فقه المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلّد

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دار الاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

فقہ المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

کامل ۳ جلد یکجا

جلد اوّل

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس
ضخامت : 291 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہِ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

...... ملنے کے پتے ......

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLIWELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A.

فہرست مضامین ﴿جلد اول﴾

مصنف کا مختصر تعارف

ابتدائی تعارف:

استاذ محترم حضرت مولانا مفتی احسان اللہ شائق ارکانی صاحب اطال اللہ بقاءہ یکم شوال ۱۳۸۳ھ بمطابق 1963ء میں پیدا ہوئے، قرآن کریم ناظرہ اور دینیات کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد الحاج مولانا شائق احمد رحمہ اللہ فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور کے پاس پڑھیں، 1977ء میں جامعہ فاروقیہ کراچی میں داخلہ لے کر باقاعدہ تعلیم کا آغاز کیا، یہاں پر ایک ہی سال میں اعدادیہ اور درجہ اولی کی تمام کتابیں پڑھیں، یہاں پر حضرت مولانا محمد یوسف افشانی صاحب زیدہ مجدہ سے خصوصی تعلق رہا، درجۂ ثانیہ کی کتابیں مدرسہ مدینۃ العلوم شمالی ناظم آباد میں پڑھنے کے بعد 1980ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا، یہاں درجہ ثالثہ سے موقوف علیہ تک کی تمام کتابیں پڑھیں۔ اس دوران حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی رحمہ اللہ، حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن کاملپوری رحمہ اللہ، حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ اور مفتی عبد السلام چاٹگامی دامت برکاتہم سے خصوصی تعلق رہا، اس دوران حضرت اقدس مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ سے خصوصی تعلق پیدا ہو گیا تھا، حضرت رحمہ اللہ تعالی سے اصلاحی تعلق کے علاوہ تلمذ کا شرف بھی حاصل رہا جس سے فقہ میں خاص مناسبت پیدا ہوئی، پھر اپنے شیخ ہی کے مشورہ سے دورۂ حدیث کے لیے جامعہ دار العلوم کراچی میں داخلہ لیا اور 1986ء میں ممتاز نمبروں کے ساتھ سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد جامعہ دار العلوم کراچی ہی سے تخصص فی الافتاء کیا، اس دوران شیخ الحدیث حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمہ اللہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب زید مجدہم سے خاص تعلق رہا، نیز تخصص کے ساتھ سرکاری بورڈ میں امتحان دے کر میٹرک بھی پاس کیا۔

زندگی کا دوسرا دور:

تخصص فی الفقہ سے فراغت کے بعد دو سال تک جامعہ اشرفیہ حقانیہ میں تدریس کے فرائض انجام دیئے، اس کے بعد 1990ء سے جامعہ حمادیہ شاہ فیصل کالونی کراچی میں تدریس اور افتاء کے منصب پر فائز ہوئے۔ 13 سال تک یہاں خدمات انجام دیتے رہے، اس دوران حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب زید مجدہم کی نگرانی میں آٹھ سال تک افتاء کا کام سرانجام دیتے رہے، پھر پانچ سال تک دار الافتاء جامعہ حمادیہ کے مستقل ذمہ دار کی حیثیت سے فتویٰ کا کام کرتے رہے ۱۴۲۳ھ بمطابق 2003ء سے تا حال، جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی میں درجہ علیا کی کتابوں کی تدریس کے

ساتھ دارالافتاء سے بھی منسلک ہیں، اس طرح اب تک تین ہزار سے زائد فتاوی تحریر فرما چکے ہیں۔

تصنیفات:

حضرت استاذِ محترم، تدریس وافتاء کے علاوہ ماشاء اللہ صاحبِ قلم بھی ہیں، سینکڑوں کی تعداد میں اصلاحی مضامین کے علاوہ اب تک چھوٹی بڑی 25 کتابیں بھی تصنیف فرما چکے ہیں، جن میں چند ایک یہ ہیں:

زادِ مسافر، سبق آموز واقعات، خواتین کی نماز کے احکام، اسلام کے پانچ بنیادی ارکان، گانا، بجانا قرآن وحدیث کی روشنی میں، تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام، داڑھی اور بالوں کے احکام، عطر ہدایہ کی تسہیل، حلال وحرام کے احکام، حیاۃ المسلمین کی تسہیل۔

جامعہ حمادیہ میں قیام کے دوران ایک رسالہ بنام "بچوں کی ابتدائی دینی تعلیمات" لکھ کر اپنے پیر ومرشد حضرت فقیہ العصر مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں جمعہ کے دن پیش کیا۔ اگلے جمعہ کو حضرت رحمہ اللہ نے حلقۃ العلماء میں تبصرہ فرمایا: "کہ انہوں نے ایک رسالہ مجھے دیا کچھ دن تک تو یہ رسالہ میرے سرہانے رکھا رہا، میں سوچتا تھا کہ یہ تو بچوں کے لیے ہے اور میں بچہ تو ہوں نہیں، اسے پڑھ کر کیا کروں گا، لیکن یوم الثلاثہ کے دن اسے اٹھا کر پڑھا تو ماشاء اللہ بہت خوب۔ یہ تو بڑوں کے لیے ہونا چاہیے تھا۔"

پھر حضرت نے اس کا کچھ حصہ اہل مجلس کو خود پڑھ کر سنایا، اس کے بعد بہت سے مہتمم حضرات نے اسے اپنے اپنے مدرسوں کے مکاتب میں باقاعدہ داخل نصاب کرلیا۔

کچھ مصنف کے بارے میں:

زیرِ نظر تصنیف "جدید معاملات کے شرعی احکام" یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی جامع کتاب ہے، جس میں جدید دور کے مسائل کا قرآن وحدیث، فقہ کی قدیم وجدید کتابوں سے نہایت آسان حل پیش کیا گیا ہے، خرید وفروخت کے احکام، کرایہ، شرکت، کفالت، رہن، سونے چاندی کی تجارت، درآمد وبرآمد، وقف وغیرہ کے تمام ہی مسائل کا حل اس میں موجود ہے، یہ کتاب جہاں مفتیانِ کرام کے لیے رہنمائی کا کام دے گی وہاں عام پڑھا لکھا طبقہ، علماء وخطباء، اسکول وکالج اور مدارسِ دینیہ کے طلبہ سب کے لیے یکساں مفید ہوگی۔ ہر ایک اپنے ظرف کے مطابق اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ استاذ محترم کی حیات دراز فرمائیں، مزید خدماتِ دینیہ کے لیے قبول فرمائیں، خصوصاً اس کتاب کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائیں اور امت کے لیے نافع بنائیں۔ آمین

بندہ احمد افنان

استاذ جامعۃ الرشید

احسن آباد کراچی

عرض مؤلف

الحمد للّٰہ رب العلمین، والصلوٰۃ والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین، امام الحنفاء، وسید الانبیاء نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ اجمعین، والتابعین لھم باحسان الی یوم الدین۔

ہر مسلمان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دین صرف عبادات تک محدود نہیں ہے کہ انسان نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کی پابندی کرے اور سمجھ لے کہ دین پر عمل کرنے کی ذمہ داری پوری ہوگئی ہے، بلکہ مکمل دین تو یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی پابندی کرے، چاہے وہ احکام عقائد سے متعلق ہوں یا اخلاق سے، عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات سے، آدمی جس طرح مساجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادات کو انجام دیتا ہے، اسی طرح بازاروں، دفاتر، عدالت، خرید وفروخت اور دیگر لین دین اور معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے لگے یعنی تمام معاملات احکامِ شرع کے مطابق انجام دے۔ اسی سے دنیا وآخرت کی کامیابی نصیب ہوگی۔

اس لیے عبادات کی طرح معاملات کے شرعی احکام کو سمجھنا بھی انتہائی اہم ہے، کیونکہ لوگوں کے درمیان جو معاملات انجام پاتے ہیں، بیع وشراء، اجارہ، شراکت داری، کفالت ووکالت، سونے چاندی کے کاروبار، قرض، ادھار، رہن وغیرہ سب معاملات کے متعلق شریعتِ مطہرہ کے واضح احکام موجود ہیں، ان کی پابندی نہ کرنے سے انسان حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے معاملات کو حلال طریقہ سے انجام دہی کا حکم فرمایا ہے:

قولہ تعالیٰ: ﴿ یایھا الذین آمنوا اوفوا بالعقود ﴾ (سورۃ المائدۃ)

قولہ تعالیٰ: ﴿ واوفوا المکیال والمیزان بالقسط ولا تبخسوا الناس اشیاء ھم ﴾ (۱۱۔۸۵)

یعنی ناپ تول پورا کرو اور لوگوں کے لیے ان کی چیزوں میں کمی مت کیا کرو اور اللہ تعالیٰ نے حرام خوری کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ سمعون للکذب اکلون للسحت ﴾ (۵۔۴۲)

یعنی یہ لوگ غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں اور بڑے حرام کھانے والے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی آیات واحادیث میں حلال کھانے کا اور حرام خوری سے بچنے کا حکم فرمایا ہے اور حرام خوری پر سخت وعیدیں بیان فرمائی ہیں:

كقوله عليه السلام : " اتقوا الظلم فإن الظلم ظلمات يوم القيامة واتقوا الشح فإن الشح أهلك من كان قبلكم حملهم على أن سفكوا دمائهم واستحلوا محارمهم ." (رواه مسلم)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ظلم سے بچوں کیونکہ ظلم قیامت کے دن بہت سی ظلمتوں کا باعث ہوگا اور حرص سے بچو کیونکہ حرص ہی نے پہلی امتوں کو ہلاک کیا انہیں خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے پر آمادہ کیا۔

وقوله عليه السلام : " ألا لا تظلموا . ألا لا يحل مال امرئ الا بطيب نفس منه ." (رواه البيهقي)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سنو! ظلم مت کرو، سنو! کسی کا مال اس کی دلی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔ (بیہقی)

بہر حال معاملات شریعت کے مطابق انجام نہ دینا یہ عذابِ الٰہی کو دعوت دینا ہے، کیونکہ اس سے انسان دانستہ و نادانستہ طور پر حرام خوری میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے خیال پیدا ہوا کہ حرام و حلال کے متعلق احکام خصوصاً معاملاتِ جدیدہ یعنی نئے پیش آنے والے معاملات مثلاً: تجارت، اجارہ، قرض وغیرہ کے احکام کو قرآن وحدیث، فقہاء متقدمین ومتاخرین کے اقوال سے اخذ کر کے امتِ مسلمہ کے سامنے پیش کیے جائیں اور انداز انتہائی آسان رکھا جائے تاکہ عمل کرنے والوں کے لیے مسائل کو سمجھنا آسان ہو، چنانچہ اب ان مسائل کا مجموعہ کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے جو کہ '' جدید معاملات کے شرعی احکام'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں شیخ محمد صابونی زید مجدہم کی کتاب '' فقہ المعاملات'' سے بھی مدد لی گئی ہے، بلکہ شروع کی ابتدائی مباحث اسی کتاب سے ماخوذ ہیں، اس کے علاوہ فقہ حنفی کی قدیم وجدید کتب سے مدد لی گئی، نیز استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم اور میرے مربی ومرشد حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''احسن الفتاویٰ'' سے خصوصی رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان اکابر کی طرح بندہ کے ''جہدِ مقل'' کو بھی قبول فرمائیں اور امتِ مسلمہ کے لیے رہنمائی کا ذریعہ بنائیں۔ آمین

راقم الحروف
احسان اللہ شائق عفا اللہ عنہ
خادم افتاء وتدریس
جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی
6/6/1427ھ

الفصل الاوّل

خرید وفروخت کے احکام

یہ کتاب لوگوں کے آپس کے لین دین مثلاً: بیع وشراء، اجارہ، رہن، وکالت، کفالت، شراکت، وغیرہ مختلف معاملات کے احکام پر مشتمل ہے جوانسانی زندگی کی ضروریات میں داخل ہیں، اسی وجہ سے اس کا نام "جدید معاملات کے شرعی احکام" رکھا گیا ہے، تاکہ ہر انسان شریعت کے مطابق عبادات ادا کر کے اللہ تعالیٰ سے تعلقات استوار کرے، اسی طرح لوگوں کے ساتھ بھی اس کا لین دین شریعت کے مطابق ہو، اس طرح وہ بیک وقت حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کرنے والا بن جائے۔

امام محمد رحمہ اللہ کا ارشاد:

فقہ حنفی کے مشہور امام، امام محمد شیبانی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ جس طرح آپ نے فقہ کو مدون فرمایا اور اس پر کتابیں لکھیں تو زہد یعنی تصوف کے بارے میں کچھ تصنیف نہیں فرمائیں گے، تو ارشاد فرمایا کہ میں نے اس موضوع پر "کتاب البیوع" لکھ دی ہے۔

(المبسوط للإمام السرخسی : ۱۲/ ۱۱۰)

اس جواب سے امام موصوف کا مقصد یہ تھا کہ انہوں نے کتاب البیوع تالیف فرمائی اس میں حلال وحرام کے احکام ہیں، جن سے لوگوں سے معاملات کے وقت انسان کی دینداری کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حلال وحرام میں کس قدر تمیز کرتا ہے۔ جب درہم ودینار سامنے ہو اس وقت انسان کے زہد وتقویٰ یا لالچ وطمع کا اندازہ ہوتا ہے۔

صرف پھٹے پرانے کپڑے پہننے اور سوکھی روٹی کھانے ہی کا نام تقویٰ نہیں کہ اس کو اختیار کر کے آدمی اپنے آپ کو متقی پرہیزگار سمجھ بیٹھے، بلکہ اصل تقویٰ حرام خوری سے اجتناب کرنے اور رزقِ حلال کو اختیار کرنے کا نام ہے۔

"جیسا کہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"اتق المحارم تكن اعبد الناس، وارض بما قسم الله لك تكن اغنى الناس."

(طرف من حديث صحيح اخرجه الترمذي رقم : ٢٣٠٦ في الزهد)

یعنی حرام اشیاء سے اجتناب کرو، اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے عبادت گزار شمار ہوگے اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے رزق کا جو حصہ مقدر فرمایا ہے اس پر راضی رہو، لوگوں میں (دلی طور پر) غنی بن جاؤ گے۔

مال کی محبت خطرناک ہے:

مال کی محبت انسان کی دین و دنیا دونوں کو تباہ کر دیتی ہے، چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

"يأتي على الناس زمان لا يبالي المرء ما أخذ منه، امن الحلال، ام من الحرام." (بخاري كتاب البيوع رقم الحديث : ٢٠٥٩)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے پیشن گوئی فرمائی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ حلال وحرام میں تمیز نہیں کریں گے، یہاں تک کہ خالص حرام کو بدونِ خوف وخطر استعمال کریں گے۔ (بخاری)

حالانکہ حرام مال کا استعمال دین و دنیا دونوں کے لیے تباہ کن ہے اور شریعتِ مطہرہ نے تو حرام کے علاوہ مشتبہ چیزوں سے بھی بچنے کا حکم فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

"إن الحلال بين، وإن الحرام بين، وبينهما امور مشتبهات، لا يعلمهن كثير من الناس، فمن اتقى الشبهات، فقد استبراء لدينه وعرضه، ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام."

(أخرجه البخاري رقم : ٥٢، مسلم : ١٥٩٩)

یعنی بے شک شریعت نے حرام کو بھی واضح کر کے بیان کر دیا اور حلال کو بھی واضح کر کے بیان کیا اور بہت سی چیزوں کے حلال وحرام ہونے میں اشتباہ ہے، جن سے اکثر لوگ واقف نہیں، جو ان مشتبہ چیزوں کے استعمال سے دور رہا اس کا دین اور اس کی عزت دونوں محفوظ رہے اور جو مشتبہ چیزوں کو استعمال کرتا ہے وہ حرام کا بھی مرتکب ہوگا۔ (بخاری)

غرضیکہ جب شریعتِ مطہرہ نے مشتبہ چیزوں سے بچنے کا حکم فرمایا ہے تو حرام چیزوں سے بچنا کتنا لازم اور ضروری ہوگا؟

مال کی غلامی:

رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو دنیا سے انتہائی محبت رکھتے ہیں اور

ان کو دنیوی زندگی میں مال جمع کرنے کے سوا کوئی اور غم وفکر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو "درہم اور دینار کے بندے" قرار دیا۔

چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

" تعیس عبد الدینار والدرهم، القطیفة والخمیصه إن اعطی رضی، وإن لم یعط لم یعرض .

(أخرجه البخاري : ٢٨٨٦)

"یعنی ارشاد فرمایا کہ ہلاک و ناکام ہوا ایسا شخص جو درہم و دینار اور لباس و کھانے کا غلام بنا رہتا ہے، اگر مل جائے تو خوش ہے، اگر محروم رہے تو ناراض رہتا ہے۔"

لہٰذا ہر مسلمان پر لازم ہے کہ حلال و حرام کو پہچانے، تاکہ اپنے آپ کو مہلک چیزوں سے بچائے اس طرح وہ اللہ قہار و جبار کے عذاب سے بچ جائے اور یہ بھی جان لے کسی کا مال باطل طریقہ سے کھانا کبیرہ گناہوں میں ایک کبیرہ گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ حرام سے بچنے کی توفیق بخشے۔

تجارت کا شرعی حکم:

اللہ تعالیٰ نے تجارت کو مباح قرار دیا ہے اور کمائی حلال اور پاکیزہ ذریعہ قرار دیا، اگر یہ آپس کی رضامندی اور خوش دلی سے ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی تجارت میں برکت نازل فرماتے ہیں، جس بیع میں آپس کی رضامندی اور خوش دلی شامل نہ ہو وہ حرام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یایها الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم ﴾ (سورة النساء : ٢٩)

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو باہمی رضامندی سے تو مضائقہ نہیں۔"

اور رسول اللہ ﷺ نے ایسے تاجر کی فضیلت بیان فرمائی ہے، جو اپنی تجارت میں سچائی اور امانت داری سے کام لے، مال کو بیچنے کے لیے نہ جھوٹ بولے اور نہ ہی دھوکہ دے، چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

" التاجر الصدوق الامین، مع النبیین والصدیقین والشهداء ."

(أخرجه الترمذي رقم : ١٢٠٩ وقال هذا حديث حسن)

یعنی ارشاد فرمایا کہ سچے امانت دار تاجر کا حشر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

خلافِ شرع تجارت کرنے والوں کے لیے وعید:

جو لوگ تجارت میں خوفِ خدا سے کام نہیں لیتے اور سچائی کو اختیار نہیں کرتے ان کو رسول اللہ ﷺ نے فاجر قرار دیا ہے "التاجر الفاجر" یعنی ایسا تاجر جس کا مقصد محض نفع خوری ہو، حلال وحرام میں بالکل تمیز نہ کرتا ہو، تجارت کے سلسلہ میں شریعتِ مطہرہ کے کسی حکم کی پابندی نہ کرتا ہو اور صرف خرید وفروخت میں مگن رہتا ہو۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ عیدگاہ کی طرف نکلے۔ آپ ﷺ کے ساتھ حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ آپ نے لوگوں کو خرید وفروخت کرتے ہوئے دیکھا، تو پہلے آواز دے کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا جب لوگ متوجہ ہو گئے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

" إن التجار يبعثون يوم القيامة فجاراً الا من اتقى الله وبر وصدق." (ترمذی کتاب البیوع : ١٢١٠)

"یعنی قیامت کے دن تاجروں کو فاجروں کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا مگر جو تاجر تقویٰ، نیکی اور سچائی کو اختیار کرے۔" (وہ اس ذلت سے محفوظ ہوگا)

بڑا ظالم وہ تاجر ہے جو اپنے سامانِ تجارت کو بیچنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھائے اور دنیا کے معمولی نفع کی خاطر اللہ جل جلالہٗ کے نام کی توہین کرے۔ اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اس طرح دنیا وآخرت دونوں کو تباہ وبرباد کر رہا ہے:

عن أبي ذر عن النبي صلى الله عليه وسلم قال : " ثلاثة لا ينظر الله إليهم يوم القيامة، ولا يزكيم ولهم عذاب أليم ." قلنا : من هم يا رسول الله ؟ فقد خابوا وخسروا فقال : " المنان، والمسبل إزاره، والمنفق سلعته بالحلف الكاذب ."

(مسلم كتاب الإيمان رقم ١٧١ ترمذي بيوع رقم ٢٣٢٦)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو ان کی طرف دیکھیں گے، نہ ان کو گناہوں سے پاک فرمائیں گے اور ان کے لیے دردناک

عذاب ہوگا، ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! یہ کون لوگ ہوں گے؟ یقیناً یہ لوگ تو ہلاک ہوگئے اور تباہ و برباد ہوگئے، تو ارشاد فرمایا:

(۱) کسی پر احسان کرنے کے بعد احسان جتانے والا!

(۲) ٹخنوں سے نیچے شلوار (پاجامہ یا ازار) لٹکانے والا!

(۳) اپنے سامانِ تجارت کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بیچنے والا!

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی ہے کہ تاجروں کو کثرت سے صدقہ خیرات کرنا چاہیے، تاکہ تجارت و معاملات میں جو کمی کوتاہی ہو جاتی ہے اس کا کفارہ ہو جائے، کیونکہ نیکیاں برائیوں کے لیے کفارہ بن جاتی ہیں۔

حضرت قیس بن ابی غرزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے ہم ان دنوں خرید وفروخت کے دلال (ایجنٹ) کے طور پر کام کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے تاجروں کی جماعت! (یہ بات یاد رکھو) کہ خرید وفروخت کے وقت شیطان حاضر ہوتا ہے اور گناہ ہونے کا بھی احتمال ہوتا ہے، اس لیے اپنی تجارت کو صدقہ خیرات کے ساتھ مخلوط رکھو۔'' (یعنی صدقہ کیا کرو، تاکہ تجارت وخرید وفروخت میں جو کچھ گناہ سرزد ہو جائے اس کا اثر ختم ہو جائے) (ابو داؤد کتاب البیوع حدیث: ۳۳۲۶)

مالِ حرام سے بچنے کی تاکید:

اب تک کچھ بیان ہوا یہ تجارت کے متعلق شرعی نقطہ نگاہ کی مختصر تشریح ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رزقِ حلال نصیب فرمائے اور رزقِ حرام سے حفاظت فرمائے۔ اب ہم اس سلسلہ کو اختتام تک پہنچانے کے لیے آخری حدیث ذکر کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دنیا کی حقارت اور دین کی عظمت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

(1) اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمہارے لیے اخلاق کو تقسیم فرمایا ہے، اسی طرح تمہارے رزق کو بھی تقسیم فرمایا۔ (یعنی ہر انسان کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لیے رزق مقرر کرلیا جاتا ہے)

(2) اللہ تعالیٰ دنیا ہر شخص کو دیتا ہے چاہے اس سے محبت ہو یا نہ ہو، لیکن دین صرف اسی شخص کو دیتا ہے جس سے محبت ہوتی ہے، لہٰذا کسی کو دین عطا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ

تعالیٰ کو اس سے محبت ہے۔

(3) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد (ﷺ) کی جان ہے جو شخص حرام مال کماتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت نازل نہیں فرماتے۔

(4) جو شخص اپنے پیچھے حرام مال چھوڑ کر جاتا ہے، وہ اس کے لیے قیامت کے دن جہنم کا ایندھن ہوگا۔

(5) اللہ تعالیٰ خبیث کو خبیث مال سے نہیں مٹاتے بلکہ خبیث کو حلال مال سے ہی مٹاتا ہے۔(مسند امام احمد، ترغیب و ترهیب : ۲ / ۵۰۰)

بیع وشراء کی تعریف

بیع:

البیع : هي مبادلة المال بالمال بالتراض .

انسان کا اپنی مملوکہ چیز دوسرے کے قبضہ میں دینا۔ آپس کی رضامندی سے چنانچہ مؤمنین کی تعریف میں قرآن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے:

﴿رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله﴾

(سورة النور: ۳۷)

ترجمہ: ''ایسے لوگ صبح وشام اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ وہ مرد جن کو اللہ تعالیٰ کی یاد، نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے سے خرید فروخت غفلت میں نہیں ڈالتی۔ وہ ایسے دن سے ڈرتے ہیں جس میں بہت سوں کے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔''

شراء:

قیمت ادا کر کے چیز کو قبضہ میں لینا۔ یہ لفظ بھی قرآن میں استعمال ہوا ہے:

﴿إن الله اشترىٰ من المؤمنين انفسهم و أموالهم بأن لهم الجنة﴾

(سورة توبة : ۱۱۱)

بیع وشراء کا لفظ کسی صفت کو دوسری صفت کے ساتھ تبدیل کرنے کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں اس معنیٰ میں بھی استعمال ہوا ہے:

﴿ أولئك الذين اشتروا الضلالة بالهدىٰ فما ربحت تجارتهم ﴾

(سورة البقرة : ١٦)

بیع کا مشروع ہونا:

بیع وشراء کی مشروعیت قرآن، حدیث، اجماعِ امت اور قیاس سے ثابت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واحل الله البيع وحرم الربوا ﴾ (سورة البقرة : ٢٧)

حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ سب سے پاکیزہ کمائی کون سی ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی خود اپنے ہاتھ سے کمائے، ہر تجارت برکت والی ہے۔ (مسند احمد، بزار)

یعنی ہر تجارت جو شریعت کے موافق ہو اس میں اللہ رب العزت کی طرف سے برکت نازل ہوتی ہے۔

اسی طرح رسول ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں لوگ بیع وشراء اور تجارت کے پیشے سے منسلک تھے آپ نے منع نہیں فرمایا، آپ ﷺ کی موجودگی میں کوئی کام انجام دیا جائے اور آپ منع نہ فرمائیں یہ اس کام کے شرعاً جائز ہونے کی دلیل ہے۔ (کیونکہ صاحبِ شریعت کے لیے خلافِ شرع کام کو روکنا لازم ہوتا ہے، دیکھ کر نکیر کئے بغیر خاموش رہنا جائز نہیں)

اجماعِ امت:

تمام مسلمانوں کا سلفاً وخلفاً بیع کے جواز پر اجماع ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے اب تک لوگ خرید وفروخت اور تجارت میں مشغول ہیں کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تجارت کی مشروعیت پر امت کا اجماع ہے۔

قیاس:

قیاس وعقل کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ بیع وشراء مشروع ہو کیونکہ انسان اپنی ہر حاجت کو خود پورا نہیں کرسکتا ہے، وہ غذا، لباس اور دواء وغیرہ اور بہت سی حاجاتِ ضروریہ کا محتاج ہے۔ اب وہ تن تنہا ان تمام حوائج کو پورا نہیں کرسکتا کہ وہ کھیتی بوئے پھر خود ہی کاٹے، پھر آٹا پیسے اور اور گوندھے پھر خود ہی روٹی پکائے۔ اسی طرح کپڑا بھی خود بنے، نجار اور لوہار اور فٹنگ وغیرہ کا کام بھی خود

کرے، اسی طرح کان سے لوہا اور دیگر دھات بھی نکالے، غرضیکہ ہر انسان اپنی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں دوسرے بہت سے انسانوں کا محتاج ہے جب وہ دوسروں کے ہاتھ کی چیزوں کا محتاج ثابت ہوا تو اس کو حاصل کرنے کے لیے ضرور اس کو عوض ادا کرنا پڑے گا، کیونکہ بلاعوض غصب یا چوری کے ذریعہ حاصل کرنے میں عظیم فساد برپا ہوگا جب کہ اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں فرماتے۔

اسی حکمت و مصلحت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ علیم وحکیم ذات نے اپنے بندوں کو تجارت کرنے کا حکم فرمایا، خرید و فروخت کو مباح قرار دیا تاکہ منافع کا تبادلہ ہوتا رہے اور دنیوی زندگی کے اسباب کے سلسلہ میں آپس میں تعاون جاری رہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وأحل الله البيع وحرم الربا ﴾ (سورة البقرة : ۲۷)

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان ﴾

(سورة المائدة : ۲)

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیع کا حاصل یہی ہے کہ اپنی مملوکہ چیز کو قیمت کے عوض میں دوسروں کی طرف منتقل کیا جائے، چونکہ یہ دوسروں کے ہاتھ کی چیزوں کا محتاج ہے اور وہ بلاعوض دیتا نہیں لہٰذا اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ بیع وشراء کا راستہ اختیار کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم فرمایا ہے:

﴿ لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ﴾

بیع کی تعریف سمجھ لینے کے بعد اب ہم بیع کی چند اقسام کا ذکر کریں گے۔

بیوع کی اقسام:

بیع کی چار اقسام ہیں ہر قسم کا ایک خاص نام ہے:

1- بیع المقایضہ

2- بیع المال بالمال یعنی بیع صرف

3- بیع مطلق سونے اور چاندی یعنی نقود کے ذریعہ خرید و فروخت

4- بیع سلم

بیع مقایضہ کی تعریف:

بیع مقایضہ کی تعریف یہ ہے کہ سامان کو سامان کے عوض فروخت کیا جائے، مثلاً: گندم کو تیل کے عوض، کھجور کو جو کے عوض، تیل کو گھی کے عوض، گھوڑے کو گھر کے عوض، وغیرہ۔

پہلے زمانہ میں یہی طریقہ زیادہ رائج تھا، کیونکہ اس زمانہ میں درہم ودینار وغیرہ سکوں کا رواج کم تھا، اس لیے وہ ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض میں بیچتے تھے، اس کا نام مقایضہ یعنی مبادلہ رکھا گیا کیونکہ اس میں سامان کو نقود کے عوض فروخت کرنے کے بجائے سامان کا تبادلہ سامان سے ہوتا تھا۔ بیع کا یہ طریقہ بھی بلا اختلاف جائز ہے کیونکہ اس بیع کے جواز میں بندوں کی مصلحت ہے۔ بیع مقایضہ کے جواز پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ حنین کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے، تو میں نے ایک زِرہ (جنگی لباس) کے عوض بنی سلمہ میں ایک باغ خریدا۔ کیونکہ یہ پہلا مال ہے جو میں نے اسلام لانے کے بعد خریدا۔

(بخاری کتاب البیوع: ۲۱۰۰)

اب اس روایت میں جلیل القدر صحابی حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرمارہے ہیں کہ میں نے زِرہ کے عوض باغ خریدا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس عقد کو برقرار رکھا اس پر کوئی نکیر نہیں فرمائی یہ اس کے جواز کی دلیل ہے۔

اسی طرح حدیثِ صحیح میں ہے:

"إذا زنت الأمة فتبين زناها فليجلدها ولا يثرب ثم قال: فليبعها ولو بحبل من شعر." (بخاري كتاب البيوع: ۲۱۵۲)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جب تم میں سے کسی کی باندی زنا کا ارتکاب کرے تو لازم ہے کہ اس کو حد لگائے، پھر فرمایا کہ اس کو فروخت کردے اگرچہ بالوں کی ایک رسی کے عوض ہی کیوں نہ ہو۔

اس روایت میں جو رسی کے عوض فروخت کرنے کا ذکر ہے اس سے ثابت ہوا کہ باندی کو رسی کے عوض فروخت کرنا جائز ہے، یہی بیع مقایضہ ہے کہ عین کو عین کے عوض فروخت کیا جائے۔

بیع صرف کی تعریف:

بیع صرف فقہاء کی اصطلاح میں ثمن کو ثمن کے عوض فروخت کرنے کو کہا جاتا ہے یعنی سونے چاندی اور ان کے سکوں کو آپس میں فروخت کرنا، اس زمانے میں کرنسی نوٹوں کے کاروبار چاہے ملکی کرنسی ہو یا مختلف ملکوں کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ ہو، ان پر بھی بیع صرف کا حکم لاگو ہوتا ہے یہ بیع بھی شرعاً کچھ شرائط کی پابندی کے ساتھ جائز ہے۔ کرنسی کے کاروبار کرنے والوں کو عربی میں ''صراف'' کہا جاتا ہے۔

اس کے جدید احکام کے متعلق ہم آئندہ گفتگو کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بیع مطلق:

بیع مطلق یعنی سامان کو نقود کے عوض میں فروخت کرنا، یعنی کیلی اور وزنی اشیاء کو ثمن (نقدی) کے عوض فروخت کرنا، خرید و فروخت کا یہی طریقہ ہر زمانہ میں رائج رہا ہے تجارت کا اصل مدار اسی پر ہے، مثلاً: گھی، تیل، گاڑی، گھر، زمین اور باغ وغیرہ اپنے علاقہ میں رائج کرنسی کے ذریعہ خریدا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إلا أن تكون تجارة حاضرة تديرونها بينكم ﴾

(سورة بقرة: ٢٨٢)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم ﴾ (سورة نساء: ٢٩)

سے یہی تجارت مراد ہے، اللہ تعالیٰ نے اس تجارت کو حلال فرمایا ہے، بشرطیکہ آپس کی رضامندی کے ساتھ ہو، غصب، زور وزبردستی اور دھمکی کا راستہ اختیار نہ کیا جائے۔

حرام اشیاء کی تجارت:

بعض اشیاء ایسی ہیں جن کی تجارت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، کیونکہ ان سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً: شراب، خنزیر اور نشہ آور اشیاء کی تجارت، اسی طرح وہ چیز جو انسان کے قبضہ نہ ہو اور مشتری کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ ہو ایسی اشیاء کا فروخت کرنا بھی شرعاً حرام ہے۔ مثلاً: ہوا میں اڑتا ہوا پرندہ جو ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا یا شکار کرنے سے پہلے مچھلی فروخت کرنا وغیرہ، یہ

بھی باطل طریقہ سے لوگوں کے مال کھانے کے حکم میں داخل ہے۔ اس کی تفصیلات بھی ہم آئندہ ان شاء اللہ ذکر کریں گے۔

بیع سلم:

بیع سلم یا سلف، فقہاء کی اصطلاح میں اس بیع کو کہا جاتا ہے جس میں قیمت پہلے ادا کی جاتی ہے اور سامان ایک مہینہ یا اس سے زائد مدت کے بعد ادا کیا جاتا ہے، مثلاً: کوئی شخص کسانوں سے گندم یا جو خریدتا ہے، گھی یا تیل خریدتا ہے، قیمت اسی مجلس میں ادا کر دیتا ہے اور سامان ادا کرنے کے لیے ایک مدت مقرر کر لی جاتی ہے، مثلاً: فصل کٹنے کے بعد، بیع سلم کا اصل حکم تو یہی ہونا چاہیے کہ یہ ناجائز ہو کیونکہ یہ معدوم اشیاء کی بیع ہے جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، چنانچہ حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! لوگ میرے پاس آ کر ایسی چیز کی بیع کا مطالبہ کرتے ہیں جو میری ملک میں نہیں ہوتی، پھر میں بازار سے خرید کر ان کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، کیا یہ صحیح ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو چیز تمہارے ملک میں داخل نہیں اس کو مت فروخت کرو۔

(ترمذی کتاب البیوع ۱۲۳۲)

تاہم شریعت نے کسان، مزارع اور دوسرے لوگوں کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی اجازت دی ہے۔

کیونکہ شریعت لوگوں کی ضرورتوں کا لحاظ کرتی ہے، بلکہ شریعت کا حاصل یہی ہے اس میں انسانوں کے لیے دینی و دنیوی فلاح کا طریقہ مذکور ہے، شریعت کی پابندی سے دونوں میں فلاح و کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نقصان دہ اشیاء کے استعمال سے اور لوگوں کو نقصان پہنچانے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

"لا ضرر ولا ضرار."

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رحم فرمانے والے بلکہ انسان کے اپنے نفس سے بھی زیادہ رحیم ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما ﴾

(سورة النساء: ۲۹)

امام قدوری رحمہ اللہ کی رائے:

فقہ حنفی کی مشہور کتاب "مختصر قدوری" میں مذکور ہے، کہ "سلم" لغت میں ایسے عقد کو کہا جاتا ہے، جو عوضین میں سے ایک نقد دوسرے کے ادھار پر مشتمل ہے یہ عقد خلافِ قیاس مشروع ہوا ہے، کیونکہ معدوم چیز کی بیع ہے، تاہم کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ سے جواز ثابت ہونے کی بناء پر ہم نے قیاس کو ترک کردیا۔

دلیل قرآنی:

قوله تعالىٰ : ﴿ يأيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه ﴾ (سورة بقرة : ٢٨٢)

ترجمہ: "اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعادِ معین تک تو اس کو لکھ لیا کرو، یہ ضروری ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والے انصاف کے ساتھ لکھیں۔"

دلیل حدیث سے:

قوله عليه السلام : " من اسلف في شيء فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى اجل معلوم ."

(بخاری کتاب السلم : مسلم مساقات ١٢٧، ترمذي كتاب البيوع : ١٣١١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ "جو شخص بیع سلم کرنا چاہے، اس کا کیل اور وزن معلوم ہونے کے علاوہ مدت بھی معلوم ہونی چاہیے۔"

اس حدیث کے شانِ ورود کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے لوگوں میں اس وقت کھجور وغیرہ میں بیع سلم کا رواج تھا تو آپ ﷺ نے اس عقد کو شرائط کے ساتھ جائز رکھا۔

اسی طرح "الاختيار لتعليل المختار: ٢/ ٣٤ " میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے معدوم (جو موجود نہ ہو) چیز کو فروخت کرنے سے منع فرمایا البتہ بیع سلم کی اجازت دی ہے اسی پر اجماع منعقد ہوا ہے، اس کو "بیع المفالس" کہا جاتا ہے یعنی مفلس لوگوں کی بیع کیونکہ درحقیقت یہ عقد وہی شخص کرتا ہے جو رقم کا محتاج ہو، بندوبست کرنے کی کوئی صورت نہ ہو تو آئندہ ملنے والے مال کو سستے دام فروخت کرتا ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوتا تو کم قیمت پر فروخت نہ کرتا۔

بیع سلم کی شرائط، ارکان اور وہ اشیاء، جن میں سلم جائز نہیں ہے ان کی تفصیلات ہم آئندہ مستقل طور پر بیان کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

بیع منعقد کرنے کے طریقے

(۱) ایجاب وقبول کا طریقہ:

بیع کی پہلی قسم جو معروف اور مشہور ہے، وہ یہی ہے کہ بائع اور مشتری میں سے ایک کی طرف سے ایجاب ہو اور دوسرے کی طرف سے قبول اور الفاظ ایسے ہوں جو پختہ بیع پر دلالت کریں، مثلاً: میں نے بیچ دیا، میں نے خرید لیا یا میں نے آپ کو اتنی قیمت پر اس چیز کا مالک بنا دیا تو دوسرا کہے: میں نے لے لیا یا قبول کر لیا وغیرہ۔

صرف وعدہ کے الفاظ سے بیع منعقد نہیں ہوتی، مثلاً: یہ کہے کہ میں فروخت کروں گا، دوسری طرف سے کہا جائے: میں خریدوں گا وغیرہ۔

اسی طرح صرف سوال و جواب سے بھی بیع منعقد نہیں ہوتی، مثلاً: ایک کہے آپ یہ گاڑی فروخت کریں گے؟ دوسرا جواب میں کہے، ہاں ارادہ ہے، اس سے بھی عقد منعقد نہیں ہوگا۔

(۲) بیع تعاطی:

فقہاء کے نزدیک بیع تعاطی اس بیع کو کہتے ہیں کہ عاقدین عقد بیع کے وقت زبان سے ایجاب یا قبول نہ کریں، بلکہ ایجاب یا قبول کیے بغیر مشتری چیز کی قیمت بائع کو پکڑا دے اور بائع وہ چیز مشتری کو دیدے، نہ بائع یہ کہے کہ میں نے یہ چیز فروخت کی اور نہ مشتری یہ کہے کہ میں نے یہ چیز خریدی۔

بیع تعاطی کی دو قسمیں ہیں:

ایک یہ کہ عاقدین میں سے ایک زبان سے ایجاب کا تلفظ کرے اور دوسرا شخص قول کی بجائے عملاً اس بیع کو قبول کر لے، مثلاً: مشتری یہ کہے کہ مجھے دو روپے کی روٹی دے دو، اس کے جواب میں بائع اس کو خاموشی سے روٹی اٹھا کر دے دے اور اس سے پیسے وصول کر لے اور زبان سے کچھ نہ کہے۔ اس صورت میں ایجاب لفظاً اور قبول عملاً پایا گیا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ عاقدین میں سے کوئی بھی زبان سے کچھ نہ کہے۔ مثلاً: ایک شخص دکان

میں داخل ہوا، دکان میں ہر چیز پر اس کی قیمت لکھی ہوئی تھی، اس نے اپنی مطلوبہ اشیاء اٹھائیں اور ان پر لکھی ہوئی قیمت دکاندار کو دے کر وہ اشیاء لے کر چلا گیا۔ اس صورت میں عاقدین کے درمیان کسی بھی قسم کی بات چیت زبان سے نہیں ہوئی۔

فقہاء کی اصطلاح میں دونوں قسموں کو ''بیع تعاطی'' یا ''بیع معاطاۃ'' کہا جاتا ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک تمام اشیاء میں بیع تعاطی کی دونوں قسمیں جائز ہیں، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے مشہور مذہب کے مطابق بیع تعاطی جائز نہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک بیع ایجاب وقبول پر موقوف ہوتی ہے اور بیع تعاطی کے اندر ایجاب وقبول دونوں یا ایک موجود نہیں۔ لیکن کتبِ شافعیہ کی طرف مراجعت کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بیع تعاطی کے حکم کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

١. ایک قول یہ ہے کہ شوافع کے نزدیک بیع تعاطی تمام اشیاء میں باطل ہے اور اس کے ذریعہ بیع منعقد نہیں ہوتی۔ یہی ان کا مشہور مذہب ہے۔

٢. دوسرا قول یہ ہے کہ معمولی اشیاء میں بیع تعاطی جائز ہے لیکن قیمتی اور نفیس اشیاء میں بیع تعاطی جائز نہیں۔ یہ علامہ ابن سریج اور رویانی رحمہما اللہ کا قول ہے۔

(مغنی المحتاج للشربینی فتح : ٢/٤)

٣. جن چیزوں میں بیع تعاطی کا عرف جاری ہے، ان میں بیع تعاطی جائز ہے، ان کے علاوہ دوسری چیزوں میں جائز نہیں۔

٤. چوتھا قول یہ ہے کہ جو لوگ ''بیع معاطاۃ'' سے واقف ہیں، جیسے: عام آدمی اور تاجر وغیرہ ان کا بیع معاطاۃ کرنا جائز ہے اور جو لوگ بیع معاطاۃ سے پوری طرح واقف نہیں، ان کو تلفظ کے بغیر بیع کرنا درست نہیں ہے۔ (مغنی المحتاج : ٢/٤)

• البتہ جمہور فقہاء کا مذہب راجح یہ ہے کہ تمام اشیاء میں تعاطی کے ذریعہ بیع منعقد ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ یہ عقد آپس کی رضامندی کے ساتھ طے پائے۔ مذہب جمہور کی دلیل کے طور پر یہاں ہم صرف علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کی عبارت نقل کرتے ہیں، جو انشاء اللہ کافی وشافی ہوگی، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''ہماری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال قرار دیا اور اس کی کیفیت بیان نہیں فرمائی،

چنانچہ جس طرح دوسرے معاملات مثلاً ''قبض'' اور ''احراز'' اور ''تفرق'' کے سلسلے میں عرف کی طرف رجوع کیا تھا، اسی طرح بیع کی کیفیت معلوم کرنے کے لیے بھی عرف کی طرف رجوع کرنا واجب ہے، چنانچہ عرف کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مسلمان اپنے بازاروں میں اس طرح سے بیع کا معاملہ کرتے ہیں اور بیع کا یہ طریقہ ان کے درمیان معلوم اور مشہور ہے۔ البتہ بیع کی اس قسم پر شریعت کے بعض احکام کا دارومدار ہے اور ان کو شریعت نے اپنی جگہ برقرار بھی رکھا ہے، لہٰذا اپنی رائے سے بیع کی اس قسم میں تغییر اور تبدیلی کرنا جائز نہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اس بیع کا کثرت سے شیوع کے باوجود اس میں ایجاب وقبول کا استعمال ثابت اور منقول نہیں، اگر ایجاب وقبول اس بیع میں استعمال کرتے تو یہ بات ضرور مشہور ہو جاتی اور اگر ایجاب وقبول کا تلفظ بیع کے اندر شرط کا درجہ رکھتا تو اس صورت میں اس حکم کو آگے دوسروں تک پہنچانا واجب ہو جاتا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ جو بات آگے پہنچانا واجب ہو اس کو نقل کرنے میں سستی اور غفلت سے کام لیتے۔

دوسری طرف بیع ان معاملات میں سے ہے، جن میں عموم بلویٰ پایا جاتا ہے، لہٰذا اگر بیع کے اندر ایجاب وقبول کا تلفظ شرط کے درجے میں ہوتا تو حضورِ اقدس ﷺ اس کو ضرور اس طرح واضح کر کے بیان فرماتے کہ وہ حکم مخفی نہ رہتا، اس لیے کہ اگر یہ ایجاب وقبول کا تلفظ بیع کے اندر شرط ہوتا تو پھر اس کے نہ پائے جانے کی صورت میں بہت سے معاملات فاسد ہو جاتے اور پھر اس کے نتیجے میں باطل طریقے پر مال کھانے کی نوبت آجاتی اور ہمارے علم کی حد تک حضورِ اقدس ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اس بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے۔

اور چونکہ ہر زمانے میں لوگ بازاروں کے اندر بیع تعاطی کے معاملات کرتے آرہے ہیں اور ہمارے مخالفین میں سے پہلے کسی نے بھی بیع کے اس طریقے کی مخالفت نہیں کی، اس لیے اس کے جواز پر اجماع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ہبہ، ہدیہ، صدقہ وغیرہ میں بھی ایجاب وقبول کا یہی حکم ہے کہ زبان سے ان کا تلفظ ضروری نہیں، چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی ان معاملات میں ایجاب وقبول کا استعمال کرنا منقول نہیں ہے، حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حبشہ اور دوسرے مقامات کے بہت سے ہدایا پیش کیے گئے اور اسی طرح لوگ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی باری کے دن حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں ہدیہ پیش کرنے کو

اوّلیت دیتے تھے۔

(متفق علیہ)

صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں کوئی شخص کھانا لاتا تو آپ لانے والے سے سوال کرتے کہ یہ ہدیہ ہے یا صدقہ ہے؟ اگر لانے والا جواب میں کہتا کہ یہ صدقہ ہے تو آپ اپنے صحابہ کرام سے فرماتے کہ آپ لوگ تناول فرمالیں اور آپ ﷺ خود تناول نہ فرماتے اور اگر جواب میں یہ کہا جاتا کہ یہ ہدیہ ہے تو اس وقت آپ اپنے ہاتھ سے لوگوں کو اس کے کھانے کا اشارہ فرماتے اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔

حضرت سلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کچھ کھجوریں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں لائے اور آکر کہا کہ میں نے یہ دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ اس کھجور کے زیادہ حق دار ہیں، اس لیے میں صدقہ کی کچھ کھجوریں آپ کی خدمت میں لایا ہوں، حضورِ اقدس ﷺ نے ان کی بات سن کر صحابہ کرام سے فرمایا کہ آپ لوگ کھالیں، آپ نے وہ کھجوریں نہیں کھائیں۔ پھر دوبارہ کھجوریں آپ کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ میں نے دیکھا کہ آپ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، اس لیے یہ کھجوریں آپ کے لیے ہدیہ لایا ہوں، اس وقت حضورِ اقدس ﷺ نے ''بسم اللہ'' پڑھی اور ان کو کھایا۔

دیکھیے: ان احادیث میں نہ تو حضورِ اقدس ﷺ سے قبول کا تلفظ کرنا منقول ہے اور نہ یہ منقول ہے کہ آپ نے ''ایجاب'' کے تلفظ کا حکم دیا ہو، بلکہ آپ نے صرف یہ معلوم کرنے کے لیے سوال کیا کہ وہ صدقہ ہے یا ہدیہ ہے؟ اور اکثر روایات میں ایجاب وقبول کا تلفظ منقول نہیں، بلکہ ''معاطاۃ'' کے طور پر وہ معاملہ مکمل ہوگیا اور فریقین کے درمیان رضامندی کے ساتھ جدائی ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ معاملہ درست ہوگیا، اس لیے کہ اگر ان معاملات میں ایجاب و قبول کا تلفظ شرط ہوتا تو اس صورت میں لوگوں کو دشواری پیش آجاتی اور مسلمانوں کے بہت سے معاملات فاسد ہوجاتے، جس کے نتیجے میں ان کے اکثر اموال حرام ہوجاتے۔ دوسرے اس لیے کہ ایجاب وقبول کا مقصد تو فریقین کی رضامندی کا اظہار ہے، لہٰذا جب ایجاب وقبول کے علاوہ دوسری چیز مثلاً: تعاطی وغیرہ پائی جائے جو آپس کی رضامندی پر دلالت کرنے والی ہو تو اس

صورت میں بھاؤ تاؤ یا تعاطی اس ایجاب وقبول کے قائم مقام ہوکر اس کی طرف سے کافی ہو جائے گی، اس لیے کہ رضا مندی کے اظہار کا ذریعہ صرف ایجاب وقبول نہیں ہے۔

(المغنی لابن قدامة : ٣ / ٥٦١) (ماخوذ از فقهي مقالات)

بائع ومشتری میں اہلیت کی شرائط

شرعاً عقد بیع منعقد ہونے کے لیے بائع اور مشتری میں درجِ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

عاقل ہونا:

عاقل ہونا ضروری ہے، پاگل، مجنوں کا عقد بھی شرعاً غیر معتبر ہے۔

قوله عليه السلام : " رفع القلم عن ثلث : عن النائم حتى يستيقظ، وعن الصبي حتى يحتلم، اي يبلغ وعن المجنون حتى يعقل ." (رواه احمد واصحاب السنن والحاكم)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تین قسم کے لوگ احکامِ شرع کے مکلف نہیں، سویا ہوا شخص بیدار ہونے تک، بچہ بالغ ہونے تک، پاگل دماغی توازن ٹھیک ہونے تک۔

تو اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جب یہ احکامِ شرع کے مکلف نہیں تو ان کے الفاظ سے عقد بھی منعقد نہیں ہوگا، البتہ بچہ سمجھدار ہو، معمولی اشیاء کی خریداری کے لیے سرپرست اجازت دیں تو ان کی اجازت سے عقد منعقد ہوگا۔

بے وقوف کم عقلی کی وجہ سے فضول خرچی کی وجہ سے اس پر عدالت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہ ہو، اگر ایسا ہوا تو جب تک پابندی ختم نہ ہو جائے اس کے ساتھ معاملہ کرنے سے عقد منعقد نہ ہوگا۔

قوله تعالىٰ : ﴿ ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التى جعل الله لكم قياماً فإن أنستم منهم رشداً فادفعوا إليهم أموالهم ﴾

(سورة النساء : ٥ ـ ٦)

شیخ صابونی صاحب فرماتے ہیں اگرچہ بعض فقہاء آزاد، بالغ پر تجارتی پابندی لگانے کو ناجائز قرار دیتے ہیں، تاہم فقہاء کی ایک جماعت جن میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام اسحاق شامل

ہیں، وہ فرماتے ہیں: اگر کوئی آزاد آدمی ضعیف العقل ہو، جو تجارت میں اکثر نقصان کرتا ہو، جس کی وجہ سے اس کا اپنا بھی نقصان ہوتا ہے اور گھر کے دیگر افراد کا بھی تو اس پر پابندی لگائی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابوخلابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر والوں نے آپ ﷺ سے مطالبہ کیا تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا:

"إذا بايعت فقل هاء وهاء، ولا خلابة."

(ترمذی: ۱۲۵، ابو داؤد کتاب البیوع رقم: ۳۵۰۱)

یعنی کسی بھی چیز کو خریدتے وقت کہہ دو میں ناواقف ہوں اس لیے دھوکہ سے اجتناب کرو۔

اس شرط کی وجہ سے دھوکہ کی صورت میں بیع ان کو ختم کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا تھا۔

نابالغ کی بیع وشراء:

عقد بیع منعقد ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عاقدین بالغ ہوں، نابالغ بچوں کی بیع وشراء منعقد نہیں ہوتی، البتہ جو بچے اور بچیاں نفع اور نقصان کی تمیز کر سکتے ہوں، باپ، دادا یا جو بھی اس وقت ولی ہو، اس کی اجازت سے ان بچوں کی بیع وشراء نافذ ہو گی، اجازت صراحۃً ہو یا دلالۃً دونوں طرح درست ہے، بچوں کو کوئی چیز خریدتے یا فروخت کرتے دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بھی سرپرست کی طرف سے اجازت سمجھی جاتی ہے۔

قال في الهندية: "إذا اذن لصبي يعقل البيع والشراء يجوز يريد به أنه يعقل معنى البيع والشراء بأن عرف أن البيع سالب للملك والشراء جالب عرف الغبن اليسير من الفاحش لا نفس العبارة كذا في الصغرى." الفتاوى الهندية: ۵/۱۱۰

نقد وادھار کا ضابطہ

نقد:

1۔ ہر وہ عقد نقد ہے، جس میں ایجاب وقبول کرتے وقت نقد کا لفظ بولا جائے، جیسے یہ گھوڑا نقد سو روپے میں لیا ہے۔

2۔ یا لیتے وقت قیمت پیش کر دی جائے کہ یہ ہزار روپے لو اور تھان کپڑے کا دیدو۔

3. یا مال کسی کے ہاتھ بھیجا جائے کہ قیمت لے کر واپس آنا۔
4. کچھ تصریح نہ کرے، مثلاً یوں کہے کہ یہ گھوڑا سو کا خریدا۔
5. جو مال، ریلوے، ٹرک، ڈاک یا بائع کے نمائندہ کے ہاتھ منگوایا جائے۔
6. مطلقاً عقد کر کے مال لے لیا، مثلاً ایک تھان پانچ سو روپے میں طے کر کے مال اٹھالیا اور چلا گیا، بائع نے کچھ مزاحمت نہ کی، پہلی تین صورتیں یقینی طور پر نقد ہیں اور آخری تین نقدیت پر محمول ہیں۔ پس اگر اسی مجلس میں قیمت کا ذکر ہوا کہ بائع نے پوچھا قیمت کب دیں گے؟ یا خریدار نے خود ہی کہا: مہینہ کے آخر میں دوں گا تو ادھار ہو جائے گا ورنہ نقد ہی رہے گا، لہٰذا ایسی صورت میں مدت کے مذکور نہ ہونے میں کوئی نقصان نہیں اور بائع کو ہر وقت مطالبہ کا حق ہوگا۔

مسئلہ: زید نے مال خریدا اور کہا کہ جب تم آدمی بھیجو گے یا حساب کر کے دو گے رقم بھیج دی جائے گی تو یہ نقد ہے۔

ادھار:

1. ہر وہ عقد جس کے ایجاب وقبول میں ادھار کا ذکر آ جائے۔
2. یا طریقہ لین دین سے ادھار ہونا معلوم ہو جائے یا مذکورہ بالا صورت نمبر ٤، ٥، ٦ میں دین کی بات مجلس عقد ہی میں ہوگئی، البتہ مدت اداء کو ذکر کرنا ضروری ہے۔ ورنہ بیع فاسد ہو جائے گی۔

مسئلہ: صورت ٤، ٥، ٦ میں مجلس عقد ختم ہونے کے بعد اداء کی بات ہوئی یا ایجاب و قبول کے بعد قیمت ادا نہیں کی لیکن وعدہ ہوا اب مدت فاسدہ کا فساد اصلی عقد کے ساتھ ملحق نہ ہوگا اس لیے کہ عقد تمام ہو گیا۔

مسئلہ: نقد معاملہ ہوا، مگر قیمت مجلس عقد میں ادا نہیں کی یا قیمت کی ادائیگی کے لیے جو وعدہ کیا تھا وعدہ کو پورا نہیں کیا تو وعدہ خلافی کا تو گناہ ہوگا، لیکن عقد میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔

بیع کی شرائط:

عقدِ بیع کے صحیح ہونے کے لیے مبیع / مال کے اندر درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے:

١۔ بائع کی ملک میں موجود ہونا:

وہ مال بائع کی ملک میں موجود ہو، لہٰذا معدوم چیز کی بیع باطل ہے، مثلاً: درخت میں پھل لگنے

سے پہلے فروخت کردینا یا کھیتی ظاہر ہونے سے کھیتی فروخت کرنا یا فلیٹ کی تعمیر سے پہلے اس کو فروخت کرنا یا گاڑی بک کروانے کے بعد تیار ہو کر قبضہ میں آنے سے پہلے آگے فروخت کردینا وغیرہ۔

۲۔ مقدور التسلیم ہو:

یعنی مال ایسا ہو کہ بائع اس کو خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت رکھتا ہو، اب جن صورتوں میں بائع مال خریدار کے حوالہ کرنے پر قدرت نہ رکھتا ہو، مثلاً: کوئی جانور بھاگا ہوا ہو، جب تک قبضہ میں نہ آجائے یا مچھلی شکار کرنے سے پہلے فروخت کرنا، وغیرہ ناجائز وحرام ہے۔

۳۔ مبیع کی مقدار معلوم ہو:

جب تک مبیع کی مقدار معلوم نہ ہو، عقد بیع نافذ نہ ہوگا، بلکہ جہالت کی وجہ سے فاسد ہوگا، مثلاً: تقسیم سے قبل ایک وارث اپنے حصہ غیر معینہ کو فروخت کردے۔

۴۔ مال کا متقوم ہونا:

یعنی جو مال فروخت ہو رہا ہے وہ قابل قدر قیمت والا مال ہو، حقیر اور بے قیمت چیز نہ ہو۔

۵۔ شرعاً وہ مال مباح ہو:

یعنی شریعت نے اس مال سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہو، لہٰذا شراب، خنزیر، مردار اور جانور کا بہتا ہوا خون وغیرہ، ایسی چیزیں ہیں جن سے شریعت نے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی، ان کی خرید وفروخت شرعاً حرام ہے، لہٰذا ان کی بیع باطل ہے۔

۶۔ مدت کا متعین ہونا:

صحت عقد کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اگر ادھار چیز خریدی جائے تو ادا، قیمت کا وقت متعین ہو، مثلاً: مہینہ دو مہینہ یا کوئی ایسا وقت جو بائع اور مشتری دونوں کے نزدیک متعین ہو، تاکہ بعد میں اس کی بنیاد پر کوئی جھگڑا نہ ہو، اگر مدت متعین نہ ہو تو عقد فاسد ہوگا۔

۷۔ بیع بالشرط کا حکم:

خرید وفروخت میں ایسی شرط لگانا جس سے بائع یا خریدار میں سے کسی ایک کو کوئی خاص فائدہ ہو یا جس شرط کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، یہ شرعاً ناجائز ہوگا، اس سے عقد فاسد ہو جائے گا، مثلاً: میں تمہیں گھر فروخت کرتا ہوں اس شرط پر کہ تمہارے گھر میں ایک ماہ کرایہ پر رہوں گا یا یہ کہ

تمہیں مکان کی قیمت کے علاوہ مجھے ایک لاکھ قرض بھی دینا ہوگا، وغیرہ، البتہ اگر عقد میں اس طرح مشروط نہ ہو کہ اس شرط کو پورا نہ کرنے سے مال فروخت نہ کرے بلکہ ایک وعدہ کے طور پر ہو، مثلاً: میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کرایہ پر دوں گا جس میں مشتری کو اختیار ہے کہ کرایہ دے یا نہ دے، تو ایسی شرط کی وجہ سے عقد فاسد نہ ہوگا، البتہ وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا، عقد صحیح ہو جائے گا۔

مسئلہ: جو شرط عقدِ بیع کے موافق ومناسب ہو، نیز وہ شرط جس سے بائع اور خریدار میں سے کسی ایک کا فائدہ ہوتا ہو، لیکن اس قسم کی شرط لگانے کا رواج ہوگیا ہو اور اس کی وجہ سے بعد میں جھگڑا نہ ہوتا ہو تو ایسی شرط لگانا جائز ہے، جیسے: آج کل الیکٹرونکس کی خریداری میں فری سروس کی شرط، زیادہ مقدار میں مال خریدنے کی صورت میں قیمت میں خصوصی کمی کرنے کی شرط، قیمت کی وصولی کے لیے امین کے ضامن کی شرط، جو شرطِ صحیح ہے وہ معتبر ہے اگر شرط پوری نہیں ہوگی تو اس سے دوسرے فریق کو سودا ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیه عن جده قال نهی رسول الله صلی الله علیه وسلم عن بیع و شرط . (أخرجه النسائی : ۳۲/۱، موطأ ۶۹)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے بیع میں شرط لگانے سے منع فرمایا ہے

عن عائشه رضی الله تعالیٰ عنها قالت قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ! اما بعد ما بال رجال یشترطون، شروطا لیست فی کتاب الله، ما کان من شرط لیس فی کتاب الله یعنی یخالف الشرع فهو باطل، وإن کان مائة شرط قضاء الله أحق وشرط الله اوثق وانماء الولاء لمن اعتق .

(بخاری رقم : ۲۱۶۸، باب إذا شرط شروطا فی البیع)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ایک باندی خریدی تو مالک نے خلافِ شرع شرط رکھی کہ ولاء مالک بائع کے لیے ہوگا، اس پر آپ ﷺ ناراض ہوئے اور خطبہ کے بعد ارشاد فرمایا کہ لوگ بیع شراء کے وقت خلافِ شرع شرط رکھتے ہیں، اگر ایسی شرط رکھی جائے تو شرط باطل ہوگی اور جو شریعت کا حکم ہے اسی کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ولاء آزاد کرنے والے کا

حق ہے۔اس روایت سے بعض نے استدلال کیا کہ اگر کوئی ایسی شرط ہو جو مقتضاء عقد کے خلاف ہوتو شرط کو باطل قرار دے کر عقد کو نافذ سمجھا جائے گا۔

قبضہ کی تعریف:

چیز پر قبضہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ بائع خریدار کے ہاتھ میں چیز دے دے یا چیز کو خریدار کے تصرف میں اس طرح دے دے کہ خریدار اسے کسی روکاٹ کے بغیر اٹھا سکے اور ساتھ میں بائع یہ بھی کہہ دے کہ یہ چیز لے لو۔ (شامی و شرح المجلة)

قبضہ ثابت کرنے والے افعال:

مسئلہ: سودا مکمل ہو جانے کے بعد خریدار کے مندرجہ ذیل افعال سے خریدار کا چیز پر قبضہ ثابت ہو جاتا ہے۔ (شامی)

(۱) چیز کو استعمال کر لیا۔

(۲) چیز کو ضائع کر دیا یا اسے عیب دار کر دیا۔

(۳) خریدار نے بائع کو سامان کے لیے کوئی برتن یا تھیلا وغیرہ دیا اور بائع نے وہ سامان خریدار کے برتن یا تھیلے میں ڈال دیا۔

(٤) خریدے ہوئے جانور کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے ہنکایا اور جانور کچھ دور خریدار کے ساتھ چلا، گاڑیوں کا بھی یہی حکم ہے۔

(٥) خریدار کے وکیل نے چیز پر قبضہ کر لیا۔

(٦) خریدی ہوئی چیز کسی کو تحفہ میں یا قرض میں دے دی یا صدقہ کر دی یا گروی رکھ دی یا کسی عوض کے بغیر فائدہ اٹھانے کے لیے دے دی۔

(۷) بائع نے خریدار کے حکم سے مذکورہ بالا افعال کیے، مزید یہ کہ خریدار کے حکم سے وہ چیز امانت رکھوا دی یا کرایہ پر دے دی، واضح رہے کہ بائع کے پاس امانت رکھوانے سے قبضہ ثابت نہیں ہوگا، نیز قبضہ کیے بغیر خود وہ چیز کرایہ پر نہیں دے سکتا اور یہ ناجائز ہوگا۔

(۸) خریدار کے حکم سے بائع نے مال خریدار کے گھر یا گودام میں پہنچا دیا۔

(۹) خریدا ہوا مال بائع کے گودام میں ہے، لیکن خریدار نے اپنا مال بائع کے دیگر اموال سے الگ کر لیا اور اس پر اپنا نام یا کوئی مخصوص نشان لگا دیا تو اس سے بھی قبضہ مکمل ہو جاتا

ہے۔

مذکورہ تمام افعال سے چیز پر خریدار کا قبضہ ثابت ہو جائے گا۔

مسئلہ: جن جن صورتوں میں خریدار کا قبضہ ثابت ہو جائے تو ان میں قبضہ کے بعد چیز خریدار کی ضمان (Risk) میں آجائے گی اور اس کے بعد خریدار کے لیے اس چیز کو فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا جائز ہوگا اور اگر ضائع ہوگئی تو خریدار کا نقصان ہوگا۔

جن افعال سے قبضہ ثابت نہیں ہوتا:

سودا مکمل ہو جانے کے بعد خریدار کے مندرجہ ذیل افعال سے قبضہ ثابت نہیں ہوگا۔ (شامی)

(۱) چیز بائع کے پاس امانت رکھوادی۔

(۲) بائع کو بلاعوض فائدہ اٹھانے کے لیے دے دی۔

(۳) بائع یا کسی دوسرے کو کرایہ پر دے دی۔ (اور قبضہ سے پہلے کرایہ پر دینا ناجائز بھی ہے)

(٤) بائع کو وہ چیز تحفہ میں دے دی۔

(٥) وہ چیز بائع کے پاس گروی رکھ دی۔

مسئلہ: خریدار کے قبضہ سے پہلے اگر بائع فروخت کی ہوئی چیز کو خود استعمال کر لے یا گروی رکھ دے یا کرایہ پر دے دے یا امانت رکھوا دے اور خریدار نے اس کی اجازت نہیں دی، پھر وہ ضائع ہوگئی تو بائع اور خریدار کے درمیان جو سودا ہوا تھا وہ ختم ہو جائے گا اور خریدار بائع سے یا کسی دوسرے سے کوئی تاوان بھی وصول نہیں کرے گا۔

بائع کی طرف سے بھیجا ہوا مال راستہ میں ضائع ہونا:

مسئلہ: بائع کی جانب سے مال روانہ کرنے سے خریدار کا قبضہ ثابت نہیں ہوتا خواہ خریدار نے یہ کہا کہ مال میری طرف سے روانہ کر دو، میں اس کا ذمہ دار ہوں، بلکہ جب تک مال خریدار کے پاس یا اس کے گودام وغیرہ میں نہیں پہنچے گا تو اس وقت تک خریدار کا قبضہ ثابت نہیں ہوگا، لہٰذا اگر مال راستہ میں ضائع ہو گیا یا چوری ہو گیا اور خریدار تک نہیں پہنچا تو یہ بائع کا نقصان ہوگا۔ (شامی)

اسی طرح اگر خریدار بائع سے کہے کہ تم اپنے آدمی کے ہمراہ یا میرے آدمی کے ہمراہ مال روانہ کردو، لیکن خریدار اپنے آدمی کو اپنا وکیل نہ بنائے پھر بائع اپنے آدمی یا خریدار کے آدمی کے ہمراہ مال روانہ کردے اور مال راستہ میں ضائع ہوجائے تب بھی بائع کا مال ضائع ہوگا۔

البتہ اگر خریدار اپنے آدمی کو اپنا وکیل مقرر کردے اور بائع، مال خریدار کے وکیل کے حوالہ کردے تو خریدار کا قبضہ ثابت ہوکر مال خریدار کے (Risk) میں آجائے گا اور اب اگر راستہ میں ضائع ہوگا تو خریدار کا مال ضائع ہوگا اور اگر خریدار نے اس مال کی قیمت ادا نہیں کی تھی تو اس کی ادائیگی بھی اس کے ذمہ (Due) ہوگی۔ (شامی)

بیع کرتے وقت مبیع (چیز) کی حوالگی (Delivery) کو مؤخر کرنے کی شرط نہ لگانا، اسی طرح اگر ثمن کوئی سامان ہو تو اس کی ادائیگی کو بھی مؤخر کرنے کی شرط نہ لگانا۔

مسئلہ: بیع کرتے وقت مبیع کی حوالگی کو مؤخر کرنے کی شرط نہیں لگائی لیکن بیع کرنے کے بعد بائع وخریدار اس پر راضی ہوگئے کہ مبیع بعد میں حوالہ کی جائے گی یا بائع اس سے کچھ مدت فائدہ اٹھائے گا تو اس طرح کرنا جائز ہے اور اس سے بیع فاسد نہیں ہوگی۔ (شامی)

ایجاب وقبول رضامندی کے ساتھ ہو، اگر جبر کرکے ایجاب یا قبول کرایا گیا تو اس سے بیع فاسد ہوجائے گی اور بعد میں مجبور شخص کو یہ سودا ختم کرنے یا باقی رکھنے کا اختیار ہوگا۔

بیع کرتے وقت ہر ایسی شرط اور کام سے بچنا جس کا انجام بائع اور خریدار کے درمیان جھگڑا ہو۔

بیع کو سود کے شبہ سے بھی خالی کرنا۔

جس چیز کو اکیلے فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، فروخت کرتے وقت اس کا استثناء کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

کسی چیز کو فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت وصول کرنے سے پہلے وہی چیز خریدار سے کم قیمت پر خریدنا جائز نہیں۔ (جدید تجارت: ص ۳۹)

بیع فضولی کا حکم:

بیع فضولی کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دوسرے کی چیز کو اس امید پر فروخت کردے کہ وہ اس بیع پر راضی ہوجائے گا یا کسی کے لیے اس امید پر مال خریدا کہ وہ اس سودے پر راضی ہوجائے گا، یہ عقد

اصل مالک کی اجازت پر موقوف ہوگا، اگر اصل شخص نے اجازت دے دی تو نافذ ہوگا ورنہ نہیں۔ ائمہ فقہ میں سے اگر چہ امام شافعی رحمہ اللہ بیع فضولی کے باطل ہونے کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی رائے یہی ہے کہ اصل فریق کی اجازت سے بیع نافذ ہوجائے گی۔

كما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم: بعث حكيم بن حزام، يشترى له أضحية بدينار فاشترى اضحية فأربح فيها ديناراً (اي اعطى فيها ربحا ديناراً فباعها) فاشترى اخرى مكانها فجاء بالأضحية والدينار إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم. فقال عليه الصلاة والسلام: "ضح بالشاة وتصدق بالدينار."

(اخرجه ابو داؤد رقم: ٣٣٨٦، والترمذي رقم: ١٢٥٧)

یعنی نبی کریم ﷺ نے حکیم بن حزام کو ایک دینار دے کر قربانی کی بکری خریدنے بھیجا تو انہوں نے ایک بکری خریدی اور اس کے بعد ایک دینار نفع لے کر فروخت کر دی اس کے بعد ایک دینار کی دوسری بکری خرید لی پھر خدمتِ اقدس میں ایک دینار اور بکری لے کر حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بکری کی قربانی کر دو اور دینار کو صدقہ کر دو۔

ہر دو ائمہ استدلال فرماتے ہیں کہ یہ صحابی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وکیل تھے، بکری خریدنے کے بعد اس کو فروخت کیا پھر دوسری خریدی، نفع اور بکری لے کر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ نے بیع کو نافذ فرمایا اور بلا اجازت فروخت کرنے اور خریدنے پر کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ ان کے حق میں برکت کی دعا دی جس کی وجہ سے بڑے مالدار بن گئے، اس سے ثابت ہوا کہ اگر اصل مالک بیع کی اجازت دے دے تو فضولی کی بیع نافذ ہوگی۔

تحریر اور فون کے ذریعہ خرید و فروخت:

خرید و فروخت جس طرح زبان کے ذریعہ ہوسکتی ہے اسی طرح بوقتِ ضرورت مراسلت اور خط و کتابت کے ذریعہ بھی کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ بیچی جانے والی چیز اور اس کی قیمت تحریر کے ذریعہ مناسب طور پر متعین کر دی جائے اور معاملہ میں ایسا ابہام باقی نہ رہے کہ آئندہ نزاع کا اندیشہ رہ جائے، البتہ ضروری ہے کہ اس صورت میں خریدی اور بیچی جانے والی چیز سونے، چاندی کے قبیل سے نہ ہو یا دونوں کی ... ایک نہ ہو کہ ہم جنس چیزوں کی خرید و فروخت میں سامان اور

قیمت پر ایک ہی مجلس میں قبضہ ہونا ضروری ہے۔

تحریر کے ذریعہ خرید وفروخت کی بابت علامہ شامی رحمہ اللہ کا بیان ہے:

ویکون بالکتابۃ من الجانبین فإذا کتب اشتریت عبدك فلانا بکذا و کتب إلیه البائع قد بعت فھذا بیع. (ردالمحتار: ٤/ ٥١٢)

''اور خرید وفروخت کا معاملہ فریقین کی جانب سے تحریری شکل میں ہوسکتا ہے تو اگر خریدنے والے نے یہ لکھ دیا کہ میں نے اتنے میں تیرے فلاں غلام کو خرید لیا اور بیچنے والے نے بھی تحریری شکل میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو اس معاملہ پر بیع کا اطلاق ہوگا۔''

جس طرح تحریر کے ذریعہ خرید وفروخت درست ہے اسی طرح ٹیلی فون کا حکم بھی ہوگا۔ اس لیے کہ تحریر اور ٹیلی فون دونوں میں گہری مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ اسی طرح فیکس کے ذریعہ بھی خرید وفروخت کا معاملہ جائز ہوگا۔ فی زمانہ فون، فیکس اور مراسلت کے ذریعہ بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک ایک شہر سے دوسرے شہر جو خرید وفروخت کی جاتی ہے وہ جائز و درست ہے۔ (جدید فقھی مسائل: ١/ ٣٧٠)

گونگے کی خرید وفروخت کے احکام:

گونگے کے لیے اشارہ کے ذریعہ خرید وفروخت کرنا جائز ہے، اسی طرح لکھ کر بھی وہ معاملہ کرسکتا ہے، اس کے حق میں اشارہ، زبانی ایجاب وقبول کے قائم مقام ہے، بیع تعاطی کو فقہاء نے جائز قرار دیا ہے جبکہ اس میں قدرت کے باوجود زبانی ایجاب وقبول نہیں ہوتا گونگا تو زبان سے بولنے پر قادر ہی نہیں جبکہ انسان ہونے کے ناطے اس کو بھی معاملات خرید وفروخت وغیرہ کی ضرورت ہے، لہٰذا اس کے حق میں یہی اشارہ یا لکھائی کو فقہاء نے گویائی کے قائم مقام قرار دیا ہے۔

احکام کے لحاظ سے بیع کی اقسام

احکام کے لحاظ سے بیع کی پانچ قسمیں ہیں:

صحیح:

یعنی جو بیع تمام شرائط پوری ہونے کی بناء پر شرعاً جائز ہو، یہ بیع نافذ ہے۔

۲۔ بیع باطل:

یعنی جو بیع اصلاً و وصفاً مشروع نہ ہو، جیسے مردار، خنزیر، شراب وغیرہ کی خرید وفروخت، یہ بیع باطل ہے۔

بیع باطل کا حکم یہ ہے کہ خریدار چیز کا اور بائع قیمت کا مالک نہیں بنتا اور دونوں کے لیے چیز اور قیمت کا استعمال ناجائز ہے۔ اگر خریدار نے چیز پر قبضہ کرلیا تو اس پر لازم ہے کہ وہ اس چیز کو واپس کر دے، اگر وہ چیز خریدار کے پاس ضائع ہوگئی تو اس کا ضمان اس پر لازم ہوگا، اسی طرح بائع پر لازم ہے کہ وہ قیمت خریدار کو واپس کر دے ناجائز چیز فروخت کر کے آدمی اس کی قیمت کا مالک نہیں بنتا ہے۔ (در مختار و عطر الهداية)

۳۔ بیع فاسد:

یعنی بیع اصل کے لحاظ سے مشروع ہے، البتہ اوصاف کے لحاظ سے غیر مشروع ہے، جیسے: کسی غیر معین چیز کی بیع، مثلاً: بکری کی ریوڑھ میں سے کوئی غیر متعین بکری دو ہزار میں فروخت کر دی۔

بیع فاسد کا حکم:

بیع فاسد کا حکم یہ ہے کہ مبیع پر قبضہ نہ کیا جائے اور اگر بائع کی اجازت و رضامندی سے اسی مجلس میں مبیع پر قبضہ کرلیا تو خریدار اس مبیع کا مالک ہو جائے گا لیکن یہ ملکیت حرام ہوگی، قبضہ کرنے کے بعد اگر مبیع موجود ہو تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر وہ چیز ضائع ہوگئی یا اس کی ملکیت سے نکل گئی تو اس کی بازار میں رائج قیمت کے مطابق قیمت دینا واجب ہے۔ (در مختار)

مسئلہ: بیع فاسد سے جو مبیع خریدار کے قبضہ میں آئے اسے کھانا، پینا اور پہننا جائز نہیں ہے، نیز اگر اسے فروخت کر دیا اور نفع حاصل ہوا تو یہ نفع بھی حلال نہیں ہے اور اس کا صدقہ کرنا واجب ہے، البتہ بیع فاسد کے ذریعہ بائع کو جو قیمت یعنی کرنسی نوٹ حاصل ہوئے اس کے لیے ان کا استعمال جائز ہے اور ان کے ذریعہ کوئی چیز بیع صحیح کے ساتھ خرید وفروخت کرنے سے جو نفع حاصل ہوگا وہ بھی جائز ہے لیکن بیع فاسد کرنے کا گناہ ضرور ہوگا۔ (در مختار و مجله)

٤۔ بیع موقوف:

یعنی جس بیع کا حکم موقوف ہو، جیسے: بیع فضولی ہے یعنی دوسرے کے مال کو اس کی اجازت

کے بغیر اس کے نام پر فروخت کردیا ہے، اب یہ بیع شرعاً مالک کی اجازت پر موقوف ہے، جیسا کہ پہلے یہ بات تفصیل سے گزر چکی ہے۔

۵۔ بیع مکرَہ:

کسی انسان کو ڈرا دھمکا کر کسی مال کے بہت کم دام کے ساتھ فروخت کرنے پر یا زیادہ قیمت کے ساتھ خریدنے پر مجبور کیا جائے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ یہ بیع فاسد ہے بعد میں جبر و اکراہ ختم ہونے کے بعد اختیار ہوگا کہ چاہے تو بیع کو برقرار رکھے چاہے تو ختم کردے۔

٦۔ بیع مکروہ:

مثلاً: جمعہ کی پہلی اذان کے بعد سے نمازِ جمعہ ختم ہونے تک خرید وفروخت مکروہِ تحریمی ہے۔

بیع مکروہ کا حکم:

بیع مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اگر سودا مکمل ہو چکا ہے تو خریدار چیز کا مالک بن جائے گا اور ملکیت حرام نہیں ہوگی، نیز بائع قیمت کا مالک بن جائے گا لیکن بیع مکروہ کرنے کا گناہ ہوگا اس پر توبہ و استغفار کرنا چاہیے۔

اقالۂ بیع کا حکم:

''اقالہ'' کا مطلب یہ ہے کہ پہلے جو عقد بیع ہوا ہے اس کو ختم کردیا جائے، مال بائع کو واپس کردیا جائے اور قیمت مشتری کو واپس دی جائے، اس کی بعض دفعہ سخت ضرورت پڑتی ہے، مثلاً: خریدنے کے بعد خریدار قیمت ادا کرنے پر قادر نہیں رہا یا بائع کو مکان فروخت کرنے پر پشیمانی اور ندامت ہے، مثلاً: اس جیسا اس کو دوسرا مکان نہیں مل رہا یا ایک سامان خریدا گھر کا کوئی دوسرا فرد بھی وہی سامان خرید کر لے آیا جس کی وجہ سے ڈبل ہوگیا، ان حالات میں اگر طرفین پہلا سودا ختم کرنے پر رضامند ہوجائیں تو شرعاً جائز ہے اس سودا کو ختم کردیا جائے، البتہ قیمت میں کمی زیادتی جائز نہیں بلکہ جتنی قیمت ادا کی گئی تھی وہی پوری واپس کی جائے گی۔

(ردالمحتار: ٤/١٠٦، بیوع)

رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کے وقت اقالہ کرنے کی ترغیب دی اس کو باعثِ ثواب قرار دیا۔

كما روي أنه عليه السلام قال : " من اقال نادماً بيعته اقال الله عثرته يوم القيامة ."

(أخرجه ابو داؤد : ٢/٢٤٦، ابن ماجه في كتاب التجارة : ٧٤١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے بیع پر ندامت کی وجہ سے اقالہ کرلیا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی لغزشوں کو معاف فرمادیں گے۔

ہاں! اگر اقالہ کرنے سے پہلے خریدا ہوا مال تلف ہوجائے تو اب اقالہ جائز نہ ہوگا، کیونکہ اصل مدار مال پر ہے، البتہ قیمت اگر ہلاک ہوجائے اس کے بعد بھی اقالہ ہوسکتا ہے۔

خریدے ہوئے مال کو قبضہ سے پہلے دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنا:

کوئی چیز خریدنے کے بعد اس پر قبضہ سے پہلے آگے فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ جب تک قبضہ میں نہ آجائے اس کے ہلاک ہونے، گم ہونے وغیرہ کا خطرہ باقی ہے، اس طرح مشتری کے ساتھ دھوکہ ہوسکتا ہے اور جس بیع میں دھوکہ ہو وہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

لحديث ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما نهى النبي صلى الله عليه وسلم ان يباع الطعام حتى يقبض، قال ابن عباس ولا احسب كل شئ الا مثله . (بخاری رقم : ٢١٣٥)

یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ کھانے کی اشیاء کو قبضہ سے پہلے فروخت کیا جائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں میرے خیال میں ہر چیز کا یہی حکم ہے۔

وفي رواية لمسلم من اشترى طعاماً فلا يبعه حتى يستوفيه ويقبضه . (أخرجه مسلم رقم: ١٥٢٦ باب بطلان البيع قبل القبض)

گوبر اور پاخانہ کی خرید وفروخت:

گوبر کی بیع ضرورت کی وجہ سے جائز ہے، البتہ پاخانہ کی بیع جائز نہیں الا یہ کہ مٹی ملی ہوئی ہو اور مٹی غالب ہو۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ پاخانہ بالاتفاق نجاست غلیظہ ہے اور گوبر میں اختلاف ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کے ہاں نجاست غلیظہ ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے ہاں نجاست خفیفہ ہے اگر

ترجیح نجاست غلیظہ کے قول کو ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ پاخانہ زیادہ متعفن ہوتا ہے اور گوبر میں تعفن کم ہے۔

قال في التنوير وشرحه: "وبطل بيع قن ضم الى حر وذكية ضمت إلى ميتة ماتت حتف انفها (إلى قوله) ورجيع آدمي لم يغلب عليه التراب فلو مغلوبا به جاز كسرقين وبعر.

(ردالمحتار: ٤/١١٦، احسن الفتاوىٰ: ٦/٥٢١)

خون کی بیع وشراء حرام ہے:

حلال جانوروں کا وہ خون جو ذبح کے وقت نکلتا ہے اس کی خرید وفروخت جائز نہیں، اگر کسی نے فروخت کر دیا اس سے ملنے والی رقم کا استعمال جائز نہیں، اسی طرح انسانی خون فروخت کرنا اور اس کی قیمت کا استعمال کرنا بھی حرام ہے، البتہ خون کا عطیہ دینا جائز ہے۔

یعنی جس طرح بوقتِ ضرورت دوسرے کی اولاد کو دودھ پلانا جائز ہے، اسی طرح ضرورت کے وقت خون کا عطیہ دے کر جان بچانا بھی جائز ہے، بلکہ بعض اوقات حالات کے لحاظ سے ضروری بھی ہو جاتا ہے۔

شراب کی خرید وفروخت حرام ہے:

شراب نجس چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے، اس لیے اس کی تجارت کرنا اس کو استعمال کرنا دونوں حرام ہیں۔

قوله تعالىٰ: ﴿حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما اهل لغير الله به والمنخقة والموقوذة والمتردية﴾

(سورة المائدة: ٣)

تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کہ غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی کی ٹکر سے مر جائے۔

لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم بائع الخمر، وشاربها، وعاصرها، ومعتصرها، وحاملها، والمحمولة إليه.

(أخرجه الترمذي: ١٢٩٥، وابن ماجه ٣٣٨١ باب لعنت الخمر في عشرة)

ترجمہ: رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، شراب فروخت کرنے والے پر اور شراب پینے والے پر، شراب نچوڑنے والے پر، اٹھانے والے پر اور اس پر جس کے لیے اٹھا کر لے جائی گئی۔

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها أنها قالت : لما نزلت آيات سورة البقرة من اخرها، خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال حرمت التجارة في الخمر . (أخرجه البخاري رقم : ٢٢٢٦)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ جب شراب کے متعلق سورۂ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں تو آپ ﷺ لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور اعلان فرمایا: ''شراب کی تجارت حرام ہوگئی ہے۔''

جانوروں کے حمل کو بیچنے کا حکم:

بعض لوگ جانوروں کے حمل کو فروخت کر دیتے ہیں، چونکہ اس کے بارے میں بہت سارے احتمالات ہیں، مردہ پیدا ہو یا زندہ، دبلا ہو یا تروتازہ، نر ہو یا مادہ، جس میں دھوکہ ہونے کا قوی امکان ہے اور بیع میں دھوکہ حرام ہے، لہٰذا حمل کی بیع حرام ہے۔

وقد كانت هذه البيوع مشهورة في الجاهلية، يتعامل بها الناس فحرمها الإسلام لما فيها من الغدر أو الضرر، ووقوع الخلافيات والمخاصمات، وذلك مما يكره الإسلام .

(فقه المعاملات : صـ ٤٦)

شراب ملی ہوئی اشیاء کی خرید وفروخت:

شراب شرعاً حرام اور نجس ہے، جس چیز میں شراب شامل ہو جائے وہ چیز حرام اور نجس ہو جاتی ہے، اگرچہ قلیل مقدار میں کیوں نہ ہو، اس بناء پر جن ادویات میں شراب شامل ہونے کا یقین یا ظن غالب ہو اور علاج دیگر متبادل داوؤں سے ممکن ہو تو ان کی خرید وفروخت اور استعمال ناجائز ہوگا اور دیگر اشیاء کا حکم یہ ہے کہ شراب ملی ہوئی اشیاء کا استعمال حرام ہے۔

لما ورد في الحديث : فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : يا ابا عامر إن الله قد حرم الخمر فلا حاجة لنا في خمرك قال خذها فبعها فاستعن بثمنها على حاجتك فقال يا أبا عامر إن الله تعالىٰ قد

حرم شربها و بیعها و أكل ثمنها .

(المسند للإمام لاعظم : صـ ۳۷۳ كتاب البيوع)

پھل ظاہر ہونے سے پہلے باغات کو فروخت کرنا:

اس وقت عام دستور ہو گیا ہے کہ باغات کے پھلوں کو موسم کے شروع میں کسی ٹھیکیدار کے ہاتھ فروخت کردیتے ہیں، پھر وہ خریدار پھل تیار ہونے کے بعد قسط وار آگے مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے، پھل ختم ہونے تک باغ اس کے قبضہ میں رہتا ہے۔

ایسا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ معاملہ ہونے کے بعد کسی آفتِ سماویہ سے پھل تیار ہونے سے پہلے برباد ہو گیا جس سے خریدار کا نقصان ہوا، بعض دفعہ جتنے پھل کا اندازہ لگایا گیا تھا اس سے کم پیدا ہوا جس سے معاملہ کرنے والوں میں نزاع پیدا ہوا، آپ ﷺ نے ان باتوں کو دیکھ کر پھل تیار ہونے سے پہلے فروخت کرنے کو منع فرمادیا۔

كما روي بخاري و مسلم عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما قال : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع الثمار حتى يبدو صلاحها نهى البائع و المبتاع .

(أخرجه البخاري رقم : ۲۱۹٤ ومسلم ۱٥٤۳)

وفي رواية لمسلم : قال صلى الله عليه وسلم لو بعت من اخيك ثمراً، فاصابته عاهة، اي آفة و عيب، فلا يحل لك أن تاخذ منه شيئا بم تأخذ مال أخيك بغير حق . (أخرجه مسلم : ۱٥٥٤)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تو اپنے مسلمان بھائی کے ہاتھ پھل فروخت کرے اور پھل حاصل ہونے سے پہلے کسی آفت سے برباد ہو جائے تو تمہارے لیے قیمت وصول کرنا ناجائز ہوگا، کیونکہ اگر تم اس صورت میں کچھ وصول کرو گے تو اپنے بھائی کا مال ناحق کھانے والے ہو گے۔

اسی قسم کی اور بہت سی روایات ہیں جن سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک باغات میں پھول پھل کی صورت اختیار نہ کرلیں اس کی بیع بالاتفاق جائز نہیں، البتہ پھل لگنے کے بعد کھانے کے قابل ہونے سے پہلے فروخت کرنے کا کیا حکم ہے اس کے بارے میں تفصیل ہے۔

چنانچہ شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:
''بیع الثمر قبل بدو الصلاح'' کی تین صورتیں ممکن ہیں۔
پہلی صورت یہ ہے کہ بیع میں یہ شرط لگائی جائے کہ مشتری پھل کو فوراً کاٹ لے گا۔
دوسری صورت یہ ہے کہ یہ شرط لگائی جائے کہ بیع کے بعد پھل پکنے تک درخت پر لگا رہے گا۔
تیسری صورت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی شرط نہ لگائی جائے۔

امام ابی لیلیٰ اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کے نزدیک تینوں صورتیں ناجائز ہیں، کیونکہ حدیث میں مطلقاً ممانعت ہے، جبکہ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ پہلی صورت کے جواز اور دوسری صورت کے عدم جواز پر اتفاق کرتے ہیں، تیسری صورت میں اختلاف ہے، ائمہ ثلاثہ کے نزدیک یہ صورت بھی ناجائز ہے، احناف کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، لیکن مشتری پر لازم ہوگا کہ فوراً پھل کاٹ لے الا یہ کہ بائع اپنے طور پر پھل کو درختوں پر چھوڑنے کی اجازت دے دے۔

خلاصہ یہ ہے کہ پھل لگنے سے پہلے باغات فروخت کرنا کسی حال میں جائز نہیں، چاہے اس میں اس کا تعامل ہو چکا ہو یا نہ ہو، البتہ اگر بعض پھل ظاہر ہو چکا ہو اور بعض ظاہر ہونا باقی ہو تو ایسی صورت میں درخت پر چھوڑنے کی شرط کے بغیر فروخت کرے اس میں مشائخ احناف میں اختلاف ہے، ظاہر مذہب عدم جواز کا ہے۔ لیکن شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ نے فرمایا اگر اکثر پھل ظاہر ہو چکے ہوں تو تبعاً سب کی بیع جائز ہوگی۔ چنانچہ خاتمۃ المحققین علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں عموم بلویٰ کی وجہ سے اس کو بیع سلم کے ساتھ لاحق کر کے جائز قرار دینا مناسب ہے۔ البتہ بعض فقہاء نے پہلی صورت یعنی پھل لگنے سے پہلے باغ فروخت کرنے کو ضرورت اور عموم بلویٰ کی وجہ سے جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے تاہم مولانا دامت برکاتہم فرماتے ہیں: اس کو جائز قرار دینے کی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی ایسی ضرورت متحقق نہیں ہوئی جتنی کہ دوسری صورت کی ہوئی، دوسری بات یہ ہے کہ کسی حرام کو حلال قرار دینے کے لیے مطلقاً ضرورت کا تحقق کافی نہیں بلکہ کسی اصل شرعی کے تحت اس کا داخل ہونا ضروری ہے۔ اصل شرعی بعض پھل کے ظاہر ہونے کی صورت میں یہ ہے کہ جو پھل ظاہر ہو چکا ہے اسی میں اصلاً بیع منعقد ہوگی اور جو معدوم ہے ان میں تبعاً، پہلی صورت میں چونکہ سب معدوم ہے اور بیع معدوم حرام ہے، لہٰذا پھل لگنے سے پہلے باغ فروخت کرنا حرام ہے۔

(ھذا ملخص ما فی تکملۃ فتح الملھم: ۱/ ۳۸۳ ـ ۳۹٤)

حضرت اقدس مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

سوال: باغوں کے پھل کی بیع جبکہ بور میں پھل اس قدر نکلا ہو کہ کالی مرچ یا چنے کے برابر ہو تو اسے قابل انتفاع کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور ایسے وقت اس کی بیع درست ہے یا نہیں؟ نیز بعض پھل یک لخت نہیں نکلتے، مثلاً: کیلا تھوڑا تھوڑا نکلتا ہے، اس کی بیع کب درست ہوگی؟ اگر جائز نہیں ہے تو جواز کے لیے کوئی حیلہ کارگر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس سے قبل آنجناب سے استفتاء کیا گیا تھا مگر جواب مختصر ہونے کی وجہ سے خلجان دور نہ ہوا، مقامی علماء میں مسئلہ کے جواز وعدم جواز میں اختلاف چل رہا ہے، عنقریب فریقین کے دلائل آپ کے پاس بھی آئیں گے، امید ہے کہ قدرے تفصیل سے بیان فرمائیں گے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اس معاملہ میں ابتلاء عام اور اس سے احتراز کے تعسر بلکہ تعذر کے پیش نظر اہل فتویٰ پر لازم ہے کہ اس کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرما کر اس کا کوئی حل نکالیں۔

بعض اہل تقویٰ آم سے پرہیز فرماتے ہیں مگر اس پرہیز سے عامۃ المسلمین کے لیے تو کیا سبیل نکلتی خود ان کے لیے بھی کارآمد نہیں، اس لیے کہ یہ معاملہ صرف آم کے ساتھ مخصوص نہیں کہ اس کے ترک سے تقویٰ محفوظ رہے بلکہ سب پھلوں کی بیع میں یہی دستور ہے بالخصوص کیلے کا مسئلہ تو اور بھی زیادہ کٹھن ہے، اس لیے کہ اس کے تو بہت سے پودے ہی بیع کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

ایسی ضرورتِ شدیدہ کے مواقع میں عمل بالمرجوح بلکہ عمل بمذہب الغیر کی بھی گنجائش دی جاتی ہے، بلکہ بعض مواقع میں عمل بمذہب الغیر واجب ہو جاتا ہے، حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ ایسے مواقع ضرورت کو کسی بعید سے بعید تاویل کے ذریعہ کسی کلیہ شرعیہ کے تحت لاکر گنجائش نکالنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ نے بیع ثمار کی گنجائش نکالنے کی اہمیت و ضرورت پر بہت زور دیا ہے اور طویل بحث فرمائی ہے، بالآخر اس کو بیع سلم سے ملحق

قرار دے کر جواز کا فتویٰ تحریر فرمایا ہے۔

التحریر المختار میں علامہ رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تحقیق پر کوئی اعتراض نہیں کیا، مگر حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے امداد الفتاویٰ میں مندرجہ ذیل اشکالات تحریر فرمائے ہیں:

(۱) وقت عقد میں مسلم فیہ کا وجود ضروری ہے۔

(۲) مقدار ثمار متعین نہیں۔

(۳) کوئی اجل متعین نہیں۔

(٤) اجل پر مشتری بائع سے مطالبہ نہیں کرتا۔

(٥) اکثر ثمار عددی متقارب یا وزنی متماثل نہیں۔

(٦) اکثر پورا ثمن پیشگی یکمشت تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اشکالِ اوّل کا جواب تو حضرت حکیم الامۃ قدس سرہٗ نے خود ہی تحریر فرمادیا کہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بوقتِ عقد مسلم فیہ کا وجود شرط نہیں۔

ثانی سے خامس تک کے اشکالات کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اشتراط امور مذکورہ کے مفسد ہونے کی علت جہالۃ مفضیۃ الی المنازعۃ ہے، مگر بسبب تعارف احتمال نزاع منقطع ہوگیا۔

فارتفع الفساد لارتفاع العلة كما قالوا فى اشتراط الألة على الاجير والصبغ على الصباغ والخيط على الخياط .

اشکالِ سادس کا حل یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تأخیر الثمن بالاشتراط تین یوم تک اور بدونِ اشتراط زیادہ مدت تک بھی جائز ہے۔

(بداية المجتهد : ۲ / ۲۰۲، اقرب المسالك مع الشرح الصغير : ۳/۲٦۲)

ائمۂ ثلاثہ رحمہم اللہ تعالیٰ اس پر متفق ہیں کہ بوقتِ عقد وجود مسلم فیہ شرط نہیں، اس لیے مسئلہ زیر بحث میں قول مالک رحمہ اللہ تعالیٰ اختیار کرنا چاہیے۔

للزوم التلفيق على اختيار قول الشافعي رحمه الله تعالىٰ .

متعاقدین بوقتِ ضرورت تین روز سے زائد شرط تأخیر ثمن کے فساد سے احتراز کی یہ تدبیر کر سکتے ہیں کہ مشتری کل ثمن بروقت ادا کرنے پر قادر نہیں تو بائع ہی سے قرض لے کر اس کو بطورِ ثمن

واپس کردے۔

یہ تدبیر متعاقدین کے فائدہ کے لیے لکھ دی ہے، ورنہ عوام پر یہ تجسس و تحقیق لازم نہیں بلکہ یہ تعمق جائز ہی نہیں کہ باغ کی بیع مطلق ہوئی ہے یا بشرط تأخیر ثمن؟ پھر شرط تأخیر تین روز تک ہے یا اس سے زائد؟

ہاں جہاں بدونِ تجسس تین روز سے زائد شرط تأخیر محقق ہو جائے یا اس کا دستور عام معروف ہو جائے وہاں احترام لازم ہے۔

فائدہ:

علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے ابتلاء عام وضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے الحاق بالسلم کی بحث بروز البعض کے بیان میں لکھی ہے مگر اس پوری بحث سے ظاہر ہے کہ قبل بروز الثمار بلکہ قبل بروز الازہار کا بھی یہی حکم ہے، جہاں اس میں ابتلاءِ عام کی وجہ سے ضرورت شدیدہ کا تحقق ہو جائے، وہاں مذہب مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے مطابق اس کو بیع سلم میں داخل کرکے جائز قرار دیا جائے گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کا حل خود فقہ حنفی میں موجود ہے، لہٰذا دوسرے مذاہب کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ آم اور اس قسم کے دوسرے پھلوں کی بیع درختوں پر پھول آنے کے بعد ہوتی ہے، اگر بعض ثمر بھی ظاہر ہو چکا ہو تو کوئی اشکال ہی نہیں اور اگر ثمر بالکل ظاہر نہ ہوا ہو تو یہ بیع الاثمار نہیں بلکہ بیع الازہار ہے اور یہ ازہار مال متقوم منتفع بہ للدواب بل لبعض حاجات الناس بھی ہے، بالفرض فی الحال منتفع بہ نہ بھی ہو تو فی ثانی الحال منتفع بہ ہے:

> كما نقل العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ عن الإمام ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ في صحة بيع الثمار بعد البروز قبل أن تكون منتفعابها . (ردالمحتار : ٤/٤٢)

حضرات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے بیع الثمر قبل انفراک الزہر کو بالاتفاق ناجائز قرار دیا ہے مگر خود بیع الزہر کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ البتہ بیع قبل ظہور الازہار کی صورت میں عمل بمذہب مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے سوا چارہ نہیں اور یہ جب جائز ہوگا کہ اہل بصیرت اس میں ابتلاءِ عام اور

ضرورت شدیدہ کا فیصلہ کردیں۔

کیلے کے باغ کی بیع اس لیے جائز ہے کہ یہ بیع الاشجار مع الاصول ہوتی ہے، لہٰذا بیع کے بعد پیدا ہونے والے درخت مشتری کی ملک ہیں، اگر اس بیع میں مدتِ معینہ کے بعد ترک الاصول للبائع مشروط ہو تو یہ بیع فاسد ہوگی۔

وھو یثبت ملك المشتری بعد القبض فیحل اکله لمشتری الثانی.

اس سے بھی بہتر حل یہ ہے کہ یہ بیع الاشجار بدونِ الاصول ہے، اشجار موجودہ کی بیع میں کوئی کلام نہیں اور اشجار غیر موجودہ کی بیع بتبع الاشجار الموجودہ درست ہے۔

وله نظائر فی کتب المذھب خصوصا فی مبحث بیع الاثمار والازھار من رد المحتار .

شبہ: بعض حضرات کو شبہ ہوا ہے کہ بیع بشرط التبقیۃ فاسد ہے اور معاملہ معہودہ میں اگرچہ بیع مطلقاً ہے مگر عرفاً تبقیہ لازم ہے، والمعروف کالمشروط۔

جواب: بحث مذکور میں اس شبہ کا جواب ہو چکا ہے، یعنی یہ شرط مفضی الی النزاع ہونے کی وجہ سے مفسد تھی، مگر عرفِ عام سے احتمالِ نزاع منقطع ہو گیا۔

فارتفع الفساد وانظر تفصیله فی اجارات کتب المذھب ۔ فاغتنم ھذا التحریر الفرید وتشکرو ایاك والتعمق فی الدین واقتحام المضیق ولن یشاد الدین احد الاغلبه . والله سبحانه وتعالیٰ اعلم

(أحسن الفتاوی: ٤/ ٤٨٧)

بیعانہ کی رقم واپس کرنا ضروری ہے:

''بیعانہ'' جس کو عربی میں ''عربون'' کہا جاتا ہے، جائیداد یا جانور وغیرہ کے فروخت کرتے وقت یہ صورت اختیار کی جاتی ہے کہ جو قیمت طے ہوئی ہے اس کا کچھ متعین حصہ مثلاً: دس ہزار، ابھی دے دیں اگر بعد میں سودے سے مکر گئے تو یہ دس ہزار بائع کا ہو جائے گا مشتری کو واپس نہیں ملے گا، اس شرط کے ساتھ سودا کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ شرطِ فاسد ہے، اگر کسی نے ایسا کرلیا تو اس عقد کو ختم کرنا ضروری ہے اور بیعانہ بھی واپس کرنا ضروری ہے۔ اگر عقد بیع کے وقت ایسی شرط نہیں

لگائی بلکہ قیمت میں سے کچھ حصہ پہلے ادا کر دیا، بعد میں مشتری کی وجہ سے اس سودا سے انکار کرتا ہے تو بائع پر شرعاً لازم ہے کہ بیعانہ کی اس رقم کو واپس کردے اس کو روکنا حرام ہے۔

كما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم: انه نهى عن بيع العربون. وفي رواية النسائي نهى عن بيع العربان ومعناهما واحد.

(ابن ماجة رقم: ۲۱۹۲، ابو داود: ۳۵۰۲)

البتہ اس زمانہ میں بکثرت ایسا ہونے لگا ہے کہ لوگ سودا کر کے کچھ دنوں کے بعد انکار کر دیتے ہیں جس سے بائع کا نقصان ہو جاتا ہے تو تلافی نقصان کے لیے احسن الفتاویٰ میں مندرجہ ذیل تجاویز مذکور ہیں:

(۱) مشتری پوری قیمت ادا کر کے مبیع پر قبضہ کر لے پھر بائع بقدر بیعانہ کم قیمت پر مشتری سے واپس خرید لے۔

(۲) بائع مشتری کی اجازت سے مبیع کو دوسری جگہ فروخت کر دے اگر پہلی قیمت سے کم قیمت پر فروخت ہوئی تو یہ نقصان بیعانہ سے وصول کرے اور زیادہ قیمت مل گئی تو زیادتی مشتری اوّل کو واپس کر دے۔

(۳) اگر مشتری کسی طرح بھی قابو نہ آئے تو بائع حاکم مسلم کو درخواست دے وہ مال کو فروخت کر کے نمبر۲ میں مذکور تفصیل کے مطابق فیصلہ کرے۔

ومن اشترى عبدا فغاب فبرهن البائع على بيعه وغيبته معروفة لم يبع بدين البائع والابيع بدينه. (كنز الدقائق: صـ ۲٤۱)

اگر حاکم مسلم سے یہ کام نہ لیا جا سکے تو علماء کی مجلس میں پیش کر کے تفصیل مذکور کے مطابق فیصلہ کروایا جا سکتا ہے۔ (أحسن الفتاوى: ٦/٥٠١)

بیع بالشرط کا حکم:

''بیع بالشرط'' کی وہ صورت جس کو فقہاء کی اصطلاح میں ''صفقۃ فی صفقۃ'' کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی چیز متعین قیمت پر اس شرط کے ساتھ فروخت کرنا کہ خریدار بھی کوئی چیز بائع کے ہاتھ فروخت کرے گا، مثلاً: میں آپ کو یہ مکان دس لاکھ میں اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ آپ اپنا باغ مجھے پانچ لاکھ میں فروخت کریں گے۔ یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس میں شرط لگا کر

ایک عقد کو دوسرے عقد کے ساتھ معلق کر دیا گیا جبکہ ایسی شرط ممنوع ہے۔

لحديث : نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن بيع و شرط .

(أخرجه المالك في المؤطاء : ٦٩ نسائي في سنن : ٧/ ٣٠٠)

بیع عینہ کا حکم:

بیع عینہ کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص کو رقم کی ضرورت ہے وہ دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے وہ قرض دینے کی بجائے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ اپنا کوئی مال اس کے ہاتھ مہنگے دام ادھار پر فروخت کر دیتا ہے، مثلاً: اپنا مکان ہے اس کو ادھار پانچ لاکھ میں فروخت کر دیا ایک سال کے بعد ادائیگی کے وعدہ پر پھر بائع ایک شخص سے یہ مکان چار لاکھ میں نقد خرید لیتا ہے، اس طرح اس شخص کو چار لاکھ روپے ہاتھ آ گئے اور بائع کو ایک سال کے بعد پانچ لاکھ وصول ہو گا۔ شریعتِ مطہرہ نے اس صورت کو سود کھانے کا ایک حیلہ قرار دیا ہے اور اس بیع کو حرام قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہاں مکان کی خرید و فروخت مقصود ہی نہیں تھی، بلکہ یہ سودی قرضہ لینے دینے کا ایک حیلہ ہوا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے سخت وعید بیان فرمائی ہے:

عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إذا تبايعتهم بالعينة واخذتم اذناب البقر ورضيتم بالزرع، وتركتم الجهاد، سلط الله عليكم الذلة ، لا ينزعه حتى ترجعوا إلى دينكم . (أخرجه ابو داود رقم : ٣٤٦٢)

یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم بیع عینہ کرو گے اور جانوروں کی دُم کے ساتھ (یعنی ان کی دیکھ بھال میں) مشغول ہو جاؤ گے اور کھیتی باڑی ہی کو پسند کرو گے، اس طرح جہاد کو چھوڑ بیٹھو گے۔ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط فرما دیں گے اور اس وقت تک ذلت مسلط رہے گی یہاں تک کہ تم دوبارہ دین (یعنی جہاد کے راستہ) کی طرف واپس لوٹ آؤ۔

قال محمد بن الحسن : هذا البيع في قلبي كا مثال الجبال ذميم، أخترعه اكلة الربا . (ردالمحتار : ٤/ ٢٤٤)

یعنی امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بیع عینہ گناہ میں پہاڑوں سے بھی بڑی ہے اس کو سود

خوروں نے ایجاد کیا ہے۔

ومما يوئد الحرمة ما رواه البيهقي في السنن الكبرى عن ' العالية بنت ريفع " انها قالت : دخلت انا وام ولد زيد بن ارقم . وأمرأته على عائشة رضي الله تعالىٰ عنها، فقالت ام ولد زيد بن ارقم انى بعت غلاما من زيد بن ارقم بثمانمائة درهم إلى العطاء أى إلى ان يافيه عطاؤه من بيت المال ثم اشتريته منه بست مائه درهم، فقالت لها عائشة بئس ما بعت بئس مَا اشتريت ابلغى زيد بن ارقم أنه قد ابطل جهاده مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا أن يتوب .

(بیهقی سنن کبری : ٥/ ٣٣٠ مصنف عبد الرزاق ٨/ ١٨٤ ورواه أحمد فی المسند)

حضرت عالیہ بنت ایفع فرماتی ہیں کہ میں اور زید بن ارقم رضی اللہ تعالی عنہ کی ام ولد اور ان کی بیو ی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو زید بن ارقم کی ام ولد نے کہا کہ میں نے زید بن ارقم کے ساتھ ایک معاملہ اس طرح کیا ہے کہ میرا ایک غلام تھا میں نے اس کو 800 روپے میں ادھار پر اس شرط پر فروخت کیا ہے کہ بیت المال سے عطایا ملنے کے بعد قیمت ادا کرے گا، پھر میں نے ان سے وہی غلام چھ سو روپے نقد میں خرید لیا، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہا نے فرمایا تمہارا یہ بیچنا اور خریدنا بہت برا ہوا ہے یعنی حرام ہوا ہے اور فرمایا کہ میرا یہ پیغام زید بن ارقم کو پہنچا دو کہ اگر تم اس عقد سے توبہ نہیں کرو گے تو تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد جیسی جو عظیم عبادت انجام دی ہے اس کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔

آزاد انسانوں کی خرید وفروخت:

اس وقت انسانی اسمگلنگ (یعنی انسانوں کی خرید وفروخت) میں بہت سے لوگ ملوث ہیں بلکہ بہت سے بین الاقوامی گروہ باقاعدہ اس گھناؤنے کاروبار میں ملوث ہیں، اس کے سدباب کے لیے بین الاقوامی قوانین ہونے کے باوجود اس کی روک تھام مشکل ہوگئی ہے۔

شرعاً کسی بھی آزاد آدمی کی خرید وفروخت حرام ہے، عورت ہو یا مرد، جوان ہو یا بچہ، اگر کسی نے ایسا معاملہ کیا تو اس کے عوض ملنے والی رقم حرام ہے۔

ارشادِ باری تعالی ہے: ﴿ ولقد كرمنا بنى ادم ﴾

''ہم نے بنی آدم کو باعزت بنایا۔''

علامہ صابونی صاحب اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ہم نے بنی نوع انسان کو آزاد پیدا کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا غلام نہیں، اب اگر کوئی انسان اس کو گرفتار یا اغواء کر کے تاوان وصول کرتا ہے یا دوسرے کے ہاتھ فروخت کر کے قیمت وصول کرتا ہے تو شرعاً یہ نا قابل معافی جرم ہے اور وہ مال حرام ہے۔

عن أبي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: قال الله تعالىٰ أي في الحديث القدسي، ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمته. رجل اعطى بي ثم غدر اي عاهد وحلف بالله ثم نقض عهده ورجل باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استاجر أجيراً فاستوفىٰ منه ولم يعطه أجره.

(بخاري كتاب البيوع رقم: ٢٢٢٧ باب اثم من باع حرا)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں قیامت کے دن تین آدمیوں کی طرف سے مخاصمت کروں گا جس کی طرف سے میں مخاصمت کروں گا اس کو غالب کروں گا:

(۱) وہ شخص جس نے میرا نام لے کر عہد کیا، یعنی اللہ کے نام کی قسم اٹھائی اور پھر اس عہد کو توڑ دیا۔

(۲) اور وہ شخص جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے اس کی قیمت کھائی۔

(۳) اور وہ شخص جس نے کسی شخص کو بطورِ مزدور لیا اور اس سے کام کروایا لیکن اس کو اجرت نہیں دی۔

مسجد میں خرید و فروخت کرنا:

معتکف کے لیے مسجد میں اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت کی چیزیں خریدنا جائز ہے کوئی بڑی چیز ہو تو اس کو مسجد میں لانا جائز نہیں، ہاں کوئی ایسی چھوٹی چیز جو زیادہ جگہ نہیں گھیرتی مثلاً: کوئی کتاب، درہم وغیرہ تو اس کو مسجد میں لانا جائز ہے، لیکن مسجد کے اندر تجارت کرنا تو معتکف کے لیے بھی جائز نہیں اور معتکف کے علاوہ عام لوگوں کے لیے تو مسجد کے اندر ہر قسم کی خرید و فروخت

مکروہِ تحریمی ہے۔ چاہے اپنے اور گھر والوں کی ضرورت کی چیزیں ہوں یا یہ کہ کوئی تجارتی سامان اور سامان مسجد میں لاکر بیچا یا سامان لائے بغیر ہی مسجد میں بیٹھ کر خرید وفروخت کا معاملہ کیا جائے تو ہر صورت میں یہ بیع مکروہِ تحریمی ہوگی اور ایسے معاملے کو ختم کرنا شرعاً واجب ہے۔

لقوله عليه السلام : إذا رائتم من يبيع او يبتاع في المسجد فقولوا: لا اربح الله تجارتك . (أخرجه الترمذي رقم : ١٣٨١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم مسجد میں خرید وفروخت والوں کو دیکھو تو یوں بددعاء دو" کہ اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں برکت نہ دے۔"

ذلك لإن المساجد بيوت الله عزوجل، بنيت للعبادة وليست اسواقا للبيع والشراء والتجارة . (فقه المعاملات)

وعقد احتاج إليه لنفسه أو عياله فلو لتجارة كره اي وان لم يحضر السلعة واختاره قاضيخان ورجحه الزيلعي لانه منقطع إلى الله فلا ينبغي له أن يشتغل بامور الدنيا .

(وكره) اي تحريما لانها محل اطلاقهم احضار مبيع فيه كما كره فيه مبايعة غير المعتكف مطلقا نهى، (قوله مطلقا) اي سواء احتاج إليه لنفسه أو عياله أو للتجارة احضره اولا كما يعلم مما قبله ومن الزيلعي والبحر .

(ردالمحتار : ٢/٤٤٨ـ٤٤٩ كتاب الاعتكاف)

مجسمہ فروش کا حکم:

کسی جاندار کی تصویر بنانا، وہ مجسمہ، مورتی کی شکل میں ہو جس کو عربی میں "تمثال" کہا جاتا ہے یا ایسی تصویر جو کسی کپڑے، کاغذ یا دیوار وغیرہ میں بنی ہوئی ہو، چاہے ہاتھ سے بنائی ہو یا جدید مشینی آلات سے بنی ہو، جس کو عربی میں "صورۃ" کہا جاتا ہے سب حرام ہیں۔

حرمت کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ دنیا میں بت پرستی کی بنیاد تصویر سازی اور اس کا احترام بنی ہے جس کی تفصیل کتبِ تاریخ میں موجود ہے اور بت پرستی ہی شرک کی بنیاد ہے جبکہ شرک کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نا قابل معافی جرم قرار دیا ہے:

لقوله تعالیٰ : ﴿ إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ شرک کے گناہ کو ہرگز معاف نہیں فرمائیں گے اس کے علاوہ جو گناہ چاہیں گے معاف فرمادیں گے۔

اور فرمایا:

قوله تعالى : ﴿ إن الشرك لظلم عظيم ﴾

''شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

حرمت کی دوسری وجہ ''تشبہ بخلق اللہ'' یعنی صفتِ تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت اختیار کرنا، یہ بھی جرمِ عظیم ہے۔

قوله عليه السلام : إن من اشد الناس عذابا يوم القيامة المصورون . (صحيح بخارى و مسلم)

یعنی قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو دیا جائے گا۔

قال ابو ذرعه : دخلت مع ابي هريرة رضي الله تعالىٰ عنه فى دار مروان فراى فيها التصاوير فقال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول قال الله عزوجل ومن اظلم ممن ذهب يخلق خلقا كخلقى فليخلقوا ذرة وليخلقوا حبه أو ليخلقوا شعيرة .

(صحيح بخاري باب نقض الصور)

حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ مروان کے گھر داخل ہوا، انہوں نے اس کے گھر میں تصاویر دیکھیں تو آپ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میرے پیدا کرنے کی طرح پیدا کرتا ہے، پس اس کو چاہیے کہ وہ ایک ذرّہ پیدا کر کے دکھائے کوئی دانہ پیدا کر کے دکھائے یا کوئی جو پیدا کر کے دکھائے۔

وقوله عليه السلام : لا تدخل الملائكة بيتا فيه تماثيل او تصاوير . (صحيح مسلم)

یعنی جس گھر میں مورتی یا تصویر، اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

چونکہ تصویر سازی حرام ہے، اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے، لہٰذا جانداروں کی مجسمہ سازی یا فوٹوگرافی کا پیشہ، اسی طرح پروگراموں کی مووی وغیرہ بنانا اس کو پیشہ کے طور پر اختیار کرنا حرام ہے اور اس سے حاصل ہونے والی کمائی حرام ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ تصویر بنانا، بنوانا، خریدنا، فروخت کرنا، قلمی ہو یا عکسی، منقش ہو یا مجسمہ، صرف چہرہ ہو یا پوری، یہ بڑے گناہ کا کام ہے اور حرام ہے، لہٰذا اگر کسی نے تصویریں بنالیں تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ (عطر: صـ ١٦١)

عن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما قال: سمعت محمدا صلى الله عليه وسلم يقول: من صور صورة في الدنيا كلف يوم القيامة ان ينفخ الروح وليس بنافخ.

(صحيح بخاري، باب من صور صورة الخ)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں کوئی تصویر بنائے گا تو قیامت کے روز اس کو اس بات کا مکلف کیا جائے گا کہ وہ اس کے اندر روح ڈالے اور وہ اس کے اندر روح نہیں ڈال سکے گا۔

قال سعيد بن أبي الحسن: كنت عند ابن عباس إذ جاء ه رجل فقال: يا ابن عباس! انى رجل انما معيشتي من صنعة يدى وإنى اصنع هذه التصاوير، فقال ابن عباس: لا أحدثك الا ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم، سمعته يقول: من صور صورة فإن الله معذبه حتى ينفخ فيها الروح وليس بنافخ فيها ابداً. فربا الرجل ربوة شديدة واصفر وجهه، فقال: ويحك ان أبيت الا ان تصنع فعليك بهذا الشجر، كل شئ ليس فيه روح.

(صحيح بخاري، كتاب البيوع، باب بيع التصوير)

حضرت سعید بن ابی الحسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پاس تھا، اتنے میں ان کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے آکر کہا کہ اے ابن عباس! میری

معیشت کا دارو مدار میرے ہاتھ کی صنعت پر ہے اور میں یہ تصاویر بناتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے وہ بات بیان کرتا ہوں جو جناب رسول اللہ ﷺ سے میں نے سنی ہے، میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس شخص نے کوئی تصویر بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کو عذاب دینے والے ہیں یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح ڈال دے اور وہ شخص کبھی بھی اس میں روح نہیں ڈال سکے گا، یہ سن کر اس شخص نے ایک لمبی سانس لی اور اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: ارے بھائی! اگر تو بنانا ہی چاہتا ہے تو اس جیسے درخت کی تصویر بنا اور ہر اس چیز کی تصویر بنا جس میں روح نہ ہو۔

"نجش"، یعنی گاہک کو دھوکہ دینے کی حرمت:

بعض تاجر نیلامی کے وقت یا کسی کے ساتھ سودا طے کرتے وقت کچھ دلال رکھتے ہیں اور ان دلالوں کا مقصد خریداری نہیں ہوتا بلکہ وہ محض گاہک کو دھوکہ دے کر چیز کو زیادہ قیمت پر فروخت کروانے کے لیے رکھے جاتے ہیں، شرعاً یہ فعل حرام ہے۔

روي ابن عمر رضي الله عنهما : " نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن النجش ." (بخاری رقم : ٢١٤٤، مسلم : ١٥١٦)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے "نجش" سے منع فرمایا ہے، "نجش" کا مفہوم یہی ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

البتہ اگر کسی نے دلال سے دھوکہ کھا کر زیادہ قیمت پر خرید لیا تو (دھوکہ حرام ہونے کے باوجود) یہ بیع نافذ ہوگی، بعد میں خریدار کو معلوم ہونے کے باوجود سودا واپس کرنے کا حق نہ ہوگا کیونکہ اس نے خود دیکھ کر سودا طے کیا ہے۔

دوسرے کا سودا خراب کرنے کی ممانعت:

دو آدمیوں میں سودا طے ہو رہا ہو بائع نے ایک قیمت پر رضا مندی ظاہر کر دی ہو، درمیان میں ایک تیسرا آدمی آ کر کہے میں اس سے زیادہ قیمت پر خریدوں گا، اس طرح دونوں کا سودا خراب کر دے چاہے بعد میں خود خریدے یا نہ خریدے، اس کو عربی میں "سوم علی سوم الغیر" کہا جاتا ہے، دوسری صورت یہ ہے ایک شخص نے کوئی مال خرید لیا ابھی قیمت کی ادائیگی باقی تھی، ایک تیسرا شخص آ کر گاہک سے کہتا ہے کہ میں ایسی چیز اس سے کم قیمت پر دیتا ہوں، اب تم اپنا پہلا سودا ختم کر کے

اس تیسرے شخص سے خرید تا ہے، یہ دونوں فعل حرام ہیں۔

عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنهما عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال : لا يبيع بعضكم على بيع بعض، ولا يخطب بعضكم على خطبة بعض، ولا يسوم الرجل على سوم اخيه .

(أخرجه الترمذي رقم : ١٢٩٢ والبخاري ٢١٤٠ باب لا يبيع على بيع اخيه)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی بیع پر بیع نہ کرے اور دوسرے کے پیغام نکاح پر پیغام نہ بھیجے اور دوسرے کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے۔ (بخاری / ترمذی)

کتے کی خرید وفروخت کا حکم:

کتا ایک نجس جانور ہے، اس کو گھر میں رکھنا اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا۔اس کو اپنے ساتھ گھمانا پھرانا جیسا کہ مغرب زدہ طبقہ میں رائج ہے۔یہ شرعاً ممنوع ہے، اس مقصد کیلئے کتے کی خرید وفروخت بھی حرام ہے اور اس سے اجتناب کرنا بھی ضروری ہے، البتہ گھر، شکار یا کھیتی وغیرہ کی حفاظت کیلئے کتا رکھا جائے تو شرعاً اس کی اجازت ہے اور اس مقصد کیلئے خرید وفروخت بھی جائز ہے اور قیمت بھی حلال ہے۔

روي عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال : من اقتنىٰ كلب الا كلب صيد أو ما شية، نقص من اجره كل يوم قيراطان .

(بخاري ١٢/٧ اسلم ١٢٠١)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جس نے کتا پالا (سوائے شکاری اور چوکیدار کتے کے) روزانہ اس کے ثواب میں سے دو قیراط کم ہو جائیں گے۔(بخاری و مسلم)

عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال : نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن ثمن الكلب . وقال إن جاء يطلب ثمن الكلب فاملا كفه ترابا . (ابو داؤد رقم : ٣٤٨٢)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت کھانے سے منع فرمایا اور فرمایا اگر وہ قیمت کا مطالبہ کرنے آئے تو اس کے منہ پر مٹی ڈالدو۔

عن عکرمة عن ابن عباس قال : رخص رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی ثمن کلب الصید .

(مسند إمام اعظم بالرخصة فی ثمن کلب الصید)

مال پہنچنے سے پہلے اس کی بیع:

سوال: ایک تاجر مال باہر سے منگواتا ہے اور مال پہنچنے سے پہلے ہی منافع پر فروخت کر دیتا ہے، یہ منافع اس کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ مال پیشگی فروخت کرنے کا سبب یہ ہے کہ اسے خوف لاحق ہے کہ مال پہنچنے کے بعد کہیں خسارہ نہ اٹھانا پڑے۔ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

مال پر قبضہ کرنے سے قبل اس کی بیع جائز نہیں، لہٰذا یہ منافع بھی حلال نہیں۔

اس کی تصحیح کی دو صورتیں ہیں:

(۱) جہاں مال خریدا ہے وہاں کسی کو یا مال بردار کمپنی کو وکیل بالقبض بنادے، اس کے قبضہ کے بعد بیع جائز ہے۔

(۲) مال پہنچنے سے قبل بیع نہ کرے بلکہ وعدۂ بیع کرے، بیع مال پہنچنے کے بعد کرے، اس صورت میں جانبین میں سے کوئی انکار کر دے تو صرف وعدۂ خلافی کا گناہ ہوگا، بیع پر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اگر مال پہنچانے کا کرایہ خریدار ادا کرتا ہے تو اس کے اذن سے بائع کا کسی بھی مال بردار کمپنی کی تحویل میں مال دے دینا مشتری کا قبضہ شمار ہوگا، اگرچہ مشتری نے کسی خاص کمپنی کی تعیین نہ کی ہو، کمپنی کی تحویل میں آجانے کے بعد بیع جائز ہے۔

قال فی الهندیة : "إذا قال المشتری للبائع ابعث الی ابنی واستأجر البائع رجلا یحمله الی ابنه فهذا لیس بقبض والاجر علی البائع الا ان یقول استأجر من یحمله فقبض الاجیر یکون قبض المشتری ان صدقه انه استأجره ودفع إلیه وان انکر استیجاره ودفع إلیه فالقول قوله کذا فی التتارخانیة . (عالمگیریة : ۳/ ۱۹)

(أحسن الفتاوی : ٦/ ٥٢٥)

نمک لگائے ہوئے چمڑے کی خرید وفروخت:

بحمد للہ چمڑے کی تجارت میں آج بھی مسلمانوں کا بہتر تناسب ہے، چمڑا اگر ایسے جانور سے حاصل کیا گیا ہو جس کو شرعی طور پر ذبح کیا تھا تب تو کوئی قباحت نہیں، ایسے چمڑے پاک اور قابل خرید وفروخت ہیں، لیکن اگر مردار کے چمڑے ہوں تو گوشت کی طرح یہ چمڑے بھی ناپاک ہیں اور ان کی خرید وفروخت جائز نہیں، مسلمان تاجرانِ چرم کے لیے یہ پہلو ہندوستان کے ماحول میں خاصا دشوار ہے، کیونکہ ایک کثیر تعداد مشرکین کے ذبیحوں سے حاصل ہونے والے چمڑوں کی ہوتی ہے، اس لیے مسلمان تاجرانِ چرم کو چاہیے کہ ایسے چمڑوں کو اولاً ان کے مالک سے کچھ اجرت لے کر نمک لگا دیں اور پھر انہیں خرید لیں، کیوں کہ مردار کے چمڑے بھی دباغت سے پاک ہو جاتے ہیں اور دباغت کے لیے نمک لگانا کافی ہے اور دار قطنی رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

استمتعوا بجلود الميتة إذا هي دبغت ترابا كان او رمادا او ملحا او ما كان بعد ان يزيل صلاحه . (فتح القدير : ٩٥/١) وفي هذا الحديث كلام .

ترجمہ: ''مردہ جانوروں کے ایسے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ جن کو مٹی، راکھ یا نمک یا کسی اور شئی سے دباغت دے دی جائے، بشرطیکہ اس سے اس کے باقی رہنے کی صلاحیت بڑھ جائے۔''

چنانچہ فقہاء لکھتے ہیں:

ثم الدباغ هو ما يمنع عود الفساد الى الجلد عند حصول الماء فيه والدباغ على ضربين حقيقى وحكمى فالحقيقى هو ان يدبغ بشيء له قيمة كالشب والقرظ والعفص وقشور الرمان ولحى الشجر والملح وما اشبه ذالك . (البحر الرائق : ٩٩/١)

یعنی فقہاء نے فرمایا ہے کہ دباغت ایسے عمل کا نام ہے کہ پانی لگنے کے بعد چمڑا دوبارہ خراب نہ ہو۔ دباغت کی دو قسمیں ہیں دباغتِ حقیقی، دباغتِ حکمی۔

دباغتِ حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز سے دباغت دی جائے کہ جس کی کوئی قیمت ہو، جیسے شب قرظ، عفص، انار کے چھلکے، درخت کی کھال، نمک یا اسی طرح کی دوسری چیزوں سے

دباغت کا عمل انجام دیا جائے۔ (جدید فقهی مسائل : ۱/ ۳۷٤)

تلقی الجلب اور بیع حاضر لباد کی ممانعت:

عن ابي هريرة رضي الله تعالیٰ عنه قال : نهی رسول الله صلی الله عليه وسلم عن التلقی، وأن يبيع حاضر لباد .

(أخرجه البخاري رقم : ٢١٦٢، مسلم : ١٥٢١)

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو معاملات سے منع فرمایا ہے ایک ''تلقی الجلب'' جس کا مطلب یہ ہے کہ دیہاتی لوگ سامان فروخت کرنے کے لیے شہر لا رہے ہوں، کوئی شہری شہر سے باہر نکل کر ان سے سستے داموں خرید لے اور شہر میں لاکر مہنگے داموں فروخت کرے۔ دوسرا ''بیع حاضر لباد'' دیہاتی شہر میں آ کر کم قیمت پر سامان فروخت کرنے کا ارادہ رکھتا ہو اب کوئی دلال اس سے کہے آپ سامان میرے پاس رکھوائیں میں آپ کو یہ چیز زیادہ قیمت پر فروخت کر کے دیتا ہوں، ان دونوں صورتوں میں عام شہریوں کا چونکہ نقصان ہے کہ ان کو زیادہ قیمت پر خریدنی پڑے گی۔ حالانکہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ معیشت کو آزاد چھوڑا جائے کہ لوگ اپنے حساب سے فروخت کریں چنانچہ دوسری روایت میں ہے:

لا يبيع حاضر لباد، دعوا الناس يرزق الله بعضهم من بعض .

(مسلم رقم : ١٥٢٢)

مطلب یہ ہے کہ شہری دیہاتی کا دلال بن کر مال فروخت نہ کرے بلکہ ان کو اپنے طور پر فروخت کرنے دیں تا کہ اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے وسیلہ سے رزق عطا فرمائے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک دونوں قسم کی بیع مطلقاً ناجائز اور حرام ہے۔

فقہاءِ احناف فرماتے ہیں کہ یہ دلال دیہات سے لانے والے کو قیمت کے بارے میں دھوکہ دے اور اس کے فعل کی وجہ سے شہر والوں کو نقصان بھی نہ پہنچتا ہو تو اس طرح کی بیع جائز ہے اگر کوئی ایک خرابی بھی لازم آئے تو احناف کے نزدیک ایسا کرنا ممنوع ہے، مکروہِ تحریمی ہے۔

وقال البارقی فی العنايه شرح الهداية : صورته المصری اخبر بمجئی قافلة عيرة فتلقاهم واشتری الجميع وأدخله المصر يبيعه علی ما إراده، فذالك لا يخلوا اما يضر باهل البلد اولا، والثاني لا يخلو من

أن يلبس السعر على الواردين أولا، فإن كان الاوّل بان كان اهل المصر في قحط وضيق فهو مكروه باعتبار قبح التضييق المجاور المنفك، وإن كان الثاني فقد لبس السعر على الواردين فقد غر وضر وهو قبيح فيكره والا فلا بأس. (العناية: ٥/ ٢٤٠)

قرض کے ساتھ مشروط بیع کا حکم:

روي عن مالك أنه بلغه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن بيع وسلف. (أخرجه مالك في المؤطاء بلاغا)

رسول اللہ ﷺ نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے جو قرض کے ساتھ مشروط ہو۔

اس کی دوصورتیں بنتی ہیں:

(۱) خریدار یوں کہے کہ میں آپ کی چیز مثلاً: ہزار روپے میں اس شرط پر خریدوں گا کہ آپ مجھے دس ہزار روپے قرض بھی دیں گے۔

(۲) دکاندار یوں کہے کہ مثلاً: میں آپ کو یہ چیز ہزار روپے میں اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ اس ہزار کے علاوہ آپ مجھے پانچ ہزار روپے قرض بھی دیں گے۔ یہ بھی بیع فاسد ہے اور ناجائز ہے، کیونکہ اس میں قرض کے ذریعہ سے ایک گونہ نفع حاصل کیا جارہا ہے کیونکہ وہ اس لیے قیمت کم کررہا ہے کہ قرض ملے گا، تو یہ کل قرض "جر نفعا فهو ربا" کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

وروى الترمذي في سننه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لا يحل سلف وبيع ولا شرطان في بيع، ولا ربح مالم يضمن ولا بيع ما ليس عندك. (ترمذي رقم: ١٢٣٤، ابو داؤد رقم: ٣٥٠٤)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسی بیع حلال نہیں ہے جو قرض کے ساتھ مشروط ہو، اسی طرح بیع میں دو شرطیں لگانا بھی جائز نہیں اور جو چیز ضمان میں داخل نہ ہو اس سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہیں اور جو چیز ملک میں موجود نہ ہو اس کو بیچنا بھی جائز نہیں۔

بیع الوفاء کا حکم:

آج کل بعض لوگ قرض کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس طرح کرتے ہیں کہ اپنا مکان

یا دکان یا زمین اس شرط پر فروخت کر دیتے ہیں کہ (مکان کی قیمت قرض) چھ مہینے یا سال کے بعد مشتری کو واپس کر کے اپنا مکان واپس لے لیں گے پھر وہ مکان بدستور مقروض (بائع) کی ملک میں آ جائے گا۔ فقہاء اس کو "بیع الوفاء" سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس میں بائع راہن ہے اور خریدار "مرتہن" ہے، لہٰذا اس پر رہن ہی کے تمام احکام جاری ہوں گے تو خریدار (مرتہن) کے لیے اس سے نفع اٹھانا جائز نہیں اگر فائدہ اٹھایا تو سود کے حکم میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا۔ (ماخوذ از عطر هدایه)

البیع الذی تعارفه اهل زمننا احتیالا لربا وسموه بیع الوفاء وهو رهن فی الحقیقة لا یملکه ولا ینتفع به الا باذن مالك وهو ضامن لما اكل من ثمرة و اتلف من شجرة. (ردالمحتار: ۲/ ۳٤٦)

حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بیع اس وقت فاسد ہوگی جب بیع کے اندر شرط ہو اور وہ دونوں اس کو عقد لازم سمجھ رہے ہوں اگر بیع کے اندر شرط نہ ہو بلکہ بیع کے بعد واپسی کی شرط لگائی ہو تو بیع صحیح ہے البتہ اس وعدہ کا ایفاء لازم ہے۔

قال فی العلائية: قيل بيع يفيد الانتفاع به وفی إقاله شرح المجمع عن النهاية وعليه الفتوىٰ وقيل إن بلفظ البيع لم يكن رهنا ثم إن ذكرا لفسخ فيه أو قبله او زعماه غير لازم كان بيعا فاسدا ولو بعد على وجه المعياد جاز ولزم الوفاء به.

(أحسن الفتاوىٰ: ٦/ ٥٠٧ بحواله ردالمحتار: ٤/ ٣٧٤)

نیلام کے ذریعہ خرید و فروخت:

اگر کوئی شخص حلال مال کو نیلام کے ذریعہ فروخت کرنا چاہے، جس کی صورت یہ ہوتی ہے بازار میں سامان رکھ کر بولی لگائی جاتی ہے کوئی شخص ایک قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو جائے تو دوبارہ اس سے زیادہ کے لیے بولی لگائی جاتی ہے آخری قیمت والے کے ہاتھ چیز فروخت کر دی جاتی ہے۔

قال عطاء: ادركت الناس لا يرون بأسا ببيع المغانم فيمن يزيد.

(صحيح البخاری: ٤/ ٤١٥ باب بيع المزايده)

وروي الترمذي عن انس بن مالك أن رسول الله صلى الله عليه وسلم باع حلسا ـ هو ما يوضع فوق ظهر الدابة وقدحاً وقال: من يشتري هذا الحلس والقدح ؟ فقال رجل : اخذهما بدرهم . فقال النبي صلى الله عليه وسلم : من يزيد على درهم ؟ من يزيد على درهم ؟ فاعطاه رجل درهمين فباعهما منه .

(أخرجه الترمذي رقم : ١٢١٨)

آلاتِ موسیقی کی خرید وفروخت

گانے گانا، سننا، سنانا، موسیقی اور دیگر ساز باجے، سننا، سنانا یہ انسانی اخلاق کے بگاڑ کے اسباب ہیں ان کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے اس لیے گانا بجانا وغیرہ باتفاقِ امت حرام ہیں، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں ذکر کی گئی ہیں۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ومن الناس من يشتري لهو الحديث ليضل عن سبيل الله بغير علم ويتخذها هزوا ط أولئك لهم عذاب مهين ﴾

''ایک وہ لوگ ہیں کہ خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تاکہ اللہ تعالیٰ کی راہ سے بے سمجھے بوجھے گمراہ کرے اور اس کی ہنسی اڑادے ایسے لوگوں کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔''

(معارف القرآن)

اس کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ امام قرطبی نے نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ سے یہی منقول ہے کہ یہ آیت گانے بجانے اور لغو کہانیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

(قرطبی : ١٥ / ١٤)

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ عکرمہ، سعید بن جبیر، مجاہد، مکحول، عمرو بن شعیب، علی بن بذیمہ اور حسن بصری رحمہم اللہ (علماء تابعین) سے بھی یہی منقول ہے کہ یہ آیت غناومزامیر کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(تفسیر ابن کثیر : ٣/٢٤٢)

اور جو گانا تحریک اصوات اور تحسین نغمات کے ساتھ برعایت قواعد موسیقی ہو وہ بالاتفاق حرام

ہے۔ غرض یہ کہ اس آیت میں لہوالحدیث سے قصے، کہانیاں اور گانے بجانے کا سامان مراد ہے۔ جیسے باجا، بانسری، موسیقی ستار، سارنگی، خرافات و مضحکہ خیز باتیں ناول وافسانہ جات اور گانے بجانے والی لڑکیاں، یہ سب چیزیں لہوالحدیث کے عموم میں داخل ہیں اور یہ سب چیزیں باجماع صحابہ وتابعین وباتفاق ائمہ مجتہدین حرام ہیں جن کے حرام ہونے میں ذرہ بھر شبہ نہیں اور گانا بجانا تو تمام ادیان وملل میں حرام رہا ہے۔ یہ نفسانی وشہوانی چیزیں کسی دین میں کبھی بھی جائز نہیں ہوئیں اور غنا و مزامیر کی حرمت میں بے شمار احادیث آئی ہیں۔ جن کو علامہ ابن حجر مکی نے ''کتاب الزواجر'' میں ذکر کیا ہے لہٰذا اس قسم کے ہفوات وخرافات سے بھرے ہوئے ناولوں اور افسانوں کا پڑھنا بلاشبہ حرام ہے اور اگر اس سے مقصود حق کی طرف کان لگانے اور قرآن سننے سے روکنا ہو تو پھر یہ بلاشبہ کفر ہے۔ دشمنانِ اسلام کا طریقہ یہی ہے کہ حق بات کو توجہ کے ساتھ سننے سے باز رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی مشغلہ تلاش کرتے رہتے ہیں ہیں اور حق کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر ان کو حق بات سنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ناک بھوؤں چڑھاتے ہیں گویا کہ انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں اور مغرورانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے چلتے ہو جاتے ہیں۔ ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کا حال بیان فرمایا اور وعید وعذاب کی بشارت دی ہے۔

(معارف القرآن ١ ٥/ ٢٣ ٤)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واستفزز من استطعت بصوتك ﴾ (١٧ ـ ٦٤)

''اور پھسلا ان میں سے جس کو تو پھسلا سکے اپنی آواز کے ذریعہ سے۔''

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اس آیت میں شیطانی آواز سے گانا بجانا مراد ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے ابلیس!) تو انہیں کھیل تماشوں اور گانے بجانے کے ساتھ مغلوب کر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ہر وہ آواز مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف دعوت دے۔ یہی قول حضرت قتادہ رحمہ اللہ کا ہے اسی کو مفسر قرآن ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار فرمایا ہے۔

(تفسیر ابن کثیر ٣/ ٥٠)

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ والذين لا يشهدون الزور وإذا مروا باللغو مروا كراما ﴾

(۲۵۔ ۷۲)

''اور وہ بیہودہ باتوں میں شامل نہیں ہوتے اور اگر بیہودہ مشغلوں کے پاس ہو کر گزریں تو سنجیدگی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔''

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''زور'' کے معنی گانا بجانا (احکام القرآن) اور حضرت محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ بیہودہ باتوں اور گانے بجانے کی مجلس میں شامل نہیں ہوتے۔(معالم التنزیل: ٤/ ٢٥١)

ان جریر رحمہ اللہ مختلف اقوال کو جمع کر کے فرماتے ہیں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ یوں کہا جائے: وہ (رحمٰن کے بندے) کسی قسم کے باطل کام میں شریک نہیں ہوتے۔ نہ شرک میں اور نہ گانے بجانے میں اور نہ جھوٹ میں اور اس کے علاوہ بھی کسی ایسے عمل میں جس پر زور کا اطلاق ہو، شریک نہیں ہوتے۔

گانا بجانے کی حرمت پر احادیث مبارکہ:

(۱) عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله حرم الخمر والميسر والكوبة وكل مسكر حرام . (رواه احمد وابى داؤد)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شراب، جوئے، طبلہ اور سارنگی کو حرام کیا اور فرمایا ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔

(۲) عن ابى هريرة رضي الله تعالىٰ عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم قال : استماع الملاهى معصية والجلوس عليها فسق والتلذذبها كفر .

(قال في الدرالمختار وغيره اي بالنغمة) (كذا في نيل الأوطار)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گانا سننا گناہ ہے اور ان کے پاس بیٹھنا فسق ہے اور اس سے لذت حاصل کرنا کفر ہے، پھر آگے درمختار وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ گانے سے تلذذ مراد ہے اور اس کے نغمہ سے لذت

حاصل کرنا ہے۔

(۳) عن علی رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال ان النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعثت بکسر المزامیر .

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو مزامیر (یعنی گانے بجانے کے آلات) کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

(٤) وعن علی رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم نهى عن ضرب الدف و الطبل و الصوت و الزمارة .

(کذا في نيل الأوطار)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی ﷺ نے منع فرمایا ڈھول اور طبلہ بجانے اور بانسری کی آواز سننے سے۔ موجودہ زمانے کی موسیقی اسی میں داخل ہے۔

گانا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے:

(٥) وعن ابن مسعود رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ أن النبي صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال : الغناء ينبت النفاق في القلب كما ينبت الماء البقل .

(رواه البیهقی و ابن الدنیا و ابی داوٗد)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ گانا دل میں نفاق کو یوں اُگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اُگاتا ہے۔

گانا بجانے اور سننے پر سخت وعیدیں:

(٦) وعن ابي مالك الاشعری رضي اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال : رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لیشربن ناس من أمتی الخمر یسمونها بغیر اسمها یعزف علی رؤسهم بالمعازف و المغنیات یخسف اللّٰہ بهم الأرض ویجعل اللّٰہ منهم القردة و الخنازیر .

(رواه ابی داود ابن ماجه ابن حبان)

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پئیں گے اور ان کے سامنے

معازف ومزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسا دے گا اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا۔

(۷) وعن ابی هریرة رضي الله تعالیٰ عنه أن النبي صلی الله علیه وسلم قال : یمسخ قوم من أمتي في آخر الزمان قردة والخنازیر قالوا یا رسول الله المسلمون هم ؟ قال نعم یشهدون أن لا إله الا الله وانی رسول الله ویصومون . قالوا فما بالهم یا رسول الله ؟ قال اتخذوا المعازف والقینات والدفوف وشربوا هذه الاشربة فباتوا علی شرابهم ولهوهم فاصبحوا وقد مسخوا . (رواه مسدد وابن حبان)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ آخری زمانہ میں میری امت کے کچھ لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دیا جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! کیا وہ مسلمان ہی ہوں گے؟ تو ارشادفرمایا کہ ہاں بلکہ وہ اس بات کی گواہی دینے والے ہوں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ (یعنی مسلمان ہوں گے) اور روزہ بھی رکھتے ہوں گے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! پھر ان کا قصور کیا ہوگا؟ تو ارشادفرمایا کہ وہ گانے بجانے کے آلات اور گانے بجانے والی عورتوں اور ڈھول بجانے میں مشغول ہوں گے اور شراب پیا کریں گے۔ وہ رات اسی طرح شراب پینے اور دوسرے کھیل کود میں گزاردیں گے جب صبح کو اٹھیں گے تو ان کے چہرے مسخ ہو چکے ہوں گے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گانا بجانا سننا سنانا شرعاً حرام ہے اور گانا بجانے کے آلات باجا، گٹار، ہارمونیم وغیرہ اور سننے اور دیکھنے کے آلات ٹی وی، وی سی آر، وی سی ڈی، ڈی وی ڈی وغیرہ اور دیگر وہ آلات جو محض موسیقی سننے سنانے دیکھنے کے لیے ہی استعمال ہوتے ہوں اور ان سے کوئی اور کام نہ لیا جاتا ہو تو ایسے آلاتِ معاصی کی خرید وفروخت شرعاً جائز نہیں، کیونکہ یہ آلاتِ معصیت ہونے کی وجہ سے جواز کی گنجائش نہیں رکھتے۔

لما قال العلامة ابن عابدین رحمه الله : ویکره تحریماً بیع السلاح من اهل الفتنة لانه اعانة علی المعصیة ...... وقلت و إفاد

کلامهم ان ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه تحريما وإلا تنزيها، نهر، ونظيره كراهة بيع المعازف لان المعصية تقام بها .

(ردالمحتار : ۱/ ۲٦٨ كتاب السير)

وقال العلامة ابن نجيم : نظيره بيع المزامير يكره هنا إن ما قامت المعصية بعينه يكره بيعه وإلا فلا .

(البحر الرائق ٥/ ١٤٣، بتغيير يسير آخر كتاب البغاة)

حضرت اقدس مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مالا تقوم المعصية بعينه" کا مطلب یہ ہے کہ معصیت سے قبل اس چیز میں صنعت وغیرہ کے ذریعہ کوئی تغیر آ گیا ہو۔ کبیع الحديد من اهل الفتنة وبيع العصير اور ما تقوم المعصية بعينه سے مراد یہ ہے کہ بدونِ تغیر کے اسی حالت میں اس کو معصیت میں استعمال کیا جاتا ہو، كبيع السلاح من اهل البغي . نیز تحریر فرماتے ہیں مزامیر وغیرہ آلات لہو ولعب کے بارے میں مشائخ رحمہم اللہ نے بالاتفاق صاحبین رحمہم اللہ کے قول کے مطابق خرید وفروخت کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ (أحسن الفتاویٰ : ٦/ ٥٤٩)

ویڈیو، فلم اور کیسٹ کی بیع:

سادہ کیسٹوں یا جن کیسٹوں میں قرآن کریم، وعظ، تقریر یا اور کوئی دینی، مذہبی یا اصلاحی پروگرام ٹیپ ہو یا اور کوئی ایسی چیز ریکارڈ جو خلافِ شرع نہ ہو تو ان کیسٹوں کا کاروبار بلاشبہ جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے اور جن کیسٹوں میں گانے، ساز، ڈھولک، سارنگی، ہارمونیم اور میوزک وغیرہ ٹیپ ہوں، ان کیسٹوں کا کاروبار اعانتِ معصیت کی بناء پر ناجائز اور حرام ہے اور اس کی اسی لیے آمدنی بھی حلال نہیں۔

اسی طرح فلم جو کسی کاغذ یا کسی اور مادّے پر اس طرح ثبت ہو کہ اسے معمولی آنکھ سے بھی دیکھا جا سکے، اس کے تصویر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لیے اس کی تجارت ناجائز ہے اور آمدنی حرام ہے۔

البتہ ویڈیو کیسٹ کے حکم میں یہ تفصیل ہے کہ ویڈیو کیسٹ بذاتِ خود کوئی حرام چیز نہیں ہے، اس میں جائز چیز بھی بھری جا سکتی ہے اور ناجائز چیز بھی، مثلاً: بے جان اشیاء کی تصاویر، مناظر

قدرت جو بے جان ہوں، ان کی تصویر یا تعلیمی پروگرام جس میں جاندار کی تصاویر نہ ہوں، اس صورت میں ویڈیو کیسٹ اور اس میں بھری ہوئی چیز دونوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔

البتہ اگر ویڈیو کیسٹ میں کوئی غیر شرعی، منکر اور فحش پروگرام محفوظ کیا جائے، مثلاً: گانے، فلم، جاندار کی تصاویر وغیرہ تو اس کا حکم بھی کیسٹ کی طرح ہے، یعنی محفوظ شدہ غیر شرعی چیز کی خرید و فروخت نا جائز ہے اور اس کی قیمت بھی حرام ہے، البتہ اصل کیسٹ کی قیمت نا جائز نہیں کہلائے گی۔

گناہ سے بچنے کے لیے ٹی وی فروخت کرنا:

آج کل لوگ اپنے گھروں میں ٹی وی رکھتے ہیں، لیکن اب اگر کسی کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق ہو جائے تو وہ کیا کرے؟ کیا اس کو دوسرے کسی کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہوگا اور اس کی قیمت اس کے لیے حلال ہوگی؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ٹی وی کا غالب استعمال چونکہ نا جائز طریقوں سے ہو رہا ہے اور وہ اس وقت بے شمار دینی اور دنیاوی خرابیوں اور مفاسد پر مشتمل ہے اس لیے اصل حکم تو یہی ہے کہ ٹی وی نہ گھر میں رکھنا جائز ہے اور نہ اس کی خرید وفروخت جائز ہے۔

تاہم موجودہ دور میں اس کا جائز استعمال بھی ممکن ہے، مثلاً: یہ کہ اس کو غیر جاندار اشیاء جیسے عمارتوں، مقامات، پارکوں، سمندروں وغیرہ کی نقل وحرکت یا طلوع وغروب وغیرہ کے مناظر اور تصاویر دیکھنے کے لیے استعمال کیا جائے یا سامان وغیرہ کی چیکنگ اور ہوائی جہاز وغیرہ کے نظام الاوقات بتلانے اور اعلانات کے لیے استعمال کیا جائے یا دیگر سیکورٹی وغیرہ کے انتظامات میں استعمال کیا جائے، لہٰذا اگر مذکورہ بالا جائز مقاصد کے لیے خریدنے والے شخص کو ٹی وی فروخت کیا جائے تو بیع جائز ہے اور اس کی قیمت بھی بلاشبہ حلال ہے۔

البتہ ٹی وی اگر ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے جس کے متعلق غالب گمان یہ ہو کہ خریدنے والا اسے نا جائز کاموں میں استعمال کرے گا تو اس کو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں گناہ ہے، کیونکہ اس میں گناہ کے کاموں میں اعانت ہے اور اس صورت میں فروخت شدہ قیمت کراہت کے ساتھ حلال ہے۔

فی خلاصة الفتاویٰ : (۳/ ۱۰۰) " وبیع الغلام الأمرد ممن یعلم انه ممن یعصی اللّٰه یکره، لانه اعانة علی معصیة ."

نیز ٹی وی فروخت کرنے کی ایک جائز صورت یہ بھی ہے کہ اس کے تمام پرزے الگ کر لیے جائیں اور ان پرزوں کو فروخت کر دیا جائے تو یہ طریقہ بھی درست ہے۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کو اس گناہِ کبیرہ سے توبہ کی توفیق ہو وہ ٹی وی کو توڑ پھوڑ کر ضائع کرے، ہاں اس میں کوئی پرزہ اس قسم کا موجود ہو جو کسی دوسرے مباح کام میں آسکتا ہو تو اس کے نکال لینے میں مضائقہ نہیں، نیز جس شخص یا کمپنی سے ٹی وی خریدا تھا قیمتِ خرید یا اس سے کم پر اسے بھی واپس کیا جا سکتا ہے۔

(أحسن الفتاویٰ : ۸/ ۳۰۶)

بھنگ اور افیون کی تجارت اور کاشت کا حکم:

بھنگ اور افیون کی کاشت اور خرید وفروخت کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس میں قدرے تفصیل ہے:

خلاصہ یہ ہے کہ بھنگ اور افیون سے متعلق دو مسئلے الگ الگ ہیں:

(۱) بھنگ اور افیون کے استعمال کا مسئلہ

(۲) بھنگ اور افیون کی زراعت وتجارت کا مسئلہ

پہلا مسئلہ جامد مسکرات جیسے: افیون وغیرہ کی اتنی مقدار جو بالفعل نشہ کرے یا اس میں ضرر شدید ہو اس کا استعمال بہر صورت ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح مقدارِ نشہ سے کم صرف لہو ولعب اور تلہی کے طور پر استعمال کرنا بھی حرام ہے، البتہ مقدارِ قلیل جو حدِ نشہ سے کم ہو کو دواء کے طور پر استعمال کرنا جائز ہے، اگرچہ اضطراری حالت نہ ہو۔

قال إبن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ تحت قوله : " ویحرم اکل البنج والحشیشة " : أقول هذا غیر ظاهر لان ما یخل العقل لا یجوزا ایضا بلا شبهة فکیف یقال انه مباح ؟ بل الصواب ان مراد صاحب الهدایة وغیره اباحة قلیله للتداوي ونحوه، ومن صرح بحرمته اراد به القدر المسکر منه، یدل علیه ما فی غایة البیان عن شرح شیخ الإسلام : " أکل قلیل السقمونیا والبنج مباح للتداوي " وما زاد علی ذلك إذا

كـان يقتل أو يذهب العقل حرام آهـ فهذا صريح فيما قلناه ومؤيد لما سبـق بـحثـنـاه مـن تـخصيص ما مرَّ من ان ما اسكر كثيره حرام قليله بـالـمـائـعات، وهكذا يقول فى غيره من الأشياء الجامدة المضرة في الـعـقـل أو غيره يحرم تناول القدر المضر منها دون القليل النافع، لان حـرمتهـا ليست لعينها بل لضررها . وفي أول طلاق البحر: من غاب عـقـلـه بـالبنج والافيون يقع طلاقه إذا استعمله للهو و إدخال الأفات قـصـداً لـكـونـه مـعـصية، وإن كان لتداوي فلا لعدمها، كذا فى فتح الـقدير . وهو صريح فى حرمة البنج والافيون لا للدواء . وفي البزازية : والتـعـليـل ينادي بحرمته لا للدواء آهـ كلام البحر. وجعل فى النهر هذا التفصيل هو الحق .

والـحاصل ان استعمال الكثير المسكر منه حرام مطلقاً كما يدل عليه كلام العناية، واما القليل فإن كان للّهو حرام، وإن اسكر منه يقع طـلاقـه لان مبـدأ استـعماله كان محظوراً وإن كان للتداوي وحصل منه اسكار فلا، فاغتنم هذا التحرير المفرد .

(ردالمحتار : ٦/٤٥٧، ٤٥٨)

وأيـضـاً قال العلامة الحصكفي فى بحث الطلاق : (أو سكران) ولو بنبيذ أو حشيش أو افيون او بنج .

قال إبن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله او افيون او بنج) الافيون مـا يـخـرج مـن الخشخاش، والبنج نبت مسبت . وصرح فى البدائع وغيـرهـا بـعـدم وقـوع الـطـلاق بـاكله معللاً بان زوال عقله لم يكن بسبب هو معصية .

والـحـق الـتـفصيل، وهو ان كان للتداوي لم يقع لعدم المعصية، وإن للهو وإدخال الآفة قصداً فينبغي ان لا يتردد فى الوقوع .

(ردالمحتار : ٣/ ٢٤٠)

دوسرا مسئلہ افیون اور بھنگ کی بیع اور زراعت کا ہے تو جس طرح افیون اور بھنگ وغیرہ جامد مسکرات کے استعمال کا حکم نصوصِ شرعیہ میں صراحۃً مذکور نہیں، اسی طرح افیون اور بھنگ وغیرہ جامد مسکرات کی زراعت وتجارت کا حکم بھی قرآن وحدیث میں صراحۃً مذکور نہیں بلکہ یہ مسئلہ مجتہد فیہا اور مبنی علی العرف ہے، لہٰذا علت حکم کے فقدان اور تبدل عرف کی وجہ سے اس کا حکم بھی بدل سکتا ہے۔

زمانِ سابق میں چونکہ افیون اور بھنگ تداوی میں بکثرت استعمال نہیں ہوتی تھی بلکہ عموماً تلہی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی اس لیے بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان کی بیع کو آلاتِ معصیت وآلاتِ لہوولعب کی بیع کے تحت داخل کر کے اسے ماتقوم بہ المعصیۃ بعینہا قرار دے کر علی الاطلاق مکروہ تحریر فرمایا ہے۔ (انظر ردالمحتار والدر المختار: ٦/٤٥٤) مگر آج کل افیون اور بھنگ دواء کے طور پر کثرت سے استعمال ہونے لگی ہیں اور علاج میں بڑی اہمیت اور شہرت حاصل کر چکی ہیں، بلکہ ضرورتِ شدیدہ کی حد تک پہنچ گئی ہے، لہٰذا ان کی بیع وزراعت قواعدِ فقہیہ کی نظر سے جائز ہے، مثلاً:

"الأمور بمقاصدها، الاحكام تتغير بتغير الزمان، الضرورات تبيح المحظورات وغير ذلك."

البتہ جس شخص کے بارے میں ظن غالب ہو کہ وہ ان کو تلہی کے طور پر استعمال کرے گا اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں، ان کی بیع زہر کی بیع کی طرح ہوگی کہ زہر فی نفسہٖ طاہر چیز ہے، پسو، کھٹمل، جوؤں وغیرہ کے لیے لوگ اسے گھروں کپڑوں وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں اور زہر کی بیع فی نفسہٖ جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر کسی کے بارے میں ظن غالب ہو کہ وہ یہ زہر خود کھائے گا اور خودکشی کرے گا تو اس کے ہاتھ بیچنا جائز نہیں۔

اسی طرح بیع السلاح فی نفسہٖ جائز بیع ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں، لیکن فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے بيع السلاح من اهل الفتنة اي الفتنة بين المسلمين اور بيع السلاح على أهل الحرب کو مکروہ کہا ہے اور اس کو اعانۃ علی المعصیۃ قرار دیا ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: وبيع سلاح من أهل الفتنة لان المعصية تقوم بعينه. (ردالمحتار: ٦/٣٩١)

وقال أيضاً: ويكره تحريماً بيع السلاح من أهل الفتنة أن علم، لأنه إعانة على المعصية، وبيع ما يتخذ منه كالحديد ونحوه يكره لأهل الحرب. (ردالمحتار: ٤/٢٦٨)

افیون اور بھنگ کی تجارت وزراعت کے عدم جواز پر احادیث خمر اور کل مسکر حرام اور اس جیسی اور حدیثوں سے استدلال درست نہیں، اس لیے کہ جن احادیث میں مسکرات کو خمر کہا گیا ہے تو ان سے مراد مسکرات مائعہ اور سیال اشربہ ہیں جیسا کہ احادیث کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

قال العلامة بدر الدين العيني فی شرح الصحيح البخاري: وقال أهل المدينة وسائر الحجازيين وأهل الحديث كلهم: كل مسكرٍ خمرٌ. فنقول: نحن لا تنازع فی هذا لان معناه كل شراب اسكر فحكمه حكم الخمر فی الحرمة وبقية الاحكام ...... وبعد ذلك يقول: وملخص الكلام بما فيه الرد على كل من رد على اصحابنا فيما قالوه من إطلاق الخمر حقيقة على النيئ من ماء العنب المشتد وعلى غيره مجازاً او تشبيهاً أبو عمرو القرطبي والخطابي والبيهقي وغيرهم بما رواه الطحاوي عن إبن عباس رضي الله تعالی عنه بإسنادٍ صحيح قال: حرمت الخمر بعينها والمسكر من كل شراب.

(عمدة القاري شرح صحيح البخاري: ٢١/١٧٣،١٧٤)

اسی طرح محرمین اور مانعین افیون کی حرمت پر ایک اور حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں:

"كل ما اسكر كثيره فقليله حرام."

لیکن وہ روایت بھی مائع مسکرات یعنی اشربہ کے ساتھ خاص ہے۔

قال محمد: أخبرنا أبو حنيفة عن حماد عن إبراهيم (النخعي) قال: ما أسكر كثيره فقليله حرام، خطأ من الناس، إنما أرادوا السكر حرام من كل شراب قال محمد: وهو قول أبي حنيفة.

(كتاب الأثار: ١٨٢)

قال الشيخ ظفر أحمد العثماني رحمه الله تعالی: وليس مراد

النخعي القدح في الرواية لان الراوية صحيحة كما منذكره بل المراد أن الناس تأولوا على غير تأويله فجعلوا كل ما اسكر كثيره حراماً قليله سواء كان خمراً او غير خمر، وإنما هو مختص بالخمر، والصحيح على العموم هو أن السكر حرام من كل شراب خمراً كان أو غير خمرٍ . (إعلاء السنن : ٣٦/١٨)

اور اس روایت کی طرح علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو اشربہ یعنی مائع مسکرات کے ساتھ خاص کیا ہے۔

قال إبن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله قال محمد) أقول : والظاهر أن هذا خاص بالأشربة المائعة دون الجامد كالبنج والأفيون فلا يحرم قليلها بل كثيرها المسكر، وبه صرح إبن حجر الهيثمي في التحفة وغيره، وهو مفهوم من كلام ائمتنا لأنهم عدوها من الأدوية المباحة وإن حرم السكر منها بالإتفاق كما نذكره . ولم نر احداً قال بنجاستها ولا بنجاسة نحو الزعفران مع أن كثيره مسكر، ولم يحرموا اكل قليله أيضاً، ويدل عليه أنه لا يحد بالسكر منها كما يأتي، بخلاف المائعة فإنه يحد، ويدل عليه أيضاً قوله في غرر الافكار، وهذا الأشربة عند محمد و موافقيه كخمر بلا تفاوت في الأحكام وبهذا يفتى في زماننا آهـ فخص الخلاف بالاشربة، وظاهر قوله بلا تفاوت أن نجاستها غليظة فتنبه لكن يستثنىٰ منه الحد فإنه لا يجب إلا بالسكر، بخلاف الخمر .

والحاصل أنه لا يلزم من حرمة الكثير المسكر حرمة قليله ولا نجاسته مطلقاً إلا في المائعات لمعنى خاص بها، أما الجامدات فلا يحرم منها إلا الكثير المسكر، ولا يلزم من حرمته نجاسته كالسمّ القاتل فإنه حرام مع أنه طاهر، هذا ما ظهر لفهمي القاصر .

(ردالمحتار : ٤٥٥/٦)

وأيضا قال: اقول: المراد بما اسكر كثيره الخ من الاشربة، وبه عبر بعضهم، والالزم تحريم القليل من كل جامد إذا كان كثيره مسكرا كالزعفران والعنبر، ولم ارمن قال بحرمتها، حتى ان الشافعية القائلين بلزوم الحد بالقليل مما اسكر كثيره خصوه بالمائع.

(ردالمحتار: ٤ / ٤٢) (ماخوذ از تبویب جامعة الرشيد)

غصب اور چوری کے مال خریدنے کا حکم:

کسی مال کے متعلق قرائن سے معلوم ہو جائے کہ یہ چوری کا مال ہے یا غصب شدہ مال ہے۔ اس کو خریدنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اور گناہ کے کام میں تعاون کرنا شرعاً ناجائز ہے۔

قوله تعالیٰ: ﴿ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان ﴾

(سورة المائدة: ٢)

گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون مت کرو۔

قوله عليه السلام: من اشترى سرقة، وهو يعلم أنها سرقة، فقد اشترك في اثمها وعارها. (جمع الفوائد)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے جانتے ہوئے چوری شدہ مال خریدا وہ بھی چور کے ساتھ اس کے گناہ اور عار میں شریک ہوگا۔

اگر کسی شخص نے غلط فہمی میں مال خریدا تو بعد میں حقیقت واضح ہونے کے بعد وہ مال اصل مالک کو واپس کیا جائے اور ادا کردہ قیمت بائع (چور/غاصب) سے واپس لی جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله: ولو ظهر غير حلال اي مسروقا أو مغصوبا يرجع عليه المشترى.

(ردالمحتار: ٤/١٠٦ كتاب البيوع)

وقال ملك العلماء العلامة الكاساني رحمه الله: ولو باع السارق المسروق من انسان او ملك منه بوجه من الوجوه فإن كان قائما فلصاحبه أن يأخذ لانه عين ملكه وللمأخوذ منه ان يرجع

بالضمان على السارق . (بدائع الصنائع : ٥/ ٨٥ كتاب البيوع)

حکومت کا ضبط کردہ مال خریدنے کا حکم:

اسی طرح کسٹم والے یا حکومت کے دیگر کارندے لوگوں کے مختلف اموال ناحق اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں، بعد میں بذریعہ نیلام سستے دام فروخت کردیتے ہیں چونکہ ان اموال پر حکومت کا قبضہ ظلم ہے، لہٰذا علم ہوتے ہوئے ان اموال کو خریدنا جائز نہیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : لا يحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفس . قلت : وكل مال ممنوع حكمه حكم مال مسلم .

(أحسن الفتاوى : ٨/ ٩٣)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔

حرام مال سے خریدی ہوئی چیز کا استعمال بھی حرام ہے:

حرام طریقہ مثلاً: بینک یا انشورنس کی ملازمت یا غصب سے حاصل شدہ مال کے عوض کوئی کھانے پینے کی چیز خریدلے تو اس کا استعمال جائز ہے یا نہیں اس کا جواب یہ ہے کہ اگر عین غصب شدہ مال دے کر کوئی چیز خریدی اس کا استعمال تو بالاتفاق حرام ہے۔ اگر نقد رقم ہے تو اس میں امام کرخی رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ اگر خریدتے وقت حرام رقم کی طرف اشارہ کیا اور اسی رقم سے قیمت ادا کی تب تو خرید کردہ اشیاء حرام ہوں گی اور اگر خریدتے وقت اس رقم کی طرف اشارہ نہیں کیا یا اشارہ تو کیا لیکن قیمت اس رقم سے ادا نہیں کی تو ان حالات میں خریدی ہوئی اشیاء میں کوئی کراہت نہیں۔

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ راجح یہی ہے کہ بہر حال حرام مال سے حاصل کردہ اشیاء حرام ہیں خواہ اشارہ کیا ہو یا نہ کیا ہو اور احتیاط بھی اسی میں ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : نقل عن الحموى عن صدر الإسلام : إن الصحيح لا يحل له الاكل ولا الوطئ لان فى السبب نوع خبيث اهـ فليتأمل . (ردالمحتار : ٥/ ١٦٥)

قول کرخی رحمہ اللہ تعالیٰ قرآن وحدیث اور قیاس وعقل کے خلاف معلوم ہوتا ہے، بندہ نے اس کا صحیح محمل تلاش کرنے کی کوشش کی اور بعض دوسرے علماء محققین سے بھی دریافت کیا مگر عقدہ

حل نہ ہو سکا۔

البتہ غصب شدہ رقم کی مقدار مالک کو واپس کردے اگر مالک معلوم نہ ہو تو کسی مسکین پر صدقہ کردے تو یہ چیز حلال ہو جائے گی۔(ماخوذ از احسن الفتاوی ۸/۱۰٤)

فارمی مرغیوں کی خوراک اور گوشت کا حکم:

پولٹری فارم والے مختلف قسم کے مردار جانوروں کا خون اور دوسرے بعض اعضاء اور دوائی وغیرہ ملاکر مرغیوں کی غذا تیار کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی خوراک مرغیوں کو کھلانا اور اس خوراک کی خرید وفروخت کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ نیز اس خوراک سے پلی ہوئی مرغیوں کے گوشت کا کیا حکم ہے؟

جواب یہ ہے کہ مرغیوں کو بھی حلال اور پاکیزہ غذا کھلانا چاہیے، ایسی حرام غذا مرغیوں کو کھلانا جائز نہیں، نیز اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں، البتہ گوشت کی حرمت کے لیے یہ شرط ہے کہ ناپاک غذا کی وجہ سے گوشت میں بدبو پیدا ہو جائے ۔لیکن عام طور پر چونکہ گوشت بدبودار نہیں ہوتا اس لیے فارمی مرغیوں کا گوشت استعمال کرنا شرعاً حلال ہے۔

وقال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وتحبس الجلالة حتى يذهب نتن لحمها وقدر بثلاثة ايام لدجاجة واربعة لشاة وعشرة لابل وبقر على الاظهر ولو اكلت النجاسة وغيرها بحيث لم ينتن لحمها كما حل اكل جدى غذى بلبن خنزير لان لحمه لا يتغير وما غذى به يصير مستهلكا لا يبقى له اثر .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله : (قوله حلت) وعن هذا قالوا لا بأس باكل الدجاج لانه يخلط ولا يتغير لحمه وروي انه عليه السلام كان يأكل الدجاج وما روي أن الدجاجة تحبس ثلاثة ايام ثم تذبح فذالك على سبيل التنزه وزيلعى . (ردالمحتار : ٥/٢١٧)

زندہ مرغی کو وزن کر کے فروخت کرنے کا حکم:

آج کل زندہ مرغی تول کر فروخت کی جاتی ہے شرعاً اس کا کیا حکم ہے جبکہ صاحب ہدایہ کی اس عبارت سے عدمِ جواز معلوم ہوتا ہے۔

ولا یمکن معرفة ثقله بالوزن لانه یخفف نفسه مرة ویثقل اخری

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مرغی کے سانس کی وجہ سے اس کے وزن میں کوئی معتد بہ فرق نہیں آتا لہذا جہالت یسیرہ ہے جو مفضی الی المنازعۃ نہیں نیز اس طرح خرید وفروخت کے عرف عام ہوجانے کی وجہ سے اس میں نزاع کا احتمال نہیں اس لیے یہ بیع جائز ہے۔ (أحسن الفتاویٰ: ٦/٤٩٧)

انسانی بالوں کی خرید وفروخت:

بعض عورتیں اپنے بالوں کے حسن میں اضافہ کرنے کے لیے دوسری عورتوں کے بال لے کر اپنے بالوں کے ساتھ ملا لیتی ہیں شرعاً یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ حدیث میں ایسا کرنے والیوں پر لعنت وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: یا رسول اللہ (ﷺ) میری بچی کو بخار لاحق ہوا جس کی وجہ سے سر کے بال ٹوٹ کر کم ہو گئے اب اس کی شادی کرنے کا ارادہ ہے تو کیا میں کسی عورت کے بال لے کر اس کے بالوں میں ملا لوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"لعن اللّٰه الواصلة والمستوصلة." (أخرجه البخاري: ٥٩٣٧)

یعنی اللہ تعالیٰ نے "واصلہ" اور "مستوصلہ" دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

"واصلہ" کا معنی ہے جو عورت اپنے بال کاٹ کر فروخت کرے۔

"مستوصلہ" جو دوسرے کے بال خرید کر اپنے بالوں میں ملا لے۔

شرعاً یہ فعل ممنوع اور باعثِ لعنت اس لیے ہے کہ اس میں:

(۱) دھوکہ دہی کے ذریعہ اپنے آپ کو جوان اور حسین ظاہر کیا جاتا ہے۔

(۲) اجنبی مرد بھی یہ بال دیکھیں گے جبکہ شرعاً اجنبیہ عورت کے بال دیکھنا یا اجنبی مرد کو اپنے بال دکھانا جائز نہیں۔

قوله تعالیٰ: ﴿ولا یبدین زینتهن الا لبعولتهن﴾

اس لیے بالوں کی خرید وفروخت بھی ناجائز اور حرام ہے۔

البتہ کسی جانور کے بال ہوں تو اس کو خریدنا اور اپنے بالوں میں ملانا جائز ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه: تحت (قوله وشعر الانسان)

ولا یجوز الانتفاع به لحدیث لعن الله الواصلة و المستوصلة وانما یرخص فیها تتخذ من الوبر فیزید فی قرون النساء وذوائبهن هدایة .

(ردالمحتار: ٤ / ١٠٥)

تجارت میں منافع کی مقدار متعین نہیں:

شریعتِ مقدسہ نے تجارت میں مال میں منافع حاصل کرنے کی کوئی خاص حد متعین نہیں کی کہ کوئی مال خرید کر آپ صرف اتنے فیصد نفع لے کر فروخت کر سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔ بلکہ اس کو عاقدین پر چھوڑ دیا کہ وہ باہمی رضا مندی سے جس طرح چاہیں معاملہ طے کر لیں، البتہ اس حد تک منافع لینا جس سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہو یا لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا خلافِ مروّت ہے، اس لیے حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ وہ ناجائز منافع خوری پر قابو پانے کے لیے مناسب اقدام کرے۔

ہاں البتہ مال کی بے جا تعریف کرنا یا عیب چھپانا یا نقلی اور جعلی مال کو اصلی ظاہر کر کے دھوکہ دے کر زیادہ رقم وصول کرنا یہ گناہِ عظیم ہے۔

قال العلامة علی حیدر رحمه الله : " وجاء تعریف البیع فی کثیر من الکتب الفقهیه بأنه مبادلة المال بالمال بالرضاء .

(درد الحکام شرح مجلة الأحکام : ١/١٠٦)

غبن فاحش کا مسئلہ:

اگر بائع نے کسی بھی طریقہ سے مشتری کو دھوکہ نہیں دیا بلکہ ویسے دوگنی سہ گنی قیمت وصول کر لی بعد میں مشتری کو اس کا علم ہو جاتا ہے اب کیا اس کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ معاملہ ختم کرے؟ تو جمہور کی رائے یہ ہے کہ چونکہ بائع نے کسی قسم کا دھوکہ نہیں دیا صرف زیادہ قیمت وصول کر کے خلافِ مروت کام کیا تو شرعاً مشتری کو سودا ختم کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام مالک رحمہ اللہ کی رائے:

البتہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک مندرجہ ذیل صورتوں میں سودا ختم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

(۱) عاقدین بالغ ہوں وہ کسی نابالغ کی طرف سے وصی یا وکیل ہو تو نابالغ کے حق کو

بچانے کے لیے رد کا اختیار حاصل ہوگا۔

(۲) مشتری نے بائع سے کہا ہو کہ آپ جتنے میں عام لوگوں کو بیچتے ہیں مجھے بھی اتنی ہی قیمت پر دیں اس کے باوجود بائع نے زیادہ قیمت وصول کی۔

(۳) مشتری نے کہا بازاری قیمت پر دیدیں بائع نے بازاری قیمت سے دوگنی قیمت وصول کر لی ان تینوں صورتوں میں حقیقت معلوم ہونے کے بعد مال واپس کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ بشرطیکہ مال موجود ہو۔ (فقه المعاملات للصابونی)

البتہ اگر بیع کے وقت یہ شرط رکھے کہ دھوکہ نہ دیں تو اس صورت میں اگر دھوکہ ثابت ہو جائے تو جمہور کے نزدیک بھی رد کا حق حاصل ہوگا لیکن یہ خیارِ شرط کی وجہ سے ہوگا نہ غبن کی وجہ سے۔

عیب دار چیز عیب بتائے بغیر فروخت کرنا:

دکان میں کوئی عیب دار چیز ہو تو گاہک کو عیب پر مطلع کیے بغیر فروخت کرنا سخت گناہ ہے۔

لقوله عليه السلام: من باع معيبا لم ينبه لم يزل في لعنت الله ويلعنه الملائكة.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے گاہک کو بتائے بغیر عیب دار چیز فروخت کر دی وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت میں گرفتار رہے گا۔ ایسا شخص فاسق ہو جاتا ہے۔ بعد میں عیب پر مطلع ہونے کی صورت میں خریدار کو مال واپس کرنے کا حق ہوگا، تفصیلات خیارِ عیب کے مسئلہ کے ضمن میں بیان ہوں گی۔

مرابحہ:

مرابحہ کا معنی یہ ہے کہ قیمتِ خرید بتا کر اس پر متعین نفع لے کر فروخت کیا جائے، مثلاً: دکاندار گاہک کو یہ کہے کہ یہ چیز دس روپے میں پڑی ہے اور میں آپ کو بارہ روپے میں بیچتا ہوں۔

تولیہ:

تولیہ کا معنیٰ ہے کہ جتنی قیمت پر خریدا ہے، اتنی قیمت میں فروخت کر دے مثلاً: دس کا خریدا دس میں فروخت کر دے۔

وضعیہ:

وضعیہ کا معنیٰ ہے کسی ضرورت سے قیمتِ خرید سے کم پر فروخت کرنا۔

ان تینوں قسموں میں ضروری ہے کہ بائع امانت داری اور سچائی سے کام لے اگر بعد میں جھوٹ ظاہر ہو جائے تو خریدار کو حق حاصل ہوگا کہ سودا ختم کر کے مال واپس کردے۔

مساومہ:

مساومہ یہ ہے کہ آپس کے بھاؤ تاؤ کے ذریعہ مارکیٹ ریٹ پر سودا طے کیا جائے، اس میں اگر قیمت زیادہ بھی ہو جائے تو بھی واپس کرنے کا حق نہ ہوگا جیسا کہ اوپر کے مسئلہ میں گزرا ہے، کیونکہ خریدار عاقل، بالغ شخص ہے خود دیکھ کر اس نے مال خریدا ہے، البتہ بہت زیادہ قیمت وصول کرنا خلافِ مروت ہے، مسلمان کو دوسرے مسلمان کا خیال رکھنا چاہیے۔

قسطوں پر خرید و فروخت کا حکم

قسطوں پر بیع کی حقیقت:

قسطوں پر بیع کا مطلب یہ ہے کہ جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دے دے، لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے، بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کو ادا کرے۔ لہٰذا جس بیع میں مذکورہ بالا صورت پائی جائے اس کو ''بیع بالتقسیط'' کہیں گے، چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم یا زیادہ۔ لیکن ''بیع بالتقسیط'' میں عام معمول یہ ہے کہ اس میں چیز کی قیمت بازار کی قیمت سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے، لہٰذا اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہتا تو وہ اس چیز کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے، لیکن اگر خریدار اس چیز کو ادھار خریدنا چاہے گا تو بیچنے والا اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا جب اس کو نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لیے عام طور پر ''بیع بالتقسیط'' میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

مدت کے مقابلے پر قیمت زیادہ کرنا:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کے مقابلے میں قیمت زیادہ مقرر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر قدیم اور جدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے، چنانچہ بعض علماء اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں، اس لیے کہ ثمن کی یہ زیادتی ''مدت'' کے عوض میں ہے اور جو ثمن ''مدت'' کے عوض میں دیا جائے وہ سود ہے یا کم از کم سود کے

مشابہ ضرور ہے۔ یہ زین العابدین علی بن الحسین اور الناصر، المنصور باللہ اور ہادویہ کا مسلک ہے اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ان فقہاء کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے۔ (نیل الاوطار: ۱۷۲/۵)

لیکن ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے، بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع مؤجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر متفق ہو جائیں، لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں اور اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر اتفاق کیے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہوگی، لیکن اگر عاقدین مجلس عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن پر اتفاق کر لیں تو یہ بیع جائز ہو جائے گی۔

چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيعتين في بيعة" کے تحت فرماتے ہیں:

وقد فسر بعض اهل العلم، قالوا بيعتين في بيعة ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة، و بنسيئة بعشرين، و لا يفارقه احد البيعين فإن فارقه على احدهما فلا باس إذا كانت العقدة على احد منهما .

(ترمذی، کتاب البیوع، باب نمبر ۱۸، حدیث نمبر: ۱۳۳۱)

"بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ "بیعتین فی بیعۃ" سے مراد یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ "میں یہ کپڑا تم کو نقد دس روپے میں بیچتا ہوں اور ادھار بیس روپے میں بیچتا ہوں" اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کرنے سے پہلے وہ جدا ہو گئے لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدا ہوئے تو اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی بیع جائز ہے) کیونکہ معاملہ ایک صورت پر طے ہو گیا ہے۔"

امام ترمذی رحمہ اللہ کے قول کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بیع کے ناجائز ہونے کی علت یہ ہے کہ عقد کے وقت کسی ایک صورت کی عدم تعیین سے ثمن دو حالتوں میں متردد ہو جائے گا اور یہ تردد جہالتِ ثمن کو مستلزم ہے، جس کی بناء پر بیع ناجائز ہوگئی مگر مدت کے مقابلے میں ثمن کی زیادتی ممانعت کا سبب نہیں، لہٰذا اگر عقد کے وقت ہی کسی ایک حالت کی تعیین کر کے جہالتِ ثمن کی خرابی دور کر دی جائے تو پھر اس بیع کے جواز میں شرعاً کوئی قباحت نہیں رہے گی۔

ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا بھی وہی مسلک ہے جو امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہے۔

(دیکھئے: المغنی لابن قدامة: ٤/١٧٧، المبسوط للسرخسی: ١٣/٨،
الدسوقی علی الشرح الکبیر: ٣/٥٨، مغنی المحتاج للشربینی: ٢/٣١)

اور دلائل کے اعتبار سے بھی یہ راجح ہے اس لیے کہ قرآن وحدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں اور اس بیع میں ثمن کی جو زیادتی پائی جا رہی ہے اس پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آ رہی ہے کیونکہ وہ قرض نہیں ہے اور نہ ہی یہ اموالِ ربویہ کی بیع ہو رہی ہے بلکہ یہ ایک عام بیع ہے اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے فروخت کرے اور بائع کے لیے شرعاً یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی چیز بازار کے دام پر ہی فروخت کرے اور قیمت کے تعین میں ہر تاجر کا علیحدہ اصول ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے اور اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی چیز نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچ رہا ہو، اس شخص کے لیے بالاتفاق اسی چیز کو نقد دس روپے میں فروخت کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس میں دھوکہ فریب نہ ہو اور جب نقد دس روپے میں بیچنا جائز ہے تو ادھار دس روپے میں بیچنا کیوں ناجائز ہوگا؟

چونکہ یہ مسئلہ ائمہ اربعہ کے درمیان متفق علیہ ہے اور اکثر فقہاء اور محدثین نے اس کو بیان کیا ہے اس لیے قرآن وسنت سے اس بیع کے جواز پر دلائل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس بیع کے جواز کے بعد اس سے متفرع ہونے والے مختلف مسائل پر ان شاء اللہ تفصیلی بحث کریں گے۔

دو قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین شرط ہے:

جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کیا کہ بائع کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ بھاؤ تاؤ کے وقت مختلف قیمتیں بیان کرے، مثلاً: یہ کہے کہ نقد آٹھ روپے میں اور ادھار دس روپے میں بیچوں گا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مختلف مدتوں کے مقابلے میں مختلف قیمتیں متعین کرے؟ مثلاً وہ کہے کہ ایک ماہ کے ادھار پر دس روپے میں اور دو ماہ کے ادھار پر بارہ روپے میں (اور تین ماہ کے ادھار پر چودہ روپے میں) بیچتا ہوں؟ اس بارے میں فقہاء کی کوئی عبارت تو نظر سے نہیں گزری۔ البتہ فقہاء کے سابقہ اقوال پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت بھی جائز

ہے، اس لیے کہ جب نقد اور ادھار کی بنیاد پر قیمتوں میں اختلاف جائز ہے تو پھر مدتوں کے اختلاف کی بناء پر قیمتوں میں اختلاف بھی جائز ہے۔اس لیے کہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ مختلف قیمتوں کا تذکرہ صرف بھاؤ تاؤ کے وقت ہی جائز ہے۔لیکن عقدِ بیع صرف اس وقت جائز ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ہو جائے، لہٰذا بھاؤ تاؤ میں ذکر کردہ مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی ضروری ہے۔ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔

اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرو گے تو اس کی قیمت دس روپے ہے اور اگر دو ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت بارہ روپے ہے اور تین ماہ بعد ادا کرو گے تو اس کی قیمت چودہ روپے ہے اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ مشتری ان تین شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کرلے گا تو یہ بیع بالاجماع حرام ہے اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کریں اور دوبارہ اَز سرِ نو تجدید عقد کریں۔جس میں کسی ایک شق کو وضاحت کے ساتھ متعین کریں۔

ثمن میں زیادتی جائز ہے، منافع کا مطالبہ جائز نہیں:

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اوپر اس بیع کے جواز کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس وقت ہے جب نفس ثمن میں زیادتی کر دی جائے، لیکن اگر یہ بیع اس طرح کی جائے جس طرح بعض لوگ کرتے ہیں کہ نقد بیچنے کی بنیاد پر اس چیز کی ایک قیمت مقرر کر لیتے ہیں اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس کی اصل قیمت پر اضافہ کرتے ہیں، یہ صورت سود میں داخل ہے۔مثلاً: بائع یہ کہے میں فلاں چیز تم کو آٹھ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں، لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید ادا کرنے ہوں گے۔اب اس دو روپے کو ''منافع'' کا نام دیا جائے یا کچھ اور لیکن اس کے سود ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔اس لیے کہ اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے مقرر کر دی اور یہ آٹھ روپے بیع کے نتیجے میں مشتری کے ذمہ دین ہو گئے۔ اب اس آٹھ روپے سے زیادہ مطالبہ کرنا یقیناً سود ہی ہے۔

دونوں صورتوں میں عملی فرق یہ ہے کہ پہلی صورت اس لیے جائز ہے کہ اس میں فریقین کے درمیان جن مختلف قیمتوں پر بھاؤ تاؤ ہو رہا تھا ان میں سے ایک قیمت یقینی طور پر فریقین کے اتفاق سے طے ہو جاتی ہے اور بیع مکمل ہونے کے بعد اس قیمت میں اضافہ یا کمی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور مشتری کی طرف سے قیمت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، مثلاً: اگر مشتری نے وہ چیز دس روپے میں اس شرط پر خریدی کہ ایک ماہ بعد قیمت ادا کرے گا لیکن کسی وجہ سے وہ ایک ماہ کے بجائے دو ماہ میں قیمت ادا کرے تب بھی وہ دس روپے ہی ادا کرے گا اب مدت کی زیادتی کی بنیاد پر قیمت میں زدیاتی نہیں ہوگی اور دوسری صورت اس لیے ناجائز ہے کہ اس میں قیمت تو آٹھ روپے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس میں نفع کا اضافہ کیا گیا اور اس کے بعد پھر ادائیگی میں جتنی تاخیر ہوتی جائے گی نفع میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا مثلاً: اس چیز کی اصل قیمت آٹھ روپے متعین ہوگئی اور پھر ادائیگی میں ایک ماہ کی تاخیر کی بنیاد پر دو روپے نفع کا اضافہ ہو جائے گا اور اگر مشتری نے دو ماہ بعد قیمت ادا کی تو اب چار روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور تین ماہ کی تاخیر پر چھ روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس طرح ہر تاخیر پر قیمت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، لہٰذا بیع کی پہلی صورت شرعاً جائز اور حلال ہے اور دوسری صورت ربا میں داخل ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

دَین کی توثیق اور اس کی قسمیں

چونکہ بیع مؤجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ دین ہو جاتا ہے اس لیے بائع کو مشتری سے اس دین پر کسی توثیق کا مطالبہ کرنا یا مقرر وقت پر دین ادا کرنے پر کسی گارنٹی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

رہن کا مطالبہ کرنا:

دین کی ادائیگی پر گارنٹی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک رہن رکھنا، دوسرے یہ کہ تیسرے شخص کا ضمانت دینا۔ پہلی صورت میں مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے اور بائع گارنٹی کے طور پر اس چیز کو اپنے پاس رکھ لے، لیکن اس شئی مرہون سے منتفع ہونا اس کے لیے کسی صورت میں جائز نہیں اس لیے کہ اس شئی مرہون سے منتفع ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے،

البتہ وہ چیز بائع کے پاس اسی لیے رہے گی تاکہ مشتری اس رہن کے دباؤ کی وجہ سے وقتِ مقررہ پر دین ادا کرنے کا اہتمام کرے، لہٰذا اگر مشتری وقتِ مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر بائع اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے گا، لیکن عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ لہٰذا اگر اس شئی مرہون کو بیچنے سے اتنی رقم وصول ہوئی ہو کہ بائع نے اپنا دین وصول کر لیا اور پھر بھی رقم بچ گئی تو وہ بچی ہوئی رقم مشتری کو واپس لوٹانا ضروری ہے اور جس طرح مشتری کے لیے اپنی مملوکہ اشیاء کو رہن رکھوانا جائز ہے اسی طرح ان اشیاء کی صرف دستاویزات اور کاغذات کو بھی رہن رکھوانا جائز ہے۔

ذخیرہ اندوزی کا شرعی حکم:

ذخیرہ اندوزی کو عربی زبان میں ''احتکار'' کہتے ہیں، لغوی معنی، غلہ کو اس نیت سے ذخیرہ کر لینا کہ جب مہنگا ہو جائے گا فروخت کروں گا اور شرعاً ذخیرہ اندوزی کا معنی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو انسان یا حیوان کی غذا ہو اس کو ایسے وقت میں ذخیرہ کر لینا جب شہر والوں کو اس کی ضرورت ہو، مقصد یہ ہے کہ بعد میں خوب زیادہ قیمت لے کر فروخت کروں گا، چونکہ اس سے لوگوں اور حیوانات کو تکلیف پہنچتی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے:

قوله عليه السلام : من احتكر فهو خاطی ...... اخرجه مسلم فی باب تحريم الاحتكار . ١٢٢٧

یعنی جو شخص ذخیرہ اندوزی کرے وہ سخت گناہگار ہے اور اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کے لیے پیش کرنے والا ہے۔

اکثر فقہاء نے اس کو اگرچہ صرف انسانی و حیوانی غذاؤں کے ساتھ خاص فرمایا ہے کہ انہی کو ذخیرہ کر کے تکلیف پہنچانے والے کے لیے یہ گناہ ہے۔

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے فرمایا:

" كل ما اضر بالناس حبسه فهو احتكار . "

یعنی ہر وہ ضروریاتِ زندگی کی چیز جس کی ذخیرہ اندوزی سے لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو وہ احتکار کے حکم میں داخل ہے۔ علامہ صابونی فرماتے ہیں یہی قول مزاج شریعت کے زیادہ موافق معلوم ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان کو کسی بھی طریقہ سے تکلیف پہنچانا یہ انسانیت کے خلاف ہے۔

ذخیرہ اندوزی کا شرعی حکم یہ ہے کہ انسانی اور حیوانی غذاؤں کی ذخیرہ اندوزی کرنا مکروہِ تحریمی ہے، بشرطیکہ اپنی زمین کا غلہ نہ ہو اور اس سے عام لوگوں کو ضرر پہنچتا ہو۔ (عطریہ هدایه)

لہٰذا حکومتِ وقت پر لازم ہے کہ لوگوں کو ضرر سے بچانے کے لیے ایسے نفع خوروں پر پابندی عائد کرے اور تاجر کو مال گودام سے نکال کر بازار میں فروخت کرنے کا حکم دے اور اگر حکم کے باوجود اس حرکت سے باز نہ آئے تو اس کو خاطر خواہ سزا دے اور اس کا ذخیرہ شدہ غلہ نکال کر بازار میں مناسب قیمت پر فروخت کرا دے البتہ حکومت کے لیے اس کے مال پر قبضہ کرنا جائز نہیں بلکہ فروخت کر کے قیمت اسی کو دے دی جائے۔ (فقه المعاملات للصابوني)

"قوله عليه السلام : من احتكر الطعام اربعين ليلة فقد برى من الله و برى الله منه .

(اخرجه ابن ماجه : صـ ٢٢٨ و الدارمى فى كتاب البيوع : ٢/٢٤٩)

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت:

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے استعمال کا حکم معلوم ہو جائے۔

اعضاء کی پیوند کاری کی چار صورتیں ہیں:

(1) کسی دوسرے انسان کا کوئی جز، آنکھ، دل، گردہ وغیرہ کی پیوند کاری کی جائے۔

(2) اپنے جسم کا گوشت یا کھال کے ایک حصہ کو لے کر دوسرے حصہ میں پیوند کر دیا جائے۔

(3) دوسرے انسان کا خون استعمال کیا جائے۔

(4) کسی جانور کی آنکھ وغیرہ کی پیوند کاری کی جائے۔

انسانی اعضاء کی پیوند کاری کی اکثر صورت جو آج کل ہسپتالوں میں پیش آرہی ہے اور جس کے لیے اپیلیں کی جارہی ہیں، وہ یہ کہ جو انسان دنیا سے جارہا ہو، خواہ کسی عارضہ کے سبب یا کسی جرم میں قتل کیے جانے کی وجہ سے، اس سے اس بات کی اجازت لی جائے کہ مرنے کے بعد اس کا فلاں عضو کسی دوسرے انسان میں لگا دیا جائے گا۔

اس صورت کو عام طور پر لوگ جائز مفید سمجھتے ہیں اور یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ یہ تو سارے

اعضاء فنا ہونے والے ہیں، ان میں سے کوئی عضو کسی زندہ انسان کے کام آ جائے اور اس کی مصیبت کا علاج بن جائے تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس سے بڑھ کر بہت سے لوگ اپنے اعضاء اپنی زندگی میں ہی فروخت کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ لاوارث مردوں کے اعضاء نکال لیتے ہیں، پھر اس کو فروخت کرتے ہیں۔

چونکہ انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا محترم ہے، زندگی میں تو قابل احترام ہوتا ہی ہے لیکن مرنے کے بعد بھی اس کا احترام برقرار رہتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے پاس اس کا جسم اعضاء اور جوارح وہ اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہیں، لہٰذا اس کو اس بات کی اجازت نہیں کہ ان اعضاء کو تلف کر دے نہ ہی ان کو فروخت کرنے کی اجازت ہے۔ اسی وجہ سے خودکشی کرنے کو حرام قرار دیا اور فرمایا کہ جو خودکشی کرے گا قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا، جب انسان اپنے اعضاء کا مالک ہی نہیں تو اعضاء کو نہ تو وہ فروخت کر سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے، نہ اس کی وصیت کر سکتا ہے اگر کوئی وصیت کر بھی دے تو یہ وصیت غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے شرعاً باطل ہے اس پر عمل کرنا حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے انسان کے اعضاء کی پیوند کاری نا جائز ہے اس مقصد کے لیے اعضاء کی خرید و فروخت بھی حرام ہے اور اس پر ملنے والے معاوضہ کا استعمال بھی حرام ہے۔

روي عن أبي امامة بن سهل بن حنيف أن النبي صلى الله عليه وسلم داوى وجهه يوم احد بعظم بال، فيه دليل جواز المداواة بعظم بال وهذا لإن العظم لا يتنجس بالموت على اصلنا لانه لا حياة فيه الا ان يكون عظم الانسان أو عظم الخنزير فإنه يكره التداوي به لان الخنزير نجس العين فعظمه نجس كلحمه لا يجوز الانتفاع به بحال والآدمي محترم بعد موته على ما كان عليه في حياته فكما لا يجوز التداوي بشيء من الادمي الحي إكراماً له فكذلك لا يجوز التداوي بعظم الميت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كسر عظم الميت ككسر عظم الحي. (شرح السير الكبير: ۱/۸۸)

الانتفاع باجزاء الادمي لم يجز قيل للنجاسة وقيل للكرامة هو

الصحیح کذا فی جواھر الاخلاطی (عالمگیریة : ٥١/٣٥٤)

(2) اسی طرح دوسری صورت یعنی مریض کے اپنے کسی حصہ سے گوشت اتار کر دوسری جگہ چڑھانے کا معمول ہے یہ بھی ناجائز ہے۔

(3) کسی جانور کی آنکھ، دل، گردہ وغیرہ کی پیوند کاری اس شرط کے ساتھ جائز ہوگی کہ وہ کسی حلال جانور کا عضو ہو، مثلاً بکری، گائے وغیرہ اس مقصد کے لیے اعضاء کو خریدنا بھی جائز ہوگا۔

چنانچہ حنفیہ کے علاوہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی تداوی کے لیے انسان کی ہڈی کی پیوند کاری کو ناجائز فرماتے ہیں:

ونص : وإذا كسر للمرأة عظم فطار فلا يجوز إن ترفعه الا بعظم ما يؤكل لحمه ذكيا وكذلك إن سقطت سنه صارت ميتة فلا يجوز له أن يعيدها بعد ما بانت فلا يعيد من شئ غيرسن ذكى يوكل لحمه وإن رفع عظمه بعظم ميتة أو ذكى لا يؤكل لحمه أو عظم إنسان فهو كالميتة فعليه قلعه وإعادة كل صلاة صلاها وهو عليه فإن لم يقلعه جبر السلطان على قلعه . (الام : ١/٥٤)

(4) خون انسان کا جز ہے اور جب نکال لیا جائے تو نجس بھی ہے، انسان کا جز ہونے کی حیثیت سے اس کی مثال عورت کے دودھ کی ہوگی جس کا استعمال علاج کے لیے فقہاء نے جائز لکھا ہے۔ (فتاویٰ عالمگیریة طبع مصر : ٤/١١٢)

جن صورتوں میں خون کا استعمال جائز ہے اس کے لیے خون دینا بھی جائز ہے، البتہ خون فروخت کرنا جائز نہیں اگر کوئی خون خریدنے پر مجبور ہو جائے تو اضطرار کی حالت میں خریدنا تو جائز ہے لیکن فروخت کرنے والے کے لیے اس رقم کا استعمال حرام ہے۔

الکحل کی تجارت کا حکم:

الکحل کی خرید وفروخت کا شرعاً کیا حکم ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس کے استعمال کا حکم جاننا ضروری ہے اس لیے پہلے اس کے استعمال کا حکم تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

وضاحت کے لیے اسپرٹ کی ہر قسم کا حکم الگ الگ لکھا جاتا ہے، جو حکم اسپرٹ کا بیان ہوگا

وہی الکحل کا ہوگا، پھر بتایا جائے گا کہ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اسپرٹ کس قسم کا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

(۱) قسم اوّل وہ اسپرٹ جو منقیٰ، انگور یا کھجور کی شراب سے بنایا گیا ہو۔ بالاتفاق ناپاک ہے، جس دواء میں یہ ملایا گیا ہو وہ بھی ناپاک اور اس کا پینا حرام، البتہ شدید اضطراری حالت میں ایسی دواء پینے کی رخصت ہے اور شدید اضطراری حالت یہ ہے کہ ماہر معالج کا ظن غالب یہ ہو کہ اس مریض کو کسی اور دواء سے شفاء نہ ہوگی تو ایسی صورت میں اس قسم کی اسپرٹ ملی ہوئی دواء پینے کی بقدرِ ضرورت گنجائش ہے۔

ففي النهاية عن الذخيرة الاستشفاء بالحرام يجوز اذ علم أن فيه شفاء ولم يعلم دواء آخر. (البحر الرائق: ۱/۱۲۲)

(۲) قسم دوم وہ اسپرٹ جو مذکورہ بالا اشیاء کے علاوہ کسی اور چیز مثلاً: جو، آلو، شہد وغیرہ کی شراب سے بنائی گئی ہو تو اس کی طہارت وحرمت میں فقہاء کا اختلاف ہے، امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ وابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ پاک ہے اور اتنی مقدار پینا بھی حلال ہے کہ جس سے نشہ نہ ہو۔ (بشرطیکہ پینا بقصدِ لہو ولعب نہ ہو) اور امام محمد رحمہ اللہ کے نزدیک یہ نجاستِ خفیفہ ہے اور اس کی تھوڑی مقدار پینا بھی جائز نہیں، فتویٰ اگرچہ عام حالات میں امام محمدؒ کے قول پر دیا گیا ہے، مگر اسپرٹ میں چونکہ عموم بلویٰ ہے، لہٰذا جس دواء میں قسم دوم کی اسپرٹ یا الکحل ملا ہوا ہو اس کے بارے میں گنجائش ہے کہ امام اعظم وابو یوسفؒ کے قول پر عمل کر لیا جائے، اگرچہ تقویٰ اور احتیاط امام محمدؒ کے قول پر عمل کرنے میں ہے۔

(۳) قسم سوم وہ اسپرٹ جو کسی بھی شراب سے نہ بنائی گئی ہو بلکہ کسی اور پاک وحلال چیز مثلاً: منقیٰ، انگور، کھجور، آلو، جو، شہد وغیرہ سے بنائی گئی ہو، یہ بالاتفاق سب کے نزدیک پاک ہے اور جس دواء میں یہ ملائی گئی ہو وہ بھی پاک اور حلال ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل اس وقت ہے جبکہ معلوم ہو کہ اسپرٹ کس قسم کا ہے اور اگر معلوم نہ ہو کہ یہ کس قسم کا ہے تو چونکہ ناپاک ہونے کا ظن غالب نہیں، بلکہ محض شبہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ قسم اوّل سے ہو تو محض اس شبہ کی بناء پر اس کی نجاست یا حرمت کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ لہٰذا جس دواء میں ایسی اسپرٹ یا الکحل ہو جس کے بارے میں معلوم نہ ہو کہ مذکور تین قسموں میں سے کس قسم سے ہے تو ایسا دواء کے کھانے اور پینے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے کو ایسی دواء یا اسپرٹ لگ جائے اسے

ناپاک نہ کہا جائے گا، دھوئے بغیر نماز پڑھ لے تو اس کی نماز ادا ہو جائے گی۔ البتہ جو شخص ایسی اسپرٹ سے بھی اجتناب کرنے پر قادر ہو تو جس حد تک اجتناب کرے بہتر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ الکحل کی قسم معلوم ہو گی یا نامعلوم، اگر معلوم ہو تو وہ قسم استعمال کرے جس کو پاک اور حلال لکھا گیا ہے، جبکہ قسم اوّل مہنگی اور دوم وسوم ارزاں ہوتی ہے اور اگر قسم معلوم نہیں تو دواء استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور جس کپڑے اور بدن کو لگ جائے اس کو ناپاک نہیں کہیں گے دھوئے بغیر نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی۔ (ماخوذ از رجسٹر نقل فتاویٰ دارالعلوم کراچی)

اب الکحل کی خرید وفروخت کا حکم یہ ہے کہ جن صورتوں کو پاک لکھا گیا ہے اور استعمال کی گنجائش دی گئی ہے ان صورتوں میں خرید وفروخت بھی جائز ہو گی، اس کی تجارت بھی حلال ہو گی اور جن صورتوں کو ناپاک لکھا گیا ہے ان کی خرید وفروخت بھی ناجائز ہو گی۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله: الشراب لغة كل ماء يشرب واصطلاحا ما يسكر والمحرم منها اربعة ...... وصح بيع غير الخمر.

قال ابن عابدين رحمه الله: (تحت قوله صح بيع غير الخمر) اي عنده خلاف لهما في البيع والضمان لكن الفتوى على قوله في البيع.

(ردالمحتار: ٦/٤٥٤ كتاب الاشربة)

انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کا حکم:

آج کل حکومت نے انعامی بانڈز کے نام سے ایک کاروبار شروع کیا ہوا ہے جو مختلف مالیت کا ہوتا ہے اور اس کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ بانڈز حاصل کرنے کے بعد ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے قرعہ اندازی میں جو نمبر نکلتے ہیں ان کے حاملین کو زیادہ رقم دی جاتی ہے، باقی تمام ممبران کو صرف اپنی جمع شدہ رقم واپس لینے کا حق ہوتا ہے۔

شرعاً یہ کاروبار دو وجہوں سے ناجائز ہے:

1- جن کو انعام کے نام سے رقم ملتی ہے وہ سود ہے اور سود حرام ہے۔

2- ہر ممبر کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ مجھے زیادہ رقم ملے اور حقیقت میں ہر ممبر کو نہیں ملتی بلکہ صرف ان ممبران کو ملتی ہے جن کا نام قرعہ میں نکل آئے، لہٰذا یہ قمار کی صورت ہوئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ سود اور قمار کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں نص قرآن کی رو سے ناجائز اور حرام ہیں، لہٰذا انعامی بانڈز کی خرید وفروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے۔

اگر کسی نے خرید لیا تو اس کو واپس کر کے اصل رقم واپس لینا جائز ہے اور اگر کسی کے نام قرعہ نکل آیا اور اس کو اصل رقم سے زائد رقم انعام کے نام سے ملی تو اس زائد رقم کا استعمال جائز نہیں بلکہ بدونِ نیت ثواب صدقہ کر دینا ضروری ہے۔

لما قال الله تعالیٰ: ﴿إنما الخمر والميسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشيطن فاجتنبوه﴾ (سورة المائدة: ٩٠)

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔

کچی فصل خریدنا پکنے کی شرط لگا کر:

بہت سے لوگ گندم، جو، مکئی، چاول وغیرہ کی فصلوں کو اس شرط پر خریدتے ہیں کہ فصل پکنے تک زمین میں رہے گی، اس شرط کے ساتھ خرید وفروخت ناجائز ہے کیونکہ یہ شرطِ فاسد ہے البتہ فقہاء نے جواز کی ایک صورت ذکر کی ہے کہ کھیتی میں فصل لگنے کے بعد فصل کو مستقل طور پر خرید لیا جائے اور پھر زمین کو معمولی اجرت پر خاص وقت تک کے لیے کرایہ پر لے لیا جائے پھر اس مدت کے اندر فصل کاٹ لی جائے، اس طرح یہ صورت جائز ہو جائے گی۔

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله: ولو اراد ان يترك فى الأرض ويكون له الولاية الشرعية فالحيلة أن يشتري الحشيش واشجار الطبخ ببعض الثمن ويستاجر الأرض ببعض الثمن من صاحب الارض اياما معلوما.

(خلاصة الفتاوىٰ: ٢٩/٣ كتاب البيوع، فتاوىٰ حقانية: ٦٢/٦)

دودھ والے جانور کا دودھ روک کر فروخت کرنے کا حکم:

جانوروں کا دودھ دو تین دفعہ روک کر جانور فروخت کیا جاتا ہے تاکہ لوگ زیادہ دودھ والا سمجھ کر زیادہ قیمت میں خرید لیں۔ اس طرح خریدار کو دھوکہ دے کر فروخت کرنا حرام ہے، کیونکہ حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے۔

روي البخاري و مسلم عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " من اشترى شاة مصراةً، فهو بالخيار ثلاثة ايام، إن شاء امسكها، وإن شاء ردها، وردمعها صاعاً من تمر ."

(أخرجه البخاري رقم : ٢١٤٨، مسلم رقم : ١٥٢٤ واللفظ له)

ائمہ ثلاثہ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ اس حدیث کے ظاہر پر عمل کرتے ہوئے مشتری کو خیار عیب کے ذریعہ واپس کرنے کا حق دیتے ہیں، ساتھ ساتھ جو دودھ دھولیا اس کے عوض ایک صاع کھجور دینے کا بھی حکم دیتے ہیں، البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں مشتری اگر اس جانور کو واپس کرنا چاہے تو دودھ کی قیمت بھی واپس کرنا ہوگی۔ لیکن امام اعظم ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ اس طرح دھوکہ دے کر فروخت کرنا اگرچہ ناجائز اور گناہ ہے تاہم اگر کسی نے خرید لیا تو بعد میں معلوم ہونے پر واپس کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا۔

كما فى تكملة فتح الملهم : والا ردها وردمعها صاع من تمر اخذ بظاهر الحديث الائمه الثلاثة وأبى يوسف وابن ابى ليلى والجمهور فقالوا : التصرية عيب يرد به المبيع وهذا القدر متفق عليه عندهم . ثم اختلفوا فى تفاصيله فقال الشافعي رحمه الله : يجب رد صاع من تمر بدل اللبن المحلوب، قل اللبن أو كثر، ولا يجوز اداء غير التمر قال بعض المالكية يجب صاع من غالب قوة البلد وقال أبى يوسف يجب قيمة اللبن بالغة ما بلغت وخالفهم أبي حنيفة و محمد رحمهما الله تعالىٰ، فقالا : التصرية ليست بعيب يجوز الرد به، وإذ ما يجوز للمشتري أن يرجع بنقصان قيمة المبيع ولا خيار له فى الرد الخ .

(تكملة فتح الملهم لشيخ محمد تقى العثماني : ١/ ٣٤٠)

اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تو فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث میں آپ ﷺ کا ارشاد شرعی فیصلہ نہیں بلکہ بطورِ صلح کے آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے۔

(امداد الفتاویٰ کتاب البیوع جلد ثالث)

البتہ اگر خریدار کو واضح طور پر بتادیا جائے کہ آج کل کے عرف کے مطابق دو تین دن سے اس کا دودھ روکا ہوا ہے، نکالا نہیں گیا اس کے باوجود اگر خریدار لینے پر راضی ہو جائے تو اس کی گنجائش ہے، کیونکہ اب اس میں دھوکہ نہیں رہا۔

مسجد کی آمدنی سے تجارت کرنا:

مسجد کی آمدنی اور فنڈ دراصل مسجد کی ضروریات پورا کرنے کے ملیے ہوتے ہیں لیکن اگر فنڈ مسجد کی ضروریات سے فی الحال زائد ہو تو اس رقم کو کسی قابل نفع تجارت میں لگا کر اس سے حاصل ہونے والے نفع کو مسجد ہی کے فنڈ میں جمع کروائے تو شرعاً ایسی تجارت کی اجازت ہوگی، بشرطیکہ چندہ دہندگان کی طرف سے صراحۃً یا دلالۃً اجازت ہو۔

لما قال في الهندية: متولي المسجد إذا اشترىٰ بمال المسجد حانوتا أو دارً ثم باعها جاز إذا كانت له ولاية الشراء.

(الهندية: ٢/٤١٧ الباب الخامس في ولاية الوقف وتصرف القيم)

(فتاویٰ حقانية: ١١/٣٤)

پتنگ سازی کا حکم:

بعض شہروں میں پتنگ اڑانے کا بہت رواج ہو گیا ہے اس لیے لوگوں نے پتنگ سازی کو مستقل پیشہ کے طور پر اختیار کر لیا ہے، شرعاً پتنگ سازی کا کیا حکم ہے؟ اس کو بطورِ پیشہ اختیار کرنے اور اس کی آمدنی کا کیا حکم ہے؟ اس حکم کا مدار پتنگ بازی کے حکم پر ہے۔

مندرجہ ذیل وجوہ کی بناء پر فقہاء نے پتنگ اڑانے کو ناجائز فرمایا ہے:

(١) کبوتر اڑانے اور کبوتر کے پیچھے بھاگنے والے کو رسول اللہ ﷺ نے شیطان کا بھائی فرمایا ہے:

عن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم راى رجلا يتبع حمامة فقال شيطان يتبع شيطانة.

(أبو داؤد: ٢/١٩٤)

رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے بھاگتا ہوا دیکھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

کہ شیطان ہے شیطانہ کے پیچھے بھاگ رہا ہے، کبوتر بازی میں انہماک کی وجہ سے امور دینیہ و دنیویہ سے غفلت کا مفسدہ پتنگ بازی میں بھی پایا جاتا ہے، لہٰذا اس وعید میں یہ بھی شامل ہے۔

(۲) پتنگ بازی کی وجہ سے پتنگ باز مسجد کی جماعت بلکہ خود نماز ہی سے غافل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جوئے اور شراب کے حرام ہونے کی یہی وجہ بیان فرمائی ہے:

﴿ و یصدکم عن ذکر اللّٰہ و عن الصلوٰۃ ﴾

(۳) پتنگ اکثر مکانوں کی چھت پر کھڑے ہو کر اڑائی جاتی ہے جس سے آس پاس والے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہے۔

(٤) بعض اوقات پتنگ اڑاتے ہوئے پیچھے کو ہٹتے ہیں اور نیچے گر جاتے ہیں اس میں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا جس میں منڈیر نہ ہو۔

(٥) اسی طرح اس کی ڈوری سے آئے دن لوگوں کا زخمی ہونا، گلے کٹ کر ہلاک ہونا یہ تو روز کا معمول بن گیا ہے ایسی افسوناک خبریں اور واقعات اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

کسی انسان کو ناحق قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے اگر چہ بلا ارادہ ہی ہو بلکہ حدیث میں آیا ہے کسی ایک انسان کو ناحق قتل کرنا تمام انسانوں کو قتل کرنے کے برابر گناہ ہے۔

(٦) اس میں مال کو بے جا خرچ کرنا ہے، جبکہ بے جا مال خرچ کرنا اسراف ہے اور اسراف حرام ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے:

﴿ إن المبذرین کانوا إخوان الشیطین ﴾

لہٰذا شرعاً پتنگ اڑانا ناجائز ہے، اگر اس کے ساتھ ہار جیت بھی شامل ہو تو قمار کی وجہ سے حرام ہے، بلکہ خطرۂ کفر ہے۔ (احسن الفتاویٰ ۸/۱۷٦ مع تغییر یسیر)

جب شرعاً پتنگ اڑانا ناجائز بلکہ حرام ٹھہرا تو پتنگ سازی میں اس حرام کام کے لیے معاون بننا ہے تو جس طرح دوسرے آلات معصیت کی تجارت مکروہِ تحریمی ہے پتنگ کی تجارت بھی مکروہِ تحریمی ہوگی اس لیے اجتناب لازم ہے، اس سے حاصل ہونے والی آمدن کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا۔

کھیل کود کے سامان کی خرید وفروخت:

کھیل کود کے سامان کی خرید وفروخت کا حکم خود کھیل کود کے حکم پر موقوف ہے، ایسی کھیل کود جس کی وجہ سے آخرت سے غفلت ہو یہ شرعاً مذموم اور ممنوع ہے:

لقوله عليه السلام: " كل شئ يلهو به الرجل باطل الا رميه بقوسه و تأديبه فرسه و ملاعبته امرأته فانهن من الحق رواه الترمذى.

(المشكوٰة: ۲/۳۳۷)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جو کھیل بھی اختیار کرتا ہے وہ باطل ہے مگر تین قسم کے کھیل:

1- تیراندازی

2- اپنے گھوڑے کو سدھانا

3- اپنی بیوی کے ساتھ ملاعبت، کیونکہ یہ شرعاً مطلوب ہے۔

عن سعيد بن جبير رضى الله عنه إن قريبا لعبد الله بن مغفل رضى الله عنه خذف فنهاه وقال إن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عن الخذف وقال انها لا تصيد صيد او لا تنكاء عدوا ولكنها تكسر السن و تفقاء العين قال فعاد فقال احدثك ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنه ثم تخذف لا اكلمك ابدا.

(صحيح مسلم: ۲/۱۵۲)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک پڑوسی نے کنکر پھینکا تو عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے منع فرمایا اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کنکر پھینکنے سے منع فرمایا اور فرمایا اس سے نہ شکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی دشمن پر غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے، البتہ یہ دانت توڑتا ہے اور آنکھ پھوڑتا ہے، راوی کہتے ہیں کہ اس نے دوبارہ کنکر پھینکا اس پر حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ ناراض ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہیں حدیث سنا رہا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور تم پھر بھی کنکر مارے جا رہے ہو۔ (حدیث کی بے ادبی کی وجہ سے) اب میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔

البتہ ایسا کھیل جس میں ورزش ہو، یہ صحت اور دینی و دنیوی امور میں معین ہونے کی وجہ سے فی نفسہ جائز بلکہ کسی قدر ضروری ہے مگر اس کے لیے یہ شرائط ہیں:

1- کھیل کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جس سے گرد و نواح میں کسی قسم کی جانی یا مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

2- خود کھیلنے والے کو یا اس کے ساتھ شرکاء میں سے کسی کو کسی قسم کے جسمانی یا مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

3- نمازوں کے اوقات میں نہ ہو، یعنی نماز کے نظام میں کوئی خلل نہ آئے۔

4- دوران کھیل ستر کھلا ہوا نہ ہو۔

5- گالم گلوچ نہ ہو۔

6- کوئی ایسا مقابلہ نہ ہو کہ ہار جیت کی صورت میں مال دینے کی شرط ہو۔

7- اس میں ایسا انہماک نہ ہو کہ اس کو مستقل پیشہ کے طور پر اختیار کرلے کہ اس کو پھر کھلاڑی کے نام سے یاد کیا جانے لگے اور پہچانا جانے لگے۔

8- اس میں ورزش کا مفہوم ہی غالب ہو، لہو و لعب اور تماشہ کا پہلو غالب نہ ہو۔

9- وہ محض وقت گزاری کا مشغلہ نہ ہو، جیسے تاش، لڈو، شطرنج، کیرم بورڈ، ڈبو، اٹھارہ گوٹی، نو گوٹی، اڈہ کھڈہ، چوسر، چوپڑ وغیرہ اور اس جیسے سب کھیل شرعاً ناجائز ہیں۔

اب مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق جو کھیل ورزش کے حکم میں داخل ہو کر جائز ہے، اس کے سامان کی خرید و فروخت بھی جائز ہے۔

اور جو کھیل شرعی حدود کی خلاف ورزی کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اس کے سامان کی خرید و فروخت تعاون علی الاثم کی وجہ سے ناجائز ہے، ایسے کاروبار سے احتراز کرنا لازم ہے۔

اس زمانے میں مروجہ کھیل، فٹبال، کرکٹ، ہاکی وغیرہ جن کو قومی کھیل سمجھا جاتا ہے، ان میں عموماً شریعت کے احکام کی پابندی نہیں کی جاتی، ستر ڈھانپنے کا اہتمام نہیں ہوتا، اس میں موسیقی، ڈانس وغیرہ کا بھی ساتھ اہتمام ہوتا ہے، بعض اوقات اس میں جوا بھی کھیلا جاتا ہے، نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا، اس لیے اس طرح کے کھیل میں شرکت کرنا یا ان لوگوں کو سامان تیار کر کے دینا دونوں ناجائز ہیں ایسے لوگوں کو کھیل کا سامان فروخت کرنا اور اس سے حاصل ہونے والے نفع کا

استعمال بھی ناجائز ہے۔

سمگلنگ کا شرعی حکم:

سمگلنگ کے معاملہ کی حقیقت یہی ہے کہ باہر ممالک سے مال لے کر آنا یا باہر ممالک مال لے کر جانا حلال مال ہو شرعی اعتبار سے جائز ہے، لیکن چونکہ حکومت نے اس پر پابندی لگا رکھی ہے، اس پابندی کی خلاف ورزی میں بہت سے گناہوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، مثلاً: اکثر جھوٹ بولنا پڑتا ہے، رشوت دینی پڑتی ہے، جان مال یا عزت وآبرو کو خطرے میں ڈالنا پڑتا ہے، جس کی حفاظت کا شریعت میں بڑا خیال رکھا گیا ہے اور بسا اوقات جسمانی تکلیف اور قید وبند کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے، اس لیے حکومت کے قانون کی پابندی کرنی چاہیے اور ایسے کاروبار سے اجتناب کرنا چاہیے تاہم اسمگل ہو کر آنے والی حلال ومباح چیزوں کی خرید وفروخت جائز ہے اور ان کو اپنے استعمال میں لانا درست ہے اور آمدنی بھی حلال ہے۔

قرآن کریم کی خرید وفروخت:

قرآن کریم کی خرید وفروخت کے بارے میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، معظم ومکرم ہے، خرید وفروخت میں ایک گونہ توہین ہے اس لیے خرید وفروخت مکروہ ہے، اس کی بجائے مسلمانوں کو چاہیے کہ قرآن کریم وقف کریں، ہدیہ دیں۔

(انظر کتاب المغنی لابن قدامہ : ٦/٣٦٧)

لیکن جمہور فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ کلام اللہ کی خرید وفروخت نہیں بلکہ مجلد اوراق کی خرید وفروخت ہے جن میں کلام اللہ لکھا گیا ہے، لہٰذا تفسیر، حدیث وفقہ کی کتابوں کی طرح قرآن کریم کی خرید وفروخت بھی جائز ہے آمدن حلال ہے۔

کافروں کے ہاتھ قرآن کریم کی فروخت:

کافروں کے ہاتھ قرآن کریم فروخت کرنے میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی بے حرمتی کرے گا اہانت وتحقیر سے کام لے گا یا اس کے آداب کا خیال نہیں رکھے گا کہ پاکی وناپاکی ہر حالت میں اس کو ہاتھ لگائے گا، تو ایسی صورت میں ان کو قرآن کریم عطیہ دینا یا فروخت کرنا، دونوں جائز نہیں بلکہ گناہ ہے اور حرام ہے۔ لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو ان کے ہاتھ فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں، نیز تبلیغ کی غرض سے ہدیہ کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

كما روي " نهى النبي صلى الله عليه وسلم عن المسافرة بالقرآن الى ارض العدو مخافة أن تناله أيديهم .

(الحديث أخرجه ابو داود في سننه ٢ / ٣٥ ،

باب النهي عن ان يسافر بالقرآن الى ارض العدو)

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کی خرید و فروخت کا حکم:

ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ کا استعمال جائز امور میں ممکن ہے اور لوگ جائز امور کے لیے استعمال کرتے بھی ہیں، مثلاً: خبریں سننا، تلاوت اور وعظ و نصیحت سننے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے ان مقاصد کے لیے خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں تاہم ایسے لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا جن کے متعلق یقین ہو کہ یہ محض ناجائز کام میں استعمال کریں گے، مثلاً: گانا وغیرہ سننے کے لیے ہی استعمال کریں گے یہ چونکہ گناہ کے کام میں تعاون ہے اس لیے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

شیئرز کی خرید و فروخت کا حکم:

اس وقت شیئرز کا کاروبار عروج پر ہے، شرعی اعتبار سے اس کاروبار کی کیا حیثیت ہے؟ مطلقاً جائز ہے یا کچھ قیود اور شرائط ہیں، نیز اسٹاک ایکسچینج میں دلال یعنی بروکر کی حیثیت سے کام کرنے کا کیا حکم ہے؟ دونوں مسئلوں کو تفصیل سے لکھا جاتا ہے:

شیئرز کا کاروبار:

شیئرز کے کاروبار کا حکم:

(1) جس کمپنی کا اصل کاروبار حرام ہو، مثلاً: سودی بینک، انشورنس کمپنی یا شراب کی خرید و فروخت جیسا حرام کاروبار کرنے والی کمپنی، ان کا حکم یہ ہے کہ اس کے شیئرز خریدنا حرام ہے، البتہ اگر کمپنی کا اصل کاروبار تو حلال ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ضمنی طور پر سودی لین دین بھی کرتی ہے، مثلاً: بینک میں پیسہ رکھ کر سود حاصل کرتی ہے اور اسے حلال نفع میں شامل کرتی ہے۔ (آج کل شاید ہی کوئی کمپنی اس سے محفوظ ہو) تو ایسی کمپنی نے ابتداءً جو شیئرز جاری کیے انہیں دو شرطوں سے خریدنا جائز ہے:

-1 شیئرز خرید کر اس کمپنی کا حصہ دار (شیئر ہولڈر) چونکہ اس سودی معاملے میں کمپنی کا معاون و مددگار بن رہا ہے اور اس کا پیسہ بھی اس گناہ میں استعمال ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر واجب

ہے کہ اپنی استطاعت کے بقدر اس کمپنی کے شرکاء کے سالانہ اجلاس میں سود کے خلاف آواز ضرور اٹھائے یا کم از کم ہر مرتبہ کے اجلاس میں ایک بار اس بات کا اظہار ضرور کرے کہ وہ اس سودی معاملے پر راضی نہیں یا ای میل کے ذریعے سے کمپنی کو خط لکھا کرے کہ کمپنی سودی لین دین یکسر ختم کردے۔ اگرچہ اس کی اس رائے اور آواز پر کان نہ دھرا جائے مگر یہ اپنا فرض ادا کرتا ہے۔

2- شیئر ہولڈر کمپنی کی ویب سائٹ پر انکم اسٹیٹمنٹ کے ذریعے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس کمپنی نے کل نفع میں سے کتنے فی صد نفع سود کی مد میں حاصل کیا ہے؟ چنانچہ شیئر ہولڈر نفع وصول کرنے کے بعد اپنے حصے کے تناسب سے اپنے نفع میں سے سودی نفع کے بقدر رقم فقراء پر بلا نیتِ ثواب صدقہ کردے، اگر سودی نفع کی مقدار کے بارے میں تحقیق وجستجو کے باوجود بھی علم نہ ہو سکے تو اندازے سے رائے قائم کرے اور جتنی مقدار کا گمان غالب ہو، وہ صدقہ کرے۔

یہ شرائط تو اس شخص کے بارے میں تھیں جو کمپنی کی طرف سے جاری کردہ شیئرز اس سے براہِ راست لے کر گھر بیٹھے نفع حاصل کرنا چاہتا ہو، البتہ جب کمپنی نے ایک مرتبہ تمام شیئرز جاری کر دیے اور اب کوئی شخص ان کی خرید وفروخت کے ذریعے نفع کمانا چاہتا ہے تو اس کاروبار کے جواز کے لیے مزید تین شرطیں ہیں:

1- کمپنی نے شیئرز کے ذریعے حاصل ہونے والی رقم سے کچھ خام مال یا عمارت وغیرہ خرید لی ہو، یعنی کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے وجود میں آچکے ہوں، کل اثاثے محض نقد (کرنسی) کی صورت میں نہ ہوں، بصورتِ دیگر شیئرز کی اصل قیمت پر خرید وفروخت تو جائز ہوگی، کمی بیشی پر نہیں، نیز شیئرز کی قیمت پر قبضہ بھی اس مجلس میں ضروری ہوگا، ادھار پر معاملہ جائز نہ ہوگا۔

2- شیئرز سرٹیفکیٹ پر قبضہ ہو چکا ہو، یا کسی بھی طرح یقینی طور پر شیئر ہولڈر کی بقدر حصص ملکیت کمپنی میں ثابت ہو چکی ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ کمپنی کو اگر بالفرض نقصان ہو تو اس نقصان کا ضمان قانوناً شیئر ہولڈر پر بھی آتا ہو، چنانچہ شیئرز پر حقیقۃً قبضہ کے بغیر یا یقینی طور پر ملکیت ثابت ہوئے بغیر انہیں آگے بیچنا جائز نہیں۔

بعض حضرات کا شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق پورے معاملے میں درحقیقت خریدنا اور بیچنا بالکل مقصود ہی نہیں ہوتا، ان کے پیش نظر سرٹیفکیٹ وصول کرنا ہوتا ہی نہیں اور نہ ہی یہ حضرات

سرٹیفکیٹ وصول کرتے ہیں، بلکہ محض زبانی کلامی اس پوری کارروائی سے مقصد انتہاء اور نتیجہ کے اعتبار سے فرق برابر کرنا ہوتا ہے تو یہ صورت بھی جوا اور سٹہ بازی ہونے کی وجہ سے بالکل حرام ہے۔

-3 سپاٹ سیل کرے، شارٹ سیل، فارورڈ اور فیوچر سیل اور ہیجنگ (جن کی تفصیل نمبر 2 میں آرہی ہے) جائز نہیں۔

بروکر (دلال کا حکم)

(2) اسٹاک ایکسچینج میں بحیثیتِ دلال کام کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا مدار ان معاملات پر ہے جو ایک دلال انجام دیتا ہے، چنانچہ ہماری معلومات کے مطابق ایک بروکر بحیثیت دلال شیئرز کی خرید وفروخت سے متعلق کاروبار میں شیئرز بیچنے والوں اور خریدار حصص کے درمیان پانچ طرح سے رابطے کا کام دیتا ہے:

-1 حاضر سودا (Spot Sale):

یہ خرید وفروخت کی دلالی کا عام اور سادہ طریقہ ہے دلال اپنے تعلقات اور معلومات کی بناء پر کسی شخص سے شیئرز کی قیمت وصول کر کے یا اس وصولی کے لیے آئندہ کوئی تاریخ معین کر کے اس کے لیے کسی شیئر ہولڈر سے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کرتا ہے اور اس دلالی پر اس شخص سے متعین معاوضہ (کمیشن) وصول کرتا ہے۔

-2 بعض اوقات خریدار کے پاس رقم نہیں ہوتی تو دلال کمیشن کے حصول کے لیے اس کی طرف سے شیئرز کی قیمت کا کل یا بعض حصہ ادا کر کے اس کے لیے شیئرز خرید کر اس کے حوالے کر دیتا ہے، پھر کچھ دنوں تو خریدار کو قیمت کی ادائیگی کی مہلت بلا سود ہوتی ہے، اس کے بعد دلال اس سے سود وصول کرتا ہے، اسے اصطلاح میں (Sale on Margin) کہتے ہیں۔

-3 بیع غیر مملوک (Short Sale)

دلال خریدار کو کمیشن کے لالچ میں ایسے شیئرز فروخت کر دیتا ہے جنہیں اس نے خود بھی ابھی تک نہیں خریدا، محض اس توقع یا یقین پر کہ بعد میں خرید لوں گا۔

-4 دلال اور خریدار کے درمیان خرید وفروخت سے متعلق معاملے کی نسبت مستقبل یعنی آئندہ آنے والی کسی مقررہ تاریخ کی طرف ہوتی ہے، یعنی دونوں کے درمیان خرید وفروخت کا

معاملہ تو طے ہو گیا مگر اس مقررہ تاریخ سے قبل سودا وجود پذیر نہیں سمجھا جائے گا۔ اسٹاک ایکسچینج کی اصطلاح میں اسے (Forward Sale) (البیع المضاف إلی المستقبل) کہتے ہیں۔

5- دونوں کے درمیان نمبر 4 کی طرح خرید وفروخت سے متعلق معاہدے کی نسبت مستقبل کی طرف ہوتی ہے، مگر مقررہ تاریخ پر قبضہ مقصود ہی نہیں ہوتا، مقررہ تاریخ آنے پر دونوں نفع ونقصان کا فرق برابر کر لیتے ہیں، مثلاً شیئرز کی قیمت مقررہ تاریخ پر اگر بڑھ گئی تو دلال خریدار کو شیئرز کی بجائے زائد رقم دے گا اور اگر قیمت گھٹ گئی تو اتنی رقم اس سے لے گا، اس معاملے کو اصطلاح میں (Future Sale) سٹہ کہتے ہیں۔

ان تمام صورتوں میں صرف پہلی صورت جائز ہے، بقیہ چاروں صورتیں بیع فاسد، جوا (سٹہ) یا سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، لہٰذا اسٹاک ایکسچینج میں اگر کوئی شخص بروکر کی حیثیت سے کام کر کے خود کو ان معاملات کا مرتکب ہونے سے بچا سکتا ہے جو ناجائز اور حرام ہیں تو اس کے لیے اس ادارے میں ملازمت جائز ہے اور اگر ممکن نہیں تو حصص کی دلالی کا کام نہ کرے اور خود کو حرام میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتاویٰ دارالافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی : ۴۳ / ۶۱۰)

سرکاری طور پر نرخ کنٹرول کرنے کا حکم:

بسا اوقات کسی چیز کی قیمت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے، ایسے وقت میں حکومت قیمت کی ایک حد مقرر کر کے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا دیتی ہے جس کو ''نرخ کنٹرول'' کہا جاتا ہے، عربی میں ''تسعیر'' کہا جاتا ہے کیا حکومت کے لیے اس قسم کی پابندی لگانا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی چیز کی خرید وفروخت کو بائع ومشتری کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے، خواہ وہ قیمت زیادہ ہو یا کم، بعض چیزوں کی کوالٹی میں تفاوت کی وجہ سے بھی قیمتوں میں تفاوت آجاتا ہے اس لیے شرعاً حکومت کو پابندی لگانے کا حق نہیں۔

كما روى اصحاب السنن عن أنس رضي الله عنه قال : قال بعض الناس يا رسول الله ! غلا السعر فسعر لنا، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : إن الله هو المسعر، القابض، الباسط الرزاق، إني لأرجو الله . وليس احد منكم يطالبني بمظلمة في دم ومال .

(أخرجه ابو داؤد: ۲/۲٤٤، ترمذی: ٦/٥٢)

لیکن بعض حالات میں تاجر لوگ اشیاءِ ضروریہ کی قیمت میں بے تحاشہ اضافہ کر کے عوام کو پریشان کرتے ہیں بلکہ اب تو نفع خوری کی ہوس نے ماحول ایسا بنا دیا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد باقاعدہ عوام کو لوٹنے کا منصوبہ بنالیا جاتا ہے اور اچانک ہوش ربا اضافہ کر دیا جاتا ہے ایک عام آدمی کے لیے مارکیٹ تک رسائی حاصل کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے تو اس صورتِ حال میں حکومت کو تو شرعاً اس کی اجازت ہے کہ وہ معاشیات اور اقتصادیات کے ماہرین اور سمجھدار دیندار تاجروں کے مشورے سے اشیاءِ ضروریہ کی قیمتوں کا تعین کر کے زائد قیمت وصول کرنے پر پابندی لگا سکتی ہے تا کہ عوام الناس پریشان نہ ہوں۔

قال: فی الهداية: ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس، فإن كان أرباب الطعام يتحكمون ويتعدون في القيمة تعديا فاحشا، وعجز القاضي عن صيانة حقوق المسلمين الا بالتسعير، فحينئذ لا بأس به، بمشورة من أهل الرأي والبصر." (هداية كتاب البيوع)

گمراہ کن کتابوں کے کاروبار کا حکم:

ایسی کتب جو شرک و بدعت، خلافِ شرع رسم و رواج یا اہل باطل کے عقائد اور گمراہ کن نظریات پر مشتمل ہوں، ان کی خرید و فروخت شرعاً ناجائز ہے۔

اسی طرح فحش ناول، ڈائجسٹ اور جرائم پیشہ افراد کے حالات پر مشتمل کتابیں انجیل اور تورات کے موجودہ نسخے اسی طرح بڑی بڑی فحش تصاویر والے رسائل وغیرہ اسی طرح فلم اور گانے کے متعلق رسائل اور اخبارات وغیرہ ان سب کی اشاعت اور خرید و فروخت ترسیل وغیرہ، یہ گناہ کے کام میں اعانت کی وجہ سے ناجائز ہیں، ایسی تجارت سے پرہیز کرنا چاہیے اس کو چھوڑ کر حلال اور پاکیزہ کاروبار اختیار کرنا چاہیے۔

کما قال العلامة محمود آلوسیؒ: واستدل بعضهم على القول بأن لهو الحديث الكتب التي اشترى ها النضر بن الحارث على حرمة مطالعة التواريخ الفرس القديمة وسماع ما فيها وقرأته وفيه بحث ولا يخفى ان فيها من الكذب ما فيها فالاشتغال بها لغير غرض ديني

حوض فی الباطل۔ (روح المعانی ۷/۷۹، سورۃ المائدۃ)

طوطوں کا کاروبار:

اس دور میں ملکی اور بین الاقوامی طور پر طوطوں کا کاروبار بھی عروج پر ہے بعض لوگوں کو اس کے جواز پر شبہہ ہوتا ہے کہ ایک پرندے کو پنجرے میں بند کر کے حبس میں رکھا جاتا ہے یہ ظلم ہے لیکن فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر پرندہ بند کر کے اس کی خوراک اور دیگر ضروریات کا خیال رکھا جائے تو شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، طوطے پالنے والوں کے بارے میں مشاہدہ ہے وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں لہٰذا یہ کاروبار جائز ہے۔ (عالمگیریۃ)

گاڑیوں کی خرید وفروخت میں خلافِ شرع شرط لگانا:

آج کل گاڑیوں کی خرید وفروخت میں ایک طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ مثلاً: دو لاکھ کی ٹیکسی خرید کر آگے ڈھائی لاکھ میں قسطوں پر فروخت کر دی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ بقیہ رقم گاڑی پر ہے گاڑی چلتی رہے گی اور قسطیں بھی ادا ہوتی رہیں گی، لیکن قسط مکمل ہونے سے پہلے اگر گاڑی کسی حادثہ کا شکار ہوگئی، جل گئی یا چوری ہوگئی اس صورت میں بقیہ قسطیں ساقط ہو جائیں گی یعنی بائع کو خریدار سے بقیہ رقم کے مطالبہ کا حق نہ ہوگا، یہ شرط خلاف شرع ہے جس کی وجہ سے یہ بیع فاسد ہوگی شرعاً دونوں پر لازم ہے کہ اس معاملے کو ختم کر کے اَز سرِ نو اس شرط کے بغیر عقد کریں، اگر ایسا نہیں کیا اور یہ عقد فاسد برقرار رہا تو اب ایسی صورت میں اگر قسطیں مکمل ہونے سے پہلے گاڑی کو کوئی حادثہ لاحق ہوگیا تو خریدار پر شرعاً واجب ہے کہ پوری قیمت ادا کرے، ہاں البتہ بائع خریدار پر رحم کھا کر کچھ رقم معاف کر دے یہ بھی شرعاً درست ہے لیکن لازم نہیں۔

گاڑی کے حصے خریدنے کا ایک سودی طریقہ:

ایک شخص کو رقم کی ضرورت ہے وہ اپنے رکشہ کا ایک حصہ مثلاً: دوسرے کو 30000 ہزار میں فروخت کرتا ہے اور رقم وصول کر لیتا ہے پھر دوبارہ اسی وقت اس سے یہ حصہ 40000 ہزار میں قسطوں میں خرید لیتا ہے اس طرح وہ تیس ہزار روپے اور گاڑی لے کر چلا جاتا ہے، شرعاً یہ خرید وفروخت نہیں ہے بلکہ سود دینے اور لینے کا ایک حیلہ ہے، لہٰذا ناجائز اور حرام ہے اور تیس ہزار پر دس ہزار جو نفع کے نام سے سود دینے کا معاہدہ ہوا اس کا بھی لینا اور دینا دونوں حرام ہیں دوسرے شخص کے لیے اس کا استعمال بھی حرام ہے۔

"نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن بيع ما لم يضمن."

بری اور بحری جانوروں کی خرید وفروخت:

آج کل کیکڑا اور کچھوا وغیرہ بکثرت ایکسپورٹ ہو رہے ہیں اور مختلف طریقوں اور صورتوں میں ان کو استعمال کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے ان کی خرید وفروخت عام ہوگئی ہے ان کی خرید و فروخت جائز ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں تفصیلی اور تحقیقی جواب ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

تمام بری اور بحری جانوروں کی کل دو قسمیں ہیں: حلال اور حرام اور خرید وفروخت کے اعتبار سے ان دونوں کی کئی قسمیں متصور ہو سکتی ہیں، تفصیل درج ذیل ہے: مثلاً:

بری حلال جانور:

1- زندہ

2- مذبوح (اسلامی طریقہ کے مطابق ذبح کیا ہوا)

3- میتہ (ٹڈی کے علاوہ، کیونکہ یہ مری ہوئی بھی حلال ہے)

بری حرام جانور:

1- زندہ

2- مذبوح

3- میتہ (خون والا جیسے ہاتھی اور شیر وغیرہ)

4- میتہ (جو خون والا نہ ہو جیسے حشرات الارض)

بحری حلال جانور:

1- زندہ

2- میتہ

بحری حرام جانور:

1- زندہ

2- میتہ

مجموعہ ان گیارہ قسموں میں سے بری حلال جانور خواہ زندہ ہوں یا مذبوح اور بحری حلال جانور جو زندہ ہے ان کی خرید وفروخت بلا شبہ جائز ہے اور آمدنی بھی حلال ہے اور بری حلال

جانوروں میں سے جو میتہ ہیں اس کی بیع جائز نہیں، البتہ میتہ ٹڈی حلال ہے اور اس کی بیع بھی جائز ہے اور بری حرام جانوروں میں سے جو خون والے ہوں مثلاً: شیر اور ہاتھی وغیرہ تو اس کے میتہ کی بیع جائز نہیں اور بحری جانوروں میں سے جو میتہ ہیں اس کی بیع جائز ہے، مگر اس کا کھانا جائز نہیں یہ چھ قسمیں ہیں جن کا حکم بیان ہوا ہے۔

ان کے علاوہ بحری حرام جانور کی دونوں قسمیں (زندہ، میتہ) اور بری حرام جانور کی تینوں قسمیں (زندہ، مذبوح اور میتہ غیر ذی دم) یہ کل پانچ قسمیں ہیں جن کی بیع جائز ہونے اور نہ ہونے میں قدرے تفصیل ہے جو حسب ذیل ہے۔

ذیل میں درج شدہ فقہی نصوص پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان پانچ قسموں کے جانوروں کی خرید وفروخت ایک شرط کے ساتھ جائز ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ قابل انتفاع ہوں اور اگر ان میں سے کوئی منتفع بہ نہ ہو تو پھر اس کی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی۔

قابل انتفاع ہونے کا معیار:

اب رہی بات کہ منتفع بہ ہونے کا معیار کیا ہے اور اس کا فیصلہ کون کرے گا؟

تو یہ نہایت اہم سوال ہے اس کی تحقیق ہونی چاہیے، چنانچہ اس سلسلے میں جب فقہی نصوص کا بنظر غائر جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ شرعی نقطہ نظر سے منتفع بہ ہونے کا اصل معیار عام لوگوں کی ضرورت ہے اور ضرورت ایک ایسی چیز کا نام ہے جو اپنے اندر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے، جس میں ہر زمان، ہر مکان اور ہر تغیر پذیر حالات کی ضروریات شامل ہوتی ہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ ہر زمانہ کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہوتیں اور ہر جگہ اور ہر علاقہ کی ضروریات بھی ایک طرح کی نہیں ہیں، اسی حالات و واقعات کے بدلنے سے بھی لوگوں کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، لہٰذا ضرورت ایک وسیع مفہوم کا حامل لفظ ہے، جس میں دواء سازی کی ضرورت، علاج معالجہ کی ضرورت اور کسی بھی جائز ومباح چیز تیار کرنے کی ضرورت سب اس میں داخل ہیں، غرض یہ کہ کسی بھی جائز ومباح موقع ومرحلہ میں جب ان جانوروں سے انتفاع کی ضرورت ہوگی تو وہ ضرورت کے وسیع مفہوم میں شامل ہوگا اور یہ حکم خنزیر کے علاوہ ہے، کیونکہ یہ نجس العین ہے اور اس سے کسی طرح بھی انتفاع جائز نہیں۔

اور آج کی سائنسی ترقی یافتہ دنیا میں کسی نہ کسی موقع ومرحلہ پر ان جانوروں سے انتفاع کی

ضرورت پیش آتی ہے اور کسی نہ کسی چیز کی ایجاد وتیاری میں ان سے مدد لی جاتی ہے اور ایسی تیار شدہ جائز ومباح اشیاء سے انسان فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔

نیز منتفع بہ ہونا ایک مفہوم کلی بھی ہے، جس سے ہر شخص اپنی ضرورت کے تحت مستفید ہوتا ہے، مثلاً ان جانوروں کو فروخت کرنے والا اور ان کا کاروبار کرنے والا اور ان سے مباح اشیاء تیار کرنے والا، تمول اور دولت کا فائدہ اٹھاتا ہے اور عام لوگ ان کے ذریعہ تیار شدہ مباح اشیاء سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان جانوروں کے منتفع بہ ہونے کا اصل معیار و مدار عام لوگوں کی ضرورت ہے اور ضرورت ایک وسیع مفہوم ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا انداز مختلف ہوسکتا ہے اور ہر شخص اپنی ضرورت اور موقع ومحل کے تحت اس سے استفادہ کرتا ہے، اس طویل تمہید سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کسی نہ کسی موقع ومرحلہ میں ان جانوروں سے انتفاع کی ضرورت پڑتی ہے، اس لیے یہ منتفع بہ ہیں اور چونکہ منتفع بہ اشیاء کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہے، لہٰذا ان جانوروں کی خرید وفروخت بھی جائز ہوگی۔

اس طویل اور اصولی گفتگو کے بعد اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ کیکڑے اور کچھوے کی خرید وفروخت جائز ہے یا نہیں؟

اوپر ذکر کردہ اصول کے مطابق اس کا جواب تو بالکل واضح ہے کیونکہ ہمارے علم ومعلومات کے مطابق دواء سازی، علاج ومعالجہ اور دیگر مباح اشیاء کی تیاری میں ان دونوں جانوروں سے مدد لی جاتی ہے، لہٰذا یہ منتفع بہ ہیں، اس لیے ان کی خرید وفروخت بلاشبہ جائز ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی بھی حلال ہے۔

چنانچہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ رقمطراز ہیں:

''سوائے خنزیر کے زندہ سب جانوروں کی بیع کسی فائدہ کے لیے درست ہے، خواہ بری ہوں یا بحری، چھوٹے ہوں یا بڑے، حتیٰ کہ کتے اور چیتے اور سانپ وغیرہ کی بھی اور مردہ ان حیوانات کی بیع بھی درست ہے جو پاک ہیں، جیسے دریائی جانور یا حشرات غیر ذی دم یا ذی دم جانور بعد ذبح، کیونکہ ذبح سے ہر جانور پاک ہوجاتا ہے، سوائے خنزیر کے، دریائی جانور سب پاک ہیں، چھوٹے ہوں یا بڑے، مذبوح ہوں یا غیر مذبوح، ہاں کھانا کسی کا سوائے مچھلی کے مذہب حنفی میں درست

نہیں، تو خارجی استعمال تمام حیوانات دریائی کا اور ان کے تمام اجزاء کا درست ہوا۔''

(بهشتی زیور نوال حصه ص: ۱۰۳ـ ۱۰۴)

نیز کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم ان جانوروں کو خرید کر کسی اور کام کے بجائے کھانے پینے میں بھی استعمال کر سکتے ہیں؟ جب کہ حرام چیز غیر مسلم کو کھلانا بھی جائز نہیں، تو اس کا جواب اوپر بیان کردہ تفصیلات کی رو سے بالکل واضح ہے کہ ان جانوروں کا استعمال کھانے پینے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، دیگر ضروریات میں بھی ان کا استعمال ہوسکتا ہے اور ہو رہا ہے، لہٰذا اگر فروخت کرنے والے کا ارادہ اسی ضرورت کا ہو، پھر بھی خریدنے والا اگر اس کو کھانے میں استعمال کرتا ہو تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا، فروخت کرنے والا ذمہ دار نہ ہوگا۔

واضح رہے کہ اس مذکورہ تفصیل کی رو سے وہ تعارض بھی بآسانی رفع ہو جاتا ہے جو بادی نظر میں نصوص فقہیہ کے درمیان نظر آتا ہے، کہ بعض فقہی عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں میں سے بعض کی بیع جائز نہیں مکروہ ہے، جبکہ دوسری فقہی عبارات اس کے بالکل برخلاف ہیں، الحمد للہ اوپر بیان کردہ اس تفصیل سے یہ تعارض بالکل رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ جن فقہاء کرام نے ان کی بیع کو ناجائز ومکروہ کہا ہے، وہ ان کے نزدیک منتفع بہ نہ ہونے کی بنیاد پر کہا ہے اور جن حضرات نے ان کی بیع کو جائز کہا ہے وہ ان کے نزدیک منتفع بہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے، لہٰذا دونوں رائے کا محمل الگ الگ ہے اس لیے ان کے مابین کوئی تعارض نہیں ہے۔

دلائل ذیل میں ملاحظہ ہوں:

١ـ جاء في الدر المختار: او بخنق ونحوه، قال ابن عابدين رحمه الله في بيان حكم بيع دودة القدمز، قلت، وفيه انها من اعز الاموال اليوم، ويصدق عليها تعريف المال المتقوم، ويحتاج إليها الناس كثيرا في الصباغ وغيره، فينبغي جواز بيعها كبيع السرقين والعذرة المختلطة بالتراب هذه الدودة ان لم يكن لها نفس سائلة تكون منتها طاهرة كالذباب والبعوض وان لم يجز اكلها، وسياتي ان جواز البيع يدور مع حل الانتفاع وانه يجوز بيع العلق للحاجة مع انه من الهوام وبيعها باطل، وكذا بيع الحيات للتداوي، وفي القنية:

وبيع غير السمك من دواب البحر لوله ثمن كالسقنقور و جلود الخز و نحوها يجوز و الا فلا ." (ردالمحتار : ٥/ ٥١ باب البيع الفاسد)

٢۔ في الدر المختار : "ويباع دود القز، في ردالمحتار (قوله المحرز ......) قال في البحر، وهو معنى ما في الذخيرة إذا كان مجموعا لانه حيوان منتفع به حقيقة و شرعا فيجوز بيعه وإن كان لا يؤكل كالبغل والحمار قوله جوز ابو الليث بيع العلق و به يفتى للحاجة، في البحر عن الذخيرة، إذا اشترى العلق الذى يقال له بالفارسية موعل يجوز و به اخذ الصدر الشهيد لحاجة الناس اليه لتمول الناس له ."

" اقول : العلق في زماننا يحتاج إليه للتداوي بمصه الدم، و حيث كان متمولاً لمجرد ذلك دل على جواز بيع دودة القدمز، فإن تمولها الان اعظم اذهى من اعز الاموال، ويباع منها في كل سنة قناطير بثمن عظيم فعلم ان المراد به علق خاص متمول عند الناس وذلك متحقق في دود القدمز، وهو اولى من دود القز وبيضة فإنه ينتفع به في الحال ودود القز في المال ."

" (قوله كحيات) في الحاوي الزاهدي : يجوز بيع الحيات إذا كان ينتفع بها للأدوية، ما جاز الانتفاع بجلده او عظمه اي من حيوانات البحر او غيرها . قال في الحاوي : ولا يجوز بيع الهوام كالحية والفارة والوزغة والضب والسلحفاة والقنفذ و كل مالا ينتفع به ولا بجلده، وبيع غير السمك من دواب البحر، إن كان له ثمن كالسقنقور وجلود الخز ونحوها يجوز، وإلا فلا، كالضفدع والسرطان وذكر قبله . ونقل السائحاني عن الهندية : ويجوز بيع سائر الحيوانات سوى الخنزير وهو المختار، وعليه مشى في الهداية وغيرها من باب المتفرقات كما سيأتي ." (٥/٦٨، ٦٩)

۳۔ فی متفرقات الدر المختار: "وصح بیع الکلب والفهد والفیل والقرد والسباع بسائر انواعها حتی الهرة."

فی ردالمحتار: "(قوله الهرة) لانها تصطاد الفار والهوام المؤذیة فهی منتفع بها فتح ... وتقدم فی البیع الفاسد جواز بیع السرقین وبعد ولو خالصیس والانتفاع به والوقود به وبیع رجیع الأدمی لو مخلو طابتراب." (۲۲۶/۵، ۲۲۷)

٤۔ فی الدر المختار: "وجوز فی القنیة: بیع ماله ثمن کالسقنقورو جلود خز وجمل الماء لوحیا." (۲۲۷/۵)

٥۔ فی الهدایة: "ولنا انه علیه الصلوٰة والسلام: نهی عن بیع الکلب الا کلب صید او ماشیة، ولانه منتفع به حراسة واصطیاداً فکان مالاً فیجوز بیعه ..... قال ابن الهمام رحمه اللّٰه: یعنی مالاً مملوکاً متقوماً، اما کونه مالاً فلان المال اسم لغیر الادمی خلق لمنفعته المطلقة شرعاً وهذا کذلك، فکان مالاً، واما انه مملوك متقوم فلانه محرز ماذون شرعاً فی الانتفاع به والملك یثبت بالاحراز بدار الاسلام والتقوم بالتمول وکلاهما ماذون فیه شرعاً."

(فتح القدیر: ۲٤۷/٦ مسائل منثورة)

٦۔ فی الهندیة: (۱۱٤/۳) ..... "ولا یجوز بیع ما یکون فی البحر کالضفدع والسرطان وغیره الا السمك ..... وفی النوازل: ویجوز بیع الحیات إذا کان ینتفع بها فی الادویة، وإن کان لا ینتفع بها لا یجوز، والصحیح انه یجوز بیع کل شئی ینتفع به کذا فی التتارخانیة."

۷۔ قال الموفق فی المغنی (۲٥٦/٤، ۲٥۷): "وبیع الفهد والصقر المعلم جائز، وکذلك بیع الهرة وکل ما فیه المنفعة، وجملة ذلك ان کل مملوك ابیح الانتفاع به یجوز بیعه الا ما استثناء الشرع

من الکلب ...... ویحمل الحدیث علی غیر المملوك منها او مالا نفع فیہ منها، بدلیل ما ذکرنا، ولأن البیع شرع طریقا للتوصل الی قضاء الحاجة واستیفاء المنفعة المباحة لیصل کل واحد الی الانتفاع بما فی ید صاحبه مما یباح الانتفاع به، فینبغی ان یشرع ذلك فیه لیصل کل واحد الی الانتفاع بما فی ید صاحبه فما یباح الانتفاع به ینبغی ان یجوز بیعه." (ماخوذ از جدید تجارت کے شرعی احکام)

زندہ جانور کو تول کر بیچنے کا حکم:

اگر خریدار اور فروخت کنندہ زندہ جانور کو وزن کر کے خرید و فروخت پر راضی ہوں تو جانور کو وزن کر کے نقد رقم یا غیر جنس کے ذریعے خریدنا اور فروخت کرنا دونوں جائز ہیں، بشرطیکہ متعین جانور کا فی کلو حساب سے نرخ طے کر لیا گیا ہو، نیز جانور کا وزن کرنے کے بعد اس کی قیمت بھی متعین کر لی گئی ہو۔ جس کی صورت یوں ہوگی کہ خریدار کو مثلاً: ایک بکرے کی ضرورت ہے تاجر کے پاس جا کر وہ بکروں میں سے ایک بکرا منتخب کر لیتا ہے اور تاجر اس کو بتا دیتا ہے کہ اس بکرے کا نرخ پچاس روپے کلو ہے اور اس بکرے کو خریدار کے سامنے وزن کر کے بتا دیتا ہے کہ مثلاً: یہ بیس کلو ہے۔ اب اگر خریدار اس کو قبول کر لے تو بیع منعقد ہو جائے گی اور اس طرح کی گئی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے۔ (حوالہ بالا)

خیارِ شرط کا ثبوت:

عقد میں اصل تو یہی ہے کہ ایجاب وقبول سے عقد مکمل ہو جاتا ہے، بیع مکمل ہونے کے بعد بائع پر لازم ہے کہ مبیع حوالہ کرے اور خریدار پر لازم ہے کہ قیمت ادا کر دے اس کے بعد فریقین میں سے کسی کو سودا ختم کرنے کا حق نہیں، البتہ بعض صورتوں میں شریعت مطہرہ نے اجازت دی ہے کہ ایجاب وقبول کے بعد بھی کچھ وقت کے لیے عقد کے منعقد ہونے کو موقوف رکھا جا سکتا ہے، مثلاً: فریقین میں سے کوئی ایک اپنے لیے شرط رکھے، امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ایسی صورت میں تین دن تک خیارِ شرط حاصل ہو جائے گا، شرط رکھنے والے کو اس مدت کے اندر اختیار ہوگا چاہے، بیع کو نافذ کرے چاہے سودا ختم کر دے، لیکن اگر تین دن گزر گئے اور اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو خود بخود عقد مکمل ہو جائے گا اگر عقد ختم کرنے کا ارادہ ہو تو فریق ثانی کو مطلع

کرنا ضروری ہے، ان کو مطلع کیے بغیر اکیلے عقد کو ختم کرنا شرعاً معتبر نہیں۔

قال ابو حنیفة رحمه الله: " أن اشتراط الخيار، شرط ينافي موجب العقد، وهو ثبوت الملك عند العقد، وانما عرفنا جوازه، بحديث حبان بن منقذ. على خلاف القياس وكان يخدع في البيوع، فقال صلى الله عليه وسلم: " إذا ابتعت فقل لا خلابة. " اي لا خديعة ولي الخيار ثلاثة ايام. "

(اخرجه ابو داؤد رقم: ۳۵۰۰، بداية المجتهد: ۱۷۵/۲)

خیارِ رویت:

عقد بیع صحیح ہونے کے لیے مبیع (مال) کا معلوم ہونا ضروری ہے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو اس لیے مال کو اچھی طرح دیکھ کر خریدنا چاہیے، تاہم اگر اوصاف بتا کر مال کو متعین کرلیا جائے تب بھی عقد صحیح ہو جائے گا، لیکن مال کو اگر دیکھے بغیر خرید لیا تو دیکھنے کے بعد خریدار کو اختیار ہوگا چاہے سودا برقرار رکھے یا واپس کردے۔

لقوله عليه السلام " من اشترى مالم يره فهو بالخيار اذا لراه.

اخرجه البيهقي في كتاب البيوع (السنن الكبرى: ۲٦٨/٥)

قال في الهندية: ومن اشترى شيئا لم يره فله الخيار إذا راه إن شاء اخذه بجميع الثمن وإن شاء رده سواء راه على الصفة التي وصفت له أو على خلافها. "

(الفتاوى الهندية: ۵۷/۳ الباب السابع في خيار الرؤية)

جملہ عیوب سے برأت کا اعلان کر کے کوئی چیز فروخت کرنا:

کسی چیز کے فروخت کے وقت اگر بائع یوں کہہ دے کہ آپ اچھی طرح دیکھ کر لے لیں بعد میں کوئی عیب نظر آئے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا اس طرح برأت کے اعلان کے ساتھ فروخت کرنا شرعاً جائز ہے، اب بعد میں خریدار کو کوئی عیب نظر آئے تو سودا واپس کرنے کا حق نہ ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: وصح البيع بشرط

البراءة من كل عيب وإن لم يسم خلافا للشافعي لأن البراءة من الحقوق المجهولة لا تصح عنده وتصح عندنا لعدم افضائه إلى المنازعة." (تنقيح الحامدية : ١/٢٧٣ باب خيار الروية)

خیارِ عیب کا حکم:

کوئی چیز خریدی اس کے بعد مشتری کسی ایسے عیب پر مطلع ہوا جو بائع کے پاس ہی مبیع میں موجود تھا اور مشتری کو خریدتے وقت اس کا علم نہ ہو سکا یا قدرے علم تو ہوا تھا لیکن مکمل علم نہ ہونے کی وجہ سے اس عیب پر رضا کا اظہار نہیں کیا تو ایسی صورت میں اب خریدار کو دو باتوں کا اختیار ہوگا چاہے کل قیمت پر مال کو اپنے پاس رکھ لے چاہے تو مال واپس کر کے اپنی ادا کردہ قیمت لے لے، اس بات کا اختیار نہیں ہوگا کہ مال اپنے پاس روک کر بائع سے نقصان کا عوض وصول کرے۔ الا یہ کہ بائع خود اس کے لیے تیار ہو جائے۔

قال في الاختيار : مطلق البيع يقتضي سلامة المبيع، وكل ما اوجب نقصان الثمن، في عادة التجار فهو عيب، إذا علم المشترى بالعيب عند الشراء او عند القبض وسكت فقد رضي به وإذا اطلع المشترى على عيب، فإن شاء اخذ المبيع بجميع الثمن، وإن شاء رده، وليس له اخذه واخذ النقصان الا برضاء البائع لأن الاوصاف لا يقابلها شئ من الثمن بالعقد .

(الاختيار لتعليل المختار للموصلي : ٢/١٨)

اخبارات کی خرید وفروخت:

اخبارات کی خرید وفروخت کا بنیادی مقصد چونکہ ملکی وغیر ملکی حالات وواقعات سے مطلع ہونا ہوتا ہے اس لیے فی نفسہ ان کی خرید وفروخت جائز ہے، باقی اخبارات میں جاندار کی تصاویر شائع کرنا حرام ہے، اس کا گناہ شائع کرنے والوں پر ہوگا، اخبار کے خریدار پر لازم ہے کہ ان تصاویر کو مقصدِ خرید نہ بنائے اسی طرح حتی الامکان ان تصاویر سے نظر بچانے کی کوشش کرے بلکہ اخبار لینے کے بعد پڑھنے سے پہلے تصاویر کے چہرے مٹا دے، ہاں البتہ جن اخبارات ورسائل کا مقصد ہی عریاں نیم عریاں تصاویر شائع کر کے فحاشی وعریانی کو فروغ دینا ہو ایسے اخبارات اور رسائل کو

خریدنا جائز نہیں ہے۔

قال العلامة فخر الدين الشهير بقاضيخان : إذا سال الرجل غيره الاخبار المحدثه في البلد قال بعضهم يكره الاخبار و الاستخبار و قال بعضهم لا يكره الاستخبار و يكره الاخبار و الصحيح انه لا بأس بالأخبار ايضا ليكون عالما بالمصالح .

(خانية على هامش الهندية : ٣/ ٤٢٥، فتاوىٰ حقانية بتغيير يسيرة)

بجلی کی خرید وفروخت کا حکم:

بجلی کی خرید وفروخت کا شرعاً کیا حکم ہے جبکہ حکومت مختلف لوگوں کو مختلف ریٹ پر بجلی فروخت کرتی ہے اور بجلی کوئی ایسا مال بھی نہیں ہے جو عین ہو اس کو اوصاف کے ذریعہ متعین کیا جا سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً قاعدہ یہ ہے کہ مال کی بیع جائز ہے، بجلی اگر چہ عین شئی نہیں ہے، تاہم وہ عرفاً مال سمجھی جاتی ہے، لہٰذا اس کی خرید وفروخت جائز ہے کیونکہ یہ بھی مال کے حکم میں داخل ہوگئی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : المال تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم .

(ردالمحتار : ٤/ ٥٠١ كتاب البيوع، مطلب في تعريف المال و الملك)

باقی اس کے ریٹ کا مختلف ہونا چونکہ یہ حکومت کی ملک ہے وہ رعایا کے حالات کے لحاظ سے اگر قیمت کم یا زیادہ رکھے تو اس میں کوئی حرج نہیں البتہ استعمال سے پہلے بتلا دے اور پھر اس کے مطابق ہی وصول کرے ہیرا پھیری اور دھوکہ سے اجتناب حکومت پر بھی لازم ہے۔

خودرو گھاس کی خرید وفروخت کا حکم:

خودرو گھاس کو کاٹنے سے پہلے فروخت کرنا جائز نہیں اگر چہ اپنی مملوکہ زمین میں اُگی ہو، البتہ اگر کسی نے اُگائی ہو یا باڑ وغیرہ لگا کر اس کی حفاظت کی یا پانی وغیرہ کے ذریعہ اس کو بڑھایا یا زمین کو ہموار کر کے گھاس اُگنے کے قابل بنایا تو ان صورتوں میں خودرو گھاس کی خرید وفروخت جائز ہوگی۔

كما روي عن النبي صلى الله عليه و سلم : عن رجل من مهاجرين من اصحاب النبي صلى الله عليه و سلم قال غزوت مع

النبي صلى الله عليه وسلم ثلاثا اسمعه يقول المسلمين شركاء في ثلاث الماء والكلاء والنار. (ابو داؤد: ۲/۱۲٦)

قال في الهندية: ولا يجوز بيع الكلاء واجارته وإن كان في ارض مملوكة غير أن لصاحب الارض ان يمنع الدخول في ارضه ... هذا إذا نبت بنفسه فاما إذا كان سقى الارض واعدها للانبات فنبت ففي الذخيرة والمحيط والنوازل يجوز بيعه لإنه ملكه وهو مختار الشهيد.

(الفتاوىٰ الهندية: ۱۰۹/۳، ومثله في البحر الرائق ٦/٧٧ باب البيع الفاسد)

خریدار کے مطالبہ پر مال دوسری جگہ سے منگوا کر دینا:

زید کو کتاب کی ضرورت ہے وہ کتب خانہ میں جا کر طلب کرتا ہے لیکن فی الوقت کتاب موجود نہیں، اس لیے وہ دوسری جگہ سے منگوا کر نفع لے کر زید کے ہاتھ فروخت کرتا ہے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

شرعاً یہ جائز نہیں البتہ کتاب آنے کے بعد یہ بیع منعقد ہوگی اس سے پہلے دونوں کو اختیار حاصل ہے مالک کو اختیار ہے چاہے زید کو فروخت کرے یا کسی اور کو اور زید کو بھی اس قیمت پر خریدنے اور نہ خریدنے دونوں باتوں کا اختیار ہے، البتہ اگر زید نے خریدنے کا وعدہ کیا ہو اور مالک نے فلاں تاریخ تک لا کر دینے کا وعدہ کیا ہو تو ایسی صورت میں طرفین کے لیے وعدہ کی پابندی لازم ہے، جو خلاف ورزی کرے گا وہ گناہگار ہوگا۔

بائع کو پیشگی رقم دے کر تھوڑا تھوڑا کر کے مال وصول کرنا:

بعض علاقوں میں دستور ہے کہ قصائی کو پیشگی رقم دے دی جاتی ہیں اور گوشت کی ایک قیمت مقرر کر کے روزانہ یا حسب ضرورت متعین گوشت وصول کیا جاتا ہے، اسی طرح دیگر اشیاء میں بھی یہی رواج ہے پیشگی رقم دینے کی وجہ سے قیمت میں بھی کچھ رعایت ہوتی ہے، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ حنفیہ کے نزدیک ناجائز ہے اس لیے کہ جو رقم پیشگی ادا کی گئی ہے یہ قرض ہے اور یہ رعایت قرض کی وجہ سے ہے

اور اس معاملہ کو بیع سلم بھی نہیں کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ اس میں کم سے کم مہلت ایک ماہ ہوتی ہے، البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک چونکہ بیع سلم میں اجل شرط نہیں ہے، اس لیے یہ معاملہ ان کے ہاں سلم میں داخل ہوسکتا ہے، چونکہ اس میں ابتلاء عام ہے، لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے قول پر عمل کی گنجائش ہے۔(بتعبیر امداد الفتاویٰ: ۳/ ۳۱)

ایڈوانس رقم دے کر رعایۃً اشیاء خریدنا:

موجودہ دور میں مختلف دواء ساز کمپنیاں ہیں جو زرعی ادویات یا دیگر مختلف قسم کی ادویات کا کاروبار کرتی ہیں، ان کے کاروبار کا ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کمپنی خریدار سے رقم ایڈوانس لے لیتی ہے اور پھر پانچ چھ ماہ بعد مقررہ مدت پر خریدار کو دواء دیتی ہے اور ایڈوانس رقم دے کر دواء خریدنے والے خریدار کو عام خریداروں کی بنسبت 20 یا 30 فیصد رعایت دیتی ہے، تو اس طرح ایڈوانس رقم دے کر رعایت کے ساتھ دواء وغیرہ خریدنا شرعاً جائز ہے اور اس میں عام خریدار کے مقابلے میں جو رعایت پہلے بکنگ کرانے والے کو ملتی ہے، اس کی دو حیثیتیں ہیں:

ایک حیثیت سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ خریدار نے کمپنی کو رقم قرض دی ہے اس لیے وہ قرض کے مقابلے میں رعایت دے رہی ہے، اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ رعایت شرعاً جائز نہ ہو، کیونکہ یہ ایک نفع ہے جو قرض سے حاصل کیا گیا ہے۔

لیکن دوسری حیثیت یہ ہے کہ یہ رعایت قرض کی وجہ سے نہیں بلکہ خریدار کے مستقل گاہک ہونے کی وجہ سے ہے اور چونکہ یہ تاجروں کا طریقہ ہے کہ اپنے مستقل گاہکوں کو رعایت دیا کرتے ہیں اس لیے وہ یہ رعایت دے رہے ہیں اور ایڈوانس رقم کا مطالبہ یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے ہے کہ یہ شخص واقعۃً مقررہ مدت پر دوائی ضرور خریدے گا، اس صورت میں یہ رعایت شرعاً جائز ہے اور ایسے معاملات میں جواز کی دوسری وجہ راجح معلوم ہوتی ہے، تاجروں کا عرف اور علماءِ عصر کا تعامل بھی اس کی تائید کرتا ہے۔(فقہی مقالات: ص ۶۹)

آرڈر پر مال تیار کرانے کا حکم:

کسی کمپنی وغیرہ سے نمونہ دکھا کر آرڈر لینا اور پھر مال تیار کر کے دینا جس کو فقہ کی اصطلاح میں استصناع کہا جاتا ہے، چونکہ اس کی عام ضرورت ہے اس لیے جائز ہے، البتہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک چیز تیار ہونے کے بعد خریدار کو خریدنے نہ خریدنے کا اختیار رہے، اسی طرح خریدار

کو دکھانے سے پہلے بنانے والے کو اختیار ہے آرڈر والے کے ہاتھ فروخت کرے یا نہ کرے ہاں خریدار کو دکھا دینے کے بعد اختیار ختم ہو جائے گا ہر حال میں اسی کو دینا ہوگا۔

لیکن امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جب معاہدہ طے پا گیا، ایجاب وقبول ہو گیا اب دونوں کا اختیار ختم ہو گیا، فریقین میں سے کسی کو بھی رجوع کا حق نہیں یہ بیع لازم ہو جاتی ہے۔ اسی فتویٰ پر عمل کر کے ہی استصناع پر عمل ہو سکتا ہے، ورنہ آرڈر کی تعمیل بہت مشکل ہے۔ باقی خیار رویت کا مسئلہ وہ نمونہ دیکھنے اور اوصاف بیان کرنے سے ساقط ہو گیا اور بنانے والے کا اختیار معاہدہ کی وجہ سے باطل ہو گیا۔

استصناع صحیح ہونے کی تین شرطیں:

استصناع (آرڈر) صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں:

1- کوئی مدت اس طرح مقرر نہ کی جائے کہ اس مدت سے پہلے لینا صحیح نہ ہو البتہ اندازہ اور مہلت کے لیے مدت کو بیان کر سکتے ہیں۔

2- مال تیار کرنے کے تمام اجزاء کاریگر کے ہوں، اگر اکثر خام مال خریدار کا ہو تو اجارہ ہو جائے گا اور اجرت کے احکام اس پر جاری ہوں گے اور اگر اکثر مال کاریگر کا ہے تو یہ بھی استصناع ہے۔

3- ایسی چیز بنوائی جائے جس کا عام رواج ہو گیا ہو، ایسی چیز نہ ہو جو غیر مستعمل اور غیر متعارف ہو ورنہ عقد فاسد ہوگا کیونکہ استصناع خلافِ قیاس جائز ہے جو چیز خلافِ قیاس جائز ہو وہ موضع ثبوت پر مقید رہتی ہے اس پر قیاس کر کے دوسری جگہ حکم نہیں لگا سکتے۔

البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب استصناع سے بیع لازم ہو جاتی ہے تو متعارف ہونے کی شرط لگانے کی ضرورت نہیں کیونکہ عام طور پر وہی چیز بنوائی جاتی ہے جو جدید قسم کی ہو اور خاص وضع کی ہو، امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی کے لیے لکڑی کا ممبر بنوایا حالانکہ اس سے پہلے ممبر متعارف تھا نہ مستعمل۔

مسئلہ: کتابوں کو پریس سے چھپوانا، نئے آلات اپنی فرمائش اور پسند سے بنوانا یہ سب استصناع میں داخل ہیں، جیسے الماری، شوکیس کوئی بھی نئے ڈیزائن کا بنوانا یہ سب استصناع کی صورتیں ہیں جو اس زمانہ میں عام اور بکثرت ہیں۔

(ماخوذ از عطریہ ھدایہ جدید : ص ۲۱٤)

نمونہ (سیمپل) کی دوا فروخت کرنا:

دواء ساز کمپنی کی طرف سے جو دواء ڈاکٹروں کو نمونہ اور سیمپل کے طور پر ملتی ہے، اس پر لکھا ہوتا ہے فروخت کے لیے نہیں، ڈاکٹروں کو ان دواؤں کا مالک نہیں بنایا جاتا بلکہ کمپنی ان کو اپنا نمایندہ بناتی ہے لہذا ڈاکٹروں کے لیے سیمپل کی دوا فروخت کرنا ناجائز اور حرام ہے، آمدن بھی حرام ہے، اگر ڈاکٹر دکانداروں کے ہاتھ فروخت کرے تو معلوم ہوتے ہوئے دکانداروں کے لیے خریدنا جائز نہیں، اگر علم نہ ہونے کی وجہ سے خرید لیا تو واپس کر کے ڈاکٹروں سے اپنی رقم واپس لے لے، اگر دکاندار صرف فروخت کر کے رقم ڈاکٹروں کو دے دے تب بھی گناہ کے کام میں تعاون ہونے کی بناء پر یہ عمل ناجائز ہے۔

قرعہ اندازی سے اشیاء خریدنا:

بعض دواء ساز کمپنیاں اپنی دوائی کی ایڈوانس بکنگ کرتی ہیں اور فی پیک ایک متعین قیمت کا اعلان کرتی ہیں اور بکنگ محدود وقت کے لیے اور محدود پیک دواؤں کے لیے ہوتی ہے اور جب مطلوبہ افراد ایڈوانس بکنگ کرائیں تو کمپنی ان میں سے چند محدود افراد کے لیے انعامات کا اعلان کرتی ہے، جس میں موٹر سائیکل، عمرے کا ٹکٹ اور دیگر چیزیں ہوتی ہیں اور یہ چیزیں ان افراد کے درمیان قرعہ اندازی سے تقسیم کی جاتی ہیں اور لوگ انعام کے لالچ میں اس طرح خریداری کرتے ہیں۔

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر مبیع یعنی برائے فروخت دوائی یا دیگر اشیاء کی اعلان شدہ قیمت وہی ہو جو عام بازار کی قیمت ہوتی ہے تب تو ایسی اسکیم میں شامل ہو کر قرعہ اندازی کے ذریعہ اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا بلاشبہ جائز ہے، البتہ اگر اس دوائی وغیرہ کی اعلان شدہ قیمت عام بازار کی قیمت سے زائد رکھی گئی ہو تو پھر اس طرح ایڈوانس بکنگ کرا کے قرعہ اندازی میں شامل ہو کر اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا جائز نہیں، کیونکہ اشیاء کی قیمت عام بازاری ریٹ سے زیادہ ہونے کی وجہ سے زائد قیمت جوئے میں شامل ہو جائے گی، اس لیے کہ زائد قیمت دینے والا انعام حاصل کرنے کی غرض سے اپنی زائد رقم داؤ پر لگائے گا اور اسی کو شریعت میں جوا کہا جاتا ہے، اس لیے ایسی اسکیم کے ذریعہ اشیاء خریدنا اور انعام حاصل کرنا جائز نہیں۔

انعامی کوپن یا کارڈ پر اشیاء خریدنا:

بعض دکاندار لوگ اپنے سامان کو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے کے لیے لوگوں کو ترغیبات دیتے رہتے ہیں، اگر کوئی ان کی دکان سے ان کی مقررہ کردہ مقدار تک سامان خریدتا ہے تو اسے ایک کوپن یا کارڈ دیا جاتا ہے، اس کوپن یا کارڈ میں قرعہ اندازی کے نمبر ہوتے ہیں اور خریدار کا نام نمبر کے ساتھ درج کیا جاتا ہے، پھر وہ خریدار اس کوپن یا کارڈ کو قرعہ اندازی کے دفتر میں جمع کروا دیتا ہے اور نمبر نکلنے کی صورت میں انعام دیا جاتا ہے تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر دکاندار سامان کی وہی قیمت لیتا ہے جو عام طور پر بازار میں ہوتی ہے، تو پھر انعام لینے کی نیت سے اس سے سامان خریدنا درست ہے اور انعامی کوپن یا کارڈ پر قرعہ اندازی کے ذریعہ جو انعام ملتا ہے اس کا لینا جائز ہے اور یہ انعام دکاندار کی طرف سے تبرع ہے، کسی چیز کا عوض نہیں ہے اور اگر خریدی ہوئی اشیاء انعامی کوپن کی وجہ سے بازاری قیمت سے زیادہ پر فروخت کی جارہی ہوں جبکہ وہی چیز انعامی کوپن کے بغیر کم قیمت پر مل رہی ہو تو اس صورت میں متوقع انعامات حاصل کرنے کی جستجو کرنا ناجائز اور حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ ایسی صورت میں یہ قمار میں داخل ہو جائے گا جو شرعاً حرام ہے۔

مقررہ وقت سے پہلے ادائیگی پر رعایت دینے کا حکم:

تاجر لوگ کمپنی سے ادھار پر مال خریدتے ہیں اور ایسے خریدار کے لیے کمپنی ایک تاریخ مقرر کر دیتی ہے کہ فلاں تاریخ تک پیسے ادا کرنے ہوں گے اور ساتھ یہ بھی بتا دیتی ہے کہ اگر فلاں تاریخ تک پیسے ادا کر دیے تو مثلاً: 10 فیصد رعایت ہوگی اور اگر اس سے تاخیر کی تو یہ رعایت نہیں ملے گی بلکہ پورے پیسے ادا کرنے ہوں گے اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر کمپنی تاجر کو مال ادھار پر دیتے وقت یہ کہے کہ فلاں متعین تاریخ مثلاً: دو ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرنی ہے، پھر اس معاملہ کے بعد تاجر کو یہ کہے کہ تم اگر اس تاریخ سے قبل ایک ماہ کے اندر اندر اس کی قیمت ادا کر دو گے تو دس فیصد رعایت کر دیں گے تو اب یہ خرید و فروخت شرعاً درست نہیں ہے، کیونکہ ایک ماہ بعد قیمت ادا نہ کرنے کی صورت میں رعایت ختم کر کے کمپنی جو رقم لے گی یہ مدت کے مقابلے میں ہوگی اور مدت کے مقابلے میں رقم وصول کرنا شرعاً سود ہے، اس لیے یہ معاملہ شرعاً جائز نہیں اور فقہی اصطلاح میں اس کو ضَعْ وتعجّل کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے، جسے فقہاءِ کرام نے سود ہونے کی وجہ

سے ناجائز قرار دیا ہے اور اگر کمپنی نے تاجر کو مال ادھار دیتے وقت مال کی قیمت کی ادائیگی کے لیے کوئی تاریخ متعین نہیں کی تھی اور نہ پہلے ادائیگی پر رعایت کی بات ہوئی تھی بلکہ یوں ہی مطلقاً معاملہ کیا ہے، پھر بعد میں تاجر کو کہا کہ اگر فلاں تاریخ تک ادا کر دو گے تو دس فیصد رعایت کر دیں گے تو اب یہ خرید، فروخت جائز اور درست ہے، اس لیے یہاں جو رعایت دی جارہی ہے وہ مدت کے مقابلے میں نہیں ہے اس لیے کہ یہاں پر ادائیگی کے لیے مدت سرے سے تھی ہی نہیں، لہذا شرعاً یہ معاملہ جائز ہے۔ (فقہی مقالات)

بائع کا غلطی سے کم قیمت پر فروخت کرنا:

اگر دکاندار کوئی چیز فروخت کر دے اور مشتری چیز لے کر قیمت بھی ادا کر دے پھر بعد میں بائع کہے کہ لسٹ میں اس کی قیمت زیادہ تھی میں نے دیکھا نہیں تھا یا غلطی سے کم بتا دیا تھا یا بھول گیا تھا تو ایسی صورت میں چونکہ فروخت مکمل ہو چکی ہے لہذا خریدار پر زائد پیسے دینا لازم نہیں ہے، البتہ اگر واقعۃً دکاندار کو مغالطہ ہوا ہے اور اس چیز کی قیمت بازار میں زیادہ ہے تو اسے زائد پیسے دے دینا مستحب اور بہتر ہے۔

(تکملة فتح الملهم : ١/ ٣٧٩،٨٠ مطلب في خيار المغبون، شرح المجلة : ٢/ ٣٣٥ ماده : ٣٨٦ والدر المختار : ٥/ ١٤٢)

(ماخوذ از جدید تجارت : ص ١٠٨)

بیع صرف کے احکام

بیع صرف کی تعریف:

وہ بیع جس میں ثمن اور مبیع دونوں سونا چاندی کی جنس سے ہوں۔

هو بيع الاثمان بعضها ببعض كبيع الذهب بالفضة او الدنانير بالدراهم .

بیع صرف کے جواز کی تین شرطیں ہیں:

1- اگر جنس واحد ہو تو برابر ہونا ضروری ہے، کمی زیادتی جائز نہیں۔

2- مجلس عقد میں عوضین پر قبضہ ہو جائے۔

3۔ ادھار بیع نہ ہو بلکہ نقد ہو۔(فقہ المعاملات المصارف)

نوٹوں کے عوض سونے چاندی کوخریدنے کا حکم:

رائج الوقت کاغذی نوٹ اور سکے سونے چاندی کے حکم میں نہیں، نہ ہی سونے اور چاندی کی رسید ہیں، لہٰذا ان کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے، چاہے زیوارت خریدیں یا اشرفی یا دراہم ان پر بیع صرف کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

سونا چاندی ادھار خریدنے کا حکم:

سونا یا چاندی اس طرح ادھار پر فروخت کرنا کہ مثلاً: سونے کے زیورات خرید لیے اور رقم کچھ ابھی دے دی اور کچھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا یا کل رقم ادھار ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ کاغذی نوٹ کے ذریعہ سے سونے چاندی کا لین دین بیع صرف کے حکم میں داخل نہیں ہے اس لیے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، شرط یہ ہے کہ عوضین میں سے کسی ایک پر مجلس عقد میں قبضہ ہو جائے تاکہ بیع بالکالی لازم نہ آئے۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : (تنبيه) سئل الحانوني عن بيع الذهب بالفلوس نسيئة فاجاب بأنه يجوز إذا قبض احد البدلين . (ردالمحتار : ٤/٢٠٥ باب الربوٰ كتاب البيوع)

وفي الهندية قال : وروي الحسن عن أبي حنيفه إذا اشترى فلوسا بدراهم وليس عند هذا فلوس ولا عند الآخر دراهم ثم إن احدهما دفع وتفرقا جاز وإن لم ينقد واحد منها حتى تفرقا لم يجز كذا في المحيط . (عالمگيريه : ٣/٢٢٤ الفصل الثالث في بيع الفلوس)

چیک سے سونا چاندی خریدنا:

چیک نوٹ ہی کے جاری ہوتے ہیں اور نوٹ ہی کی نمائندگی کرتے ہیں اور سونے چاندی کی خرید وفروخت نوٹوں سے ہوتی ہے، لہٰذا چیک سے سونا چاندی خریدنا جائز ہے، کیوں کہ وہ بیع صرف نہیں ہے اور تقابض شرط نہیں۔(احکام اوراق نقدیہ)

آرڈر پر زیور تیار کرنا:

زیور خریدنے والا، زرگر کو زیور بنانے کا آڈر دیتا ہے اور اس کے لئے پیشگی رقم بھی دیدیتا ہے

اور کہتا ہے کہ فلاں تاریخ تک تیار زیور چاہیے اور اس دوران زرگر اس رقم کو کاروبار میں لگا کر نفع حاصل کرتا ہے کیا ایسا کرنا درست ہے؟ اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ، زیور بنوانے والے کے لئے مناسب یہ ہے کہ زرگر سے ابتداء سونا خرید لے، قیمت خواہ اسی وقت ادا کی جائے یا ادھار معاملہ کیا جائے اور پھر سونا بنوائی کی اجرت طے کر کے سونا سنار کے حوالہ کیا جائے یا یہ کہ خرید وفروخت کا باقاعدہ معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ زیور کا آرڈر دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ باقاعدہ قیمت طے کر کے بیع کرنے کا مطالبہ کرے، تو رقم بطور قرض دی جاسکتی ہے، جو بعد میں زیور کی قیمت میں شمار ہو جائے گی، ان دونوں صورتوں میں زرگر خریدار سے حاصل شدہ رقم اپنے استعمال میں لاسکتا ہے اور جو تاریخ طے ہوئی ہے اس کی پابندی بھی شرعاً لازم ہے، شرعی عذر کے بغیر اگر تاخیر کرے گا تو معاہدہ کی خلاف ورزی کی وجہ سے گناہ گار ہوگا اور اگر باقاعدہ قیمت طے کر کے زیور بنوانے کا معاملہ کیا جائے اور پوری قیمت پیشگی دی جائے، خواہ تاریخ معین کی جائے یا نہ کی جائے تو اس کی بھی گنجائش ہے اور اس صورت میں بھی زرگر اس رقم کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے اور کاروبار کر کے نفع بھی حاصل کرسکتا ہے۔ (احکام اوراق نقدیہ)

کاریگر اور دکاندار کے درمیان سونے کا لین دین

زیورات کی تیاری:

سونے کا وزن میں برابر ہونا، معاملہ ہاتھ در ہاتھ نہ ہونا، یہ ایک اہم مسئلہ ہے جو مفصل سوال اور تفصیلی جواب کی شکل میں لکھا جاتا ہے، زیورات بنوانے کے لئے دکاندار کاریگر کو خالص سونا دیتا ہے اور کاریگر اس سے دوکاندار کی ہدایت کے مطابق زیور تیار کر کے دیتا ہے، زیورات کی تیاری کے لئے دوکاندار چند باتوں کا اہتمام کرتا ہے۔

(۱) خالص سونا دیتا ہے۔

(۲) ملاوٹ کی شرح بتا دیتا ہے

(۳) جتنے وزن کے زیورات مطلوب ہیں اس سے زیادہ وزن کا خالص سونا دیتا ہے، تا کہ مطلوبہ وزن کے زیورات اس سونے سے تیار ہوسکیں، زیورات کے مطلوبہ وزن کے برابر خالص سونا دینے سے مطلوبہ وزن کے زیورات نہیں بن سکتے، کیونکہ مطلوبہ وزن کے زیورات بنانے کے لئے زائد سونے کا استعمال ناگزیر ہے، اس کے بغیر زیور نہیں بن سکتا، اگر دوکاندار زائد

وزن کا سونا کاریگر کو نہ دے سکے، تو مجبوراً کاریگر اسی سونے میں زائد سونا اپنے پاس سے شامل کرتا ہے اور مطلوبہ وزن کے زیورات دوکاندار کو فراہم کرتا ہے، واضح رہے کہ کاریگر دوکاندار کی ہدایت کے مطابق جو زیورات تیار کرتا ہے، وہ عام طور پر اندازے سے تیار کرتا ہے، جس کی وجہ سے زیورات کا وزن ٹھیک ٹھیک وہ نہیں ہوتا، جو دوکاندار نے بتلایا تھا، کچھ کم اور کبھی کچھ زیادہ ہوجاتا ہے اور کبھی کبھار کاریگر نے بہت توجہ دی تو مطلوبہ وزن بھی ٹھیک ٹھیک حاصل ہوجاتا ہے، سونے اور زیورات کے لین دین کی ایک مثال درج ذیل ہے:

مثال:

دوکاندار کا سونا دینا	کاریگر سے زیورات لینا
خالص سونا دیا	ملاوٹ شدہ سونے کے زیور کا تیار کردہ وزن آیا
۱۰۰،۰۰ گرام	۷۲،۰۰ گرام
ملاوٹ بتائی	کام کی نوعیت کے اعتبار سے چھیجت بنی
۰۹،۰۰ گرام	۰۵،۰۰ گرام
کل وزن نام میں لکھا	باقی سونا کاریگر کے پاس بچا
۱۰۹،۰۰ گرام	۳۲،۰۰ گرام
	کل:......۱۰۹،۰۰ گرام

(نوٹ) مثال مذکور میں کاریگر کے پاس جو زائد سونا ۳۲ گرام ملاوٹ شدہ بچا ہے دوکاندار اس کے بدلے میں کاریگر سے ملاوٹ کا ۳ گرام وزن کم کر کے ۲۹ گرام خالص سونا وصول کرتا ہے، واضح ہو کہ تمام معاملات دوکاندار اور کاریگر کے درمیان باقاعدہ اجرت کی بنیاد پر طے پاتے ہیں اور معاملہ کے اختتام پر اجرت کا لین دین ہوتا ہے۔

سوال: مذکورہ بالا صورت حال کے متعلق چند سوالات درج ذیل ہیں:

(ا) دوکاندار خالص سونا کاریگر کے سپرد کرتا ہے اور دوکاندار کی ہدایت کے مطابق ملاوٹ کر کے زیورات تیار کرتا ہے اور دوکاندار کے حوالے کرتا ہے اور دکاندار اسی وقت حساب کر کے جو سونا کاریگر کے پاس زائد بچا ہے چھیجت کاٹ کر باقی کے بدلے خالص سونا وصول کر لیتا ہے، شرعاً اس کی کیا حیثیت ہے۔

اس میں یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ دوکاندار نے خالص سونا کاریگر کو دیا تھا اور اس میں کچھ ملاوٹ شامل کروائی تھی، اب آخر میں زائد ملاوٹ شدہ سونا جو کاریگر کے پاس بچا ہے اس کے بدلے میں خالص سونا وصول کرتا ہے اس میں کوئی قباحت تو نہیں؟ جبکہ یہ معاملہ باہمی رضامندی سے ہوتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ کاریگر زائد بچا ہوا سونا، اسی وقت نہیں دیتا، جس وقت اس نے زیورات بنا کر دوکاندار کو دیئے ہوں، بلکہ وہ چھیجت چھوڑ کر باقی سونے کے بدلے میں خالص سونا ایک دودن کے بعد دینے کا وعدہ کرتا ہے، اس میں دونوں طرف سونا ہے ایک دوکاندار کا زائد سونا ہے جو کاریگر کے پاس ہے اور کاریگر اس کے بدلے میں اپنے پاس سے دوسرا خالص سونا دیتا ہے، اس طریقہ سے سونے کا تبادلہ ہاتھ در ہاتھ نہیں ہوتا، اس میں شرعاً کیا حکم ہے؟

اس مسئلہ کا شرعی حکم یہ ہے کہ:

(الف) مطلوبہ زیور تیار کرنے کے بعد جو سونا کاریگر کے پاس بچ گیا ہے، دوکاندار کو اختیار ہے کہ وہ اپنی امانت بعینہٖ واپس لے لے یا باہمی رضامندی سے اس کے بدلے خالص سونا لے لے، لیکن خالص سونا لینے کی صورت میں یہ سونے کی سونے سے ہونے والی ''بیع صرف'' جس میں یہ شرط ہے کہ دونوں طرف وزن برابر ہو اور ایک ہی مجلس میں دوکاندار اور کاریگر اپنے اپنے سونے پر قبضہ کرلیں (جس کی صورت یہ ہے کہ کاریگر بچا ہوا سونا مجلس عقد میں لیکر آجائے اور سودا طے ہوتے ہی اس پر دوبارہ قبضہ کرلے اور دوکاندار خالص سونے پر قبضہ کرلے) اگر اس طرح کرنا دشوار ہو تو اس کی متبادل آسان اور جائز صورت یہ ہے کہ بچے ہوئے سونے کے بدلے سونا لینے کے بجائے پیسے لینا طے کرلیں، اس صورت میں جو بھی قیمت باہمی رضامندی سے طے ہو جائے جائز ہے اور اس میں ایک ہی مجلس میں سونے اور پیسوں پر قبضہ ضروری نہیں، بلکہ ان میں سے کسی ایک پر قبضہ کافی ہے۔

فی در المختار (۲۸۹:۵) "ولو اشتری المودع الودیعة الدارهم بدنانیر وافترقاقبل ان یجدد لمودع قبضا فی الودیعة بطل الصرف بخلاف المغصوبة، لان الغصب ینوب عن قبض الشراء بخلاف الودیعة."

(ب) اس صورت میں کاریگر جو بچے ہوئے سونے کے بدلے میں خالص سونا دینے کا وعدہ کررہا ہے، تو اس وقت بیع نہیں ہے، بلکہ وعدہ بیع ہے جس میں فی الحال دونوں طرف قبضہ ضروری نہیں ہاں جس وقت کاریگر سونا ادا کریگا اس وقت بیع ہوگی، اس وقت دونوں جانب سونے کا برابر ہونا اور ایک ہی مجلس میں دونوں طرف سے قبضہ کرنا ضروری ہوگا۔

یاد رہے کہ جس صورت میں کاریگر کو اپنی طرف سے زائد سونا ملانا پڑتا ہے تو اس زائد سونے کے بدلے سونا دینا طے کرنا جائز نہیں ہے (کیوں کہ زائد سونا ملاتے ہی تعاطی کے ذریعہ بیع ہو جائیگی اگر بدلے میں سونا دینا طے ہو تو یہ بیع صرف ہوتی ہے جس میں تقابض شرط ہے اور سونا چونکہ بعد میں دیا جاتا ہے اس لئے جائز ہے) لہٰذا اس زائد سونے کے بدلے پیسے دینا طے کیا جائے اس صورت میں چونکہ جانبین سے قبضہ ضروری نہیں اس لئے بیع جائز ہوگی۔

تیار زیورات کے لین دین میں ادھار کے معاملات

(۱) سونے کے زیورات کے ادھار لین دین میں ایک صورت یہ رائج ہے کہ زیورات کا تاجر یا کاریگر تیار شدہ سادہ اور جڑاؤ زیورات دوکاندار کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے اور عوض میں سونا لینا طے ہوتا ہے، لیکن عوض کا سونا نقد اور ہاتھ در ہاتھ ادا نہیں کیا جاتا، بلکہ ایک خاص مدت تک کے لئے اس کی ادائیگی کو طے کرلیا جاتا ہے۔

مثلاً ۵ تولے سونے کے وزن کا زیور دوکاندار کو فروخت کیا اور اس کے عوض میں ۵ تولے سونا ایک ہفتہ کے بعد دینا طے ہوا، شرعاً اس کا کیا حکم ہے۔

(۲) بعض مرتبہ بدلے کا سونا طے شدہ مدت پر پورا ادا نہیں کیا جاتا، بلکہ آدھا یا اس سے کم وبیش ادا کیا جاتا ہے، اسطرح مختلف قسطوں میں عوض کے سونے کی ادائیگی ہوتی ہے، ۵ تولہ سونے کے زیورات کے عوض میں ۵ تولہ سونا ایک ہفتہ کے بعد دینا طے پایا، جب کاریگر ایک ہفتہ کے بعد سونا لینے آتا ہے تو دوکاندار اس کو ۲ یا ۳ تولہ سونا اس وقت دے دیتا ہے، باقی مزید ایک ہفتہ کے بعد دیتا ہے۔

اور بعض مرتبہ عوض کا سونا مقررہ مدت پر دوکاندار کاریگر کو نہیں دیتا بلکہ ٹال دیتا ہے اس طرح ہفتوں اسے ٹالتا رہتا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟

اس مسئلہ کا شرعی حکم یہ کہ سونے کے زیورات کو سونے کے بدلے ادھار فروخت کرنا جائز

نہیں، اس میں ضروری ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ ایک ہی مجلس میں زیورات اور سونے کا تبادلہ کریں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو اس طرح بیچنا جائز نہیں اس کا آسان حل یہ ہے کہ سونے کے زیورات کو سونے کے بدلے میں فروخت نہ کریں، بلکہ پیسوں کی بدلے فروخت کریں، کیونکہ سونے کے زیورات کی پیسوں کے بدلے ادھار خرید وفروخت جائز ہے، جبکہ ادھار کی مدت طے ہو، پھر جب رقم کی ادائیگی کا وقت آجائے تو مقررہ پیسے لے لیں یا اس کی بجائے اس دن کے نرخ کے مطابق سونا لے لیں۔

دوسرا حل یہ ہے کہ جب کاریگر دوکاندار کے پاس تیار زیورات لیکر آئے اور دوکاندار کے پاس قیمت ادا کرنے کے لئے سونا نہ ہو تو وہ اس قدر سونا کسی سے قرض لے لے اور اس سونے کے بدلے کاریگر سے زیور خرید لے اور ایک ہی مجلس میں زیورات اور سونے کا تبادلہ کرلیں اور قبضہ کرلیں، پھر دوکاندار بعد میں قرض لیا ہوا سونا ادا کرے۔

(۳) سونے کے زیورات کی خرید وفروخت کا یہ طریقہ کارنا جائز ہے اس کا حل وہی ہے جو اوپر لکھا گیا ہے کہ زیورات پیسوں کے بدلے فروخت کئے جائیں اور ادھار والی قیمت طے کرلیں اور ادھار کی مدت مقرر کرلیں پھر جب وہ مدت آجائے تو چاہے مقررہ رقم لے لیں یا باہمی رضامندی سے اس دن کے نرخ سے اس قیمت کا سونا لے لیں۔

کاریگر کے پاس بچے ہوئے سونے کا حکم

(۱) زیورات بنوانے میں ایک طریقہ یہ بھی رائج ہے کہ دوکاندار خالص سونا کاریگر کے حوالے کرتا ہے اور ملاوٹ کی شرح بھی بتادیتا ہے اور مطلوبہ زیورات بنانے کی ہدایت بھی کردیتا ہے اور کاریگر کے پاس جو زائد سونا بچا ہوا ہو وہ واپس نہیں لیا جاتا، بلکہ کاریگر کے پاس ہی رہتا ہے اور نہ ہی دوکاندار کاریگر کو دوسرا خالص سونا دیتا ہے، اس طرح سے دوکاندار اور کاریگر کا یہ لین دین مزید زیور کے لئے مسلسل جاری رہتا ہے، دوکاندار کی طرف سے سونا آتا رہتا ہے اور کاریگر کی طرف سے زیورات تیار ہوکر آتے رہتے ہیں، دوکاندار اور کاریگر دونوں سونے اور زیورات کے لین دین کا باقاعدہ حساب تحریری کرتے رہتے ہیں اور حسب منشاء دو چار ہفتوں میں حساب کتاب ملالیتے ہیں لیکن بچا ہوا زائد سونا واپس نہیں لیتے اس طرح یہ معاملہ بغیر کسی حد پر ختم ہوئے سالہا سال چلتا رہتا ہے جس میں اکثر دوکاندار کا سونا کاریگر کے پاس ہی رہتا ہے۔

لیکن کبھی کبھار کاریگر کا سونا دوکاندار کی طرف نکلتا ہے اور وہ دوکاندار سے فوری طلب کرتا ہے، دوکاندار عام طور پر کچھ تاخیر سے وہ سونا لوٹا دیتا ہے، اسی طرح جب دوکاندار کا سونا کاریگر کی طرف نکلتا ہے اور دوکاندار اس سے طلب کرتا ہے تو وہ بھی تاخیر سے ادا کرتا ہے اس طرح اس پورے معاملہ میں جانبین کی طرف زائد نکلنے والے سونے کو تاخیر سے لوٹانے کی شرعاً کیا حیثیت ہے جبکہ صورتحال بظاہر سونے کے بدلہ سونے کی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ یہاں بھی سونے کے دوکاندار اور کاریگر کے درمیان جو تبادلہ ہوتا ہے، وہ تحریری حساب میں چھیجت جوڑ کر اور ملاوٹ کے تناسب سے وزن جوڑ کر حساب میں برابر کرلیا جاتا ہے۔ لیکن عملاً وزن برابر نہیں ہوتا، جیسا کہ اس سے پہلے سوال میں لکھا گیا ہے۔

(۲) اوپر جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ جانبین سے خالص سونا دینے کی ہے اور اگر خالص سونے کے بجائے ملاوٹ شدہ سونا ہی جانبین سے دیا جائے (جبکہ غالب سونا ہو اور ملاوٹ مغلوب ہو) اور باقی صورتحال وہی ہو جو اوپر لکھی گئی ہے تو پھر شرعی حکم کیا ہوگا؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ

(۱) جو سونا کاریگر کے پاس بچا ہے وہ امانت ہے اس کی ادائیگی فی الحال ضروری نہیں، لہٰذا اگر سالہا سال تک وہ سونا کاریگر کے پاس رہے تو یہ جائز ہے، لیکن جب بھی کاریگر بچے ہوئے سونے کے بدلے دوسرا سونا دوکاندار کو ادا کرے گا تو یہ بیع صرف ہوگی، اس میں دونوں طرف سے برابری اور قبضہ ضروری ہے۔

(یعنی کاریگر مجلس بیع میں وہ بچا ہوا سونا حاضر کرے پھر دکاندار کو اپنا سونا دیکر قبضہ کرادے اور خود بھی بچے ہوئے سونے پر قبضہ کرلے، یاد رہے کہ اس صورت میں کاریگر کا سابقہ قبضہ کافی نہیں بلکہ عقد کے وقت تجدید قبض ضروری ہے)

کاریگر کا جو سونا دوکاندار کی طرف نکلتا ہے تو اس کے بارے میں وضاحت گزر گئی کہ اس کے بدلے میں سونا دینا طے کرنا جائز نہیں ہے بلکہ رقم دینا طے کیا جائے رقم طے ہونے کی صورت میں فی الفور ادائیگی ضروری نہیں بلکہ تاخیر بھی جائز ہے اور اگر کاریگر چاہے تو اسی رقم کے بدلے دوکاندار سے بعد میں سونا خرید لے۔

(۲) ملاوٹ شدہ سونے کا وہی حکم ہے جو خالص سونے کا ہے۔

ٹانکے کا شرعی حکم:

زیورات بنانے کے دوران ایک مرحلہ یہ آتا ہے کہ سونے سے بنائے ہوئے سونے کے مختلف ٹکڑوں میں جوڑ کر زیور تیار کرنا ہوتا ہے، انہیں جوڑنے کے لئے ٹانکہ استعمال ہوتا ہے جو ضروری ہے کیونکہ بغیر ٹانکے کے سونے کے زیورات کے یہ مختلف حصے آپس میں نہیں جڑ سکتے مثلاً زیور میں مختلف پھول، پتیاں الگ الگ بنائی جاتی ہیں، مختلف کنڈے موقع بہ موقع چپکائے جاتے ہیں جیسے مثلاً چوڑی کے ۲ سرے باہم ملا کر جوڑے جاتے ہیں جس کے لئے ٹانکہ استعمال ہوتا ہے۔

ٹانکہ کی حقیقت اور قسمیں:

ٹانکہ اس سونے یا اس دھات کو کہتے ہیں جو زیور کے سونے سے پہلے پگھل جائے اور دو ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ دے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

(۱) ایک ٹانکہ وہ کہلاتا ہے جو سونے سے تیار کیا جاتا ہے، جس میں چاندی اور تانبہ کی ایک خاص مقدار سونے میں شامل کی جاتی ہے مثلاً ایک تولہ سونے میں ۱۰ ماشہ چاندی اور ۶ ماشہ تانبہ ملایا جاتا ہے اس طرح کل دو تولہ ٹانکہ حاصل ہو جاتا ہے، اس قسم میں عموماً آدھی مقدار سونے کی اور آدھی مقدار دوسری دھاتوں کی ہوتی ہے، جیسا کہ مثال سے واضح ہے۔

(۲) دوسری قسم کا ٹانکہ "کاڈمیم" کا ٹانکہ کہلاتا ہے، کاڈمیم ایک خاص قسم کی دھات ہے جس کی تھوڑی سی مقدار سونے میں ملانے سے حسب ضرورت ٹانکہ حاصل ہو جاتا ہے، مثلاً: ایک تولہ ملاوٹ شدہ سونے میں ڈیڑھ ماشہ کاڈمیم ملایا جاتا ہے اور ٹانکہ بن جاتا ہے، یہ اعلیٰ قسم کا ٹانکہ کہلاتا ہے اس میں کاڈمیم دھات کی ملاوٹ بہت کم ہوتی ہے اور جس قدر ہوتی ہے تیاری کے دوران اس میں سے بھی کچھ مقدار اڑ جاتی ہے اور برائے نام باقی رہتی ہے۔

ٹانکہ کی مروجہ صورتحال

عام طور پر ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ پہلی قسم کا ٹانکہ لگانے کا دستور ہے اس قدر ٹانکہ استعمال کرنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو، کاریگر اتنی مقدار میں ٹانکہ ہر زیور میں عموماً لگا دیتے ہیں، حالانکہ بعض اوقات ایک تولہ سونے کے زیور میں ۲ تا ۳ رتی ٹانکہ بھی کافی ہوتا ہے مگر پھر بھی تول کر ایک ماشہ ٹانکہ پورا لگا دیا جاتا ہے، اس طرح ایک ماشہ ٹانکہ لگانے اور لگوانے کو معیوب نہیں

سمجھا جاتا، خواہ وہاں ایک ماشہ ٹانکہ سے کم لگانے سے بھی ضرورت پوری ہوجاتی ہو بلکہ اس قدر ٹانکہ لگانا معیار کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔

نیز واضح رہے کہ ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرنے کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ زیور بنائی کی اجرت اور چھیجت کے معاملات جو دوکاندار اور کاریگر کے مابین طے ہوتے ہیں ان میں ٹانکہ کا پہلو مدنظر ہوتا ہے۔

کیوں کہ زیور بنانے میں کاریگر کی ایک اجرت ہوتی ہے، دوسرے اس کو ٹانکہ لگانے کی صورت میں سونا بچتا ہے، اب اگر ایک ماشہ سے کم ٹانکہ لگایا، تو اس کو کم سونا بچے گا، جس کے لئے وہ زیادہ اجرت کا مطالبہ کریگا تا کہ اس کی وہ آمدنی مکمل ہوجائے جو اس کو ایک ماشہ ٹانکہ لگانے پر ملتی ہے اور نیز ایک ماشہ سے کم ٹانکہ استعمال کرنے میں ہر ایک زیور کا الگ انداز سے معاملہ کرنا پڑے گا، جس میں بہت سی مشکلات ہوں گی، اس لئے عام طور پر ایک تولہ زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرنا رائج ہے۔

اس سلسلے میں سوالات یہ ہیں:

(۱) جب ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ سے کم کی ضرورت ہو اور کاریگر پورا ایک ماشہ ٹانکہ استعمال کرلے، جب کہ دوکاندار بھی بلاضرورت ایک ماشہ ٹانکہ لگانے پر اس لئے راضی ہے کہ اس کو زیورات بنوانے کی اجرت زیادہ نہ دینی پڑے اور کاریگر اس لئے ضرورت سے زیادہ ٹانکہ لگا رہا ہے کہ زائد ٹانکہ اس کی آمدنی کا ایک حصہ ہے، اس طرح دوکاندار اور کاریگر دونوں دستور کے مطابق بلاضرورت بھی زائد ٹانکہ لگانے پر رضامند ہیں، شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

(۲) ٹانکہ کے استعمال کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ کاریگر ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ ٹانکہ سے زیادہ مقدار میں بلاضرورت ٹانکہ استعمال کرلیتا ہے، محض اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے اور پھر وہ اس کو ظاہر بھی نہیں کرتا بلکہ ایک تولہ میں ایک ماشہ ٹانکہ ہی کہہ کر زیورات دیتا ہے، ایسا کرنے کا کیا حکم ہے؟

نیز یہ کہ اگر دوکاندار کاریگر کو ایسا کرنے کے لئے کہے، یا دونوں باہم مل کر اپنی اپنی آمدنی کی خاطر یہ ٹانکہ لگوائیں اور بغیر بتائے فروخت کریں تو کیا حکم ہے؟

(۳) اگر کاریگر دوکاندار کی ہدایت کے خلاف ایک تولہ سونے کے زیور میں ایک ماشہ سے

زیادہ ٹانکہ استعمال کرے، مثلاً: ڈیڑھ یا دو ماشہ اور وہ بعد میں کسی وقت اس زیور کی جانچ پڑتال میں ثابت ہو جائے تو اس کا تاوان کاریگر سے لینا دوکاندار کے لئے جائز ہے یا نہیں؟

اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ

(۱) جب دکاندار ایک تولہ سونا میں ایک ماشہ ٹانکہ لگوانے پر راضی ہے تو کاریگر کو ایک تولہ سونے میں ایک ماشہ ٹانکہ لگانا جائز ہے، البتہ جب دکاندار گاہک کو یہ زیور فروخت کرے تو اسے یہ بتانا چاہیے کہ اس میں ایک ماشہ سونے کی بجائے ایک ماشہ ٹانکہ شامل ہے یہ بتانا چاہے زبانی ہو یا تحریری۔

(۲) یہ سراسر جھوٹ اور دھوکہ ہے جو کاریگر اور دوکاندار دونوں کے لئے حرام ہے البتہ اگر دکاندار اور کاریگر دونوں اس پر راضی ہوں تو ایک ماشہ سے زیادہ مقدار میں ٹانکہ لگانا بھی جائز ہے لیکن گاہک کو فروخت کرتے وقت اس کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

(۳) بنوائی کے وقت اگر سونے کے وزن کے اعتبار سے معاملہ طے کیا گیا تھا تو اس صورت میں دکاندار کے لئے کاریگر سے تاوان لینا جائز ہے۔

فی الدر المختار :"وضمن بصبغه اصفر وقد امربا حمر قيمة ثوب ابيض وان شاء المالك اخذه واعطاه مازا دالصبغ فيه ولا اجر له. (٦:٢ ٤) (ماخوذ از جدید تجارت کے شرعی احکام مؤلفه مفتی کمال الدین صاحب)

کرنسی نوٹوں کا حکم:

کرنسی نوٹ کے متعلق حضرات فقہاءِ کرام کی قدیم تحقیق یہ تھی کہ براہِ راست ثمن نہیں بلکہ اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ سونا اور چاندی جو ثمن خلقی ہیں یہ نوٹ اس کی دستاویز اور سند کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹ کے متعلق جو تحقیق سامنے آئی ہے اس کی رو سے یہ کرنسی نوٹ ثمن ہی ہیں، البتہ ان کو ثمن عرفی کہا جاتا ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ میں ان کی ماہیت اور حقیقت یکسر تبدیل ہوگئی ہے اور سونے چاندی کے ساتھ کرنسی نوٹ کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا، اسی طرح ان نوٹوں نے پوری طرح سونے اور چاندی کی جگہ لے لی، یعنی اب یہ نوٹ سونے چاندی کی دستاویز کے طور پر استعمال نہیں ہوتے بلکہ فرضی قوتِ خرید کی نمائندگی کر رہے ہیں اور

حکومت کی طرف سے ہر شخص مجبور ہے کہ ان کو عوض کے طور پر قبول کرے، لہٰذا یہ کرنسی نوٹ عرفاً قانوناً ثمن ہی متصور ہوتے ہیں۔

ملکی کرنسی نوٹوں کا تبادلہ:

اگر ایک ہی ملک کی کرنسیوں کا آپس میں تبادلہ کیا جائے یعنی خرید وفروخت تو چونکہ جنس ایک ہی ہے، اس لیے ایک جانب سے مجلس عقد کے اندر قبضہ ضروری ہے تا کہ افتراق دین بدین لازم نہ آئے اور اس میں کمی زیادتی بھی جائز نہیں، اگر کمی بیشی کریں گے تو سود لازم آئے گا جو کہ حرام ہے۔

نئے نوٹ کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کا حکم:

بعض لوگ عیدی وغیرہ بانٹنے کے لیے یا کسی اور مقصد کیلئے نئے نوٹ حاصل کرتے ہیں اب جن کے پاس نئے نوٹ ہیں وہ زیادہ رقم وصول کرتے ہیں مثلاً: ہزار روپے کے دس والے نئے نوٹ کو ایک ہزار دس یا بیس روپے میں فروخت کرتے ہیں شرعاً یہ ناجائز ہے کیونکہ قانونی طور پر نئے اور پرانے نوٹوں کی قیمت برابر ہے۔ اس لیے دس بیس روپے جو زائد لیے یہ سود ہوا جو کہ حرام ہے۔

ریز گاری فروخت کرنے کا حکم:

گاڑی والوں کو اسی طرح بعض دکانداروں کو کھلے پیسوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ پان کی دکان والوں سے یا کھلے پیسے فروخت کرنے والوں سے زیادہ رقم دے کر سکے خریدتے ہیں، شرعاً یہ خرید وفروخت ناجائز اور حرام ہے کیونکہ قانونی طور پر سکے اور نوٹوں کی قیمت برابر ہے، لہٰذا زائد رقم یعنی مثلاً: دس کا نوٹ دے کر 9 روپے کے سکے وصول کیے تو ایک روپے سکے فروش کے حق میں سود ہوا اس کا استعمال اس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح دینے والا بھی سود دینے کی وجہ سے گناہگار ہوا، بعض لوگ کہتے ہیں کیا کریں راستہ میں ضرورت پڑ جاتی ہے اب سکے کہاں سے لائیں؟ یہ اعتراض فضول ہے کیونکہ اس کا حل یوں نکل سکتا ہے کہ اڈے سے نکلنے سے پہلے ہی اس کا انتظام کرلیا جائے کہ گزشتہ کل جو سکے جمع ہو گئے تھے اگلی صبح کے لیے اس کو محفوظ رکھا جائے۔ صبح صبح اس کو ساتھ لے کر اڈے سے روانہ ہوا جائے۔ البتہ اگر یہ صورت اختیار کی جائے کہ دس روپے کے عوض نو روپے کے سکے اور کوئی معمولی چیز مثلاً: چار آنے والی ٹافی یا چاکلیٹ وغیرہ دیدیں۔ اس

طرح کرنے سے یہ معاملہ جائز ہو جائے گا اور دونوں فریق گناہ سے بچ جائیں گے۔

مختلف ممالک کی کرنسی کی تجارت:

دوملکوں کی کرنسی چونکہ مختلف الاجناس اشیاء میں داخل ہے اسی وجہ سے ان کے نام کی اکائیاں وغیرہ مختلف ہوتی ہیں جب دونوں کی جنس مختلف ہے تو ایک ملک کی کرنسی کو دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس کا کاروبار کرنا بھی جائز ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ مجلس عقد میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک فریق کا متبادل کرنسی پر قبضہ ہو جائے، اگر کسی ایک فریق کا بھی مجلس عقد میں متبادل کرنسی پر قبضہ نہ ہوا بلکہ معاملہ کر کے دونوں فریق بعد میں ادائیگی کے وعدہ پر جدا ہو گئے تو یہ جائز نہیں، کیونکہ اس میں افتراق دین بدین لازم آتا ہے جو کہ حدیث کی رو سے ممنوع ہے:

قال العلامة برهان الدين المرغيناني رحمه الله : واذ عدم الوصفان الجنس والمعنیٰ المضموم اليه حل التفاضل والنساء لعدم العلة المحرمة والاصل فيه الاباحة واذا وجد احرم التفاضل والنساء لوجود العلة وإذا وجد احدهما وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النساء . (الهداية على فتح القدير : ١٥٣/٦ باب الربو)

حکومت کی طرف سے غیر ملکی کرنسیوں کے ریٹ مقرر کرنا:

آج کل کرنسیوں کا کاروبار عام ہو گیا ہے اس کے لیے با قاعدہ مارکیٹ وجود میں آ گئی ہے بڑے پیمانے پر یہ کاروبار ہو رہا ہے، اب اس میں حکومت مختلف ممالک کی کرنسیوں کے ریٹ مقرر کر دیتی ہے، لیکن لوگ بلیک مارکیٹ میں حکومتی ریٹ کی بجائے اپنی مرضی سے ریٹ لگا کر خرید و فروخت کرتے ہیں، جو حکومت کے ریٹ سے مختلف ہوتا ہے اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جب دونوں کرنسیاں جنس کے اعتبار سے مختلف ہوں تو کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا جائز ہے اور اس کمی زیادتی کی شرعاً کوئی حد مقرر نہیں، بلکہ یہ فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، اب عاقدین جس ریٹ پر متفق ہو جائیں جائز ہے، بشرطیکہ دھوکہ اور فریب نہ ہو۔

لیکن بلیک مارکیٹ میں اس طرح معاملہ کرنا چونکہ اس قانون کی خلاف ورزی ہے جو اجتماعی مفاد کے لیے حکومت کی طرف سے نافذ ہے اس لیے اس خارجی سبب کی وجہ سے بلیک مارکیٹ

میں لین دین کی اجازت نہ ہوگی، کیونکہ فقہ کا قاعدہ ہے کہ جائز امور میں حکومتی قوانین کی پابندی واجب ہے، البتہ اس آمدنی کو حرام نہیں کہا جائے گا۔

(ماخوذ از فقہی معاملات مع اضافہ و ترمیم: ۱۱/ ۴۰)

ہنڈی کے کاروبار کا حکم:

ہنڈی کے کاروبار کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ فیروز اللغات میں ہنڈی کی تعریف یہ لکھی ہے کہ وہ رقعہ جو ساہوکار ایک جگہ سے دوسری جگہ روپے دینے کے لیے دیتا ہے، اس وقت دنیا میں یہ کاروبار عام ہوگیا ہے، مثلاً: ایک شخص پاکستان میں ہے وہ اپنے ملک، برما، بنگلادیش روپے بھیجنا چاہتا ہے لیکن قانونی پیچیدگیوں کی بناء پر بینک کے ذریعہ نہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ وہ یہاں ہنڈی کے کاروبار کرنے والے کو پاکستانی روپے حوالہ کرتا ہے، اس سے ایک تحریر لے کر اپنے رشتہ دار کے نام ارسال کرتا ہے وہ حسب وعدہ وہاں ہنڈی کے کاروبار کرنے والے سے رقم وصول کرتا ہے یہ کاروبار خلاف قانون تو ہے کیا خلاف شرع بھی ہے؟ یا شرعاً جائز ہے نیز اس میں ایک تیسرا شخص بھی ہوتا ہے جو رقم بھیجنے والوں کو تلاش کر کے ہنڈی والے تک پہنچاتا ہے اور اپنی دلالی کی اجرت وصول کرتا ہے، اس کا کیا حکم ہے، نیز اس میں کمی زیادتی کے ساتھ خرید و فروخت ہوتی ہے اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کا جواب دارالافتاء دارالعلوم کراچی سے جو موصول ہوا اس کو بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

بحالات موجودہ نوٹ ثمن عرفی بن چکے ہیں، لہٰذا ایک ملک کے نوٹوں کا دوسرے ملک کے نوٹوں سے کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنا شرعاً جائز ہے۔ یہ تبادلہ ربوا نہیں، البتہ عقد کے وقت یہ ضروری ہے کہ جس مجلس میں تبادلہ ہوا اس میں کم از کم ایک فریق روپے پر قبضہ کر لے، دوسرا فریق چاہے اسی وقت قبضہ کر لے چاہے بعد میں قبضہ کرے تاکہ افتراق عن دین بدین لازم نہ آئے۔

بعد میں قبضہ کرنے کی صورت میں یہ شبہہ نہ کیا جائے کہ نسیئۃً بیع ہونے کی وجہ سے ربوا ہے، اس لیے کہ نوٹ فلوس کے حکم میں ہیں، فلوس کی بیع اور تبادلہ میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ عاقدین میں سے ایک جانب فلوس پر قبضہ کر لے دوسری جانب خواہ بعد میں ادا کرے اور کسی بھی جگہ ادا کرے گنجائش ہے اس لیے کہ مبیع اگر ثمن ہو خواہ عرفی ہو خواہ خلقی، اس کا بائع کے پاس موجود ہونا ضروری نہیں، اس لیے کہ وہ مالایتعین بالتعیین کے قبیل سے ہے، بائع ادائیگی کے وقت جہاں سے چاہے

تلاش کر کے دینے کی قدرت رکھتا ہے، چنانچہ علامہ شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط میں اور علامہ علاء الدین حصکفی نے درمختار میں اور علامہ شامی نے ردالمحتار میں اس کی گنجائش دی ہے ملاحظہ ہو:

و إذا اشترى الرجل فلوسا بدراهم و نقد الثمن و لم تكن الفلوس عند البائع جائز لان الفلوس الرائجة ثمن كالنقود و قد بينا ان حكم العقد فى الثمن و جوبها و وجودها معا و لا يشترط قيامها فى ملك بائعها لصحة العقد كما لا يشتطر ذلك فى الدراهم و الدنانير .

(المبسوط : ١٤ / ٢٤)

باع فلوسا بمثلها بدراهم او بدنانير فإن نقد احدهما جاز و ان تفرقا بلا قبض احدهما لم يجز كما مر .

(الدرالمختار على هامش ردالمحتار : ٤/١٨٣، ١٨٤)

لان مافى الاصل لا يمكن حمله على انه لا يشترط التقابض و لو من احدا الجانبين لانه لا يكون افتراقا عن دين بدين و هو غير صحيح فتعين حمله على انه لا يشترط منهما جميعا بل من احدهما فقط .

(الشامية : ٤/١٨٤)

جہاں تک ایک ملک کے نوٹوں کا دوسرے ملک کے نوٹوں کے ساتھ کمی بیشی سے تبادلہ کرنے کا قانونی تعلق ہے چونکہ ہر شہری نے حکومت سے معاہدہ کیا ہوا ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے قانون کی پابندی اس حد تک کرے گا کہ نصوصِ شرعیہ کی خلاف ورزی لازم نہ آئے اور چونکہ حکومت نے غیر ملکی کرنسی کے بارے میں بذریعہ بنک ایک خاص ریٹ مقرر کیا ہے، لہٰذا اس ریٹ کی خلاف ورزی کر کے کمی بیشی سے تبادلہ قانونی جرم ہے اور قانونی جرم کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا کسی بھی شہری کے لیے جائز نہیں۔

یاد رہے کہ تبادلہ عقد ہے اس عقد میں عاقدین میں سے کسی بھی جانب کو فیس کے نام پر زیادہ وصول کرنا جائز نہیں، البتہ دلال کو ان کی محنت کی اجرت شرعاً دی جاسکتی ہے۔

البتہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ عقد مع الشرط ہونے کی وجہ سے فاسد ہے، شرط یہ ہے کہ مشتری (ہنڈی کا کاروبار کرنے والا) اس رقم کا عوض

بنگلہ دیش یا برما میں فلاں جگہ پہنچائے گا یہ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہے۔

نیز اگر اس معاملہ کو قرض قرار دیا جائے تو بھی جائز نہیں اس لیے کہ اس صورت میں یہ "سفتجہ" کہ پاکستان میں قرض دینے کے ساتھ بنگلہ دیش میں واپسی کی شرط لگا کر قرض دینے والے نے اسقاط خطر طریق کا نفع حاصل کیا ہے۔ (احسن الفتاوی : ۱۰۵/۷)

حضرت مولانا فتح محمد لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ہنڈی اور منی آرڈر ایک سند ہے اس کے ذریعہ آدمی ہر جگہ روپے بھیج سکتا ہے اس کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں جو باہم متعارض ہیں میرے نزدیک اکابرین امت سے اس بارے میں کوئی روایت منقول نہیں ہے۔

سفتجہ جس کی کراہت منقول ہے وہ ہنڈی نہیں ہے، ہنڈی کو غرض بیع یا امانت قرار دے کر فاسد یا مکروہ سمجھنا ایک زبردستی والی بات ہے۔

بلکہ ہنڈی حوالہ ہے جس کے لیے کچھ اجرت متعین کی گئی ہے محتال علیہ یا وکیل کو بعض امورِ متعلقہ کی اجرت لینا جائز ہے، کیونکہ اس کی ممانعت منقول نہیں، لہٰذا کچھ اجرت لی جائے اور جس مقام پر جس وقت دینا شرط طے پا جائے دے دیا جائے۔ اس کی نظیر منقول ہے، جیسے ہبہ بالعوض ابتداءً تبرع ہے لیکن انتہاءً اس کا عوض لیا جاتا ہے، ہنڈی کے حرام ہونے کے دلائل سے صرف نظر کرنا لازم ہے، کیونکہ ایسے دلائل ہرگز قابل تسلیم نہیں جو ہنڈی کے ممنوع اور مکروہ ہونے کے موجب ہوں، تاکہ تجارت میں توسیع اور معاملات میں آسانی پیدا ہو اور اموال کی حفاظت ہو سکے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچانا اور ان کو تنگی اور حرج سے بچانا ہمیشہ شارع علیہ السلام کا پیش نظر رہا ہے۔ (عطر ہدایہ جدید: ۱۴۵)

کریڈٹ کارڈ کا حکم:

اس دور میں کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ خرید و فروخت عام ہوتی جا رہی ہیں، شرعاً اس کے ذریعے خرید و فروخت کا کیا حکم ہے اس سلسلہ میں دارالافتاء دارالعلوم کراچی اور دارالافتاء جامعہ احتشامیہ کراچی کے دو فتاوی بعینہٖ نقل کیے جاتے ہیں:

استفتاء:

1- کریڈٹ کارڈ اور ٹریول چیک کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟

بینوا توجروا المستفتی: سیف اللہ خالد

جواب:

1- کریڈٹ کارڈ خریدنا اوران کا استعمال کرنا فی نفسہ تو جائز ہے بشرطیکہ پہلے سے اکاؤنٹ کھلوالیا جائے تا کہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرضہ وہاں سے وصول کر لے اور اگر اکاؤنٹ سے براہِ راست قرضہ منہا کرنے کا فی الحال انتظام نہیں ہے تو پھر اس کی انتہائی احتیاط کرنی چاہیے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کردینی چاہیے تا کہ ان پر سود بہر حال لاگو نہ ہو سکے کیونکہ اس پر سود کا ادا کرنا حرام ہے، ہاں کارڈ جاری کرنے والا ادارہ جو سالانہ فیس وصول کرتا ہے وہ ادا کرنا جائز ہے، کیونکہ وہ سود کے زمرے میں نہیں آتی۔ (ماخذ البلاغ انگریزی اگست 1994)

2- ٹریولز چیک یعنی سفری چیک کا استعمال جائز ہے اور بینک کو اس کے اس عمل کی انجام دہی پر فیس ادا کرنا درست ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

کریڈٹ کارڈ کے متعلق متفرق سوالات:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیانِ کرام مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں:

سوال (1): کریڈٹ کارڈ کا کیا حکم ہے شرعاً اس صورت میں جب کہ پیسے اکاؤنٹ میں موجود ہوں؟

یا

سوال (2): کریڈ کارڈ کا کیا حکم ہے؟ شرعاً اس صورت میں جبکہ پیسے اکاؤنٹ میں موجود نہ ہوں اور پیسے قرض کے طور پر لیے جائیں؟

جواب (2-1): کریڈٹ کارڈ کا خریدنا اوراس کا استعمال کرنا اس صورت میں جبکہ پہلے سے کارڈ ہولڈر کے اکاؤنٹ میں رقم موجود ہو تا کہ کارڈ جاری کرنے والا ادارہ اپنا قرض وہاں سے وصول کر لے تو یہ صورت بلاشبہ جائز ہے۔ اسی طرح اگر پہلے سے اکاؤنٹ بینک کے اندر موجود نہ ہو تو پھر بھی کریڈٹ کارڈ کا خریدنا اس کا استعمال کرنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ جاری کردہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کردی جائے تا کہ ان پر سود لاگو نہ ہو سکے کیونکہ اس پر سود کا ادا کرنا حرام ہے۔

سوال(3): کریڈٹ کارڈ سے نقدی وصول کرنے کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب(3): کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ نقدی حاصل کرنے کے دوطریقے ہیں پہلا طریقہ ہاتھ سے وصول کرنا کہ کارڈ ہولڈر بینک والوں کو اپنا کارڈ پیش کرے اور بینک والے کارڈ دیکھ کر نقدی اس کے حوالے کر دیں تو یہ صورت اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ نقدی جاری کرنے پر کوئی زائد ٹیکس نہ لیا جائے کیونکہ زائد ٹیکس خدمات کی لاگت کے مقابلے میں نہیں بلکہ قرض کے مقابلے میں ہوگا جو کہ خالص سود ہے۔ دوسرا طریقہ مشین کے ذریعے وصول کرنا جس کو ATM کہتے ہیں چونکہ یہ مشینیں بذات خود بہت قیمتی ہوتی ہیں پھر اس کی تنصیب اور حفاظت وغیرہ پر بھی کثیر اخراجات ہوتے ہیں اس لیے ان اخراجات کے تناسب سے کچھ ٹیکس لیا جائے تو اس میں گنجائش ہے۔ کیونکہ اس صورت میں یہ ٹیکس قرض کے مقابلے میں نہیں بلکہ اخراجات اور خدمات کے مقابلے میں ہے۔

سوال(4): ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونا اور چاندی خریدنا جائز ہے یا نہیں اور کیا یہ معاملہ بیع صرف کے حکم میں ہے یا نہیں؟

جواب(1-2): ڈیبٹ کارڈ، چارج کارڈ اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ سونے چاندی کی فروخت جائز ہے اور یہ معاملہ بیع صرف نہیں کیونکہ اس میں سونے چاندی کی خریداری درحقیقت کرنسی نوٹ کے ذریعہ ہوتی ہے جو کارڈ ہولڈر کے ذمہ دین ہوتا ہے اور وہ اپنے ذمہ کا دین براہ راست ادا کرنے کے بجائے کارڈ جاری کرنے والے ادارے (بینک یا کمپنی) سے وصول کرنے کا تاجر کو حوالہ کرتا کرنسی نوٹ چونکہ خلقۃً ثمن نہیں ہے بلکہ یہ ثمن عرفی یا اصطلاحی ہے اور بیع صرف کے احکام اثمان خلقیہ (سونے، چاندی کے باہمی تبادلے) پر جاری ہوتے ہیں اس لیے مذکورہ کارڈوں کے ذریعہ سونے چاندی کی جو ادھار خرید وفروخت ہوتی ہے وہ جائز ہے اور مجلس عقد میں دونوں طرف سے قبضہ ضروری نہیں بلکہ جانب واحد (خریدار) کا قبضہ جواز عقد کے لیے کافی ہے۔

سوال(5): بینک کا کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب(5): بینک کا کارڈ ہولڈر سے ڈیوٹی اور اجرت وصول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اجرت ان خدمات کے مقابلہ میں ہے جو بینک کارڈ ہولڈر کے لیے انجام دیتا ہے مثلاً: بینک کی یہ خدمات ہیں کہ وہ ایک قیمتی کارڈ جاری کرتا ہے جس کی تمام لاگت بینک برداشت کرتا ہے جیسا کہ کارڈ تیار

کرنا، اس پر علامات لگانا، فائلوں کی کارروائی کرنا، ٹیلیفون پر رابطہ کرنا اور دفتری نوعیت کی دوسری خدمات انجام دینا پھر ہر بڑے شہر میں رقم نکلوانے کے لیے مشین نصب کرنا جو کہ بذاتِ خود بہت قیمتی ہے اور پھر ان کا حساب رکھنا تو ظاہر ہے کہ بینک کارڈ ہولڈر سے جو اجرت وصول کرتا ہے وہ مذکورہ بالا خدمات کے مقابلہ میں ہیں اور اس اجرت کا اس قرض سے کوئی تعلق نہیں جو کارڈ ہولڈر کے ذمہ ہوتا ہے۔

سوال(6) بینک کا تاجر سے کمیشن وصول کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب(6): بینک کا تاجر سے بھی کمیشن وصول کرنا جائز ہے کیونکہ یہ اجرت صرف حوالہ قبول کرنے کے مقابلے میں نہیں ہے بلکہ ان جائز خدمات کے مقابلہ میں ہے جو بینک تاجر کو فراہم کرتا ہے، مثلاً: بینک تاجروں کو یہ خدمات مہیا کرتا ہے کہ وہ ان کو چیکنگ مشین فراہم کرتا ہے اور ان کے لیے فوری جواب دینے کا انتظام کرتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے وہ اچھے گاہکوں کو جو حاملین کارڈ ہیں ان کی طرف کھینچ کراتا ہے پھر ان کے دیون (قرض) کو حاملین کارڈ سے وصول کرتا ہے ان تمام کاموں میں محنت اور مشقت ہے تو یہ کمیشن دراصل ان خدمات اور محنت ومشقت کا ہے اس لیے اس کا لینا دینا شرعاً جائز ہے۔

سوال(7) کریڈٹ کارڈ کے ذریعہ خریداری کی صورت میں بلوں کی قیمت اگر مقررہ مدت کے اندر ادا نہ کی جائے تو سود لاگو ہوتا ہے تو یہ شرطِ فاسد کیا اس عقد کو باطل کردے گی یا نہیں؟

جواب(7): واضح رہے کہ کریڈٹ کارڈ ہولڈر کے ساتھ بینک کا جو عقد ہوتا ہے وہ آخر کار قرض کا عقد ہوتا ہے کہ بینک کی جانب سے تاجر کو رقم کی ادائیگی کے وقت بینک کا کریڈٹ ہولڈر کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے اور قرض کے ساتھ سود کی یہ شرط فاسد لگی ہوتی ہے، قرض چونکہ عقودِ تبرع میں سے ہے عقد معاوضہ نہیں ہے اور حنفیہ کے نزدیک اصول یہ ہے کہ عقودِ معاوضہ میں شرطِ فاسد لگانا عقد کو فاسد کرتا ہے۔ عقودِ تبرع میں شرط فاسد خود فاسد اور لغو ہو جاتی ہے اور عقد فاسد نہیں ہوتا البتہ اس میں صرف شرطِ فاسد لگانے کا گناہ رہ جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا مکمل اطمینان کرلے کہ اس شرط فاسد پر کبھی بھی عمل نہیں ہوگا اور وہ بلوں کی قیمت مقررہ مدت کے اندر ادا کر دے گا اور سود کی ادائیگی کی نوبت نہ آنے دے گا تو ان شاء اللہ اس شرط فاسد لگانے کا گناہ بھی نہ ہوگا۔

سوال (8): بینک والے اور کمپنیوں والے کریڈٹ کارڈ کے استعمال کرنے والوں کو انعامات دیتے ہیں اور اسی طرح اپنے گاہکوں کو ترغیبات دیتے ہیں مثلاً: اگر تم اتنی رقم کی خریداری کرو گے تو تم کو یہ چیزیں گفٹ میں ملیں گی تو کیا ان گفٹوں کا حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب (8): بینک والے اور کمپنیوں والے کارڈ ہولڈر کو جو انعامات دیتے ہیں ان کا لینا اور استعمال کرنا جائز ہے کیونکہ بینک والوں اور کمپنیوں والوں کی حیثیت مال کا قرض دہندہ کی ہوتی ہے اور کارڈ ہولڈر ان اداروں کے لیے مقروض کا درجہ رکھتا ہے، قرض دہندہ اگر اپنے مقروض کو کوئی انعام دے تو اس کا لینا مقروض کے لیے جائز ہے ہاں مقروض اگر قرض دہندہ کو کوئی انعام دے تو وہ سود کے حکم میں ہوتا ہے۔

سوال (9): کریڈٹ کارڈ کا انشورنس کرانا جائز ہے یا نہیں جواب تفصیل کے ساتھ عنایت فرمائیں۔

جواب (9): واضح رہے کہ فی الوقت جتنی بیمہ پالیسیاں رائج ہیں وہ سب کی سب ناجائز ہیں کیونکہ وہ سود اور قمار اور ناجائز شرائط پر مشتمل ہیں اور یہ سب چیزیں شرعاً حرام ہیں اس لیے کریڈٹ کارڈ کا بھی اصل حکم یہی ہے کہ اس کا انشورنس کرانا ناجائز ہے، البتہ اگر قانونی طور پر اگر انشورنس کو لازمی قرار دے دیا جائے اور اشیاء ضرورت خریدنے کے لیے کریڈٹ کارڈ کے علاوہ کوئی متبادل جائز ذریعہ آسانی سے میسر نہ ہو جو انشورنس کی شرط سے آزاد ہو یا انشورنس کروانے کی وجہ سے حکومت کے ناجائز اور ظالمانہ ٹیکس سے نجات مل سکتی ہو تو مجبوری میں ایک ضرورت کے تحت کریڈٹ کارڈ کی انشورنس کرانے کی اجازت ہوگی لیکن یہ یاد رہے کہ اس میں اگر نفع کے نام سے کوئی زائد رقم ملتی ہو تو ان حالات میں بھی اس زائد رقم کو لینا جائز نہ ہوگا البتہ اصل رقم جو اقساط کی صورت میں جمع کروائی ہو اس کو وصول کرنا جائز ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ادویات بیچنے کا ڈپلومہ اور لائسنس فروخت کرنا:

مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً زید نے دواؤں کے متعلق کورس پاس کیا ہے اور ڈپلومہ لیا ہے اور حکومت کی طرف سے ڈپلومہ رکھنے والے شخص کو میڈیکل اسٹور کھولنے اور دوائیں فروخت کرنے کا اجازت نامہ ملتا ہے، زید اس اجازت نامہ سے خود فائدہ نہیں اٹھاتا، بلکہ کسی دوسرے شخص کو یہ اجازت نامہ دے دیتا ہے جس کے بدلے یکمشت یا ماہانہ ایک مقررہ رقم وصول کرتا ہے، اس

بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ زید کے لیے دوائیں فروخت کرنے کا لائسنس فروخت کرنا اس کے عوض یکمشت یا ماہانہ رقم وصول کرنا شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس میں ملکی قوانین کی خلاف ورزی ہے، لہٰذا اجازت نامہ فروخت کرنا یا بلا معاوضہ دینا دونوں درست نہیں۔

نیز دوا فروخت کرنے کا ڈپلومہ کسی خاص تعلیمی صلاحیت کا امتحان پاس کرنے پر دیا جاتا ہے، کسی دوسرے شخص کو جو اس صلاحیت کا حامل نہیں اس کا منتقل کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ ایک طرح کی جھوٹی شہادت بھی ہے۔ (ماخوذ از جدید تجارت بتغیر یسیر)

بل کو کٹوتی کے ساتھ فروخت کرنا:

تاجر لوگ ایک دوسرے کو ادھار پر چیز فروخت کرتے ہیں (مقروض) بائع کو ایک چٹ لکھ دیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو رقم دے دوں گا، اب مقروض سے رقم وصول کرنے کی تاریخ چونکہ لمبی ہوتی ہے جبکہ رقم کی فوری ضرورت ہے لہٰذا بائع بینک یا کسی شخص کو یہ چٹ دے کر رقم لیتا ہے، بینک یا وہ شخص اس رقم سے کچھ منہا کر کے مثلاً: دس لاکھ کی رقم اس چٹ پر لکھی ہوئی ہے تو وہ نو لاکھ پچانوے ہزار بائع کے حوالے کرتا ہے تو یہ معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں، کیونکہ اس میں ایک ملک کی کرنسی کی بیع اسی ملک کی کرنسی کے ساتھ ہو رہی ہے، جس میں کٹوتی کی صورت میں کمی زیادتی ہو رہی ہے لہٰذا بل آف ایکسچینج شرعاً جائز نہیں، البتہ اس کی ایک جائز صورت ہو سکتی ہے کہ پہلے حامل چٹ (دستاویز) مثلاً: زید بینک کو دستاویز جاری کرنے والے شخص سے قرض وصول کرنے کا وکیل بنا دے اس وکالت پر زید بینک کو کچھ اجرت دے دے، اس کے بعد نئے معاملہ کے ذریعے زید چٹ پر تحریر شدہ رقم کے بقدر بینک سے قرض حاصل کرے اور بینک کو اختیار دے دے کہ جب میرا قرض اس سے وصول ہو جائے تو اس سے اپنا قرض وصول کر لے، اس طرح دونوں معاملات الگ الگ ہو جائیں گے، پہلا معاملہ، وصولی قرض کے لیے اجرت کے ساتھ وکیل مقرر کرنا دوسرا معاملہ بینک سے قرض لے کر دستاویز میں تحریر شدہ قرض حاصل ہونے پر اس سے اپنا قرض وصول کرنے کا بینک کو اختیار دینا، تو شرعی لحاظ سے یہ دنوں معاملے درست ہوں گے۔

(بحوث فی قضایا وفقهيه: ۲۰)

سود کی حرمت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

صنعتی انقلاب کے اس دور میں سود کو معیشت وتجارت کا ایک لازمی حصہ قرار دے دیا گیا

ہے۔ اہل مغرب کا تو یہ تصور ہے ہی، اب مسلمان تاجروں کا بھی یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ سودی معیشت کی ہزار ہا خرابی کے باوجود تجارت اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی۔ معیشت کو سود سے پاک کرنا ناممکن ہے۔ یہی تو اسلام سے قبل دور جاہلیت کے تاجروں کا خیال تھا اور سود در سود ان کے کاروبار کا لازمی جز تھا۔ اسلام نے آ کر جہاں اور مظالم کو ختم کیا وہاں سود کی لعنت کا بھی خاتمہ فرما دیا۔ قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں نازل ہوئیں بلکہ سودی کاروبار کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اعلانِ جنگ فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ یاایها الذین آمنوا اتقوا الله وذروا ما بقی من الربو إن کنتم مؤمنین O فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله إن تبتم فلکم رؤس أموالکم لا تظلمون ولا تظلمون O ﴾ (بقرة: ۲۷۸ - ۲۷۹)

''اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، پھر اگر تم عمل نہیں کرو گے تو اعلانِ جنگ سن لو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے اصل مال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ، نہ تمہارے اوپر کوئی ظلم کرنے پائے۔''

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

قوله علیه السلام: لعن الله اکل الربا.

(اخرجه البخاری فی کتاب الاعتصام وفی اللباس ۲۱۷/۷ ومسلم فی المساقاة: ۱۲۱۹/۳)

''جناب نبی کریم ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت فرمائی۔''

(مسلم شریف)

اور بخاری کی روایت میں اس کا اضافہ ہے کہ سود پر گواہ بننے والے اور سود کی کتابت کرنے والے پر بھی لعنت فرمائی ہے۔ (بخاری)

قوله علیه السلام: "ومؤکله، وکاتبه، وشاهدیه."

سود مہلکات میں داخل ہے:

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: اجتنبوا السبع الموبقات قال یا رسول اللّٰہ وما ھم ؟ قال . الشرک باللّٰہ، والسحر، وقتل النفس التی حرم اللّٰہ الا بالحق، واکل الربا، واکل مال الیتیم . والتولی یوم الزحف، وقذف المحصنات المؤمنات غافلات . (متفق علیہ)

"سات قسم کے مہلکات سے اجتناب کرو۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا یا رسول اللہ ! وہ کون سے ہیں؟ تو ارشاد فرمایا:

1- اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (ذات یا صفات میں)
2- جادو کرنا
3- کسی ایسے نفس کو قتل کرنا جس کا قتل کرنا شرعاً حرام ہو
4- سود کھانا
5- یتیم کا مال کھانا
6- کفار سے مقابلہ کے وقت لڑائی سے منہ موڑنا (یعنی جہاد میں جبکہ کفار کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں دوگنا سے زیادہ نہ ہو، میدانِ جنگ چھوڑ کر بھاگ جانا)
7- کسی پاک دامن بھولی بسری عورت پر تہمت لگانا۔ (بخاری و مسلم)

سود زنا سے بدتر ہے:

جناب نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ
"سود کا ایک درہم جو آدمی قصداً کھائے وہ چھتیس دفعہ زنا کرنے سے بدتر ہے۔" (مشکوٰۃ)

سود کی ستر سے زائد برائیاں ہیں:

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
"جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سود کے گناہ کے ستر درجات ہیں، سب سے ادنیٰ درجہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے۔" (مشکوٰۃ)

مطلب یہ ہے کہ سود کا گناہ اتنا بدترین گناہ ہے کہ اس کا ادنیٰ درجہ بھی اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے کے برابر ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دورِ فساد میں بھی کسی غیرت مند انسان کے

لیے اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنا تو دور کی بات ہے، کوئی ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ منہ کالا کرے۔ سرکار دو جہاں ﷺ نے سود کے گناہ کو اس سے بھی بدتر قرار دیا ہے۔ بہت افسوس کا مقام ہوگا کہ ہم ایسے ارشادات سننے کے بعد بھی سود کے ساتھ چمٹے رہیں۔

سود خور کے پیٹ میں سانپ:

جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

''شب معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ گھڑوں کی مانند بہت بڑے بڑے تھے اور اس کے اندر سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹ کے باہر ہی سے نظر آرہے تھے۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ یہ سود خور ہیں۔'' (مشکوۃ)

سود خور جہنم میں:

جناب نبی کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ

'' (انسانی جسم کا) جو گوشت حرام مال سے پرورش پایا ہو وہ جہنم کی آگ کے زیادہ لائق ہے۔'' (مشکوۃ)

بہر حال سودی کاروبار کرنا اور سودی رقم کو استعمال کرنا اور اس کے فروغ کے لیے کسی قسم کا شریک و معاون بننا، دنیا و آخرت دونوں کے لیے تباہ کن ہے جس کے برے اثرات انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کی زندگی میں مرتب ہوتے ہیں۔ دولت سمٹ کر چند ہی افراد کے پاس جمع ہو جاتی ہے۔ غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر بن جاتا ہے۔ معاشرے سے مساوات ختم ہو جاتی ہے، سود خوروں کے دل میں غریب غرباء کے لیے رحم نہیں ہوتا۔ وہ غریب جو پائی پائی کے لیے ترستا ہے، امیر دولت جمع کرنے کے لالچ اور حرص سے سود کے ذریعے مزید خون چوسنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اپنے کو دیندار کہلانے والے تاجر، رات کو تہجد و ذکر اللہ میں گزارنے والے جب صبح اپنے کارخانے میں پہنچتے ہیں تو انہیں خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سود و قمار، جوا، سٹہ، انشورنس وغیرہ میں مبتلا ہو کر کچھ گناہ کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کو ناراض کر رہے ہیں بلکہ بڑی بے فکری کے ساتھ سودی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ حلال روزی کو چھوڑ کر حرام روزی کماتے ہیں۔ ان حضرات سے درخواست یہ ہے کہ اگر سودی کاروبار کو فوری نہیں چھوڑ سکتے تو کم از کم اس کو گناہِ عظیم سمجھیں اور توبہ کرتے رہیں اور رزقِ حلال کی فکر جاری رکھیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کو ایک مرتبہ برما کے تاجروں نے وعظ ونصیحت کے لیے رنگون آنے کی دعوت دی اور حضرت تشریف لے گئے۔ تقریر شروع فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا کہ آج میں خلافِ معمول ایک بات کہتا ہوں کہ آپ تاجر حضرات ہر ماہ کسی عالم دین کو وعظ کی دعوت دیتے ہیں، وہ آکر آپ حضرات کو تبلیغ کرتے ہیں اور خصوصاً سود کی مذمت کرتے ہیں اور سود کی لعنت سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ آج میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ خوب سود کھائیں۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میری بات سے آپ لوگوں کو تعجب ہو رہا ہوگا۔ پھر حضرت رحمہ اللہ نے خود ہی وضاحت فرمائی کہ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ اتنے علماء کی تقاریر سننے کے باوجود کوئی سود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ حرام طریقے پر تجارت کرتے ہیں، ستم ظریفی یہ ہے کہ خود کو دیندار بھی سمجھتے ہیں۔ اصل وجہ یہی ہے کہ اب تک سود سے دل میں نفرت پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لیے دل ملامت نہیں کرتا تو میں کہتا ہوں آپ لوگ دن بھر جو کاروبار کرتے ہیں تو رات کو سوتے وقت اللہ تعالیٰ سے اتنی بات کہہ دیا کریں یا اللہ دن بھر پاخانہ کھاتا رہا، اسی کا حساب کتاب کرتا رہا، اسی کا لین دین کرتا رہا تو معاف فرما جب یہ نسخہ استعمال کریں گے تو سود سے دل میں نفرت پیدا ہوگی اور چھوڑنا بھی آسان ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام مسلمانوں کو دین کی سمجھ عطا فرمائے اور رزقِ حلال نصیب فرمائے۔ حرام خوری سے بچائے اور پورے معاشرے کو سود اور جوئے کی لعنت سے بچائے۔

سود کی تفصیلات:

بہر حال سود خوری، جس کی قرآن وحدیث نے سخت الفاظ میں مذمت فرمائی اور اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں، بار بار سود خوری چھوڑنے کا مطالبہ کیا ہے، اس کی بنیادی طور پر تین قسمیں بنتی ہیں:

1- قرض دے کر اس سے زائد وصول کرنا، جس کو ہمارے عرف میں "مہاجنی" سود کہا جاتا ہے۔

2- تجارتی سود، خرید وفروخت کاروبار میں لین دین کا ایسا طریقہ اختیار کرنا جو شرعی اصول کے مطابق سودی معاملہ بنتا ہو، جس کو "انٹرسٹ سود" کہا جاتا ہے۔

3- بینک ڈیپازٹ بینک کے ذریعہ معاملہ کر کے سود وصول کرنا۔

پہلی دونوں قسمیں تو نزولِ قرآن کے وقت بھی رائج اور متعارف تھیں، قرآن وحدیث میں جو حرمت وارد ہوئی ہے دونوں قسموں کو شامل ہیں۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ یایھا الذین آمنوا لا تاکلوا الربوٰ اضعافا مضعفة واتقوا اللّٰہ لعلکم تفلحون ﴾ (آل عمران: ۱۳۰)

یعنی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ حصے سے زائد اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور امید ہے کہ تم کامیاب ہوگے۔

بقولِ مفسرین اس آیت کا نزول ایام جاہلیت کے خاص طریقہ سودخوری کی مذمت میں ہوا ہے کہ ان کے ہاں عام دستور تھا کہ خاص مدت کے لیے ادھار پر سود پر دیا جاتا تھا جب وہ معیاد آگئی اور قرضدار اس کی ادائیگی پر قادر نہ ہوا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دیجاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جاتی تھی، اسی طرح دوسری معیاد پر بھی ادائیگی نہ ہوئی تو سود کی مقدار بڑھادی جاتی ﴿ اضعافا مضعفہ ﴾ اس کی مذمت ہے اسی رسم بد کو مٹانے کا حکم ہے، اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ احل اللّٰہ البیع وحرم الربوٰ ﴾ (بقرة: ۲۷۵)

میں تجارتی سود پر خصوصی طور پر روک لگادی ہے کہ معاملہ کا وہ طریقہ جس میں سود لازم آئے وہ حرام ہے، اس سے اجتناب کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے حرمتِ ربوا کا ایک جامع اصول بیان فرمایا:

"الذھب بالذھب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والتمر بالتمر والشعیر بالشعیر، والملح بالملح، مثلا بمثل، سواء بسواء، یدا بید، فمن زاد او استزاد فقد اربی ای دخل فی الربا المحرم، الأخذ و المعطی فیه سواء." اخرجه البخاري رقم: ۲۱۷٤ و مسلم رقم: ۱۵۸۷ والترمذی: ۱۲٤۰ وقال حسن صحیح.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو یہ ارشاد فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض میں یا چاندی کو چاندی کے عوض میں، گندم کو گندم کے عوض میں، کھجور کو کھجور کے عوض میں، جو کو جو کے عوض میں، نمک کو نمک کے عوض میں فروخت کرنا ہو تو (اس کے جواز کے لیے دو شرطیں ہیں)

1- برابر وزن میں فروخت کیا جائے کسی طرف سے کمی زیادتی نہ ہو۔

2- نقد فروخت کیا جائے ،ایک طرف یا دونوں طرف سے ادھار نہ ہو،اس میں جس نے زیادہ ادا کیا یا زیادتی کا مطالبہ کیا تو وہ سود خوری کے حرام طریقہ کا اختیار کرنے والا ہوگا اس میں سود دینے والا اور لینے والا دونوں گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔(بخاری ومسلم)

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : والاصل فيه (اي في البيع) الاباحة وإذا وجد احرم التفاضل والنساء لوجود العلة . وإذا وجد احدهما، وعدم الاخر حل التفاضل وحرم النساء مثل ان يسلم هرويا في هروى او حنطة في شعير، فحرمة ربو الفضل بالوصفين، وحرمة النساء باحدهما . (هداية مع الدراية : ٢/ ٨٣)

خلاصہ یہ ہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے تجارت میں سود ثابت ہونے کے لیے دو چیزوں کو علت قرار دیا ہے:

1- جنس 2- قدر

اب ایک چیز کو دوسری چیز کے عوض فروخت کرنے میں اگر دونوں وصفیں پائی جائیں تو عوضین کا مساوی ہونا اور نقد ہونا ضروری ہے۔اگر کمی زیادتی کے ساتھ فروخت کرے یا ادھار فروخت کرے تو دونوں صورتوں میں سود لازم آنے کی وجہ سے حرام ہے اور اگر ایک وصف پائی جائے تو زیادتی حلال ہے،ادھار فروخت کرنا حرام ہے۔

بینکوں میں رقم رکھوانے کا حکم:

بینکوں میں رقم رکھوانے کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں:

1- سودی کھاتہ (سیونگ اکاؤنٹ)

2- ڈیپازٹس

3- غیر سودی کھاتہ (کرنٹ اکاؤنٹ)

4- لاکر

فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ کا حکم:

فکس ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں،اکاؤنٹ ہولڈر کو منافع کے نام سے جو رقم ملتی ہے،

چونکہ یہ بات طے ہے کہ ان اکاؤنٹس میں رکھی جانے والی رقوم بالاتفاق قرض ہوتی ہیں، لہذا بینک اکاؤنٹ ہولڈر کو اصلی رقم سے زیادہ جو رقم بھی ادا کرے گا وہ صراحتاً سود ہوگی، جس کے جائز ہونے کی کوئی صورت نہیں لہذا ان دونوں اکاؤنٹس میں رقم جمع کروانا اور منافع کے نام پر سود وصول کرنا حرام ہے۔

کرنٹ اکاؤنٹ (غیر سودی کھاتہ)

سودی بینک کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں، بعض اس کو ضرورت کے پیش نظر جائز قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسرے بعض حضرات تعاون علی الاثم ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیتے ہیں استاذ محترم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم اور دار العلوم کراچی کے دیگر ارباب فتویٰ کی رائے جواز کی ہے۔

چنانچہ ایک تحریر کے ضمن میں فرماتے ہیں:

جہاں تک سودی بینک کے "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانے کا تعلق ہے تو جیسا کہ میں نے پہلے عرض کر دیا کہ اس "اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانے والے کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا ہے، لہذا اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے سے سودی قرض کے معاہدے میں داخل ہونا لازم نہیں آتا، اس حیثیت سے "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانا جائز ہونا چاہیے، لیکن بعض علماءِ معاصرین نے اس پر اشکال کیا ہے کہ اگرچہ یہ سودی قرض تو نہیں ہے لیکن اس صورت میں سودی معاملات میں بینک کے ساتھ اعانت تو پائی جا رہی ہے، اس لیے کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رکھی جانے والی رقم کو بینک منجمد کر کے نہیں رکھ دیتا، بلکہ بینک اس رقم کو بھی سودی قرضوں میں دے کر اس پر نفع حاصل کرتا ہے، لہذا رقم رکھوانے والا بینک کے ساتھ سودی معاملات میں معاون بن جائے گا۔

لیکن اس اشکال کو مندرجہ ذیل طریقوں سے دور کرنا ممکن ہے:

1- بینکوں کا یہ معمول ہے کہ "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رکھی گئی تمام رقموں کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے، بلکہ اس رقم کی ایک بڑی مقدار اپنے پاس اس غرض سے رکھتے ہیں کہ اس کے ذریعے رقم نکلوانے والوں کی طلب کو روزانہ پورا کیا جا سکے اور چونکہ بینک کے اندر تمام رقومات ایک ہی جگہ پر ملی جلی رکھی جاتی ہیں، اس لیے کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لیے یہ یقین کرنا ممکن نہیں

ہے کہ اس کی رقم کسی سودی معاملہ میں لگ چکی ہے۔

2- دوسرے یہ کہ بینک کے پاس رقم لگانے کی بے شمار جگہیں ہوتی ہیں وہ سب کی سب جگہیں شرعاً ممنوع نہیں ہوتیں بلکہ ان میں بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں خرچ کرنا اور رقم لگانا حرام نہیں ہوتا، لہٰذا کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر کے لیے یقینی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اس کی رقم اس جگہ پر صرف ہوئی ہے جو شرعاً حلال نہیں ہے۔

3- غیر سودی قرض کا معاملہ شرعاً جائز معاملہ ہے اور ''نقود'' کا حکم یہ ہے کہ وہ ''عقودِ صحیحہ'' میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتے۔

اور کرنٹ اکاؤنٹ میں جو شخص بھی کوئی رقم رکھواتا ہے تو بینک کو قرض دینے کے نتیجے میں وہ رقم اس کی ملکیت سے نکل کر بینک کی ملکیت میں داخل ہو جاتی ہے، اب بینک اس رقم میں جو کچھ تصرف کرے گا وہ اکاؤنٹ ہولڈر کی ملکیت میں تصرف کرنا نہیں ہوگا بلکہ اس کی اپنی ملکیت میں یہ تصرف ہوگا، لہٰذا اس تصرف کو اکاؤنٹ ہولڈر کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔

4- کسی معصیت پر اعانت کرنا اگرچہ حرام ہے، لیکن فقہاءِ کرام نے اس کے کچھ اصول بھی بیان فرمائے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں (اگر تفصیل کی ضرورت ہو تو ملاحظہ فرمائیں: در مختار مع ردالمحتار: ٥/٢٧٢، تکملہ فتح القدیر: ٨/١٢٧، شرح المهذب: ٩/٣٩١، نهاية المحتاج: ٣/٤٥٤، حواشي الشرواني على تحفة المحتاج: ٤/٣١٧، الفروق للقرافي ٢/٣٣، نيل الاوطار للشوكاني: ٥/١٥٤)

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ تحریر فرمایا ہے اور ''اعانت'' کے مسئلہ میں جتنی نصوص فقہیہ آئی ہیں ان سب کو اس رسالے میں جمع فرمایا ہے۔ یہ رسالہ ''احکام القرآن'' عربی کی تیسری جلد کا جزء بن کر شائع ہو چکا ہے، اس رسالے کے آخر میں اس مسئلہ کا خلاصہ اس طرح تحریر فرمایا کہ:

" إن الاعانة على المعصية حرام مطلقا بنص القرآن اعنی قوله تعالیٰ: ﴿ولا تعاونوا على الإثم والعدوان﴾ وقوله تعالیٰ: ﴿فلن أكون ظهيرا للمجرمين﴾ ولكن الاعانة حقيقة هي ما قامت المعصية بعين فعل المعين ولا يتحقق الا بنية الاعانة او التصريح بها او

تعينها في استعمال هذا الشئ بحيث لا يحتمل غير المعصية وما لم تقم المعصية بعينه لم يكن من الاعانة حقيقة بل من التسبب ومن اطلق عليه لفظ الاعانة فقد تجوز لكونه صورة إعانة كما مر من السير الكبير .

ثم السبب ان كان سببا محركا وداعيا الى المعصية فالتسبب فيه حرام كالاعانة على المعصية بنص القرآن كقوله تعالىٰ : ﴿ لا تسبوا الذين يدعون من دون الله ﴾ وقوله تعالىٰ ﴿ فلا تخضعن بالقول ﴾ وقوله تعالىٰ : ﴿ لا تبرجن ﴾ الآية وان لم يكن محركا وداعيا بل موصلا محضا وهو مع ذلك سبب قريب بحيث لا يحتاج في إقامة المعصية به الى احداث صنعة من الفاعل كبيع السلاح من اهل الفتنة وبيع العصير ممن يتخذ خمرا وبيع الامرد ممن يعصى به واجارة البيت ممن يبيع فيه الخمر او يتخذها كنيسة او بيت نار وامثالها فكله مكروه تحريما بشرط ان يعلم به البائع والاجر من دون تصريح به باللسان فإنه ان لم يعلم كان معذورا وان علم وصرح كان داخلا في الاعانة المحرمة .

وان كان سببا بعيدا بحيث لا يفضى الى المعصية على حالته الموجودة بل يحتاج الى احداث صنعة فيه كبيع الحديد من اهل الفتنة وامثالها، فتكره تنزيها . (احكام القرآن : ۳/ ۷٤)

''اعانت علی المعصیت نص قرآن کی رو سے مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ﴾ ''گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔'' (سورة المائدة : ۲) دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿ فلن اكون ظهيرا للمجرمين ﴾ ''میں کبھی مجرموں کی مدد نہیں کروں گا۔'' (سورة القصص : ۱۷) لیکن حقیقت میں ''اعانت'' اس کو کہا جاتا ہے کہ معین یعنی مدد گار کے عین فعل سے وہ معصیت قائم ہو، یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب یا تو مدد گار اعانت کرنے کی نیت بھی کرے یا اعانت کرنے کی تصریح کرے یا اس چیز کے استعمال کو اسی

معصیت کے کام کے لیے اس طرح متعین کرے کہ غیر معصیت میں اس کے استعمال کا احتمال باقی نہ رہے۔ لیکن اگر معصیت معین یعنی مددگار کے عین فعل کے ساتھ قائم نہ ہو تو اس کو حقیقۃً اعانت نہیں کہیں گے بلکہ اس کو معصیت کا "سبب" کہیں گے اور جن حضرات نے اس پر "اعانت" کے لفظ کا اطلاق کیا ہے انہوں نے مجازاً کہا ہے، اس لیے کہ یہ صورۃً اعانت ہے حقیقۃً اعانت نہیں جیسا کہ "السیر الکبیر" کے حوالے سے پیچھے گزر چکا ہے۔

پھر "سبب" کو دیکھا جائے گا کہ اگر وہ "سبب" معصیت کی طرف محرک اور داعی ہو تو اس کا سبب بننا بھی حرام ہے، جیسا کہ اعانت علی المعصیت جو کہ نص قرآن سے حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ ﴾ (سورۃ الانعام: ۱۰۸) یعنی "ان کو گالی مت دو جن کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ پھر وہ لوگ ناواقفی سے حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔" دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ فلا تخضعن بالقول ﴾ (الاحزاب: ۳۲) ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا: ﴿ ولا تبرجن ﴾ (الاحزاب: ۳۳)

اور اگر وہ "سبب" معصیت کے لیے محرک اور داعی تو نہ ہو بلکہ معصیت تک صرف پہنچانے والا ہو، اس کے ساتھ ساتھ وہ اس معصیت کے لیے اس لحاظ سے قریب بھی ہو کہ اس کے ذریعہ "معصیت" انجام دینے کے لیے فاعل کو کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے، مثلاً: فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنا یا مثلاً: شراب بنانے والے کو انگور کا شیرہ فروخت کرنا یا مثلاً: امرد غلام ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جو اس کو بدفعلی کے ارادے سے خرید رہا ہو یا مثلاً: ایسے شخص کو مکان کرائے پر دینا جس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ اس مکان میں شراب کی تجارت کرے گا یا اس مکان کو وہ "کنیسہ" (یہودیوں کی عبادت گاہ) بنائے گا یا اس مکان کو وہ مجوسیوں کی عبادت گاہ بنائے گا۔ ان تمام صورتوں میں فروخت کرنا یا کرایہ پر دینا مکروہ تحریمی ہے، بشرطیکہ بائع کو اور کرائے پر دینے والے کو زبانی تصریح کے بغیر ان باتوں کا علم ہو جائے لیکن اگر بائع اور کرائے پر دینے والے کو ان باتوں کا علم نہ ہو تو اس صورت میں وہ معذور سمجھا جائے گا اور اگر بائع اور آجر کو صراحتاً ان باتوں کا علم تھا اس کے باوجود اس نے بیع کر دی یا کرایہ پر دے دیا تو اس صورت میں بائع اور آجر حرام کام پر اعانت کرنے والے ہو جائیں گے۔

اور اگر وہ سبب قریب نہیں ہے بلکہ سبب بعید ہے کہ موجودہ صورت میں اس سے معصیت

صادر نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے ذریعے معصیت کو انجام دینے کے لیے اس میں تبدیلی کی ضرورت پیش آئے گی، مثلاً فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ لوہا فروخت کرنا وغیرہ تو یہ صورت مکروہِ تنزیہی ہے۔

(جواهر الفقه: ٢/٤٥٣،

احکام القرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمه الله : ٣/٧٤)

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے اپنے ایک اردو کے مقالے میں اس مسئلہ کو اور زیادہ واضح کر کے بیان فرمایا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''اگر ''تسبب'' کے مفہوم کو مطلقاً سببیت کے لیے عام رکھا جائے تو شاید دنیا کا کوئی مباح کام بھی مباح اور جائز نہیں رہے گا، مثلاً: زمین سے غلہ اور پھل اُگانے والا اس کا بھی سبب بنتا ہے کہ اس غلہ اور ثمرات سے اعداء اللہ (اللہ تعالیٰ کے دشمنوں) کو نفع پہنچے، کپڑا بننا، مکان بنانا، ظروف اور استعمالی چیزیں بنانا، ان سب میں بھی یہ ظاہر ہے کہ ہر ایک نیک اور فاجر ان کو خریدتا ہے اور استعمال کرتا ہے اور اپنے فسق و فجور میں بھی استعمال کرتا ہے اور سبب اس کا ان چیزوں کا بنانے والا ہوتا ہے، اگر اس طرح حرمت کو عام کیا جائے تو شاید دنیا میں کوئی کام بھی جائز نہ رہے اس لیے ضروری ہے کہ سبب قریب اور بعید کا فرق کیا جائے، سببِ قریب ممنوع اور سببِ بعید مباح ہو۔ مذکورہ مثالیں سب کی سب سببِ بعید کی مثالیں ہیں اس لیے وہ جائز رہیں گی۔

پھر سببِ قریب کی بھی دو قسمیں ہیں:

ایک سببِ جالب و باعث جو گناہ کے لیے محرک ہو کہ اگر یہ سبب نہ ہوتا تو صدورِ معصیت کے لیے کوئی اور ظاہری وجہ نہ تھی ایسے سبب کا ارتکاب گویا معصیت ہی کا ارتکاب ہے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے ''موافقات'' کی جلد اول کے مقدمہ میں ایسے ہی اسباب کے متعلق فرمایا ہے کہ'' ایقاع السبب ایقاع للمسبب'' (یعنی سبب کا ارتکاب مسبب ہی کا ارتکاب ہے) چونکہ ایسے اسباب معصیت کا ارتکاب گویا خود معصیت ہی کا ارتکاب ہے اس لیے معصیت کی نسبت اس شخص کی طرف ہی کی جائے گی جس نے اس کے سبب کا ارتکاب کیا، کسی فاعل مختار کے درمیان میں حائل ہونے سے معصیت کی نسبت اس سے منقطع نہیں ہوگی۔ جیسا کہ حدیث شریف میں دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دینے والے کے حق میں اپنے ماں باپ کو گالی دینے والا کہا گیا ہے کیونکہ ایسا تسبب للمعصیۃ بنص قرآن و حدیث خود ایک معصیت ہے۔

سبب قریب کی دوسری قسم یہ ہے کہ وہ سبب قریب تو ہے مگر معصیت کے لیے محرک نہیں ہے بلکہ صدور معصیت کسی دوسرے فاعل کے اپنے فعل سے ہوتا ہے، جیسے " بیع العصیر ممن یتخذ خمرا " یا " اجارۃ الدار لمن یتعبد فیہا للاصنام " وغیرہ، تو یہ بیع اور اجارہ اگرچہ ایک حیثیت سے، معصیت کا سبب قریب مگر بذات خود جالب اور محرک للمعصیۃ نہیں ہیں۔

ایسے سبب قریب کا حکم یہ ہے کہ اگر بیچنے یا اجارہ پر دینے والے کا مقصد مشتری اور مستاجر کی اعانت علی المعصیۃ ہو تو یہ خود ارتکاب معصیت ہے اور اعانت علی المعصیۃ میں داخل ہو کر قطعاً حرام ہے اور اگر بیچنے والے اور کرایہ پر دینے والے کا یہ مقصد نہ ہو تو پھر دو صورتیں ہیں: ایک صورت یہ ہے کہ بیچنے والے کو معلوم ہی نہ ہو کہ وہ شخص شیرۂ انگور خرید کر سرکہ بنائے گا یا شراب بنائے گا، اس صورت میں تو یہ بیع بلا کراہت جائز ہے اور اگر بائع کو معلوم ہو کہ یہ شخص شیرہ انگور سے شراب بنائے گا تو اس صورت میں بیچنا مکروہ ہے۔

پھر اس مکروہ کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ وہ مبیع کسی تغیر اور تبدیلی کے بغیر بعینہٖ معصیت میں استعمال ہوتی ہو تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہِ تحریمی ہے، دوسری یہ کہ وہ مبیع کچھ تصرف اور تبدیلی کے بعد معصیت میں استعمال ہو سکے گی تو اس صورت میں اس کی بیع مکروہِ تنزیہی ہے۔

(جواهر الفقه: ۲/ ۴۶۰، ۴۶۲)

لہٰذا جب مندرجہ بالا بنیاد پر بینک میں رکھی گئی رقوم میں غور کیا تو اس سے یہ بات سامنے آئی کہ کسی شخص کا "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانا سودی معاملات کا ایسا محرک اور سبب نہیں ہے کہ اگر یہ شخص بینک میں رقم نہیں رکھوائے گا تو بینک سودی لین دین کے گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا، لہٰذا ایسا شخص سبب قریب کی قسم ثانی میں داخل ہے اور عام طور پر بینک میں رقم رکھوانے والے کا یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ سودی لین دین میں بینک کی مدد کرے گا بلکہ عام طور پر اپنی رقم کی حفا[illegible] مقصود ہوتی ہے اور پھر رقم رکھوانے والے کو یقینی طور پر یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس کی رقم سودی لین دین میں لگائی جائے گی بلکہ اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم بینک میں محفوظ رکھی جائے اور اس کا بھی احتمال ہوتا ہے کہ اس کی رقم کسی جائز اور مشروع لین دین میں لگائی جائے، لیکن اگر بالفرض بینک نے اس کی رقم سودی کاروبار میں بھی لگا دی ہو تب بھی کرنسی کا اصول یہ ہے کہ وہ جائز عقود معاوضہ میں متعین کرنے سے متعین نہیں ہوتی، لہٰذا سودی معاملات کو "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رکھی

گئی رقم کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا بلکہ ان معاملات کو اس رقم کی طرف منسوب کیا جائے گا جو اب بینک کی اپنی ملکیت ہوگئیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ "کرنٹ اکاؤنٹ" میں رقم رکھوانا مکروہ تنزیہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بہت سے جائز معاملات بھی بینکوں کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہیں اور ان معاملات کی تکمیل کے لیے انسان اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کسی نہ کسی بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولے۔ چونکہ بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کی یہ ضرورت بالکل ظاہر ہے، اس ضرورت کے پیش نظر بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ کھولنے کی کراہت تنزیہی بھی انشاء اللہ ختم ہو جائے گی۔ (فقہی مقالات ۳/۳۶، ۳۹)

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگر چہ سود لینے کا گناہ نہیں ہے مگر تعاون علی الاثم کا گناہ اس میں بھی ہے۔

لاکرز کا حکم:

لاکر میں جمع کرانا بھی جائز نہیں کیونکہ اس میں اگر چہ سود لینے اور تعاون علی الاثم کا گناہ نہیں ہے مگر بینک کے حرام پیسے سے بنے ہوئے خانے کے استعمال کا گناہ ہے، مجبوری کے وقت اس میں رقم جمع کرائی جاسکتی ہے، اس میں پہلی دونوں صورتوں کی نسبت گناہ کم ہے، لیکن پھر بھی توبہ و استغفار لازم ہے۔ (احسن الفتاوی ۷/۱٦)

غیر مسلم ممالک میں بینکوں سے سود لینے کا حکم:

غیر مسلم ممالک کے وہ بینک جن کے مالک بھی غیر مسلم ہیں، اس بارے میں موجودہ دور کے بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ ان بینکوں میں رقم رکھوانا اور اس رقم پر بینک جو منافع دیتا ہے اس کو لینا جائز ہے۔ وہ اپنے قول کی بنیاد امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے اس قول کو قرار دیتے ہیں

"یجوز اخذ مال الحربی برضاہ."

یعنی حربی کا مال اس کی رضامندی سے لینا جائز ہے اور یہ کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہوتا۔

لیکن جمہور فقہاء نے بعض علماء کے اس قول کو قبول نہیں کیا حتی کہ متاخرین حنفیہ نے اس قول کے مطابق فتوی بھی نہیں دیا ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، دارالحرب میں بھی کفار سے سود لینا عند الجمہور

حرام ہے، ائمہ ثلاثہ اور احناف میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ حرمت کے قائل ہیں، البتہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ سے دار الحرب میں سود لینے کا جواز منقول ہے، لیکن دوسرے علماء نے امام اعظم رحمہ اللہ کے قول کا بھی ایسا مطلب بیان کیا ہے کہ جمہور کے خلاف نہیں رہتا یعنی امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک بھی حرام ہے، قرآن کریم میں سود خوروں سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے، حدیث میں بھی سود کے متعلق جس قدر وعیدِ شدید آئی ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شبہ ربو پر بھی جرات نہیں کر سکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

"فدعوا الربوا و الريبة ."

''کنز العمال'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول منقول ہے:

"تركنا تسعة اعشار الحلال خشية الربوا ."

لہٰذا محققین علماء کا فتویٰ ہے، دار الحرب میں بھی غیر مسلموں سے سود لینا حرام ہے۔

(احسن الفتاوی : ۲۰/۷)

علامہ محمد علی صابونی فرماتے ہیں:

الربوا حرام سواء كان مع المسلم او مع غير المسلم، فما يفعله بعض المسلمين، من وضع اموالهم فى النبوك الاوربية أو الامريكية، ثم أخذ فوائد ربوية عليها، بزعمهم أن تلك البلاد . " دارالحرب " لانها بلاد غير الاسلامية انما هو من تزيين الشيطان لهم، لجرهم إلى الوقوع فى المحرم، و استحلال الربا الذى حرمه الله تعالىٰ .

وهذا الاعتقاد خطا، حسيم، و خطر . فادح، يجر المسلمين إلى مقارنة جريمة الربا، على ظن منهم أن الدين بيبح لهم وما دروا انهم يخالفون تعاليم دينهم صراحةً و جهاراً دون فقه لتعاليمه الرشيده السامية، الى قوله ..... قال ابن قدامة ويحرم الربا فى دارالحرب كتحريمه فى دارالاسلام ."

وعموم الاخبار يقتضى تحريم الربوا، لان ما كان محرما فى دارالاسلام، كان محرما فى دارالحرب، كالربا بين المسلمين وما

ورد " لا ربا بین اهل الحرب و اهل الاسلام خبر موسل لا تعرف صحته، قال الشافعي هذا ليس ثابت، ولا حجة فيه . "

(المغنی لابن قدامة : ٦/٩٨) (فقه المعاملات : صـ ١٥٧)

قابل غور بات:

یورپی ممالک کے بینکوں میں رقم رکھ کر فوائد حاصل کرنا حرام ہونے کا فتویٰ مندرجہ بالا سطور میں مذکور ہے، البتہ استاذِ محترم حضرت مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم ایک ''مقالہ'' کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''لیکن یہاں ایک بات قابل توجہ ہے، وہ یہ کہ آج کے موجودہ دور میں عام اسلامی حکومتوں پر مغربی ممالک ہی کا تسلط اور کنٹرول ہے اور ان کے کنٹرول کے اہم عوامل میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے مسلم ممالک کی دولت کو یا تو غصب کرلیا ہے یا مسلم ممالک نے ان مغربی ممالک سے جو قرض لیا ہے، اس قرض پر سود کی صورت میں مسلمانوں کا مال حاصل کرلیا ہے، دوسری طرف مسلمانوں نے جو بڑی بھاری رقمیں ان ممالک کے بینکوں میں رکھوائی ہیں، ان رقموں پر بھی ان کا قبضہ ہے اس رقم کو وہ اپنی ضروریات میں خرچ کرتے ہیں، بلکہ اس رقم کو مسلمانوں ہی کے خلاف سیاسی اور جنگی اسکیموں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، لہٰذا مسلمان اپنی رقم پر ملنے والا سود وہاں چھوڑ دیں تو اس کے ذریعہ ان کفار کو تقویت ہوگی، ان حالات کی وجہ سے میرا رجحان اس طرف ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے لیے غیر مسلم ممالک میں غیر مسلموں کے بینکوں سے اپنی رقم پر ملنے والے سود کو وصول کرلینا جائز ہے، لیکن اس رقم کو اپنی ضروریات میں صرف کرنا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ بلا نیتِ ثواب کسی نیک مصرف میں خرچ کردینا چاہیے، اس طرح جو مسلمان اپنی رقمیں ان بینکوں میں رکھوا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے کام میں ان کافروں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس تعاون میں کمی ہوجائے گی، بہر حال یہ مسئلہ علماء کی خدمت میں پیش ہے، وہ اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ فرمائیں۔ (فقہی معاملات : ٣/٣١)

غیر مسلم مالک کے بینک میں سود چھوڑنا:

بینک کے مالک خواہ مسلم ہوں یا کافر، بہر کیف، بینک میں رقم جمع کرانا جائز نہیں اور اگر کسی نے ناواقفیت یا ضرورتِ شدیدہ کی وجہ سے بینک میں رقم جمع کرادی تو اس کا سود بینک میں چھوڑنا

جائز نہیں اسلیے کہ بینک میں مختلف لوگوں کی رقوم سے خلافِ شرع حاصل شدہ منافع ارباح فاسدہ ہیں، جو بحکم لقطہ ہیں اور چونکہ ان کا مالک معلوم نہیں، لہٰذا بینک سے سود کی رقم لے کر فقراء پر صدقہ کر دینا واجب ہے۔

وفي الباب الخامس عشر من كراهية الهندية : والسبيل في المعاصي ردها وذالك ههنا برد الماخوذ أن تمكن من رده بأن عرف صاحبه، وبالتصدق به إن لم يعرفه ليصل اليه نفع ماله إن كان لا يصل إليه عين ماله . (عالمگرية : ٣٤٩/٥)

علاوہ ازیں اس میں سودی کاروبار سے تعاون کا گناہ بھی ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ١٨/٧)

بینک کے سود سے انکم ٹیکس ادا کرنا:

بینک سے ملنے والے سود کو حکومت کی طرف سے عائد کردہ انکم ٹیکس وغیرہ میں ادا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تا کہ غیر شرعی رقم کے ذریعہ غیر شرعی ٹیکس سے نجات حاصل کی جائے، اس بارے میں شرعی مسئلہ یہ ہے کہ بینک سے جو سود ملتا ہے چونکہ وہ حکومت کے خزانے سے نہیں ملتا اور اس کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے اس سے انکم ٹیکس ادا کرنا صحیح نہیں، بلکہ مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔

بینک کے چوکیدار کی تنخواہ کا حکم:

جو لوگ بینک میں سودی لین دین کرتے ہیں اس کا حساب و کتاب کرتے ہیں یا سودی معاملہ کرنے میں کسی بھی درجہ میں شریک ہیں ان کی تنخواہ تو حرام ہے، اگر کوئی بینک میں چوکیداری کرے یا کوئی اور ایسا کام کرے جس کا سودی کاروبار سے کوئی تعلق نہ ہو، تو ان کی کی تنخواہ بھی حرام ہوگی جبکہ ان کا سودی کاروبار سے تعلق نہیں؟ اس بارے میں علماء کی دو رائے ہیں:

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بینک کی رقوم دو قسم کی ہیں، ایک اصل سرمایہ، دوسری منافع یا آمدن اصل سرمایہ میں حلال غالب ہے، اسی وجہ سے بینک میں جمع کردہ رقم واپس لینا جائز ہے اور یہ رقم حلال ہے۔

دوسری قسم بینک کی آمدن ہے، اس میں سود اور دیگر ناجائز منافع کا غلبہ ہے اور عقلاً وعرفاً

قاعدہ یہ ہے کہ ہر قسم کے کاروبار میں ملازمین کی تنخواہوں اور دوسرے مصارف کو آمدن سے متعلق قرار دیا جاتا ہے، مصارف اصل سرمایہ کی بجائے آمدن سے وضع کیے جاتے ہیں اس لے بینک کے ہر قسم کے ملازم کی تنخواہ حرام ہے خواہ سودی کاروبار سے اس کا تعلق بھی نہ ہو۔

(احسن الفتاویٰ بتغیر یسیر)

دوسری طرف بعض علماء کا موقف یہ ہے کہ بینک ایک کاروباری ادارہ ہے اس میں سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے لہٰذا جو لوگ سودی کاروبار کرتے ہیں، کسی بھی درجہ میں ان کا کام سود سے متعلق ہے، ان کی تنخواہ تو حرام ہے، لیکن چوکیدار وغیرہ جو بینک میں حلال کام کرتے ہیں ان کی تنخواہ حلال ہے، اگرچہ یہ قول اوسع ہے اور مبنی بر سہولت ہے تاہم پہلا قول راجح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شرعی قاعدہ ہے کہ حلال وحرام میں تعارض ہو جائے تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول پہلے گزرا ہے۔

" دعوا الربوا و الريبة ."

یعنی سود کو بھی چھوڑ دو اور جس میں سود کا شبہ ہے اس کو بھی چھوڑ دو، اس لیے بینک کی چوکیداری کی ملازمت بھی اختیار نہ کی جائے۔

حرام مال کے مصارف:

حرام مال سے بچنے اور حلال رزق حاصل کرنے کی قرآن کریم نے مختلف عنوانات سے تاکید فرمائی، ایک آیتِ کریمہ میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے کہ انسان کے اعمال و اخلاق میں بہت بڑا دخل حلال کھانے کو حاصل ہے، اگر اس کا کھانا پینا حلال نہیں، تو اس سے اخلاق حمیدہ اور اعمالِ صالحہ کا ظہور مشکل ہے۔

لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حلال مال کے لیے کوشش کرے اور حرام مال سے احتراز کرے، لیکن اگر کسی ذریعہ سے مسلمان کے پاس حرام مال آ جائے تو اس کا استعمال اس کے لیے جائز نہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ حرام مال جہاں سے حاصل کیا ہے وہیں اس کو واپس لوٹا دے۔ یعنی اگر اصل مالک یا اس کا ورثا موجود ہوں اور معلوم بھی ہوں تو مال ان کو واپس کرنا ضروری ہے اور اگر اصل مالک یا اس کے ورثاء موجود نہ ہوں یا معلوم نہ ہوں یا کسی معقول عذر کی وجہ سے یہ مال ان تک پہنچانا مشکل ہو، تو اصل مالک کی طرف سے اس کو صدقہ کرنا ضروری ہے،

اس کا ثواب اصل مالک کو مل جائے گا اور یہ صدقہ مساکین پر کیا جائے۔

ویردونھا علی اربابھا إن عرفوھم وإلا تصدقوا بھا لأن سبیل الکسب الخبیث التصدق إذا تعذر الرد علی صاحبہ.

(ردالمحتار : ٦/٣٨٥)

والحاصل إن علم ارباب الأموال وجب ردہ علیھم، وإلا فإن علم عین الحرام لا یحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ.

(ردالمحتار : ٥/٩٩)

بینک کی ملازمت:

سود میں خود ملوث اور مبتلا ہونا ہی گناہ نہیں ہے بلکہ اس کے کاروبار میں مدد معاون ہونا بھی معصیت ہے۔ یوں تو تمام ہی گناہ کے کاموں میں اعانت ناپسندیدہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان﴾ لیکن خصوصیت سے سود کے متعلق آپ ﷺ کی صراحت موجود ہے۔ حضرت جابرؓ سے مروی ہے:

لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربوا ومؤکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال ھم سواء.

(صحیح مسلم عن جابر : ٢/٢٧ باب الربا)

ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے اور کھلانے والے اور اس کے کاتب نیز گواہوں سبھی پر لعنت کی ہے اور فرمایا کہ وہ سبھی برابر ہیں۔''

یہاں سود کے لکھنے والوں اور گواہوں پر حضور ﷺ کی لعنت سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ بینک کی ایسی ملازمت جس میں آدمی کسی ذمہ دارانہ عہدہ پر فائز ہو یا سودی معاملات لکھنے پڑتے ہوں جائز نہیں، اس لیے کہ ان کی حیثیت ربوا کے کاتبین اور گواہوں کی ہوگئی اور ان کو حضور ﷺ نے نہ صرف یہ کہ ملعون قرار دیا ہے، بلکہ سودخوروں کے مساوی قرار دیا ہے۔

ہاں! ایسی ذمہ داریاں جن کا تعلق براہِ راست سودی کاروبار سے نہ ہو بلکہ وہ بینک کے دوسرے کام یا اس کی حفاظت پر مامور ہوں، ان کے لیے اس ملازمت کا جاری رکھنا یا حاصل کرنا جائز ہے۔ (ماخوذ جدید فقہی مسائل : ص ٣٨٧)

ماقبل میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا فتویٰ نقل کر چکے ہیں کہ بینک کے چوکیدار کی تنخواہ بھی حلال نہیں، اس لیے ہر قسم کی ملازمت سے اجتناب کیا جائے۔

مالِ حرام سے مسکین کا کھانا جائز نہیں:

ایک شخص بینک میں ملازم ہے، اس کی بالغ اولاد اگر مسکین ہے تو کیا ان کے لیے والد کی حرام آمدن سے کھانا پہننا جائز ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ

حرام مال واجب التصدق ہے جس میں تملیک مسکین ضروری ہے، اس لیے حرام آمدن والے کے ہاں کھانا مسکین کے لیے بھی جائز نہیں، البتہ وہ مسکین کو مالک بنادے تو اس کے لیے جائز ہے، مگر تملیک مسکین کے بعد بھی غنی کے لیے جائز نہیں جب تک کہ غنی کو مالک نہ بنائے۔

سوال میں مذکورہ صورت میں یہ تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے کہ والد بالغ اولاد میں سے کسی کو نقد رقم کا مالک بنادے پھر وہ گھر کے تمام مصارف پر خرچ کرتا رہے، اسی طرح پورا گھرانا حرام خوری سے بچ سکتا ہے۔

فی الباب الخامس عشر من كراهية الهندية : و السبيل فی المعاصی ردها و ذلك ههنا بردا لمأخوذ ان تمكن من رده بأن عرف صاحبه و بالتصدق به ان لم يعرفه ليصل اليه نفع ما له ان كان لا يصل إليه عين ماله . (عالمگيرية : ٣٤٩/٥)

وقال العلامة الحصكفی رحمه الله تعالىٰ : عليه ديون و مظالم جهل اربابها و أيس من عليه ذلك من معرفتهم فعليه التصدق بقدرها من ماله و ان استغرقت جميع ماله . (ردالمحتار : ٣٢٣/٣)

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله تمليكا) فلا يكفی فيها الاطعام الا بطريق التمليك ولو اطعمه عنده ناويا الزكاة لا تكفی .

(ردالمحتار : ٦٢/٢)

قال العلامة الحصكفی رحمه الله تعالىٰ : وطاب لسيده و ان لم يكن مصرفا للصدقة ما ادی اليه من الصدقات فعجز لتبدل الملك واصله حديث بريرة رضی الله تعالىٰ عنها هی لك صدقة ولنا هدية

كما في وارث شخص فقير مات عن صدقة اخذها وارثه الغني وكما في ابن السبيل اخذها ثم وصل الى ماله وهي في يده اي الزكاة وكفقير استغنى وهي في يده فإنها تطيب له بخلاف فقير اباح لغني او هاشمي عين زكاة اخذها لا يحل لان الملك لم يتبدل .

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى : تحت (قوله لان الملك لم يتبدل) لان المباح له يتناوله على ملك المبيح ونظيره المشترى شراء فاسدا إذا اباح لغيره لا يطيب له ولو ملكه يطيب هداية . (ردالمحتار : ٥/٧٢) (احسن الفتاوىٰ : ٨/١٣٢)

وضاحت:

اس میں حرام خوری سے بچنے کی جو تدبیر مذکور ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بینک میں نوکری کرتا رہے اور نابالغ اولاد میں سے کسی کو مالک بنا کر اس سے کھاتا رہے، بلکہ بینک کی ملازمت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ ملازمت حرام ہے اور ملنے والی تنخواہ بھی حرام ہے اور اگر ناواقفیت کی وجہ سے کسی نے ملازمت اختیار کرلی تو اس سے توبہ کرے اور حتی المقدور کوشش کرنے کے حلال ذریعہ معاش اختیار کرے، جب تک اس کا بندوبست نہ ہو اس وقت تک مذکورہ تدبیر اختیار کرے، البتہ اس کے لیے بھی شرط یہ ہے کہ لڑکا بالغ ہو اور مسکین بھی اور اس کو مالک بنا کر دے دیا جائے۔

اگر یہ شرائط نہ پائی جائیں تو یہ تدبیر بھی شرعاً غیر معتبر ہوگی۔

لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کا اجرت یا کمیشن لینا:

جو لوگ باہر سے مال منگواتے ہیں، ان کو کسی بینک میں ایل سی کھلوانی پڑتی ہے، جس کے نتیجے میں بینک اس کے لیے ''لیٹر آف کریڈٹ'' جاری کرتا ہے اور جس میں بینک اس شخص کی ضمانت دیتا ہے اور پھر بینک اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بینک کے لیے اس ضمانت پر معاوضہ وصول کرنا جائز ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

اس موضوع پر میں نے ڈاکٹر رفیق مصری کی تجاویز کا جائزہ لیا۔ لیکن اس مسئلے میں میرا وہی جواب ہے جو ''سروس چارجز'' کے مسئلے میں عرض کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ کفالت یا ضمانت پر

اجرت لینا شرعاً حرام ہے، میرے علم کے مطابق کسی ایک فقیہ نے بھی اس کو جائز نہیں کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایسی اجرت ہے جو کسی مال یا عمل کے عوض میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں کفالت کو عقد تبرع میں شمار کیا جاتا ہے۔ عقود معاوضہ میں شمار نہیں ہوتا اور یہ ایسی واضح بات ہے کہ جس کے لیے دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔

البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ''کفیل'' کے لیے نفس کفالت پر تو اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کفیل کو اس کفالت پر کچھ عمل کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس کے بارے میں اس کو لکھنا پڑھنا پڑتا ہے اور دوسرے دفتری امور بھی انجام دینے پڑتے ہیں یا مثلاً کفالت کے سلسلے میں اس کو ''مضمون لہ'' (جس کے لیے ضمانت لی گئی ہے اور ''مضمون عنہ'' جس کی طرف سے ضمانت لی ہے) سے ذاتی طور پر یا خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ کرنا پڑتا ہے' اس قسم کے دفتری امور کو تبرعاً انجام دینا ضروری نہیں، بلکہ کفیل کے لیے مکفول لہ سے یا مکفول عنہ سے ان تمام امور کے انجام دینے پر اجرت مثل کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

آج کل جو بینک کسی کی ضمانت لیتے ہیں تو وہ صرف زبانی ضمانت نہیں لیتے، بلکہ اس ضمانت پر بہت سے دفتری امور بھی انجام دیتے ہیں، مثلاً: خط و کتابت کرنا کاغذات وصول کرنا، پھر ان کو سپرد کرنا، رقم وصول کرنا، پھر اس کو بھیجنا وغیرہ اور ان کاموں کے لیے اسے ملازمین، عملہ، دفتر، عمارت اور دوسری ضروری اشیاء کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب بینک جو یہ تمام امور انجام دے رہا ہے۔ یہ فری فنڈ میں مفت انجام دینا اس کے لیے واجب نہیں ہے۔ چنانچہ ان امور کی انجام دہی کے لیے بینک کے لیے اپنے گاہکوں سے مناسب اجرت لینا جائز ہے، البتہ نفس ضمانت پر اجرت لینا جائز نہیں۔

اور پھر بینک بائع اور مشتری کے درمیان واسطہ بھی بنتا ہے اور بحیثیت دلال یا وکیل کے بہت سے امور انجام دیتا ہے اور شرعاً دلالی اور وکالت پر اجرت لینا جائز ہے۔ لہٰذا ان امور کی ادائیگی میں بھی بینک کے لیے اپنے گاہک سے اجرت کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

چنانچہ اب بینک کے لیے گاہک سے دو قسم کی اجرتوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

1- لیٹر آف کریڈٹ جاری کرنے پر بینک کو جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان امور پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

2- وکالت یا دلالی پر اجرت طلب کرنا جائز ہے۔

البتہ بینک اپنے گاہک سے یہ دو قسم کی جو اجرتیں وصول کرے گا، اس میں یہ ضروری ہے کہ وہ اجرت ان کاموں کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو، اس لیے کہ اگر یہ اجرت مثل سے زائد ہوگی تو پھر یہ تو نفس ضمان پر اجرت وصول کرنے کا ایک حیلہ بن جائے گا۔

بہر حال، جب بینک کو یہ دو قسم کی اجرتیں حاصل ہو گئیں تو اب نفس ضمان پر اجرت لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ (ماخوذ از فقهی مقالات: ۳ / ۳۰۱ ـ ۳۰۳)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ درآمد کنندگان کو بینک جو ضمانت فراہم کرتا ہے جس کو لیٹر آف کریڈٹ کہا جاتا ہے، اس پر اجرت لینا جائز نہیں، البتہ لیٹر فراہم کرتے وقت جو دفتری امور انجام دینے پڑتے ہیں ان کی اجرت لینا جائز ہے، شرط یہ ہے کہ بینک جو رقم اجرت کے نام سے وصول کر رہا ہے وہ ان امور کی اجرت مثل سے زائد نہ ہو۔

جی پی فنڈ پر سود کا مسئلہ:

حکومت سرکاری ملازمین کی تنخواہ سے ہر ماہ کچھ رقم جبراً وضع کرتی ہے جس کو جی پی فنڈ کہا جاتا ہے، اختتام ملازمت (ریٹائرمنٹ) پر حکومت یہ ساری جمع شدہ رقم ملازم کو اور اس کے انتقال کی صورت میں اس کے ورثاء کو ادا کر دیتی ہے، اس میں سود کے نام سے ایک اضافی رقم بھی ملاتی ہے اب یہ اضافی رقم جو حکومت ادا کرتی ہے اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں ہے کیونکہ سود دو آدمیوں کے درمیان بذریعہ عقد طے ہوتا ہے، جبکہ دونوں طرف سے مال ہو اور ان کا مملوک ہو، مسئلہ مذکورہ میں ملازم سے جو رقم تنخواہ سے وضع کی جاتی ہے وہ ملازم کی ملک نہیں ہوتی، اس لیے کہ ملازم کی تنخواہ ملک میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قبضہ میں ہو:

قال العلامة ابن نجيم: قوله بل بالتعجيل او بشرطه او بالاستيفاء أو بالتمكن اي لا يملك الاجرة الا بواحد من هذه الاربعة. (البحر الرائق: ۷/ ۳۰۰)

چونکہ اس رقم پر ملازم یا اس کے وکیل نے قبضہ نہیں کیا، اس لیے ملازم اس رقم کا مالک نہیں ہوا لہٰذا ملازم کے تصرفات اس میں نافذ نہ ہوں گے، اب حکومت اصل رقم یا سود کے نام پر اضافی رقم

جو کچھ بھی ادا کر رہی ہے، سب اجرت ہی کا حصہ ہے جو حکومت مؤجلاً اکٹھی ادا کر رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جبری پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود کے نام سے جو رقم ملتی ہے، وہ شرعاً سود نہیں بلکہ اجرت (تنخواہ) ہی کا ایک حصہ ہے۔''

(پراویڈنٹ فنڈ پرز کوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٤)

جی پی فنڈ پر بیمہ کمپنی یا بینک سے سود لینے کا حکم:

اگر کوئی سرکاری ملازم درخواست دے کر اپنے جی پی فنڈ کی رقم کسی بینک یا بیمہ کمپنی کے حوالہ کر دے تو وہ کمپنی اس کی وکیل بن جائے گی، چونکہ وکیل کا قبضہ مؤکل کا قبضہ ہوتا ہے، لہٰذا بیمہ کمپنی یا بینک میں رقم منتقل ہونے کے بعد ملازم اس رقم کا مالک بن جائے گا، اب اس رقم پر جو سود ملے گا وہ شرعاً سود ہی ہے، اس کا استعمال ملازم کے لیے حرام ہے، چنانچہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اس دوسری صورت کے بارے میں تحریر فرمایا کہ ''اگر بینک یا کمپنی وغیرہ اس رقم پر کچھ سود دے تو شرعاً سود ہی ہوگا جس کا لینا ملازم کے لیے قطعاً حرام ہے۔''

(پراویڈنٹ فنڈ پرز کوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٢٦)

اختیاری جی پی فنڈ کا حکم:

کوئی ملازم بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے کچھ رقم جی پی فنڈ میں کٹوائے اور پھر اختتام ملازمت اصل رقم مع سود وصول کرے شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ اصل رقم تو حلال ہے، اس پر حکومت کی طرف سے سود کے نام پر جو اضافی رقم ملے گی، اس میں تشبہ بالربوا ہے آئندہ سود خوری کا ذریعہ بنا لینے کا بھی خطرہ ہے، اس لیے اس سے اجتناب کیا جائے۔

(پراویڈنٹ فنڈ پرز کوۃ اور سود کا مسئلہ: ص ٤)

مال حرام سے ہدیہ یا دعوت قبول کرنا:

اگر کسی کی آمدن حرام و حلال مخلوط ہو اس کے ہاں دعوت کھانے یا اس سے ہدیہ قبول کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بارے میں حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے:

اگر حرام مال جدا ممتاز نہ ہو، یعنی خالص حرام یا حلال و حرام مخلوط ہونے کا یقین نہ ہو اور حلال مال زیادہ ہو تو اس سے ہدیہ یا دعوت قبول کرنا جائز ہے۔

اگر حرام زیادہ ہے یا دونوں برابر ہیں یا حرام مال جدا ممتاز ہے تو اسے قبول کرنا جائز نہیں۔

قال فی الهندية اهدی الی رجل شيئا او اضافه ان كان غالب ماله من الحلال فلا بأس الا ان يعلم بأنه حرام فإن كان الغالب هو الحرام فينبغي ان لا يقبل الهدية ولا يأكل الطعام الا ان يخبره بأنه حلال ورثه او استقرضه من رجل كذا فی الينابيع .

وايضا فيها اكل الربو او كاسب الحرام اهدی اليه او اضافه وغالب ماله حرام لا يقبل ولا يأكل مالم يخبره ان ذلك المال اصله حلال ورثه او استقرضه وإن كان غالب ماله حلالا لا بأس بقبول هدية والاكل منه كذا فی الملتقط . (عالمگيرية كتاب الكراهية : ٤)

وفی الاشباه فی القاعدة الثانية من النوع الثاني : إذا اجتمع عند احد مال حرام و حلال فالعبرة للغالب ما لم يتبين .

(الاشباه والنظائر : ١٤٧/١)

مال مخلوط کا حکم مذکور اس صورت میں ہے کہ خلط متیقن نہ ہو، اگر خلط کا یقین ہو تو بہر حال حرام ہے خواہ حلال غالب ہو یا مغلوب۔ (احسن الفتاویٰ : ١٠٣/٨)

البتہ اگر حرام آمدن والا کہیں سے حلال مال قرض لے کر چندہ دے یا کسی کی دعوت کرے یا کسی کو ہدیہ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں، اگر کہیں مشترک کھانے میں حرام مال کو ملالیا جائے تو سب کا کھانا حرام ہو جائے گا، جیسا کہ ایک کلو دودھ میں ایک قطرہ پیشاب ملانے سے سارا دودھ ناپاک ہو جاتا ہے، اس لیے جہاں حرام آمدنی والے کو شریک کرنا پڑے تو یہ حیلہ اختیار کرلیا جائے کہ اس سے کہا جائے کہ کہیں سے حلال رقم قرض لے کر شرکت کریں، نیز قربانی کے جانور میں شرکت کا بھی یہی طریقہ ہے، کہ کہیں سے حلال رقم قرض لے کر شرکت کرے ورنہ سب کی قربانی خراب ہو جائے گی۔

بیمہ

تأمین:

بیمہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے، کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں ہوتی۔

بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا ادارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرات کی میں تلافی کردوں گا۔ مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودہویں صدی عیسوی میں ہوا۔ دوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا۔ بحری جہاز ڈوب بھی جاتے تھے اور مال کا نقصان ہوتا تھا۔ بحری جہاز کے نقصان کی تلافی کے لیے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔ علامہ شامیؒ نے بھی ''متامن'' کے احکام میں ''سوکرہ'' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔ جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے۔ ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں:

1- تامین الاشیاء: (جنرل انشورنس)

اس کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے جسے ''پریمیئم'' کہتے ہیں اور چونکہ پریمیئم اکثر قسط وار ادا کیا جاتا ہے، اس لیے عربی میں اسے ''قسط'' کہتے ہیں اور اس چیز کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کردیتی ہے۔ اگر اس سامان کو جس کا بیمہ کرایا گیا تھا کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیئم ادا کیا ہے وہ واپس نہیں ہوتا۔ البتہ حادثے کی صورت میں بیمے کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نقصان کی تلافی کرلیتا ہے۔ اس میں جہاز کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ داخل ہوگئے۔

2- تامین المسئولیۃ: (تھرڈ پارٹی انشورنس)

جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے۔ اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لیے بیمہ کرایا جاتا ہے۔ مثلاً: گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دوسرے کا نقصان ہوجانے کا خطرہ ہے۔ اس صورت میں گاڑی چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہوجائے گا۔ اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثے کی وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس کو عموماً (تھرڈ پارٹی انشورنس) کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گاڑی سڑک پر لانے کے لیے یہ انشورنس قانوناً ضروری ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے سے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کرکے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے بھی

گھر کے مالکان بیمہ کرالیتے ہیں، یہ بھی ''تامین المسئولیۃ'' کی ایک شکل ہے جس میں اگر تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔

3- تأمین الحیاۃ: (لائف انشورنس)

جس کو (بیمہ زندگی) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدت میں بیمہ دار کا انتقال ہو گیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو ادا کرے گی۔ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر ہوتی ہے، اس مدت میں انتقال ہو گیا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی، اگر اس مدت میں انتقال نہ ہوا تو مدت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہو جاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں مدت مقرر نہیں ہوتی جب بھی انتقال ہو گا تو بیمہ کی رقم ورثہ کو مل جاتی ہے۔

''تأمین الاشیاء'' اور ''تأمین الحیاۃ'' میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ''تأمین الاشیاء'' کی صورت میں وہ خطرہ پیش نہ آئے تو جو قسطیں (پریمیئم) ادا کی تھیں وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے اور ''تأمین الحیاۃ'' میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم مع سود واپس مل جاتی ہے۔

بیمہ کی طریق کار اور ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں اور ہیں:

1- التامین الاجتماعی:

حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعہ کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدے کے حصول کی سہولت حاصل ہو جاتی ہے، اسے ''گروپ انشورنس'' کہتے ہیں، مثلاً: ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی مقدار ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کر لیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثے کی صورت میں بھاری رقمیں ورثاء کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہیں، اس کی بے شمار صورتیں ہیں ان تمام پر ایک اجمالی حکم لگانا مشکل ہے، ہر صورت کا حکم الگ ہو گا۔

2- التامین التبادلی یا التامین التعاونی (میوچل انشورنس)

اس کو انگریزی میں (Mutual Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنا لیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ میں سے اس کے نقصان کی تلافی کی

جائے گی۔ اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے۔ سال کے بعد حساب کرلیا جاتا ہے، اگر ادا کیے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کر لی جاتی ہے اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کر دی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لیے فنڈ میں حصہ کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداء بیمے کی یہی شکل چلی تھی اور شرعاً اس میں کوئی اشکال نہیں اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

3- التامین التجاری یا التامین بقسط ثابت: (کمرشل انشورنس)

جس کو انگریزی میں (Commecrical Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے، اس کمپنی کا مقصد بیمے کو بطور تجارت کے اختیار کرنا ہوتا ہے اور اس کا اصل مقصد بیمے کے ذریعے سے نفع کمانا ہوتا ہے جیسے دوسری کمپنیاں مختلف کاروبار سے نفع کماتی ہیں۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہیں۔ جو بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لیے حساب کر لیتی ہے کہ جس خطرے کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے تا کہ ان کے معاوضات ادا کر کے کمپنی کو نفع بچ سکے۔ اس حساب کے لیے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو "ایکچوری" کہتے ہیں۔

بیمے کی اسی قسم کا رواج زیادہ ہے اور اسی کا شرعی حکم علماء معاصرین میں زیادہ محل بحث بنا ہے۔ اس کے بارے میں علماء عرب میں سے شیخ ابوزہرۃ اور مصطفیٰ الزرقاء کا شدید اختلاف رہا ہے۔ شیخ ابوزہرہ اس کی حرمت کے قائل تھے اور مصطفیٰ الزرقا اس کے جواز کے قائل تھے۔ اس وقت عالم اسلام کے تقریباً تمام مشاہیر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں، البتہ مشاہیر میں سے صرف دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں۔ ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دوسرے شیخ علی الخفیف۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربوا بھی۔ قمار اس لیے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے۔ جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے۔ اسی کو قمار کہتے ہیں اور ربوا اس طرح کہ

یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے، البتہ تامین الحیاۃ (بیمہ زندگی) میں قمار نہیں، اس لیے کہ وہاں رقم واپس مل جاتی ہے، مگر ربوا اور غرر ہے، ربو تو ظاہر ہے، غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکان عقد (ثمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا یا کسی مجہول اور غیر معین واقعہ پر موقوف ہونا، یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی گئی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

(ماخوذ از جدید معیشت و تجارت)

بیمۂ زندگی حرام ہونے کی وجوہات:

بیمہ کی مختلف اقسام ہیں ان میں سے زندگی کا بیمہ ناجائز ہونے کی یہ وجوہ ہیں:

1- جو رقم بالاقساط ادا کی جاتی ہے وہ بیمہ کمپنی کے ذمہ قرض ہے اور اس پر جو زائد رقم ملتی ہے جس کو منافع سے تعبیر کرتے ہیں وہ سود ہے، کل قرض جر نفعا فھو ربوا۔

اس لیئے زندگی کا بیمہ قطعاً ناجائز ہے۔

2- بیمہ کا کاروبار مشروط بالشرط ہوتا ہے اور قرض مشروط حرام ہے۔

قال الامام طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله تعالىٰ: وفي كفالة الاصل في الباب الاخير القرض بالشرط حرام والشرط ليس بلازم. (خلاصة الفتاوىٰ: ٣/٥٤)

3- بیمہ مؤجل ہوتا ہے اور قرض میں تاجیل صحیح نہیں

قال الإمام المرغيناني رحمه الله تعالىٰ: فان تأجيله لا يصح (إلى قوله) وعلى اعتبار الانتهاء لا يصح لانه يصير بيع الدراهم بالدراهم نسيئة وهو ربوا. (هداية ٣/٧٦)

4- کمپنی والے اس رقم سے لوگوں کے ساتھ سودی معاملہ کرتے ہیں تو بیمہ کرنے میں گناہ پر تعاون ہوگا۔

قال الله تعالىٰ: ﴿ وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا تعاونوا على الإثم والعدوان ﴾

علاج کے لیے بیمہ کا حکم:

سوال: امریکہ میں میڈیکل (علاج معالجہ) کی سہولتیں پرائیوٹ اداروں کے سپرد ہیں، حکومت وقت کی طرف سے لوگوں کے علاج کے لیے ہسپتال وغیرہ کا انتظام نہ ہونے کے برابر ہے، حکومت کا کہنا ہے کہ مریض کو چونکہ اچھے سے اچھے علاج اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور پرائیویٹ ادارے زیادہ خوش اسلوبی سے علاج معالجہ کی سہولتیں بہم پہنچا سکتے ہیں، عام لوگوں نے علاج کے لیے پرائیویٹ کمپنیوں سے انشورنس (بیمہ) کرایا ہوتا ہے، ضرورت پڑنے پر مریض کے تمام اخراجات انشورنس کمپنی ہسپتال کو ادا کر دیتی ہے، انشورنس کمپنی بیمہ کرانے والے سے ماہانہ کچھ رقم وصول کرتی ہے، کیا امریکہ جیسے ماحول اور صورت حال میں اس مقصد کے لیے انشورنس کروانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مقصد کے لیے بھی بیمہ کرنا جائز نہیں بلکہ عام طریقہ یعنی علاج کے بعد رقم ادا کرنا اس پر عمل کیا جائے۔

گاڑی کا بیمہ:

سوال: امریکہ میں ہر گاڑی رکھنے والا شخص قانونی طور پر اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی کار کے لیے کم از کم ضرور انشورنس کرائے کہ اگر کبھی کار کا حادثہ ہوا اور حادثہ میں اس کی غلطی ہوئی تو وہ دوسرے شخص کی کار کے نقصان اور متاثرہ لوگوں کے علاج کا پورا ذمہ دار ہوگا اور اپنی انشورنس کمپنی کی مدد سے دوسرے کا پورا نقصان ادا کرے گا، کیا اس صورت میں ضرورت کے تحت کار کا انشورنس جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: چونکہ گاڑی کے مالک کی طرف سے بیمہ کا معاہدہ بطیبِ خاطر نہیں بلکہ حکومت کی طرف سے یکطرفہ جبر وظلم ہے، لہٰذا بوقتِ ضرورت گنجائش ہے، لیکن بصورتِ حادثہ جمع کردہ رقم سے زائد واجب التصدق ہے۔ (احسن الفتاوی: ۲۵/۷)

انشورنس کمپنی کی ملازمت کا حکم:

بیمہ کی جو موجودہ صورتیں رائج ہیں، وہ شرعی نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں ہیں، بلکہ سود اور جوا کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں، اس لیے اپنے اختیار سے بیمہ کرانا جائز نہیں ہے اور اس ادارہ میں ملازمت اختیار کرنا بھی جائز نہیں، اگر کوئی غلطی اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسے ادارہ میں ملازمت اختیار کر لے تو اس پر لازم ہے کہ فوری طور پر کوئی حلال ذریعہ معاش کا بندوبست کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی

کرتے رہیں کہ اس حرام خوری کی لعنت سے نجات عطا فرمائے، جب کوئی حلال ذریعہ میسر آجائے تو فوراً چھوڑ دیں اس وقت تک اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے ہوئے استغفار کرتے رہیں۔

رشوت کی تعریف اور احکام

رشوت کی تعریف:

رشوت بکسر راء، وہ مال جو اپنے موافق فیصلہ کروانے کے لیے دیا جائے۔

حضرت ابن عطیہ نے رشوت کی جامع تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

اخذ الاموال علی فعل ما یجب علی الاخذ فعله او فعل ما یجب علیه ترکه .

(تفسیر بحر محیط: ٤/٥٣٣، دستور العلماء: ٢/١٣٦)

یعنی جس کام کا کرنا اس کے ذمہ واجب ہے، اس کے کرنے پر معاوضہ لینا یا جس کام کا چھوڑنا اس کے ذمہ لازم ہے اس کے کرنے پر معاوضہ لینا رشوت ہے۔

رشوت کی جائز و ناجائز صورتیں:

سوال: آج کل ہر طرف رشوت کا بازار گرم ہے، کئی مواقع ایسے آتے ہیں کہ شریف آدمی بھی رشوت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے، جواز و عدم جواز کے مواقع معلوم نہ ہونے کی وجہ سے سخت پریشانی ہوتی ہے اور بسا اوقات خاصا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

اس لیے کوئی ایسا جامع ضابطہ بیان فرما دیں جسے سامنے رکھ کر ہر موقع کا حکم معلوم ہو جائے تاکہ احکام شرعیہ کی پابندی اور نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کیا جا سکے۔ حضرت مفتی رشید احمد رحمہ اللہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ

رشوت لینے دینے کی مختلف صورتیں ہیں، ہر ایک کا حکم لکھا جاتا ہے:

1- حکومت سے قضاء یا اس جیسا کوئی منصب حاصل کرنے کے لیے

2- حاکم سے کوئی فیصلہ کروانے کے لیے

3- اعانت علی الظلم کے لیے

ان تینوں صورتوں میں رشوت لینا بھی حرام ہے اور دینا بھی۔

حاکم سے منع حق کا خطرہ ہوتو اس کو دفع ظلم کے لیے رشوت دینا بھی جائز نہیں، اس لیے کہ اس سے حاکم کی عادت بگڑے گی جو پوری قوم پر ظلم کا باعث بنے گی۔

فهذا داخل في قاعدة : "ان الضرر الخاص يتحمل لدفع الضرر العام."

4- جس سے ضرر کا اندیشہ ہو اسے رشوت دینا جائز ہے، اس کیلئے لینا حرام ہے۔

5- دفع مضرت یا جلب منفعت کے لیے درمیان میں واسطہ بننے والے یعنی صرف سفارش کرنے والے کو رشوت دینا جائز ہے، آخذ کے لیے لینا جائز نہیں، البتہ اگر درمیانی واسطہ کے ذمہ کوئی کام لگایا جائے تو اس کے لیے اس کام کی اجرت لینا جائز ہے، بشرطیکہ وہ یہ کام کرنے پر بنفس خود قادر ہو، قادر بقدرت غیر کا اعتبار نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وفي الفتح الرشوة اربعة اقسام منها ما هو حرام على الآخذ والمعطي وهو الرشوة على تقليد القضاء والامارة الثاني ارتشاء القاضي ليحكم وهو كذلك ولو القضاء بحق لانه واجب عليه الثالث اخذ المال ليسوي امره عند السلطان دفعا للضرر او جلبا للنفع وهو حرام على الآخذ فقط وحيلة حلها ان يستأجره يوما الى الليل او يومين فتصير منافعه مملوكة ثم يستعمله في الذهاب الى السلطان للامر الفلاني وفي الاقضية قسم الهدية وجعل هذا من اقسامها فقال حلال من الجانبين كالاهداء للتودد وحرام منهما كالاهداء ليعينه على الظلم وحرام على الآخذ فقط وهو ان يهدى ليكف عنه الظلم والحيلة ان يستأجره الخ قال اي في الاقضية هذا إذا كان فيه شرط اما إذا كان بلا شرط لكن يعلم يقيناً انه انما يهدى ليعينه عند السلطان فمشايخنا على انه لا بأس به ولو قضى حاجته بلا شرط ولا طمع فاهدى اليه بعد ذلك فهو حلال لا بأس به وما نقل عن ابن مسعود رضي الله تعالىٰ عنه من كراهيته فورع الرابع ما يدفع من دفع الخوف من المدفوع إليه على نفسه او

ما له حلال للدافع حرام على الآخذ لان دفع الضرر عن المسلم واجب ولا يجوز اخذ المال ليفعل الواجب اهـ ما في الفتح ملخصا .

(ردالمحتار : ٤ / ٣٠٣) (ماخوذ از أحسن الفتاویٰ)

رشوت دے کر نوکری حاصل کرنا:

بعض لوگ رشوت دے کر نوکری حاصل کرتے ہیں، جبکہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں، لیکن بعض آدمی رشوت دینے پر مجبور ہوتے ہیں اس کے بغیر نوکری کا حصول مشکل ہو جاتا ہے، سرکاری افسران رکاوٹ ڈالتے ہیں، ایسی صورت میں دفع ظلم کے لیے رشوت دی جائے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں فرمائیں گے، باقی رشوت دے کر جو نوکری حاصل کی گئی ہو اس کی تنخواہ کا حکم یہ ہے کہ اگر اس ملازم میں کام کی اہلیت موجود ہے اور جو کام اس کے سپرد کیا گیا اس کو ٹھیک ٹھیک انجام دیتا ہے تو اس کی تنخواہ حلال ہے اگر وہ اس کام کا اہل ہی نہیں، یا کام ٹھیک انجام نہیں دیتا تو تنخواہ حلال نہیں ہوگی۔

مالِ حرام اور مخلوط مال سے نفع حاصل کرنے کا حکم:

جو مال حلال اور حرام سے اس طرح مخلوط ہو کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہو تو ایسی صورت میں خلط کرنے والا تمام مال کا مالک بن جاتا ہے، البتہ جتنا مال حرام کا ہے اس کا ضمان ادا کرنا اس پر واجب ہے۔ جب تک اس کا ضمان ادا نہ کرے یا ضمان کو اپنے ذمہ لازم نہ کر لے اس وقت تک اس مال مخلوط میں کسی قسم کا تصرف کرنا اور اس سے کسی طرح بھی نفع اٹھانا جائز نہیں اور جو مال خالص حرام ہے اس کا حکم بھی بطریق اولیٰ یہی ہے۔

اور اگر کوئی شخص اس غالب حرام والے مخلوط مال یا خالص حرام مال کے ذریعہ کاروبار کر کے نفع حاصل کرتا ہے تو وہ نفع چونکہ اس کے لیے حلال نہیں ہے اس لیے اس نفع کو اصل رقم کے ساتھ اصل مالک یا اس کے ورثاء کو لوٹانا ضروری ہے، اصل مالک یا اس کے ورثاء کے موجود نہ ہونے یا نہ ملنے کی صورت میں اس کی طرف سے صدقہ کرنا واجب ہے، للخبث فیہ.

اور اگر مخلوط مال کی اکثریت حلال ہو تو پھر اس میں تصرف کرنا اور کاروبار کر کے نفع اٹھانا جائز ہے اور اس کے ذریعے کاروبار کر کے اگر کچھ آمدنی حاصل کی ہے تو وہ بھی حلال ہے، تاہم جس قدر مال حرام کا شامل ہوا ہے وہ اصل مالک کو واپس کرنا ضروری ہے معلوم نہ ہونے کی صورت میں

صدقہ کرنا ہوگا اور جس قدر اس حرام مال میں نفع ہوا ہے اس نفع کو صدقہ کرنا بھی لازم ہے، مثلاً: دس فیصد حرام مال شامل تھا تو نفع کا دس فیصد صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

قرض کے احکام اور اس کی تفصیلات

قرض کی تعریف:

هو المال الذي يدفعه الشخص الى غيره، ليرده مثله، عند قدرته فانه على سداد الدين.

یعنی قرض وہ مال ہے جو ایک شخص دوسرے کو دیتا ہے، تاکہ قدرت حاصل ہوتے وقت اس کی مثل واپس کرے۔

قرض کے فضائل:

کسی کو قرض دینا بہت ثواب کا کام ہے۔

چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ واقرضوا الله قرضا حسنا ﴾

بلکہ دوسرے کے فائدہ کے لیے بھی نیک کام کیا جائے وہ بھی قرضۂ حسنہ کے اندر داخل ہے:

قوله عليه السلام: من نفس عن مسلم كربة من كرب الدنيا، نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة.

(اخرجه مسلم: ٤ / ٢٠٧٤)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان کی ایک دنیوی حاجت پوری کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کے اخروی حوائج پورے فرمائیں گے۔ (مسلم، ترمذی)

وقوله عليه السلام: من اخذ اموال الناس يريد اداء ها ادى الله عنه اي يسر عليه سدادا دينه، ومن اخذها يريد اتلافها اتلفه الله.

(اخرجه البخاری)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی سے قرض لیا ادائیگی کے ارادہ سے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے قرض کی ادائیگی کو آسان بنا دیتا ہے اور جس نے قرض لیا دبا لینے کی نیت سے، اللہ

تعالیٰ اس کو تلف فرماتا ہے یعنی اس کے لیے آئندہ آسانی کا معاملہ نہیں فرماتے بلکہ اس کو مزید تنگی میں مبتلا فرمادیتے ہیں۔ (بخاری)

قرض کی ادائیگی میں جلدی کرنے کا حکم:

اگر کسی کے ذمہ دوسرے کا قرض ہو تو قرض کو جلد ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کما روي أن رجلا سال رسول الله صلى الله عليه و سلم أخ له مات و عليه دين، فقال له صلى الله عليه و سلم: هو محبوس بدينه فاقض عنه. (اخرجه احمد فى المسند)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ میرے ایک بھائی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے ذمہ دوسرے کا قرض ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ اپنے قرض کی وجہ سے قید میں ہے، لہٰذا اس کی طرف سے قرض ادا کردو۔ (مسند احمد)

بھائی کی طرف سے قرض ادا کرنے کا حکم:

اس حدیث میں جو حکم دیا گیا ہے اگر مرنے والے نے مال چھوڑا ہو تو ورثاء کے ذمہ قرض کا ادا کرنا لازم ہے اور اگر مال نہ چھوڑا ہو تو یہ حکم استحبابی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا مقروض کا جنازہ پڑھانے سے انکار فرمانا:

عن أبي سلمة قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يصلي على رجل مات وعليه دين، فاتي بميت فقال: أعليه دين؟ قالوا نعم ديناران، فقال صلوا على صاحبكم فقال ابو قتادة الانصاري: هما عليّ يا رسول الله، فصلى عليه رسول الله صلى الله عليه وسلم. (اخرجه البخارى و مسلم والترمذى)

حضرت ابوسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مقروض اگر قرض کی ادائیگی کے لیے مال چھوڑے بغیر مرجاتا تو رسول اللہ ﷺ اس کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ایک میت کو لایا گیا تو آپ ﷺ نے پوچھا کیا اس کے ذمہ قرض ہے؟ صحابہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! دو دینار (دو اشرفی) ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ساتھی پر خود ہی جنازہ پڑھ لو، اتنے میں ابوقتادہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) اس قرض کی ادائیگی کو میں

اپنے ذمہ لیتا ہوں، پھر آپ نے جنازہ پڑھایا۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

شہید اور قرض:

عن حارث بن ربعی أن رجلا قال یا رسول اللّٰہ ! اریت إن قتلت فی سبیل اللّٰہ، نکفر عنی خطا یای؟ فقال لہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نعم إذا قتلت فی سبیل اللّٰہ، وانت صابر محتسب، أي تطلب الاجر من اللّٰہ، مقبل غیر مدبر، الا الدین، فإن جبرائیل قال لی ذالك.

(اخرجہ مسلم، رقم: ۱۸۸۵)

حضرت حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیا جاؤں تو کیا یہ شہادت میری خطاؤں کا کفارہ ہو جائیگی؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، جب تو ثابت قدم رہے اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید کے ساتھ لڑے اور لڑائی میں دشمن کو پیٹھ دکھانے کی بجائے سینہ سپر ہو، سوائے اس کے تیرے ذمہ کسی کا قرض ہو، تو قرض کے گناہ کو شہادت بھی نہیں مٹا سکتی، یہ بات جبرائیل علیہ السلام نے مجھے بتائی ہے۔ (مسلم)

مقروض کو مہلت دینے کی فضیلت:

تو جس طرح مقروض کے لیے حکم ہے کہ قرض کی ادائیگی میں جلدی کرے، وسعت ہوتے ہوئے تاخیر نہ کرے، ایسے ہی دائن (قرض دینے والے) کو بھی شریعت نے حکم دیا ہے کہ مقروض کو مہلت دے قرض کے مطالبہ میں نرمی سے کام لے۔

قولہ تعالیٰ: ﴿ وإن کان ذو عسرۃ فنظرۃ الی میسرۃ وأن تصدقوا خیر لکم إن کنتم تعلمون ﴾ (بقرۃ: آیت ۲۸۰)

اگر (مقروض) تنگدست ہے تو مہلت دینی چاہیے وسعت پیدا ہونے تک اور معاف کر دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم کو سمجھ ہو۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من انظر معسرا أو وضع عنہ اظلہ اللّٰہ فی ظلہ. (أخرجہ مسلم: ۳۰۰۶)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی تنگدست محتاج کو (دین کی ادائیگی میں) مہلت

دے گا اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز عرش کے سایہ میں جگہ دے گا۔ (مسلم)

قرض کے لیے مثلی ہونا شرط ہے:

قرض کے جواز کے لیے مثلی ہونا شرط ہے، جن چیزوں کے مثل نہ ہوان کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز نہیں، کیونکہ قرض میں جو چیز لی گئی ہے اس کی مثل واپس کرنا شرعاً لازم ہے۔

قال علامة الصابوني: ونص الفقهاء على أن قرض المكيل والموزون جائز، كاستقراض الحب والشعير، والتمر والزبيب وكاستقراض السمن والزيت، وكل ما يكال ويوزن، واما ما لا مثل له فلا يجوز اقراضه كاللآلي، والجوهرات، وهذا مذهب ابي حنيفة، واجاز الشافعية والحنابلة اقراض مالا مثل له اذا كان معروف القيمة، فيجب رد القيمة. (فقه المعاملات)

حاصل یہ ہے کہ مکیلی اور موزونی چیز کی مثل موجود ہوتے ہوئے ان کو قرض دینا جائز ہے اور جو چیزیں غیر مثلی ہیں، جن کو "ذوات القیم" کہا جاتا ہے ان کو قرض کے طور پر دینا جائز نہیں، البتہ دراہم ودنانیر اور دیگر کرنسی کو قرض کے طور پر دینا بھی جائز ہے کیونکہ ہر ملک کی کرنسی اس ملک کے اندر ذوات الامثال ہے۔

قرض دے کر نفع حاصل کرنا حرام ہے:

قرض خالص لوجہ اللہ ہونا ضروری ہے، یعنی ثواب کی نیت ہو کوئی دنیوی نفع مقصود نہ ہو، کیونکہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

"كل قرض جر نفعا فهو ربا."

ہر وہ قرض جس کے ذریعے نفع کمایا جائے وہ نفع سود کے حکم میں ہے۔

مثلاً: کسی درزی کو ہزار روپے قرض دیا اور شرط رکھی کہ ہزار روپے واپسی کے علاوہ ایک جوڑا کپڑا مفت سی کر دینا ہوگا یا کسی بڑھئی کو دیا اور شرط رکھی کہ ایک الماری مفت بنا کر دینا ہوگی تو اگر وہ قرض کی واپسی کے ساتھ جوڑا بھی تو جوڑا سود ہے اس کا استعمال حرام ہے۔

قرض کی واپسی میں مقدار سے زائد واپس کرنا:

قرض سے جو نفع اٹھانا حرام ہے یہ اس صورت میں ہے کہ قرض دینے والا شرط لگائے یا عادۃً

وہاں معروف ہو کہ قرض لینے والا زائد واپس کرتا ہے، اگر قرض کی واپسی میں زیادتی مشروط نہ ہو بلکہ مقروض حُسنِ قضا کے طور پر زائد واپس کرتا ہے تو یہ شرعاً سود نہیں بلکہ ایسا کرنا بہتر ہے۔

لحدیث جابر بن عبد اللّٰہ قال : کان لی علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم حق، فاعطانی وزادنی .

(اخرجه الشیخان والإمام احمد)

قرض کے بعد سکے بدل گئے:

اگر سکے یا نوٹ قرض لینے کے بعد بازار میں اس کا رواج بند ہو گیا (یعنی حکومت نے اس پر پابندی عائد کر دی) یا اس کی قیمت کم ہو گئی تو امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس دن قرض لیا تھا اس دن بازار میں اس کی جو قیمت تھی وہ ادا کی جائے گی۔ امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری دن جس دن بند ہوا ہے اس دن کی قیمت معتبر ہوگی اسی پر فتویٰ ہے۔ (عطر ہدایہ بحوالہ شامیہ)

میت پر قرض کا حکم:

اگر کسی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ذمہ جو قرض ہے وہ ترکہ سے زیادہ ہے تو ایسی صورت میں جو مالِ ترکہ موجود ہے اس کو قرضخواہوں میں بقدرِ حصہ تقسیم کیا جائے گا جس کا جتنا فیصد قرض ہے ترکہ میں سے اسی قدر دے دیا جائے گا اگر مرحوم کے ترکہ میں کچھ بھی مال نہ ہو تو قرض خواہوں کو کچھ نہیں ملے گا، کل دین یا مابقیہ دین آخرت کے حساب میں ہوگا، دنیا میں ورثاء سے اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا ہے، ہاں البتہ ورثاء اپنی طرف سے خوشی سے کل دین یا کچھ حصہ ادا کر دیں تو یہ ان کا احسان ہوگا اور اگر ترکہ زیادہ ہے اور قرضہ کم ہے تو کفن دفن کے بعد، ترکہ میں سے پہلے قرض ادا کیا جائے گا اس کے بعد وصیت نافذ کی جائے گی، اس کے بعد جو مال بچے گا اس کو شریعت کے مطابق ورثہ میں تقسیم کیا جائے گا۔

مالِ حرام سے قرض ادا کرنے کا حکم:

اگر مثلاً: زید کے ذمہ قرض ہو اور اس کے پاس مالِ حرام کے سواء اور مال نہ ہو تو اس کے لیے مالِ حرام سے قرض ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

الربوٰ، والرشوۃ، واجرۃ الزنا، واجرۃ الغناء کل ذلك حرام سحت لم یخرج من ملك صاحبه فلا یجوز تأدیة القرض به .

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ زید کے پاس جو حرام مال ہے، اس کا زید خود مالک نہیں ہے شرعاً اس پر لازم ہے کہ وہ اصل مالک یا اس کے ورثاء کو واپس کرے معلوم نہ ہونے کی صورت میں ان کی طرف سے صدقہ کرے۔ جب زید خود اس مال کا مالک نہیں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ اس حرام مال سے قرض ادا کرے، تاہم اگر زید نے اس مالِ خبیث کو قرض میں ادا کر دیا تو قرض سے بری الذمہ ہو جائے گا، البتہ غیر کے مال استعمال کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا، زید کے ذمہ لازم رہے گا اس مال کے ضمان اور بدل کے طور پر دوسرا مال مالک کو واپس کرے یا صدقہ کرے، باقی مقرض (دائن) کو اگر معلوم ہو جائے کہ زید حرام مال سے قرض ادا کر رہا ہے تو اس کے لیے قبول کرنے اور اس کو استعمال کر کے فائدہ حاصل کرنے کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں تفصیلی فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

حرام مال سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا:

اگر دائن (قرض خواہ) کو مسلمان مدیون (مقروض) کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کا جو مال ہے وہ ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہے، مثلاً: سود، قمار، جوا، شراب، خنزیر وغیرہ کی خرید وفروخت کی آمدنی، ناچ گانے، فسق وفجور، بدکاری اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل کیا گیا مال ہے تو ایسی صورت میں دائن کے لیے مدیون کے اس مال حرام سے اپنا دین (قرض) وصول کرنا اور اس کو اپنے استعمال میں لانا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ یا ایسی صورت میں دائن اپنا دین (قرض) مدیون کے ذمہ چھوڑ دے اور اس کے حرام مال سے دین وصول ہی نہ کرے اور ایسی صورت میں حلال مال سے دین (قرض) ادا نہ کرنے کی وجہ سے مدیون گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

علماء کا اختلاف:

دائن کے لیے مدیون کے حرام مال سے اپنا قرض وصول کرنے کے جواز اور عدم جواز میں علماء کے درمیان اختلاف ہے اور اس اختلاف کا بنیادی منشاء یہ ہے کہ ملک خبیث یعنی غیر مشروع طریقہ اور ناجائز ذرائع سے جو مال حاصل کیا گیا ہے اس مال کی عین میں حرمت ہے یا حرمت حرام مال حاصل کرنے والے کے ذمے میں ہے؟

اگر حرمت عین مال میں نہیں ہے تو اس حرام مال کے اصل مالک کا حق اس کی عین سے متعلق نہیں ہوگا بلکہ اس طرح حرام مال کے کاسب وحاصل کے ذمہ سے متعلق ہوگا، ایسی صورت میں

کاسب کی ملکیت اس مال حرام میں ثابت ہوگی، لہٰذا قضاءاس مال حرام سے قرض وصول کرنا جائز ہوگا، البتہ دیانۃً جائز نہ ہوگا۔

مذاہبِ علماء:

مذکورہ بالا اختلاف کی وجہ سے اس مسئلہ میں علماء کے اقوال بھی مختلف ہیں، چنانچہ اس مسئلہ میں حضرات فقہاء کے چار اقوال مشہور ہیں:

1- حضرت امام محمد شیبانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدیون کے مال حرام سے دین وصول کرنا جائز ہے اور اس سے فائد حاصل کرنا بھی درست ہے اور یہ حکم قضاء ہے البتہ دیانۃً ایسا کرنا جائز نہیں۔

2- حضرت ابن قاسم مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مدیون کے پاس حلال اور حرام دونوں طرح کا مال مخلوط ہو اور حلال مال غالب ہو، تو اس مال سے قرض وصول کرنا اور اس سے نفع اٹھانا جائز ہے۔

3- ابن وہب مالکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدیون کے مال حرام سے قرض وصول کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

البتہ علامہ ابن رشد مالکی رحمہ اللہ نے ابن قاسم اور ابن وہب کے دونوں اقوال کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ابن قاسم کا قول قیاس کے مطابق ہے اور ابن وہب کا قول استحسان پر مبنی ہے، اس بناء پر ترجیح یہ ہے کہ اگر اس کے مال میں حلال غالب ہے تو اس سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز ہے اور اگر حرام غالب ہے تو اس سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز نہیں۔

4- امام ابن تیمیہ اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں یہ فرق کرنا ضروری ہے کہ اگر دائن کو معلوم ہے کہ مدیون قرض کی ادائیگی میں جو مال دائن کو دے رہا ہے وہ مال حرام ہے تو ایسی صورت میں مدیون کے حرام مال سے دین وصول کرنا دائن کے لیے جائز نہیں اور اگر دائن کو یہ معلوم نہیں کہ مدیون قرض کی ادائیگی میں دائن کو جو مال دے رہا ہے وہ مال حرام ہے یا حلال؟ تو ایسی صورت میں مدیون کے مال سے قرض وصول کرنا جائز ہے اور مال کے حلال اور حرام ہونے کے متعلق مدیون سے استفسار کرنا دائن پر لازم نہیں، کیونکہ اصل حکم یہ ہے کہ جو چیز

مسلمان کے پاس ہوتی ہے وہ اس کی ملک ہوتی ہے، لہٰذا اس کی حقیقت معلوم کرنا ضروری نہیں۔

راجح اور مفتی بہ قول:

ان چاروں اقوال میں سے راجح قول یہ ہے کہ اس بات میں فرق کرنا ضروری ہے کہ اگر دائن کو یہ معلوم ہو کہ مدیون کے پاس جو مال حرام ہے وہ اصل مالک کی رضا اور شریعت کی اجازت کے بغیر ہی حاصل کیا گیا ہے، مثلاً: چوری، ڈکیتی، غصب، رہزنی وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہے تو ایسی صورت میں دائن کے لیے اس مال حرام سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا جائز نہیں۔

اور اگر دائن کو یہ معلوم ہے کہ مدیون کے پاس جو مال حرام ہے وہ اصل مالک کی رضا سے تو حاصل کیا گیا ہے لیکن شریعت کی اجازت کے بغیر یعنی غیر مشروع طریقہ حاصل کیا گیا ہے، جیسے سود، قمار، جوا، بدکاری، ناچ گانے وغیرہ سے حاصل کیا گیا ہے اور اس مال حرام سے قرض وصول کرنا اور نفع اٹھانا قضاء جائز ہے، البتہ دیانۃً اگر اس سے اجتناب کرے تو تقویٰ کے لحاظ سے زیادہ بہتر ہے، یہی رائے مترشح ہوتی ہے حضرات امام محمد بن الحسن شیبانی، حضرت امام ابن قاسم، حضرت امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے اقوال سے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مالِ حرام: ص: ۳۶۴، مولفہ مفتی کمال الدین راشدی)

روٹی عدداً قرض لینا:

کھانے پینے کی جن چیزوں میں عادۃً تسامح سے کام لیا جاتا ہے ان میں قرض دینے اور لینے سے مقصد نفع کمانا نہیں ہوتا بلکہ محض وقتی ضرورت پوری کرنا مقصد ہوتا ہے، اس میں معمولی کمی و زیادتی سود میں داخل نہیں، لہٰذا روٹی کو عدداً قرض لینا جائز ہے۔

وذلك لما روي عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها انها قالت قلت يا رسول الله ! إن الجيران يستقرضون الخبزُ والعجين، ويردون زياده ونقصانا، فقال لا بأس، إن ذالك من مرافق الناس، لا يراد به الفضل .

وعن معاذ بن جبل أنه سئل عن استقراض الخبز فقال سبحان الله، انما هذا من مكارم الأخلاق، فخذ الكبير واعط الصغير، وخذ الصغير واعط الكبير خيركم احسنكم قضاءً سمعت رسول الله صلى

اللّٰہ علیہ و سلم یقول ذلک .

(اخرجھا ابو بکر الوراق فی کتابہ الشافعی کما فی المغنی لابن قدامہ : ٦/ ٤٣٥)

نیز معمولی درجہ کی نمک، مرچ، ہلدی وغیرہ قرض لینے کا دستور ہے ان میں بھی سود کا تحقق نہیں ہوتا لہٰذا واپسی میں معمولی کی زیادتی کو سود نہیں کہا جائے گا۔

سونے کے زیور قرض دے کر ان کی قیمت واپس لینا:

سوال: کسی نے دوسرے شخص سے کچھ تولہ سونا بصورتِ زیور قرض لیا، اب مقروض اپنا قرض ادا کرنا چاہتا ہے، مقرض (قرض دینے والا) اس سے کہتا ہے کہ آپ بجائے زیوارت کے ان کی قیمت دے دیں تو مناسب ہو، کیا مقروض زیورات کی قیمت دے سکتا ہے؟ اگر دے سکتا ہے تو کس وقت کی قیمت معتبر ہوگی؟ واضح رہے کہ بعض علماء نے اس معاملہ کو سود میں شامل کر کے ناجائز قرار دیا ہے۔ نیز یہ بھی فرمائیں کہ ربوا نسیئۃ اور قرض کے درمیان کچھ فرق ہے یا نہیں؟
بینوا توجروا

جواب: زیور کی بجائے اس کی قیمت لینے میں شبہ ربوا کی کوئی وجہ نہیں۔

قال العلائی رحمہ اللّٰہ تعالیٰ : (و) صح (بیع من علیہ عشرۃ دراھم) دین (ممن ھی لہ) ای من دائنہ فصح بیعہ منہ (دینارابھا) اتفاقا و تقع المقاصۃ بنفس العقد إذلا ربوا فی دین سقط .

وقال ابن عابدین رحمہ اللّٰہ تعالیٰ : (قولہ و تقع المقاصیۃ بنفس العقد) ای بلا توقف علی ارادتھما لھا بخلاف المسألۃ الآتیۃ و وجہ الجواز انہ جعل ثمنہ دراھم لا یجب قبضھا و لا تعیینھا بالقبض وذلک جائز اجماعا لان التعیین للاحتراز عن الربوا ای ربوا النسیئۃ و لا ربوا فی دین سقط انما الربوا فی دین یقع الخطر فی عاقبتہ ولذا لو تصارفا دراھم دینا بدنانیر دینا صح لفوات الخطر .

(ردالمحتار : ٤/ ٢٦٦)

البتہ اگر زیور کے قرض کے بدلے زیور ہی لیے جاتے تو مبادلۃ الجنس بالجنس ہونے کی وجہ سے ربوا ہونے کا مغالطہ ہوسکتا تھا، مگر درحقیقت اس صورت میں بھی ربوا نہیں، بلکہ یہ قرض ہے۔

ربوا نسیئۃ جب ہوتا ہے کہ مبادلۃ الجنس بغیر الجنس ہو یا مبادلۃ الجنس بالجنس ہو اور اس میں لفظ بیع یا مبادلہ یا معاوضہ استعمال کیا گیا ہو، اگر جنس دے کر وہی جنس واپس لینے کا معاملہ کیا ہو مگر بیع یا مبادلہ یا معاوضہ کے الفاظ نہیں کہے تو یہ قرض ہے خواہ قرض کا لفظ کہے یا نہ کہے اور یہ بلا شبہہ جائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ: ۱۷٤/۷)

قرض وصول کرنے کی تدبیر:

سوال: ایک عزیزہ مُصر ہیں کہ ان کو حسبِ ذیل معاملہ کے جواز کے متعلق مطمئن کیا جائے، ان سے ان کے والدِ حقیقی نے بطورِ ادھار مبلغ ایک سو روپے لیے تھے مگر اب مدتِ دراز سے وہ ادا نہیں کر رہے حالانکہ وہ اس رقم کو ادا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور نہ آئندہ وصول ہونے کی توی امید ہے۔ ان کے والد گھی کا کاروبار کرتے ہیں اور یہ گھی اسی سائلہ بیٹی کے گھر رکھتے ہیں، ایسی صورت میں کیا یہ جائز ہوگا کہ یہ بیٹی اپنے والد کے گھر میں سے وقتاً فوقتاً ان کی اجازت کے بغیر کسی قدر گھی نکال کر فروخت کر کے اپنی رقم وصول کر لے اور جب اس طرح وصول ہو جائے تو اپنے والد کو آگاہ کر دے، اگر چہ آگاہ کرنے میں ناراضگی کا اندیشہ بھی ہے لیکن آخر یہ بیٹی جو کہ بیوہ ہے، صاحبِ اولاد اور ضرورت مند ہے کیا کرے؟ اور باپ محتاج نہیں، آیا رقم وصول کرنے کی یہ تدبیر شرعاً جائز ہے۔ بینوا توجروا

جواب: یہ طریقہ جائز ہے مگر اس کا پورا اہتمام رہے کہ اپنے حق سے زیادہ ہرگز نہ لے، وصول ہونے کے بعد والد کو اس کی اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں، خصوصاً جب کہ ناراضگی کا اندیشہ ہو۔

قال فی العلائیة: لیس لذی الحق ان یأخذ غیر جنس حقه وجوزه الشافعی رحمه الله تعالیٰ وهو الاوسع.

وقال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ: (قوله وجوزه الشافعی) قدمنا فی کتاب الحجر ان عدم الجواز کان فی زمانهم اما الیوم فالفتوی علی الجواز.

(ردالمحتار: ۳۰۰/۵، احسن الفتاویٰ: ۱۱٤/۷)

بیع سلم کی تعریف اور احکام

بیع سلم کی تعریف اور مشروعیت:

السلم : بيع شيء إلى اجل معين مع قبض الثمن فوراً عند العقد ويسمى : بيع السلف . ايضا

یعنی بیع سلم ایسی بیع ہے جس میں ثمن (یعنی قیمت) پر تو مجلس عقد میں قبضہ ہوتا ہے اور مبیع (مال) پر ایک مدت (کم از کم ایک ماہ) کے بعد قبضہ ہوتا ہے۔

قال القدروي : السلم في لغة العرب هو : عقد يتضمن تعجيل احد البدلين، وهو الثمن، وتأجيل الاخر وهو المبيع، وهو عقد شرع على خلاف القياس، لكونه بيع المعدوم، الا انا تركنا القياس، بالكتاب والسنة والاجماع . (الاختيار لتعليل المختار : ٢/٣٤)

قال العلامة الصابوني :

دليل جواز السلم : أما دليل جوازه فهو الكتاب، والسنة، والإجماع . أما الكتاب فقول الله عزوجل ﴿ يايها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين الى اجل مسمى فاكتبوه ...... ﴾ والدين عام يشمل دين السلم، وغيره من ديون المبايعات . قال ابن عباس : أشهد أن السلف المضمون إلى أجل، قد أحله الله في كتابه، وأذن فيه، وأنزل فيه أطول آية في كتابه، ثم تلا هذه الآية . رواه الطبراني والحاكم والبيهقي .

أما السنة : ١ ـ فهو ما رواه البخاري ومسلم عن ابن عباس أنه قال : "قدم النبي صلى الله عليه وسلم المدينة وهم يسلفون بالتمر السنتين والثلاث، فقال : من أسلف في شيء، فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم، إلى أجل معلوم ."

(أخرجه البخاري في كتاب السلم رقم : ٢٢٤٠ ومسلم رقم

١٦٠ في المساقات والترمذي رقم: ١٣١١)

٢ـ وأخرج البخاري عن عبد الله المجالد قال: "أختلف عبد الله بن شداد، وأبو بردة في السلف، فبعثوني إلى ابن أبي أوفى رضى الله عنه فسألته، فقال: إنا كنا نسلف عى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكر و عمر، في الحنطة، والشعير، والزبيب، والتمر، وسألت ابن أبزىٰ فقال مثل ذلك."

(أخرجه البخاري رقم: ٢٢٤٢ ابو داود رقم: ٣٤٦٤)

٣ـ وبما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه "نهى عن بيع ما ليس عند الإنسان، ورخص في السلم." (الاختيار لتعليل المختار: ٣٤/٢)ففي هذه الأحاديث الشريفة، دلالة واضحة على جواز بيع السلم، وأن النبي صلى الله عليه وسلم إنما جوزه للحاجة إليه، واضطرار الناس إلى التعامل به، مع السبب الموجب للمنع، وهو عدم وجوده في ملكه، وعدم قدرة تسليمه في الحال، ولهذا قال الفقهاء: إنه ثبت على خلاف القياس.

وأما الإجماع: فقد أجمع أئمة علماء المسلمين على جوازه من غير خلاف.

قال ابن المنذر: أجمع كل من تحفظ عنه من أهل العلم، على أن السلم جائز، لأن بالناس حاجة إليه، لأن أرباب الزروع والثمار، والتجارات، يحتاجون إلى النفقة على الزروع ونحوها حتى تنضج، فجوز لهم السلم دفعا للحاجة. (فقه المعاملات)

بیع سلم کی شرائط:

بیع سلم کی صحت کے لیے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، وہ کل آٹھ شرائط ہیں:

1- ''جنس کا معلوم ہونا'' کہ کس چیز میں بیع ہو رہی ہے۔

2- ''نوع کا معلوم ہونا'' کہ کس قسم کی چیز ہوگی۔

3- "صفت کا معلوم ہونا" کہ چیز عمدہ اعلیٰ قسم کی ہے یا ادنیٰ قسم کی۔

4- "اجل (مدت) کا معلوم ہونا" کہ مال کتنے عرصہ کے بعد مشتری کا حوالہ کیا جائے گا۔

5- "مجلس عقد میں ثمن (قیمت) پر قبضہ کرنا" کہ مشتری اسی مجلس میں طے شدہ قیمت بائع کا حوالہ کردے۔

6- "مؤجلاً ہونا" یعنی سلم میں ضروری ہے کہ مبیع مال ایک مدت کے بعد حوالہ کیا جائے، اگر مبیع ادھار نہ ہو تو یہ معاملہ عقد سلم نہ ہوگا اور مدت کم از کم ایک ماہ کی ہونی چاہیے۔

7- "مال کا وقت عقد سے لے کر مدت پوری ہونے تک بازار میں موجود ہونا۔"

8- "رأس المال معلوم ہو۔"

والقاعدة فيه أن كل ما امكن ضبط صفته، معرفة نوعه، مقداره، في المكيلات، والموزونات، والمزروعات والمعدودات، جاز السلم فيه وما لا يمكن ضبط صفته ومعرفته نوعه وقدره. لا يجوز السلم فيه. (فقه المعاملات)

یعنی بیع سلم کے جواز کا قاعدہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کی صفت کو ضبط کرنا، نوع اور مقدار کو پہنچانا ممکن ہو مکیلی، موزونی اور عددی چیزوں میں سے اس میں سلم جائز ہے جس میں ممکن نہ ہو اس میں سلم بھی جائز نہیں۔

جانوروں میں بیع سلم کا حکم:

حیوانات میں بیع سلم کا مسئلہ فقہاء کے ہاں مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک چونکہ بیع سلم کے لیے مبیع کا کیلی، وزنی یا عددی متقارب کا ہونا ضروری ہے، جبکہ جانوران میں سے کسی میں داخل نہیں اور حیوانات ایک دوسرے سے، چھوٹے بڑے یا دبلے، موٹے ہونے میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں، اس لیے حنفیہ کے نزدیک حیوانات میں بیع سلم جائز نہیں، البتہ ائمہ ثلاثہ اس کو حیوانات کے قرض پر قیاس کر کے جائز قرار دیتے ہیں۔

گوشت میں بیع سلم کا حکم:

گوشت میں بیع سلم کے متعلق علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ اگر گوشت صفات ذکر کے متعین

کرلیا جائے تو ائمہ ثلاثہ کے نزدیک گوشت میں بھی بیع سلم جائز ہے۔

قال العلامة الصابوني:

مذهب أبي حنيفة، أنه لا يجوز السلم في الحيوان ولحمه، لأنه يتفاوت تفاوتا فاحشاً بكبر العظم وصغره، وبالسمن والهزال.

وقال الشافعية والحنابلة والمالكية: يجوز السلم في الحيوان، قياساً على جواز القرض فيه، وذلك لما رواه مسلم عن أبي رافع " أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استسلف من رجل بكرا۔ اي استقرض جملا فتيا۔ فقدمت عليه إبل من إبل الصدقة، فأمر أبا رافع أن يقضي الرجل بكره فرجع إليه أبو رافع فقال: لا أجد فيها إلا خيارا رباعيا۔ أي ابن ست سنين أفضل من البكر۔ فقال: أعطه إياه، إن خيار الناس أحسنهم قضاء " وأما السلم في اللحم مع العظم، فالجمهور على جوازه بشرط ضبط صفاته، بذكر جنس اللحم، كلحم الشاة أو لحم البقر، ولحمه كذكر أو أنثى، معلوف أو سائم، وسنه كشاة ثني أو جذعه، وصفته كسمين، أو مهزول، أو سط، وإلى هذا ذهب الصاحبان من تلامذة أبي حنيفة، لأنه إذا ضبط الوصف، والنوع، والوزن، جاز السلم فيه لانتفاء الجهالة، ودليلهم قول النبي صلى الله عليه وسلم: " من أسلف فليسلف في كيل معلوم، ووزن معلوم إلى أجل معلوم ." (اخرجه البخاري و مسلم)

قالوا: وظاهر الحديث إباحة السلم في كل موزون، وباعتبار الوزن ينتفي الغرر والجهالة، وإذا جاز السلم في الحيوان، فاللحم أولى بالجواز.

(انظر مفنى المحتاج: ٢/١١١ والمهذب: ١/٢٩٨، المغنى: ٣/٢٨)

کپڑے میں بیع سلم کا حکم:

1- اگر کوئی تاجر کسی فیکٹری کے مالک سے اس طرح معاملہ طے کرے کہ مثلاً آئندہ

سال گرمی کے موسم میں مجھے اتنے تھان کپڑا درکار ہے اور جملہ شرائط طے کر کے قیمت فیکٹری کے مالک کے حوالے کر دے تو شرعاً یہ عقد جائز ہوگا یا نہیں؟

-2 یا آرڈر کرے کہ مجھے ہزار جوڑے کپڑے سلے ہوئے چاہئیں دو مہینے کے بعد اور رقم ابھی ادا کر دے اس کا کیا حکم ہے؟

تو شرعاً یہ دونوں صورتیں کپڑے میں بیع سلم کی ہیں، لہٰذا اگر سودا طے کرتے وقت، کپڑے جملہ اوصاف (یعنی کونسا کپڑا ہوگا، سوتی ہوگا یا ریشم؟ کس ڈیزائن میں ہوگا) تمام باتیں واضح کر دی جائیں تو شرعاً یہ عقد جائز ہوگا۔

لما في مجلة الأحكام: الكرباس والجوخ وامثالها من المزوعات يلزم تعيين طولها وعرضها ورقتها ومن اي شئ تنسبح ومن نسج اي محل هي.

(شرح المجلة رستم باز: صـ ٢١٨ ماده صـ ٣٨٥ الفصل الثالث فى السلم)

الثياب من العدديات المتفاوتة، فلا يجوز فيها السلم قياسا على الدور، والعقارات، والجواهر، واللآلئ، التي لا يمكن ضبطها بالوصف، ولأن الثياب ليست من ذوات الأمثال، لتفاوت فاحش بين ثوب وثوب، ويجوز فيها السلم استحسانا عند الحنفية، إذا توضح فيها الجنس، والنوع، والصفة، والقدر من الثخانة والغلظ، والطول والعرض، فيلتحق بالمثليات، لحاجة الناس إليهما في تعاملهم، حيث يضطرون إلى شراء الثياب، سواء ما كان منها يخص الرجال أو النساء، من الثياب المخيطة.

وأجاز المالكية والشافعية والحنابلة السلم في الثياب، إذا عرف الوصف، والنوع، والقياس، حتى قال ابن المنذر: وأجمعوا على جواز السلم في الثياب. (انظر المغنى لابن قدامة: ٤/ ٢٧٦ فقه المعاملات)

مسلم فیہ دینے سے عجز کا حکم:

سوال: ایک شخص نے بیع سلم ایک روپیہ فی کاسہ کے حساب سے کی، اب وقت معین پر مبیع

کے ادا کرنے پر بوجہ افلاس کے قادر نہیں تو رب السلم اس سے دو روپے فی کاسہ ثمن وصول کرنا چاہتا ہے، کیا شرعاً اس کے لیے یہ فعل جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: مدت معینہ تک اگر مسلم الیہ مسلم فیہ ادا نہ کر سکا تو اس کے عوض کوئی دوسری چیز لینا یا ثمن سے زیادہ لینا جائز نہیں، لہٰذا مشتری کو چاہیے کہ یسر تک بائع کو مہلت دے یا اپنا ثمن واپس لے لے، بائع کی رضا سے بھی استبدال یا ثمن سے زائد لینا جائز نہیں۔

قال في الهندية : ولا يجوز الاستبدال بالمسلم فيه.

(عالمگیریة : ۳/۱۸٦)

وقال في شرح التنوير : ولو انقطع بعد الاستحقاق خير ربّ السلم بين انتظار وجوده والفسخ واخذ رأس ماله.

(ردالمحتار : ٤/۲۳۸)

وايضاً فيه : ولا يجوز التصرف للمسلم اليه في رأس المال ولا لرب السلم في المسلم فيه قبل قبضه نحو بيع وشركة ومرابحة وتولية ولو ممن عليه (إلى قوله) لقوله عليه الصلاة والسلام لا تأخذ الا سلمك او رأس مالك اي الا سلمك حال قيام العقد او رأس مالك حال انفساخه فامتنع الاستبدال.

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : وتقدم اوّل فصل التصرف في المبيع ان بيع المنقول من بائعه قبل قبضه لا يصح ولا ينتقض به البيع الاول بخلاف هبته منه لأنها مجاز عن الاقالة.

(ردالمحتار : ٤/۲۳۳) (احسن الفتاوىٰ : ٦/٤۸۱)

اجارہ (کرایہ داری) کے احکام

اجارہ کی تعریف:

هي عقد على منافع بين اثنين او جماعة، مقابل عوض مالي، كاستئجار دار للسكنى. ودابة أو سيارة للركوب، او عامل للخدمة.

یعنی اجارہ دو آدمیوں کے درمیان منافع کو مال کے عوض فروخت کرنے کا عقد ہے، جیسے مکان کو رہائش کے لیے، جانور کو مال برداری کے لئے اور گاڑی کو سواری کے لیے کرایہ پر لینا یا نوکر کو خدمت کے لیے رکھنا۔

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله : الاجارة عقد على المنافع بعوض .

ودليل جوازه : قوله تعالىٰ : ﴿ إن أريد أن انكحك احد ابنتي هتين على أن تاجرني ثمني حجج ﴾ (قصص : ٢٧)

وقوله تعالىٰ : ﴿ فإن أرضعن لكم فأتوهن أجورهن ﴾ (طلاق : ٦)

وقوله عليه السلام : اعطوا الاجير اجره قبل أن يجف عرقه . (اخرجه ابن ماجه)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دے دو۔

وفي صحيح البخاري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم استاجر رجلاً ليدله على الطريق، وهو ابن الاريقط . (اخرجه البخاري ومسلم)

وفي الحديث القدسي الذي رواه البخاري : ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة ومن كنت خصمه خصمت : رجل اعطى بي ثم غدر ورجل باع حراً فأكل ثمنه ورجل استاجرا جيراً فاستوفى منه ولم يعطه اجره . (اخرجه البخاري رقم : ٢٤٢٧ في البيوع)

حدیث قدسی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں تین آدمیوں کی طرف سے مخاصمت کرتا ہوں اور میں جس کا طرف دار بنتا ہوں اس کو غالب کرتا ہوں۔

1- جس نے میرے نام پر عہد کیا پھر بھی غداری کی۔

2- جس نے کسی آزاد آدمی کو فروخت کر کے قیمت استعمال کی۔

-3 جس نے کسی سے مزدوری کروا کر یا کام پورا لینے کے بعد اس کو مزدوری نہیں دی۔(بخاری)

اجارہ صحیح ہونے کے لیے درجِ ذیل شرائط کا لحاظ کرنا ضروری ہے:

-1 اہلیۃ العاقدین: کہ عاقدین عاقل، بالغ، سمجھدار ہوں۔

-2 طرفین کی رضامندی سے عقد کیا جائے۔

-3 منفعت کا متعین ہونا، یعنی کس قسم کے کام کے لیے کون سی چیز کرایہ پر لی گئی ہے، تا کہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو، مثلاً: اگر مکان کرایہ پر لیا تو پہلے مکان کو دیکھ لیا جائے یا درزی کو کپڑے دیا تو یہ طے کر لے کہ کتنی مدت میں سی کر دے گا وغیرہ۔

-4 اسی طرح معقود علیہ قابل انتفاع ہو، لہٰذا مغصوبہ زمین کرایہ پر دینا، اسی طرح بدکنے والا اونٹ کرایہ پر دینا یا جو مکان غاصب یا ظالم کے قبضہ میں ہو اس کو کرایہ پر دینا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ کرایہ دار کے لیے اس سے انتفاع ناممکن ہے۔

-5 اجرت کی مقدار متعین ہو۔

لقوله عليه السلام: من استاجر أجيرا فليعلمه اجره.

(مصنف عبد الرزاق)

-6 وہ کام اجیر کے ذمہ فرض نہ ہو لہٰذا نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کے لیے کسی کو اجرت پر لینا جائز نہ ہوگا اور اس پر اجرت وصول کرنا حرام ہوگا۔

اجیر کی اقسام:

اجیر کی دو قسمیں ہیں:

-1 اجیر خاص -2 اجیر مشترک

اجیر خاص:

جو مزدور، ملازم کل وقت یا بعض متعین وقت کسی ایک ہی مالک کے لیے کام کرتا ہے، مہینہ بھر یا سال بھر یا طویل مدت کے لیے چاہے یومیہ تنخواہ وصول کرے یا ماہانہ اس کو اجیر خاص کہتے ہیں۔

اجیر مشترک:

وہ مزدور جو مخصوص مالک کا کام نہیں کرتا بلکہ متعدد مالکوں کا کام کرتا ہے، اس کو اجیر مشترک

کہتے ہیں، جیسے رنگریز، درزی، دھوبی، حجام، خاکروب وغیرہ۔

اجیر خاص کے احکام:

-1 اجیر خاص جب خود کام کے لیے حاضر ہو (یعنی ڈیوٹی پر موجود ہو) چاہے مالک پورے وقت کام لے یا کچھ وقت وہ پوری اجرت کا مستحق ہے، ہاں اگر مفوضہ کام انجام نہیں دیا تو اجرت کا مستحق نہیں ہوگا۔ (شرح مجلہ)

-2 اپنے مالک سے کام کا جو وقت طے ہوا (یعنی جتنے گھنٹہ کام کا معاہدہ ہوا) اس وقت میں کسی دوسرے کا کام کرنا جائز نہیں (ہدایہ) اگرچہ اجرت بہت زیادہ ملتی ہو۔ (عالمگیری)

-3 اجیر خاص کے ہاتھ سے کوئی چیز بغیر تعدی کے ضائع ہو جائے تو اس پر ضمان لازم نہ ہوگا اور اگر خود تلف کردے تو ضمان لازم ہوگا۔

اجیر مشترک کے احکام:

-1 اجیر مشترک کا کوئی وقت کسی کام لینے والے کے لیے مختص نہیں کہ اس وقت میں کسی دوسرے کا کام ناجائز ہو یا آرام کرنا جائز نہ ہو، کیونکہ یہاں اجرت کام سے متعلق ہے، اگر کام پورا کرے گا تو اجرت کا مستحق ہوگا ورنہ نہیں، وقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں، البتہ کام پورا کرنے کے لیے کوئی وقت مقرر کیا ہو تو وعدہ کے طور پر اس کو مجبور کیا جا سکتا ہے۔

-2 اجیر مشترک کام پورا کیے بغیر اجرت کا مستحق نہیں۔

-3 صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نقصان کی صورت میں اجیر مشترک کو ضامن بنایا جائے گا۔

قال في الموسوعة الفقهية : والأجير الخاص هو أن يعمل الرجل لغيره عملا مدة معلومة، كشهر، أو سنة، كأن يرعى غنمه، أو يقود سيارته، ولا يجوز لهذا الأجير أن يعمل لغيره في هذه المدة .

ويستحق الأجرة إذا حضر عمله في مدة الإجارة وإن لم يعمل بعد، ما لم يطلب منه ذلك . ويستحق الموظف الأجرة، في أيام العطلة والإجازة، جريا على العادة (الموسوعة الفقهية لشيخ خليل كوناج : ١ /٨) وهو أمين لا يضمن . بهلاك الشيء في يده، من غير

تقصير منه، فإذا غرقت السفينة من ريح أو موج، وهلك ما فيها، لا يكون ضامنا، أما إذا هلك بمده وحذفه فيضمن، وكذلك أمر السيارة والشاحنة أيضا، فإنه لا يضمن السائق إذا تعطلت السيارة من نفسها، من غير تقصير منه، وسبب تلف المال، أما إذا كان له تقصير في ذلك، فيكون ضامنا. (فتاوى قاضيخان: ٢/ ٣٣٥)

والأجير المشترك: هو الذي يعمل لأكثر من واحد كالخياط، والنجار، والحداد، والصباغ، وأمثالهم، سمي مشتركا، لأن الناس يشتركون في نفعه ..... وليس لمن استأجره أن يمنعه من العمل لغيره، لأنه لم يستأجره لنفسه، ولا يستحق الأجرة إلا بالعمل، خلافا للأجير الخاص.

اجیر مشترک پر ضمان کا حکم:

ذهب المالكية وبعض فقهاء الشافعية، إلى أن يد الأجير المشترك (يد ضمان) بمعنى أنه إذا تلف الشيء في يده، فإنه يضمنه، ولو بغير تعد أو تقصير فيه، حفاظا على أموال الناس، ورعاية لمصالحهم، حتى يهتم بما عهد إليه، ويستشعر بالمسئولية، فلا يقصر ولا يفرط في عمله.

واستدلوا بما روي أن عليا رضي الله عنه، كان يضمن الصانع، والصباغ، وكان يقول: "لا يصلح أمر الناس إلا ذاك." (رواه البيهقي عن على رضى الله عنه)

وروي أن شريحا القاضي، كان يضمن القصار - أي الصباغ - فضمن قصارا احترق بيته فقال: أتضمنني وقد احترق بيتي؟

فقال له شريح: أرأيت لو احترق بيته، أكنت تترك له أجرك!؟

وذهب أبو حنيفة وأحمد: إلى أن يد الأجير المشترك يد أمانة، فلا يضمن إلا بالتعدي، أو بالإهمال والتقصير.

(انظر ردالمحتار : ٥/ ٤٠٥)

وهو الصحيح من أقوال الشافعي رضي الله عنه، والراجح من مذهب أحمد.

قال ابن حزم : لا ضمان على أجير مشترك أو غير مشترك، ولا على صانع أصلا، إلا ما ثبت أنه تعدى فيه أو أضاعه.

وقال في الاختيار : والأجراء نوعان : مشترك كالصباغ والقصار، ولا يستحق الأجرة حتى يعمل، والمال أمانة في يده، لأنه قبضه بإذن المالك فلا يضمنه، إلا أن يتلف بعمله، كتحريق الثوب من دقه، وانقطاع الحبل من شده، ونحو ذلك، إلا أنه لا يضمن الآدمي إذا غرق في السفينة، أو سقط من الدابة يسوقه وقوده، لأن الآدمي لا يضمن بالعقد، وإنما يضمن بالجناية !

ولو غرقت من موج أو ريح، أو اصطدام بجبل، فلا ضمان عليهم، لأنه لا فعل لهم بذلك. وأجير خاص، كالمستأجر شهراً للخدمة، ورعي الغنم ونحوه، ويستحق الأجرة بتسليم نفسه، وإن لم يعمل، ولا يضمن ما تلف في يده ولا بعمله إذا لم يتعمد الفساد.

(الاختيار لتعليل المختار للموصلی : ٢/ ٥٣)

وما ذهب إليه مالك من تضمين (الأجير المشترك) هو الأصح والأرجح، وهو مذهب الصاحبين أبي يوسف ومحمد فقد قالا : إنه يضمن سواء هلك بفعله، أو بغير فعله، إلا ما لا يمكن الاحتراز عنه، كالموت، والحرق، والغرق الغالب، والعدو المكابر، لأنه مأمور بحفظه، فإذا تركه ضمن، كما إذا هلك بفعله، وهو مروي عن عمر، وعلي رضي الله عنهما. (المرجع السابق : ٢/ ٥٤)

وإنما قلنا : إن هذا المذهب أصح وأرجح، لأنه إذا عرف الأجير المشترك، أنه ضامن لما أتلف، يهتم بعمله ولا يقصر فيه، ويبذل

قصاری جهده لإتقان عمله، حتى لا يغرم قيمة ما أتلفه، فتضمن حقوق الناس، وتؤمن مصالحهم، أما إذا كان الشيء خارجا عن طاقته وقدرته، كالحرق، والغرق، فلا يكلف الله نفسا إلا وسعها، والله اعلم . (فقه المعاملات للصابوني)

دورانِ ملازمت حقوق اللہ ساقط نہیں ہوں گے:

ملازم کے ذمہ جو حقوق اللہ ہیں وہ کسی عقد سے نہ ساقط ہو سکتے نہ متاخر، جیسے: نماز اور حج فرض کی ادائیگی کے لیے سفر، مسلمانوں کے علاقہ پر کفار کے طرف سے حملہ کی صورت میں مسلمان مجاہدین کی مدد یا کسی جلنے اور ڈوبنے والے کو بچانا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، بشرطیکہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اس کے سوا اور کوئی نہ ہو، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان حقوق کی ادائیگی سے مستاجر کو کوئی ایسا ضرر نہ پہنچے جو ان حقوق کے برابر یا ان سے زیادہ ہو مثلاً: جیسے زید سخت بیمار ہے صاحبِ فراش ہے کوئی اس کا مددگار یا خادم نہیں اب بکر جو اس کا ملازم ہے اس کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا یا اس کی عورتیں چھوٹے بچے یا اس کی ماں ان سب کی دیکھ بھال ملازم کے ذمہ ہے وہ ملازم اب کوئی ایسا کام نہیں کر سکتا جو ان کے یا مال کے ضائع ہونے کا سبب ہو۔ اللہ تعالیٰ مستغنی ہے بندہ محتاج ہے اللہ تعالیٰ اپنے حقوق معاف فرمانے والے ہیں بندے حقوق وصول کرنے والے ہیں، اب دونوں حقوق میں تقابل ہو جائے تو حقوق العباد کی ادائیگی مقدم ہو گی، البتہ ملازم کوشش کرے کہ فرائض کو اس طرح ادا کرے کہ بندہ (آقا کی) حق تلفی نہ ہو تو یہی مناسب اولیٰ ہے۔ (عطر ہدایہ)

ملازم کے لیے جماعت چھوڑنا جائز نہیں:

ملازم کے لیے پانچوں وقت کی نمازیں، مع سنتوں کے، اسی طرح جمعہ، عیدین اور ان کے مقدمات، جیسے غسل، استنجاء، وضو اور مسجد میں حاضری وغیرہ، سارے کام دورانِ ملازمت جائز ہیں، مالک کے لیے جائز نہیں کہ ملازم کو ان عبادات کی ادائیگی سے منع کرے۔

اگر ملازمت کے وقت ان سے روکنے کی شرط لگائے یا شرط لگائے بغیر روکے تو ملازم کے لیے حکم ماننا جائز نہیں، کیونکہ آقا کا ہر وہ حکم جو حکم الٰہی کے مقابل ہو اس کا ماننا شرعاً جائز نہیں۔

مسئلہ: البتہ دورانِ ملازمت آقا کی اجازت کے بغیر نوافل پڑھنا جائز نہیں۔

مسئلہ: اگر مسجد دور ہو تب بھی جماعت جمعہ چھوڑنا جائز نہیں۔

۔ اسی طرح آقا کے لیے روکنا جائز نہیں، البتہ اتنے وقت کی تنخواہ کاٹی جا سکتی ہے۔ (عطر ہدایہ)

سرکاری ملازم کا کمیشن لینا رشوت ہے:

سرکاری ملازم کو حکومت ان کے فرائض منصبی کی ادائیگی پر باقاعدہ تنخواہ دیتی ہے اور جب حکومت کی طرف سے ان کی تنخواہ مقرر ہے، تو ان کے ذمہ عوام کا جو کام ہے اس کے کرنے پر عوام سے کمیشن لینا ہرگز جائز نہیں۔ یہ رشوت اور خیانت ہے جو شرعاً ناجائز اور حرام ہے، بعض صاحب منصب یہ کہتے ہیں کہ ہم ذاتی محنت اور کوشش سے ان کا کام کرا کے دیتے ہیں، ان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کیونکہ یہ کام ان کے فرائض منصبی میں داخل ہیں، مثلاً: کسی شہری کو پاسپورٹ کی ضرورت ہے وہ افسر کے پاس جاتا ہے افسر کہتا ہے کہ بنا کر دوں گا مگر اتنی رقم لوں گا یہ رشوت ہے اس کا لینا حرام ہے کچھ بھی تاویل کرے جواز کی کوئی صورت نہیں۔

حرام لباس تیار کرنے کی اجرت:

سونے، چاندی کے ایسے زیور جو صرف مرد استعمال کرتے ہیں اسی طرح وہ ریشمی لباس جو صرف مرد استعمال کرتے ہیں ایسے زیورات یا لباس تیار کر کے دینا اور ان کی اجرت حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، البتہ جس لباس کا استعمال مردوں کے لیے ناجائز اور عورتوں کے لیے جائز ہو لیکن دونوں استعمال کرتے ہوں تو اس کو تیار کرنا اور فروخت کرنا دونوں کام امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہیں، کیونکہ مرد اگر اس کو استعمال کرے گا تو چونکہ وہ خود مختار ہے، لہٰذا گناہ اسی کی طرف منسوب ہوگا، جبکہ صاحبین رح کے نزدیک دونوں کام ناجائز ہیں۔ (ماخوذ از عطر ہدایہ)

ڈاڑھی مونڈھنے کی اجرت حرام ہے:

واضح ہو کہ اپنی ڈاڑھی مونڈھنا یا ایک مشت سے کم کرنا حرام ہے ایسے ہی دوسرے کی ڈاڑھی مونڈھنا مقدارِ مذکورہ سے کم کرنا بھی حرام ہے، ڈاڑھی مونڈھنے کی اجرت وصول کرنا بھی حرام ہے، لہٰذا باربری کا پیشہ اختیار کرنے والے اپنی روزی حرام نہ کریں۔

ومن آفات اليد حلق رأس المرأة ولحية الرجل وقص اقل من قبضة ولو باذن منه لانه اعانة على معصية فيكون معصية ايضا .

(شرح طریقۃ محمدیہ)

دونوں ہاتھوں کے آفات (گناہوں) میں سے عورت کے سر کے بال یا مرد کی ڈاڑھی کا مونڈھنا اور مٹھی سے کم کاٹرا شنا بھی ہے چاہے یہ مونڈھنا اور کترنا اس مرد یا عورت کی اجازت سے ہی کیوں نہ ہو کیونکہ گناہ کے کام میں مدد کرنا ہے گناہ کے کام میں مدد اور بھی گناہ ہے۔

نیز ''کشاف القناع'' میں ہے کہ ڈاڑھی منڈھوانے کے لیے کسی کو اجرت دینا یا اجرت کا لینا دونوں حرام ہیں۔ (کشاف ٤/٩، ماخوذ از داڑھی کی اسلامی حیثیت)

باغی حاکم کی فوجی نوکری کا حکم:

ایسے باغی حاکم کی فوجی نوکری کرنا ہمیشہ حرام ہے جو امام عادل سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے یا کفار کی مدد سے مسلمانوں کو دھمکی دیتا ہے کیونکہ امن کی حالت میں تو اس کی فوج اللہ والوں کو ڈارتی ہے اور ان کو ان کے مبارک خیالات وعقائد سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہے اور حالت جنگ میں تو علی الاعلان کلمۂ کفر اور علم بغاوت بلند کرتی ہے اور یہ لوگ اسلام اور اہل اللہ کی کھلم کھلا دشمنی پر اتر آتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) مگر ایسی نوکریاں بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نزدیک خدمات کی تاویل سے قابل اجرت ہیں اگر چہ گناہ سے خالی نہیں، صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ایسی نوکری گناہ بھی ہے اجرت بھی حلال نہیں، خاص اسی کام کی اجرت بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والو! ایسی نوکری سے دور رہو۔ (عطر ہدایہ)

ٹیکسی ڈرائیور کا میٹر سے زیادہ کرایہ لینا:

بعض ٹیکسی ڈرائیور میٹر سے زیادہ کرایہ وصول کرتے ہیں اس کا کیا حکم ہے؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ ڈرائیور پر حکومت کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی پابندی کرنا لازم ہے، اس کے خلاف کرنا گناہ ہے، مگر اس کے باوجود اگر میٹر سے زیادہ کرایہ پہلے سے طے کر لیا جائے تو یہ اجرت حلال ہے۔

البتہ میٹر کو تیز کر کے دھوکے سے زیادہ اجرت لینا جائز نہیں، اگر کسی نے ایسا کر لیا تو میٹر تیز کرنے کی وجہ سے جتنی اجرت زیادہ حاصل ہوئی ہے وہ حرام ہے، وہ رقم مالک کو واپس کر دینا فرض ہے اگر بعد میں خیال آیا کہ یہ زائد رقم حرام ہے اور اب مالک تک پہنچانا ممکن نہیں رہا تو مساکین پر صدقہ کرنا فرض ہے۔

گناہ کا کام کروانے کے لیے اجرت پر لینے کا حکم:

اس کے تین درجے ہیں:

1- مقود علیہ عین معصیت ہو، جیسے ناچ، گانا بجانا، زنا، چوری، جعل سازی، چغل خوری، تعزیہ بنانا، بت سازی، تصویر سازی، شراب کشی، شرک، کفر اور حرام کاموں کی ترویج اور بدعات وفسق وفجور، یہ اجارہ بالاتفاق ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی اجرت لازم نہیں اس سے احتراز کرنا واجب ہے۔ ان گناہ کے کاموں کی انجام دہی سے جو اجرت یا نفع حاصل ہوا وہ ملک خبیث ہے اگر مالک معلوم ہو تو اسی کو واپس کرنا یا بلا نیت ثواب صدقہ کر دینا واجب ہے۔

2- معقود علیہ کوئی اور مباح چیز ہو مگر اس کے ضمن میں گناہ اور فعل حرام کا ارتکاب پایا جائے، جیسے ایک شخص نے مطلق ملازمت اختیار کی لیکن آقا شراب فروخت کروائے یا ناقوس بجوائے، بت خانہ بنوائے، تعزیہ اٹھوائے یا مکان کرایہ پر، یا پھر اس میں زنا کاری ہو جوا بازی ہو یا رقص وغیرہ کی محفل منعقد ہو یا فوجی سپاہی کو دشمن سے لڑنے کے لیے بھیجا جائے اور اس میں خونِ ناحق بھی بہانا پڑے یا سپاہی سے ظلم کے قوانین نافذ کرانا ان سب صورتوں میں فعل حرام ہے ان امور کی انجام دہی سے گناہ لازم ہوگا لیکن آقا کے ذمہ تنخواہ واجب ہوگی۔

3- وہ اجارہ ایسے افعالِ ممنوعہ کی طرف منسوب ہو جیسے عقد ملازمت کے وقت ہی طے پایا کہ شراب فروخت کرنا ہوگی، یا تعزیہ اٹھوائیں گے، بت خانہ کی خدمت کرنا ہوگی یا عورت کو نوکر رکھا کہ خلوت میں پنکھے سے ہوا دیگی، پاؤں دبائے گی۔ اس میں امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک عقد کا اعتبار کرتے ہوئے اجرت ثابت ہوگی۔

صاحبین رحمہ اللہ کے نزدیک فعل کا اعتبار کرتے ہوئے یہ عقد حرام ہے اور اجرت بھی ساقط، مگر ایسے کاموں کو ترک کرنا بالاتفاق واجب ہے، خلاصہ یہ کہ امام صاحب رحمہ اللہ نفس عقد پر نظر فرماتے ہے وہ صحیح ہے یا نہیں اور اجرت کو عقد ہی سے معلق فرماتے ہیں اور صاحبین رح غرض اور انجام پر نظر فرماتے ہیں اگر وہ باطل ہو تو عقد کو باطل قرار دیتے ہیں۔ (عطر ہدایہ)

قال العلامة الصابوني: أن لا يكون العمل المستأجر له معصية، فلا يجوز الاستئجار على النوح على الميت، ولا على الملاهي، والرقص، والغناء الماجن، وسائر المنكرات، وما أخذ من الأجرة على

ذلك فحرام، يجب رده إلى صاحبه إن علم، وإلا فيجب إنفاقه للتخلص من إثمه، لأنه كسب خبيث، و " كل لحم نبت من السحت- أي الحرام- فالنار أولى به " كما ورد في الصحيح . كما لا يجوز للإنسان أن يؤجر نفسه لفندق تقام فيه الدعارة الزني- ولا في مطعم يقدم فيه الخمر، ولا لبنك- مصرف- يتعامل بالربا، لأن من أعان على معصية كان شريكاً في الإثم، كما وضحته الأحاديث النبوية الشريفة . وقد نص الفقهاء على أن من استأجر رجلا ليقتل آخر ظلما، أو رجلا ليحمل له الخمر، أو أجر داره أو دكانه لمن يبيع بها الخمر، ويلعب فيها القمار، أو أجرا أرضه لمن يجعلها كنيسة، فإن هذه الإجارة فاسدة، لأنه اشتملت على معصية الله، و كل من المؤجر والمستأجر آثم . (فقه المعاملات)

شریک کوملازم رکھنے کاحکم:

سوال: بیس آدمی مثلاً: اپنے مختلف المقدار سرمایہ سے ایک کمپنی بناتے ہیں اور کمپنی کے قواعدو ضوابط اور اختیارات بقدرِ سرمایہ نفع تقسیم کرنے اور کمپنی کو چلانے کے لیے ڈائریکٹر مقرر کرتے ہیں اور اُسے یہ اختیار دیتے ہیں کہ آپ کمپنی کو چلانے کے لیے ماہر عملہ کو تنخواہ پر مقرر کر سکتے ہیں خواہ شرکاء میں سے ہوں یا دوسرے باہر کے افراد ہوں۔

جواب طلب امر یہ ہے کہ آیا اس کمپنی کے شرکاء میں سے اگر کوئی کمپنی کے کام میں شریک ہو، تو اس کو نفع کے علاوہ اپنے عمل اور کام کی تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

بعض علماء نے اس معاملہ کے ناجائز ہونے کے لیے صفقہ فی صفقہ کو علت قرار دیا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: اس بارے میں فقہ حنفی میں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ سے کوئی روایت منقول نہیں، البتہ امام محمد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق شریک کو ملازم رکھنا جائز نہیں۔

اگر ملازم رکھا اور اس نے عمل کیا تو وہ اجرت کا حقدار نہیں ہوگا کیونکہ یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے اپنی ذات کے لیے کام کیا، لہٰذا اجرت کا مستحق نہیں۔

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ اجارۃ المشاع کی طرح شریک کو اجیر رکھنے کے جواز پر متفق ہیں، نیز کمپنی کے شرکاء کو اجیر رکھنے کا تعامل بھی عام ہوگیا ہے، اس لیے اس زمانہ میں شریک کو ملازم رکھنا جائز ہے، جیسا کہ اس کی تائید مضاربت سے بھی ہوتی ہے، کہ مضارب عمل مشترک سے نفع حاصل کرتا ہے۔

وقال الامام المرغيناني رحمه الله تعالىٰ: قال وإذا كان الطعام بين رجلين فاستأجر احدهما صاحبه او حمار صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجرله، وقال الشافعي له المسمى، لان المنفعة عين عنده وبيع العين شائعا جائز، فصار كما إذا استأجر دارالمشتركة بينه وبين غيره ليضع فيها الطعام او عبدا مشتركا ليخيط له الثياب، ولنا انه استأجره لعمل لا وجود له لان الحمل فعل حسي لا يتصور في الشائع. (الهداية مع البناية: ٩/٣٧٠)

وقال الحافظ العيني رحمه الله تعالىٰ: (قال) اي في الجامع الصغير (وإذا كان الطعام بين رجلين فاستأجر احدهما صاحبه او حمار صاحبه على ان يحمل نصيبه فحمل الطعام كله فلا اجرله) يعني لا المسمى ولا اجر المثل وعلى قياس قول ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ ينبغي ان يجب اجر المثل كما في اجارة المشاع لكن الفرق ان فساد العقد هناك للعجز عن استيفاء المعقود عليه على الوجه الذي اوجبه العقد لا لانعدام الاستيفاء اصلا وهنا البطلان لتعذر الاستيفاء اصلا وبدون الاستيفاء لا يجب الاجر في العقد الفاسد.

وقال الكرخي في مختصره قال ابن سماعة عن محمد رحمه الله تعالىٰ (إلى قوله) ثم قال الكرخي قال محمد رحمه الله تعالىٰ وكل شيء استأجره من صاحبه مما يكون حملا فانه لا يجوز وإن عمله فلا اجرله وكل شيء ليس يكون عملا استأجر احدهما من صاحبه فهو جائز.

(انه استأجره لعمل لا وجود له) قيل هذا ممنوع بل لعمله وجود (الى قوله) وفيه نظر لان معنى قوله لا وجود له يتميز وجوده.

(لان الحمل فعل حسي لا يتصور في الشائع) إذا لحمل يقع على معين والشائع ليس بمعين (الى قوله) فان قلنا إذا حمل الكل فقد حمل البعض لا محالة فيجب الاجر قلت حمل الكل حمل المعين ونصيبه ليس بمعين فيما وجد نصيبه. (البناية: ٩/ ٣٧٠، ٣٧١)

وقال العلامة معين الدين الهروي المعروف بملا مسكين: (وان استأجره لحمل طعام بينهما فلا اجرله له) اي إذا كان الطعام مشتركا بين رجلين فان استاجر إحدهما صاحبه او حمار صاحبه ليحمل نصيبه منه الى مكان كذا فحمل الطعام كله فلا اجر له لا المسمى ولا اجر المثل وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ له المسمى.

(شرح الكنز لملا مسكين مع الحاشية فتح المعين: ٣/ ٢٥٠)

وقال العلامة المفتي ابو السعود رحمه الله تعالىٰ: (قوله وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ له المسمى) وبه قال مالك واحمد رحمهما الله تعالىٰ عيني. (فتح المعين: ٣/ ٢٥٠)

وقال الحافظ العيني رحمه الله تعالىٰ: (وقال الشافعي رحمه الله تعالىٰ له المسمى لان المنفعة عين عنده وبيع العين شائعا جائز) وبه قال احمد رحمه الله تعالىٰ (فصار كما إذا استأجر دارا مشتركة بينه وبين غيره ليضع فيها الطعام او عبدا مشتركا ليخيط له الثياب). حيث يجب الاجر. (البناية: ٩/ ٣٧٠)

وقال الإمام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: ولو استأجره ليحمل له نصف هذا العطام بنصفه الآخر لا اجرله اصلا لصيرورته شريكا.

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: قال في التبين ومشايخ بلخ والنسفي يجيزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض

المنسوج لتعامل اهل بلادهم بذلك ومن لم يجوزه قاسه على قفيز الطحان والقياس يترك بالتعارف ولئن قلنا انه ليس بطريق القياس بل النص يتناوله دلالة فالنص يخص بالتعارف الا ترى ان الاستصناع ترك القياس فيه وخص من القواعد الشرعيه بالتعامل ومشايخنا رحمهم الله لم يجوزوا هذا التخصيص لان ذلك تعامل اهل بلدة واحدة وبه لا يخص الاثر بخلاف الاستصناع فإن التعامل به جرى في كل البلاد و بمثله يترك القياس ويخص الاثر اهـ.

(ردالمحتار: ٥/ ٤٠ ـ ٤١) (والتفصل في احسن الفتاوىٰ: ٧/ ٣٢١)

اجرت علی الطاعات کا حکم:

امامت، اذان، تدریس وغیرہ دیگر امور دینیہ کی انجام دہی پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں اس کے بارے میں شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بارے میں شریعت کا اصل حکم تو یہی ہے کہ یہ سب کام عبادات ہیں اور عبادات کو خالص اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب لینے کے لیے انجام دینا چاہے، قرآن و حدیث نے بھی اس کی ترغیب دی ہے، بلکہ بعض روایات میں ایسے امور پر اجرت لینے پر وعید بھی آئی ہے، اس لیے فقہاء متقدمین کی رائے یہی تھی کہ ان طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں جیسا کہ فی نفسہٖ نماز روزہ وغیرہ کی ادائیگی پر کسی اجیر سے اجرت لینا جائز نہیں، لیکن فقہاءِ متاخرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اصل تو یہی ہے کہ ان طاعات کو اللہ تعالیٰ کے لیے انجام دیا جائے اس پر اجرت نہ لی جائے، لیکن دوسری طرف لوگوں کی سستی وغفلت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ ان شعائر دینیہ کو بلا اجرت انجام دینے والے بہت کم لوگ رہ گئے اب اگر ایسی خدمات کے انجام دینے والوں کو اجرت نہ دی جائے تو دین کے ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اس لیے ابقاء دین کی مصلحت کے پیش نظر ان خدماتِ دینیہ، امامت، تدریس، قضاء، افتاء وغیرہ پر اجرت لینا جائز ہے البتہ جن عبادات پر ابقاءِ دین موقوف نہیں ہے، مثلاً: قرآن خوانی، فاتحہ خوانی، تہلیل خوانی، وغیرہ ان پر اجرت حاصل کرنا اب بھی حرام ہے۔ حضرت اقدس تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

کہ اصل مذہب یہ ہے کہ کسی طاعت مقصودہ پر اجرت لینا جائز نہیں، مگر طاعات میں دوام اور پابندی کی ضرورت ہے اور وہ شعائر دین میں سے ہیں کہ ان کے بند ہونے سے دین میں خلل

لازم آئے گا اور ایسے کسی کو فرصت نہیں کہ ان امور کو مفت انجام دے، لہٰذا ایسے امور اس کلیہ (عدم جواز سے) مستثنیٰ ہیں (یعنی ان پر اجرت لینا جائز ہے)

باقی قرآن خوانی تہلیل خوانی وغیرہ کے متروک ہونے سے دین میں کوئی خلل نہیں آئے گا اس لیے یہ قاعدہ عدم جواز سے مستثنیٰ نہ ہوں گے۔ (ماخوذ از امداد الفتاوی: ۳/ ۳۳۴)

جواز کے سلسلہ میں علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ چونکہ خلفاء راشدین اور بعد کے زمانہ میں ایسی خدمات انجام دینے والوں کے لیے حکومت کی طرف سے وظائف مقرر تھے لہٰذا وہ بے فکری کے ساتھ تنخواہ لیے بغیر ہی خدمات سرانجام دیتے تھے لیکن بعد کے زمانہ میں سرکاری وظیفہ کا سلسلہ بند ہو گیا، اب ضرورۃً اسکی اجازت دی گئی ہے اور درحقیقت یہ طاعات کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ جس وقت اور اپنے آپ کو پابند بنانے کا ایک معمولی صلہ ہے اب ان کی مکمل تحقیق نقل کی جاتی ہے۔

قال العلامة الصابوني: عرفنا مما تقدم أن أخذ الأجرة على الفرائض والواجبات والطاعات، لا يصح، لأنها فرائض دينية، فرضها الله على عباده، ولما كان الأذان، والإقامة، والإمامة من الشعائر الدينية الواجبة، فهل يصح أخذ الأجرة عليها ؟

اختلف الفقهاء في ذلك، كما اختلفوا في أخذ الأجرة على تلاوة القرآن وتعليمه .

مذهب أبي حنيفة وأحمد :

أنه لا تصح الإجارة على شيء من الطاعات، كاستئجار من يقرأ القرآن ليهدي ثوابه إلى الميت، أو كمن يؤذن يؤم الناس في الصلاة، أو يعلم القراان والفقه والحديث، لأن هذه طاعات وعبادات، ينبغي أن تؤدى لوجه الله تعالىٰ .

واستدلوا بما روي عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال :

"اقرء وا القرآن ولا تأكلوا به ."

(أخرجه أحد وأبو يعلى، قال في فتح الباري : ۹/ ۱۰۱ وإسناده قوي)

أي لا تأخذوا أجرة تأكلونها مع قراء ته، وبما روي عن عثمان

بن أبي العاص رضي الله عنه أنه قال: "آخر ما عهد إلي رسول الله صلى الله عليه وسلم أن لا أتخذ مؤذنا يأخذ على الأذان أجرا."

(أخرجه الترمذي رقم: ٢٠٩، والنسائي: ٢٠، ابن ماجه: ١/٣٣٦)

وقالوا: إن هذه الطاعات تقع من العامل عن نفسه، فلا يجوز أخذ الأجرة عليها من غيره، كالصوم والصلاة، وكل عبادة يحرم أخذ الأجرة عليها، كالأذان والإمامة وقراءة القرآن، لأنه يؤديها قربة صلى الله عليه وسلم؟ فهي له، ينال أجرها من الله، لقوله سبحانه: ﴿وأن ليس للإنسن إلا ما سعى﴾.

وكذلك تعليم القرآن واجب ديني، فلا يصح أخذ الأجرة عليه، كما لا يجوز أخذ الأجرة على تعليم الفقه، والحديث، وسائر العلوم الشرعية، لأنها واجبات دينية.

وهذه نظرة مثالية رائعة، تسمو بقدسية العلم إلى آفاق سامية، وتجعل نشره وتعليمه فريضة على المسلم، عليه أن يؤديها، كما يؤدي الصوم والصلاة، وقد قال صلى الله عليه وسلم: "من سئل عن علم فكتمه ألجم يوم القيامة بلجام من نار."

(أخرجه الترمذي رقم: ٢٦٥١، وأبو داؤد رقم: ٣٦٥٨)

فهل هناك نظرة أعلى وأسمى، من هذه النظرة الكريمة، إلى قداسة العلم ومكانته؟ ولكن هل تتحقق مثل هذه النظرة من هذا العصر المادي؟

لقد أفتى المتأخرون من فقهاء المذهب، بجواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن والفقه والحديث، لئلا تضيع العلوم الشرعية، ويذهب العلم وأهله، بعد أن انقطعت العطايا والهدايا من بيت مال المسلمين للعلماء، بانهدام الخلافة الإسلامية، وضياع بيت مال المسلمين.!

قال في كتاب الاختيار: ولا تجوز الإجارة على الطاعات، كالحج، والأذان، والإمامة، وتعليم القرآن والفقه، وبعض أصحابنا المتأخرين قال يجوز على التعليم، والإمامة في زماننا، وعليه الفتوى لحاجة الناس إليه، وظهور التواني في الأمور الدينية، وكسل الناس في الاحتساب، فلو امتنع الجواز، يضيع حفظ القرآن .

(الاختيار لتعليل المختار : ٢/ ٦٠)

وقال في المغني : وما كان من القرب ـ أي العبادات ـ كالإمامة، والأذان، وتعليم القرآن، فلا يجوز اخذ الأجرة عليه، وبه قال أبو حنيفة ...... وكره الزهري تعليم القرآن بأجر، وقال ابن شقيق : هذه الرغف التي يأخذها المعلمون من السحت ـ أي الحرام .

وعن أحمد رواية أخرى : يجوز ذلك، وروي عنه أنه قال : التعليم أحب إلي من أن يتوكل لهؤلاء السلاطين، ومن أن يستدين ويتجر، لعله لا يقدر على الوفاء، فيلقى الله بأمانات الناس، التعليم أحب إليّ !!

وهذا يدل على أن منعه كان للكراهة لا للتحريم، وممن أجاز ذلك مالك، والشافعي، لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم زوج رجلا بما معه من القرآن، وإذا جاز تعليم القرآن في باب النكاح، وقام مقام المهر، جاز أخذ الأجرة عليه في الإجازة .

ووجه الرواية الأولى " التحريم " ما ورد عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال : " اقرءوا القرآن، ولا تغلوا فيه، ولا تجفوا عنه، ولا تأكلوا به، ولا تستكثروا به ."

(والحديث اخرجه احمد فى المسند : ٣/ ٤٢٨)

لأن هذا قربة إلى الله، فلم يجز أخذ الأجر عليه، فأما أخذ الأجرة على الرقيقة، فإن أحمد اختار جوازه وقال : لا بأس به، للحديث

الصحيح الوارد فيه، لأن الرقية نوع مداوة .

(المغني لابن قدامه الحنبلي : ١٧/١٣٦)

مذهب المالكية والشافعية :

وذهب المالكية والشافعية إلى جواز أخذ الأجرة على تعليم القرآن والعلم، لأنه استئجار لعمل معلوم، بأجر معلوم، وكما يجوز أخذ الأجرة على تعليم القرآن، يجوز أخذها على الحج، والأذان، لأنها مقابل الالتزام بما كلف به، واستدلوا بما رواه البخاري عن ابن عباس رضي الله عنهما " أن نفرا من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم مروا بماء فيه لديغ، فعرض لهم رجل من أهل الماء، فقال : هل فيكم من راق ؟ فإن عندنا رجلا لديغا، فانطلق رجل منهم، فقرأ بفاتحة الكتاب على شياه، ـ فشفي الرجل ـ فجاء بالشياه إلى أصحابه، فكرهوا ذلك، وقالوا : أخذت على كتاب الله أجرا !!

حتى قدموا المدينة فقالوا : يا رسول الله صلى الله عليه وسلم : أخذ على كتاب الله اجراً !! فقال صلى الله عليه وسلم : " إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله ."

(أخرجه البخاري فى كتاب الاجارة والطب : ١٩٩/١٠)

فدل الحديث على جواز أخذ الأجر، على قراءة القرآن الكريم، ويقاس عليه سائر العلوم الدينية .

قال ابن حزم : والإجارة جائزة على تعليم القرآن، وعلى تعليم العلم، مشاهرة وجملة، كل ذلك جائز، كما تجوز على الرقى ـ أي القراءة على المريض . وعلى نسخ ان مصاحف، ونسخ كتب العلم، لأنه لم يأت في النهي عن ذلك نص بل قد جاءت الإباحة ، والله أعلم .

أقول : إن الفتوى قد استقرت على جواز أخذ مرتب على تعليم

القرآن، والفقه، والعلوم الدينية، وعلى الأذان، والإمامة، والخطابة، من المتأخرين من الفقهاء و هذا الذي يتفق مع عصرنا الذي طغت فيه المادة، وقل فيه من يعلم الناس العلم لوجه الله، ولا بد من تأمين حاجات المعلمين، والأئمة والخطباء، والمال الذي يأخذونه ليس على الأذان والإمامة إنما هو مقابل الجهد الذي يبذلونه، والتفرغ لهذا العمل الجليل، والانقطاع له، حتى يؤدي المعلم واجبه في خدمة الدين والمسلمين . (فقه المعاملات)

وعظ کہنے پر اجرت لینے کا حکم:

وعظ کہنے پر اجرت وصول کرنا جائز ہے یا نہیں اس بارے میں بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ اجرت علی الطاعات میں داخل ہے اس لیے جائز نہیں لیکن بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جائز ہے، چنانچہ دونوں اقوال میں تطبیق دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر وعظ کہنے کی نوکری اختیار کر لی جائے امامت کی طرح تو اجرت لینا جائز ہے اور اگر (مستقل) نوکری نہیں کی، بلکہ عین وقت پر اجرت لینے کی شرط طے کرے، (یعنی کسی کو وقتی طور پر وعظ کے لیے بلایا جائے اور وہ اجرت دینے کی شرط رکھے) تو یہ صورت جائز نہیں جیسے کوئی مستقل امام نہ ہو بلکہ نماز کا وقت ہو گیا اور وہ مسجد میں موجود ہے اس کو نماز کے لیے کہا گیا تو عین وقت پر امامت پر اجرت مانگنے لگے، یہ بھی جائز نہیں۔'' (امداد الفتاویٰ بتغیر یسیر)

حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اگر کسی کو وعظ کہنے کے لیے ملازم رکھا گیا ہے یا کسی نے اپنے کو اسی کام کے لیے فارغ کر رکھا ہے کہ کوئی کہیں بھی وعظ کہلوانے کے لیے لے جا سکتا ہے تو اس صورت میں وعظ پر اجرت لینا جائز ہے اگر کسی خاص موقع پر کسی عالم سے وعظ کہنے کی درخواست کی جائے تو وعظ پر اجرت لینا جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۳۰۰)

ریڈیو پر تلاوت کرنے اور تفسیر بیان کرنے کی اجرت:

سوال: ریڈیو پر قرآن کریم کی تلاوت اور تفسیر بیان کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: محض تلاوت دو وجہ سے ناجائز ہے:

1- عموماً تلاوت کرنے والا اجرت لیتا ہے اور تلاوت محضہ پر اجرت لینا حرام ہے۔

2- اسی مجلس میں گانا بجانا بھی ہوتا ہے جس میں قرآن کریم کی توہین ہے، لہٰذا اس کا سننا بھی جائز نہیں۔

البتہ تفسیر بیان کرنا اور اس پر اجرت لینا جائز ہے۔ (احسن الفتاوی: ۱۹۹/۸)

جانور چرانے کی اجرت میں نصف جانور دینا:

زید نے بکر کو ایک گائے نصف بٹائی پر دی کہ اس کو کھلاتے رہو جب یہ بچہ دے گی تو بچہ آپ کا اور گائے میری ہوگی، اس کو نصف بٹائی کہا جاتا ہے، اسی طرح کی اور بہت سی صورتیں مختلف علاقوں میں رائج ہیں جس میں اجرت مجہول ہوتی ہے اور مدت بھی اکثر مجہول ہوتی ہے حالانکہ صحت اجارہ کے لیے دونوں کا معلوم ہونا ضروری ہے، اس لیے یہ اجارہ فاسد ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ اجارہ فاسد ہے، اس لیے کہ اس میں اجرت اور مدت دونوں مجہول ہیں، چرانے والے کو اجر مثل ملے گا اور بچہ گائے کے مالک کا ہوگا۔''

قال فی التنویر وشرحه: فكل ما افسد البيع مما مر يفسدها كجهالة ماجور واجرة او مدة او عمل وكشرط طعام عبد وعلف دابة ومرمة الدار الخ. (ردالمحتار: ۳۲/۵)

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: بخلاف دفع الغنم والدجاج ودود القز معاملة بنصف الزوائد لانه لا اثر هناك للعمل فى تحصيلها فلم يتحقق الشركة. (هداية: ۴۲۵/۴)

قال فى الهندية: ولا تجوز اجارة الشجر على أن الثمر للمستأجر وكذالك لو استاجر بقرة أو شاة ليكون اللبن أو الولد له كذا فى محيط السرخسى.

(عالمگيرية: ۴۴۳/۴) (أحسن الفتاویٰ: ۳۰۹/۷)

البتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"كتب إلى بعض الاصحاب من فتاوىٰ ابن تيميه كتاب

الاختیار ان ما نصه لو دفع دابته أو نخله إلى من يقوم له وله جزء من نمائه صح وهو رواية عن احمد ." (٨٥/٤)

پس حنفیہ کے قواعد پر تو یہ عقد نا جائز ہے، کما نقل عن العالمگیریۃ، لیکن بناء بر نقل بعض اصحاب امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک اس میں جواز کی گنجائش ہے، پس تحرز (اجتناب) احوط ہے اور جہاں ابتلاء شدید ہو تو توسع کیا جا سکتا ہے۔ (امداد الفتاویٰ : ۳۴۳/۳)

دلال کی اجرت جائز ہے:

خرید و فروخت و دیگر معاملات جن کو آدمی ناواقف ہونے کی بناء یا فرصت نہ ہونے کی بناء پر خود انجام نہیں دے پاتا اب جو شخص دلال (ایجنٹ) بن کر یہ کام انجام دے رہا ہو، شرعاً اس کے لیے اجرت لینا حلال ہے یا نہیں، اس بارے میں مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اجرتِ دلال کے بارے میں فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی عبارات مختلف ہیں، مگر لوگوں کی ضرورت اور حاجت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جواز کا قول مختار اور مفتیٰ بہ ہے۔ البتہ بوقت عقد تعیین اجرت ضروری ہے۔

قال فی التتارخانية : وفى الدلال والسمسار يجب اجر المثل وما تواضعوا عليه إن فى كل عشرة دنانير كذا فذاك حرام عليهم، وفى الحاوي سئل محمد بن سلمة عن اجرة السمسار فقال ارجو انه لا بأس به وإن كان فى الاصل فاسداً لكثرة التعامل و كثير من هذا غير جائز فجوزوه لحاجة الناس إليه كدخول الحمام .

(ردالمحتار : ٤٤/٥)

اجرة السمسار والمناوى والحمامى والصكاك وما لا يقدر فيه الوقت ولا العمل تجوز لما كان للناس به حاجة .

(ردالمحتار : ٣٢/٥) (احسن الفتاوىٰ : ٢٧٣/٧)

کمیشن پر چندہ کرنے کا حکم:

بعض اہل مدارس چندہ کے لیے سفراء مقرر کرتے ہیں اور یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ حاصل شدہ چندہ کا تہائی یا چوتھائی حصہ بطورِ اجرت دیا جائے گا شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں

حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''حنفیہ کے اصول پر یہ اجارۂ فاسد ہے دوسرے مذاہب کی تحقیق نہیں۔'' (امداد الفتاوی: ۳/۳۷۶)

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معاملہ دو وجہ سے جائز نہیں:

1- اجرت من العمل ہے لہٰذا قفیز الطحان کے حکم میں داخل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

2- اجیر اس عمل پر بنفسہ قادر نہیں، بلکہ قادر بقدرۃ الغیر ہے، اس کا عمل چندہ دینے والوں کے عمل پر موقوف ہے اور قادر بقدرۃ الغیر بحکم عاجز ہوتا ہے جبکہ صحت اجرۃ کے لیے قدرت بنفسہ شرط ہے، چنانچہ قفیز الطحان کے فساد کی علت بھی یہی ہے کہ مستاجر قادر علی الاجرۃ بقدرۃ العامل ہے بنفسہ قادر نہیں۔

جب کہ حسب تصریح فقہاء رحمہم اللہ تعالی بقدر عقد اجیر کا قادر علی العمل ہونا اور مستأجر کا قادر علی تسلیم الاجرۃ ہونا صحت عقد کے لیے شرط ہے۔

البتہ اس معاملہ کو صحیح بنانے کی یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ اجرت من العمل کا ذکر بطور شرط نہ ہو بلکہ صرف تعیین وتحدید کے لیے ہو یہ مفسد نہیں، یعنی قفیز الطحان میں اگر یہ شرط نہ ہو کہ اسی طحین (پسے ہوئے آٹا) سے دیا جائے گا تو جائز ہے۔

(ماخوذ از احسن الفتاوی: ۷/۲۷۶)

کرایہ پر لی ہو چیز دوسرے کو کرایہ پر دینے کا حکم:

زید نے مثلاً: ایک زمین آدھی پیداوار کے عوض کرایہ پر لی اب اس کا کچھ حصہ آگے دوسرے کو تہائی پیداوار پر بطورِ کرایہ کے دیتا ہے یا مال منتقل کرنے کے لیے جہاز میں ایک جگہ کرایہ پر حاصل کی پھر اس کا ایک حصہ دوسرے کو کرایہ پر دیتا ہے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے۔ بشرطیکہ اپنے موجر (یعنی جس سے کرایہ پر لی) کے ساتھ نہ ہو اور اجرتِ اولی سے کم پر ہو اور اگر اجرتِ اولیٰ سے زیادہ کے ساتھ ہو تو زائد رقم حلال نہ ہوگی اس کا تصدق واجب ہوگا۔

اِلا یہ کہ دوسرا عقد پہلے عقد کے خلاف جنس سے ہو، یا یہ کہ کرایہ دار اس میں کوئی مرمت واصلاح کرے، مثلاً: اگر مکان ہو تو اس کی مرمت، رنگ وروغن وغیرہ کرے، اگر زمین ہو تو اس کی نالی وغیرہ درست کرے۔

وفی الهندیة : وإذا استاجر دار وقبضها ثم اجرها فإنه یجوز ان اجرها بمثل ما استاجرها او اقل وإن اجرها باکثر مما استاجرها فهی جائزة ایضا الا انه إن کانت الاجرة الثانیة من جنس الاجرة الأولی فإن الزیادة لا تطیب له ویتصدق بها، وإن کانت من خلاف جنسها طابت له الزیادة ولو زاد فی الدار زیادة کما لو وتد فیها وتدا أو حفر فیها بئرا او اصلح ابوابها أو شیئا من حوائطها طابت له الزیادة.

(الفتاوی الهندیة : ٤/٢٥، کتاب الاجارة)

قال ابن عابدین رحمه اللّٰه : (قوله المستاجر ان یوجر الموجر الخ) اي ما استاجر بمثل الاجرة الأولی او ما نقص، فلو باکثر تصدق بالفضل الا فی المسئلتین کما مر اول باب ما یجوز من الاجارة.

(ردالمحتار : ٦/٩١ مسائل شتیٰ، مطلب فی اجارة المستاجر)

تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے:

تعویذ کے جواز کی شرائط یہ ہیں کہ

1- الفاظ صحیح ہوں۔

2- الفاظ منقولہ یعنی قرآن وحدیث میں وارد شدہ ہوں۔

3- شرکیہ الفاظ نہ ہوں۔

4- تعویذ کو مؤثر بالذات نہ سمجھے

اگر یہ شرائط پائی جائیں تو تعویذ جائز ہے اور اس پر اجرت لینا بھی جائز ہے، کیونکہ تعویذ علاج کے حکم میں ہے۔

قال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه : لان المتقدمین المانعین الاستیجار مطلقاً جوزوا الرقیة بالاجرة ولو بالقرآن کما ذکره الطحاوی لانها لیست عبادة محضه بل من التداوی.

(ردالمحتار : ٦/٥٧ باب الإجارة الفاسدة)

ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ لینا جائز ہے:

سوال: مثلاً اسکولوں کے اساتذہ نے حکومت کے سامنے کچھ مطالبات پیش کیے لیکن حکومت نے ان کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا بار بار یاد دہانی کے باوجود حکومت نہیں مانی تو اساتذہ نے مجبور ہو کر ہڑتال کر دی اور طالبعلموں کو پڑھانا چھوڑ دیا لیکن خود اسکول میں پابندی سے حاضری دیتے رہے، تو کیا ہڑتال کے دنوں کی تنخواہ حلال ہوگی؟ جبکہ انہوں نے پڑھایا نہیں؟

جواب: چونکہ جمہوری حکومتوں میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کا قانونی حق حاصل ہوتا ہے، لہٰذا صورتِ مسئولہ میں، ان کی تنخواہ حلال ہوگی۔ (ماخوذ از فتاویٰ حقانیہ : ۶/۲۶۱)

ویزہ نکلوانے پر رقم وصول کرنے کا حکم:

ایک آدمی کو دوسرے ملک کے ویزہ کی ضرورت ہے، لیکن خود حاصل کرنا دشوار ہے، اب ایک دلال مقررہ فیس سے کئی گناہ زیادہ رقم لیکر ویزہ حاصل کر کے اس کے حوالے کرتا ہے تو اس معاملہ کا شرعاً کیا حکم ہے؟

جواب: اگر ویزہ اس آدمی کا حق بنتا ہو مگر بغیر رشوت حاصل نہ کر سکتا ہو، تو دینے والے کے لئے حرام نہیں البتہ رشوت لینے والے کے لئے حرام ہے، اب جو آدمی درمیان میں کام کر رہا ہے، اس کی اجرت کا حکم یہ ہے کہ اگر وہ باقاعدہ طور پر بھاگ دوڑ کر کے وقت خرچ کر کے اس کام کو انجام دیتا ہے تو اس کی اجرت جائز ہوگی۔

قال العلامة قاضی خان رحمه الله: اهل بلدة تقلت عليهم المؤنات فاستاجروا رجالا باجر معلوم ليذهب الى السلطان ويرفع القصه يخفف عنهم السلطان نوع تخفيف واخذ الاجر من عامة اهل البلدة من الاغنياء والفقراء، قالوا: ان كان بحال لوذهب الى بلدة السلطان يتهيئ اصلاح فی یوم أو يومين جازت الاجارة وان كان بحال لا يحصل المقصود فی یوم أو يومين وانما يحصل فی مدة فان وقتو الاجارة وقتاً جازت الاجارة وله كل المسمى وان لم يؤقتوا فسدت الاجارة وكان له الاجر المثل على اهل البلدة على قدر مؤنتهم ومنافعهم.

(فتاوى قاضی خان : ۳/۱۸، باب الاجارة الفاسدة)

مکانوں اور دکانوں کی پگڑی کا حکم:

آج کل مکانوں اور دکانوں کی پگڑی کا عام رواج ہو گیا ہے جس کا نام حق قرار بھی ہے، بسا اوقات مالک مکان / دکان اپنا مکان، دکان طویل مدت کے لئے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ کے علاوہ کچھ رقم یکمشت لیتا ہے، کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حقدار ہو جاتا ہے کہ کرایہ دار طویل مدت تک یا تاحیات باقی رکھے پھر بسا اوقات کرایہ دار اپنا حق دوسرے کرایہ دار کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اس سے یکمشت رقم وصول کرتا ہے اور اس معاملہ کو عرف میں پگڑی فروخت کرنا کہا جاتا ہے اب رقم ادا کرنے کے بعد دوسرا شخص مالک مکان دکان سے عقد اجارہ کا حقدار ہو جاتا ہے یا اگر مالک مکان دکان کرایہ دار سے مکان یا دکان جو واپس لینا چاہے تو اس کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے کہ کرایہ دار کو اتنی رقم ادا کرے جس پر دونوں راضی ہوں اس یکمشت لی جانے والی رقم کو مختلف بلاد عربیہ میں ''خلو'' کہا جاتا ہے جبکہ ہند و پاک میں ''پگڑی'' یا ''سلامی'' کہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے یہ لینا جائز ہے یا ناجائز؟

شرعاً اس کا لین دین دونوں ناجائز ہیں کیونکہ یہ رقم یا تو ''رشوت'' ہے یا ''حق مجرد'' کا عوض ہے اب اگر کسی نے ایسا معاملہ کر لیا تو دونوں فریق پر توبہ کرنا اور اس رقم کو واپس کرنا لازم ہے۔

قال العلامة الصابونی: اذا نتهت مدةُ الاجارة، فعلى المستأجر أن يسلمها لصاحبها، وليس له حق فی أن يخليها لغيره، على أن يأخذ منه مبلغاً فی نظير الاخلاء، كما يفعله بعض الناس اليوم، لأن ملك الدار أو الدكان لصاحبها المالك، فتكون المنفعة له، لاللمستأجر، يتحكم فيها كيف شاء، وهذا الذی يسميه الناس "حق الخلو" أو "حق نقل القدم" ليس بالأمر الشرعی.

ويمكنه أن يستأجرها مدة أخرى، ثم يؤجرها لغيره، أو يأخذ قيمة الزينة المسمى "الديكور" من المستأجر الثانی، ويتعاقد هذا المستأجر مع مالكها، الأصلی بالمبلغ الذی يتفقان عليه أمَّا أن يأخذ ماشاء من خلو، كأنه مالكها، ويمنع مالكها من تأجيرها الأن يرضىٰ بذلك المالك، وكما لايحق للمستأجر أن يفوت على المؤجر

التصرف بملكه، كذلك لايجوز للمالك أن يضيع حق المستأجر، فيما أنفق على المحل من مالٍ لتحسين المحل وتزيينه، بل يكرمه ويرضيه، فهذا هو شرع الله وينه المحكم العادل ﴿ لا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾

قال الشيخ خليل فى الموسوعة الفقهية :

الخلو المعروف الآن فى زماننا أن يستأجر شخصٌ دكاناً مثلاً: بأجرةٍ شهرية أو سنوية، ثم يريد اخلاء ه لغيره، على أن يأخذ منه مبلغاً فى نظير الاخلاء، وهو غير صحيح عند جمهور العلماء، لأنّ يد المستأجر عليه، يدُأمانة، لايستحقُ أن يأخذ عليها شيئاً،والدكان ليست ملكاً له .

ولا يُقال هذه ضرورة لا يمكن الاحتراز عنها فتحل، فان الضرورة هى التى لا يمكن لأحدٍ أن يتجنَّبها، مثل ضرورة ماء، أى طين، الشوارع فى الشتاء، ولأنه لو صحَّ بيعه لأحدٍ لصح لمالكه .

(الموسوعة الفقهية : ٣٥٥/٦)

وقد قال بعض العلماء المتأخرين، يجوز للمستأجر أن يأخذ شيئاً، مقابل تنازله عن اختصاصه بمنفعة العقار المأجور،لشخص آخر يحلُّ محلَّه، بناءً على العرف الخاص فى التنازل عن الوظائف، الذى أفتى به بعضُ المتأخرين، والخلو عند الفقهاء معناه أن توجد مثلاً: دار خربة، أوأرضٌ موقوفة وليس للواقف ريعٌ يعمر به الأرض، فيدفع شخص مبلغاً لجهة الوقف لبناء الأرض، أو تعمير الدار الخربة، على أن يدفع أجرةً كلَّ سنة تسمى "حِكْراً" فهو يملك المنفعة، وتسمى هذه المنفعة با الخلو، وهذا الذى ذكره الفقهاء غير الخلو فى زماننا، ومن هذا يتبيَّن لنا أنه لا يجوز اخلاء لغيره على أن يأخذ منه مبلغاً فى نظير الاخلاء، فانه من قبيل أكل أموال الناس بالباطل،

ولیس الأمر کما یدّعیه البعض من أنه یجوز عملاً بعرف الناس، فانه لاقیمة للعرف اذا خالف النصَّ، فانه لا یجوز أن یُقال :یباح شرب الخمر مثلاً: فی هذا الزمان استناداً الی العرف . (فقه المعاملات)

خلاصہ یہ ہے کہ بعض عبارات فقہاء سے بعض علماء کو مروجہ پگڑی کے جواز کا شبہ ہوا کہ وہ اس کو ''جدک'' پر قیاس کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''جدک'' اور ''خلو'' دونوں جدگانہ الگ الگ چیزیں ہیں، اس لئے خلوء کو جدک پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ الرحمہ نے تنقیح الحامدیہ میں ذکر کیا ہے چنانچہ موصوف'' سکنی'' کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"وهو غیر الخلو الذی هو عبارة عن القدمیة ووضع الید، خلا فالمن زعم هو، واستدل بذلك علی جواز بیع الخلو، فانه استدلال فاسد، لما علمت من ان السکنی اعیان قائمة مملوكة، کما اوضحه العلامة الشر نبلالی فی رسالة خاصة لكن اذا كان هذا الجدك المسمی بالسکنی قائما فی ارض وقف فهو من قبیل مسألة البناء او الغرس فی الارض المحتكرة، لصاحبه الاستبقاء باجرة مثل الارض، حیث لاضرر علی الوقف، وان ابی الناظر، نظراً للجانبین علی ما مشیٰ علیه فی متن التنویر.......... ولا ینافیه ما فی التجنیس من ان لصاحب الحانوت ان یكلفه رفعه، لان ذاك فی الحانوت الملك، بقرینة مافی الفصولین : والفرق ان الملك قد یمتنع صاحبه عن ایجاره، ویریدان یسكنه بنفسه او یبیعهُ او یعطله، بخلاف الموقوف المعد لا یجار، فانه لیس للناظر الاان یوجره، فایجاره من ذی الید باجرة مثله اولیٰ من ایجاره من اجنبی لما فیه النظر للوقف ولذی الید. " (تنقیح الفتاویٰ الحامدیة لابن عابدین : ۲/ ۲۰۰)

''سکنی'' اس خلو کے علاوہ ہے جو محض پرانا کرایہ دار ہونے اور قابض ہونے کا نام ہے ان لوگوں کے برخلاف جن کا یہ گمان ہے کہ ''سکنی'' ہی ''خلو'' ہے اور اس سے ''خلو'' کی بیع کے جواز پر

استدلال کیا ہے یہ استدلال فاسد ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا کہ ''سکنی'' پائیدار اور مملوک اعیان کا نام ہے جیسا کہ علامہ شرنبلالی نے ایک مستقل رسالہ میں اس کی وضاحت کی ہے، لیکن اگر یہ ''جدک'' جس کو ''سکنی'' کہا جاتا ہے وقف کی زمین میں قائم ہو تو یہ اسی طرح کی چیز ہوگی جیسا کہ محکرہ زمین میں عمارت تعمیر کرنے یا درخت لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اس صورت میں صاحب جدک کو کرایہ مثل دے کر اسے اپنے قبضے میں باقی رکھنے کا اختیار ہے کرایہ مثل کی شرط اس واسطے ہے تا کہ وقف کا نقصان نہ ہو، اگر چہ وقف کا متولی اس پر راضی نہ ہو، دونوں فریقوں کی رعایت کرتے ہوئے یہی قول التنویر میں اختیار کیا گیا ہے........التجنیس میں یہ جو لکھا ہوا ہے کہ دوکان کے مالک کو اختیار ہے کہ کرایہ دار کو جدک ہٹانے پر مجبور کرے یہ بات ہماری مذکورہ بالا بات کے منافی نہیں ہے کیونکہ التجنیس میں جو بات لکھی ہوئی ہے وہ اس دوکان کے بارے میں ہے جو شخصی ملکیت ہے اس کا قرینہ جامع الفصولین کی یہ عبارت ہے: ملکیت اور وقف میں فرق یہ ہے کہ جو مکان شخصی ملکیت ہو اس کا مالک مکان کبھی اس کو کرایہ پر دینے سے باز آجاتا ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس میں رہائش اختیار کر لے یا اسے فروخت کردے یا معطل چھوڑ دے لیکن جو مکان وقف کی ملکیت ہے اور کرایہ پر دینے کے لئے بنایا گیا ہے اس کے بارے میں وقف کے متولی کو کرایہ پر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، لہٰذا اس مکان پر جس شخص کا قبضہ ہے اسی کو اجرت مثل پر کرایہ پر دینا کسی اجنبی شخص کو کرایہ پر دینے سے زیادہ بہتر ہے اس لئے کہ اس میں وقف اور صاحب قبضہ دونوں کی مصلحت کی رعایت ہے۔''

مروج پگڑی کا متبادل:

ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ دکان یا مکان کرایہ پر لیتے وقت ''پگڑی'' یا سلامی کے نام سے جو رقم وصول کی جاتی ہے، شرعاً اس کا لین دین ناجائز ہے، اس لئے ایسا معاملہ کرنے سے اجتناب کیا جائے، البتہ پیشگی کرایہ وصول کرنا جائز ہے، لہٰذا اس کی جائز صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کرایہ کا معاملہ کرتے وقت کرایہ دار سے خاص مقدار میں یک مشت رقم لے لی جائے، جسے متعینہ مدت کا پیشگی کرایہ قرار دیا جائے، اب آگے، ماہانہ کرایہ کے ساتھ اس رقم کا ایک حصہ کٹوادے، یا یہ کہ جب تک یہ رقم ختم نہ ہو مزید کرایہ وصول نہ کیا جائے اور اگر جتنے مہینے کا کرایہ بنتا ہے اس سے پہلے اجارہ فسخ ہو جائے تو مالک کے ذمہ واجب ہوگا کہ حساب کر کے بقیہ رقم واپس

کردے۔

ناجائز ملازمت کی پنشن کا حکم:

ایک شخص کوئی ناجائز ملازمت کررہا تھا، اب پنشن مل رہی ہے، تو کیا اس پنشن سے اس کو یا کسی دوسرے کو انتفاع کرنا جائز ہے؟

اس کا حکم یہ ہے کہ ایسی پنشن جائز ہے بشرطیکہ پنشن دینے والے ادارے کے ذرائع آمدن حلال ہوں، ورنہ اصل تنخواہ کی طرح اس پنشن کا لینا بھی حرام ہوگا، جیسے بینک کی پنشن کہ تنخواہ اور پنشن دونوں سود سے دیجاتی ہیں۔(احسن الفتاویٰ: ۴/ ۳۱۷)

نکاح خوانی کا حکم:

نکاح پڑھانے کی اجرت لینا جائز ہے بشرطیکہ اس سے اجرت لی جائے جس نے بلایا ہے اور وہی شخص اجرت لے جس نے نکاح پڑھایا ہے اور یہ جو رواج ہے کہ بلانے والا لڑکی والا ہوتا ہے اور اجرت لڑکے والے دیتے ہیں یہ ناجائز ہے۔

نیز یہ رواج بھی ناجائز ہے کہ نکاح پڑھانے والے کو تھوڑی سی اجرت دیکر باقی روپیہ قاضی کو بطور حق کے دیا جاتا ہے، قاضی نے جب کام نہیں کیا اس کا حق کچھ نہیں۔

(امداد الاحکام: ۳/ ۶۱۱، کتاب الاجارہ)

البتہ قاضی اگر نکاح رجسٹرار ہو تو سرکاری فیس اور فارم کی لکھوائی وصول کرسکتا ہے، جو پہلے سے متعین کرلی جائے تاکہ بعد میں نزاع پیدا نہ ہو۔

مدرسہ کا مکان بینک کو کرایہ پر دینا:

مدرسہ کا مکان یا دکان بینک کو کرایہ پر دینا اعانۃ علی المعصیت ہونے کی وجہ سے شرعاً ممنوع ہے، سود کی برائی اور وعیدوں کے پیش نظر مدرسہ کا مکان /دکان بینک کو کرایہ پر دینے کی جرأت نہ کی جائے اگرچہ کرایہ زیادہ ملتا ہو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قل لا یستوی الخبیث والطیب ولو اعجبك كثرة الخبيث فاتقوا الله يا اولى الالباب لعلكم تفلحون﴾ (المائدة)

"آپ فرمادیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں گو تجھ کو ناپاک کی کثرت تعجب میں ڈالتی ہو

پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو'' (مائدہ) (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/ ۲۹۱)

ناجائز اشیاء فروخت کرنے والے پر ملازمت کا حکم:

ایسی دکان میں ملازمت کا حکم جہاں ناجائز اشیاء کی فروخت، سودی لین دین اور دھوکہ فریب ہو اسی طرح جس دکان میں ناجائز خرید وفروخت ہو اس میں ملازمت کا کیا حکم ہے اس سلسلہ میں اس طرح کا سوال جواب امداد الاحکام سے نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ایک بڑی دکان پر مختلف قسم کی اشیاء جائز وناجائز فروخت ہوتی ہیں، مگر بمقابلہ اشیاء ناجائز کے کثرت اشیاء جائزہ کی ہے، البتہ یہ بات ضروری ہے کہ معاملات بیع وشراء میں سودی معاملہ بھی کبھی کبھی برتا جاتا ہے، اگرچہ تاجر دوکان مشتری سے سود لیتا تو کم ہے مگر بعض اوقات خود دوسرے کو دینے سے چارہ نہیں ہوتا، اس دوکان پر متعدد ملازم ہوتے ہیں جن میں بعض جاہل محض ہوتے ہیں اور بعض کچھ شدبد والے، یہ ملازم دغا کذب وغیرہ بے کھٹکے اعلیٰ درجہ کا برتتے ہیں اور مالک دوکان باوجود وقوف آگہی کے ان افعال پر ملازمین سے کچھ تعرض نہیں کرتا۔

حاصل یہ کہ اس دکان پر ایک روپیہ میں آٹھ آنہ سے زائد کی نسبت سے لین دین کذب ودغا برتی جاتی ہے اور بعض معاملات بیع فاسد کے بھی ہوتے ہیں (مگر یہ بیع فاسد کے معاملات بوجہ لاعلمی مسائل فقہیہ ہوتے ہیں) پس ایسی دوکان پر ملازمین از قسم منشی گری، یا تعلیم اطفال، یا خرید وفروخت اشیاء دوکان درست ہے یا نہیں؟ اور یقین کامل ہے کہ تنخواہ اس ہی رقم دوکان سے ملے گی اور ایسی دوکان پر بطور مہمان دعوت کھانا، یا پان وچائے معمولی اشیاء دوستانہ رسم کی خورد ونوش درست ہے یا نہیں؟

جواب: سود دینے سے دُکان کے مال میں حرمت نہیں آتی، دینے والوں کو گناہ ہوتا ہے اگر بدون سخت مجبوری کے دیں اور سود لینا مسلمان سے تو مطلقاً حرام ہے اور کفار سے لینا بھی بعض علماء کے نزدیک حرام ہے، مگر جب وہ قلیل ہے اور زیادہ آمدنی بے سودی ہے تو ملازمِ دکان کو تنخواہ لینا جائز ہے جبکہ تنخواہ مال مخلوط سے دی جائے، اس طرح جب اشیاء حلال زیادہ ہیں تو غلبہ حلال کو ہے اور ملازموں کی دغا وفریب سے ان کو گناہ عظیم ہوتا ہے، اسی طرح دوکان دار کو بھی اگر وہ اس سے واقف ہے لیکن جو قیمت حاصل ہوتی ہے وہ حلال ہے گو کراہت سے خالی نہیں، لیکن دکاندار کی ملک ہو جاتی ہے، اسی طرح بیع فاسد میں قبضہ سے دوکان دار کی ملک ہو جاتی ہے، البتہ کراہت

وخبث ضروری ہے اب اگر ملازم دکان کو یہ معلوم ہو کہ یہ تنخواہ جو مجھے دی گئی ہے یہ بیع فاسد کے ثمن سے دی گئی ہے یا سود کی آمدنی سے، جب تو اس کا لینا درست نہیں اور اگر سب مخلوط ہو اور اس کو معلوم نہ ہو کہ یہ تنخواہ بیع صحیح کی قیمت سے ہے یا فاسد کی تو تنخواہ لینا حلال ہے۔

قال فی الأشباہ :غلب علی ظنه أن اکثر بیاعات أھل السوق لا تخلو عن الفساد، فان کان الغالب ھو الحرام تنزہ عن شرائه، لکن مع ھذا لو اشتراہ یطیب له اھ، قال الحموی: ووجهه أن کون الغالب ھو الحرام لایستلزم کون المشتری حراماً، لجواز کونه من الحلال المغلوب والاصل الحل اھ . (ص ٩٢)

اور ایسے دوکاندار کی دعوت وضیافت وہدیہ وغیرہ قبول کرنا درست نہیں، لعدم تبدل الملک فیه بیعاً وشراء، ولعدم الحاجة الی ذلک۔

وقال الشیخ دام ظله: اذا اعطی الموجر الأجرۃ من المال المخلوط والأجیر عالم بالخلط، فکیف یجوز له أخذھا، والخبث قد تمکن بھا بالخلط، قلت: ھذا علی قولھا، وھو الأحوط، ولکن علی قول أبی حنیفة فالخلط مستھلك، فان قیل ھذا یفید ملکه لأجل استمتاعه به، قلت: عبارات الفتاوی تدل علی جواز الاستمتاع أیضاً علی قوله قال فی فتاویٰ قاضی خان ان کان غالب مال المھدی من الحلال، لا بأس بان یقبل الھدیة ویأکل مالم یتبین عندہ أنه حرام، لأنه اموال الناس لا تخلو عن قلیل حرام فیعتبر الغالب، واذا مات عامل من عمال السلطان وأوصی أن یعطی الحنطة للفقراء، قالوا: ان کان ماأخذہ من الناس مختلطا بماله لابأس به، وان کان غیر مختلط لا یجوز للفقراء أن یأخذہ اذا علم أنه مال الغیر، فان کان ذلك الغیر معلوماً ردہ الیه، وان لم یعلم الآخذ أنه من ماله أو مال غیرہ، فھو حلال حتّی یتبین انّه حرامٌ، قال الفقیه ابو اللیث ان کان مختلطاً بماله علی قول أبی یوسف ومحمد ھو علی ملك صاحبه، لایجوز أخذہ

الالیرد ہ علی صاحبه، وعلیٰ قول أبی حنیفة یملك الما ل بالخلط ویکون للاخذ أن یأخذ اذا کان فی بقیة مال المیت وفاء بمقدار مایؤدی به حق الخصماء اھ .

(امداد الاحکام : ۳/۵۳۳ ـ ۵۳۵ اجارۃ)

مچھلی شکار کرنے کی اجرت کا حکم:

بعض لوگ مچھلی شکار کرنے کے لئے لوگوں کو مزدور رکھتے ہیں وہ سمندر سے مچھلی شکار کر کے لاتے ہیں اور مالک کے حوالے کرتے ہیں مالک ان کو اجرت دیتا ہے کیا شرعاً یہ معاملہ درست ہے یا نہیں؟

قال العلامة الحصکفی رحمه اللّٰه: استاجره لیصید له أو یحتطب له فان وقت لذالك وقتا جاز والا لا .

وقال ابن عابدین رحمه اللّٰه : (تحت قوله جاز) لانه اجیر وحد وشرطه بیان الوقت وقوله والالا ای والحطب للعامل .

(جـ ٦ ، کتاب الاجارہ)

وفیه فلو لم یوقت وعین الحطب فسد والحطب للمستاجر وعلیه اجر مثله . (امداد الفتاویٰ : ۳/۳۷۳)

مذکورہ عبارت سے ثابت ہوا کہ اگر ان کو ماہانہ یا سالانہ ملازم رکھے اور اجرت وقت کی ادا کرے چاہے مچھلی ملے یا نہ ملے تو یہ معاملہ جائز ہے، اجرت حلال ہوگی، مچھلی جو ملے سب مالک کی ہوگی اور اگر وقت مقرر نہ کرے بلکہ مزدوروں کو جال حوالہ کر کے شکار کے لئے بھیجے اور مچھلی کی کچھ مقدار کو اجرت ٹھہرائے جیسا کہ فی زمانہ مروج ہے یہ صورت ناجائز ہے یہ اجارہ باطل ہوگا، مچھلی شکار کرنے والے کی ملک ہوگی، جال والے کو جال کی اجرت مثل ملے گی۔

(ھکذا فی امداد الفتاویٰ : ۳/۳۷٦)

رشوت لینے والے ملازم کی تنخواہ کا حکم:

اگر کوئی ملازم سرکاری ہو یا پرائیوٹ دوران ڈیوٹی رشوت لیتا ہو اس کی تنخواہ حلال ہوگی یا نہیں؟ اس بارے میں حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رشوت اکل بالباطل ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے باطل طریقہ پرلوگوں کے مال کھانے کوحرام قرار دیا۔

قولہ تعالیٰ : ﴿ ولا تا کلوا اموالکم بینکم بالباطل ﴾

لہٰذا رشوت کھانا تو حرام ہے، البتہ نوکری میں حلال کام انجام دے اور جو وقت طے ہو اس میں مکمل ڈیوٹی کرے تو اس کام کی تنخواہ حلال ہوگی۔

(ماخوذ از امداد الفتاویٰ بتغیر : ۳۷۸/۳)

رشتہ طے کرانے پر اجرت لینے کا حکم:

اس زمانے میں بعض لوگوں نے رشتہ طے کرانے کو بطور پیشہ کے اختیار کرلیا ہے کیا شرعاً اس عمل پر اجرت لینا جائز ہے یا نہیں؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ رشتہ طے کرانا اس کی حیثیت سفارش کی ہے اور سفارش ایک باعث اجر وثواب عمل ہے، لیکن یہ عمل شرعاً غیر متقوم ہے، لہٰذا اس پر اجرت لینا ناجائز ہے۔

لما فی امداد الفتاویٰ: لانہ لم ینقل تقومہ وتقوم المنافع بغیر القیاس فمالم ینقل لایجوز القول بتقومہ وایضاً فلا تعب فی الشفاعة ولایعطون الاجر علیھا من حیث انہ عمل فیہ مشقة بل من انھا مؤثرة بالوجاھة والوجاھة وصف غیر متقوم فجعلوا اخذ الاجر علیھا رشوة وسحتاً . (امداد الفتاویٰ : ۳۴۲/۳)

ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی پر اجرت لینا حرام ہے:

بلا معاوضہ ایصال ثواب کرنا جائز ہے کار ثواب ہے، اپنے طور پر صدقات نافلہ، یا تلاوت یا تسبیح وتہلیل وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچانا حدیث سے ثابت ہے البتہ ایصال ثواب کے لئے اجتماع کا اہتمام اس میں رسم ورواج کی پابندی کرنا اس کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا سب امور بدعت ہونے کی بناء پر ناجائز ہیں۔

نیز اس پر اجرت لینا اور دینا بھی حرام ہے، چنانچہ حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، "قرأة القرآن عند القبر" اور اس پر اجرت کو عالمگیریہ اور جوہرہ میں اگرچہ جائز لکھا ہے جبکہ مدت متعین کر کے معاملہ کیا جائے لیکن عالمگیریہ وغیرہ کے اس فتویٰ کی علامہ شامی رحمہ اللہ نے

تردید وتغلیط کی ہے اس لئے صحیح یہ ہے کہ "قرأۃ قرآن" پر اجرت لینا حرام ہے۔

لکونہ استجارا للطاعۃ وھو لایجوز واستثناء التعلیم والاذان والامامۃ للضرورۃ ولا ضرورۃ فیہ کما صرح بہ فی ردالمحتار: ۵/۵۲. (امداد الاحکام: ۳/۵۵۸)

مدارسِ دینیہ کا عقد اجارہ مسانہہ ہے:

مدارس دینیہ میں جو مدرسین ہوتے ہیں یہ اجیر خاص ہیں، جن کا عقد اجارہ عمل کی بجائے وقت پر ہے، جس کی مدت عرف مدارس دینیہ میں ایک سال ہے وہ شعبان اور رمضان کی تنخواہ کے بھی حقدار ہیں، البتہ اگر بوقت عقد اس بات کی تصریح کردی گئی تھی کہ یہ تعاقد آخر شعبان تک ہے تو رمضان کی تنخواہ کا استحقاق نہیں، یعنی یہ قاعدہ مقرر کرے کہ ہمارا معاہدہ یکم شوال سے ۲۹ شعبان تک ہے، اس کے بعد نیا معاہدہ ہوگا۔

(اس بارے میں مزید تفصیلات احسن الفتاوی: ج ۷، کتاب الاجارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کا حکم:

وکالت کا پیشہ اختیار کرنا فی نفسہ جائز ہے، اس میں جائز طریقہ پر مقدمہ کی پیروی کرکے اجرت لینا بھی جائز ہے البتہ اس زمانے میں چونکہ وکیل کو جھوٹے مقدمات کی پیروی کرنا پڑتی ہے، جبکہ ظالم کی ظلم میں مدد کرنا حرام ہے، لہٰذا جھوٹے مقدمات کی پیروی سے جو کمائی حاصل ہوگی وہ حرام ہوگی اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اس لئے جھوٹے مقدمات کی پیروی سے اجتناب کرنا لازم ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ﴾ کہ گناہ اور ظلم میں کسی کے ساتھ تعاون مت کرو۔

نمازِ جنازہ پر اجرت لینا ناجائز ہے:

نمازِ جنازہ ایک عبادت ہے اور فرض کفایہ ہے جس طرح تلاوت قرآن مجید پر روپیہ پیسہ لینا جائز نہیں اسی طرح جنازہ پڑھانے والے کو بھی اجرت دینا لینا جائز نہیں۔

(ماخوذ از عزیز الفتاوی: ص ۶۳۶)

گندم کی کٹائی کی اجرت میں گندم دینا:

گندم، دھان وغیرہ کی فصل کی کٹائی کی میں گندم کو بطور اجرت دینے کا کیا حکم ہے اس

بارے میں ایک سوال جواب احسن الفتاویٰ سے نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: آج کل لوگ عام طور پر گندم اور چاول کی فصل کٹوا کر گندم اور چاول کی گٹھریاں اجرت میں دیدیتے ہیں یہ مرض گاؤں میں زیادہ ہے، مزدور پیسے بالکل نہیں لیتے زمینوں کے مالک اس بارے میں مجبور ہیں اور یہ مرض تقریباً عموم کی صورت اختیار کر گیا ہے، حالانکہ فقہ کی رو سے جس چیز پر عمل ہو اسی سے اجرت دینا جائز نہیں ہے اس مسئلہ کا کوئی حل بتائیے جس سے مسلمان گناہ سے بچ جائے۔

جواب: یہ صورت ناجائز ہے کیونکہ عمل سے اجرت دینا ناجائز ہے نیز گٹھے مقدار میں مختلف ہوتے ہیں اس لئے یہ اجرت مجہول ہے۔

جواز کی صورت یہ ہے کہ جس رسی میں گٹھا باندھا جائے گا اس کا طول متعین کرلیا جائے اور یہ طے کرلیا جائے کہ مزدور کی کاٹی ہوئی فصل میں سے دینا شرط نہیں، بلکہ فلاں خاص قسم کے گندم کا اتنا بڑا گٹھا اجرت میں دیا جائے گا، خواہ وہ کہیں سے بھی دے۔ (احسن الفتاویٰ :۷/۳۱۲)

کتابیں کرایہ پر دینے کا حکم:

بعض دکان دار کتابیں کرایہ پر دے کر کمائی حاصل کرتے ہیں اسی طرح بعض لوگ قرآن کریم کے سپارے قرآن خوانی کے لئے کرایہ پر دیتے ہیں، شرعاً یہ اجارہ ممنوع ہے اگر کسی نے لیکر مطالعہ کرلیا تو اس پر اجرت لازم نہیں۔ (ماخوذ از فتاویٰ محمودیہ : ٤/٣٥٩)

وفي الهندية قال : ولو استاجر كتبا ليقراء فيها شعراً كان اوفقها او غير ذالك لايجوز ولا اجرله وان قراء، و كذالك اجارة المصحف، و كان هذا كله نظير من استاجر كرماً ليفتح له بابه فينظر فيه للاستئناس من غير ان يدخله الخ .

(عالمگیریه : ٤/ ٥٠٨ الاستئجار على الطاعة)

ناول کرایہ پر دینا:

بعض لوگ دکان میں مختلف قسم کے فحش ناول قصہ کہانی کی کتابیں رکھتے ہیں ان کو کرایہ پر دیکر آمدنی حاصل کرتے ہیں، اولاً تو فحش تصاویر والے لیٹریچر اسی طرح ناول، جرائم پیشہ لوگوں کے حالات پر مشتمل قصے یا فحش اشعار وغیرہ اسی طرح اہل باطل کے خیالات کا مطالعہ کرنا بھی عوام

کے لئے گمراہی کا سبب ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے اس کے لئے کتب فراہم کرنا یہ ناجائز کام میں تعاون ہونے کی وجہ سے گناہ کا کام ہے، ثانیاً فی نفسہ کتابوں کو کرایہ پر دیکر اجرت حاصل کرنا بھی شرعاً ممنوع ہے، خواہ وہ کتابیں اچھی ہوں، چہ جائیکہ ایسے مخرب اخلاق کتابوں کو کرایہ پر دیا جائے۔ (حوالہ بالا ملاحظہ فرمائیں) اس کی آمدنی بطریق اولیٰ حرام ہوگی۔

کرایہ پر دی ہوئی چیز گم ہو جانے کی صورت میں ضمان کا حکم:

اگر کسی نے کوئی چیز کرایہ پر لی پھر اس کے ہاتھ سے گم ہوگئی اس پر ضمان لازم ہوگا یا نہیں اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اگر اس کرایہ دار نے مکمل حفاظت کا اہتمام کیا اس کے باوجود گم ہوگئی تو ضمان لازم نہیں ورنہ لازم ہے۔ اس بارے میں ایک سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: ایک شخص میری دکان سے سائیکل کرایہ پر لے گیا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے سائیکل کارخانہ کے دروازہ پر رکھی تھی لیکن جب میں واپس آیا تو سائیکل وہاں پر نہیں تھی، کسی شخص نے اٹھالی، اب دکاندار کو اس سائیکل کی قیمت لینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: وہ سائیکل کرایہ دار کے ہاتھ میں امانت تھی اس کی حفاظت لازم تھی اگر وہ جگہ جہاں سائیکل رکھی تھی محفوظ جگہ نہیں ہے وہاں سے کسی کے اٹھا لینے کا اندیشہ تھا، پھر بھی حفاظت کے انتظام کئے بغیر وہاں رکھ دی اور کسی نے اٹھالی تو حفاظت میں کوتاہی کی جس کی وجہ سے دکاندار کو ضمان وصول کرنے کا حق حاصل ہے ورنہ نہیں۔ (فتاوی محمودیة: ۱۲/۴۳۲)

تراویح میں ختم قرآن پر اجرت لینا حرام ہے:

بیس رکعت تراویح جماعت کے ساتھ ادا کرنا سنت موکدہ ہے اور اگر نیک صالح حافظ قرآن میسر ہو جائے تو اس سے ایک ختم قرآن سننا بھی سنت ہے اور بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے، اگر کوئی ایسا صالح حافظ قرآن میسر نہ ہو جو بلا اجرت قرآن سنائے تو اجرت لیکر قرآن سنانے والے حافظ کی اقتداء میں تراویح پڑھنے کا کیا حکم ہے اس بارے میں ایک سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں جو امداد الاحکام میں مذکور ہے۔

سوال: زید و عمر ایک ہی محلّہ کے رہنے والے ہیں اور اس محلّہ میں ایک ہی مسجد ہے، جس میں جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہے، زید نے اس مسجد میں ختم تراویح کے لئے اجرت پر ایک حافظ مقرر کیا، عمرو اس فعل کو حرام جانتا ہے اور حافظ کی اجرت کی شرط سے منکر ہے۔ اس حالت میں عمرو

ختم تراویح میں شریک ہوسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: جو حافظ اجرت پر ختم قرآن شریف کے لئے رکھا گیا ہے، اگر وہ اس تنخواہ میں مہینہ بھر پانچوں نمازوں کی امامت بھی کریگا، تو اس کو واضح کر کے سوال کیا جائے اور اگر ایسا نہیں تو اس کے پیچھے قرآن سننے سے ثواب نہ ملے گا اور ایسا حافظ جو کہ فاسق بھی ہے، اس لئے اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے، پس عمرو اس حالت میں الگ نماز پڑھ لے، اس حافظ کے پیچھے نہ پڑھے۔

قال في مراقي الفلاح ولذا كره امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدين فتجب اهانتهٗ شرعاً، فلايعظم بتقديمه، للامامة و اذا تعذر منعهٗ ينتقل عنه الى غيره للجمعة وغيرها و ان لم يقم الجمعة الا هو يصلى معه اهـ . (ص ١٧٦)

اور اگر اپنے گھر میں تراویح کی جماعت کر لے تو اور بھی اچھا ہے، باقی فرضوں کی جماعت ترک نہ کرے، اگر اس امام مذکور کے سواء اور کسی کے پیچھے فرض جماعت نہ ملے تو اس کے ہی پیچھے پڑھ لے۔

والاصل فيه ما حققه ابن عابدين في رسالته "شفاء العليل و بل الغليل" من حرمة الاجارة والاستيجار على مجرد تلاوة القرآن و لا يخفى ان الحافظ الذى لايؤم في الصلوات الخمس وانما للتراويح ويختم فيها يأخذ الاجر على ذالك انما هو يأخذ الاجر على الامامة فامامة التراويح بمجردها لا يجوز أخذ الأجر عليها لعدم الضرورة التى بها ابيح الاجرة في تعليم القرآن وامامة المكتوبة والأذان وغيرها فانها فرائض او سنن موكدة من شعائر الاسلام وامامة التراويح سنة كفاية وتتأتى بقرأئة سورةٍ قصيرةٍ من اخر القرآن ولا تتوقف على الختم، قال في مراقي الفلاح: وسنن ختم القرآن فيها مرة في الشهر على الصحيح، وان مل به القوم قرأ بقدر مالا يودى الى تنفيرهم في المختار، لان تكثير القوم افضل من تطويل القرأة وبه يفتى، قال الزاهدى : يقرأ كما في المغرب اى بقصار المفصل بعد الفاتحة اهـ.

(صـ ۲٤۱)

قال الصدر الشهيد: الجماعة سنة على الكفاية فيها حتى لو اقامها البعض في المسجد بجماعة و باقي اهل المحلة اقامها منفرداً في بيته لايكون تاركاً للسنة لأنه يروى عن افراد الصحابة التخلف اهـ. (من مراقي الفلاح: صـ ٤۲۰)

بخلاف جماعة المكتوبات فانها واجبة على العين او سنة مؤكدة وايضاً فانها من الشعائر فتحققت الضرورة فيها دون جماعة التراويح فلايجوز أخذ الأجرة على امامتها مجردة ولا على الختم فيها والتخلف عن مثل هذا الامام اولیٰ. والله اعلم.

(امداد الاحکام: ۳/۵۵۹، کتاب الاجارة)

جن ہوٹلوں میں شراب خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہو، ان میں ملازمت کا حکم:

سوال: وہ مسلمان طلبہ جو حصول تعلیم کے لئے غیر مسلم ممالک کا سفر کرتے ہیں وہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان کے معاشی اخراجات کے لئے وہ رقوم ناکافی ہوتی ہیں جو ان کے والدین وغیرہ کی طرف سے ان کو بھیجی جاتی ہیں، چنانچہ وہ طلبہ معاشی اور تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہاں ملازمت اختیار کرلیتے ہیں اور بعض اوقات ان طلبہ کو وہاں ایسے ہوٹلوں میں ملازمت ملتی ہے جن میں شراب اور خنزیر کی خرید وفروخت ہوتی ہے، کیا ان طلبہ کے لئے ایسے ہوٹلوں میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے؟

سوال: بعض مسلمان غیر مسلم ممالک میں شراب بنا کر بیچنے کا پیشہ اختیار کرلیتے ہیں، کیا اس طرح غیر مسلموں کے لئے شراب بنا کر بیچنا جائز ہے؟

جواب: ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم کے ہوٹل میں ملازمت اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ وہ مسلمان شراب پلانے یا خنزیر یا دوسرے محرمات کو غیر مسلموں کے سامنے پیش کرنے کا عمل نہ کرے اس لئے کہ شراب پلانا یا اس کو دوسروں کے سامنے پیش کرنا حرام ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لعن اللّٰہ الخمر وشاربها وساقيها وبائعها ومبتاعه، عاصرها ومعتصرها وحاملها والمحمولة اليه.

اللہ جل شانہ نے شراب پر اس کے پینے والے اس کے پلانے والے، اس کے بیچنے والے، اس کے خریدنے والے، اس کو نچوڑنے والے اور جس کے لئے وہ نچوڑی جائے اور اس کے اٹھانے والے اور جس طرف اٹھا کر لے جائے، ان سب پر لعنت فرمائی ہے۔

(ابو داؤد، كتب الاشربه، باب العنب يعصر للخمر، حديث نمبر ٣٦٧٤، ٣٢٦/٣)

ترمذی شریف میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

لعن رسول اللّٰہصلى اللّٰه عليه وسلم فى الخمر عشرة عاصرها ومعتصرها وشاربها وحاملها والمحمولة اليه وساقيها وبايعها وآكل ثمنها والمشترى لها والمشتراة له.

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کے متعلق دس اشخاص پر لعنت فرمائی ہے شراب نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو پینے والا، اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، پلانے والا، بیچنے والا، شراب بیچ کر اس کی قیمت کھانے والا، خریدنے والا، جس کے لئے خریدی جائے۔

(ترمذى شريف، كتاب البيوع، باب ماجاء فى بيع الخمر، حديث نمبر ١٣١٣، ٣٨٠/٢)

ابن ماجہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ اسی طرح ہیں:

عاصرها، ومعتصرها، والمعصورة له وحاملها والمحموله له وبائعها والمبيوع له وساقيها والمستقاة له۔

شراب نچوڑنے والا، نچوڑنے والا، جس کے لئے نچوڑی جائے، اس کو اٹھانے والا، جس کے لئے اٹھائی جائے، اس کو فروخت کرنے والا، جس کو فروخت کی جائے، پلانے والا، جس کو پلائی جائے۔

(ابن ماجة: ١١٢٢/٢، كتاب الاشربة، باب لعنت الخمر على عشرة اوجه،

حدیث نمبر ۳۳۸۱)
امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث روایت کی ہے:

قالت : لما نزلت الایات من آخر سورة البقرة خرج رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فأقرأ هن علی الناس، ثم نهی عن التجارة فی الخمر.

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب سورہ بقرہ کی آخری آیات نازل ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے باہر تشریف لائے اور وہ آیات لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی تجارت اور خرید وفروخت کی ممانعت فرمادی۔

(بخاری شریف، کتاب البیوع، کتاب المساجد، و کتاب التفسیر، تفسیر سورة البقرة، مسلم شریف کتاب البیوع، باب تحریم بیع الخمر)

امام مسلم رحمہ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول مرفوعاً نقل کیا ہے کہ:
جس ذات نے شراب پینے کو حرام قرار دیا ہے، اسی ذات نے اس کی خرید وفروخت بھی حرام قرار دی ہے۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں یہ روایت نقل کی ہے کہ:

عن عبد الرحمن بن وعلة قال سالت ابن عباس فقلت انا بارض لنا بها الكروم، وان اكثر غلا نها الخمر، فذكر ابن عباس ان رجلا اهدى الى النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم راوية خمر، فقال له رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: ان الذی حرم شربها حرم بیعها .

عبدالرحمٰن بن وعلۃ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ہم ایسے علاقے میں رہتے ہیں جہاں ہمارے پاس انگور کے باغات ہیں اور ہماری آمدنی کا بڑا ذریعہ شراب ہی ہے اس کے جواب میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شراب کی ایک مشک بطور ہدیہ کے پیش کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے فرمایا: جس ذات نے

اس کے پینے کو حرام قرار دیا ہے اس کی خرید و فروخت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

(مسند احمدؒ : ١/ ٢٤٤)

مندرجہ بالا احادیث سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شراب کی تجارت بھی حرام ہے اور اجرت پر اس کو ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر لے جانا، یا پلانا سب حرام ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فتوی سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگر کسی علاقے میں شراب بنانے اور اس کی خرید و فروخت کا عام رواج ہو، وہاں بھی کسی مسلمان کے لئے حصول معاش کے طور پر شراب کا پیشہ اختیار کرنا حلال نہیں۔

اور میرے علم کے مطابق فقہاء میں سے کسی فقیہ نے بھی اس کی اجازت نہیں دی۔

(فقہی مقالات : ١/ ٢٥٢)

تعطیلات کی تنخواہوں کا حکم:

یہاں ایک مسئلہ یہ ہے کہ مدرسین اور خادمین دین کو جن کا ہفتہ میں ایک دن تعطیل کا ہوتا ہے یا سال میں بعض طویل تعطیلات دی جاتی ہیں ان کی تنخواہیں دی جائیں گی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ مدرسہ کی انتظامیہ کی حیثیت عوام کی طرف سے وکیل اور نمائندہ کی ہوتی ہے اور مدرسین بالواسطہ عوام کے اجیر ہوتے ہیں، اس طرح چندہ دینے والے عام لوگ مدرسین کے لئے جتنے دنوں کی رخصت باتنخواہ اور عام تعطیل کو گوارہ کریں اتنے دنوں اساتذہ کے لئے اس کا حق حاصل ہے، یہی حال بیماری کی رخصت کا بھی ہے، اب ظاہر ہے کہ ہر چندہ دینے والے سے اس کی تحقیق اور اس پر رائے لینا دشوار ہی نہیں تقریباً محال ہے، ان حالات میں دراصل عرف و عادت کا اعتبار ہے اور عرف یہ ہے کہ مدرسہ کی بڑی تعطیلات عموماً مشہور ہیں اور باتنخواہ اتفاقی اور مرض کی وجہ سے رخصت کا ضابطہ بھی عام ہے، اس کے باوجود عام مسلمان، مدرسوں کا تعاون کرتے ہیں اس پر اعتراض نہیں کرتے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں یہ رخصتیں اور تعطیلات گوارہ ہیں، لہٰذا ان کا تنخواہ لینا اور دینا جائز ہوگا۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم مصریؒ نے ''العادة محكمة'' کے اصول کے تحت اسے جائز رکھا ہے اور یہی رائے علامہ شامیؒ کی بھی ہے اور فقیہ ابواللیثؒ کی بھی، فرماتے ہیں:

حيث كانت البطالة معروفة في يوم الثلاثاء والجمعة وفي

رمضان والعيدين يحل الاخذ وكذا لو بطل في غير معتاد لتحرير درس الااذا نص الواقف على تقييد الدفع باليوم الذي يدرس فيه ... قال الفقيه ابو الليث ان ياخذ الاجر من طلبة العلم في يوم لا درس فيه ارجو ان يكون جائزاً . (در المختار : ٣٨/٣)

ترجمہ: جہاں منگل اور جمعہ نیز رمضان کی عیدین میں تعطیل رہا کرتی ہو ان دنوں کی تنخواہ لینا حلال ہے، ایسے ہی اگر خلاف عادت کسی دن درس قلم بند کرنے کے لئے فرصت دیدی تو بھی تنخواہ لے سکتا ہے سوائے اس کے کہ وقف کرنے والا صرف ان ہی ایام کو تنخواہ دینے کی قید لگادے جس میں درس ہوا کرے۔ فقیہ ابواللیثؒ نے کہا کہ اگر استاد طلبہ سے ایسے دن کی اجرت بھی لے جس میں درس نہ ہوا ہو تو امید ہے کہ یہ جائز ہوگا۔ (جدید فقہی مسائل : ١/ ٣٩٣)

ریلوے/بس ٹکٹ کی حیثیت:

ریلوے، بس ٹکٹ وغیرہ کی حیثیت اجارہ کے وثیقہ کی ہے، یہ گویا اس بات کی سند ہے کہ ہم نے کرایہ ادا کردیا ہے، اس لئے ہمیں سواری کرنے حق حاصل ہے، عام اجارہ میں اور اس میں صرف اس قدر فرق ہے کہ یہاں اجرت یعنی کرایہ پہلے وصول کرلیا جاتا ہے تاکہ نظم میں سہولت ہو۔

بس اور ریلوے میں اصل مالک اور ''آجر'' حکومت ہوتی ہے، مسافروں کی حیثیت کرایہ داروں اور ''مستاجروں'' کی ہے، ٹکٹ دینے والے حکومت کے وکیل ہوتے ہیں، جب یہ بات معلوم ہے کہ حکومت نے بلاٹکٹ سفر کی اجازت نہیں دی ہے تو اب کسی صورت بلاٹکٹ سفر کرنا درست نہیں، چاہے ریلوے اور بس کے سرکاری عہدہ دار بلاٹکٹ چلنے کی اجازت ہی کیوں نہ دے دیں، ٹکٹ کے بغیر سفر سفرِ معصیت ہے اور گویا اس کی حیثیت غاصب کی ہے۔

(ماخوذ از جدید فقہی مسائل)

بینک کا اپنے گاہک کو اولاً سامان خریداری کا وکیل بنانا، پھر اس کے ساتھ کرایہ داری کا معاملہ کرنا:

سوال: اسلامی ترقیاتی بینک کرایہ پر دینے کا جو معاملہ کرتا ہے وہ اس طرح کرتا ہے کہ مثلاً: ذرائع نقل وحمل جیسے آئل ٹینکر، جہاز وغیرہ کی خریداری اور پھر ان کو آگے کرایہ پر دینے کے لئے

سرمایہ کاری کرتا ہے، یا بعض اوقات ممبر ممالک کے لئے ان کے صنعتی منصوبوں کے اسباب اور سامان کی خریداری اور پھر ان کو کرایہ پر دینے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ اسلامی ترقیاتی بینک مندرجہ ذیل پر کرایہ کا معاملہ کرتا ہے:

(الف) جس پروجیکٹ میں بینک ''کرایہ داری'' کے طریقے پر سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہے، جب اس پروجیکٹ میں بینک کو مالی فائدے کے حصول کا یقین ہو جاتا ہے، اس وقت بینک اس پروجیکٹ کو چلانے والی کمپنی (مستاجر) کے ساتھ ایک معاہدہ کر لیتا ہے اور بینک اس کمپنی کو اپنے نام پر مطلوبہ سامان خریدنے کی اجازت دے دیتا ہے، (جس کی تعیین اور تخمین مصارف کی تحدید ایگریمنٹ میں طے شدہ ہوتی ہے) اور معاہدہ کے مطابق بینک سپلائرز کو سامان کی قیمت ایگریمنٹ میں طے شدہ مدتوں کے مطابق براہ راست ادا کر دیتا ہے۔

(ب) اس کے بعد کمپنی (مستاجر) بینک کی طرف سے نائب بن کر اس سامان پر قبضہ کرتی ہے اور ایگریمنٹ میں بیان کردہ اوصاف کے مطابق ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں یقین حاصل کر لیتی ہے اور پھر اگر اس مشینری کو نصب کرنے کی ضرورت ہو تو اس کی تنصیب کی نگرانی کرتی ہے، تاکہ ایگریمنٹ کے مطابق پورا کام صحیح طور پر انجام پائے۔

(ج) پروجیکٹ پر کام کرنے والی کمپنی کی معلومات کے مطابق اور کمپنی اور بینک کے فنی ماہرین کے اندازوں کے مطابق سامان کی خریداری اور اس کی تنصیب کی عملی تنفیذ جس کے بعد اس مشینری سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جاسکے، ان دونوں کاموں کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کی تحدید ''ایگریمنٹ'' کرے گا، تاکہ اس کی بنیاد پر جو وقت مقرر کیا گیا ہے، اس کے بعد ''کرایہ داری'' کی ابتداء ہو سکے اور اس کے بعد سامان کرایہ پر دینے کے قابل ہو سکے اور اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

(د) مدت کرایہ داری کے دوران کرایہ دار عقد کرایہ داری میں طے شدہ قسطیں ادا کرتا رہے گا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کمپنی بینک کی مفاد کی خاطر سامان کی حفاظت اور اس کی انشورنس کی ذمہ داری بھی لے گی۔

(ہ) ایگریمنٹ کے مطابق بینک اس بات کا پابند ہوگا کہ مدت کرایہ داری پوری ہونے کے بعد بینک اس سامان کو معمولی قیمت پر کرایہ دار کمپنی کو فروخت کر دے گا اور کرایہ دار طے

شدہ تمام قسطیں اور دوسرے تمام التزامات ایگریمنٹ کے مطابق ادا کریگا۔

کیا بینک کے لئے مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق کرایہ داری کا معاملہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: کسی چیز کو کرایہ پر دینے کا معاملہ دو طریقوں سے ممکن ہے۔

(۱) پہلی صورت یہ ہے کہ بینک اشیاء اور سامان کو خود خریدے اور پھر بطور مالک کے اس پر قبضہ بھی کرے اور پھر بینک وہ چیز مدت معلومہ اور اجرت معلومہ پر اپنے گاہک کو کرایہ پر دیدے، اس صورت میں مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اشیاء اور سامان دوبارہ بینک کے قبضہ میں آجائے گا اور پھر فریقین کو اختیار ہوگا، چاہیں تو دوبارہ تجدید عقد اجارہ کرلیں یا فریقین آپس میں اس وقت کوئی ثمن طے کر کے عقد بیع کرلیں اور بینک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اشیاء اور سامان کو دوسرے گاہک کو کرایہ پر دیدے اور یا دوسرے گاہک کے ہاتھ فروخت کردے۔

مذکورہ بالا طریقہ شرعاً بالکل جائز ہے، اس کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں۔

(۲) دوسری صورت جس کے بارے میں سوال بھی کیا گیا ہے، وہ یہ کہ بینک ایسی اشیاء اور سامان کرایہ پر دے جو عقد اجارہ کے وقت اس کی ملکیت میں نہیں ہے، بلکہ عقد اجارہ کرنے کے بعد بینک وہ سامان سپلائر سے اپنے گاہک کے نام ہی پر خریدے اور پھر بینک اپنے گاہک کو اس سامان پر قبضہ کرنے اور اس کو وصول کر کے اپنے یہاں نصب کرنے کا وکیل بنادے اور بینک ایک تاریخ مقرر کردے گا کہ فلاں تاریخ پر عقد بیع مکمل ہو کر عقد اجارہ شروع ہو جائے گا، چنانچہ اس مقررہ تاریخ کے بعد بینک اس چیز کا کرایہ گاہک سے وصول کرتا رہے گا، یہاں تک کہ عقد اجارہ کی مدت معاہدہ کے مطابق پوری ہو جائے اور بینک اپنے تمام واجبات گاہک سے وصول کرلے تو پھر بینک وہ سامان معمولی ثمن پر اسی گاہک کے ہاتھ فروخت کردیگا۔

اس دوسری صورت میں فقہی اعتبار سے چند امور قابل غور ہیں:

۱۔ جس وقت بینک عقد اجارہ کرتا ہے، وہ اس چیز کا مالک بھی نہیں ہوتا، اس پر قبضہ ہونا تو دور کی بات ہے اور جس چیز کا انسان مالک نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اسی طرح جو چیز انسان کے قبضے میں نہ ہو، اس کو کرایہ پر دینا بھی باطل ہے، اس لئے کہ یہ "ربح مالم یضمن" کی قبیل سے ہے، جو حدیث کی رو سے منھی عنہ ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ کی الشرح الکبیر میں ہے:

وكذلك لا يصح هبته ولا رهنه، ولا دفعه اجرة، وما اشبه ذلك، ولا التصرفات المنعقدة الى القبض، لانه غير مقبوض، فلا سبيل الى اقباضه .(الشرح الكبير لابن قدامة : ١١٩/٤)

اسی طرح ہبہ رہن اور اجارہ اور دوسرے معاملات جو قبضہ کے ساتھ تام ہوتے ہیں، قبضہ میں آنے سے پہلے ان کو ہبہ کرنا، رہن رکھنا یا کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ چیز قبضہ میں نہیں ہے، لہٰذا دوسرے کو اس پر قبضہ کرانا بھی ممکن نہیں ہے۔

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"ومنها (اى من شرائط صحة الاجارة) ان يكون مقبوض المؤجر اذا كان منقولاً، فان لم يكن فى قبضه فلا تصح اجارته ."

(الفتاوى الهنديه : ٤١١/٤)

''اجارہ کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اگر وہ چیز منقول ہے تو موجر کے قبضے میں ہو، اگر وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے تو پھر عقد اجارہ درست نہیں۔''

شوافع کا بھی صحیح قول یہی ہے۔(دیکھئے، مغنی المحتاج : ٦٨/٢ ـ ٦٩)

اس مشکل کا حل یہ ہے کہ جس وقت بینک اور گاہک کے درمیان معاہدہ ہو، اس وقت عقد اجارہ کو منعقد نہ مانا جائے، بلکہ اس معاہدہ کو عقد اجارہ کے لئے محض ایک وعدہ تصور کیا جائے، پھر جب گاہک سپلائر سے سامان وصول کر کے اپنے قبضے میں لے آئے اور اپنے یہاں نصب کرنے کا کام مکمل ہو جائے اس کے بعد بینک اپنے گاہک کے ساتھ اس تاریخ پر بالمشافہ یا تحریری مراسلت کے ذریعہ عقد اجارہ کرے اور عقد اجارہ کی اس تاریخ سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا، لہٰذا اگر وہ سامان بلا تعدی کے ہلاک اور ضائع ہو جائے تو گاہک ضامن نہیں ہوگا۔

۲۔ اصول یہ ہے کہ اگر کرایہ کی چیز پر آفات سماویہ آ جائے تو اس صورت میں مستاجر ضامن نہ ہوگا، جب تک مستاجر اس چیز کی حفاظت میں تعدی سے کام نہ لے، اس اصول کے پیش نظر مدۃ اجارہ کے دوران حوادث اور آفات سے حفاظت کے لئے اس سامان کی انشورنس کرنا ضروری ہو تو بینک بحیثیت مالک کے اس کا انشورنس کرائے۔

یہ انشورنس بھی اس وقت جائز ہے جب وہ تعاونی اور جائز انشورنس ہو، اگر وہ انشورنس

دھوکہ، سود، قمار وغیرہ پر مشتمل ہو تو ایسا انشورنس کرانا شرعاً جائز نہیں۔

۳۔ سوال میں عقد اجارہ مذکور ہے، اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد موجر وہ سامان معمولی قیمت پر مساجر کو فروخت کردے گا۔

فقہی اعتبار سے اس کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اس سامان کی بیع اجارہ کے ختم کے ساتھ معلق کردی جائے، اس صورت میں بیع دو چیزوں کے ساتھ مشروع ہوگی ایک یہ کہ مدت اجارہ پوری ہو جائے اور دوسرے یہ کہ مستاجر کا ذمہ تمام واجبات سے فارغ ہو جائے یہ صورت شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے اور مستقبل کے کسی زمانے کی طرف عقد بیع کی اضافت کرنا بھی درست نہیں ہے۔"

علامہ خالد الاتاسی شرح المجلہ میں فرماتے ہیں:

"واما الذی لایصح نعلیقه بالشرط شرعاً فضا بطه کل ماکان من التملیکات ...... کالبیع والاجارة."

(شرح المجلة العدلية : ١/ ٢٣٤)

شرعاً جن عقود کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا درست نہیں ہے، اس کا اصول یہ ہے کہ ہر وہ عقد جن کا تعلق تملیکات سے ہو ..... مثلاً عقد بیع اور عقد اجارہ۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس وقت بیع نہ کی جائے، بلکہ وعدہ بیع کرلیا جائے جو عقد اجارہ کے اندر مشروط ہے۔

اس صورت میں ایسی شرط ہوگی جو مقتضاء عقد کے خلاف ہے اور اس جیسی شرط حنفیہ اور شوافع کے نزدیک عقد اجارہ کو فاسد کر دیتی ہے جہاں تک مالکیہ اور حنابلہ کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک بہت سی شرطیں جو اگر چہ مقتضاء عقد کے خلاف ہوں، لیکن وہ شرطیں عقد کو فاسد نہیں کرتیں، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایک ہی صفقہ میں اجارہ کے اندر بیع کی شرط لگانا جائز ہوگا۔

چنانچہ شرح الخرشی علی مختصر الخلیل میں ہے:

"ان الاجارة اذا وقعت مع الجعل فی صفقة واحدة فانها تکون

فاسدة لتنافر الاحكام بينهما، لان الاجارة لا يجوز فيها الغرر، و تلزم بالعقد، و يجوز فيها الاجل، ولا يجوز شئى من ذلك فى الجعل، بخلاف اجتماع الاجارة مع البيع فى صفقة واحدة، فيجوز سواء كانت الاجارة فى نفس المبيع، كما لو باع له جلوداً على ان يخرزها البائع للمشترى نعالا، او كانت الاجارة فى غير المبيع، كما لو باع له ثوباً بدراهم معلومة على ان ينسج له ثوبا آخر ."

(الخرشى على مختصر خليل : ٧ ـ ٤)

''اگر عقد اجارہ اور عقد جعل ایک ہی صفقہ میں کیا جائے تو یہ صورت فاسد ہے اس لئے کہ ''اجارہ'' اور ''جعل'' کے درمیان تنافر ہے، اس لئے کہ عقد اجارہ کے اندر ''غرر'' جائز نہیں، معاملہ کرنے سے اجارہ لازم ہو جاتا ہے اور اجارہ کے اندر مدت کی تعیین جائز ہے، جبکہ ''جعل'' میں اس میں سے کوئی بھی چیز جائز نہیں، بخلاف اس کے کہ اجارہ کو بیع کے ساتھ ایک صفقہ میں جمع کر دیا جائے، یہ صورت جائز ہے، چاہے وہ اجارہ اسی مبیع میں ہو، جس کی بیع ہوئی ہے، مثلاً: کوئی شخص کھال اس شرط پر فروخت کرے کہ بائع مشتری کے لئے اس کھال کے جوتے کاٹ کر بنا کر دے گا یا یہ صورت ہو کہ عقد اجارہ مبیع کے علاوہ کسی دوسری چیز میں ہو، مثلاً: کوئی شخص معین دراہم میں اس شرط پر کپڑا فروخت کرے کہ وہ اس کے لئے دوسرا کپڑا بن کر دے گا۔ (تو یہ صورت شرعاً جائز ہے)

مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ جواز اس وقت ہے جب بیع بھی حالاً ہو، موجل نہ ہو اور بیع کے اندر جو اجارہ مشروط ہو وہ بھی حالاً ہو، لیکن زیر بحث مسئلہ اس کے بالکل برعکس ہے، یعنی اس میں اجارہ تو حالاً ہے، لیکن اسی اجارہ کے اندر جو بیع مشروط ہے وہ مدت اجارہ کے ختم ہونے کے بعد منعقد ہوگی، اس مسئلہ کا صریح حکم اگر چہ مالکیہ کی کتابوں میں تو مجھے نہیں ملا، لیکن ان کتابوں کی عبارت سے یہ مفہوم ہو رہا ہے کہ ان کے نزدیک عقد کے اندر شرط لگانا بنیادی طور پر جائز ہے اور صرف دو صورتوں کے علاوہ کوئی شرط بھی عقد کو فاسد نہیں کرتی، ایک یہ کہ وہ شرط اس عقد کے منافی ہو، مثلاً: بائع اپنی چیز فروخت کرتے وقت یہ شرط لگا دے کہ مشتری اس چیز میں کوئی تصرف نہیں کرے گا، یا موجر اس شرط پر ایک چیز کرایہ پر دے کہ مستاجر اس سے نفع نہیں اٹھائے گا، چونکہ یہ

دونوں شرطیں مقتضاء عقد کے خلاف ہیں، اس لئے یہ عقد فاسد ہو جائے گا، دوسرے یہ کہ وہ شرط ایسی ہو جس کی وجہ سے ثمن مجہول ہو جائے، یا تو ثمن میں زیادتی ہو جائے یا کمی ہو جائے، اس قسم کی شرط سے عقد فاسد ہو جائے گا۔

(دیکھئے: مواهب الجليل للحطاب: ٤/٣٧٣، الخرشي ٥/٨٠ ـ ٨١، هداية المجتهدين: ٢/٣٣ ـ ١٣٤)

ظاہر ہے کہ موجر کا مدت اجارہ کے ختم کے ساتھ بیع کی شرط لگانا مندرجہ بالا دو صورتوں میں داخل نہیں ہے، اس لئے یہ صورت مالکیہ کے نزدیک جائز معلوم ہوتی ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ۔

بہر حال! مندرجہ بالا تفصیل کے بعد مالکیہ کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اس مسئلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک وعدہ بیع ہے جو اجارہ کے ساتھ مشروط ہے، لیکن اس صورت میں مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد بیع منعقد ہوگی، لہٰذا جب مدۃ اجارہ ختم ہو جائے اس وقت فریقین مستقل ایجاب وقبول کے ذریعہ بیع کا معاملہ کریں، اب چاہے وہ ایجاب وقبول بالمشافہ ہو، یا خط وکتابت کے ذریعہ ہو۔

زیر بحث مسئلہ کے جواز کی تیسری شکل اور بھی ہو سکتی ہے، جو میرے خیال میں چاروں ائمہ کے مسلک کے مطابق درست ہوگی، وہ یہ کہ وعدہ بیع کو اجارہ کے ساتھ مشروط نہ کیا جائے، بلکہ وہ وعدہ ایگریمنٹ میں ہو جائے، جس میں اسی بات کا وعدہ ہو کہ فریقین پہلے عقد اجارہ کریں گے اور پھر بیع کریں گے، پھر وعدہ کے مطابق وقت مقرر پر فریقین کے درمیان اجارہ ہو جائے، جس میں بیع کا ذکر نہ ہو، اس کے بعد جب اجارہ کی مدت ختم ہو جائے تو مستقل بیع کر لی جائے، جس میں کوئی شرط وغیرہ نہ ہو، اس طرح دونوں عقد مستقل اور غیر مشروط ہو جائیں گے اور اس طرح فریقین کے درمیان جو معاہدہ ہوگا۔ وہ تین باتوں پر مشتمل ہوگا

١. بینک گاہک کو سامان خریدنے کا وکیل بنائے گا
٢. گاہک یہ وعدہ کرے گا کہ وہ سامان وصول کرنے اور اس کو اپنے قبضے میں لانے اور نصب کرنے کے بعد اس کو کرایہ پر لے لے گا
٣. بینک یہ وعدہ کرے گا کہ اجارہ کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ سامان اس گاہک کو فروخت کر دے گا، اس معاہدہ کے مکمل ہو جانے کے بعد گاہک صرف سامان خریدنے کے سلسلے

میں بینک کا وکیل ہو جائے گا، پھر وکالت کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد وعدہ کے مطابق عقد اجارہ مستقل طور پر اپنے وقت پر منعقد ہوگا اور پھر وعدہ کے مطابق اجارہ کی مدت ختم ہو جانے کے بعد فریقین کے درمیان مستقل طور پر بیع منعقد ہو جائے گی۔

اور گاہک کی طرف سے اجارہ پر لینے کا وعدہ اور بینک کی طرف سے فروخت کرنے کے وعدہ کو دیانۃ تو پورا کرنا فریقین کے ذمے بالا جماع واجب ہے، جہاں تک قضاءً اس وعدہ کے ایفاء کا تعلق ہے، تو مالکیہ کے مذہب کے مطابق اگر وعدہ کرنے والے نے وعدہ کر کے موعود لہ کو کسی ایسے معاملے میں داخل کر دیا ہے جو اس وعدہ کی وجہ سے اس پر لازم ہوا ہے تو اس صورت میں قضاءً اس وعدہ کو پورا کرنا واجب ہے اور اگر وعدہ کرنے والا وعدہ خلافی کرے اور اس وعدہ خلافی کی وجہ سے موعود لہ کو کوئی مالی نقصان ہو جائے تو وعدہ کرنے والا اس مالی نقصان کا ضامن ہوگا۔

چنانچہ علامہ قرافی مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الفروق'' میں فرماتے ہیں:

قال سحنون :الذی یلزم من الوعد یقوله : اهدم دارك، وانا اسلفك ماتبنی به، واخرج الی الحج وانا اسلفك، او اشتر سلعة او تزوج امراة وانا اسلفك، لانك ادخلته بوعدك فی ذلك اما مجرد الوعد فلا یلزم الوفاء به، بل الوفاء به من مكارم الاخلاق .

(كتاب الفروق : ٤/ ٢٤_٢٥)

امام سحنون فرماتے ہیں کہ وہ وعدہ جو لازم ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ مثلاً: ایک شخص دوسرے سے یہ وعدہ کرے کہ تم اپنے گھر کو منہدم کردو، میں اس کو دوبارہ بنانے کے لئے قرض فراہم کروں گا، یا یہ کہے کہ تم حج کے لئے چلو، میں تمہیں خرچ کے لئے قرضہ دونگا، یا یہ کہے کہ تم یہ سامان خرید لو، یا فلاں عورت سے شادی کرلو، میں خرچ کے لئے قرضہ دوں گا (اس قسم کے وعدہ کو پورا کرنا قضاءً لازم ہے) اس لئے کہ اس وعدہ کے ذریعہ تم نے اس کو اس معاملے میں داخل کیا ہے، البتہ اگر محض وعدہ ہو، جس کے ذریعہ موعود لہ کو کسی معاملے کے اندر داخل نہ کرے تو اس وعدہ کو پورا کرنا قضاءً تو لازم نہیں، البتہ اس وعدہ کو پورا کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے۔

شیخ علیش مالکی رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ میں وعدہ کے لازم ہونے کے بارے میں تین اقوال ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"والرابع :يقضي بها ان كانت على سبب، ودخل الموعود بسبب العدة في شئي، وهذا هو المشهور من الاقوال . قال اصبغ سمعت اشهب سئل عن رجل اشترى من رجل كرما، فخاف الوضيعة فاتى ليستوضعه فقال له: بع وانا ارضيك قال: ان باع براس ماله او بربح فلاشئي عليه وان باع بالوضيعة كان عليه ان يرضيه ..... وهذا القول الذي شهره ابن رشد في القضاء بالعدة اذا دخل بسببها في شئي قال الشيخ ابو الحسن في اول كتاب الاول انه مذهب المدونة، لقولها في آخر كتاب الغرر، وان قال :اشتر عبد فلان وانا اعينك بالف درهم فاشتراه لزمه ذلك الوعد ، وهو قول ابن القاسم في سماعه من كتاب العارية وقول سحنون في كتاب العدة ."

(فتح العلى المالك : ۱/۲۵۵)

''چوتھے یہ کہ اس وعدہ کو قضاء لازم ہونے کا حکم دیا جائے گا، اگر یہ وعدہ کسی معاملے پر مبنی ہو اور اس وعدہ کی وجہ سے موعود لہ اس معاملے کو اختیار کرلے یہی قول زیادہ مشہور ہے۔ اصبغ فرماتے ہیں کہ میں نے اشہب سے یہ مسئلہ سنا کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے انگور خریدے، لیکن خریدنے کے بعد مشتری کو نقصان کا اندیشہ ہوا، چنانچہ وہ اس کی قیمت کم کرانے کے لئے بائع کے پاس آیا، تو بائع نے اس سے کہا کہ تم یہ انگور آگے فروخت کردو، اگر تمہارا نقصان ہوا تو میں اس کی تلافی کرکے تمہیں راضی کردوں گا، اس صورت میں اگر وہ مشتری وہ انگور اسی قیمت پر آگے فروخت کردے، جس قیمت پر اس نے خریدے تھے، یا منافع پر فروخت کردے تو اس صورت میں بائع کے ذمے کوئی چیز لازم نہیں ہوگی، لیکن اگر مشتری نقصان کے ساتھ فروخت کرے اس صورت میں بائع کے ذمے لازم ہے کہ وہ نقصان کی تلافی کرکے مشتری کو راضی کرے۔ علامہ ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو لیا ہے کہ قضاء ایسا وعدہ پورا کرنا لازم ہے، جس وعدہ کے ذریعہ موعود لہ کسی معاملے میں مبتلا ہو جائے، شیخ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کتاب اول کے ابتداء میں فرماتے ہیں کہ ''صاحبِ مدونہ'' کا بھی یہی مسلک ہے اس لئے کہ کتاب الغرر کے آخر میں ہے کہ اگر ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ تم فلاں شخص کا غلام خرید لو، میں ایک ہزار درہم کے ذریعہ تمہارے

ساتھ (ثمن کی ادائیگی میں) تعاون کروں گا، اگر اس نے وہ غلام خرید لیا تو اس صورت میں اس وعدہ کرنے والے کے ذمہ ایک ہزار درہم لازم ہو جائیں گے۔ کتاب العاریۃ میں ابن القاسم کا یہی قول مذکور ہے، امام سحنون کا بھی کتاب العدۃ میں یہی قول مذکور ہے۔''

حنفیہ کے اصل مسلک میں وعدہ اگرچہ قضاء لازم نہیں ہوتا، لیکن متاخرین فقہاء حنفیہ نے کئی مقامات پر وعدہ کو لازم قرار دیا ہے۔

چنانچہ درالمختار میں ''شرط فاسد'' کے بیان میں ہے کہ:

"وفي جامع الفصولين ايضا: لو ذكر البيع بلا شرط ثم ذكر الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد، اذ المواعيد قد تكون لازمة فيجعل لازما لحاجة الناس."

جامع الفصولین میں بھی ہے کہ اگر بیع بلاشرط کی جائے اور پھر شرط کا ذکر بطور وعدہ کے کیا جائے، تو اس صورت میں وہ بیع جائز ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا ضروری ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم بھی ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے اس وعدہ کو بھی لازم کیا جائے گا۔

اس کے بعد علامہ رملیؒ کے فتاوی خیریہ سے نقل کیا ہے کہ:

"فقد صرح علماءنا بانهما لو ذكرا البيع بلا شرط ثم ذكرا الشرط على وجه العدة جاز البيع ولزم الوفاء بالوعد."

''ہمارے علماء نے بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اگر عاقدین بلاشرط کے بیع کر لیں اور پھر بطور وعدہ کے کوئی شرط لگا لیں تو اس صورت میں بیع درست ہو جائے گی اور اس وعدہ کو پورا کرنا لازم ہوگا''

پھر اس بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

"وقد سئل الخير الرملي عن رجلين تواضعا على بيع الوفاء قبل عقده وعقد البيع خالياً عن الشرط فاجاب بانه صرح في الخلاصة والفيض والتتارخانية وغيرها بانه يكون على ما تواضعا."

علامہ خیر الدین رملی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر دو آدمی عقد سے پہلے بیع

الوفاء کے انعقاد پر معاہدہ کرلیں۔ اور پھر عقد بیع غیر مشروط طور پر کریں۔ (تو یہ جائز ہے یا نہیں؟)

علامہ رملی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ خلاصہ فیض اور تتارخانیہ وغیرہ میں صراحت کے ساتھ یہ موجود ہے کہ اگر عاقدین اس طرح عقد کرلیں تو یہ عقد اسی طرح منعقد ہوجائے گا جس طرح عاقدین نے معاہدہ کیا تھا۔"

(رد المحتار: ٤/١٣٥، باب البیع الفاسد مطلب فی الشرط الفاسد اذا ذکر بعد العقد او قبله)

چنانچہ علماء حنفیہ نے ان عبارات فقہیہ میں اسی بات کی تصریح کی ہے کہ "وعدہ" بعض اوقات لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے لازم ہوجاتا ہے، اسی طرح علامہ خالد الاتاسی نے "بیع الوفاء" کی بحث میں فتاوی خانیہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ:

"وان ذکر البیع من غیر شرط ثم ذکر الشرط علی وجه المواعدة فالبیع جائز، ویلزم الوفاء بالوعد لان المواعید قد تکون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس." (شرح المجلة لخالد الاتاسی: ٢/٤١٥)

اگر بیع غیر مشروط طور پر کی جائے اور پھر بطور وعدہ کے شرط کا ذکر کیا جائے تو اس صورت میں بیع جائز ہوگی اور اس وعدہ کا ایفاء لازم ہوگا، اس لئے کہ وعدے کبھی لازم ہوتے ہیں، لہٰذا لوگوں کی ضرورت کے لئے اس وعدہ کو لازم کیا جائے گا"۔

لہٰذا فقہاء کے مندرجہ بالا اقوال کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ کہنا درست ہوگا کہ مستقبل میں ہونے والے اجارۃ اور بیع کے ایگریمنٹ میں فریقین آپس میں جو وعدہ فی الحال کرلیں تو وہ وعدہ قضاءً بھی لازم ہوگا۔

جواب کا خلاصہ:

اوپر ہم نے جو تفصیلی جواب دیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بینک کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس تفصیلی جواب کے بالکل ابتداء میں ہم نے جو پہلا طریقہ بیان کیا تھا، اس کے مطابق بینک گاہک کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرے، اس لئے کہ اس طریقے کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی کا اختلاف ہے اور اختلاف اور شبہات سے دور رہنا زیادہ بہتر ہے۔

البتہ اگر کسی وجہ سے اس طریقہ پر عمل ممکن نہ ہو تو پھر بینک نے جو صورت پیش کی ہے، اس کو

شرعی طور پر جائز کرنے کے لئے اس میں مندرجہ ذیل شرائط کالحاظ ضروری ہے:

(۱) بینک اور گاہک کے درمیان جو ایگریمنٹ لکھا جائے، اس میں گاہک کو سامان خریدنے کے لئے وکیل بنانے کا معاملہ تو قطعی اور یقینی ہو، لیکن اس ایگریمنٹ میں اجارہ اور بیع کا تذکرہ صرف بطور وعدہ کے ہو، قطعی اور فیصلہ کن طریقہ پر ان کا عقد نہ کیا جائے۔

(۲) جب گاہک سامان خرید کر اس پر قبضہ کر لے اور اس کو اپنے یہاں نصب کر لے، اس کے بعد عقد اجارہ بالمشافہ یا مراسلت کے ذریعہ کیا جائے اور اس عقد اجارہ کے وقت بیع کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

(۳) سامان کی خریداری کے بعد اور عقد اجارہ ہونے سے پہلے وہ سامان بینک کی ضمان میں رہے گا۔

(٤) مدت اجارہ ختم ہونے کے بعد پھر بیع قطعی طور پر کی جائے۔

(٥) ایگریمنٹ میں فریقین کی طرف سے اجارہ اور بیع کا جو وعدہ ہوگا، قضاء اور دیانۃ اس وعدہ کو پورا کرنا فریقین پر لازم ہوگا۔

(٦) اگر فریقین میں سے کوئی ایک وعدہ اجارہ یا وعدہ بیع کی خلاف ورزی کرے گا تو اس وعدہ خلافی کے نتیجے میں فریق ثانی کو جو مالی نقصان ہوگا فریق اول اس نقصان کی تلافی کرے گا۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم (فقہی مقالات: ص ۲۷۹ ـ ۲۹۲)

عیب دار چیز دلوانے کا حکم:

دلال اگر عیب دار چیز دلوائے تو اجرت کا حقدار نہ ہوگا تفصیل درج ذیل سوال و جواب میں ملاحظہ فرمائیں:

سوال: زید نے بکر سے ایک رکشہ خریدا، دلال نے ان کے درمیان بیع کرائی اور مبلغ پچاس روپے دلالی طے ہوئی تھی، اب رکشہ خریدنے کے بعد اس کا ایک پرزا اس سے کم قیمت کا نکلا جو بیع سے پہلے مالک نے دلال کو بتائی تھی، زید کو اس پرزے کی وجہ سے دوسو روپے کا نقصان ہوا تو کیا اس دلال کو پچاس روپے دلالی دینے کے دینے ضروری ہیں؟ بینوا توجروا

جواب: دلال اجرت کا اس وقت مستحق ہوتا ہے جب وہ معقود علیہ صحیح سالم مع شرط وقیود خریدار کے سپرد کرے، اس لئے صورت سوال میں دلال اجرت کا مستحق نہیں بلکہ خریدار ضرر عیب

کی بنا پر یہ رکشہ دلال کے ذریعہ واپس کر سکتا ہے بشرطیکہ اس میں خریدار کے پاس مزید کوئی عیب نہ پیدا ہو گیا ہو، اگر مزید کوئی عیب پیدا ہو گیا تو رد مبیع کی بجائے بائع پر جو رجوع بالنقصان کر سکتا ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی)

کرایہ دار نے دو روز کے بعد مکان چھوڑ دیا:

زید نے ایک مکان تین ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لیا اور مبلغ ہزار روپے پیشگی دے دیے اور دو دن اس مکان میں قیام کر کے چلا گیا تو کیا مالک مکان کو ہزار روپے دو دن کے عوض رکھنا جائز ہوگا یا دو دن کا کرایہ وضع کر کے باقی رقم واپس کرنا ضروری ہوگی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ

اگر یہ شخص کسی ایسے عذر کی وجہ سے جا رہا ہے جو شرعاً معتبر ہے تو دو روز کے بعد عقد اجارہ فسخ کر سکتا ہے اور مالک مکان چاہے تو دو روز کا کرایہ اس سے وصول کر سکتا ہے اور اگر بلا عذر معتبر جا رہا ہے تو چونکہ یہ عقد ماہانہ ہوتا ہے اس لئے پورے مہینے کا کرایہ ادا کرنا اس کے ذمہ ہے، اس صورت میں یہ شخص مکان اپنے قبضہ میں رکھنا چاہے تو رکھ سکتا ہے۔ واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

ایسی ملازمت کا حکم جس میں رشوت دینا پڑتی ہو:

ایک شخص ایسی کمپنی میں کام کرتا ہے جو درآمد برآمد کا کام کرتی ہے، کمپنی نے اس ملازم کو اس کاروبار کے سلسلہ میں مختلف مراحل میں رشوت دینا پڑتی ہے، کیا ایسی ملازمت جائز ہے اور ایسے شخص کے ہاں کھانا کھانے کا کیا حکم ہے؟ اس کا حکم یہ ہے کہ

رشوت دینا اور لینا دونوں حرام ہیں، اس ملازم پر فرض ہے کہ یہ ملازمت ترک کر کے دوسرا کوئی ذریعہ معاش اختیار کرے، اس کے ہاں کھانا کھانا بہرحال جائز ہے رشوت کی جائز و ناجائز صورتوں کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ریل میں وزن سے زائد سامان لے جانے کا حکم:

ریل، جہاز وغیرہ میں مسافر کے لئے سامان کی ایک مقدار متعین ہے اگر اس مقدار سے زائد سامان لے جائے تو سامان کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے، اب اگر اپنا کوئی زائد سامان ساتھ جانے والے مسافر دوست احباب کے حوالے کر دے تاکہ کرایہ سامان اور ریلوے کی گرفت سے بچ جائے تو شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں البتہ سوار ہونے سے قبل ہی پورا سامان دوسرے کے ذمہ لگا دیا تو جائز ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی بتغییر یسیر)

حرام آمدن والوں کے ہاں نوکری کا حکم:

جن لوگوں کی آمدنی حرام ہے، ان کے ہاں نوکری کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ایک مدلل فتوی ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی شخص نے ایک کسبی یا سودخور یا شراب فروش کی نوکری کر لی یا کسی ایسے شخص نے اپنے گندم یا کوئی اور چیز کسی شراب فروش کے ہاتھ فروخت کی اور اس نے آمدنی ناجائز سے قیمت دی تو اب اس کے لیے وہ قیمت وہ حلال ہے یا نہیں، اس مسئلہ کی اچھی طرح تشریح فرمائیے؟

جواب: جن کی آمدنی بالکل حرام خالص ہے جیسے کسبی یا شراب فروش یا سودخور وغیرہم ان کی نوکری کرنا جائز نہیں اور جو تنخواہ اس میں سے ملتی ہو وہ حلال نہیں اور اسی طرح اپنی چیز اس کے ہاتھ فروخت کر کے اسی مال حرام سے قیمت لینا بھی حلال نہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿ولا تتبدلوا الخبيث بالطيب﴾ تو اپنی پاکیزہ مزدوری یا پاکیزہ چیز کو اس ناپاک مال سے بدلنا ناجائز ٹھرا۔

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لا یحل ثمن الکلب ولا حلوان الکاهن ولا مهر البغی، صـ۱۳۶، وقال علیه السلام: ان اللّٰہ حرم الخمر وثمنها، صـ۱۳۷

وعن ابن عباسؓ قال رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم جالسا عند الرکن قال فرفع بصره الی السماء فضحك فقال لعن اللّٰہ الیهود ثلاثا ان اللّٰہ تعالیٰ حرم الشحوم فباعوها واکلوا اثمانها وان اللّٰہ تعالیٰ اذا حرم علی قوم اکل شئی حرم علیه ثمنه صـ۱۳۷، لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اکل الربا وموکله، صـ۱۲۷، سنن ابی داؤد جلد ثانی وغیر ذلك من الآیات والاحادیث۔

ہاں جن لوگوں کی آمدنی مشتبہ اور مختلط الحلال والحرام غالب الحلال ہو، مثلاً: یہی لوگ کسبی و مے فروش وسودخور وغیرہم کوئی دوسرا پیشہ مباح مثل حلال تجارت یا اور کچھ بھی کرتے ہوں اس وقت ان کے ہاں نوکری کرنا اور اپنی چیز ان کے ہاتھ فروخت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ تنخواہ یا قیمت حلال مال میں سے دیں یا غالب الحلال سے دیں۔

نهانا صلى الله عليه وسلم عن كسب الامة الا ما علمت بيدها وقال هكذا باصابعه نحو الخبز و غزل و النقش . (ابو داؤد : ۲/ ۱۳۲)

وجہ یہ ہے کہ مشتبہ سے بچنا متعذر اور دشوار ہے پس ضرورت کی وجہ سے جائز ہے:

"لان الضرورات تبيح المحظورات ولا يكلف الله نفسا الا وسعها"

اگر چہ خلاف تقویٰ ہے۔

دع ما يريبك الى مالا يريبك هو الموافق .

(امداد الفتاوی : ۳/ ۳۷۸)

عورتوں کے لئے ملازمت کرنے کا حکم:

(۱) عورت کے لئے ملازمت اختیار کرنے کی شرعاً کس قدر گنجائش ہے اس سلسلہ میں ایک مفصل فتویٰ و جواب کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ

ل) عورتوں کے لئے دنیاوی تعلیم حاصل کرنا کیسا ہے؟ اگر کوئی صورت جواز کی ہو تو تحریر فرمائیں؟

ب) عورتوں کے لئے ملازمت کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر شوہر یا دیگر وسائل کے نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت کرنا چاہے تو کیا حکم ہے؟

جواب: پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ عورتوں کے لئے بلا ضرورت گھر سے باہر نکلنا جائز نہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى﴾

(سورة الأحزاب : ۳۳)

یعنی گھروں میں قرار سے رہو، اگر ضرورت کی وجہ سے گھر سے باہر نکلنا ہو تو درج ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے:

(۱) ایسی بڑی چادر، برقعہ وغیرہ میں لپٹی ہوئی ہو کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مائل نہ ہو۔

(۲) بناؤ سنگھار اور خوشبو لگا کر نہ نکلیں۔

(۳) ان کی چال وچلن ایسی نہ ہو کہ فتنے کا سبب بن جائے، جیسا کہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وحیث أبحنا لها الخروج فبشرط عدم الزينة في الكل، وتغيير الهيئة الى مالا يكون داعية الى نظر الرجال واستمالتهم."

(در المختار: ۳/۱۴۶)

جبکہ عورتوں کا تعلیم کے لئے نکلنا ضرورت میں داخل نہیں، علاوہ ازیں اس خروج میں خروج بلاضرورت کے ساتھ دیگر کئی مفاسد پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱) باہر نکل کر اجانب کو اپنی طرف مائل کرنا۔

۲) بُرے ماحول میں جانا۔

۳) بے دین عورتوں سے تعلیم حاصل کرنے میں ایمان، اعمال واخلاق کی تباہی۔

٤) نامحرم مردوں سے پڑھنے کی معصیت۔

٥) کافر اور بے دین قوتوں کی نقالی کا شوق۔

٦) اس تعلیم کے سبب حب مال اور حب جاہ کا بڑھ جانا اور اس کی وجہ سے دنیا وآخرت کا تباہ ہونا۔

عورتوں کے لئے اگر لکھنے پڑھنے کا بنیادی علم یا دینی علم کسی دیندار عورت یا محرم مرد سے گھر میں سکھانے کا بندوبست کیا جائے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔ اور طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم سے یہی مراد ہے نہ کہ دنیوی فنون، اس لئے ہرگز مغالطے میں نہیں رہنا چاہیے۔

(۲) آج کل کے دور میں یہ ممکن نہیں کہ عورت ملازمت کرے اور ممنوعات میں سے کسی ممنوع امر کا ارتکاب نہ کرے، جو مفاسد اس کے عصری درسگاہوں میں پڑھنے میں بیان ہوئے ہیں ان سے زیادہ اس کی ملازمت کرنے میں پائے جاتے ہیں، نیز یہ کہ عورت کے نان نفقہ کی ذمہ داری باپ پر اور شادی کے بعد شوہر پر ہے، اس لئے عورتوں کے لئے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں۔

اور اگر کوئی عورت مجبور ہو کہ کمانے والا کوئی موجود نہ ہو تو بھی گذر بسر کے لئے اور کوئی جائز تدبیر اختیار کی جائے، سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ مناسب جگہ نکاح ثانی کرے، جب تک یہ

صورت نہ ہو یا کسی وجہ سے عورت نکاح ثانی کے لئے آمادہ نہ ہو تو گھر میں چھوٹے بچے بچیوں کو پڑھانا شروع کردے یا کوئی گھریلو ہنر اختیار کرے اور اس سے اخراجات کا انتظام کرے، اگر ایسی کوئی صورت نہ ہو سکے تو لڑکیوں کو پڑھانے کے لئے کسی ایسے اسکول میں جاسکتی ہے جہاں مردوں سے اختلاط یا کسی امر ممنوع کا ارتکاب نہ ہوتا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخذ از حسب نقل فتویٰ دار الافتاء والارشاد کراچی [illegible] ۴۱ ۳۱۱)

قرض وصول کرکے دینے کی اجرت کا حکم:

ایک شخص کا دوسرے پر قرض ہے اور قرض کی دستاویز بھی موجود ہے اور گواہ بھی موجود ہیں، لیکن وہ مقروض قرض ادا نہیں کرتا، اب یہ شخص کسی با اعتماد شخص سے کہتا ہے کہ میرا قرض فلاں سے وصول کرکے دو میں اس قرض کا تہائی تمہیں دوں گا، تو شرعاً یہ معاملہ جائز ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "یہ شخص اجیر خاص ہے لہذا تنخواہ معین ہونی چاہیے، خواہ ماہانہ خواہ یکمشت کہ کامیابی حاصل ہونے کے بعد تم کو اتنا فیصد دیں گے، اب یہ شخص اس کام کے انجام دہی کے لئے جو کچھ خرچ کرے اس کی ادائیگی تو ہر حال میں اس کے ذمہ فرض ہوگی، خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو باقی اجرت اگر کامیابی کے ساتھ مشروط تھی تو کامیابی کے بعد ملے گی، اگر ماہانہ ہو تو مہینہ کے بعد ملے گی۔

(ماخوذ از امداد الفتاوی بتغییر یسیر ۳ [illegible] ۳)

اجارۂ فاسدہ کا حکم:

ہر وہ شرط جس سے بیع فاسد ہوتی ہے اس سے اجارہ بھی فاسد ہو جاتا ہے اس لئے اجارہ میں شرط فاسد سے بچنا لازم ہے، لیکن اگر کسی شرط فاسد کی وجہ سے اجارہ فاسد ہوگیا ہے تو فیصلہ اس طرح ہوگا، کہ اگر ابھی تک عمل شروع نہیں ہوا تو اس عقد کو ختم کردیا جائے، نئے سرے سے صحیح شرائط کے ساتھ عقد کیا جائے اور اگر عمل شروع ہو چکا ہے اور کام بھی پورا ہوگیا ہے تو اجیر کو اجرت مثل ملے گی۔

کما فی التنویر وشرحہ: تفسد الاجارۃ بالشروط المخالفۃ لمقتضی العقد وکل ما افسد البیع کمامر (یفسدھا) کجہالۃ ماجور او اجرۃ او مدۃ او عمل وکشرط طعام عبد وعلف دابۃ ومرمۃ الدار

معارمها وعشر وخراج أو مؤنة، شباه .

(در المختار : ٥ / ٣٢ كتاب الاجارة)

وقال العلامة محمد على الصابونى:

والقاعدة انه اذا فسدت الاجارة يجب اجر المثل قياساً على النكاح لقوله صلى الله عليه وسلم :فى النكاح بغير مهر، فان دخل بهافلها مهر مثلها لا وكس ولاشطط (اخرجه ابو داؤد والنسائى والترمذى)

اى من غير نقص ولا مجاوزة للحد، فدل الحديث على وجوب القيمة فى العقد الفاسد ولا يزاد على المسمى الذى اتفق عليه فى الاجارة . (فقه المعاملات)

پیشگی اجرت دینے کا حکم:

اجارہ میں اصل قاعدہ تو یہی ہے کہ جب کام پورا ہو جائے یا ڈیوٹی پوری کر دے اس وقت اجرت کا مستحق قرار پاتا ہے اور مالک کے ذمہ اجرت کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے، تاہم اگر کوئی ملازم پیشگی اجرت کی شرط رکھے یا مالک مکان ودکان پیشگی کرایہ کا مطالبہ کرے اور کرایہ دار اس شرط کو تسلیم کرے یا ادارہ اور کمپنی خود ملازمین کو مہینہ کے شروع میں پیشگی تنخواہ ادا کرے یہ سب صورتیں آپس کی رضامندی سے شرعاً جائز ہیں۔

تحصیل ملازمت کے لئے ستر کھولنے کا حکم:

بعض ملازمتیں حلال ہوتی ہیں لیکن ان میں بھرتی ہونے کے لئے کوئی ناجائز شرط ہوتی ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، ایسے موقع پر کیا کیا جائے، اس بارے میں ایک سوال وجواب پیش کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کے حل میں مدد ملے۔

سوال: حکومت نے ائیر فورس میں مذہبی تعلیم کے سلسلہ میں ایک نیا شعبہ کھولا ہے جس میں علماء کو وارنٹ افیسر (ریلجس ٹیچر) کے عہدہ پر بھرتی کیا جاتا ہے، سرکاری قانون یہ ہے کہ بھرتی کے وقت طبی معاینہ کروانا ضروری ہے جس میں ستر کھولنا لازمی ہے، کیا مذکورہ صورت میں ستر کھولنا اور اعضاء مخصوصہ کا معاینہ کروانا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: یہ کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے جس کی بناء پر کسی کے سامنے ستر کھولنے کی اجازت ہو تعجب اور افسوس کا مقام ہے کہ جن لوگوں کو مذہبی تعلیم کے لئے لیا جا رہا ہے ان ہی کو مذہب کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو لوگ ملازمت کے لئے ایسے گناہ کبیرہ اور حرام کے ارتکاب پر تیار ہوں وہ مذہب کی تعلیم جو کچھ دیں گے وہ ظاہر ہے، ایسے لوگوں سے مذہب کو فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔

بہر کیف بلا ضرورت شدیدہ کسی کو ستر دکھانا اور دیکھنا سخت گناہ اور حرام ہے اور سوال میں مذکورہ صورت ضرورت شدیدہ میں داخل نہیں۔ (احسن الفتاویٰ : ۱۸۷/۸)

سودی کاروبار کرنے والے اداروں میں بجلی کی فٹنگ کا حکم:

سودی کاروباری اداروں میں تعمیراتی کام اور اس کی اجرت کا کیا حکم ہے اس بارے میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ کا فتویٰ سوال و جواب کی صورت میں ملاحظہ فرمائیں۔

سوال: آج کل اکثر ادارے خصوصاً تجارتی ادارے اور کمپنیاں جن کا اکثر کاروبار سودی ہے، ٹھیکیدار کمپنی یا ادارہ سے قرض لیکر تعمیر کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں بندہ ایسی رقم سے تعمیر شدہ مکانات میں بجلی کا کام ٹھیکے پر کرتا ہے، مجھے جو رقم اجرت میں ملتی ہے وہ سودی ہی ہوتی ہے کیا میرے لئے وہ رقم اجرت میں لینا اور ملازمین کو دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: آپ کے کام میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے، اداروں کا سودی کاروبار ان کا اپنا فعل ہے جس کا وبال اور گناہ انہی پر ہے، لہٰذا آپ کے کام کی اجرت بلاشبہ حلال ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اجرت کی رقم حلال آمدن سے ہو، اس لئے کمپنی سے معاہدہ کرتے وقت یہ شرط کر لی جائے کہ ہمیں اجرت سودی منافع سے نہ دی جائے گی، کمپنی میں یقیناً حلال آمدن کے ذرائع بھی ہوں گے ان سے اجرت دی جائے اگر حلال و حرام آمدن خلط کر دیا جاتا ہے اور حلال کو الگ رکھنے پر ادارہ تیار نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ حلال و حرام مخلوط ہوں لیکن حلال غالب ہو تو اس سے اجرت لینا جائز ہے اور اگر حلال و حرام دونوں برابر ہوں یا حرام غالب ہو تو جائز نہیں۔ (احسن الفتاویٰ، ص۳۲۹، ج ۷)

تاخیر کی وجہ سے اجرت میں زیادتی جائز نہیں:

ایک ایجنٹ سے میرا معاملہ طے ہوا کہ وہ اڑھائی ہزار روپے ٹکٹ اور دوسرے کاموں کی

اجرت کے طور پر وصول کرے گا، معاملہ طے ہو جانے کے بعد پانچ سو روپے میں نے نقد ادا کردیئے اور دو ہزار کے بدلے میں سعودی عرب جاکر دو ماہ کے اندر آٹھ سو سعودی ریال ادا کردینے کا وعدہ کیا، لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں وعدہ کے مطابق دو ماہ کے اندر قرض نہیں اتار سکا، بعد از اں دو ماہ کی تاخیر سے آٹھ سو ریال ادا کردیئے، لیکن ایجنٹ تاخیر کرنے پر ایک سو ریال مزید طلب کررہا ہے، شرعاً یہ زائد سو ریال ادا کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

جواب: اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت کے باوجود وعدہ خلافی کی ہے تو اس کا گناہ ہوگا، مگر ایجنٹ زائد رقم کے مطالبہ کا حق دار نہیں۔

نیز معاملہ پاکستانی روپے سے طے ہوا ہے، اس کے بعد سعودی ریال سے اس کا مبادلہ بیع الکالی بالکالی ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، اس لئے آپ کے ذمہ صرف پاکستانی دو ہزار روپے واجب ہوں گے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

قبل المیعاد ملازمت چھوڑنے پر مالی جرمانہ کا حکم:

سوال: ایک کمپنی اپنے ملازمین کو مقرر تنخواہ کے علاوہ کچھ رقم دیتی ہے، اس شرط پر کہ پانچ سال یہاں ملازمت کرنا پڑے گی، اگر ملازم میعاد سے قبل چلا گیا تو پانچ سال کی رقم بحساب مقرر دیکر جائے گا، اگر کمپنی نے نکال دیا تو پانچ سال کی رقم پوری کی پوری دے دیگی، چاہے ایک سال کے بعد نکال دے، آیا اس قسم کی ملازمت جائز ہے یا نہیں؟ اور کمپنی والوں کو پیسے ملازم سے لینا اور ملازم کو کمپنی والوں سے لینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

جواب: زائد رقم بھی تنخواہ میں داخل ہے اور میعاد سے قبل چھوڑنے کی صورت میں اس کی واپسی کی شرط مفسد اجارہ ہے، لانہ مخالف لمقتضی العقد وفیہ نفع لاحد المتعاقدین۔

لہٰذا جانبین پر توبہ اور اس عقد کا فسخ کرنا فرض ہے، ملازم نے جتنی مدت کام کیا اس کو اس کا اجر مثل ملے گا اور جو مقررہ تنخواہ مع اضافہ سے زائد نہ ہوگا۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(احسن الفتاوی کتاب الاجارہ)

بدون طے کئے اجارہ منعقد نہیں ہوتا:

سوال: زید اپنے باپ کے ہمراہ عرصہ سات سال سے تجارت کررہا ہے، زید بالغ اور باقی بھائی سوائے ایک کے نابالغ ہیں، زید نے اپنی تجارت کے عرصہ میں اپنی مزدوری نکالی ہے، کیوں

کہ سامان لینا اور حساب وغیرہ اسی کے سپرد تھا، والد فقط دوکان پر بیٹھتا تھا، زید شادی شدہ اور صاحب اولاد ہے، باقی بھائی غیر شادی شدہ ہیں، زید اور اس کی بیوی کا کھانا اور خرچ والد کے ساتھ مشترک تھا، ان سات سالوں کی کل مزدوری زید نے آٹھ ہزار روپے یعنی سو روپے فی ماہ کے حساب سے سرمایہ سے لی ہے اور کاروبار کپڑے کا ہے، دوکان خوب چلتی ہے، کیا زید کے لئے یہ اجرت لینا جائز ہے، بصورت تقسیم ترکہ زید والد کی ملکیت میں باقی بھائیوں کے مساوی شریک ہوگا یا یہ اجرت بھی ملکیت میں شمار کی جائے گی؟ اور بقدر حصص تقسیم ہوگی، خواہ تقسیم بصورت انتقال پدر ہو یا باپ زندگی میں ہی زید کو الگ کردے۔ بینوا توجروا

جواب: زید نے اپنے والد سے اجرت پر کام کرنا طے نہیں کیا تھا اس لئے اس کا کام کرنا تبرع ہے، اجرت والی رقم بھی ترکہ میں شمار ہوگی اور اس میں سب ورثہ کا حق ہوگا، البتہ والد زندگی میں زید کو الگ کردے تو والد کو چاہیے کہ زید کی محنت کے پیش نظر اس کی مناسب مدد کردے۔ واللہ سبحانہ تعالی اعلم۔ (احسن الفتاوی کتاب الاجارہ)

مسائل بتانے پر اُجرت لینا:

سوال: ایک علاقہ ہے جس میں مسائل بتانے والا کوئی مفتی نہیں ہے، کوئی مفتی اہل علاقہ کو تین یا چار گھنٹے دیتا ہے اور ایک متعین جگہ بیٹھ جاتا ہے، لوگ آتے ہیں اور اس سے مسائل پوچھتے ہیں، کیا یہ مفتی لوگوں سے اس وقت کی اجرت لے سکتا ہے جبکہ کسی ادارہ یا بیت المال سے اس کی کوئی اجرت مقرر نہیں ہے؟ بینوا توجروا

جواب: لے سکتا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مفتی سے مسئلہ پوچھے اور مفتی کو معلوم ہو تو بتانا فرض ہے لہذا اس پر اجرت لینا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی مفتی لوگوں کی سہولت کے لئے اپنا وقت فارغ کر کے صرف مسائل بتانے کے لئے کسی جگہ بیٹھ جاتا ہے تو چونکہ ایسا کرنا اس پر فرض نہیں ہے اس لئے وہ حبس اوقات کی اجرت مستفتین سے لے سکتا ہے۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله تعالیٰ: (ولا بأس برزق القاضی) لانه علیه السلام بعث عتاب بن اسید رضی الله تعالیٰ عنه الی مکة وفرض له وبعث علیا رضی الله تعالیٰ عنه الی الیمن وفرض له ولانه محبوس لحق المسلمین فتکون نفقته فی مالهم، هو مال بیت المال

وهذا لان الحبس من اسباب النفقة كما في الوصي والمضارب اذا سافر بمال المضاربة وهذا فيما يكون كفاية فان كان شرطا فهو حرام لانه استئجار على الطاعة اذا القضاء طاعة بل هو افضلها ثم القاضي اذا كان فقيرا فالافضل بل الواجب الاخذ لانه لايمكنه اقامة فرض القضاء الا به اذ الاشتغال بالكسب يقعده عن اقامته وان كان غنيا فالافضل الامتناع على ما قيل رفقا ببيت المال وقيل الاخذ وهو الاصح صيانة للقضاء عن الهوان ونظرا لمن يولى بعده من المحتاجين لانه اذا انقطع زمانا يعتذر اعادته ثم تسميته رزقا تدل على انه بقدر الكفاية . (الهداية : ٣/٤٧٦)

وقال ايضا : وينبغي للقاضي ان ينصب قاسما يرزقه من بيت المال يقسم بين الناس بغيرا جر لان القسمة من جنس عمل القضاء من حيث انه يتم به قطع المنازعة فاشبه رزق القاضي ولان منفعة نصب القاسم تعم العامة فتكون كفايته في مالهم غرما بالغنم (قال فان لم يفعل نصب قاسما يقسم بالاجر) معناه باجر على المتقاسمين لان النفع لهم على الخصوص ويقدراجر مثله كيلا يتحكم بالزياده والافضل ان يرزقه من بيت المال لانه ارفق بالناس وابعد عن التهمه .
(الهداية : ٣/٤١٠)

وقال الاما م طاهر بن عبد الرشيد البخاري رحمه الله تعالىٰ:وفي المحيط وذا اراد القاضي ان يكتب السجل ويأخذ على ذلك اجر ايأخذ منه مقدار مايجوز اخذه لغيره وكذا لوتولى القسمة بنفسه باجر ولو اخذ الاجرة في مباشرة نكاح الصغار ليس له ذلك لانه واجب عليه ومالا يجب عليه مباشرته جاز اخذ الاجرة عليه .
(خلاصة الفتاوى : ٤/٧)

وقال العلامة علاء الدين الطرابلسي رحمه الله تعالىٰ: (فصل)

واما اجرة السجل علی من تجب قیل علی المدعی اذبه احیاء حقه فنفعه له وقیل علی المدعی علیه اذ هو یأخذ السجل وقیل علی من استأجر الکاتب وان لم یأمره احد وامره القاضی فعلی من یأخذ السجل. (معین الحکام: ۱/ ۹۵) واللّٰه سبحانه وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۷/ ۳۳۹)

ملازمت برقرار رکھنے کے لئے رشوت دینا:

بعض لوگ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ میں اس کے قواعد وضوابط کے مطابق نوکری حاصل کر لیتے ہیں، لیکن دوران ملازمت افسران بالا بعض ناجائز وجوہات کی بناء پر تنگ کرتے ہیں ملازمت سے نکال دینے کی دھمکیاں دیتے ہیں اور رشوت طلب کرتے ہیں، جبکہ ملازم کے لئے اس ملازمت کے علاوہ اور کوئی جائز ذریعہ معاش بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری کی حالت میں ملازمت برقرار رکھنے کے لئے حکام بالا کو رشوت دینے کی گنجائش ہے، پھر بھی اس پر استغفار کرے، تاہم حکام کے لئے یہ رشوت ہے اور لینا اس کا حرام ہے، نیز حکام بالا کے لئے ماتحت ملازم کو بلاوجہ تنگ اور پریشان کرنا ملازمت سے فارغ کرنے کی دھمکی دینا، رشوت طلب کرنا، یہ سب امور ناجائز اور حرام ہیں، اس لئے ان کو ایسی ناجائز باتوں سے بچنا ضروری ہے۔

کسٹم ڈیوٹی سے بچنے کے لئے رشوت دینا:

لوگ بیرون ملک سے سامان منگواتے ہیں یا اپنے ساتھ سامان لاتے ہیں تو کسٹم والے اس پر ٹیکس لیتے ہیں اور عموماً حکام اس پر رشوت مانگتے ہیں اور رشوت نہ ملنے کی صورت میں سامان والے کو تنگ وپریشان کرتے ہیں اور زیادہ ٹیکس عائد کر دیتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے آیا ان کو رشوت دی جائے یا نہیں؟ تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اگر حکومت درآمد کردہ اشیاء پر مناسب شرح سے کسٹم ڈیوٹی وصول کرتی ہے جو کہ ظلم کے دائرہ میں نہیں آتی تو ایسی صورت میں کسٹم ڈیوٹی سے بچنے کے لئے کسٹم والوں کو رشوت دینا جائز نہیں، نیز اس میں حکومت کے ساتھ خیانت اور دھوکہ بھی ہے، جو ناجائز ہے لیکن اگر کسٹم حکام بہت زیادہ کسٹم ڈیوٹی وصول کرتے ہیں جو ظلم کی حد تک پہنچتی ہے تو ایسی صورت میں دفع ظلم کی نیت سے کسٹم حکام کو رشوت دینا تاکہ وہ مناسب شرح کے ساتھ کسٹم ڈیوٹی وصول کریں، اس کی گنجائش ہے، پھر بھی اس پر استغفار کرے، البتہ کسٹم حکام

کے لئے یہ رشوت ہے، ان کے لیے لینا اور استعمال کرنا بہر حال نا جائز ہے۔

(در المختار ٦/٤٢٣)

ٹھیکہ حاصل کرنے کے لئے رشوت دینا:

بعض ٹھیکیدار، کاموں کے ٹھیکے حاصل کرنے کے لئے بسا اوقات حکام کو رشوت دیتے ہیں اور بعض حکام خود بھی رشوت مانگتے ہیں، رشوت کے بغیر ٹھیکہ کی منظوری نہیں دیتے اور پھر بلوں کو پاس کرانے پر رشوت طلب کرتے ہیں، اس صورت میں بامر مجبوری رشوت دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس طرح ٹھیکیداروں کا افسروں سے رشوت کا لین دین کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ٹھیکیداری کا کام اگر چہ جائز ہے، مگر جس جائز کام کے لئے ناجائز کا ارتکاب کرنا پڑتا ہو ایسا کام کرنا جائز نہیں، لہٰذا اگر رشوت دیئے بغیر ٹھیکہ نہ ملے اور ٹھیکہ لینے کے بعد بھی بل پاس کرانے کے لئے رشوت دینی پڑتی ہو تو ایسا ٹھیکہ لینا جائز نہیں ہے، کسی دوسرے جائز کاروبار کو اختیار کرنا چاہیے۔

گاڑی والے کا پولیس کو رشوت دینا:

اگر کسی گاڑی والے کے پاس گاڑی کے صحیح کاغذات، لائسنس وغیرہ نہیں، یا سرکاری ٹیکس ادا نہیں کیا یا قانونی طور پر جتنے مسافر یا مال لانے کی اجازت ہے اس سے زیادہ مسافر یا مال لاد لیا یا اس قسم کی کوئی اور قانونی خلاف ورزی کی وجہ سے پولیس والے گاڑی روک لیں اور پھر گاڑی والے چالان سے بچنے کے لئے پولیس والوں کو پیسے دیں تو یہ رشوت ہے جو ناجائز ہے، یہ رشوت دینے اور لینے والے دونوں سخت گناہ گار ہوں گے۔

لیکن اگر گاڑی والے کے پاس اپنی گاڑی کے صحیح کاغذات موجود ہیں اور سرکاری ٹیکس وغیرہ ادا کرنے کی رسید بھی موجود ہے اور کسی طرح کی قانونی خلاف ورزی بھی نہیں کی، پھر بھی بلاوجہ پولیس والے تنگ اور پریشان کریں اور پیسے لئے بغیر نہ چھوڑیں یا چالان کر دیں تو ان حالات میں پولیس کے ظلم سے بچنے کے لئے مجبوراً ان کو رشوت دینی پڑے تو اس کی گنجائش ہے، دینے والا گناہ گار نہیں ہوگا، لیکن پولیس والے گناہ گار ہوں گے اور ان کے حق میں یہ پیسے رشوت کہلائیں گے جو کہ حرام ہے۔ (فتاویٰ هندية: ٣/٣٣١)

دیوالیہ ہونے کا حکم:

کسی تاجر پر لوگوں کا قرض اس قدر بڑھ جائے کہ اس کا تجارتی مال لوگوں کے قرضے اداء

کرنے کے لئے کافی نہ ہو یا کوئی کمپنی اس طرح دیوالیہ ہو جائے کہ بہت سے ملازمین کی تنخواہیں اس کے ذمہ ہیں، اس کا جاری سرمایہ ختم ہو گیا یا اس قدر کم ہو گیا کہ وہ تجارت جاری رکھ کر لوگوں کے قرض واپس کر سکنے کی اس میں استطاعت نہیں رہی تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ایسے ادارے پر پابندی عائد کرے اور اس کا اثاثہ یعنی سامان ضبط کر کے اپنے قبضہ میں لے لے اس کے بعد دیکھے کہ کمپنی یا دکان میں موجود سامان میں اگر کسی شخص کا متعین مال نکل آئے مثلاً کسی تاجر سے ایک مشین خریدی گئی تھی وہ ابھی غیر مستعمل صحیح سالم موجود ہے یا مثلاً کسی ڈیلر سے دس فریج لئے تھے وہ ابھی تک گودام میں پیک شدہ موجود ہیں تو وہ مال ثبوت وشہادت کی بنیاد پر اصل مالک کو واپس کر دیئے جائیں گے، اس کے بعد بقیہ مال فروخت کر کے قرض خواہوں کے قرض ادا کر دیئے جائیں گے مال فروخت کرنے کی ترتیب یہ رکھے کہ سب سے پہلے سامان تجارت فروخت کرے اس کے بعد اثاثہ یعنی مشین وغیرہ اس کے بعد دکان رکمپنی یا فیکٹری فروخت کی جائے گی۔

قال الشيخ الصابوني: والأصل في هذا ماروى كعب بن مالك، أن رسول الله ﷺ حجر على معاذ بن جبل، وباع ماله واذا فلس الحاكم رجلا، أي حكم بافلاسه، فأصاب أحد الغرماء عين ماله، فهو أحق به، الا أن يشاء تركه، ويكون أسوة الغرماء، لحديث "من أدرك متاعه بعينه، عند انسان قد أفلس، فهو أحق به."

(اخرجه البخاري: ۱۵۵/۳ ومسلم: ۱۱۹۳/۳)

قال في الاختيار:

اذا طلب غرماء المفلس الحجر عليه، حجر عليه القاضي، ومنعه من التصرفات والاقرار، حتى لايضر بالغرماء نظر الهم، ويبيع ماله ان امتنع المديون من بيعه ويقسمه بين الغرماء بالحصص، لان ايفاء الدين مستحق عليه.

ويباع في الدين النقود، ثم العروض، يعني عروض التجارة ثم العقار، ويترك له ثياب بدنه، وينفق من ماله عليه، وعلى زوجته،

واولاده الصغار وذوی ارحامه، لانها من الحوائج الاصلية، وانها مقدمة على حقهم، وان لم يظهر للمفلس مال. فان كان القاضي يعرف يساره، او قامت البينة ان له مال، حبسه القاضي مدة يغلب على ظنه، انه لو كان له مال اظهره، فان لم يظهر له مال خلى سبيله، ولايحول بينه وبين غرمائه، بعد خروجه من الحبس، يلازمونه، ولايمنعونه من التصرف والسفر، ويأخذون فضل كسبه، يقتسمونه بينهم بالحصص .

وانما يؤذن لهم بملازمته، لأنه ربما كان له مال لا يطلع عليه احد قد اخفاه، وهو يظهر الفقر والعسرة، فاذا لازموه فربما اضجروه فأعطاهم، والملازمة ان يتابعه الدائن فيدور معه حيث دار، ويجلس على بابه اذا دخل بيته، وبينة اليسار مقدمة على بينة الاعسار، لأنها مثبتة اذالاصل الاعسار .

(الاختيار لتعليل المختار على فذهب الخصى : ٢/٩٩)

البتہ اس کے رہائشی گھر، اس کے اور گھر والوں کے گذارے کے بقدر سامان اس کے پاس چھوڑ دینا مناسب ہے۔

قال العلامة الصابونی:

ويامر القاضي ان يقميوا منادياًينادى لهم على المتاع، ويباع ما عنده بالمزاد العلنى، وينبغى ان يترك له ما يقوم به، من معيشته، ومعيشة ابنائه، فلا تباع داره التى يسكنها، ولا الثياب التى يلبسها، ولا كل ما يحتاج اليه حاجة ضرورية، سواء كان له اولاهله وعياله .

انعامی اسکیمیں:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام درج ذیل انعامی اسکیموں کے بارے میں:

(۱) فیوچر اسٹریٹجیز انعامی اسکیم

(۲) بیسٹ فیوچر انعامی اسکیم

(۳) فیوچر کنگ انعامی اسکیم

(٤) پینٹا گونو انعامی اسکیم

(٥) ڈبلیو ٹی ایلی۔ اپن کوپن اسکیم

(٦) دیگر مخصوص انعامی اسکیمیں

جواب: آج کل ملکی و بین الاقوامی سطح پر مختلف ناموں اور متنوع عنوانات کے حامل ''انعامی اسکیمیں'' عوام وملک کی فلاح و بہبود اور باہمی تعاون کے دلکش عنوان کے ساتھ سامنے آرہی ہیں، جن میں راتوں رات مال دار بننے کے سنہرے خواب دکھلا کر عوام سے روپیہ اکٹھا کیا جاتا ہے اور پھر اس میں سے ایک معمولی مقدار ''انعام'' کے نام پر عوام میں تقسیم کر کے باقی رقم ہڑپ کر لی جاتی ہے، ان میں سے اکثر میں ''جوا'' پایا جاتا ہے، بعض میں اس کے ساتھ سود کی خرابی بھی ہے، اس لئے ان کا حکم جاننے سے پہلے ''قمار'' یعنی جوا کی وضاحت ضروری ہے۔

قمار ہر اس معاملے کو کہتے ہیں جس میں کسی مال کا مالک بنانے کو ایسی شرط کے ساتھ معلق کیا جائے جس کے ہونے نہ ہونے دونوں کا یکساں امکان ہو اور اسی بناء پر نفع خالص یا تاوان خالص برداشت کرنے کی دونوں جانب بھی برابر ہوں، بالفاظ دیگر ''کسی غیر یقینی واقعہ پر اپنا مال داؤ پر لگا دینا۔''

قال العلامة الجصاص رحمه الله تعالىٰ: و حقيقته تمليك المال على وجو ...... (الاحكام القرآن : صـ ٥٥٢)

قال في رد المحتار : " تعليق التمليك على الخطر و المال من الجانبين ." (در المختار :٣/ ٣٥٥)

قال العلامة الشوكاني رحمه الله تعالىٰ: الميسر ميسران ميسر اللهو، وميسر القمار، فمن ميسر اللهو النرد، والشطرنج، و الملاهي كلها، وميسر القمار ما يتخاطر الناس عليه، اى فيه مخاطرة الربح والخسارة، بانواع من الالعاب او الشروط ككل انواع القمار الموجودة والتي يمكن ان توجد ."

(تفسير فتح القدير للشوكاني : ١/ ٣٣٦).

وفي الموسوعة الفقهية "قال ابن حجر المكي :الميسر: القمار بأي نوع كان، وقال المحلي "صورة القمار المحرم التردد بين ان يغنم، وان يغرم." (الموسوعة الفقهية : ۳۹/ ٤٠٤)

قمار کی مذکورہ بالا تعریف سے معلوم ہوا کہ سوال میں درج شدہ تمام اسکیمیں قمار میں داخل ہیں، نیز ان میں سے بعض میں قمار کے ساتھ "سود" بھی پایا جاتا ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱ تا ۵) فیوچر اسٹریٹجیز اسکیم اور اس سے ملتی جلتی اسکیموں میں عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام لین دین اسکیم میں حصہ لینے والے شرکاء براہ راست ایک دوسرے سے کریں گے، صرف کمپنی کو اس کے "سروس چارجز" یعنی اخراجات کی مد میں کچھ رقم ملے گی، حالانکہ یہ اسکیم اور اس قسم کی دوسری تمام اسکیمیں صاف طور پر "جوا" پر مشتمل ہیں اس لئے کہ ان میں رقم لگانے کے بعد جہاں اس بات امکان ہے کہ یہ رقم مع اضافہ کے ملے گی وہاں اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ اصل رقم ہی ضائع ہو جائے، مثلاً: اس طرح کہ کمپنی نے نئے ممبر کی طرف جو فارم فروخت کرنے کے لئے بھیجے تھے ممکن ہے وہ کمپنی کی طرف سے مقررہ مدت میں واپس نہ بھیجے جاسکیں، یا جن گاہکوں کو آگے یہ فروخت کئے جائیں وہ اس مدت میں ان کو مکمل کر کے کمپنی کو ارسال نہ کرسکیں، یا فارم میں غلطی ہو جائے اور کمپنی فارم کو مسترد کردے، ان تمام صورتوں میں اصل رقم ضائع ہو جائے گی، لہٰذا یہ "جوا" ہے۔

نیز ان اسکیموں کے جاری کرنے والے کا مقصد کوئی کاروبار یا تجارت کرنا نہیں ہوتا بلکہ دوسروں سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنا ہوتا ہے اور ان میں حصہ لینے والوں کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ ان کی تھوڑی رقم اپنے ساتھ زیادہ رقم کھینچ لائے، لہٰذا ان میں قمار کے ساتھ "سود" کی خرابی بھی پائی جاتی ہے۔

سود اور جوا شریعت میں حرام ہیں لہٰذا ان اسکیموں سے اجتناب فرض ہے، اس کے علاوہ مختلف ناموں سے جتنی اسکیمیں ہیں، مثلاً: ڈبلیوٹی، این کوپن اسکیم، فیوچر کنگ کوپن اسکیم، پینٹا گونو انعامی اسکیم، بیسٹ فیوچر کوپن اسکیم وغیرہ ان سب کی یہی حقیقت اور سب کا یہی حکم ہے، البتہ ان میں کسی نے کم لالچ دیا ہوتا ہے کسی نے زیادہ۔

ایک نجی اسکیم اور اس کا حکم:

ایک اسکیم جو ۲۵۰ سے ۳۰۰ ممبران پر مشتمل ہوتی ہے، ہر ممبر ۳۰۰ روپے ماہوار دیتا ہے، ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے جس کا نام نکل آئے اس کو ۱۵۰۰۰ روپے یا اتنی مالیت کے برابر دوسری چیز دی جاتی ہے اور اس سے باقی قسطیں نہیں لی جاتیں۔

اس اسکیم میں بھی دو احتمال ہیں یا تو ہر ممبر کو انعامی رقم ملنا یقینی ہوگا یا اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہوگا، اگر ملنا یقینی ہے تو یہ "سود" ہے کیوں کہ رقم جمع کروانے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ رقم اور زیادہ رقم لے کر آئے اور اسکیم چلانے والے بھی اس کی ترغیب اور لالچ دلاتے ہیں کہ ممبر قرعہ اندازی میں حصہ لے کر نام نکلنے پر زائد رقم حاصل کرے۔

اگر اصل رقم کے ڈوبنے کا خطرہ ہے تو یہ جوا ہے۔ سود اور جوا دونوں حرام ہیں، ان سے بچنا فرض ہے۔

جوا کے مفاسد:

جوے کا سارا کھیل اس پر موقوف ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے نقصان پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع، ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان، پھر اس کاروبار سے دولت کی گردش بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے اور اس کاروبار کے ذریعے ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار کی مجموعہ حیثیت سے قوم کی تباہی اور ملکی معیشت کی بربادی ہے، بخلاف تجارت اور لین دین کی جائز صورتوں کے کہ ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلے سے دولت کی گردش بڑھتی ہے اور خریدنے اور بیچنے والے دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

موجودہ دور میں سود اور جوئے کے نئے نئے طریقے اور نئی نئی اسکیمیں ایجاد کرلی گئی ہیں جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے اور جو نقصان ہوتا ہے وہ سب پر برابر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا اور جس کو رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے، اس لئے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں، لیکن قوم کے اجتماعی نقصان کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا حالانکہ اس میں وہ سب نقصانات موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوئے میں پائے جاتے ہیں بلکہ ایک حیثیت سے اس کا نقصان اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے

خراب اثرات دوررس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہیں، کہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا جائے گا اور سرمایہ ایک محدود دائرے میں مرتکز ہو جائے گا حالانکہ اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ اس میں ہر ایسے معاملے کو حرام قرار دیا گیا ہے جس کے ذریعے دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے، قرآن کریم نے اس کا اعلان خود تقسیم کا اصول بیان فرماتے ہوئے اس طرح فرما دیا:

" کی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ."

یعنی مال فئے (جو غنیمت کی ایک قسم ہے) کی تقسیم مختلف طبقوں میں کرنے کا جو اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اس کی غرض یہ ہے کہ دولت سمٹ کر سرمایہ داروں کی تجوریوں میں جمع نہ ہو جائے۔

اسلام میں منافع کا تصور:

اسلام منافع کی نفی نہیں کرتا، البتہ اس کے حصول میں کھلی چھوٹ بھی نہیں دیتا، محدود پابندیاں عائد کرتا ہے جن کی رعایت نہ کرنے سے معاشی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اجتماعی نقصان ہوتا ہے ان کی رعایت کرتے ہوئے انسان جتنا نفع چاہے حاصل کر لے، اسلام نے زیادہ سے زیادہ منافع کی کوئی حد مقرر نہیں کی، اگر اسلامی اصول کے مطابق کوئی کاروبار کیا جائے تو اس کا پورے معاشرے پر یہ مفید اثرات مرتب ہوتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہوتی، بلکہ اس منافع کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے معاشرے کے سب افراد اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتوی دار الافتاء والارشاد ناظم آباد کراچی فتوی، ۱۴/۳۲۴)

سیمنز (تولیدی جوہر) کی خرید وفروخت:

آج کل جانوروں کی اچھی سے اچھی نسل تیار کرنے کے لئے مصنوعی طریقے سے ان کی نسل کشی کی جاتی ہے، جس میں کسی اعلیٰ نسل کے نر جانور سے نطفہ حاصل کر کے اس سے بڑی تعداد میں سیمنز (تولیدی جوہر) تیار کر لئے جاتے ہیں، پھر بوقت ضرورت ڈاکٹر اپنے ہاتھ سے شیشے کی نلی کے ذریعے اس سیمن کو مادہ کے رحم میں رکھ دیتا ہے اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج کل وسیع پیمانے پر ان سیمنز کی خرید وفروخت کی جاتی ہے، اس شعبہ سے وابستہ بعض حضرات کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ مختلف شہروں میں حکومت کے بڑے بڑے فارم ہیں جہاں نطفہ سے سیمنز حاصل کرکے سرکاری طور پر ان کی خرید وفروخت ہوتی ہے، جانوروں کے اعلیٰ اور عمدہ نسلیں جو یہاں پاکستان میں دستیاب نہیں ہیں بیرون ملک سے خود حکومت ان کے سیمنز خرید کر بڑی تعداد میں یہاں فروخت کرتی ہے، الغرض یہ کاروبار ایک بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے اور یہ بات واضح ہے کہ مصنوعی طریقے سے نسل کشی کرنا اور اس کے نتیجے میں حاصل شدہ جانوروں کا دودھ اور گوشت جائز اور حلال ہے شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے تو جب ان سیمنز کا استعمال اور ان سے انتفاع جائز طریقے سے ممکن ہے تو کیا اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی یا شرعاً اس خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟

ہمارے علماء کرام اور اکابر رحمہم اللہ مادہ منویہ کی بیع کو اس کے نجس، غیر متقوم اور غیر مال ہونے کی بناء پر ناجائز کہتے ہیں تاہم فقہاء کرام رحمہم اللہ کی کچھ عبارات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر نجس چیز کسی دور میں جائز طریقے سے قابلِ انتفاع ہوجائے تو اس کی خرید وفروخت جائز ہوگی چنانچہ شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ امداد الاحکام میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان اقوال کا مقتضی یہ ہے کہ اگر کسی وقت خون کی بھی قیمت عرفاً ہوجائے تو اس کی بیع وشراء صحیح ہے۔'' (۳/۵۵۳)

اور فقہاء مالکیہ میں سے بعض فقہاء بیع النجس کو بوجہ منتفع بہ ہونے کے عند الضرورت جائز اور بعض مکروہ قرار دیتے ہیں جبکہ فقہ شافعی کے اصول وقواعد سے واضح طور پر اس کا جواز معلوم ہوتا ہے اور بر مذہب شافعی اس بیع کی صحت میں بظاہر کوئی مانع بھی نہیں ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں یہ بات دریافت طلب ہے کہ آج کل جبکہ یہ سیمنز قابلِ انتفاع ہوگئے ہیں، ان کا ضبط واحصاء بھی ممکن ہے، نیز عرفاً متقوم بھی سمجھے جاتے ہیں تو آیا ان کی خرید وفروخت شرعاً جائز ہوگی یا اب بھی ان کو ناجائز ہی کہا جائے گا؟ آں محترم سے مفصل اور محقق جواب کی درخواست ہے جزاکم اللہ تعالیٰ (عبدالرؤف سکھروی)

جواب: واضح ہو کہ جانوروں کی افزائش نسل ایسی چیز ہے جو مختلف انسانی ضروریات کے حوالے سے مفید بلکہ محتاج الیہ ہے، اب اس کی دو صورتیں ہیں ایک فطری یعنی نر و جفتی کرانا جس

کے لئے عموماً اسے کرایہ پر لئے جانے کی ضرورت پڑتی ہے، دوسرے مصنوعی یعنی سوال میں مذکورہ طریقہ سے جو ہر تولیدی کو مادہ کے رحم میں پہنچانا، اب جہاں تک نر کو اجارہ پر لینے کا تعلق ہے تو منسلکہ عبارات ملاحظہ کرنے اور کتب فقہ کی مراجعت سے ظاہر ہوا کہ ''اجارہ لعسب التیس'' جیسا کہ پہلے ناجائز تھا اس زمانے میں بھی اس کا یہی حکم ہے کیوں کہ اگر اس ''ماء مہین'' کو ضرورت وحاجت کی بناء پر متقوم اور مباح الانتفاع مانا جائے اور اس کی بیع وشراء کو فی نفسہ جائز بھی کہا جائے تب بھی اجارہ کی بنیادی شرائط میں خلل ہونے کی وجہ سے مثلاً: مستاجر کے غیر مقدور التسلیم ہونے اسی طرح اس کے مجہول ہونے کی وجہ سے یہ اجارہ جائز نہیں، جیسا کہ منسلکہ حوالہ جات وعبارات میں ''الکوکب الدری'' ج ۲، ص ۳۲۱ ''المبسوط'' ج ۱۶، ص ۴۱ '' الدر مختار'' ج ۶، ص ۵۵ ''اعلاء السنن'' ج ۱۶، ص ۱۶۸ سے ظاہر ہے۔

البتہ اس مادہ یا اس سے اخذ کئے گئے جوہر کے منفصل ہونے اور علیحدہ طور پر حاصل ہونے کے بعد اس کی بیع وشراء صحیح ہے یا نہیں؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ فقہی طور پر مبیع کے لئے جو بنیادی دو شرطیں ہیں یعنی مال ہونا اور متقوم ہونا تو ان میں سے پہلی چیز عرف وعادت پر مبنی ہوتی ہے اور آج کل جب یہ مادہ عرفاً ضرورت کی بناء پر محتاج الیہ ہونے کی وجہ سے مرغوب فیہ ہے جو کہ مدخر لوقت الحاجۃ بھی ہے، لہٰذا اسے مال مانا جائے گا۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: المراد بالمال ما يميل اليه الطبع ويمكن ادخاره لوقت الحاجة، والمالية تثبت بتمول الناس كافة او بعضهم، والتقوم يثبت بها وباباحة الانتفاع شرعا، فما يباح بلا تمول لا يكون مالا كحبة حنطة وما يتمول بلا اباحة انتفاع لايكون متقوما كالخمر، واذا عدم الامر ان لم يثبت واحد منهما كالدم، بحر ملخصا...... وحاصله ان المال اعم من المتقوم لان المال مايمكن ادخاره ولو غير مباح كالخمر والمتقوم مايمكن ادخاره مع الاباحة ......وفى البحر عن الحاوى القدسى: المال اسم لغير الآدمى، خلق لمصالح الآدمى وامكن احرازه والتصرف فيه على وجه الاختيار." (در المختار: ٤/ ٥٠١-٥٠٢)

البتہ متقوم ہونا چونکہ ''حل الانتفاع شرعاً'' پر موقوف ہے اس لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس سے شرعاً انتفاع جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک یہ مادہ ''سیمنز'' چونکہ نجس العین ہے اور مبیع کے لئے طاہر ہونا شرط ہے۔

کما فی مجموعة الفتاویٰ نقلا عن احیاء علوم الدین و الزبد و نور الانوار و غیرہ " فیعتبر فیہ (المبیع) ستہ شروط : الاول ان لا یکون نجسا فی عینہ، فلا یصح بیع کلب و خنزیر و لا یجوز بیع الخمر، فی المنهاج: وللمبیع شروط: منها طهارة عینه فلا یصح بیع الکلب و خمر المتنجس الذی لا یمکن تطهیرہ کالخل و اللبن، و فی الزبد: و یشترط فی المبیع ان یکون طاهرا، و فی نور الانوار : وله شروط : الاول ان یکون طاهرا، او یطهر بالغسل فلا یصح بیع کلب و خنزیر و فروعهما و المیتة کالعاج و جلدها قبل الدباغ و السرقین و الخمر." (۳، ۳۲۔۳۳)

تو اس بناء پر اس کی خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے لیکن دوسری طرف فقہاء کرام نے بیع العذرة والسرقین اور شراء شعر الخنزیر کو منتفع بہ ہونے کی وجہ سے اور اس کی طرف حاجت ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، یہ ضرورت و حاجت سیمنز کی بیع و شراء اور استعمال میں بھی ہے، لہٰذا یہ بھی مال متقوم اور اس کی خرید و فروخت بھی جائز ہونی چاہیے کیوں کہ ''سیمنز'' کے استعمال سے جو مقصد ہے، عادی طریقۂ تناسل سے اتنے وسیع پیمانے پر اس کا حصول اگر متعذر نہیں تو متعسر ضرور ہے۔ وھو ظاہر

نیز یہ کہ نجس چیز سے فائدہ اٹھانے کا جواز اور اس کی بیع و شراء کی صحت اس کے متبادل کے متعسر ہونے پر بھی موقوف نہیں، صرف حاجت کا تحقق ہی کافی ہے، جیسا کہ درج ذیل عبارات سے واضح ہے:

قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ: تنبیه : لم یذکروا حکم دود القرمز :اما اذا کانت حیة فینبغی جریان الخلاف الآتی فی دود القز و بزرہ و بیضه، و اما اذا کانت میتة و هو الغالب فانها علی ما بلغنا

تخنق فی الكلس او الخل، فمقتضی ما مر بطلان بیعها بالدراهم لانها میتة، وقد ذکر سیدی عبد الغنی النابلسی فی رسالة ان بیعها باطل وانه لا یضمن متلفها لانها غیر مال .

قلت: وفیه انها من اعز الاموال الیوم، ویصدق علها تعریف المال المتقوم ویحتاج الیها الناس کثیرا فی الصباغ وغیره، فینبغی جواز بیعها کبیع السرقین والعذرة المختلطة بالتراب کما یاتی، مع ان هذه الدودة ان لم یکن لها نفس سائلة تکون میتة لها طاهرة کالذباب والبعوض وان لم یجز اکلها وسیاتی ان جواز البیع یدور مع حل الانتفاع، انه یجوز بیع العلق للحاجة مع انه من الهوام، وبیعها باطل، کذا بیع الحیات للتداوی، وفی القنیة: وبیع غیر المسک من دواب البحر لو له ثمن کالسقنقور وجلود الخز ونحوها یجوز والا فلا، وجمل الماء قیل یجوز حیا لا میتا والحسن اطلق الجواز اه فتأمل." (درالمختار: ٥/٥١_٥٢)

وقال فی شرح التنویر: "عن ابی یوسف: یکره الخرزبه (بشعر الخنزیر) لانه نجس."

قال ابن عابدین رحمه اللّٰہ تعالیٰ(قوله لا نه نجس) : فیه ان النجاسة لا تنافی حل الانتفاع عند الضرورة کما علمت، لکن علل الزیلعی للکراهة بأن الخرز یتأتی بغیره، ومثله فی الفتح، وحیث تأتی بغیره فلا ضرورة فلا یحل الانتفاع بالنجس، قال فی الفتح: الا ان یقال ذلك فردتحمل مشقة فی خاصة نفسه فلا یجوز ان یلزم العموم حرجا مثله اه:وحاصله ان تاتی الخرز بغیره من شخص حمل نفسه مشقة فی ذلك لا تزول به ضرورة الا حتیاج الیه من عامة الناس " (ج٥،ص ٧٢)فعلم من هذا جواز حل الانتفاع بالنجس عند الحاجة وان لم تتحق الضرورة المصطلحة۔

وفی التنویر و شرحه: "کره بیع العذرة رجیع الآدمی خالصة، لا یکره بل یصح بیع السرقین ای الزبل خلافا للشافعی، وصح بیعها مخلوطة بتراب ..... کما صح الانتفاع بمخلوطها، ای العذرة بل بها خالصة علی ما صححه الزیلعی ..... وفی الملتقی ان الانتفاع کالبیع ای فی الحکم فافهم" قال ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ: "قوله فی الملتقی ان الظاهر انه اشار بنقله الی ان تصحیح الانتفاع بالخاصة تصحیح لجواز بیعها ایضا، وقوله فافهم تنبیه علی ذلك" (٦/٣٨٥)

وظاهر ان جواز البیع السرقین والعذرة المخلوطة بل والخالصة لیس مبنیا علی الضرورة المصطلحة بل علی الحاجة الی نمو المستغلات ای علی جلب النفع، والحاجة فی مسئلتنا لیس بأدون من هذا کما لا یخفیٰ علی متبصر.

حاجت یہاں بہرحال متحقق ہے کیوں کہ موجودہ دور میں تیز رفتار اور کثیر آبادی والی دنیا کو اتنے زیادہ وسائل درکار ہیں کہ ایسی چیزوں میں مصنوعی طریقہ اختیار کئے بغیر چارۂ کار نہیں۔

دوسری بات یہ کہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کے مطابق کسی چیز کا نجس ہونا اس کی بیع کے عدم جواز کی وجہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس سے جو انتفاع کیا جاتا ہے، اگر وہ فی نفسہ مباح ہوتو جائز ہے ورنہ نہیں، کما فی بیع العذرة والسرقین.

اب سیمنز سے انتفاع کی جو صورت ہے کہ اسے رحمِ مادہ میں پہنچا کر جودۃ نسل اور افزائش نسل کے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یہ فی نفسہ ایک جائز انتفاع ہے اور اس کی طرف حاجت بھی ہے، نیز یہاں انتفاع چونکہ استعمال الشئی فی محلّہ وموضعہ کی صورت میں ایک فطری مقصد کے حصول کے لئے ہے، اس بناء پر متقوم اور قابل انتفاع ہے اور اس (یعنی نفسِ انتفاع) جواز میں قید الحاجۃ کی بھی حاجت نہیں، لہٰذا اس کی بیع وشراء جائز ہے۔

یہاں یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ شیخین رحمہما اللہ تعالیٰ کے نزدیک بیع دود القز اس لئے جائز نہیں کہ بذاتہ منتفع بہ نہیں بلکہ انتفاع اس سے حاصل شدہ چیز سے ہے۔ کما فی الهدایة والفتح وغیرهما من الکتب

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہاں سیمنز کی ذات میں تبدیل ماہیت ہوکر اس سے بچہ حاصل ہوتا ہے، لہٰذا یہ لذاتہ منتفع بہ ہے، کیوں کہ مادیات میں ارتقاء اور تطور کا طریقہ یہی ہے کہ ہر پہلا مرحلہ دوسرے کے لئے بذاتہ موقوف علیہ ہوتا ہے اگر چہ دوسرے مرحلے پر پہنچنے کے بعد پہلا مرحلہ معدوم ہو جاتا ہے۔ کما ھو قاعدة المعدات۔

فی الھدایة: "ولا یجوز بیع جلود المیتة قبل ان تدبغ لانہ غیر منتفع بہ.

قال المحقق بعد ذکر سوال یرد علی المصنف: وھذا السوال لیس فی تقریر المصنف ما یرد علیہ لیحتاج الی الجواب منہ، فانہ ما علل المنع الا بعدم الانتفاع بہ وانما یرد علی من علل بالنجاسة ولا ینبغی ان یعلل بھا بطلان البیع اصلا، فان البیع دائر مع حرمة الانتفاع وھی عدم المالیة، فان بیع السرقین جائز وھو نجس العین لانتفاع بہ کما ذکرنا، واما جواز بیعھا (الجلود) بعد الدباغة، فلحل الانتفاع بھا حینئذ شرعاً، والحکم بطھارتھا زیادة تثبت شرعا." (ھدایہ مع الفتح: ج٦، ص٦٨) .... واللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم. (ماخوذ از رجسٹر نقل فتویٰ: ١٦٦/٤٣ دارالافتاء والارشاد کراچی)

شینل کمپنی کے کاروبار کا حکم:

سوال: ایک کمپنی "شنیل" کے نام سے موسوم ہے وہ "ہیلتھ مشین" جس کی قیمت تقریباً دس ہزار روپے ہے، بیچتی ہے، اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ جو یہ مشین خریدے گا اس کو کمپنی ممبر ایجنٹ بھی بنائے گی اور یہ ممبر بلاواسطہ صرف دو یا تین گاہک لانے کا مجاز ہوگا اور اس کو ہر گاہک پر تقریباً ایک ہزار چالیس روپے کمیشن دیا جائے گا۔

چونکہ اس کے لائے جانے والے گاہک بھی خریداری کے بعد ممبر اور ایجنٹ بن جائیں گے، وہ بھی اول کی طرح گاہک لانے کے مجاز اور کمیشن کے حقدار ہوں گے اور ان کے لائے ہوئے گاہکوں کی وجہ سے اول کو بھی کمپنی کچھ کمیشن دیتی ہے، اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، ممبر اور ایجنٹ زیادہ آنے کی وجہ سے اول ممبر اور ایجنٹ کا منصب بھی بڑھتا رہتا ہے، جس کو کمپنی مختلف نام

سے موسوم کرتی ہے، مثلاً: ایڈوانس منیجر وغیرہ، اسی منصب کی وجہ سے ان کو موبائل فون، گاڑی وغیرہ کی صورت میں انعامات بھی خاص اصول کے تحت ملتے ہیں، مندرجہ بالا تفصیل سے پیش نظر درج ذیل سوالات کے جوابات مطلوب ہیں

(۱) ''ہیلتھ مشین'' کی پوری قیمت ادا کرنا اور ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کمپنی کی رعایت کے مطابق ''ہیلتھ مشین'' کی قیمت میں سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار روپے نقد ادا کرنا ہوتا ہے اور بقیہ ساڑھے تین ہزار روپے بعد میں جب اس خریدار کو محنت کی وجہ سے بونس اور کمیشن ملتا ہے اس سے وصول کئے جاتے ہیں، یہ نقد، ادھار کا معاملہ کرنا اور اس صورت میں ممبر بننا جائز ہے یا نہیں؟

(۳) ہر ممبر کو بلاواسطہ گاہک لانے پر جو کمیشن ملتا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟

(٤) ہر ممبر کو بالواسطہ ممبروں کی وجہ سے جو کمیشن ملتا ہے وہ جائز ہے یا نہیں؟

(۵) منصب کے لحاظ سے موبائل فون وغیرہ کی شکل میں جو انعامات ملتے ہیں وہ جائز ہیں یا نہیں؟ (متعدد سائلین)

جواب: شریعت میں تجارت وکاروبار کے مشروع ہونے کی اصل حکمت وفلسفہ یہ ہے کہ روپے کی گردش سے حقیقی اثاثے اور خدمات وجود میں آئیں تاکہ معاشرے میں ہر فرد کے لئے ذریعہ معاش فراہم ہو سکے اور حقیقی اثاثوں وخدمات کی لین دین سے صحت مند معاشی سرگرمیاں وجود میں آسکیں، صرف ظاہری ہیر پھیر پر جس سے کوئی عملی فائدہ حاصل نہ ہو نفع کما لینا تجارت کے اصل منشاء کے خلاف ہے اور اس کی وجہ سے معیشت پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

سوال میں مذکور کمپنی کے کاروبار میں بھی یہی صورتحال ہے، ایک تو بنیادی عقد میں کئی خرابیاں ہیں اس کے علاوہ بالواسطہ ممبر بننے پر پہلے گاہک کو رقم ملنا اور اس کو ایک مستقل منصوبہ بندی کے تحت شکل دینا شرعی تجارت کے مقاصد کے خلاف ہے اور اس جیسی تجارت سے کے لئے جو ایک بین الاقوامی کمپنی کی مصنوعات کو مہنگے داموں فروخت کرنے کا ایک سرمایہ دارانہ حربہ ہے، صحیح محمل تلاش کرنا اور جواز کی صورتیں نکالنا بھی شریعت کے مزاج ومذاق کے خلاف ہے کیوں کہ یہ سارے وصول الی الحرام اور اکتناز دولت کے حیلے ہیں جو کہ اسلامک فائنانسنگ کے اغراض کے قطعاً خلاف ہیں اور سرمایہ دارانہ نظام کے پہیے ہیں جس سے معاشرے کے افراد کی صلاحیتیں تعمیری

سرگرمیوں سے ہٹ کر ایک محدود مانگ کی چیز کو عام کرنے اور ترغیبات کے زور سے زیادہ سے زیادہ فروخت کرنے میں صرف ہوتی ہیں، جو معاشرے کے لئے نقصان دہ اور ضرر عام کا باعث ہونے کی وجہ سے شرعاً غیر مستحسن ہے، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"لا یجوز للمفتی تتبع الحیل المحرمة والمکروهة، ولا تتبع الرخص لمن اراد نفعه، فان تتبع ذلك فسق وحرم استفتاؤه."

(اعلاء المواقعین: ۲/۵۳۵، دار البیان السعودیة)

وفی الطحطاوی علی الدر:" ویحرم التساهل فی الفتوی واتباع الحیل ان فسدت الاغراض. (۳/۱۷۵)

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں سوالات کے جوابات ملاحظہ ہوں:

(۱) کمپنی کے پورے حالات کا جائزہ لینے اور بار بار غور وفکر کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوا کہ "شینل"، کمپنی کا موجودہ کاروبار اور اس کا طریقہ کار شرعی نقطہ نظر سے صحیح نہیں لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ جو لوگ وہاں جاتے ہیں ان کا اصل مقصد کمپنی کا ایجنٹ بن کر مقررہ اصول کے تحت کمیشن حاصل کرنا ہے، لہٰذا اس کا شرعی حکم بھی اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے لگایا جائے گا۔ لأن الأمور بمقاصدها.

کسی کمپنی کا ایجنٹ بننا اور شرعی اصول کے مطابق دیانتداری سے محنت کر کے اجرت حاصل کرنا تو بلاشبہ جائز ہے، لیکن اس جیسے عقود ومعاملات کیلئے شریعت نے کچھ خاص قوانین مقرر فرمائے ہیں، جن کی رعایت انتہائی ضروری ہے اور ان میں کسی ایک شرط میں خلل آنے سے پورا معاملہ اور کاروبار ناجائز ہو جاتا ہے۔

ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا شریعت کے رو سے "عقد اجارہ" ہے اس کی بہت سی شرائط ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں ایسی خاص شرط نہ لگائی جائے جو اس معاملے کا حصہ نہ ہو بلکہ خارجی چیز ہو اور اس میں ایک طرف یا دونوں کا فائدہ ہو، لہٰذا اگر کوئی ایسی شرط لگائی جائے تو یہ معاملہ اور اس سے حاصل شدہ کمیشن وغیرہ شرعی رو سے ناجائز ہوگا۔

"شینل"، کمپنی میں ایجنٹ بننے کے لئے کمپنی کی طرف سے "ہیلتھ مشین" خریدنا شرط اور

ضروری قرار دیا گیا ہے جس کے بغیر کمپنی ایجنٹ بنانے پر تیار نہیں اور ظاہر بات ہے کہ ایجنٹ بنانے میں مشین خریدنے کی شرط لگانا شرعاً نہ اس معاملے کا حصہ ہے اور نہ اس کا تقاضا ہے اور اس کمپنی کا فائدہ ہے، لہٰذا ایجنٹ بننے بنانے کا یہ معاملہ شرعی رو سے ناجائز ہے، واضح رہے کہ اس صورت میں یہ تاویل صحیح نہیں کہ اجارہ اس وقت محقق ہی نہیں ہوتا اس لئے وہ مشین کی خریداری سے مشروط نہیں، کیوں کہ کمپنی مشین خریدنے کے بعد گاہک کو اس وقت ایجنٹ نہیں بناتی بلکہ اس کو ایک حق اختیار دے رہی ہے کہ اگر آپ چاہیں تو ہمارے ایجنٹ بن سکتے ہیں۔

یہ کہنا اس لئے صحیح نہیں کہ یہ بات تو اس شخص کے بارے میں ٹھیک ہے جو علاج وغیرہ کے لئے مشین خریدنا چاہتا ہو، لیکن جو شخص اس غرض سے جائے کہ مشین خرید کر ایجنٹ بننا چاہتا ہوں تو وہ مشین خریدتے ہی عملی طور پر ان کا ایجنٹ بن جاتا ہے، اس پر کئی قرائن وشواہد موجود ہیں، مثلاً:

۱۔ اگر مقصود صرف ایجنٹ بننے کا حق لینا دینا ہے تو پھر شرعی رو سے بھی اور عقلی اعتبار سے بھی ایجنٹ بنتے وقت ایجاب وقبول ضروری ہے، جبکہ یہاں کام اور محنت شروع کرتے وقت کمپنی اور ملازم کے درمیان الگ ایجاب وقبول نہیں ہوتا بلکہ خریدتے ہی طے شدہ معاہدہ کی بناء پر وہ کام شروع کر دیتا ہے اور کمپنی اسے بونس دینا شروع کر دیتی ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسی وقت سے یہ اجیر اور ایجنٹ ہے نہ کہ بعد میں کسی مرحلے پر ایجنٹ بنے گا۔

۲۔ یہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ لوگوں کا وہاں جانے سے مقصد ایجنٹ بن کر کمیشن حاصل کرنا ہوتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ یہ جس مقصد سے وہاں جاتے ہیں یعنی ایجنٹ بننے کے لئے، تو ایجنٹ بن کر ہی واپس ہوتے ہیں نہ کہ صرف ایجنٹ بننے کا حق حاصل کر کے۔

۳۔ کمپنی ہر اس شخص کے ساتھ ادھار کی رعایت کرتی ہے جو وہاں کا ایجنٹ بننے کی غرض سے حاضر ہو کر مشین خریدے اور طرفین یہ عقد اس بناء پر کرتے ہیں کہ خریدار محنت کر کے بونس کما کر بقیہ رقم ادا کر دے گا، تو اگر کمپنی کا مقصد ایجنٹ بنانا نہیں بلکہ ایجنٹ بننے کا حق دینا ہے تو پھر ہر ایک گاہک کے ساتھ ادھار کی رعایت کا کیا مطلب ہے؟ کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عملی طور پر ایجنٹ بنے ہی نہیں تو بقیہ رقم کہاں سے وصول کی جائے گی؟ لہٰذا ہر ایک گاہک کو ادھار کی رعایت دینا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کمپنی اسے عملی طور پر مشین خریدتے ہی ایجنٹ بنا دیتی ہے، ورنہ اس کی بقیہ رقم وصول ہونے کی کوئی معقول صورت نہیں ہوگی۔

٤۔ وہاں جانے والے عام طور پر بے روزگار اور پیسہ کمانے کے خواہشمند لوگ ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ وہاں جا کر محنت کر کے کچھ کمانے کیلئے جاتے ہیں نہ کہ صرف ایجنٹ بننے کا حق اور کاغذی دستاویز حاصل کرنے کیلئے۔

٥۔ ہر آدمی کو ایک (OPP) کلاس میں بٹھایا جاتا ہے، جس میں اسے ایجنٹ بننے کے فوائد وثمرات کے ساتھ ساتھ اصول وضوابط سے آگاہ کیا جاتا ہے، اگر صرف وہ ایجنٹ بننا چاہے گا تو اس وقت آ کر اصول وضوابط معلوم کر کے کام شروع کرے گا، لہٰذا اسی وقت کلاس میں شرکت کرنا کروانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ابھی سے ایجنٹ بن کر آگے محنت شروع کرے گا۔

مذکورہ بالا وجوہ سے واضح ہوگیا کہ اس کاروبار کے جائز ہونے کے لئے جو تاویل کی جاتی ہے وہ درست نہیں۔

(۲) اس میں مذکورہ مفاسد کے علاوہ بعض صورتوں میں جہالت اجل کی قباحت بھی ہے جو بیع کو فاسد اور ناجائز بنا دیتی ہے۔

(۳) جائز نہیں کیوں کہ جس کام پر کمیشن دیا جارہا ہے وہ بذات خود ایک ناجائز کام ہے، لہٰذا اس پر ملنے والا کمیشن یا اجرت بھی جائز نہیں۔

(٤) یہ بھی ایک گناہ کے کام (کمپنی کے کلائنٹ بنانے) پر دیا جاتا ہے جو کہ جائز نہیں۔

(٥) اس کا بھی یہی حکم ہے۔

حاصل یہ کہ کمپنی کے اس کاروباری ڈھانچہ میں بعض چیزیں تو فی نفسہ ناجائز ہیں اور بعض میں اگرچہ بذات خود جواز کا پہلو ہے لیکن اسلامی تجارت کے نقطۂ نظر کے ہم آہنگ نہیں، لہٰذا اس کی کسی طرح بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

(ماخوذ از رجسٹر نقل فتوی : دارالافتاء والارشاد کراچی)

ٹریڈ مارک (TRAD-MARK) خرید وفروخت کا حکم:

ٹریڈ مارک یا تجارتی ناموں کی خرید وفروخت اس وقت یورپی ممالک کے علاوہ اسلامی ملکوں میں بھی جاری ہے کیا شرعاً بھی ٹریڈ مارک کو تجارتی طور پر فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم کی تحقیق پیش خدمت ہے:

تجارتوں کی ترقی کے ساتھ تجارتی نام اور تجارتی علامت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ایک تاجر یا ایک تجارتی کمپنی مال تیار کرتی ہے اور اپنے تیار کردہ مال بہت سے لوگوں کو فراہم کرتی ہے اور بہت سے ممالک کو ایکسپورٹ کرتی ہے ایک ہی قسم کی مصنوعات اوصاف کے اختلاف کی بنیاد پر بہت مختلف ہوگئی ہیں اور یہ اوصاف مال تیار کرنے والی کمپنیوں یا افراد کے نام سے جانے جاتے ہیں، جب صارفین دیکھتے ہیں کہ منڈی میں فلاں کمپنی کے تیار کئے ہوئے مال کی اچھی شہرت ہے تو کمپنی کا نام سنتے ہی یا سامان پر اس کا ٹریڈ مارک دیکھتے ہی اسے خرید لیتے ہیں۔

اس طرح مصنوعات پر تجارتی نام اور ٹریڈ مارک گاہکوں کی زیادہ رغبت یا بے رغبتی کا سبب بن گیا ہے، اس لئے تاجروں کی نظر میں تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کی قیمت ہوگئی ہر وہ تجارتی نام جس نے لوگوں میں اچھی شہرت حاصل کرلی اس کے نام سے منڈی میں آئے ہوئے مال کی طرف خریداروں کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے جو تاجر اس نام سے منڈی میں مال لاتا ہے اس کا نفع بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

جب سے یہ بات شروع ہوئی کہ لوگ ان کمپنیوں کے نام کو استعمال کرنے لگے جنہیں صارفین میں اچھی شہرت حاصل ہے تاکہ اس نام سے ان کی مصنوعات بازار میں کھپ جائیں اور اس کی وجہ سے عامۃ الناس کے دھوکہ کھانے کا مسئلہ پیدا ہوا اس وقت سے حکومت کی طرف سے تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کا رجسٹریشن ہونے لگا اور تاجروں کو دوسروں کے رجسٹر کرائے ہوئے ناموں اور ٹریڈ مارکوں کو استعمال کرنے سے منع کردیا گیا۔ تاجروں کے عرف میں رجسٹریشن کے بعد ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی مادی قیمت ہوگئی اور تاجران ناموں کو مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے کیوں کہ انہیں ان تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں سے یہ امید ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے لوگ ان کی مصنوعات کی خریداری کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع جائز ہے؟ ظاہر ہے کہ نام یا علامت مادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اس نام یا علامت کے استعمال کا حق ہے اور یہ حق اصالۃ صاحب حق کے لئے اسبقیت اور حکومتی رجسٹریشن کی وجہ سے ثابت ہوا ہے یہ حق فی الحال ثابت ہے مستقبل میں متوقع نہیں ہے نیز یہ ایک ایسا حق ہے جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہوسکتا ہے لیکن یہ ایسا حق نہیں ہے جو پائیدار مادی چیز کے ساتھ متعلق ہو، لہذا فقہاء کے کلام سے ہم

نے جو قواعد نکالے ہیں ان کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دست برداری کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہیے، فروختگی کے ذریعہ جائز نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ حق ثابت اور مادی چیز میں استقرار پانے والی منفعت نہیں ہے۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے یہی فتوی دیا ہے اور انہوں نے اس مسئلہ کو مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے مسئلہ پر قیاس کیا ہے اور اس مسئلہ میں ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ کی وہ عبارت نقل کی ہے، جس کو ہم نزول عن الوظائف کے مسئلہ میں پیچھے نقل کر چکے ہیں پھر انہوں نے فرمایا:

اور کارخانے کا نام بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ ثابت علی وجہ الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کے لئے اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے، پس اس بنا پر اس عوض کے دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، گو لینے والے کے لئے خلاف تقوی ہے، مگر ضرورت میں اس کی بھی اجازت ہو جائے گی۔ (امداد الفتاوی ۳/۸۷)

احقر کا خیال یہ ہے کہ تجارتی نام کا حق اور ٹریڈ مارکوں کا حق اگر چہ اصل میں حق مجرد ہے جو کسی مادی محسوس چیز میں ثابت نہیں لیکن حکومتی رجسٹریشن جس کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے اور بے تحاشا مال خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کے بعد اس نام پر ٹریڈ مارک کی قانونی حیثیت ہو جاتی ہے جس کا اظہار اس تحریری سرٹیفکیٹ کے ذریعہ ہوتا ہے جو رجسٹریشن کرانے والے کو حکومت کے کاغذات میں اندارج کے بعد حاصل ہوتا ہے ان تمام مراحل کے بعد تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کا حق اس حق کے مثل ہو گیا جو کسی مادی چیز میں مستقر ہو اور تاجروں کے عرف میں یہ حق اعیان (مادی اشیاء) کے حکم میں ہو گیا لہٰذا بیع کے ذریعہ اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہیے اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بعض اشیاء کو اعیان میں داخل کرنے میں عرف کا بڑا دخل ہے کیوں کہ علامہ ابن عابدین کے بیان کے مطابق مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اس کی مثال بجلی اور گیس ہے جو گزشتہ زمانوں میں اموال و اعیان میں شمار نہیں ہوتی تھیں کیوں کہ یہ دونوں ایسی مادی چیز نہیں ہیں، جو قائم بالذات ہوں اور ان کا قبضہ میں کرنا بھی انسان کی طاقت میں نہیں تھا لیکن اب یہ دونوں چیزیں ان اہم قیمتی اموال میں سے ہیں جن کی خرید و فروخت کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کیوں کہ ان دونوں چیزوں میں حد درجہ نفع ہے اور ان کا احراز بھی ممکن ہے

لوگوں کے عرف میں بھی یہ دونوں چیزیں مال اور قیمتی چیز مانی جاتی ہیں۔

اسی طرح تجارتی نام ٹریڈ مارک رجسٹریشن کے بعد تاجروں کے عرف میں بڑی قیمتی چیزیں ہوتی ہیں اور ان پر یہ بات بھی صادق آتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تحریری سرٹیفکیٹ حاصل کرنے سے ان پر قبضہ ہو جاتا ہے اس لئے کہ ہر چیز کا قبضہ اس کے حسب حال ہوتا ہے اور ان پر یہ بات بھی صادق ہے کہ وقت ضرورت کے لئے ان کا ذخیرہ کیا جا سکتا ہے غرض یہ کہ کسی چیز کی مالیت پیدا کرنے کے لئے جو عناصر لازمی ہیں وہ سب تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں میں موجود ہیں صرف اتنی بات ہے کہ یہ ایسی مادی چیز نہیں جو قائم بالذات ہو اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس میں شرعاً کوئی مانع موجود نہیں ہے کہ ان کی خرید وفروخت کے جائز ہونے میں ان پر اموال کا حکم لگایا جائے لیکن اس جواز کی دو شرطیں ہیں۔

١۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک حکومت کے یہاں قانونی طور پر رجسٹرڈ ہو کیوں کہ جو نام ٹریڈ مارک رجسٹر نہیں ہوتا اسے تاجروں کے عرف میں مال نہیں شمار کیا جاتا۔

٢۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع سے صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ لازم نہ آئے مثلاً اس کی صورت یہ ہو کہ خریدار کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب اس سامان کو بنانے والا وہ فرد یا وہ ادارہ نہیں ہے جو پہلے اس نام سے سامان تیار کرتا تھا اور اس نام یا ٹریڈ مارک کو خریدنے والا اس نیت سے اس کو خریدے کہ وہ حتی الامکان کوشش کرے گا کہ اس کی مصنوعات سابقہ مصنوعات کے معیار کے برابر ہوں گی یا اس سے بہتر ہوں گی۔

لہٰذا اس اعلان کے بغیر تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کا دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا چونکہ صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ کا باعث ہوگا اور التباس اور دھوکا حرام ہے، جو کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ (فقہی مقالات: ١/ ٢٢٠)

تجارتی لائسنس کی خرید وفروخت کا حکم:

حضرت شیخ الاسلام دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

ہم نے تجارتی نام اور ٹریڈ مارک کا جو حکم اوپر بیان کیا ہے کہ ان دونوں کا عوض لینا جائز ہے بالکل یہی حکم تجارتی لائسنس پر بھی جاری ہوگا اس لائسنس کی حقیقت یہ ہے کہ عصر حاضر میں اکثر

ممالک اس کی بات اجازت نہیں دیتے کہ حکومتی لائسنس کے بغیر ایکسپورٹ یا امپورٹ کیا جائے بظاہر یہ چیز تاجروں پر ایک طرح کی پابندی ہے جسے اسلامی شریعت شدید ضرورت کے بغیر پسند نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اکثر ملکوں میں یہی ہو رہا ہے لہذا موجودہ حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس شخص کے پاس امپورٹ یا ایکسپورٹ کا لائسنس ہو وہ دوسرے تاجر کے ہاتھ اس لائسنس کو بیچ سکتا ہے یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ لائسنس کوئی مادی چیز نہیں ہے بلکہ دوسرے ملک میں سامان بیچنے یا دوسرے ملک سے سامان خریدنے کے حق کا نام ہے لہذا یہاں بھی یہی بات آئے گی جو ہم نے تجارتی نام کے بارے میں ذکر کی ہے کہ حق اصالۃً ثابت ہے لہذا مال کے بدلے میں اس سے دست برداری جائز ہوگی نیز حکومت کی طرف سے یہ لائسنس حاصل کرنے میں بڑی کوشش وقت اور مال صرف کرنا پڑتا ہے اور اس لائسنس کے حامل کو ایک قانونی پوزیشن حاصل ہو جاتی ہے جس کا اظہار تحریری سرٹیفکیٹ میں ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے حکومت یہ لائسنس رکھنے والے کو بہت سی سہولتیں مہیا کرتی ہے اور تاجروں کے عرف میں یہ لائسنس بڑی قیمت رکھتا ہے اور اس کے ساتھ اموال والا معاملہ کیا جاتا ہے لہذا یہ بات بعید نہیں ہے کہ خرید وفروخت کے جائز ہونے میں اسے مادی اشیاء کے ساتھ شامل کر دیا جائے لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہے جب کہ حکومت یہ لائسنس دوسرے آدمی کے نام منتقل کرنے کی اجازت دیتی ہو اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام ہو اور قانون دوسری کمپنی کی طرف اس کی منتقلی کی اجازت نہیں دیتا ہو تو اس لائسنس کی بیع جائز نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیوں کہ اس صورت میں لائسنس کی فروختگی سے جھوٹ اور دھوکہ لازم آئے گا اس لئے کہ لائسنس خریدنے والا بیچنے والے ہی کے نام سے استعمال کرے گا، نہ کہ اپنے نام سے، لہذا ایسا کرنا جائز نہیں ہوگا، البتہ اگر لائسنس یافتہ شخص کسی کو اپنی طرف سے بیچنے اور خریدنے کا وکیل بنا دے تو اس صورت میں اس وکیل کے لئے اس لائسنس کے ذریعہ خرید وفروخت جائز ہوگی۔ (فقہی مقالات: ۱ / ۲۲۳)

حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ یہ لائسنس مال نہیں ہے جبکہ مبیع کا مال ہونا انعقاد بیع کیلئے شرط لازم ہے لہذا تجارتی اجازت نامہ (لائسنس) کی بیع جائز نہیں۔ (ماخوذ از احسن الفتاویٰ: ۶ / ۵۲۶)

لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ اس کی خرید وفروخت نہ کی جائے۔

حق تصنیف فروخت کرنے کا حکم:

حق تصنیف فروخت کرنا اور اس کا عوض لینا شرعاً جائز ہے یا نہیں اس بارے میں علماء کی دو رائے ہیں۔ ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یہ کوئی ایسا ثابت شدہ حق نہیں جس کو فروخت کر کے عوض لیا جائے چنانچہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق تصنیف کی مروج بیع جائز نہیں اس لئے مصنف کا کوئی مخصوص حق ہے ہی نہیں ہاں صرف مسودہ اس کی ملک ہے اس کو بیچ سکتا ہے۔ (احسن الفتاوی: ۶/ ۵۳)

حضرت شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم کی تحقیق یہ ہے کہ حق تصنیف مستقل حق ہے اس کو فروخت کرنا جائز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جو عرف اور قانون کی بنیاد پر اس شخص کو حاصل ہوتا ہے جس نے کوئی نئی چیز ایجاد کی ہو یا کسی چیز کی نئی شکل ایجاد کی ہو، حق ایجاد کا مطلب یہ ہے کہ تنہا اسی شخص کو اپنی ایجاد کردہ چیز بنانے اور منڈی میں پیش کرنے کا حق ہے پھر بسا اوقات ایجاد کرنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کو خریدنے والا ایجاد کرنے والے کی طرح تجارت کے لئے وہ چیز تیار کرتا ہے اسی طرح جس شخص نے کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہے اسے اس کتاب کی نشر و اشاعت اور تجارتی نفع حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے بسا اوقات کتاب لکھنے والا یہ حق دوسرے کے ہاتھ بیچ دیتا ہے تو اس حق کا خریدار نشر و اشاعت کے بارے میں ان حقوق کا مالک ہو جاتا ہے، جو مصنف کتاب کو حاصل تھا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حق ایجاد اور حق تصنیف و حق اشاعت کی فروختگی جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں فقہائے معاصرین کی دو رائیں ہیں، کچھ علماء نے اسے جائز کہا ہے اور کچھ علماء نے ناجائز کہا ہے۔

اس سلسلہ میں بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا حق ایجاد یا حق اشاعت شریعت اسلامیہ کی طرف سے تسلیم شدہ حق ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے کوئی نئی چیز ایجاد کی، خواہ وہ مادی چیز ہو یا معنوی چیز، بلاشبہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے اپنے انتفاع کے لئے تیار کرنے اور نفع کمانے کے لئے بازار میں لانے کا زیادہ حق دار ہے کیوں کہ ابوداؤد میں حضرت اسمر بن مضرس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر بیعت کی تو

آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اس چیز کی طرف سبقت کی جس طرف کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی تو وہ چیز اس کی ہے۔

(ابو داؤد فی الخراج فیل احیاء الموات: ٤/ ٢٦٤، حدیث نمبر ٢٩٤٧)

علامہ مناویؒ نے اگرچہ اس بات کو راجح قرار دیا ہے کہ یہ حدیث افتادہ زمین کو قابل کاشت بنانے کے بارے میں آئی ہے، لیکن انہوں نے بعض علماء سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ہر چشمہ، کنواں اور معدن کو شامل ہے اور جس شخص نے ان میں کسی چیز طرف سبقت کی تو وہ اسی کا حق ہے، اس بات میں شبہ نہیں کہ لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے سبب کے خاص ہونے کا اعتبار نہیں ہوتا۔

(فیض القدیر: ٦/ ١٣٨)

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ حق ایجاد ایک ایسا حق ہے جسے اسلامی شریعت اس بنیاد پر تسلیم کرتی ہے کہ اس شخص نے اس چیز کے ایجاد کرنے میں سبقت کی ہے تو حق ایجاد پر وہی سارے احکام منطبق ہوں گے جو ہم نے حق اسبقیت کے بارے میں ذکر کئے ہیں وہاں ہم نے ثابت کیا تھا کہ بعض شافعیہ اور حنابلہ نے اس حق کی بیع کو جائز کہا ہے لیکن ان حضرات کے یہاں بھی راجح قول یہی ہے کہ حق اسبقیت کی بیع جائز نہیں ہے لیکن مال کے بدلہ میں اس حق سے دست بردار ہونا جائز ہے، وہاں ہم نے شرح منتہی الارادات سے بہوتی کی وہ عبارت بھی نقل کی ہے جو تحجیر اور حق جلوس فی المسجد سے دست برداری کے جواز کے بارے میں ہے اور اس کے علاوہ حق اسبقیت اور حق اختصاص کے دوسرے احکام بھی بیان کئے ہیں ان کا تقاضہ یہ ہے کہ حق ایجاد یا اشاعت سے عوض لے کر دوسرے شخص کے حق میں دست بردار ہونا جائز ہے، لیکن یہ حکم اصل حق ایجاد اور حق اشاعت کے سلسلہ میں ہے لیکن اگر اس حق کا حکومتی رجسٹریشن بھی کرالیا گیا ہو جس کے لئے موجد اور مصنف کو محنت کرنی پڑتی ہے مال اور اور وقت خرچ کرنا پڑتا ہے اور جس کی وجہ سے یہ حق ایک قانونی حق ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے ایک سرٹیفکیٹ جاری کردیا جاتا ہے اور تاجروں کے عرف میں اسے قیمتی مال شمار کیا جاتا ہے تو یہ بات بعید نہیں ہوگی کہ اس رجسٹرڈ حق کو مروجہ عرف کی بنیاد پر اعیان واموال کے حکم میں کردیا جائے اور ہم پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ بعض اشیاء کو اموال واعیان کے حکم میں داخل کرنے میں عرف کو بڑا دخل ہے اس لئے کہ مالیت لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور رجسٹریشن کے بعد اعیان کی طرح اس حق کا

احراز بھی ہوتا ہے اور وقت ضرورت کے لئے اس کا ذخیرہ بھی کیا جاتا ہے تو اس عرف کا اعتبار کرنے میں کتاب وسنت کے کسی نص کی ممانعت نہیں ہے بہت سے بہت قیاس کی مخالف ہے اور قیاس کو عرف کی وجہ سے ترک کر دیا جاتا ہے جیسا کہ یہ بات اپنی جگہ ثابت ہو چکی ہے۔

انہی پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے علماء معاصرین کی ایک جماعت نے اس حق کی بیع کے جائز ہونے کا فتوی دیا ہے ان میں برصغیر کے علماء میں سے مولانا فتح محمد لکھنوی (مولانا عبدالحی لکھنوی کے شاگرد) مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند مفتی عبدالرحیم لاجپوری صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حق ایجاد اور حق تصنیف کی بیع کو ناجائز کہنے والوں نے پہلی دلیل یہ پیش کی ہے کہ حق ایجاد مجرد حق ہے عین نہیں ہے اور حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں، لیکن فقہاء کا جو کلام پیچھے تفصیل سے آچکا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حقوق کا عوض لینے کا عدم جواز ہر حال میں نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے جو ہم نے حقوق کی مختلف قسموں میں بحث کرتے ہوئے بیان کی ہے۔

مانعین جواز کی دوسری دلیل یہ ہے کہ جس شخص نے کوئی کتاب دوسرے کے ہاتھ فروخت کی اس نے خریدار کو اس کتاب کا اس کے پورے اجزاء کے ساتھ مالک بنا دیا، لہٰذا خریدار کے لئے جائز ہے کہ اس کتاب میں جس طرح چاہے، تصرف کرے، لہٰذا اس کے لئے اس کتاب کی اشاعت بھی جائز ہونی چاہیے اور بیچنے والے کو خریدار پر اس سلسلے میں پابندی لگانے کا اختیار نہ ہونا چاہیے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ کسی چیز میں تصرف کرنا الگ چیز ہے اور اس کی مثل دوسری چیز بنانا دوسری چیز ہے، کتاب خرید کر وہ پہلی قسم کے تصرف کا تو مالک ہو گیا کہ اسے پڑھ کر نفع اٹھائے یا بیچے یا رعایت پر دے یا ہبہ کر دے اور اس طرح کے دوسرے تصرفات کرے لیکن اس جیسی دوسری کتاب کی اشاعت خریداری کے منافع میں شامل نہیں کہ کتاب کا مالک بننے سے اس کی حق اشاعت کا بھی مالک ہو جائے، اس کی مثال حکومت کے ڈھالے ہوئے سکے ہیں، ان سکوں کو اگر کسی نے خریدا تو ان سکوں کے دوسرے سکے ڈھالنا جائز نہیں ہوگا اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کسی چیز کی ملکیت اس بات کو مستلزم نہیں کہ مالک کو اس جیسی دوسری چیز بنانے کا حق ہو۔

مانعین کی تیسری دلیل یہ ہے کہ ایجاد کردہ چیز کو تیار کرنے اور تصنیف کردہ کتاب کو طبع کرنے

سے موجد اور مصنف کا خسارہ نہیں ہوتا بہت سے بہت یہ ہوتا ہے کہ موجد اور مصنف کا نفع کم ہو جاتا ہے نفع کم ہونا الگ چیز ہے اور خسارہ ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

اس دلیل کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ نفع کم ہونا اگر چہ خسارہ نہ ہو لیکن ضرر ضرور ہے، خسارہ اور ضرر میں واضح فرق ہے یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ جس شخص نے کوئی چیز ایجاد کرنے یا کتاب تصنیف کرنے کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقتیں جھیلیں، بے پناہ مال اور وقت صرف کیا، اس کے لئے راتوں کو جاگا، راحت و آرام قربان کیا وہ اس ایجاد اور کتاب سے نفع حاصل کرنے کا اس شخص سے زیادہ حقدار ہے جس نے معمولی سی رقم خرچ کر کے ایک منٹ میں وہ ایجاد شدہ چیز یا کتاب خرید لی پھر موجد اور مصنف کے لئے مارکیٹ تنگ کرنے لگا۔

مانعین جواز کی طرف سے یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ فرد واحد کے لئے حق اشاعت تسلیم کر لینا کتمان علم کا سبب بنتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ کتمان علم تو اس صورت میں ہوتا، جب مصنف لوگوں کو اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے اور دوسروں تک پہنچانے سے روکتا، لیکن جو شخص حق اشاعت محفوظ کرتا ہے وہ کسی کو کتاب پڑھنے، پڑھانے اور اس کے مضامین کی تبلیغ و اشاعت سے نہیں روکتا بلکہ وہ اس کی فروخت اور تجارت سے بھی نہیں روکتا وہ تو صرف اس بات سے روکتا ہے کہ کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر کتب طبع کر کے نفع اٹھائے، یہ بات ہرگز کتمان علم کے دائرے میں نہیں آتی۔

مانعین جواز کی آخری دلیل یہ ہے کہ حق طباعت محفوظ کرنے سے کتاب کی اشاعت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے اگر ہر شخص کو کتاب کی طباعت کا حق ہو تو اس کی نشر و اشاعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے گا اور اس کی افادیت زیادہ عام اور ہمہ گیر ہو جائے گی۔

یہ بات بلاشبہ امر واقعہ ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اگر ہم دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دلیل ان کے خلاف پلٹ جاتی ہے، وہ پہلو یہ ہے کہ اگر ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجادات سے نفع حاصل کرنے میں اسبقیت کے حق میں محروم کر دیا جائے تو نئی ایجادات کے لئے بڑے منصوبوں کا خطرہ مول لینے سے ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی کیوں کہ ان کو احساس یہ ہوگا کہ انہیں معمولی نفع ہی ملے گا اور اسی طرح کے امور جن میں دو پہلو ہوں فقہی مسائل کا فیصلہ نہیں کرتے، جب تک کہ کسی چیز میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو، اس لئے کہ تمام مباح چیزوں میں ضرر و نفع

دونوں کے پہلو ہوتے ہیں۔

خاتمہ:

یہاں یہ بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حقوق طبع واشاعت کی بیع کے عدم جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے، چنانچہ اس مسئلہ پر انہوں نے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا جو "جواہر الفقہ" کا جز بن کر شائع ہو چکا ہے، لیکن اس رسالے کو لکھنے کے بعد انہوں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ اس مسئلہ پر دوبارہ تحقیق اور غور وخوض کر کے اس کو اور زیادہ منقح کیا جائے اور اس غور وخوض اور بحث وتمحیص کے بعد جو رائے بھی سامنے آئے، اس کو قبول کرلیا جائے، مگر حضرت والد ماجد کو اس کی تحقیق کی فرصت نہ ملی تو انہوں نے دو مرتبہ یہ مسئلہ میرے سپرد فرمایا کہ میں اس کی مکمل تحقیق کروں، چنانچہ میں نے اس مسئلے کا مواد اسی وقت سے جمع کرنا شروع کردیا تھا، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں اس کی تکمیل مقدر نہیں تھی، چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے کافی عرصہ بعد اس مسئلہ کی تحقیق مکمل کرنے کی توفیق ہوئی .... اس طرح یہ بحث حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کی بجا آوری میں لکھی گئی ہے، اگرچہ جس نتیجے پر میں پہنچا ہوں وہ بظاہر ان کی رائے کے خلاف ہے، مگر وہ خود بھی اس مسئلے پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور آج یہ بات معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ ان کی رائے کے موافق ہے یا مخالف۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ماخوذ از فقہی مقالات: ۱/ ۲۲٤)

کاریز کے پانی کی باری فروخت کرنا:

بعض علاقوں میں باغات کو کاریز سے سیراب کیا جاتا ہے وہاں کاریز کے مالک پانی کی باری کو ایسے لوگوں پر فروخت کردیتے ہیں جن کا حصہ کاریز کے پانی میں نہیں ہوتا، اس طرح زمین کے بغیر صرف پانی کی باری فروخت کرنا مفتیٰ بہ قول کے مطابق درست نہیں، درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کاریز کے پانی کو بیچنے کی صورت میں دھوکہ (غرر) اور مقدار میں جہالت پائے جانے کا قوی احتمال موجود ہے کیوں کہ ہوسکتا ہے پورے سال کاریز میں پانی ہی نہ آئے اور آنے کی صورت میں مخصوص دنوں کم وزیادہ ہوسکتا ہے، اس لئے عام حالات میں اس کا بیچنا جائز نہیں، البتہ اگر کوئی خاص جگہ ایسی ہو کہ جہاں کاریزوں کے پانی ایک مقررہ مقدار میں ہر وقت موجود رہتا ہو جس سے

غرر اور جہالت ختم ہو جائے تو اس صورت میں ایسی جگہ کی باری چند متعین دنوں کے لئے بیچنا جائز ہوگا۔ (بحوث قضایا فقھیہ : صـ۹۳)

بینک کے کاغذات کی چھپوائی کا کام کرنا:

بینک اپنے اکاؤنٹ نمبرز کے کارڈ، فائلیں، چیک بک اور دیگر کاغذات وغیرہ چھاپنے کا ٹھیکہ دیتا ہے، تو اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ بینک میں جو کام حلال ہوتے ہیں، جیسے چیک بک اور کرنٹ اکاؤنٹ کے کاغذات وغیرہ، ان کے چھپوانے کا ٹھیکہ لینا درست ہے اور بینک کے حلال مال سے اس کی اجرت لینا جائز ہے (یعنی کام لیتے وقت یہ شرط رکھے کہ اجرت حلال مال سے دی جائے) البتہ جو کام بینک میں سودی لین دین کا ہوتا ہے اس کے کاغذات چھپوانے کا ٹھیکہ لینا جائز نہیں اور اس کی اجرت بھی حلال نہیں۔

(امداد الفتاوی : ۳۹۹/۳ ، جواہر الفقہ : ۴۵۳/۲)

بیوی کے نام زمین خریدی تو مالک کون ہوگا؟

بعض لوگ پلاٹ یا مکان خریدتے وقت اپنے نام کے بجائے بیوی یا بچوں میں سے کسی کا نام لکھوا دیتے ہیں یا بعض علاقوں میں زمین / پلاٹ قرعہ اندازی کے ذریعہ فروخت کئے جاتے ہیں، بہر حال کسی مصلحت سے اپنے نام کے بجائے گھر کے کسی فرد کے نام لکھدیا جاتا ہے، سرکاری کاغذات میں اسی کے نام پر ہوتا ہے جس کا نام ابتداء میں لکھوایا گیا ہے اب نام لکھوانے کی وجہ سے وہ شخص حقیقۃ مالک بن جائے گا یا نہیں اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے امداد المفتیین سے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: زید نے کسی وجہ سے زمانہ ملازمت میں اپنے روپے سے اپنی بیوی کے نام ایک قطعہ زمین خریدا اور پھر اس پر اپنی رقم سے مکان تعمیر کرایا، اس کے بعد بیوی کا انتقال ہوگیا، ورثاء میں ایک لڑکا، ایک لڑکی اور شوہر ہے اور مکان بیوی کی وفات سے تا حال زید کے قبضہ میں ہے زید نے بچوں کی شادی کرا دی اب زید خود اس کا مکان میں تنہا مقیم ہے تو مکان زید ہی کا ہوگا یا بیوی کا ترکہ شمار ہو کر بیوی کے ورثہ میں تقسیم ہوگا۔

جواب: صورت مذکورہ میں جس وقت زمین بیوی کے نام خریدی گئی اگر شوہر کی نیت یہ تھی کہ بیوی کو یہ زمین ہبہ کرتا ہوں پھر بیوی کو ہبہ کر کے مالکانہ قبضہ دیدیا ہو تب تو یہ زمین متوفیہ بیوی

کے ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہوگی اور اس پر تعمیر شدہ مکان زید کی ملک رہے گا اور اگر زید کی نیت ھبہ کرنے کی نہ تھی اور ایسے الفاظ بھی استعمال نہیں کئے کہ میں نے تجھے ہبہ کردی (دیدی ہے) بلکہ محض کسی مصلحت سے سرکاری کاغذات میں بیوی کا نام اندارج کرادیا تھا تو اس سے بیوی مالک نہیں ہوئی بلکہ شوہر ہی مالک رہا، اب صرف شوہر ہی کا حق ہے، بیوی کے ورثاء کو اس میں حصہ نہ ملے گا، صرح بہ فی الفتاوی الاسعدیہ۔ (امداد المفتیین: ص ۷۰۰)

اس سے معلوم ہوا کہ صرف نام اندارج کرانے سے ملک ثابت نہ ہوگی بلکہ ثبوت ملک کے لئے ہبہ اور قبضہ ضروری ہے، جب تک خریدتے وقت یا خریدنے کے بعد باضابطہ ہبہ کرکے قبضہ میں نہ دیدیا جائے صرف نام لکھوانے کی بناء پر ملک کا دعوی صحیح نہیں ہے۔

والدین کی زندگی میں بیٹے کا اپنے نام جائیداد خریدنا:

سوال: عمرو نے اپنے والد زید کی حیات میں اس کے سرمایہ سے ایک مکان اور کچھ جائیداد اپنے نام سے خریدی، لیکن مرحوم نے کوئی تعرض نہیں کیا نہ اپنے نام منتقل کرایا، جائیداد مذکورہ پر ۱۹ سال تک زید مرحوم ہی قابض و متصرف رہے، اس کی آمدن کو اپنے تصرف میں لاتے رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ زید کے انتقال کے بعد وہ زمین عمرو کی ہی رہے گی یا زید کے ترکے میں شامل سمجھی جائے گی؟

جواب: عمرو نے جو زمین اپنے والد کی حیات میں اپنے نام سے خریدی ہے اور باپ نے اس سے تعرض نہیں کیا اور نہ اپنے نام کروائی اور نہ انتقال رسمی کا مطالبہ کیا اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت کا ہے کہ عمرو کے نام فرضی بیع نامہ کسی مصلحت سے کی گیا نہ اصل بیع وشراء زید کے لئے تھی تو اس صورت میں وہ زمین عمرو ہی کی قرار پائے گی اور باپ کا اس کی آمدن میں تصرف کرتے رہنا یہ ملک والد کی علامت نہ ہوگی کیوں کہ اس کا مبنی اشتراک مصارف واختلاط ہے۔

قال فی تنقیح الفتاوی الحامدیه: نقلا عن البزازیه والوالجیة وعبارتها رجل تصرف زمانا فی ارض ورجل اخر ای الارض والتصرف ولم یدع ومات علی ذلك لم تسمع بعد ذلك دعوی ولده فتترك فی یدالمتصرف لان الحال شاهد او قلت وشراءه علی اسمه تصرف قوی و کذا الادخال والاخراج علی اسمه واداء خراج

الحکومة وغیر ھا من لوازم البیع باسمه .

(امداد الاحکام: ۳/ ۳۷۱)

مروج کمیٹی (بی سی) کا حکم:

آج کل ہر علاقے میں یہ رواج ہے کہ چند افراد مل کر ایک کمیٹی بنا لیتے ہیں، ہر ماہ کمیٹی کا ہر رکن ایک متعین مقدار میں رقم جمع کرتا ہے، پھر جمع شدہ رقم پر قرعہ اندازی ہوتی ہے، ارکان کمیٹی میں سے جس کا نام قرعہ میں برآمد ہو، اس کو جمع شدہ کل رقم ادا کر دی جاتی ہے، ایسے ہر ماہ چکر چلتا ہے، باری باری ہر رکن کمیٹی کو اس اکٹھی رقم سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہتا ہے، اس کو امداد باہمی کی ایک شکل سمجھا جاتا ہے، معلوم یہ کرنا ہے کہ کیا شرعاً یہ صورت جائز ہے؟

بندہ کو اس معاملے میں چند شبہات ہیں

(۱) ہر رکن اس امید پر شریک ہوتا ہے کہ اس کی تھوڑی رقم ایک کثیر رقم کھینچ کر لائے گی، گویا ایک بڑی رقم بطور قرض حاصل کرنے کے لئے ایک چھوٹی رقم اپنی جیب سے نکالتا ہے، استقراض کی یہ شکل غلط ہے کیوں کہ کل قرض "جر نفعا فهو ربوا" فرمایا گیا ہے۔

(۲) موجودہ صورت میں قرعہ اندازی سے قرض حاصل کرنا قمار نہ سہی، قمار کے مشابہ ضرور ہے۔

(۳) کوئی ممبر قرض کی رقم حاصل کرنے کے بعد اگر اپنا ماہانہ چندہ بند کر دے تو نزاع پیدا ہوگا، ظاہر ہے کہ ایسے معاملات شرعاً غلط ہوتے ہیں۔

(٤) یہ ممکن ہی نہیں بلکہ امر واقع ہے کہ جو واقعۃً ضرورت مند ہے، قرعہ میں نام نہ نکلنے کی وجہ سے عرصہ تک قرض حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے اور اپنی احتیاج کے باوجود ہر ماہ چندہ کی رقم اداء کر کے مزید مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے، لہذا یہ امداد باہمی نہیں بلکہ ایک حاجت مند پر ظلم ہے۔

(٥) ہر رکن کمیٹی کو ہر ماہ چندہ دیتا ہے جس کمیٹی کا وہ خود بھی رکن اور جزء ہے، سو ہر فرد اپنے آپ کو قرض دینے والا ہوا یہ ایک مہمل امر ہے، بینوا تو جروا۔

جواب: کمیٹی کا مروجہ طریقہ بلا شبہ ناجائز ہے، البتہ جواز کی یہ صورت ہوسکتی ہے کہ شرائط ذیل کی مکمل پابندی کی جائے۔

(۱) بنام کمیٹی جمع کردہ رقم سب شرکاء کی رضا سے بلاقرعہ کسی ایک کو بطور قرض دی جائے یا بذریعہ قرعہ دی جائے مگر قرعہ کے نتائج کو لازم نہ قرار دیا جائے بلکہ سب شرکاء کی رضا کو صرف تسہیل انتخاب کا ایک ذریعہ سمجھا جائے۔

(۲) ہر شریک کو ہر وقت الگ ہو جانے کا اختیار ہے، کوئی جبر نہ ہو بلکہ ایک یا چند مرتبہ رقم کسی شریک کو دے دینے کے بعد بھی ہر شریک کو علیحدہ ہو جانے کا پورا اختیار ہو اور اسے دی ہوئی رقم واپس لینے کے مطالبہ کا پورا حق ہو، اس پر شرکاء میں سے کسی کو اعتراض نہ ہو۔

(۳) ایک ماہ کی مدت کو لازم نہ قرار دیا جائے، ہر شریک کو ہر وقت بطور قرض دی ہوئی اپنی رقم کی واپسی کے مطالبہ کا حق ہو۔

شرائط مذکورہ کے تحت معاملہ کیا جائے تو اس پر سوال میں مندرج اشکالات وارد نہ ہوں گے، تفصیل یہ ہے:

(۱) اس اشکال کے دو جواب ہیں:

ل یہاں جر نفع مستقرض سے نہیں غیر سے ہے۔

ب جب ہر شخص کو ہر وقت الگ ہونے کا اختیار ہوگا تو یہ نفع مشروط نہ ہوا۔

(۲) شرط اول کے تحت قمار رہا نہ قمار سے مشابہت۔

(۳) یہ صورت تو ہر قرض میں ہوتی ہے کہ قرض خواہ کو مطالبہ کا حق ہوتا ہے، البتہ ایک ماہ کی تأجیل باطل ہے اور یہ بطلان شرط ثالث سے مرتفع ہو گیا۔

(٤) شرط ثانی کے تحت ہر شریک کو ہر مرحلہ پر اختیار ہوگا اور وہ جب چاہے اپنی دی ہوئی رقم واپس لے سکے گا تو یہ اشکال نہ رہا۔

(٥) قرض کمیٹی کو نہیں دیا جاتا بلکہ جس کے نام قرعہ نکلتا ہے اسے دیا جاتا ہے، کمیٹی کے منتظمین کا قبضہ وکالۃ ہے۔

سیاہ خضاب تیار کرنا اور فروخت کرنا:

خالص سیاہ خضاب کا استعمال سر میں ہو یا داڑھی میں مرد وعورت دونوں کے لئے حرام ہے، البتہ سیاہ خضاب تیار کرنا اور فروخت کرنا جائز ہے، اس لئے کہ ایک محل اس کے جواز کا بھی موجود ہے یعنی دشمن پر ہیبت بٹھانے کے لئے مجاہدین استعمال کریں البتہ بنانا بیچنا خلاف اولیٰ ہے مگر

ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جائز نہیں جس کے متعلق یقین ہو کہ ناجائز طور پر استعمال کرے گا۔

(کما فی رد المحتار وغیرہ احسن الفتاوی، ۸/ ۳۷٤)

تالاب میں مچھلی کی بیع جائز نہیں:

سوال: تالاب میں مچھلیوں کی بیع جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: اگر یہ تالاب شروع ہی سے مچھلی کے لئے تیار نہیں کیا گیا، یا مالک نے خود اس میں مچھلیاں نہیں چھوڑیں تو یہ مچھلیاں تالاب کے مالک کی ملک نہیں اور غیر مملوک کی بیع باطل ہے۔

اور اگر ابتداء ہی سے تالاب مچھلیاں پکڑنے کے لئے تیار کیا گیا ہے یا اس میں مچھلیاں خود مالک نے چھوڑدی ہوں یا نہر وغیرہ سے مچھلیاں تالاب میں آئیں اور تالاب کے مالک نے پانی کا راستہ بند کرکے مچھلیاں تالاب میں محبوس کرلیں تو یہ مچھلیاں اس کی مملوک ہیں، مگر غیر مقدور التسلیم ہونے کی وجہ سے ان کی بیع فاسد ہے، البتہ اگر تالاب اس قدر چھوٹا ہو کہ بدون تکلیف وحیلہ اس سے مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہوں اور مچھلیوں کی مقدار بھی معلوم ہو تو بیع درست ہے۔

قال فی شرح التنویر :وبیع مالیس فی ملکه لبطلان بیع المعدوم وماله خطر العدم لا بطریق السلم فانه صحیح .

وایضاً فیه: وفسد بیع سمك لم یصد(الی قوله)او صید ثم القی فی مکان لا یؤخذ منه الا بحیلة للعجز عن التسلیم وان اخذ بدونها صح وله خیار الرؤیة الا اذا دخل بنفسه ولم یسد مدخله فلو سده ملکه (الی قوله) وبیع طیر فی الهواء لا یرجع بعد ارساله من یده اما قبل صیده فباطل اصلاً لعدم الملك .

وفی الشامیة تحت (قوله وفسد بیع سمك لم یصد الخ)وفیه ان بیع مایس فی ملکه باطل کما تقدم لانه بیع المعدوم لیس بمال فینبغی ان یکون بیعه باطلا .

وایضا فیها: (قوله فلو سده ملکه) ای فیصح بیعه ان امکن اخذه بلا حیلة والا فلا لعدم القدرة علی التسلیم والحاصل کما فی الفتح انه اذا دخل السمك فی حظیرةفاماان یعدها لذلك اولا ففی الاول

یمسکہ ولیس لاحد اخذہ ثم ان امکن۔

(احسن الفتاوی: ٦/٤٨١)

وکیل بالشراء کا زیادہ قیمت وصول کرنا:

کمپنی بعض ملازمین کو اس مقصد کے لئے رکھتی ہے کہ وہ بازار سے سامان خرید کر لایا کریں، وہ کم قیمت میں سامان خرید کر دکاندار سے زیادہ قیمت کا بل بنواتے ہیں اور کمپنی سے زائد رقم وصول کرتے ہیں، کیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اسی طرح تعمیر مکان وغیرہ کا ٹھیکیدار لوہا وغیرہ کم قیمت پر خرید کر مالک مکان سے حساب میں زیادہ رقم ظاہر کر کے وصول کرتا ہے، کیا یہ جائز ہے؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ ملازم اور ٹھیکیدار وکیل بالاجرۃ ہیں ان پر لازم ہے کہ مالک کے ساتھ امانت داری کا معاملہ کریں اور صرف اصل قیمت وصول کرے، اصل قیمت سے زیادہ وصول کرنا، ناجائز اور حرام ہے۔

ایک حیلہ باطلہ:

اگر ٹھیکیدار یا ملازم مذکورہ بالا صورت میں یہ حیلہ اختیار کریں کہ یہ اشیاء پہلے اپنے لئے خریدیں پھر مہنگی کر کے کمپنی کو فروخت کریں شرعاً اس کی گنجائش ہوگی یا نہیں؟ تو یاد رہے یہ ایک حیلہ باطلہ ہے، شرعاً اس کی ہرگز گنجائش نہیں کیوں کہ وکیل امین ہوتا ہے اس کا اپنے لئے خریدنا جائز نہیں۔

چوکیدار کی دھوکہ دہی:

سوال: میں ایک زیر تعمیر بنگلہ میں چوکیدار ہوں، مجھے مالک نے کہا کہ ہمیں تقریباً ۴۰ ٹرک ریتی، بجری کی ضرورت ہے آپ کسی ٹرک والے سے بات کریں میں نے ایک ٹھیکیدار سے بات کی اس نے کہا ویسے تو بارہ سو کا ٹرک ہے آپ کو ساڑھے گیارہ سو کے حساب سے دوں گا، یہ رعایت صرف آپ کے لئے ہے اب میں نے مالک کو اصل قیمت بتا دی ہر دفعہ ۵۰ روپے خود رکھتا رہا تو کیا یہ پچاس روپے میرے لئے حلال ہیں یا نہیں؟

جواب: فی ٹرک پچاس روپے کے حساب سے جو آپ نے مالک سے زائد رقم وصول کی یہ شرعاً آپ کے لئے حلال نہیں کیوں کہ آپ مالک کے تنخواہ دار ملازم ہیں اور ریتی کی خریداری میں وکیل ہیں تو درمیان میں آپ کے لئے ۵۰ روپے وصول کرنا ہرگز حلال نہیں اس کا مالک کو واپس

کرنا لازم ہے۔

وکیل کا دکاندار سے کمیشن وصول کرنا:

بعض دکاندار کمپنی کے ملازم سے معاہدہ کرتے ہیں اگر آپ کمپنی کا سامان ہم سے خریدیں گے ہم آپ کو اتنے فیصد رعایت دیں گے، تو ملازم کے لئے یہ کمیشن رکھ لینا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟

جواب: یہ کمیشن کے نام سے سامان کی قیمت میں رعایت ہے جو کمپنی کا حق ہے کیوں کہ اگر وہ کمپنی کے لئے سامان نہ خریدتے تو اتنے کی اس کو نہیں ملتی تو معلوم ہوا کہ یہ اس شخص کا کمیشن نہیں بلکہ زیادہ سامان خریدنے کی وجہ سے سامان پر رعایت ہے، لہٰذا ملازم پر لازم ہے اصل قیمت کمپنی سے وصول کرے اور رعایت کمپنی کو واپس کردے اگر اب تک اپنے پاس ہی رکھتا رہا تو اتنی رقم حساب کرکے کمپنی میں جمع کرانا لازم ہے۔

آخری گذارش یہ ہے کہ حرام خوری سے بچنا اس زمانہ میں اگرچہ ایک مشکل کام ہے تاہم ناممکن نہیں ہے اگر آدمی ذرا سا ہمت سے کام لے تو اللہ تعالیٰ دست گیری فرماتے ہیں، لیکن یہ ہمت پیدا ہوگی اہل ہمت کو دیکھنے ان کی صحبت میں بیٹھنے اور ان کے مشورے پر عمل کرنے سے، کسی نئی تجارت میں رقم لگانے یا نئی اسکیم میں شرکت، یا نیا کاروبار شروع کرنے سے پہلے کسی صالح دیندار عالم سے ضرور مشورہ کریں یہ کام شرعاً حلال بھی ہے یا نہیں مبادا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہری گھاس کو دیکھ کر نجاست کے ڈھیر میں کود پڑیں پھر برسوں دھونے سے پاکی نصیب نہ ہو اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو رزق حلال نصیب فرمائے۔

" اللّٰھم اکفنی بحلالك عن حرامك واغننی بفضلك عمن سواك. "

اس دعا کا بھی ورد رکھیں، ساتھ ہی لا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ کثرت سے پڑھتے رہا کریں۔

" اللّٰھم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا و ارزقنا اجتنابه. "

وصلی اللّٰہ تعالی علی سیدنا ومولانا محمد وعلی اصحابه اجمعین.

احسان اللہ شائق عفا اللہ عنہ

خادم افتاء وتدریس

جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

فقہ المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلّد

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دارالاشاعت
اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

فقہ المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

کامل ۳ جلد یکجا

جلد دوم

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار، ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس
ضخامت : 263 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین

تمت

شرکت کے احکام

شرکت کے لغوی معنی:

اختلاط ، یقال ، شارکه ، ای خلط ماله بماله .

اس نے اپنے مال کو اسکے مال کے ساتھ خلط کرلیا، یعنی شرکت کے لغوی معنی مطلقاً ملانا ہے۔

لغوی تعریف:

اختلاط النصیبین فصاعدا، بحیث لایتمیز ثم اطلق اسم الشرکة علی العقد وان لم یوجد اختلاط النصیبین . (القاموس الفقهی)

شرکت کی اصطلاحی تعریف:

هی عقد بین المتشارکین فی رأس المال ، والربح .

(فقه المعاملات)

شرکت کرنے والوں کا رأس المال (سرمایہ) اور نفع میں شرکت کرنا۔

دوسری تعریف یہ ہے کہ

بانها ثبوت الحق لا ثنین فاکثر علیٰ جهة الشیوع .

(تکملة المجموع شرح المهذب : ۱۳/۵۰۵)

یعنی دو یا دو سے زیادہ افراد کے لئے حق کا بطریقۂ شیوع ثابت ہونا۔

شرکت کی مشروعیت:

ثبت مشروعیة الشرکة بالکتاب ، والسنة ، والاجماع ،

اماالکتاب فقول اللّٰه عزوجل :

وقال سبحانه : ﴿ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ والخلطاءُ : هم الشرکاء . (سورة صٓ : ۲۴)

وأما السنة: فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: يقول الله تبارك وتعالى أي في الحديث القدسي أنا ثالث الشريكين مالم يخن أحدهما صاحبه، فان خان أحدهما صاحبه، خرجتُ من بينهما.

(أخرجه ابو داؤد، والحاكم في المستدرك، وانظر جامع الأصول: ٦/١٠٨)

ومراد الحديث القدسي: أن الله عزوجل يبارك لهما في تجارتهما، ويحفظهما ويرعاهما، مالم تحصل خيانة من أحدهما نحو الأخر.

وفي صحيح البخاري: عن أبي المنهال، أنه قال: وقد سئل عن الصرف: اشتريت أنا وشريك لي شيئاً، يدًا بيد، أي نأخذ ونعطي، نسيئة أي الى أجل، فجاء نا البراءُ بن عازب فسألناه، فقال: فعلتُ ذلك أنا وشريكي "زيد بن ارقم" وسألنا النبي صلى الله عليه وسلم عن ذلك؟ فقال ماكان يداً بيد، أي متقابضين أخذًا وعطاءً، فخذوه وماكان نسيئة فذروه اي اتركوه لأنه محرم.

وانما نهاهم صلى الله عليه وسلم عن النسيئة، لأنه بيع مال بمال، فيدخل في باب الصرف، ويشترط في الصرف أن يكون مقبوضاً في الحال دون تأخير، لئلا يدخل فيه الربا.

وقد دلَّ الحديث الشريف على جواز الشركة، فقد كان البراءُ وزيد شريكين، وأقرَّهما النبي صلى الله عليه وسلم على هذه الشركة، فدلَّ ذلك على مشروعية الشركة.

وأما الاجماع: فقد أجمع المسلمون على جواز الشركة في الجملة، وبُعث صلى الله عليه وسلم والناسُ يتعاملون بالشركة، فلم ينههم عنها، فدلَّ على جوازها.

شرکت کی مختلف صورتیں اور انکا ارتقاء:

بنی نوع انسانی کی ضروریات زندگی اور خواہشات طبعیہ میں اضافے کے ساتھ لوگوں کے

باہمی تعلقات اور معاملات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، چنانچہ بیع وشراء اور تجارت میں اضافے کی خاطر انسان نے نت نئے راستے نکالے اور معاملات کی مختلف صورتیں رائج کیں، انہی صورتوں میں سے ایک عقد شرکت بھی ہے جسکی مزید نئی شکلیں اور متنوع اقسام زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتی رہیں اور انہیں انسانوں نے قبول کر کے اختیار کیا، انہی انسانوں میں سے اہل عرب کو بھی شرکت کی ان اقسام کا علم حاصل ہوا اور انہوں نے اس کے مطابق تعامل اور باہمی لین دین کا عقد کرنا شروع کردیا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ کی اور شرعی احکام کو نافذ فرمایا تو ان تعلیمات اور احکامات کا ایک جزوِ اعظم ''معاملات'' بھی تھے لہٰذا انہوں نے ان معاملات میں سے جو تمام بنی نوعِ انسانی کے لئے ضروری اور مناسب تھے ان کو باقی رکھا، البتہ ان میں سے وہ جو نفعِ عامہ کے منافی تھے اور اس سے انسان کا دین و دنیا کا ضرر تھا ان کو ممنوع قرار دیدیا۔

جب صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اسلام جزیرۂ عرب سے دنیا کے دور دراز خطوں میں پھیلا تو مختلف شہروں اور علاقوں کے معاملات بشمول عقد شرکت کے ایسی نت نئی اور مختلف صورتیں سامنے آئیں جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں، لہٰذا فقہاء اسلام نے اسلام کے زریں اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا اور انتہائی عرق ریزی کے بعد ان میں سے بعض صورتوں کو جائز اور بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا اور مزید یہ کہ ادلہ اربعہ کی روشنی میں ایسے اصول مستنبط فرمادیئے جن سے بعد میں آنے والوں کو ان کی روشنی میں جزوی مسائل کا علم ہوجائے۔

شرکت کی اقسام:

شرکت کی ابتداءً دو قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت املاک ۲۔ شرکت عقود

شرکت املاک:

اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی چیز کا مشترکہ طور پر مالک بننا، مثلاً کسی گھر، زمین یا گاڑی کا بطور خریداری مالک بن جائے، اس کو ''شرکت ملک اختیاریہ'' کہا جاتا ہے۔

(۲) دو یا دو سے زیادہ افراد بطریق میراث کسی گھر یا گاڑی، دکان وغیرہ کے مالک

ہو جائیں اس کو ''شرکت ملک جبریہ'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس جیسی شرکت میں دونوں کے اختیار کا دخل نہیں ہے۔

شرکت املاک کا حکم:

شرکت املاک کا حکم یہ ہے کہ ان شرکاء میں سے ہر ایک دوسرے کے حصے کے حق میں اجنبی ہے، اس لئے کسی شریک کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے کے حصہ میں بلا اجازت کسی قسم کا تصرف کرے، لہٰذا اگر کوئی شریک مشترکہ چیز کو دوسرے کی اجازت کے بغیر فروخت کردے تو یہ بیع دوسرے کی اجازت پر موقوف ہوگی، ہاں البتہ اپنا حصہ اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کرے تو یہ نافذ ہوجائے گی کیوں کہ یہ حصہ مبیع اس کے حوالہ کرنے پر قادر ہے۔

قال فی الاختیار : الشرکۃ نوعان : شرکۃ ملك . وشرکۃ عقد . وشرکۃ الملك نوعان . جبریۃ واختیاریۃ . اما الجبریۃ بان یختلط مالان لرجلین اختلاط لا یمکن التمییز بینھما او یرثان مالاً . والاختیاریۃ . ان یشتر یاعینا أو یوصی لھما او یخلطامالھما، وفی جمیع ذالك كل واحدمنھمااجنبی فی نصیب الاخر لا یتصرف فیہ الاباء ذنہ لعدم اذنہ لہ فیہ ویجوز بیع نصیبہ من شریکہ فی جمیع الوجوہ . (الاختیار لتعلیل المختار : ۱۲/۳)

شرکتِ عقد

شرکتِ عقد دو شریکوں کے درمیان یا کئی شرکاء کے درمیان اصل سرمایہ اور منافع میں شرکت کا معاملہ طے کرنا۔

شرکتِ عقد کی اقسام:

فقہائے کرامؒ نے شرکت عقد کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں، فقہائے احنافؒ کے نزدیک شرکت عقد کی چھ قسمیں ہیں:

(۱) شرکت الاعمال

(۲) شرکت الاموال

(۳) شرکت الوجوہ

اور پھران تینوں قسموں کی دوقسمیں ہیں:

(۱) شرکت المفاوضہ

(۲) شرکت العنان

اس طرح کل ملاکر چھ قسمیں بن جاتی ہیں۔(۱)

(۱) شرکت الاموال:

دو یا زیادہ افراد اپنا معین سرمایہ اس شرط پر لگائیں کہ ان میں سے ہر ایک یا بعض افراد کام کریں گے اور نفع دونوں میں مشترک ہوگا، مثلاً زید اور بکر ایک لاکھ روپے ملاکر لگائیں اور یہ طے کرلیں کہ ہم دونوں نفع میں سے آدھا آدھا لیں گے۔(۲)

(۲) شرکت الأعمال:

اسے شرکت صنائع ابدان یا تقبل بھی کہا جاتا ہے، اس کی صورتیں یہ ہوتی ہیں کہ دو یا زیادہ افراد کوئی ایسا کاروبار شروع کرتے ہیں جس میں لوگوں کے کام اجرت پر کئے جاتے ہوں اور جو کمائی ہو اس میں دونوں شریک ہوں، اب دونوں مختلف پیشہ ور بھی آپس میں مل کر ایک شراکتی ادارہ قائم کرسکتے ہیں، اسی طرح سروسز کے کاروبار میں بھی اشتراک کیا جاسکتا ہے جس کی تفصیل آگے تیسرے باب میں ذکر کی جائے گی۔

نفع کی تقسیم کام کے اندازے پر نہیں بلکہ حسب قرارداد ہوگی، اگر یہ طے کیا کہ ہر شخص اپنے کام کے بقدر منافع کمائے یا کچھ طے نہ ہوا ہو تو شرکت نہیں رہے گی۔

(۳) شرکت الوجوہ:

اسے بعض فقہاء کرام شرکت الذمم بھی کہتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شریک افراد کے پاس مال نہیں ہوتا وہ اپنی وجاہت اور اپنی ساکھ کے ذریعہ تاجروں کے یہاں سے سامان

---

(۱) شریکوں میں سے جو شخص بھی کوئی کام لے گا اس کی انجام دہی دونوں کو لازم ہوگی اور جو مزدوری ایک کے کام کرنے سے حاصل ہوگی وہ طے شدہ شرح کے مطابق دونوں کے درمیان تقسیم ہوگی اگرچہ دوسرے نے وہ کام نہ کیا ہو مثال کے طور پر زید اور عمر درزی کے کام پر اشتراک کرلیں کہ ہم مل کر کپڑے سیا کریں گے اور اس کی جو مزدوری ہوگی وہ دونوں میں آدھی آدھی یا کسی اور شرح سے تقسیم ہوگی، اب اگر زید کپڑے سیئے اور عمر نے سیئے یا زید کے مقابلے میں کم سیئے تب بھی سلائی کی اجرت دونوں پر طے کردہ شرح کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔

(۲) شرکت اعمال میں ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہے، کسی ایک شریک کو کام دے کر دوسرے شریک سے مطالبہ کیا جاسکتا ہے، کسی بھی فریق کو اجرت دی جاسکتی ہے۔

ادھار لاتے ہیں اور نقد فروخت کر کے نفع حاصل کرتے ہیں جو ان میں تقسیم ہوتا ہے، شرکت کی یہ صورت بھی صحیح ہے، شرکت کی یہ قسم صرف امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک یہ شرکت جائز نہیں ہے۔

اس شرکت میں بھی ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے نفع بقدر ضمان تقسیم ہوگا، اس کے خلاف مقرر کرنا جائز نہیں ہے، [1] خریدے ہوئے مال کی قیمت ہر ایک پر اس کے حصہ کے بقدر واجب ہوگی، اگر شروع میں یہ طے کیا گیا کہ جو چیز بھی خریدی جائے گی وہ نصف نصف ہوگی تو ہر ایک چیز کی نصف قیمت واجب ہوگی اور نفع بھی نصف تقسیم ہوگا، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح نقصان بھی ہر شریک پر اس کے خریداری کے تناسب سے آئیگا۔

یہ شرکت کی ابتدائی تین قسمیں تھیں، اب ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ شرکت المفاوضہ

۲۔ شرکت العنان

(۱) شرکت المفاوضہ:

دو یا زیادہ شریک اس طرح شراکت کریں کہ اپنا مکمل سرمایہ جو کہ برابر سرابر ہو وہ سب اکٹھا کر کے کسی کاروبار میں لگا دیں، ان کا مال حقوق تجارت، عمل و نفع سب مساوی ہوں، اس شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل ہوتا ہے، یہ شرکت شاذ و نادر پائی جاتی ہے، مثلاً زید اور عمر ہزار ہزار روپے لگا کر سرمایہ کاری کریں اور ان میں ہر ایک کا نفع نصف نصف ہو، حقوق تجارت بھی برابر ہوں، تو یہ مفاوضہ کہلائے گی، لیکن اگر کسی ایک شخص کے سرمایہ میں ذرا سا بھی اضافہ ہو گیا تو وہ فوراً مفاوضہ سے بدل کر عنان بن جائے گی، ہر شئے میں مساوات اور برابری برقرار رہنا چونکہ مشکل کام ہے لہٰذا مفاوضہ کا وجود بہت کم ہوتا ہے، زیادہ تر عنان ہی ہوتا ہے، اس لئے آگے ہماری بحث کا موضوع زیادہ تر عنان ہی ہوگا، اسی لئے مفاوضہ کے بارے میں مزید تفصیل ذکر نہیں کی جائے گی۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں:
الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود (٥٨٧هـ) بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، بيروت، مؤسسة التاريخ العربي ١٤١٧هـ، ايچ ايم سعيد كمپنی، (ج ٥ ص ١٣٣) الربح بينهما على قدر الضمان فان شرطا لأحدهما فضل ربح على حصته من الضمان فالشرط باطل ويكون الربح بينهما على قدر ضمانهما عن المشترى الخ (٦ ص ٦٤)

(۲) شرکت العنان:

دو یا زیادہ افراد اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کا سرمایہ عمل، حقوق و نفع مساوی نہ ہوں اس میں ہر شریک دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے کفیل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر اگر زید اور عمر مل کر شرکت کریں اور زید ایک ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور عمر ڈیڑھ ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور منافع بھی اس تناسب سے طے کرلیں تو یہ شرکت عنان کہلائے گی۔ (۱)

شرکت المضاربۃ:

دو افراد کا اس طرح شرکت کرنا کہ ایک طرف سے مال ہو اور دوسرے کی طرف سے عمل اور نفع میں دونوں شریک ہوں، صاحب مال کو رب المال یا سرمایہ کار (Investor) کہتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو عامل اور مضارب کہتے ہیں، جو مال لگایا جاتا ہے وہ رأس المال (Capital) اور سرمایہ کہلاتا ہے، مثلاً زید اپنا سرمایہ بکر کو دے اور یہ کہے کہ تم اس سرمایہ سے تجارت کرو اور جو نفع حاصل ہو، اس کا نصف نصف ہم دونوں لیں گے، یہ شرکتِ مضاربت ہے، زید رب المال ہوگا، بکر مضارب اور سرمایہ رأس المال کہلائے گا۔ (۲)

فقہاء مالکیہؒ نے شرکت العقد کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں، البتہ بعض مالکیہؒ نے مضاربت کو بھی شرکت العقد میں داخل فرما کر کل چھ قسمیں بیان کی ہیں، شرکت عقد کی پانچ قسمیں یہ ہیں:

۱۔ شرکت مفاوضہ

۲۔ شرکت عنان

۳۔ شرکت وجوہ

٤۔ شرکت قبول

٥۔ شرکت مضاربہ

اس طرح بنیادی طور پر شرکت عقد کی کل پانچ قسمیں ہوئیں۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں

الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود، ٥٨٧هـ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، بيروت، موسسة التاريخ العربي، ايچ ايم سعيد كمپني. (٦-٥٦)

(۲) دیکھئے

المرغيناني (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبه امداديه ملتان، المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من احد الجانبين ومراده الشركة في الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر وكا المضاربة بدونها. (۳: ۲٥٥)

عقد مضاربت مشروع ہونے کی حکمت:

عقد مضاربت مشروع ہوئی ہے لوگوں کی حاجت وضرورت کی بناء پر کیوں کہ تجارت کے معاملہ میں لوگوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں، بعض مالدار ہوتے ہیں لیکن خرید وفروخت کے ذریعہ مال کو آگے بڑھانے، نفع کمانے کے طریقوں سے ناواقف ہوتے ہیں، جبکہ بعض لوگ فقیر ہوتے ہیں اگر چہ ان کی ملک میں مال نہیں ہے لیکن خرید وفروخت کے ذریعہ مال کمانے کے طریقوں سے واقف ہیں اب دونوں کے آپس میں معاملہ طے پایا جائے ایک کی طرف سے مال دوسرے کی طرف سے محنت وکوشش ہوگی تو دونوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔

وروی عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنهما، کان یدفع ماله مضاربة ویشترط علی مضاربه الا یسلك به بحرًا، والا ینزل به وادیا، ولایشتری به ذات کبد رطبة، أی المواشی لانها قد تهلك فان فعل ذالك ضمن، فبلغ ذلك رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فاستحسنه واجازه.

وبعث علیه الصلاة والسلام والناس یتعاملون به فاقرهم علیه، وعن عمر رضی اللّٰه عنه أنه دفع مال الیتیم مضاربة لینمیه، وعلیه الاجماع. (فقه المعاملات)

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے زمانہ میں لوگ مضاربت کا معاملہ کرتے تھے آپ نے منع نہیں فرمایا یہ مضاربت کے مشروع ہونے کی دلیل ہے نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ آپ نے ایک یتیم کے مال کو مضاربت پر لگایا تھا تا کہ نفع حاصل ہو اور مضاربت کی مشروعیت پر اجماع بھی منعقد ہوا ہے۔

صحت مضاربت کی شرائط:

(۱) شرکت ومضاربت نقد میں یعنی، دراہم ودنانیر (موجودہ زمانہ میں کرنسی نوٹوں کے ذریعہ) صحیح ہوگی، اس کے علاوہ جو اموال ہیں مثلاً گندم، کپڑے اور دیگر اشیاء ان کے ذریعہ صحیح نہیں ہوگی، الا یہ کہ مضارب کو مال دیکر وکیل بنادے کہ اس کو فروخت کر کے جو رقم بنے اس سے مضاربت شروع کریں، اس طرح صحیح ہو جائے گی۔

(۲) دونوں کی شرکت نفع میں ہو، یعنی یوں معاملہ طے کیا جائے کہ اس تجارت سے جو نفع حاصل ہوگا، اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھا حصہ صاحب مال کا بقیہ مضارب کا، یعنی کسی ایک کے لئے نفع کا حصہ مقرر کردینا صحیح نہیں ہے کہ مثلاً ہر ماہ لاکھ پر دو ہزار صاحب مال کا ہوگا بقیہ مضارب کا چونکہ اس میں احتمال ہے کہ کل نفع ہی دو ہزار یا اس سے کم حاصل ہو تو مضارب کا بڑا نقصان ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم فیصد کے تناسب سے ہو۔

(۳) نفع ونقصان دونوں میں شرکت ہو یعنی اگر نفع ہوا تو طے شدہ شرط کے مطابق تقسیم کیا جائے گا اور اگر نقصان ہوا تو یہ رب المال یعنی (سرمایہ فراہم کرنے والا) کو پورا نقصان برداشت کرنا پڑے گا، باقی مضارب کو بھی اپنے عمل کا کوئی بدلہ نہیں ملے گا، اسطرح وہ بھی نقصان میں شریک ہوا۔

(٤) مال مکمل طور پر مضارب کے حوالے کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو تجارت میں اختیار کلی حاصل ہو۔

(٥) مضارب کا حصۂ نفع متعین ہونا ضروری ہے (مثلاً نفع کا آدھا حصہ) اگر رأس المال میں شرکت کو ضروری قرار دیا جائے تو مضاربت فاسد ہو جائے گی۔

قال صاحب الهداية: ومن شرط المضاربة ان يكون الربح بينهما مشاعاً، اى غير محدود، لايستحق احدهما دراهم مسماة من الربح، لان ذلك يقطع الشركة بينهما، فان شرط زيادة عشرة فله اجر مثله لفساد الشركة فلعله لا يربح الاهذا القدر فتنقطع الشركة، اى تبطل والربح لرب المال لانه نماء ملكه، وللعامل، اى المضارب اجر المثل. (هداية: ٣/٢٢٦)

نفع کی مقدار متعین کرنے کی وجہ سے عقد شرکت فاسد ہو جاتا ہے؟

آج کے دور میں شرکت کی ایک صورت یہ بھی چل نکلی ہے کہ ایک چلتی دکان یا فیکٹری وغیرہ کا مالک اپنے رشتہ داروں یا جاننے والوں سے کہتا ہے کہ تم کاروبار میں اتنی رقم شامل کرو تو ہر مہینہ تمہیں اتنا فیصد نفع ملے گا، وہ رقم شامل کرتا ہے اور ہر ماہ اس کو نفع کی مقررہ مقدار مل جاتی ہے اس کو عام طور پر لوگ جائز کاروبار سمجھتے ہیں حالانکہ شرعی نقطہ نگاہ سے اس میں کئی خرابیاں ہیں۔

(۱) کسی بھی کاروبار میں سرمایہ پر نفع متعین کر کے دینا یہ قرض دے کر سود وصول کرنے کے حکم میں داخل ہے جو صریح حرام ہے۔

(۲) اس میں رقم شامل کرنے والا نقصان کی صورت میں نقصان برداشت نہیں کرتا، وہ دکاندار کے کھاتے میں ڈالدیا جاتا ہے، جبکہ شرعاً شرکت کے لئے ضروری ہے کہ نفع نقصان دونوں میں شرکت ہو، لہٰذا یہ شرکت فاسدہ ہوئی شرکت کی یہ صورت ناجائز ہے، لہٰذا اس سے اجتناب لازم ہے۔

وفی الدر المختار: کتاب الشرکة: وشرطها کون المعقود علیه قابلا للوکالة، فلاتصح فی مباح کاحتطاب وعدم ما یقطعها کشرط دراهم مسماة من الربح لاحدهما لانه قد لا یربح غیر المسمی وحکمها الشرکة فی الربح۔فی رد المحتار تحت قوله "وحکمها الشرکة "واشتراط الربح متفاوتاً عندنا صحیح فیما سیذکر.

(ردالمحتار: ۵۲/۳)

اب یہاں سے شرکت کے بارے میں چند مسائل کو سوال و جواب کی صورت میں نقل کیا جاتا ہے تا کہ جزئیات سمجھنے میں آسانی ہو اور مسائل منقح ہو جائیں۔

شرکت واجارہ دونوں جمع نہیں ہو سکتے:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس بارہ میں کہ زید دوکان میں اپنے ساتھ شریک بکر، خالد، جعفر، امین ملا کر کل پانچ شریک قرار دیتا ہے، جن میں زید اور بکر دو بڑے حصہ دار ہیں اور پچھلے تینوں چھوٹے چھوٹے حصہ والے ہیں اور چونکہ پچھلے تینوں شریک خالد، جعفر، امین کے حصوں کا نفع ان کے حق المحنت کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے اس لئے چاہتا ہے کہ بقدر حصہ نفع کے علاوہ خالد کو چار سو روپیہ ماہوار اور جعفر اور امین کو ڈھائی ڈھائی سو ماہوار دوکان سے دیا کرے تو آیا ایسا کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کون سی صورت ایسی ہے جس میں ان کا حق المحنت پورا ان کو مل جایا کرے، درآں حالیکہ اس کے لئے ان کا حصہ بڑھا دینے کے بعد پھر گھٹانا زیادہ دشوار ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کی مذکورہ تنخواہوں میں حسب موقع کمی بیشی کی جایا کرے۔ بینوا توجروا

الجواب: صورت مذکورہ میں شریک کا اجیر ہونا لازم آتا ہے اور شرکت اور اجارہ جمع نہیں

ہو سکتے، اس کی صورت جواز یہ ہے کہ اصل سرمایہ میں تو ان شرکاء کا حصہ نہ بڑھایا جائے مگر نفع میں بڑھایا جائے مثلاً جس شریک کا حصہ دوکان ۱/۴ ہے اس کا حصہ نفع میں ۱/۳ کر دیا جائے اور اس کے لئے تمام شرکاء کی رضا شرط ہے پھر اگر زیادت نفع بھی دواماً منظور نہ ہو تو اس کے لئے باہمی معاہدہ تحریری سے ایک میعاد مقرر کر دی جائے کہ فلاں فلاں شرکاء کی حسن کارکردگی کی وجہ سے فلاں میعاد تک ان کا حصہ نفع میں بڑھایا جاتا ہے اور شرکت عنان میں راس المال کی نسبت سے نفع کا زیادہ ہونا جائز ہے۔

ویجوز التفاضل فی الربح مع تساویهما فی رأس المال

(عالمگیریة: ۲/ ۳۱۰، مدة الاحکام: ۳/ ۳۱٤)

باقی شریک کو ملازم رکھنے کا جو مسئلہ مذکور ہے کہ اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اس بارے میں حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ شریک کو ملازم رکھنا جائز ہے، چنانچہ احسن الفتاوی (۳۲۱/۷) میں اس کی تفصیل موجود ہے جس کا خلاصہ ہم نے جلد اول میں نقل کیا ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

باپ بیٹوں کی مشترک آمدن کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ زید کے پانچ فرزند ہیں:

(۱) عمر (۲) خالد (۳) ولید (٤) فجر علی (٥) ولی احمد

اور تین اولاد نابالغ ہیں:

(۱) عبداللہ (۲) عبدالرحمن (۳) فاطمہ

زید نے اپنی ذاتی محنت سے ہزار روپیہ کے نقود و اجناس و اراضی کسب کئے پھر جب عمر، خالد وغیرہ ہوشیار اور قابل کسب ہوئے تو بہ معیت ان کے چار ہزار روپیہ کا مال کمایا، غرض فی الحال زید کے پاس پانچ ہزار کا مال موجود ہے اور کاروبار زید کے ہاتھ میں ہے، اموال مشترکہ ہیں، کس نے کس قدر کسب کیا اور کہاں تک محنت کی؟ منضبط نہیں ہے اور نہ انضباط تحقیقی ہو سکتا ہے، ولید نے تقریباً آٹھ سال تک علم حاصل کیا، اس نے سب کے نقود مشترکہ میں سے بہت سے روپے خرچ کئے، طالب علمی سے فارغ ہونے کے بعد اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ تھوڑے عرصہ تک کسب معاش میں شریک رہے اور ولی احمد کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔

اب زید فرزندوں سے اور فرزند ہر ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہتے ہیں، پس تقسیم اموال ان میں کیسے ہوگی؟ آیا بقدر کسب بطور تخمین ہوگی یا جملہ اموال زید کا قرار دے کر فرزندوں کا اجر مثل دیا جائے گا اور ایام ماضیہ کا نان ونفقہ اجر مثل سے وضع ہوگا یا حکم مقاصہ کیا جائے گا، ولید کا کیا حکم ہے کہ اس نے زیادہ خرچ کیا، ولی احمد کی شادی کا خرچہ سب کے ذمہ پر ہے یا صرف باپ کے ذمہ ہوگی؟ نابالغ اولاد کو بھی حصہ ملے گا یا نہیں؟ نیز تحریر فرمائیں کہ تقسیم چار ہزار میں جاری ہوگی یا پانچ ہزار میں اور یہ بھی قلم بند فرمائیں کہ صورت مسئلہ میں اگر کاروبار کسی فرزند کے ہاتھ میں ہو تو کیا حکم ہے؟ بینوا بالکتاب توجروا اجرا جزیلاً عند الوھاب

الجواب: زید نے جو اپنے لڑکوں کو کاروبار میں اپنے ساتھ شریک کیا ہے تو اس کی صورت کیا تھی، آیا زید نے ہر بیٹے کو کچھ رقم سرمایہ ہبۃً دے دیا تھا، پھر وہ رقم یا سرمایہ کاروبار میں لگا کر لڑکا شریک تجارت ہوا یا باپ نے کسی بیٹے کو کچھ رقم ہبۃً نہیں دی، نہ سرمایہ دیا اور نہ بیٹوں کے پاس اپنی ذاتی رقم یا سرمایہ تھا جس کو کاروبار میں ملا کر وہ شریک ہوئے ہوں بلکہ بیٹے ولید ہی بدون رقم دیئے کام کرنے لگے اور اس شرکت سے کام کو ترقی ہوئی، پس صورت اولی میں تو یہ البتہ شرکت ہے اور ہر شخص اپنی رقم وسرمایہ کی نسبت سے اسوقت اصل نفع میں مستحق ہوگا اور صورت ثانی میں یہ شرکت ہی نہیں بلکہ کل سرمایہ زید کی ملکیت ہے اور سب لڑکے اس کے معین شمار ہوں گے اور جس لڑکے پر زیادہ خرچ ہوا اس صورت میں وہ سب باپ ہی کا خرچ ہوا اس سے زیادہ کے رجوع کا حق کسی کو بھی نہیں، نیز اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنے کے لئے زید کو اس صورت میں یہ ضروری نہیں کہ اس سرمایہ کو ان میں تقسیم کرے بلکہ اولاد بالغین کو بدوں کچھ سرمایہ دیئے بھی الگ کر سکتا ہے اور اگر ان کو کچھ سرمایہ دے کر الگ کرے تو یہ اچھا ہے اور اس صورت میں سب کو برابر سرمایہ دے اور نابالغوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے، بلوغ سے پہلے ان کو الگ نہیں کر سکتا۔

قال فی الحامدیة اب وابن یکتسبان فی صنعة واحدة ولم یکن لهما شیٔ ثم اجتمع لهما مال یکون کله للاب اذا کان الابن فی عیاله واجاب خیر الرملی عن سوال آخر بقوله حیث کان من جملة عیاله والمعینین له فی اموره واحواله فجمیع ماحصله بکره وتعبه فهو ملک خاص لابیه لاشئی له فیه حیث لم یکن له مالٌ لو اجتمع له

بالکسب جملة امد ال لانهٔ فی ذلك لابیه معین اهـ . (۱۸/۲)

حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں باپ اور بیٹوں کے مشترک کاروبار کی صورت میں تمام ملک باپ کی شمار ہوتی ہے، لہٰذا باپ اپنی زندگی میں جو تصرف چاہے کرسکتا ہے، باپ کے انتقال کے بعد تمام ورثا، میں شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : معزيا الى القنية : والاب وابنه يكتسبان في صنعة واحدة ولم يكن لهماشئی فالكسب كل للاب ان الابن في عياله لكونه معينا له الاترى لو غرس شجرة تكون للاب (الى أن قال) وفي الخانية زوج بنيه الخمسة في داره و كلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للاب وللبنين الثياب التى عليهم لاغير . (ردالمحتار : ۳۶۰/۳ ، أحسن الفتاوىٰ : ۳۹۳/۶)

تقسیم ترکہ سے قبل ایک وارث کا ترکہ سے تجارت کرنا:

سوال : وراثت کا روپیہ قبل تقسیم ہونے کے کسی شریک نے بلا اطلاع دوسرے شریک کے کسی کو مضاربت پر دے دیا اور مضاربت صحیح ہوئی یا نہیں اور جو نفع ہوا ہے مضارب اس میں سے نصف نفع مقررہ لینے کا مستحق ہے یا نہیں؟

الجواب : جس شریک نے مضاربت پر روپیہ دیا ہے نفع مقررہ اس کی ملک تو ہوگیا لیکن اس میں سے فقط اپنے حصۂ وراثت کے مطابق اسکو حلال ہے اور باقی نفع خبیث ہے، اس لئے دوسرے ورثاء کو بقدر ان کے حصص کے دے دے یا محتاجوں کو دے دے۔

كما في عالمگیریه : لو تصرف احد الورثة في التركة المشتركة وربح فالربح كلهٗ للمتصرف وحدهٗ كذا في الغياثة وفيه ايضاً بعد اسطر سئل ابوبكر عن شريكين جُن احدهما وعمل الآخر بالمال حتى ربح او وضع قال الشركة بينهما قائمة الى ان يتم اطباق الجنون عليه فاذا قضى ذلك يتفسخ الشركة بينهما فاذا عمل بالمال بعد ذالك فالربح كله للعامل والوضيعة عليه وهو كالغصب بمال المجنون فيطيب لهٗ من الربح حصّة ماله ولايطيب لهٗ من مال

المجنون فيتصدّق به كذا في المحيط قال الشامي : وفي القهستاني وله ان يؤديه الى المالك ويحل له التناول لزوال الخبث. (٥/ ١٨٤)

اور مضارب کے لئے بھی یہی حکم ہوگا کہ کل نفع مقررہ اس کی ملک ہے لیکن جس شریک نے اس سے عقد مضاربت کیا ہے اس کے حصہ کے موافق حلال ہے اور زائد حلال نہیں بلکہ وہ دوسرے شرکاء کو دے دے یا فقراء کو دے دے۔

وهذا هو مقتضى القواعد ولم اره صريحًا، والله اعلم.

(إمداد الاحكام: ٣/ ٣١٩)

نابالغ کے ساتھ مشترک مصارف:

سوال: مرحوم کی بیوہ کے نام کچھ رقم پینشن دس سال کے لئے منظور ہوئی ہے اور چھبیس روپے ماہوار ملنے بھی شروع ہوگئے ہیں۔

اسی طرح دوسرے امدادی فنڈ سے سولہ روپے ماہوار بچوں کے بلوغ تک کے لئے منظور ہوئے ہیں، جو ملنے شروع ہوگئے ہیں۔

بیوہ اور چاروں بچے جن میں سے دو بالغ ہیں سب اکھٹے ساتھ رہتے ہیں اور اکھٹے کھاتے پیتے ہیں، اس رقم کو مجموعہ خرچ میں صرف کریں یا علیحدہ کر کے اخراجات کا حساب رکھیں؟

بینوا توجروا

جواب: جو رقم نابالغوں کے لئے منظور ہوئی ہے اس میں سے بالغوں پر خرچ کرنا جائز نہیں ،صرف نابالغوں کے مصارف میں خرچ کی جائے ،البتہ کھانے پینے میں سب کا حساب مشترک رکھ سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم (أحسن الفتاوى : ٦/ ٤٠٢)

بالغ ونابالغ ورثاء کی مشترکہ جائیداد میں تصرف کا حکم:

سوال: حضرت میرے سسر صاحب نے چھ وارث چھوڑ کر انتقال کیا ان میں سے ایک میری ساس صاحبہ پانچ میں سے دو بالغ ایک میری بیوی اور ایک میرا سالا اور تین نابالغ ہیں، اب عرض یہ ہے کہ اگر وہ مال شرکت میں رہے تو بالغ کی اجازت سے اس میں سے ہمارا کھانا از روئے فتوی کیسا ہے؟ دیگر عرض یہ ہے کہ اگر بالغ ونابالغ مل کے دستکاری سے کوئی مال کھاویں اس حال میں کہ ابتک وہ مال تقسیم بھی نہیں ہوا اور بالغ نے کھانا کھلانا چاہا تو اس کے کھانے میں کیا حکم ہے؟

الجواب: قال في الهداية فشركة الاملاك العين يرثها رجلان ويشتريا نها فلايجوز لاحدهما أن يتصرف في نصيب الآخر الا باذنه وكل واحد منهما في نصيب صاحبه كالاجنبي اهـ.

وفي الحاشية عن الظهيرية ان شركة اذا كانت بينهما من الابتداء بأن اشتريا حنطةً اوورثاها كانت كل حبةٍ مشتركة بينهما اهـ. (٣/٦٠٤)

ترکہ مشترکہ میں اگر ورثاء سب بالغ ہوں تب تو ایک وارث دوسروں کی اجازت سے اس میں تنہا تصرف کرسکتا ہے اور اگر نابالغ بھی ہوں تو اس وقت کوئی بھی بدون تقسیم ترکہ کے اس میں تصرف نہیں کرسکتا، کیوں کہ نابالغ کا اذن معتبر نہیں، پس صورتِ مسئلہ مسئولہ میں ترکہ غیر منقسمہ سے سائل کا یا کسی اور کا کھانا جائز نہیں اور یہی حکم کسب مشترک کا ہے۔ واللہ اعلم

(امداد الاحکام: ٣/٣٢١)

شرکت مع مضاربت جائز ہے:

سوال: زید وعمر میں یہ طے پایا کہ دونوں کاروبار میں برابر سرمایہ لگائیں گے، عمر چونکہ کام بھی کریگا لہٰذا کام کے عوض نصف ربح عمر کا ہوگا اور باقی نصف اصل سرمایہ کے مطابق دونوں میں برابر تقسیم ہوگا، یہ طریقہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو کیا یہ صفقہ فی صفقۃ یا عقد بشرط میں داخل نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: شرکت میں عمل من الجانبین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے اس لئے یہ شرکت نہیں مضاربت ہے، پھر اگر رب المال کی طرف سے مال لگانا درجہ شرط میں نہ ہو تو کوئی اشکال نہیں اور اگر مشروط ہو تو بھی مضاربت وشرکت میں ملایمت کی وجہ سے جائز ہے، چونکہ اس صورت میں مضاربت اصل ہے اور شرکت بالتبع، اس لئے عمل من الجانبین کی شرط مرتفع ہوگئی۔

اسی طرح اشتراط العمل من الجانبین کے ساتھ تفاضل فی الربح بھی اسی لئے جائز ہے کہ یہ صورت اولیٰ کے برعکس اصل میں شرکت ہے اور مضاربت بالتبع، اسلئے اشتراط العمل علی الجانبین مضر نہیں۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ في الشركة: وفي النهراعلم

انهما اذا شرطا العمل عليهما ان تساويا مالاً وتفاوتاربحاً جاز عند علمائنا الثلاثة رحمهم الله تعالىٰ خلافا لزفر رحمه الله تعالىٰ والربح بينهما على ما شرطا وان عمل احدهما فقط وان شرطاه على احدهما فان شرطا الربح بينهما بقدر رأس مالهما جاز ويكون مال الذى لا عمل له بضاعة عند العامل له ربحه وعليه وضيعته وان شرطا الربح للعامل اكثر من رأس ماله جاز ايضًا على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة ولو شرطا الربح للدافع اكثرمن رأس ماله لا يصح الشرط ويكون مال الدافع عند العامل بضاعة لكل واحد منهما ربح ماله والوضيعة بينهما على قدر رأس مالهما ابداهذا حاصل ما فى العناية اهـ مافى النهر ، قلت وحاصل ذلك كله انه اذا تفاضلا فى الربح فان شرطا العمل عليهما سوية جاز ولو تبرع احدهما بالعمل وكذا لو شرطا العمل على احدهما وكان الربح للعامل بقدر رأس ماله او اكثر ولو كان الاكثر لغير العامل او لا قلهما عملا لا يصح وله ربح ماله فقط، هذا اذا كان العمل مشروطا الخ .

(ردالمحتار : ۳/۳۵۱)

مضارب بغیر کوئی وصیت کئے فوت ہوجائے تو مال کی حفاظت اور ضمان کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید نے عمر سے بطور مضاربت روپیہ لے کر تجارت میں لگایا، اتنے میں اس کا یعنی زید کا انتقال ہوگیا اور مرتے وقت کسی قسم کی وصیت نہیں کی، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ وہ مال تجارت کس کا حق ہے اور اس کی حفاظت کس کے ذمہ ہے؟ رب المال کے یا مضارب کے؟ اور اگر وہ مال تجارت اتفاق سے ضائع ہوجائے تو نقصان کس کا سمجھا جائے گا اور آیا اس روپیہ کی بابت وارثان زید پر عمر کو کسی قسم کا جبر کرنے کا حق ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: فى العالمگيرية : (۲۰۰/۵) وان كانت المضاربة حين مات المضارب عروضًا او دنانير (اى وكان رأس المال دراهم)

فأراد رب المال أن يبيعها مرابحة ولم يكن له ذلك والذي يلي بيعها وصي المضارب فان لم يكن له وصي جعل القاضي له وصيا يبيعها فيوفي رب المال رأس ماله وحصته من الربح ويعطي حصة المضارب من الربح غير ماده وقال في المضاربة الصغيرة يبيعها وصي الميت ورب المال وما ذكر هنا اصح كذا في المبسوط .

اس سے معلوم ہوا کہ اصح یہ ہے کہ وصی المضارب نہ ہونے کی صورت میں یا تو قاضی اس کی جانب سے وصی مقرر کردے جو مال فروخت کر کے رأس المال اور نفع میں سے مضارب کو دیدے یا رب المال بدون مرابحہ اس مال کو فروخت کر کے سرمایہ وصول کر لے اور جو چیز اتفاقاً کم ہوگئی ہے اس کا ضمان واجب نہیں، اگر تعدی سے نقصان ہوا ہو تو تعدی کرنے والے پر ضمان ہے۔

واللہ اعلم

مضاربت میں کل نقصان رب المال کے ذمہ ہوگا مضارب کے ذمہ کچھ نہیں:

سوال: زید نے بکر کو روپیہ دیا، بکر کام کرنے والا ہے، اور زید صرف روپیہ دینے والا ہے اور ان دونوں میں منافع میں یہ شرط قرار پائی ہے کہ زید ایک حصہ منافع لے اور بکر دو حصے اسی طرح نقصان میں بھی زید ایک حصہ نقصان اُٹھائے اور بکر دو حصے، کیا یہ طریق معاملہ شرعاً درست ہے اس کا منافع سود ہوگا یا نہیں؟

الجواب: صورت مذکورہ میں عقد مضاربت صحیح ہے لیکن کل نقصان فقط روپیہ والے کے ذمہ ہوگا (مضارب) کام کرنے والے کے ذمہ اس میں سے کچھ نہ ہوگا۔

كما في الدّر: في الحلالية كل شرط يوجب جهالة في الربح او يقطع الشركة فيه يفسدها والا بطل الشرط وصح العقداعتباراً بالوكالة وفي رد المحتار (قوله بطل الشرط) كشرط الخسران على المضارب . (٤/٧٤٢) واللہ اعلم

مشترک جائیداد کی تقسیم کی ایک صورت کا حکم:

سوال: زمینداروں نے باخورہا جائیداد تقسیم کرلی اور ہر ایک بقدر اپنے حصہ کے قابض ہوگیا اس کو خانگی تقسیم کہتے ہیں، چند دنوں کے بعد سرکاری طور پر بٹوارہ کرنے کی کسی نے درخواست

دیدی جس کو سرکاری بٹوارہ کہتے ہیں اور امین بٹوارہ نے آکر تقسیم شروع کی اس میں بعض نے امین کو رشوت دے کر دوسرے شخص کی عمدہ زمین یا درخت یا آسامی اپنے نام لکھوالیا اور اپنی خراب زمین وغیرہ اسی قدر اس کے نام کروادیا، اب سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا کیا جائے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مورث نے ایسا کیا ہو اور ورثاء کو اصلی مالک کا پتہ بھی نہ ہو؟

الجواب : ایسا کرنا ہرگز جائز نہیں کیوں کہ تقسیم میں مساوات لازم ہے مقدار میں بھی، کیفیت میں بھی، اگر مورث نے ایسا کیا ہو تو وارث کو چاہئے کہ اپنی اصل زمین لے لے اور دوسرے کی واپس کردے باقی اس کے مورث نے جو گناہ کیا اس کا یہ ذمہ دار نہیں اور اگر دوسرا شخص کچھ رقم بطور تاوان کے لے کر اسی سرکاری بٹوارہ پر راضی ہو جائے تو اس کو اسی طرح یا کسی اور طرح راضی کرلیا جائے، الغرض دوسرے کی چیز پر بدون اس کی رضامندی کے قبضہ درست نہیں اور امین کی تبدیل قسمت پر طرفین اس شرط پر راضی تھے کہ اس کو رشوت دے کر فیصلہ نہ کرایا جائے جب اس کے خلاف کیا گیا تو تبدیل رضاء سے نہ ہوئی بلکہ غصباً ہوئی۔ واللہ اعلم

بھائیوں کی مشترکہ کمائی سے منتظم بھائی نے مشترکہ جائیداد خریدی تو کیا سب میں برابر تقسیم ہوگی؟

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین صورت ذیل میں، تین بھائی ہیں ان کے معاملات سب مشترک ہیں، جائیداد، مکانات، کھانا پینا اور سب اشیاء مشترک ہیں ان میں دو بھائی برسر روزگار ہیں اور ایک بیروزگار ہے اور گھر پر رہتا ہے اور گھر کا اور جائیداد کا انتظام سب اس کے ہاتھ میں ہے، باپ بھی ان کا اپنے روزگار سے روپیہ حاصل کرتا ہے اور یہ دونوں بھائی بھی حاصل کرتے ہیں، یہ سب روپیہ منتظم بھائی کے ہاتھ سے گھر کی ضروریات میں علی سبیل الاشتراک خرچ ہوتا ہے، اور اس مشترکہ آمدنی سے منتظم بھائی نے باپ سے مشورے کے بعد کچھ جائیداد خریدی کئی سال کے بعد اس منتظم بھائی کا لڑکا برسر روزگار ہو جاتا ہے اور اس کے روزگار سے اس کو زیادہ روپیہ حاصل ہوا وہ روپیہ بھی اسی طرح علی سبیل الاشتراک خانگی ضروریات میں خرچ ہوتا رہا اور اس سے بھی منتظم بھائی نے جائیداد علی سبیل الاشتراک خریدی، اس کے روزگار ملنے کے دو تین سال بعد باپ کا انتقال ہو گیا، انتقال کے بعد بھی ان تینوں بھائیوں کے معاملات مشترک رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھی منتظم

بھائی نے کچھ جائیداد اور خریدی جس میں منتظم بھائی کے لڑکے کا روپیہ زیادہ خرچ ہوا اور باقی دونوں بھائیوں کا کم مگر یہ جائیداد بھی علی سبیل الاشتراک خریدی گئی، اجمالاً اتنا معلوم ہوا کہ ان دونوں بھائیوں کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر کم خرچ ہوا اور منتظم بھائی کے لڑکے کا حاصل کردہ روپیہ جائیداد پر زیادہ خرچ ہوا، تفصیل معلوم نہیں، اب یہ تینوں بھائی جائیداد کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں، شریعت اور فقہ حنفی کے مطابق یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں علی السویہ اور برابر تقسیم ہوگی یا منتظم بھائی کو زیادہ حصہ ملے گا؟ اور کتنا زیادہ؟ کیوں کہ اس کے لڑکے کا جائیداد خریدنے پر زیادہ روپیہ خرچ ہوا اور اگر کسی صورت سے معلوم ہو جائے کہ منتظم بھائی کے لڑکے کا روپیہ جائیداد کے خریدنے پر اتنا خرچ ہوا اور دونوں بھائیوں کا اتنا تو اس صورت میں یہ جائیداد کیسے تقسیم ہوگی؟ تینوں بھائیوں کو شرعاً مساوی حصہ ملے گا یا منتظم بھائی کو زیادہ؟ غرض دونوں صورتوں کا حکم مفصل تحریر فرمایا جائے یہاں لوگوں کا رواج تو یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں تقسیم علی السویہ ہوتی ہے، یہ نہیں کہ کسی کو زیادہ اور کسی کو کم حصہ ملے۔

الجواب: سئل في اخوة خمسة تلقوا تركة عن ابيهم فأخذوا في الاكتساب والعمل فيها جملةً كل على قدر استطاعة في مدّة معلومة فحصل الربح في المدّة فهل تكون الشركة وماحصلوا بالاكتساب بينهم سوية وان اختلفوا في العمل والرأي كثرة وصواباً، الجواب نعم اذ كل واحد يعمل لنفسه ولاخوته على وجه الشركة واجاب خير الرملي بقوله هو بينهم على السوية حيث لا يميز كسب هذا من كسب هذا ولا يختص احدهما به ولا بزيادة على الآخر اذالتفاوت ساقط نملتقط السنامل، اذا خلطا ما التقطا الاخرما قال واطال الخ: وافادواجاد. ۱/۹۲ من تنقيح الفتاویٰ الحامدية.

ان عبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ صورت مسئولہ میں یہ جائیداد تینوں بھائیوں میں بحصہ مساوی تقسیم ہوگی جبکہ ہر بھائی نے اپنی کمائی کو دوسرے کے ساتھ مخلوط رکھا، ممتاز نہیں کیا اور سب کا خرچ وغیرہ مشترک ہی چلتا رہا ہے تو اب تفاوت کو ساقط کیا جائے گا اور سب کو بحصہ مساوی شریک سمجھا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

(ماخوذ از امداد الاحکام: جـ ۳)

ہر شریک کو شرکت ختم کرنے کا اختیار ہے:

سوال: زید نے چند دوسرے شرکاء کے ساتھ مل کر مشترک کاروبار کے لئے ایک دکان خریدی ان کے ساتھ عمرو نے بھی شرکت کی خواہش ظاہر کی تو اسے اس شرط پر شریک کرلیا گیا کہ وہ حسب معمول تعلیم قرآن کی خدمت میں مشغول رہے گا اور کاروبار میں کسی قسم کا دخل نہ رکھے گا، نیز یہ بھی طے پایا کہ زید کام زیادہ کرے گا، اس لئے منافع میں اس کا حصہ بھی زیادہ ہوگا یعنی چالیس فی صد نفع زید کے لئے اور ساٹھ فیصد بقیہ شرکاء کے لئے، کچھ عرصہ گزرنے کے بعد شرکاء زید کی خیانت پر مطلع ہوئے، اس لئے وہ اسے شرکت سے الگ کرنا چاہتے ہیں، کیا شرعاً وہ اس کے مجاز ہیں؟ نیز زید کا مطالبہ ہے کہ الگ ہونے کی صورت میں دکان کی موجودہ قیمت لگا کر اسے اس کا حصہ دیا جائے، اس لئے کہ دکان کی موجودہ قیمت پہلے سے زیادہ ہے، کیا زید کا یہ مطالبہ درست ہے؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہر شریک کو ہر وقت اختیار ہے کہ دوسرے شرکاء کی رضامندی کے بغیر جب چاہے شرکت کو ختم کردے، اس صورت میں اشیاء مشترکہ کی قیمت لگا کر اصل بقدر حصہ اور منافع حسب شرط تقسیم کرلیں۔

اگر کوئی چیز لینے میں ہر شریک خواہش مند ہو تو بصورت نیلام جو شریک زیادہ قیمت پر خریدنے کو آمادہ ہو اسے دیدی جائے۔

لہٰذا شرکاء کا زید کی شرکت کو ختم کردینا صحیح ہے خواہ اس کی کوئی معقول وجہ ہو یا نہ ہو، البتہ زید دکان کی موجودہ قیمت سے اپنے حصہ کا مستحق ہے اور اگر تمام شرکاء سے زیادہ قیمت دیکر دکان خود رکھنا چاہے تو زید کو اس کا بھی اختیار ہے جیسا کہ دوسرے ہر شریک کو بھی یہ اختیار ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: وفي البحر عن البزازية اشتركا واشتريا امتعة ثم قال احدهما لا اعمل معك بالشركة وغاب فباع الحاضر الامتعة فالحاصل للبائع وعليه قيمة المتاع لان قوله لا اعمل معك فسخ للشركة معه واحدهما يملك فسخها وان كان المال عروضا بخلاف المضاربة هو المختار اهـ. (ردالمحتار: ۳/ ۳۶۳)

بلااذن شریک تصرف جائز نہیں:

سوال: عنایت اللہ اور علی محمد دونوں نے پینتیس (۳۵) ہزار میں گاڑی خریدی جس میں سے سولہ (۱۶) ہزار روپے نقد ادا کئے اور انیس (۱۹) ہزار ایک مدت معینہ تک اُدھار رہے، دو تین مہینے کے بعد علی محمد ایران چلا گیا جب روپیہ دینے کا وقت مقرر آیا تو عنایت اللہ کے پاس پیسے نہیں تھے، قرض خواہ نے عنایت اللہ کو مجبور کیا کہ روپیہ اداء کرو ورنہ گاڑی پر قبضہ کرلوں گا، مجبور ہو کر عنایت اللہ نے گاڑی تیس (۳۰) ہزار میں فروخت کردی، چند دن کے بعد علی محمد بھی آگیا اور اعتراض کیا کہ تم نے پانچ ہزار کے نقصان پر گاڑی کیوں دی؟ عنایت اللہ نے اپنا مدعا عذر پیش کیا مالک نے بہت تنگ کیا آخر میں کیا کرتا؟ اب یہ بیع ہوئی یا نہیں اور نقصان کس پر آئے گا؟
بینوا توجروا

الجواب باسم ملهم الصواب

صرف عنایت اللہ کے حصہ کی بیع صحیح ہے، گاڑی علی محمد اور خریدار کے درمیان مشترک ہے، اگر خریدار اشتراک پر راضی نہیں تو وہ بیع کو فسخ کر کے گاڑی واپس کرسکتا ہے۔

قال فی شرح التنویر: نحو حمام وطاحون وعبد ودابة حیث یصح بیع حصته اتفاقاً اھ. (ردالمحتار: ۳/۳٤٦)

مشترک مکان کی بلااجازت مرمت:

سوال: زید کی تحویل میں اس کے مرحوم والد کا متروکہ ایک مکان ہے جو ہنوز ورثا میں تقسیم نہیں ہوا۔ مکان کے ایک حصہ سے جو کرایہ حاصل ہوا وہ زید نے تمام ورثا کا حق سمجھتے ہوئے بطور امانت رکھا تاوقتیکہ شرعی تقسیم ہوجائے، اسی اثناء میں مکان کا ایک حصہ بوسیدہ ہونے کی وجہ سے قابلِ مرمت ہوگیا، مکان کی شرعی تقسیم میں دفتری کارروائی کی وجہ سے تاخیر ہورہی ہے، زید کے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ وہ مکان کے اس حصہ کی مرمت وغیرہ کروالے۔

کیا اس صورت میں کرایہ سے حاصل شدہ رقم جو زید کے پاس امانت ہے اس سے مکان کی مرمت کروائی جاسکتی ہے؟ اگر مکان کی مرمت نہیں کروائی جاتی تو بوقتِ فروخت مکان کی پوری قیمت وصول نہ ہوگی۔

نیز یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ اگر اس رقم میں سے مرمت کروائی جاسکتی ہے تو دوسرے ورثہ سے

اس رقم کے خرچ کرنے کی اجازت لینی پڑے گی یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اگر مکان ورثہ میں قابلِ تقسیم ہے تو کرایہ کی مشترک رقم خرچ کرنے کے لئے دوسرے شرکاء سے اجازت لینا ضروری نہیں۔

اور اگر مکان قابلِ تقسیم نہیں یعنی تقسیم کی صورت میں ناقابلِ انتفاع ہوجاتا ہے تو دوسرے شرکاء سے مرمت پر خرچ کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، اگر وہ اجازت نہ دیں تو حاکم کو درخواست دیکر انہیں مرمت پر مجبور کرسکتے ہیں، اگر حاکم سے اس کی اُمید نہ ہوتو بدون اجازت شرکاء بھی مرمت پر ان کی رقوم خرچ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

لانه صار مضطرا الى المرمة كالمشترك الذى يقبل القسمة .

قال العلائى رحمه الله تعالىٰ : والضابط ان كل من اجبران يفعل مع شريكه اذا فعله احدهما بلااذن فهو متطوع والا لا، ولا يجبر الشريك على العمارة الا فى ثلاث وصى وناظروضرورة تعذر قسمة ككرى نهر ومرمة وقناة وبئر ودولاب وسفينة معيبة وحائط لايقسم اساسه فان كان الحائط يحتمل القسمة ويبنى كل واحد فى نصيبه السترة لم يجبر والا اجبر وكذا كل مالا يقسم كحمام وخان وطاحون وتمامه فى متفرقات قضاء البحر والعينى والاشباه .

(ردالمحتار : ٣٦٥/٣ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ٤٠١/٦)

مشترک زمین میں بلا اجازت شریک پودے لگادیئے:

سوال : دو آدمی ایک زمین میں شریک ہیں ایک شریک نے کھجور کے پودے مشترک زمین میں لگادیئے۔

چند سال بعد جب پودے پھل دینے لگے تو شریک نے کہا کہ چونکہ میں نے پودے لگائے ہیں اس لئے میں شریک ثانی کو حصہ نہیں دیتا۔

شریک ثانی کہتا ہے کہ چونکہ آپ نے زمین مشترک میں بلا اجازت پودے لگائے ہیں اس لئے یہ پودے بھی تقسیم کئے جائیں گے، اب اس صورت میں کیا فیصلہ ہوگا؟

واضح رہے کہ ہمارے دیار میں یہ عرف ہے کہ کھجور کے پودے لگانے والے کو نصف درخت ملا کرتا ہے لیکن یہ نصف اس وقت ملا کرتا ہے جب مالک زمین کی اجازت صراحۃً یا دلالۃً موجود ہو؟ بینوا توجروا

جواب: یہ زمین دونوں میں تقسیم کی جائے گی، پودے لگانے والے کے حصہ میں اس کے پودے برقرار رہیں گے، اور دوسرے شریک کے حصہ سے پودے لگانے والا اپنے پودے اکھاڑ لے اور پودے اکھاڑنے سے زمین میں جو نقص واقع ہو وہ اس کے مالک کو ادا کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: ارض بينهما زرع احدهما كلها تقسم الارض بينهما فما وقع فى نصيبه اقر وما وقع فى نصيب شريكه امر بقلعه وضمن نقصان الارض هذا اذا لم يدرك الزرع فلو ادرك او قرب يغرم الزارع لشريكه نقصان نصفه لو انتقصت لانه غاصب فى نصيب شريكه. (ردالمحتار: ٣/٣٤٦)

اگر پودے اکھاڑنے سے زمین کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہو تو زمین کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حصے میں لگے ہوئے پودوں کی قیمت ادا کر کے ان کا مالک بن جائے قیمت ایسے پودوں کی لگائی جائے گی جو واجب ہوں اور جن کو اکھاڑنا لازم ہو۔

قال فى التنوير: ومن بنى او غرس فى ارض غيره بغير اذنه امر بالقلع والرد وللمالك ان يضمن له قيمة بناء او شجر امر بقعله ان نقصت الارض به.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: (قوله ان نقصت الارض به) اى نقصانا فاحشا بحيث يفسدها اما لو نقصها قليلا فيأخذ ارضه ويقلع الاشجار ويضمن النقصان سائحانى عن المقدسى. (ردالمحتار: ٥/١٣٧)

شرکت میں تعیینِ نفع کا اُصول:

سوال: دو شخصوں نے مل کر ایک کتاب چھاپی، ان میں سے ایک اس کتاب کو فروخت کرتا ہے اور جو کچھ نفع ہوتا ہے اس کو بحصۂ مساوی یا کم وبیش جیسا کہ طے ہو جائے آپس میں تقسیم

کر لیتے ہیں، کیا اس قسم کی شرکت شرعاً جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: جائز ہے، البتہ اگر عقد میں پورا یا اکثر کام ایک شریک کے ذمہ مشروط ہو تو دوسرے شریک کے لئے اس کے حصۂ رأس المال سے زیادہ نفع کی شرط جائز نہیں، اگر نفس عقد میں یہ شرط نہ ہو بلکہ تبرعاً کام کر رہا ہو تو کام نہ کرنے والے کیلئے بھی زیادہ نفع کی شرط جائز ہے۔

کمپنی کی شرعی حیثیت:

کمپنی کی شرعی حیثیت کو سمجھنے کے لئے ایک مدلل مضمون مولانا عمران اشرف کی کتاب سے نقل کیا جارہا ہے چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو گذشتہ صفحات میں شرکت اور کمپنی کی تعریفات واقسام اور ان کے درمیان فرق کے بیان میں واضح ہوتی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، فقہاء کرام نے شرکت کی پانچ قسمیں ذکر فرمائی ہیں، اگر مضاربت کو اس میں شامل کرلیا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے، لہذا کمپنی کا کیا حکم ہے؟ آیا اسے شرکت کی روایتی اقسام میں بظاہر داخل نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا جائے یا اسے شرکت کی کسی روایتی قسم میں شامل مان کر یا شرکت کی نئی قسم قرار دیکر جائز کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگر تمام آراء کو جمع کیا جائے تو تین قسم کے نقطہ ہائے نظر بنتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ شرکت شرعاً صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں داخل مانا جائے تو چھ قسمیں ہو جاتی ہیں اور کمپنی ان مذکورہ اقسام میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے لہذا یہ ناجائز ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی ان قسموں میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہائے کرام نے اپنے دور میں شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے،

اور پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو وہ ناجائز ہوگی لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی ایک قسم میں داخل ہے، پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکت عنان میں داخل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مضاربہ کی ایک شکل ہے۔

اب ذیل میں مذکورہ بالا تینوں نقطہ نظر علیحدہ علیحدہ دلائل کے ساتھ ذکر کئے جاتے ہیں:

پہلا نقطہ نظر:

کمپنی کے عقد کے بارے میں پہلا نقطہ نظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ شرکت شرعی لحاظ سے صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان، میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل مانا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، جبکہ کمپنی کا عقد، مذکورہ بالا کسی قسم پر پورا نہیں اترتا، لہٰذا یہ ناجائز ہے، یہ نظریہ شیخ تقی الدین النبہانی کا ہے، ان کی رائے کے مطابق کمپنی کا عقد شرکت کی کسی بھی روایتی یا معروف اقسام میں داخل نہیں ہے، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ایک کاروباری طریقہ ہے، لہٰذا اسے اسلامی شرکت کے کسی طریقے پر منطبق کر کے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۱)

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ کی رائے بھی کسی حد تک ان کے مماثل ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

لا علم لنا بأن الفقه الاسلامي يعترف بهذا النوع من الشركات.

یعنی ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اسلامی فقہ شرکت (کمپنی) کی اس قسم کا اعتراف اور اعتبار کرتی ہو۔ (۲)

ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ نے اگرچہ صراحۃً اسے حرام تو نہیں کہا ہے البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام میں کسی نے اسے حلال قرار دیا ہے، اور بعض وجوہ کی بناء پر یہ شرکت کی معروف اقسام پر منطبق بھی نہیں ہو سکتا۔ (۳)

---

(۱) النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (۱۳۳) المرزوقي، صالح بن زابن، شركة المساهمة في النظام السعودي من علماء القرن الخامس عشر جامعة ام القرى مكة المكرمة. (۴۱۹)

(۲) الدكتور عيسى عبده، العقود الشرعيه (۱۸-۱۹)

(۳) الدكتور عيسى عبده، العقود الشرعية (۱۸-۱۹)

گویا کہ شیخ تقی الدین النبہانی اور ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ دونوں اس بارے میں متفق ہیں کہ اسے شرکت کی کسی روایتی قسم پر منطبق نہیں کیا جاسکتا، ان کے دلائل ذیل میں ذکر کئے گئے ہیں

1- کمپنی میں دو یا زائد افراد کے درمیان اس قسم کا کوئی عقد نہیں پایا جاتا جو شرکت میں ضروری سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ عقد دو افراد کے درمیان ایجاب وقبول کا نام ہے، شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ شرکاء کے درمیان ایجاب وقبول پایا جانا ضروری ہے، اس کے برعکس کمپنی میں جو شخص شرکت کرنا چاہتا ہے وہ محض اپنے ادارے سے جاکر شیئر خرید لیتا ہے خواہ بقیہ شرکاء (شیئر ہولڈرز) کی رضامندی اور قبول پایا جائے یا نہ پایا جائے۔ (۱)

2- شرکت کے روایتی تصور میں دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مشترکہ سرمائے سے تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی کیوں کہ اس میں حصہ دار (Sheare Holder) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سر انجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار بھی نہیں ہوتا، یہ بات بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔ (۲)

3- روایتی شرکت کے جواز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدن انسانی ہو جو قولی اور فعلی تصرفات کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی (Juristic Person) ہوتا ہے جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخصِ قانونی کی کوئی نظیر فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتی۔

4- کمپنی کی ایک خصوصیت محدود ذمہ داری (Limited Liability) ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ حاملانِ حصص (Share Holders) کی ذمہ داریاں ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ نقصان یہ ہوگا

---

(۱) النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (۱۳٤) الخياط، عبدالعزيز عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي دار النهضة العربية بيروت، ۱٤۰۷هـ (۲: ۱٦۱)

(۲) النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (۱۳٤) الخياط، عبدالعزيز عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت، ۱٤۰۷هـ (۲: ۱٦۱)

النبهاني، الشيخ تقي الدين، الشركات في الفقه الاسلامي (۱۳٤) الخياط عبدالعزيز، عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي دار النهضة العربية بيروت، ۱٤۰۷هـ (۲: ۱٦٥)

کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملان حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، محدود ذمہ داری کے اس تصور کی روایتی فقہ اور شرکت میں نظیر دکھائی نہیں دیتی، یہ بات بھی شرکت کے جواز کے لئے مانع ہے۔

-5 روایتی شرکت میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شریک مرجائے یا پاگل ہو جائے یا اسے زبانی اور عملی تصرفات سے روک دیا جائے (یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق اسے کردیا جائے) یا کوئی شریک عقد شرکت فسخ کردے تو پوری عقد شرکت فسخ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کمپنی میں کسی بھی شریک کی طرف سے ان حالات میں کمپنی کا کاروبار فسخ یا ختم نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، یہ بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔ (۱)

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی شرکت کی روایتی اقسام میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہاء کرام نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اسکی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے، پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہیں ہے وہ ناجائز ہوگی، لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی یہ نقطہ نظر موجودہ علماء کی بھاری اکثریت کا ہے کیوں کہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنیوں اور شرکت کی تمام جدید صورتیں جائز ہیں، بشرطیکہ وہ سود سے پاک ہوں۔

تیسرا نقطہ نظر:

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی قسم میں داخل ہے پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے، یہ رائے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ (۲) اور موجودہ دور کے اکثر علماء عرب اور عجم بشمول ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط (۳) اور الاستاذ علی الخفیف (٤) اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم وغیرہ کی ہے۔ (٥)

(۱) الخیاط، عبدالعزیز عزت الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۱:۲۱۱)
(۲) تھانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاوی، مکتبہ دارالعلوم کراچی، (۳: ٤۹٤)
(۳) الخیاط، عبدالعزیز عزت الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷، (۱:۲۸)
(٤) الخفیف، علی الشرکات (۹۷) بحوالہ الاستاذ سعیدالعالم مخطوطة اللمحات من احکام الشرکات، دارالعلوم کراچی۔ (۲:۵۳)
(٥) عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، اسلام اور جدید تجارت ومعیشت، ادارۃ المعارف، کراچی (۷۹)

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کمپنی کا عقد مضاربہ کی ایک شکل ہے یہ رائے شیخ عبدالوہاب کی ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنی مضاربہ کے عقد کی مانند ہے، جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہوتا ہے جیسے رب المال اور دوسرے فریق کا عمل جسے مضارب یا عامل کہتے اور کمپنی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، کہ ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے لہٰذا یہ مضاربت میں داخل ہے۔(۱)

قابل ترجیح رائے:

مذکورہ بالا تمام اقوال اور آراء میں سب سے زیادہ ترجیح حضرت تھانویؒ کی رائے کو ہونی چاہئے، کہ کمپنی کا عقد شرکت عنان میں داخل ہے، کیوں کہ اس میں کمپنی قائم کرنے والے افراد بھی دوسرے شرکاء (Share Holders) کی مانند کمپنی میں حصہ دار ہوتے ہیں، لہٰذا تمام افراد کمپنی میں شریک ہوجاتے ہیں، البتہ کمپنی قائم کرنے والے لوگ اپنے جامد اثاثوں اور عروض (اجناس) اور مال تجارت کو (قیمت لگا کر) نقد کی طرف محول کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپے کمپنی قائم کرنے کے لئے جامد اثاثوں مثلاً عمارتوں اور ساز وسامان پر صرف کیا تو اگر سو روپے کا ایک حصہ (Share) ہے تو وہ خود کو سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت صرف نقد سرمایہ سے نہیں ہوگی، بلکہ شرکت بالعروض ہوگی، جس کے بارے میں اسی باب کے پہلے عنوان ''کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے'' کے تحت اختلاف مذاہب بیان ہو چکے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اگر عروض ذوات الامثال میں سے ہوں تو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے(۲) اور احناف کے نزدیک اگر تمام عروض ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کر دیئے جائیں تو جائز ہیں(۳) حضرت تھانویؒ اور دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر مالکیہ کے قول پر فتویٰ دینے کی گنجائش ہے۔(٤)

خلاصہ یہ کہ اسے شرکتِ عنان قرار دیا جا سکتا ہے اور اس میں سرمایہ لگانے والے آپس میں

(۱) مجلة لواء الاسلام، العدد الثاني عشر ۱۹۵۱ء (ج: ٤) بحواله الخياط، عبد العزيز عزت الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت ١٤٠٧ (٢: ١٥٥، ١٥٦)
(۲) ابن قدامة المقدسي (أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد، المغني، مكتبة الرياض السعودية (٥: ١٢٤، ١٢٥)
(۳) الكاساني، علاء الدين ابوبكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني (٦: ٥٩)
(٤) تهانوى، مولانا اشرف على تهانوى، امداد الفتاوى، مكتبه دار العلوم كراچى (٣: ٤٩٥)

شرکاء ہیں اور اس میں شرکتِ عنان کی مانند بعض شرکاء کے حصص زیادہ اور بعض کے کم ہوتے ہیں، جو حضرات اسے یہ کہہ کر مضاربہ قرار دیتے ہیں کہ اس میں مضاربہ کی طرح ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ مضاربہ ہے، ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیوں کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہنچ جاتی ہے اور تمام حصہ داروں کا بذاتِ خود اس میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سب اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارات قائم کر لیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی مانند ہوتی ہے، پھر مجلس ادارات سے منتخب کر کے ایک شخص کو ناظم یا مدیر (Managing Director) بنایا جاتا ہے، جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے میں بھی تمام شرکاء کی حصہ داری ہوتی ہے، لہٰذا یہ شرکتِ عنان ہے۔

کمپنی کو ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل کا جائزہ:

اب ہم سب سے پہلے ذکر کردہ نقطہ نظر رکھنے والے حضرات کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو کمپنی کے عقد کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔

1- مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی سب سے پہلی دلیل یہ تھی کہ کمپنی میں دو یا زیادہ افراد کے درمیان شرکت کا عقد کرنے کے لئے ایجاب وقبول نہیں پایا جاتا، حالانکہ کوئی بھی عقد ایجاب وقبول کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل صحیح نہیں کیوں کہ کمپنی قائم کرنے کا ارادہ سب سے پہلے کسی ایک فرد کے ذہن میں آتا ہے، پھر وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شرکت کی دعوت دیتا ہے، تو پہلے شخص کی طرف سے ایجاب پایا گیا، اور اس کے ساتھ اس کی دعوت پر شرکت قبول کرنے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا اسی طرح کمپنی میں ایجاب وقبول کے ساتھ مالی منصوبہ میں عقد شرکت پایا گیا، اور شرکاء نے یہ طے کیا کہ وہ نفع نقصان میں شریک ہوں گے، اور اس عقد کو تحریری شکل میں لانے کے لئے وہ متعدد تحریریں تیار کرتے ہیں، مثلاً میمورنڈم، اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن، نیز ایک منشور مرتب کرتے ہیں، جسے پراسپکٹس (Prospectus) کہا جاتا ہے، یہ تمام مسودات اس عقد کے ایک قسم کے تحریری ثبوت ہوتے ہیں، لہٰذا یہ بات صحیح نہیں، پھر جو لوگ کمپنی قائم ہونے کے بعد

بازار سے شیئر خریدتے ہیں، وہ بیچنے والے کے ساتھ ایجاب وقبول کرتے ہیں کہ ایجاب وقبول پایا جاتا، کیونکہ کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے ایجاب ہوا اور بعد میں شریک ہونے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا۔

-2 مطلقاً حرام کہنے والے حضرات کی دوسری دلیل یہ تھی کہ شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمایہ سے مل کر تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی، کیوں کہ اس میں حصہ دار (Share Holders) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سرانجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ باتیں شرکت کے خلاف ہیں۔

ان حضرات کی یہ دلیل بھی صحیح نہیں کیوں کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کے عمل میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ کمپنی میں حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، اور تمام حصہ داران کا بذاتِ خود کام میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی وہ تمام اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ دارن میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارت قائم کردیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی ہوتی ہے اور پھر مجلس ادارت سے منتخب کر کے ایک شخص کو مدیر بنایا جاتا ہے جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہٰذا امر واقعہ یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے والا شخص تمام حصہ داران کا نمائندہ یا ملازم ہوتا ہے، لہٰذا اس کا ہر فعل حصہ داروں کا فعل ہے اور انہیں اسے ہر قسم کے اعتراض اور نگرانی کا اختیار ہوتا ہے، اور انتخاب میں رائے دہی کا حق ان کے حصص کے تناسب سے ہوتا ہے، یہ طریقہ شرکت یا کمپنی کی مصالح کے عین موافق ہے، اس لئے کہ کمپنی کا سب سے زیادہ خیر خواہ وہی ہوسکتا ہے، جس کا سرمایہ کمپنی میں زیادہ لگا ہوا ہو، لہٰذا کمپنی کو مطلقاً حرام کہنے والوں کا یہ دعویٰ بالکل بے جا ہے کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں اشتراک پایا جاتا ہے، عمل میں اشتراک نہیں پایا جاتا، اور شرکاء کو کمپنی میں کسی قسم کے عمل دخل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ [1]

-3 جو حضرات کمپنی کے مطلقاً ناجائز ہونے کے قائل ہیں ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ روایتی شرکت کیلئے یہ ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدلِ انسانی ہو

(۱) الخياط عبد العزيز عزت، الشركات في الشريعة الاسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت، ۷، ۱٤۰ (۱۸۲:۲)

جو تصرفات قولیہ اور تصرفات فعلیہ کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخص قانونی یا شخص حکمی ہوتا ہے، جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخص قانونی کی فقہ میں کوئی نظیر نہیں۔

جیسا کہ ہم نے دوسری دلیل کے جواب میں ذکر کیا کہ تصرفاتِ قولیہ وفعلیہ کا اختیار مجلس ادارت کو ہوتا ہے جو شرکاء کی وکیل ہے، لہٰذا کاروبار درحقیقت تمام حصہ داران اپنے وکیل کے واسطے سے انجام دیتے ہیں، البتہ متعدد قانونی پیچیدگیوں کی بناء پر ان شرکاء کے مجموعے کو شخص قانونی (juristic Person) کی حیثیت دیدی گئی ہے، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ "شخص قانونی" کا تصور اسلام میں موجود ہے یا نہیں؟ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں اگرچہ شخصِ قانونی کی اصطلاح موجود نہیں ہے، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

شخص قانونی کے فقہی نظائر

(۱) وقف:

وقف کے لئے اگرچہ شخصِ قانونی (Juristic Person) کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے، اس لئے وقف اشیاء کا مالک بن سکتا ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے تو وقف کردہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور جس کے اوپر وقف کیا گیا (جسے موقوف علیہ کہا جاتا ہے) اس کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، لہٰذا وہ چیز نہ واقف (وقف کرنے والا) کی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی موقوف علیہ کی ملک ہوتی ہے، بلکہ وقف خود ایک مستقل وجود رکھتا ہے، گویا کہ اب وہ ایک شخص قانونی کی شکل اختیار کرگیا ہے، لہٰذا اب وہ اشیاء کا مالک بھی بن سکتا ہے، دائن اور مدیون یا موجر اور مستاجر بھی بن سکتا ہے، چنانچہ وقف کا متولی اس کی طرف سے کوئی قرضہ لے سکتا ہے، یا کوئی چیز کرایہ پر لے سکتا ہے، اسی طرح اس کے لئے ضرورت کی کوئی چیز خرید سکتا ہے، اور اس قرضہ یا واجب الاداء کرایہ کی رقم یا قیمت کی ادائیگی کا وجوب درحقیقت وقف پر ہوگا، لہٰذا متولی وقف کی آمدنی سے ان کی ادائیگی کرے گا، اسی طرح وقف کی جائیدادیں کرایہ پر بھی دی جاسکتی ہیں اور اس کے کرایہ کا مستحق وقف ہوگا، اگر وقف کے متولی نے وقف کے لئے ادھار لیا پھر وہ معزول ہوگیا تو اس سے

عرض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ نیا متولی وقف کی طرف سے اس کی آمدنی سے اس دین کی ادائیگی کرے گا، لڑائی جھگڑوں اور مقدمات کی صورت میں دراصل وقف ہی مدعی یا مدعیٰ علیہ ہوگا، اور اس کی طرف سے متولی اس کے متعلقہ امور نمٹائے گا۔ (۱)

(۲) بیت المال:

بیت المال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعویٰ نہیں کر سکتا اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک شخص قانونی ہے، بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر ایک مد ایک مستقل شخص قانونی ہے، بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں، بیت مال الصدقہ، بیت مال الخراج، امام زیلعی رحمہ اللہ نے مسئلہ لکھا ہے، کہ اگر ایک حصہ میں مال نہ ہو تو بوقت ضرورت دوسرے حصہ سے قرض لیا جا سکتا ہے۔

(تبیین الحقائق کتاب السیر قبیل باب المرتدین : ۳/۲۸۳)

اس صورت میں جس حصہ سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصہ کے لئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہوگا، دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص فرض کر لیا گیا ہے۔

(۳) ترکۂ مستغرقہ بالدین:

کسی میت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میت ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا اور نہ ورثہ مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو شخصِ قانونی ہے۔

(٤) خلطۃ الشیوع:

یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، بلکہ ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مال زکوٰۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوٰۃ انفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر [illegible] ہے، معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعہ ایک شخص قانونی ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے

---

(۱) [illegible] شامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین الشامی تنقیح الحامدیۃ، دار المعرفہ بیروت، (۱/۲۱۳) [illegible] شامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی، مطبعۃ الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ (۳/٦۱۹) شیخ زادہ [illegible] عبد الرحمن بن الشیخ محمد بن سلیمان المعروف بداماد آفندی، مجمع الانہر شرح ملتقی الابحر، دار [illegible] ۱۹۷۷ (۱/۷٤۹) الحصکفی، محمد علاء الدین بن الشیخ علی الامام بجامع بنی امیہ، الدر المنتقی فی شرح الملتقی (۱/۷٤۹) طبع دار السعادۃ استانبول (ماخوذ از عصر حاضر اور شرکت ومضاربت)

قابل ہے کہ خلطۃ الشیوع اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ خلطۃ الشیوع میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں مجموعے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی انفرادی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے اور شیئر ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص قانونی کا تصور فی نفسہ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح نئی ضرور ہے۔

محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دوسری خصوصیت جو شرعی اعتبار سے قابل غور ہے وہ (Limited Liability) یعنی "محدود ذمہ داری" ہے جس کی تشریح پیچھے کی جا چکی ہے، اس میں جہاں تک شیئرز ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کی تو شرعی نقطۂ نظر سے ایک نظیر موجود ہے، اس لئے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے، چنانچہ اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہوگئے تو ایسی صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں ہوگا بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا کیوں کہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں، اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے، ایسے ہی شیئر ہولڈرز جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے، البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی، اور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں، تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے، اور جب رب المال مضارب کو قرض کی اجازت دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی، لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ پراسپکٹس ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو، لہٰذا اس کی صحیح نظیر

یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے اصل اشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے، مگر مضارب کی ذمہ داری تو محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین رب المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں، چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا، لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے اور خود کمپنی جو شخص قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی، دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا ''خراب الذمۃ'' فقہاء کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اشکال کی بناء پر بعض علماء عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہو جاتے ہیں، کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہئے، لیکن اس مسئلے کو اگر ایک دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد دراصل شخص قانونی کے تصور پر ہے، شخص قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا، شخص حقیقی مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دین وصول کر سکتے ہیں، اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کر سکتے، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے دائنین کو فرمایا تھا "خذوا ما وجدتم، ليس لكم الا ذلك"[1] البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو اب پھر مطالبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو ''خراب الذمۃ'' ہو جاتا ہے، ان کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی، معلوم ہوا کہ شخص حقیقی اگر مفلس ہو کر مر جائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے، جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہئے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہو جانا ہی اس شخص قانونی کی موت ہے۔

خصوصاً جب کہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے،

(۱) صحیح مسلم: ۱/۲۱۹، ادارۃ القرآن، کتاب، باب وضع الجوائح

میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا، یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے، پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے، قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے، غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علی بصیرۃ کرتا ہے اسمیں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا، اس لئے اکثر علماء عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جا سکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر:

فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے، وہ ''عبد ماذون فی التجارۃ'' ہے، یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ کی مملوک ہوتی ہے، اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہوسکتا ہے اور نہ مولیٰ سے، یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہوگیا، یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہوجاتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی مولیٰ کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔

(ماخوذ از جدید معیشت و تجارت)

مضاربۂ فاسدہ کا حکم:

اگر کسی شرط فاسد سے عقد مضاربہ فاسد ہوجائے تو معاملہ ختم کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ، اس عقد سے حاصل ہونے والا کل منافع رب المال (یعنی صاحب مال) کا ہوگا، مضارب (کام کرنے والے) کو اجرت مثل ملے گی، البتہ اس کی مقدار طے شدہ منافع سے زیادہ نہیں ہونی ہونا چاہئے، نیز اگر اس عقد میں نفع نہ بھی ہو تب بھی مضارب کو اجرت کا حقدار ہوگا۔

واجارۃ فاسدۃ إن فسدت فلاربح للمضارب حینئذٍ بل له اجر مثل عمله مطلقاً ربح اولا بلازیادۃ علی المشروط .

(ردالمختار: ٤/٥٣٩)

مضاربہ میں نقصان کی تفصیل:

زید بکر دو آدمی اس طرح کاروبار کریں کہ مثلاً زید بکر کو بیس ہزار دیتا ہے اور بکر اپنی طرف سے

پانچ ہزار ملا کر کاروبار کرتا ہے، اب اگر اس تجارت میں نقصان ہو جائے تو یہ ذمہ دار کون ہوگا؟

اس کا حکم یہ ہے کہ اس تجارت میں کل پچیس ہزار رأس المال ہے، اس سے جو زائد رقم حاصل ہو وہ منافع ہے اب اگر نقصان ہو جائے تو اس نقصان کو پہلے منافع سے ادا کیا جائے گا، اگر منافع سے نقصان کی تلافی نہ ہو سکے تو رأس المال سے بقدر حصص (یعنی نقصان کے پانچ حصے کر کے چار حصے زید اور ایک حصہ بکر) ادا کرے گا۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وما هلك من مال المضاربة يصرف الى الربح لانه تبع فان زاد الهالك على الربح لم يضمن ولو فاسدة من عمله لانه أمين. (رد المحتار: ٤/٥٤٦)

مضارب کا شرط کی خلاف ورزی کرنے کا حکم:

اگر عقد مضاربہ طے ہو جانے کے بعد مضارب نے شرط کی خلاف ورزی کی مثلاً، شرط یہ طے پائی تھی کہ باٹا کمپنی سے چپل خرید کر فروخت کئے جائیں گے لیکن مضارب نے رب المال کو بتائے بغیر کسی اور کمپنی سے مال خرید اس طرح تجارت کرتا رہا، تو یہ مضارب کی طرف سے خیانت ہوئی اب خریداری عقد مضاربہ کے بجائے خود مضارب کے لئے ہوئی، لہٰذا اگر غیر معیاری کمپنی سے خریدنے کی وجہ سے نقصان ہو گیا تو نقصان مضارب کے ذمہ ہوگا، اگر نفع ہوا تو منافع بوجہ خبث کے واجب التصدق ہے۔

البتہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس چیز میں حق غیر کی وجہ سے خبث آ گیا ہو اسے صدقہ کرنے کی بجائے صاحب مالک پر رد کرنا واجب ہے، لہٰذا کل منافع رب المال کو ملنا چاہئے۔

قال الامام المرغيناني رحمه الله تعالىٰ: فيكون سبيله التصدق في رواية ويرد عليه في رواية لان الخبث لحقه وهذا اصح.

(هداية: ٣/١٢٣، كتاب الكفالة)

مگر رب المال کو منافع میں سے عقد میں طے شدہ حصہ نفع کے بقدر ملے گا اس سے زائد نہیں ملے گا، کیوں کہ وہ نفع کا حصہ متعین کر کے زائد حصہ کے اسقاط پر راضی ہو چکا ہے۔

كما قالوا في الاجارة الفاسدة. (ماخوذ از احسن الفتاوىٰ: ٧/٢٤٧)

کتاب القسمة

مشترک ملک کی تقسیم شرعاً جائز ہے، البتہ جو چیزیں تقسیم کے بعد قابل انتفاع نہ رہیں اس کی تقسیم کے لئے شرکاء کی رضامندی ضروری ہے محض ایک شریک کی چاہت ومطالبہ پر قاضی تقسیم نہیں کرے گا، ہاں دونوں ہی تقسیم کے خواہشمند ہوں تو تقسیم کردی جائے گی یا یہ کہ تقسیم کے بجائے اپنے شریک کے ہاتھ فروخت کردے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : القسمة في الاعيان المشتركة مشروعة لان النبي عليه الصلاة والسلام باشرها في المغانم والمواريث وجرى التوارث بها من غير نكير . (هداية : ٤/١١ ٤)

وشرطها عدم فوت المنفعة بالقسمة وكذا لا يقسم نحو حائط وحمام (درمختار) وقال الشارح تحت قوله المنفعة اى المعهودة وهى ما كانت قبل القسمة اذا الحمام بعدها ينتفع به كنحو ربط الدواب وسيذكره الشارح عن المجتبىٰ ، وقوله ولذا لا يقسم نحو حائط ، يعنى عند عدم الرضاء من الجميع اما اذا رضى الجميع صحت كما سيأتى متنا اهـ. (ردالمحتار : ٦/٢٥١ ، كتاب القسمة)

بوقت تقسیم شرکاء کے موجود ہونے کی تفصیل:

مشترک اشیاء کی تقسم کے وقت تمام شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس بارے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر شئی مشترک ذوات الامثال میں سے ہو تو تمام شرکاء کا موجود ہونا ضروری نہیں، خواہ یہ چیز وراثت سے حاصل ہوئی ہو یا مشترک خریداری وغیرہ سے۔

البتہ شریک غائب کا حصہ اس تک پہنچنے سے پہلے اگر ضائع ہو جائے تو نقصان حاضر و غائب دونوں کو برداشت کرنا ہوگا پھر حاضر کو ملا ہوا حصہ دونوں میں مشترک ہوگا۔

اور اگر شئی مشترک ذوات القیم میں سے ہے تو سب شرکاء کا موجود ہونا ضروری ہے، کوئی شریک غائب ہو تو تقسیم صحیح نہیں، بلکہ غائب کی اجازت پر موقوف ہے، البتہ صرف ترکہ تقسیم باذن قاضی جائز ہے، قاضی غائب شریک کی طرف سے اس کا حصہ قبضہ کرنے کے لئے نائب مقرر

کرے۔

قال فی التنویر وشرحه : (وتشتمل) مطلقا (علی) معنی (الافراز) وهو اخذ عین حقه (و) علی معنی (المبادلة) وهو اخذ حقه (و) الافراز (هو الغالب فی المثلی) ومافی حکمه وهو العددی المتقارب فان معنی الافراز غالب فیه ایضاً ابن کما ل عن الکافی (والمبادلة) غالبة (فی غیره) ای غیر المثلی وهو القیمی اذا تقررهذا الاصل (فیأخذ الشریك حصة بغیبة صاحبه فی الاول) ای المثلی لعدم التفاوت (لاالثانی) ای القیمی لتفاوته .

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ : (قوله والافراز هو الغالب فی المثلی) لان مایأخذ ه احدهما نصفه ملکه حقیقة ونصفه الآخر بدل النصف الذی بید الآخرفبا عتبار الاول افراز وباعتبار الثانی مبادلة الاان المثلی اذا اخذبعضه بدل بعض کان المأخوذ عین المأخوذ عنه حکما لوجود المماثلة بخلاف القیمی .

(قوله ومافی حکمه) ای حکم المثلی اقول نقل فی جامع الفصولین عن شرح الطحاوی کل کیلی ووزنی غیر مسوغ وعددی متقارب کفلوس وبیض وجوزونحوها مثلیات والحیوانات والزرعیات والعددی المتفاوت کرمان وسفر جل والوزنی الذی فی تبعیضه ضرر وهو السبوغ قیمیات ۔ ا هـ ۔ ثم نقل عن الجامع العددی المتقارب کله مثلی کیلا وعدا ووزنا وعند زفررحمه اللّٰه تعالیٰ قیمی وما تتفاوت احاده فی القیمة فعددی متفاوت لیس بمثلی الخ فتأ مل . (رد المحتار : ۱۷۸/۵)

قال فی شرح التنویر : فی الخانیة مکیل او موزون بین حاضر وغائب او بالغ وصغیر فاخذ الحاضر او البالغ نصیبه نفذت القسمة ان سلم حظ الآخرین والا لا .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله في الخانية الخ) اراد به بيان فائدة هي انه اذا قسم ذو اليد حصته بغيبة صاحبه كما قال في المتن لا تنفذ القسمة مالم تسلم حصة الأخر (قوله ان سلم حظ الأخرين) اي الغائب والصغير مفهومه ان سلامة مااخذه لا تشترط كما سيظهر (قوله والا لا) اي وان لم يسلم بأن هلك قبل وصوله اليهما لا تنفذ القسمة بل تنتقض ويكون الهالك على الكل ويشاركه الأخران فيما اخذ لما في هذه القسمة من معنى المبادلة .

(ردالمحتار : ١٧٨/٥)

قال في شرح التنوير : وصحت برضاء الشركاء الا اذا كان فيهم صغيراو مجنون لانائب عنه او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومهما حينئذ الا باجازة القاضي او الغائب او الصبي اذا بلغ او وليه هذالو ورثة ولو شركاء بطلت منية المفتي وغيرها. (ردالمحتار : ١٨٠/٥)

وفيه ايضا بعد صفحتين : (ولوبرهنا على الموت وعدد الورثة وهو) اي العقار قلت قال شيخنا وكذا المنقول بالاولىٰ (معهما وفيهم صغير او غائب قسم بينهم ونصب قابض لهما) نظر اللغائب والصغير ولابد من البينة على اصل الميراث عنده ايضا خلافا لهما كما مر (فان برهن) وارث (واحد) لايقسم اذلابدمن حضوراثنين ولو احدهما صغيراوموصى له (او كانوا) اي الشركاء (مشترين) اي شركاء بغير الارث (وغاب احدهم) لان في الشراء لا يصلح الحاضر خصما عن الغائب بخلاف الارث .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله قسم بينهم) افاد ان القاضي فعل ذلك قال في المحيط فلو قسم بغير قضاء لم تجز الا ان يحضر او يبلغ فيجيز طوري وهذا ما قدمه الشارح (قوله بخلاف الارث) قال في الدررفان ملك الوارث ملك الخلافة حتى

یرد بالعیب علی بائع المورث ویرد علیه ویصیر مغرورا بشراء المورث حتی لو وطی امة اشتراها مورثه فولدت فاستحقت رجع الوارث علی البائع بثمنها وقیمة الولد للغرور من جهته فانتصب احدهم خصما عن المیت فیمافی یده والآخر عن نفسه فصارت القسمة قضاء بحضرة المتقاسمین واما الملك الثابت بالشراء فملك جدید بسبب باشره فی نصیبه ولهذا لا یرد بالعیب علی بائع فلا ینتصب الحاضر خصما عن الغائب فتکون البینة فی حق الغائب قائمة بلا خصم فلا تقبل . اهـ (ردالمحتار : ١٥٢/٥)

نابالغ کے ساتھ تقسیم ترکہ کا حکم:

مثلاً کسی شخص کا انتقال ہو جائے اور ورثہ میں کوئی نابالغ لڑکا بھی ہو اب اگر میراث تقسیم ہو جائے تو بلوغ کے بعد صغیر کو تقسیم فسخ کرنے کا اختیار ہوگا یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے، اگر یہ تقسیم صغیر کے ولی کی اجازت کے بغیر ہو تو بلوغ کے بعد اس کو تقسیم فسخ کرنے کا اختیار ہوگا اور اگر صغیر کے ولی کی اجازت سے تقسیم ہوئی ہو تو بلوغ کے بعد تقسیم فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

اگر یہ مالِ مشترک میراث نہ ہو بلکہ شرکت ہو تو بلوغ کے بعد تقسیم فسخ کرنے کا صغیر کو مطلقاً حق حاصل ہوگا۔

وصحت برضاء الشرکاء الا اذا کان فیهم صغیرا ومجنون لانائب عنه أو غائب لا وکیل عنه لعدم لزومها حینئذ الا باجازة القاضی أو الغائب او الصبی اذابلغ أو ولیه هذا لورثة ولو شرکاء بطلت منیة المفتی وغیرها . (ردالمحتار : ٢٥٧/٦ ، کتاب القسمة)

مشترک مکانات کے منافع تقسیم کرنے کا حکم:

اگر شرکاء کے درمیان مکانات مشترک ہیں اب ملکیت کو مشترک رکھتے ہوئے ان کے منافع کو تقسیم کرنا ہو تو تقسیم منافع کی جائز صورت کیا ہوگی؟

عبارات فقہاء پر غور کرنے سے اس کے جواز کی دو صورتیں سامنے آئی ہیں۔

1- دونوں مکانوں کے منافع کے مجموعہ کو بقدر حصہ ملک آپس میں تقسیم کیا جائے۔

2- باہم مکانوں کی تعیین کرلیں ایک مکان ایک شریک کے لئے دوسرا دوسرے شریک کے لئے، پھر ہر شریک کو اختیار ہے کہ اپنے متعین مکان میں خود رہے یا اسکو کرایہ وغیرہ پر دے کر منافع حاصل کرے اس صورت میں ہر ایک اسی مکان کے منافع کا مستحق ہوگا جو اس کو تقسیم میں ملا ہے، خواہ اس کا منافع دوسرے سے کم ہو یا زیادہ۔

قال الامام التمرتاشی رحمه اللّٰه تعالیٰ : ولو تهايؤا في سكنى دار او دارين (الى قوله) أوفي غلة دار أو دارين صح .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالیٰ : تنبيه : في الهداية لكل واحد أن يستغل ما اصابه بالمهاياة وان لم يشترط ذلك لحدوث المنافع على ملكه .

قوله كذلك أي يأخذ هذا شهرًا والاخر شهرًا او يأخذ هذا غلة هذه والاخر غلة الاخرى. (ردالمحتار : ٦/٢٦٩ آخر كتاب القسمة)

وکالت کے احکام

وکالت کا معنی لغت میں:

التفويض والاعتماد على الغير .

یعنی لغت میں وکالت کا معنی ہے، سپرد کرنا، دوسرے پر اعتماد کرنا، کسی کو اپنے کاموں کے انجام دہی کے لئے نائب مقرر کرنا.

قال اللّٰه تعالیٰ : ﴿ انی توکلت علی اللّٰه ربی وربکم ﴾

(سورة هود : ٥٥)

الوكالة فى الشرع:

انابة الشخص لاخر فيما يقبل النيابة وتفويض امره اليه بما يحقق الخير والمصلحة وباختصار تفويض شخص امره لاخر فيما يقبل النيابة .

یعنی شرعاً وکالت کا معنی یہ ہے کہ جس میں نیابت چل سکتی ہو اور وہ کام دوسرے کے سپرد

کرنے میں خیر و مصلحت ہو ایسے کام انجام دینے کے لئے کسی کو اپنا نائب مقرر کرنا۔

وکالت کی مشروعیت:

چونکہ ہر انسان اپنا ہر کام خود انجام دینے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے ذریعے کام کروانے پر مجبور ہوتا ہے، اس لئے شرعاً وکالت جائز کاموں کو انجام دینے کے لئے جائز ہے، دوسروں کے کام انجام دینا یہ نیکی کے کام میں تعاون ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ تعاونوا على البر والتقوىٰ، ولا تعاونوا على الاثم والعدوان ﴾ (سورة المائدة : ٢)

یعنی نیکی وتقویٰ کے کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو، گناہ اور ظلم کے کام میں ایک دوسرے کی مدد مت کرو۔

لقوله عليه السلام: "والله في عون العبد ما كان العبد في عون اخيه." (طرق من حديث اخرجه البخاري ومسلم)

یعنی جب کوئی آدمی کسی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس آدمی کی مدد کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ حکیم بن حزام کو قربانی کا جانور خریدنے کے لئے وکیل مقرر فرمایا تھا، اسی طرح صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حج کے موسم میں تبلیغ سورت کے لئے اپنا نائب مقرر فرمایا تھا، اسی طرح بعض صحابۂ کرام کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے اپنا نائب مقرر کرکے مختلف علاقوں کی طرف بھیجنا ثابت ہے، اسی طرح اقامت حدود کے لئے بعض صحابہ کو مقرر فرمانا بھی احادیث سے ثابت ہے۔

والاصل فيه قوله سبحانه تعالیٰ: ﴿ وان خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكما من اهله وحكما من أهلها ان يريدا اصلاحا يوفق الله بينهما ﴾ (سورة النساء : ٣٥)

اگر تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی کشائش کا) اندیشہ ہو تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی عورت کے خاندان سے بھیجو اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادیں گے۔ (نساء)

اس آیت سے بھی وکالت کی مشروعیت ثابت ہے۔

مؤکل کی شرائط:

مؤکل کے اندران شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، کہ وہ عاقل بالغ ہو اور جس کام کے لئے دوسرے کو وکیل مقرر کر رہا ہے، اس کام کو خود انجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو یعنی شرعاً اس کے لئے ممنوع نہ ہو۔

وکیل کی شرائط:

مؤکل کی طرح وکیل کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو اور جس کام کے لئے وکیل مقرر کیا جا رہا ہے اس کام کو انجام دینے کی اہلیت رکھتا ہو۔

صحت وکالت کا ضابطہ:

فقہاء کرام نے صحتِ وکالت کے لئے ضابطہ مقرر فرمایا ہے۔

كل عقد جاز أن يعقده الانسان لنفسه جاز له أن يو كل فيه غيره، واما مالا تجوز فيه الو كالة فهو كل عمل لاتدخله النيابة .

(فقه المعاملات)

یعنی ہر وہ عقد جو انسان خود منعقد کر سکتا ہے، اس کے لئے کسی دوسرے کو وکیل مقرر کرنا بھی جائز ہے اور جس کام کے لئے شرعاً نیابت درست نہیں اس کے لئے وکیل مقرر کرنا بھی جائز نہیں۔

عبادات بدنیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات بدنیہ جو انسان کے ذمہ فرض ہیں، جیسے نماز، روزہ وضوء، طہارت، اللہ کی ذات کی قسم، ان امور کے لئے کسی غیر کو وکیل مقرر کرنا جائز نہیں، کیوں کہ یہ ایسی عبادات ہیں جن کی ادائیگی انسان کے ذمہ خود لازم ہے، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بندوں کا امتحان فرماتے ہیں: تا کہ مطیع اور عاصی (گناہ گار) میں فرق معلوم ہو جائے۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ و نبلو كم بالشر و الخير فتنة، و الينا ترجعون ﴾

(سورة الأنبياء : ٣٥)

عبادات مالیہ کے لئے وکیل مقرر کرنے کا حکم:

عبادات مالیہ، جیسے زکوٰۃ، صدقہ، قربانی، کفارات مالیہ اور دیگر تمام نفل کاموں کے لئے وکیل

مقرر کرنا جائز ہے، جیسے کسی کو زکوۃ ادائیگی یا تقسیم کے لئے وکیل مقرر کرے۔

فقد وکل اباهريرة بأن يحفظ اموال الصدقة ووكل بعض اصحابه بان يجمعواله مال الزكاة، ووكل عليا بأن ينحرعنه بقية الهدى، من الابل التي ساقها في حجة الوداع وكانت مائة ناقة نحر منها بنفسه ثلاثا وستين ووكل عليا بنحر الباقي فدل ذلك على جواز التوكيل بالامور الماليه. (فقه المعاملات)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو صدقات کے مال کی حفاظت کے لئے وکیل فرمایا اور بعض صحابہ کو اموال زکوۃ وصول کرنے کا وکیل بنایا، اور حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے سو اونٹ کی قربانی کی، ۶۳ خود ذبح فرمایا اور باقی کے ذبح کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وکیل مقرر فرمایا۔

عدالت میں وکالت کا پیشہ اختیار کرنے والوں کے لئے تنبیہ:

عدالت میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے یا مدعی کے غلط دعویٰ کی مدافعت کرنے کیلئے کسی کو وکیل مقرر کرنا یا کسی کا وکیل مقرر ہونا شرعاً جائز ہے، مؤکل مرد ہو یا عورت، نیز اس پر فریق مخالف راضی ہو یا ناراض، بہرحال شریعت کی طرف سے اجازت ہے، کوئی بطور وکالت اس کام کو انجام دے۔

البتہ کسی جھوٹے مدعی کی حمایت کرنا یا کسی ظالم کی طرف سے مدافعت کرنا، اس کی خاطر جھوٹ بولنا اور اس کو دوسروں سے بذریعہ عدالت مال لوٹ کر دینا یہ بہت بڑا گناہ ہے، ایسے لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہئے، وکالت کا ایسا پیشہ جس میں ظالم کی حمایت مظلوم پر مزید ظلم ڈھایا جائے یہ ملعون پیشہ ہے اس پر اجرت لینا بھی حرام ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الاجارہ میں تفصیل سے بیان کیا، ایسے لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ ان کی چرب زبانی کب تک ان کے کام آئے گی۔

قوله تعالیٰ: ﴿ هَاَنتم هؤلآء جادالتم عنهم في الحيوة الدنيا فمن يجادل الله عنهم يوم القيامة امّن يكون عليهم وكيلا ﴾

(سورة النساء: ١٠٩)

یعنی سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیوی زندگی میں، پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے روز یا کون ہوگا اس کا کارساز۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تو ان کی طرف سے مدافعت کرر ہے ہو ذرا سوچو قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوگی، اس وقت کون کس طرف سے جواب دہی کرے گا، اس لئے جھوٹے دعویٰ کرنے والے اور جھوٹے مقدمے کی پیروی کرنے والے دونوں کو اپنا انجام سوچنا چاہئے۔

سمع رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ذات يوم ، ارتفاع أصوات متخاصمين جاثا يتحاكمان عنده في ارض وقد ارتفعت اصواتهما امام احد حجرات بيوت ازواج النبي صلى اللّٰه عليه وسلم ، فخرج النبي عليه الصلاة والسلام ، وقد اجتمع بعض الناس حولهما ، فقال صلى اللّٰه عليه وسلم : ايها الناس أنما انابشر، وانكم تختصمون الى أن تتحاكموا عندى ، ولعل بعضكم أن يكون ألحن بحجته من بعض أى اقوى فى الحجة من الاخر،فاقضى له على نحومما اسمع ، فمن قضيت له من اخيه شيئاً فلايأخذ ه ، فانما هى قطعه من النار، اقطعها له، فمن شاء فليأخذ ومن شاء فليدع .

(اخرجه البخارى فى المظالم : ٦٨/٢ ، ومسلم : ١٧١٣)

وفى تتمه الخبرأن كلا من المتخاصمين بكىٰ وقال كل واحد منهما : جعلت حقى من الارض لاخى فامرهما صلى اللّٰه عليه وسلم أن يقتسماالارض بينهما ويضرباعليها قرعة ويتسامحا .

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ایک دن کچھ آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنیں آپ ﷺ نے توجہ فرمائی تو فیصلہ کے لئے آنے والے دو افراد تھے بعض ازواج مطہرات کے حجرہ کے سامنے بلند آواز سے باتیں کرر ہے تھے، آپ علیہ السلام حجرہ مبارک سے نکل کر ان کے پاس تشریف لائے اور کچھ دوسرے لوگ بھی جمع ہوئے، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو: میں ایک انسان ہوں، تم میرے پاس فیصلہ کے لئے مقدمہ لے کر آتے ہو، یہ بہت ممکن ہے تم میں بعض دوسرے

کے مقابلہ میں چرب زبان ہوں اپنی بات کو زیادہ اچھے انداز میں پیش کریں اور مقدمہ جیت لیں حالانکہ وہ ناحق پر ہے اب میں نے دلائل کی بنیاد پر جس کے حق میں فیصلہ کردیا اور اس کو باطل طور پر زمین کا کچھ حصہ مل گیا تو وہ سمجھ لے کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے جو میں نے اسکو دیدیا، لہٰذا جو چاہے آگ پر صبر کرے جو چاہے چھوڑ دے۔ (بخاری)

آگے روایت میں ہے دونوں صحابہ یہ تقریر سن کر بہت روئے اور ہر ایک نے کہا کہ یہ زمین دوسرے کی ہے مجھے نہیں چاہئے اسی کو دیدی جائے تو پھر آپ ﷺ نے فرمایا ایسا کرلو کہ آپس میں برابر تقسیم کرلو۔

وقوله تعالىٰ : ﴿ واتقوا يوماً ترجعون فيه الى الله ثم توفى كل نفس ما كسبت وهم لا يظلمون ﴾ (سورة البقرة : ٢٨١)

یعنی اس دن کے عذاب سے ڈرو جس دن تم اللہ کے پاس حاضر کئے جاؤ گے، پھر ہر نفس کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا، ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔

دنیا میں جیسے اعمال ہوں گے اسی کے مطابق جزا و سزا ہوگی اس لئے دنیا میں کسی پر ظلم کرتے وقت یا کسی ظلم کی حمایت کرتے وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری کو ضرور یاد رکھنا چاہئے، جس دل میں خوف خدا ہوگا وہ کبھی گناہ سے لذت نہیں حاصل کرسکتا۔

(رزقنا الله التقوىٰ)

وکیل کے ضامن ہونے کا حکم:

جب بیع و شراء وغیرہ عقود و معاملات کے لئے کسی کو وکیل مقرر کیا جائے اور شرائط وکالت پوری ہونے کے ساتھ عقد وکالت مکمل ہوجائے گا، اب وکیل کے ہاتھ میں مؤکل کا جو مال آئے گا وہ امانت کا مال ہوگا، لہٰذا اگر وہ مال وکیل کی تعدی یا کسی سستی و غفلت کے بغیر ہلاک ہوجائے تو وکیل کے ذمہ اس کا ضمان لازم نہ ہوگا ہاں البتہ اگر وکیل کی تعدی سے یا حفاظت میں غفلت سے ہلاک ہوجائے تو ضمان لازم ہوگا، تعدی کی صورتوں میں سے یہ بھی ہے کہ سامان فروخت کرنے کے بعد قیمت وصول کرنے سے پہلے مال اس کے حوالہ کردے بعد میں قیمت وصول نہ ہوسکے یا مؤکل کے لئے جو مال خریدا اس کو خود ہی استعمال کرنا شروع کردے یا یہ کہ غیر محفوظ جگہ پر چھوڑ دے وغیرہ۔ واللہ اعلم

وکالت ختم ہونے کی صورتیں:

(۱) اگر وکیل یا مؤکل میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے تو وکالت کا معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

(۲) یا مؤکل نے وکیل کو وکالت سے معزول کر دیا۔

(۳) یا وکیل نے خود اپنے کو معزول کر لیا یعنی مؤکل سے کہہ دیا کہ میں آئندہ آپ کی طرف سے وکالت نہیں کر سکتا۔

(٤) یا مؤکل نے جس کام کے لئے وکیل کیا تھا پھر وہ کام کو خود ہی انجام دیدے۔

(٥) یا جس مال کو فروخت کرنے کے لئے وکیل مقرر کیا تھا وہ مال ہی ہلاک ہو گیا یا مکان تھا منہدم ہو گیا وغیرہ۔

(٦) یا مؤکل خود مفلس ہو گیا، ان تمام صورتوں میں وکالت ختم ہو جائے گی اس کے بعد وکیل کا تصرف نافذ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

کفالت کے احکام

لغوی معنی:

الضم ، كقوله تعالىٰ : ﴿ و كفلها زكريا ﴾

یعنی مریم کی حفاظت کو اپنے ذمہ لازم کر لیا۔

و قوله عليه السلام : "انا و كافل اليتيم كهاتين في الجنة . "

(اخرجه البخارى و مسلم)

یعنی ارشاد فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی یتیم کی پرورش کو اپنے ذمہ لازم کرے جنت میں قریب قریب ہوں گے۔

شرعی معنی:

ضم ذمة الكفيل ، الى ذمة الاصيل في المطالبة لا في الدين .

یعنی اصطلاح شرع میں کفالت کا معنی یہ ہے کہ کفیل اپنے ذمہ کو اصیل کے ذمہ کے ساتھ دین کے مطالبہ میں ملاتا ہے، نہ کہ دین کی ادئیگی میں۔

کفالہ کی خاص اصطلاحیں:

کفیل: دوسرے کی طرف ذمہ داری اٹھانے والا۔

مکفول عنہ: وہ شخص جس کی طرف سے کفیل ذمہ دار بنا۔

مکفول لہ: وہ حقدار جس کے حق کی وصولی کے لئے کفیل ضامن بنا۔

مکفول بہ: وہ مال جس کا کفیل ذمہ دار بنا۔

کفالہ کی مشروعیت:

کفالت یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے کہ بلا کسی معاوضہ کے دوسرے کی طرف اس کے مال وحقوق کی ادائیگی کا ذمہ دار بننا۔

لیکن لوگوں کی حاجات اور ضرورتوں کے پیش نظر شریعت مطہرہ نے اس کی اجازت دی ہے۔

كما فى قوله تعالى : ﴿ ولمن جاء به حمل بعير وانابه زعيم ﴾

(يوسف : ٧٢)

یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ جب پیالہ گم ہوگیا تو تلاش کرتے وقت انعام کا اعلان ہوا حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے، کہ جو پیالہ لا کر دے گا اس کو انعام میں ایک اونٹ کا بوجھ غلہ دیا جائے گا، میں اس کا ضامن ہوں۔

وكما روى : أن النبى صلى الله عليه وسلم أتى بجنازة رجل ليصلى عليه : فقال هل ترك شيئاً ؟ قالوا لا، قال هل عليه دين ؟قالوا نعم،ديناران، فقال صلوا على صاحبكم ، قال ابو قتادة : هما على يا رسول الله اى انا ضامن لوفاء دينه ، فصلى عليه النبى صلى الله عليه وسلم . (اخرجه البخارى فى كتاب الكفالة)

یعنی ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ میں حاضر ہوئے نماز پڑھانے سے پہلے آپ نے پوچھا کہ میت نے دین کی ادائیگی کے لئے کچھ مال چھوڑا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں دو دینار ان کے ذمہ لازم ہے،تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، پھر آپ لوگ خود اس میت پر نماز پڑھ لیں، (یعنی جنازہ کی نماز نہیں پڑھاؤں گا) چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے ان دونوں کی ادائیگی کو اپنے ذمہ لازم لیا اس کے بعد آپ ﷺ نے جنازہ پڑھایا۔

فلما فتح اللّٰہ علیہ الفتوح ، ای فتحت علیہ البلاد قال صلی اللّٰہ علیہ وسلم ، انا اولی بالمؤمنین من انفسھم ، فمن ترك دینا فعلی قضاءہ ومن ترك مالا فلورثتہ .

(اخرجہ البخاری ایضا فی الکفالة : ٢ / ٤٠ / باب الدین)

یعنی جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں مؤمنین کا ان کی جان سے زیادہ قریب ہوں لہٰذا آئندہ کوئی شخص مقروض ہونے کی حالت میں انتقال کر جائے تو اس کے قرض کی ادئیگی میرے ذمہ ہے۔

کفالہ کی اقسام:

کفالہ کی دو قسمیں:

(١) کفالہ بالنفس

(٢) کفالہ بالمال

(١) کفالہ بالنفس کے معنی یہی ہیں کہ کوئی شخص اس بات کی ضمانت لے کر میں مکفول کو مکفول لہ کے پاس یا حاکم کے پاس حاضر کردوں گا جس کو آج کے دور میں شخصی ضمانت کہا جاتا ہے، اب ضمانت کے بعد اگر وقت مقررہ پر حاضر نہ کرے تو اسی ضامن کو قید کیا جائے گا، تا کہ اس کو حاضر کردے، البتہ کفیل بالنفس سے وہ حق وصول نہیں کیا جائے جو مکفول کے ذمہ واجب ہوا الا یہ کہ کفیل مال کا بھی ضامن ہے۔

(٢) اور کفالہ بالمال میں اگر مکفول عنہ مال ادا نہ کرے تو کفیل کے ذمہ مال کی ادائیگی لازم ہوگی، بشرطیکہ دین صحیح ہو اور دین کی مقدار معلوم ہو یا کفالہ بالعین یعنی کسی متعین چیز کی کفالت اٹھائی مثلاً مبیع کے بارے میں کہا کہ اگر بائع نے ادا نہ کیا تو میرے ذمہ ہے یا مال مغصوب غاصب نے فلاں وقت تک واپس نہ کیا تو میں ذمہ دار ہوں۔

کفالہ کے مسائل:

(1) کفالہ مکفول لہ کی اجازت اور رضاء کے بغیر درست نہیں کیوں کہ یہ اس کا حق ہے، اسی طرح دوسرے عقود کی طرح کفالہ میں بھی ایجاب وقبول ضروری ہے۔

(2) کفالہ کو کسی مناسب شرط کے ساتھ معلق کرنا جائز ہے، مثلاً اگر آپ نے فلاں

سے سودا کرلیا اور وہ ادا نہ کرے تو مبیع حوالہ کرنا میری ذمہ داری ہوگی یا اس کا غصب ثابت ہو جائے تو مال آپ کے حوالہ کرنا میرے ذمہ ہے۔

(3) کفالہ ثابت ہونے کے بعد مکفول لہ کو اختیار ہوگا چاہے تو اصل مدیون سے اپنے حق کا مطالبہ کرے یا کفیل سے مطالبہ کرے الا یہ کہ اصیل نے شرط لگائی تھی کہ آج سے میں بری ہوں کفیل ہی اصل ذمہ دار ہے اس صورت میں یہ کفالہ حوالہ بن جائے گا اور اصیل بری ہوگا لیکن اگر کسی وجہ سے کفیل سے مال وصول نہ ہو سکے تو اصیل کے ذمہ پھر لوٹ آئے گا۔

(4) کفالۃ بالنفس میں مکفول بہ مر جائے تو کفیل بالنفس بری ہو جائے گا جبکہ کفالت بالمال میں مکفول عنہ کی موت سے کفیل بری نہ ہوگا۔

(5) مکفول لہ کو حق حاصل ہے کہ عقد کفالہ فسخ کردے اگرچہ اس پر مکفول عنہ اور کفیل راضی نہ ہو لیکن کفیل یا اصیل کو مکفول لہ کی رضامندی کے بغیر عقد کفالہ فسخ کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔

(6) کفیل کو حق نہیں کہ قرض ادا کرنے سے پہلے مکفول عنہ سے مال کا مطالبہ کرے، اگر حقدار مقروض کو معاف کردے یا حق اس سے وصول کرلے تو کفیل بھی بری ہو جائے گا، اگر حقدار کفیل کو بری کردے تو مقروض بری نہ ہوگا، اس کے ذمہ قرض برقرار رہے گا۔

(7) نفس حدود و قصاص کے لئے کفیل بننا جائز نہیں کیوں کہ حدود و قصاص میں نیابت نہیں چل سکتی، البتہ مکفول کو حاضر کرنے کی کفالت درست ہے۔

(8) جو قرض مؤجل ہو اس کا حالاً کفیل بننا اسی طرح جو قرض حالی ہو اس کا مؤجلاً کفیل بننا دونوں جائز ہیں۔

کفالہ کا ایک عجیب واقعہ:

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک عجیب واقعہ نقل فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ''بنی اسرائیل میں ایک شخص دوسرے کے پاس قرض مانگنے کے لئے گیا، مالدار شخص نے کہا کہ گواہ لاؤ تا کہ میں ان کے سامنے قرض دوں، تا کہ وہ گواہ رہے، اس شخص نے کہا کہ گواہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات کافی ہے، پھر مالدار نے کہا کہ کوئی ضامن لاؤ (تا کہ وہ تمہارا ضامن بنے) اس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے

ضامن بننے کے لئے کافی ہے، تو مالدار نے کہا تو نے سچ کہا ہے، اس کے بعد ایک ہزار دینار دیئے ایک متعین مدت کے لئے، جب وہ مدت پوری ہوگئی مقروض شخص ایک ہزار دینار لے کر روانہ ہوا، (اس کے اور مالدار کے گاؤں کے درمیان دریا حائل تھا) اور کشتی کے انتظار میں دریا کے کنارہ کھڑا رہا لیکن کوئی کشتی نہ مل سکی، دن پورا ہو رہا تھا، اس لئے اس نے یہ ترکیب کی کہ ایک لکڑی لی اس میں سوراخ کر کے ہزار دینار بھر دیئے پھر اس کو اچھی طرح بند کر دیا ایک پرچی بھی اس میں رکھ دی اس کے بعد دریا کے کنارے کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ میں نے آپ کو اپنے معاملہ کا گواہ اور ضامن بنایا تھا اب میں نے قرض ادا کرنے کے لئے مقدور بھر کوشش کی لیکن میری قدرت میں نہیں ہے اب یہ دینار تیرے پاس امانت ہیں، یوں کہہ کر سمندر میں پھینکا وہ سمندر کے تہہ میں چلا گیا، پھر سواری تلاش کرتا رہا، دوسری طرف مالدار شخص بھی دریا کے کنارہ میں کھڑے انتظار کر رہا تھا کہ مقروض شخص آج میرا مال لے کر آئے گا لیکن کوئی کشتی نظر نہیں آئی اتنے میں دیکھا کہ ایک لکڑی بہہ رہی ہے جلانے کی نیت سے اس کو اٹھایا اور گھر لے جا کر اس کو چیرا تو اس میں سے دینار اور پرچی ملی، اگلے دن وہ مقروض شخص بھی پہنچ گیا اور اس سے معذرت کی کہ وقت مقررہ پر میں آپ کا قرض سواری نہ ملنے کی مجبوری سے ادا نہ کر سکا اور واقعہ سنایا، تو مالدار شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی امانت میرے پاس پہنچا دی ہے، پھر ہزار دینار اسی کو دوبارہ ہدیہ کر دیا اور کہا کہ اللہ آپ کا بھلا کرے یہ ہزار دینار لے کر گھر جائیں۔

(بخاری شریف باب الكفالة في القرض : ۳۹/۲)

یہ ہے اخلاص وفاداری، امانت داری، اللہ تعالیٰ پر توکل واعتماد کی برکت، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق دے۔ آمین

احکام حوالہ

حوالہ کے احکام:

حوالہ لغت میں نقل وتحویل کو کہا جاتا ہے۔

"يقال تحول حاله من الفقر الى الغناء ."

یعنی اس کی حالت فقر سے مالداری کی طرف منتقل ہوگئی ہے۔

اصطلاحی معنی:

"نقل الدین من ذمة الی ذمة شخص آخر ."

یعنی اصطلاح فقہاء میں حوالہ کہا جاتا ہے قرض کو ایک شخص کی ذمہ سے دوسرے کی ذمہ داری کی طرف پھیر دینا۔

حوالہ کی اصطلاحات:

محیل: مدیون جو اپنے ذمہ واجب الاداء قرض کو دوسرے کے حوالہ کر رہا ہے۔

محال علیہ: جو دوسرے شخص کے قرض کی ادائیگی کو اپنے ذمہ میں قبول کر رہا ہے، دائن (محتال لہ) وہ قرض خواہ جس کا قرض محیل کے ذمہ لازم ہے۔

حوالہ کی مشروعیت:

حوالہ کی مشروعیت حدیث واجماع سے ثابت ہے۔

عن ابی هريرة رضی الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال "مطل الغنی ظلم واذا اتبع احدكم على ملئ فليتبع ."

(اخرجه البخاری فی كتاب الحوالة : ٢/٣٧ ، ومسلم : رقم ١٥٦٤)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مالدار کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول سے کام لینا ظلم ہے۔

جب تم میں سے کسی کو (قرض کے مطالبہ میں) مالدار کے حوالے کیا جائے تو اسی کا پیچھا کرے، یعنی محتال علیہ (مالدار) سے مطالبہ کرے، (بخاری ومسلم)

وقال فی اللباب : الحوالة جائزة بالديون ديون الاعيان وتصح برضاء المحيل وهو المديون ، والمحتال وهو الدائن، لان فيه انتقال حقه الى ذمه اخرى ، والذمم متفاوتة والمحال عليه وهو يقبل الحوالة، لان فيها الزام الدين ولا الزام بلا التزام .

(اللباب فی شرح كتاب القدوری : ٢/١١٠)

حوالہ کے احکام:

(۱) دائن، مدیون محتال علیہ، کی رضامندی سے عقد حوالہ مکمل ہونے کے بعد مدیون

کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

(۲) اس کے بعد دائن کو حق ہوگا کہ اپنے قرض کا محتال علیہ سے مطالبہ کرے۔

(۳) اگر قرض کی ادائیگی سے پہلے محتال علیہ انتقال کر جائے یا غریب ہو جائے یا قرض ادا کرنے سے انکار کر دے، تو دائن کو حق ہوگا کہ دوبارہ مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کرے، کیوں کہ مدیون سے مطالبہ کا حق اس وقت ساقط ہوتا ہے جب اسکا قرض محتال علیہ سے وصول ہو، وصول نہ ہونے کی صورت میں اس کا حق باقی رہے گا۔ (ملتقی الابحر : ۲/ ۲٦٦)

(٤) اگر محتال علیہ قرض ادا کر دے تو اب اس کو مدیون سے وصول کرنے کا حق حاصل ہوگا، دو شرطوں کیساتھ، ا۔ اس نے مدیون کے حکم سے ذمہ داری اٹھائی ہو، ۲۔ اس کے ذمہ مدیون کا کوئی قرض نہ ہو، اگر قرض ہو تو مطالبہ کا حق نہ ہوگا، کیوں کہ اس نے اپنا حق تو پہلے وصول کر لیا۔

"احکام الجعالۃ" یعنی انعامات کے احکام:

کسی کام کے انجام دینے والے کے لئے انعام مقرر کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے، مثلاً جو امتحان میں اول آئے گا اس کے لئے اتنا انعام ہوگا یا کسی کی کوئی چیز گم ہوگئی اس کے لئے اعلان کرے جو تلاش کر کے لا کر دے گا اس کو اتنا انعام دیا جائے گا یا گھوڑ دوڑ یا کشتی وغیرہ میں انعام کا اعلان کیا جائے اس طرح کا انعام مقرر کرنا بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔

ہم گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ نقل کرتے ہیں جس کے ضمن میں انعام مقرر کرنے کے جواز کی تفصیل شرائط وغیرہ تمام باتیں واضح ہو جائیں گی۔

گھوڑ دوڑ کے شرعی احکام:

آج کل مسلمانوں کی معاشرت، معاملات، اخلاق اسلام سے جس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں وہ کسی پر مخفی نہیں، سود، قمار، رشوت، جو قرآن وحدیث کی بے شمار تصریحات سے باجماع امت حرام ہیں، آج مسلمانوں کا کوئی بازار، کوئی سوسائٹی، کوئی گھر ان سے خالی نہ رہا، الا ماشاء اللہ۔

ان بلاؤں کا شکار ایک تو وہ طبقہ ہے جس کو حلال وحرام اور شریعت کی موافقت ومخالفت کی طرف کوئی التفات ہی نہیں ان کے سامنے تو ان کے احکام پیش کرنا ایک درجہ میں بے سود ہے، لیکن ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو کچھ نہ کچھ اس کی فکر رکھتا ہے، مگر ناواقفیت یا غفلت کی وجہ سے ان میں مبتلا ہے، ایسے لوگوں کے لئے ضرورت ہے کہ ان کو صحیح احکام سے آگاہ کیا جائے، انہیں مسائل میں

سے آج کل ایک مسئلہ ریس (گھوڑ دوڑ) کا ہے جس میں ابتلا عام ہے شریعت اسلام کے عادلانہ اور معتدلانہ نظام میں نہ ہر کھیل سے مطلقا روکا گیا ہے اور نہ اس کو غیر محدود وسعت دی گئی ہے، بلکہ جن کھیلوں کے ذریعہ قوت جہاد اور قوت جسمانی پیدا ہوتی ہے ان کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دیا گیا۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے عمل سے اس کے استحسان کو ثابت فرمایا آپ ﷺ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی، پیادہ دوڑ پر انعام دیا، تیر اندازی اور پیراکی سیکھنے کی ہدایت فرمائی، حبشیوں کی نیزہ بازی کی مشق کا خود کھڑے ہو کر معائنہ فرمایا اور عائشہ صدیقہؓ کو دکھلایا وغیرہ، اس کے مقابل ایسے کھیل جن میں کوئی دنیاوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی یا اجتماعی مضرتیں ہیں ان کو سختی سے منع فرمایا انہیں مضر صورتوں میں وہ کھیل ہیں جن میں قمار (جوا) ہو۔

گھوڑ دوڑ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا ایک مفید کھیل ہے اور رسول اللہ ﷺ نے قولاً وعملاً اس کی اجازت دی ہے اور اس میں بازی لگانے اور بازی لے جانے والے کے لئے مشروط انعام ومعاوضہ کی بھی خاص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج کل گھر کے جواہرات چھوڑ کر دوسروں کے دروازوں پر دریوزہ گری کو مایہ ناز سمجھنے لگے، یہاں تک کہ عام کھیلوں میں بھی غیروں کی نقالی ہی رہ گئی اس نقالی میں کوئی دوسری مضرت نہ ہوتی جب بھی ایک غیرت مند قوم کے لئے نازیبا تھی خصوصاً جب کہ غیر مسلموں نے قمار جیسی حرام چیزوں کو ان میں شامل کر دیا تو مسلمان پر لازم ہو گیا کہ ان سے یکسر اجتناب کرے۔

ہماری گھوڑ دوڑ بھی اسی مشق ستم کا نشانہ بن گئی جو چیز اسباب جہاد میں داخل اور ذریعۂ عبادت تھی وہ اب محض ایک قمار اور لہو ولعب بن کر رہ گئی اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے محترم عزت مآب الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل پاکستان کو کہ اُنہوں نے گھوڑ دوڑ کے متعلق علماء سے استفسار کرنے کی ضرورت محسوس فرما کر بعض علماء سے فتویٰ حاصل فرمایا پھر علماء پاکستان سے استفسار کیا کہ اس سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک مفید مجموعہ ہو گیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ عام فائدہ کیلئے اس کو بصورت رسالہ شائع کر دیا جائے جس میں گھوڑ دوڑ کی جائز اور ناجائز قسمیں اور جائز قسم کیلئے ضروری شرائط کی تفصیل درج ہے۔ واللہ الموافق والمعین

بہت سے کام ایسے ہیں کہ ان کی صورت کھیل تماشہ ہے مگر ان کے ذریعہ قوتِ جہاد، صحت جسمانی وغیرہ کے اہم فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں ایسے کھیلوں کو شریعت اسلام نے نہ صرف جائز

بلکہ خاص شرائط کے ساتھ ایک درجہ مستحسن سمجھا ہے اور ان میں بازی لگانے اور مسابقت کرنے کی بھی اجازت دی ہے بشرطیکہ اس میں قمار کی صورت نہ ہو، جس طرح ایسے کھیلوں سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے جن میں قمار بازی ہو یا جن کے سبب میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی یا اجتماعی مضرتیں ہیں۔

گھوڑ دوڑ:

حدیث میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑ دوڑ کرائی (جصاص: ۱/۸۸) اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

"لاسبق الا فی خُفّ او حافر او نصل."

(جامع الصغیر، مسند احمد عن ابی هريرة رضي الله عنه)

حدیث میں لفظ سبق وارد ہوا ہے، جس کے معنی اس معاوضہ یا انعام کے ہیں جو کسی بازی میں آگے بڑھنے والے کو دیا جاتا ہے (صرح بہ فی شرح الجامع الصغیر) اس لئے معنی حدیث کے یہ ہیں کہ کسی مسابقت بازی میں معاوضہ یا انعام مقرر کرنا جائز نہیں بجز اونٹوں کی دوڑ یا گھوڑ دوڑ یا تیر اندازی (نشانہ بازی) کی احادیث مذکورہ سے معلوم ہوا کہ خاص صورتوں میں بازی و مسابقت اور اس پر معاوضہ یا انعام مقرر کرنا صرف مذکورہ تین چیزوں میں جائز ہے اور بعض حضرات فقہاء نے پیادہ دوڑ میں بازی لگانے کو بھی مذکورہ تین قسموں میں شامل کر کے چار قسمیں کر دی ہیں، کیوں کہ پیادہ دوڑ بھی قوتِ جہاد کے اسباب میں سے ہے اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ایک حدیث اس کی مؤید ہے۔ (شامی: ۵/۳۵۵، کتاب الکراهية)

پھر گھوڑ دوڑ وغیرہ میں بازی اور اس پر معاوضہ یا انعام کی چند صورتیں ہیں جن میں حسب تشریح قرآن و حدیث بعض جائز ہیں بعض ناجائز ہیں۔

گھوڑ دوڑ کی جائز صورتیں:

مندرجہ ذیل تمام صورتوں میں جواز کے لئے دو صورتیں لازمی ہیں اول یہ کہ اس کا مقصد محض کھیل تماشہ نہ ہو بلکہ قوتِ جہاد یا ورزش جسمانی ہو، دوسرے یہ کہ جو انعام مقرر کیا جائے وہ معلوم متعین ہو، مجہول یا غیر معین نہ ہو۔ (شامی وغیرہ)

(1) مشروط معاوضہ گھوڑ دوڑ کی جائز صورت ایک یہ ہے کہ فریقین جو اپنے اپنے

گھوڑے دوڑا کر بازی لگا رہے ہیں آپس میں کسی کو کسی سے کچھ لینا دینا نہ ہو، بلکہ حکومت وقت یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطور انعام کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لئے مقرر ہو، بدائع الصنائع میں ہے:

كذلك مايفعله السلاطين وهو ان يقول السلطان لرجلين من سبق كما فله كذا فهو جائز لما بيّنا ان ذلك من باب التحريض على استعداد اسباب الجهاد خصوصا من السلطان.

(بدائع : ٦/ ٢٠٦ وشامی : ٥/ ٣٥٤)

(2) دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کیلئے معاوضہ یا انعام فریقین ہی میں سے ہومگر صرف ایک طرف سے ہو دو طرفہ شرط نہ ہو، مثلاً زید وعمر گھوڑوں کی دوڑ میں بازی لگا رہے ہیں، زید یہ کہے کہ اگر عمر آگے بڑھ گیا تو میں اس کو ایک ہزار انعام دوں گا، دوسری طرف سے یہ نہ ہو کہ اگر زید بڑھ گیا تو عمر ایک ہزار دے گا دو طرفہ شرط کی صورت قمار حرام ہے۔

(3) فریقین میں دو طرفہ شرط بھی حنفیہ کے نزدیک ایک خاص صورت میں جائز ہے وہ یہ کہ فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار مثلاً خالد کو اپنے ساتھ شریک کرلیں پھر اس کی دو صورتیں ہیں:

(الف) شرط کی صورت یہ ٹھہرے کہ زید آگے بڑھے تو عمر ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور عمر آگے بڑھے تو زید اتنی ہی رقم اس کو ادا کرے اور اگر خالد بڑھ جائے تو اس کو کچھ دینا کسی کے ذمہ نہیں۔

(ب) شرط اس طرح ہو کہ خالد آگے بڑھ جائے تو زید وعمر دونوں اس کو ایک ایک ہزار روپیہ دیں اور زید وعمر دونوں یا ان میں سے کوئی ایک آگے بڑھے تو خالد کے ذمہ کچھ نہیں، لیکن زید وعمر میں باہم جو آگے بڑھے دوسرے پر اس کو ایک ہزار ادا کرنا لازم آئے گا۔

ان دونوں صورتوں میں جو تیسرا آدمی شریک کیا گیا ہے اس کو حدیث کی اصطلاح میں مُحَلِّل کہا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ امر مشترک ہے کہ تیسرے آدمی کا معاملہ نفع وضرر میں دائر نہیں بلکہ ایک صورت میں اسکا نفع متعین ہے، دوسری میں اس کا کچھ نقصان نہیں۔

شرط اس تیسری صورت کے لئے حسب تصریح حدیث یہ ضروری شرط ہے کہ یہ تیسرا گھوڑا

زید وعمر کے گھوڑوں کیساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہو جس کی وجہ سے اس کے آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کے دونوں احتمال مساوی ہوں، ایسا نہ ہو کہ کمزوری یا عیب کی وجہ سے اس کا پیچھے رہنا عادۃً یقینی ہو یا زیادہ قوی اور چالاک ہونے کی وجہ سے اس کا آگے بڑھ جانا یقینی ہو، حدیث میں ہے:

من ادخل فرسا بین فرسین وھو لا یأمن ان یسبق فلابأس بہ ومن ادخل فرسا بین فرسین وھو آمن ان یسبق فھو قمار۔

(ابو داؤد ومسند احمد)

بدائع الصنائع میں شرائط جواز بیان کرتے ہوئے مذکور الصدر پوری تفصیل لکھی ہے۔

(بدائع الصنائع : ٢٠٦/٦ نیز عالمگیری کتاب الحظر والاباحة باب ٦، شامی : ٢٥٤/٥)

میں بھی یہ تفصیل موجود ہے۔

گھوڑ دوڑ کی ناجائز صورتیں:

(1) گھوڑ دوڑ کی بازی محض کھیل تماشہ یا روپیہ کی طمع کے لئے ہو اور استعداد قوتِ جہاد کی نیت نہ ہو۔ شامی

(2) معاوضہ یا انعام کی شرط فریقین میں دوطرفہ ہو اور کسی تیسرے کو اپنے ساتھ بتفصیل مذکورہ بالا نہ ملایا جائے تو یہ قمار اور حرام ہے۔ (بدائع، شامی، عالمگیری)

(3) ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی طرف سے ہوتی ہے گھوڑے کمپنی کی ملک اور سوار اس کمپنی کے ملازم اور دوسرے لوگ گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگاتے ہیں جس کی فیس ان کو داخل کرنا ہوتی ہے جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اُس نمبر پر داؤ لگانے والے کو انعامی رقم مل جاتی ہے، باقی سب لوگوں کی فیس ضبط ہو جاتی ہے۔

یہ صورت مطلقاً حرام ہے، اول تو اس ریس کو قوتِ جہاد پیدا کرنے سے کوئی واسطہ نہیں، کیوں کہ بازی لگانے والے نہ گھوڑے رکھتے ہیں نہ سواری کی مشق سے ان کو کچھ کام ہے، ثانیاً جو صورت معاوضہ کی رکھی گئی ہے کہ ایک شق میں داؤ لگانے والے کو انعامی رقم ملتی ہے اور دوسری شق میں اس کو اپنی دی ہوئی فیس سے دست بردار ہونا پڑتا ہے یہ عین قمار ہے جو بنص قرآن حرام ہے۔

مروجہ ریس کی جو صورت معلوم ومعروف تھی اس کا حکم لکھا گیا ہے اگر اس میں کچھ مزید تفصیلات ہوں تو وہ تفصیلات لکھ کر ان کے متعلق دوبارہ سوال کیا جا سکتا ہے۔

تنبیہ:

جو احکام اور جائز و ناجائز کی تفصیل گھوڑوں کی دوڑ میں لکھی گئی ہے یہی حکم اونٹوں کی دوڑ اور پیادہ دوڑ اور نشانہ بازی لگانے کا ہے۔ (کما مرّ من الحدیث)

دوسرے کھیلوں میں بازی لگانے کے احکام:

مذکور الصدر اقسام چہار گانہ یعنی گھوڑ دوڑ، اونٹوں کی دوڑ، پیادہ دوڑ، نشانہ بازی کے علاوہ دوسرے کھیلوں میں کچھ تفصیل ہے۔

مُفید کھیل:

جن کھیلوں سے کچھ دینی یا دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ جائز ہیں بشرطیکہ اُنہیں فوائد کی نیت سے ان کو کھیلا جائے، محض لہو ولعب کی نیت نہ ہو، لیکن اس کی بازی پر کوئی معاوضہ یا انعام مشروط مقرر کرنا جائز نہیں۔

مثلاً گیند کا کھیل اس سے جسمانی ورزش ہوتی ہے یا لاٹھی وغیرہ کے کھیل یا پہلوانوں کی کشتی وغیرہ جو قوتِ جہاد میں معین ہو سکتے ہیں، اسی طرح معمہ بازی، شعر بازی، تعلیمی تاش، وغیرہ ہار جیت کی بازی لگانا جائز ہے مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ کی مقرر کرنا جائز نہیں، بلکہ حرام ہے۔

ولا يجوز الاستباق في غير هذه الاربعة كالبغل بالجعل واما بلا جعل فيجوز في كل شئي وقال بعد ذلك لان جواز الجعل فيما مر انما ثبت بالحديث على خلاف القياس فيجوز ما عداها بدون الجعل وفي القهستاني من الملتقط من لعب بالصولجان يريد الفروسية يجوز وعن الجواهر قد جاء الاثر في رخصة المصارعة لتحصيل القدرة على المقاتلة دون التلهي فانه مكروه .

(شامی : ۳۵۵/۵)

بے فائدہ کھیل تماشے:

ایسے کھیل تماشے جن کے تحت کوئی معتد بہا فائدہ دین و دنیا کا نہیں ہے وہ سب ممنوع اور ناجائز ہیں خواہ ان پر بازی لگائی جائے یا انفرادی طور پر کھیلا جائے پھر بازی پر کوئی رقم لگائی جائے یا نہیں، اور رقم بھی دوطرفہ ہو یا ایک طرفہ بہرحال ایسے لغو کھیل شرعاً مطلقاً ناجائز ہیں،

حدیث میں ہے:

"کل لهو المسلم حرام الاثلاثة ملاعبة اهله و تاديبه لفرسه ومناضلة بقرسه." (شامی: ۲۵۳/۵)

کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، چوسر، شطرنج، تاش، کتوں کی ریس وغیرہ سب اسی ناجائز صورت کے افراد ہیں۔ (ماخوذ از جواهر الفقه: ۳۵۲/۲)

ان کھیلوں کے احکام کی مزید تفصیلات جلد اول میں گذر چکی ہے۔

احكام الهبة

"ہبہ لغت میں بلاعوض عطیہ واحسان کو کہا جاتا ہے۔"

کمافی قوله تعالیٰ: ﴿ يهب لمن يشاء اناثا و يهب لمن يشاء الذكور ﴾ (شوریٰ: ۴۹)

شرعاً: تمليك عين بلاعوض، على وجه الاخوة والمحبة، كما قال صلى الله عليه وسلم، تهادوا تحابوا. (بخاری ادب المفرد)

شرعاً ہبہ کہا جاتا ہے کسی چیز کو بلا عوض محض اخوت ومحبت کی بنیاد پر دوسرے کو مالک بنانا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک دوسرے کو ہدیہ دو اس اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی۔

آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور بدلہ بھی عطا فرماتے تھے۔

وقال صلى الله عليه وسلم: "لو اهدى الى كراع قدم شاة لقبلت ولو دعيت عليه لاجبت."

(اخرجه احمد، ترمذی، بخاری: ۸۷/۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مجھے بکری کی ایک ٹانگ بھی ہدیہ کیجائے تو میں اس کو قبول کروں گا، اگر اس کی دعوت کی جائے تو اس کے لئے حاضر ہوں گا۔

ہبہ کی مشروعیت کی حکمت:

شریعت مطہرہ نے ہدیہ دینے کو مشروع فرمایا اس کی ترغیب دی کیوں کہ اس میں ایک مسلمان بھائی کی دلجوئی ہے اور محبت کے تعلق کو جوڑتا ہے، ہدیہ دلوں سے عداوت ونفرت کا خاتمہ کرتا ہے،

محبت وتعلق کا بیج بوتا ہے،ایک دوسرے کے لئے بھلائی وخیر کی طرف راغب کرتا ہے۔

احسن الی الناس تستعبد قلوبھم
فطالما استعبد الانسان احسان

یعنی لوگوں پر احسان کر، اور ان کے دلوں کو خرید لے
کیوں کہ عام طور پر احسان انسان کو غلام بنا لیتا ہے
یعنی اس کی تابعداری کو خرید لیتا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ ہدیہ کو رد نہیں فرماتے تھے،تا کہ ہدیہ کرنے والے کا دل نہ ٹوٹے،اور ہدیہ لانے والے کو بدلہ میں ہدیہ سے افضل وبہتر چیز عنایت فرماتے،آپ علیہ السلام خواتین کو تعلیم فرماتے:

"یا نساء المسلمات ، لاتحقرن جارۃ لجارتھا ولو فرسن شاۃ ."

(بخاری کتاب الھبۃ : ۲/۸۷)

''اے مسلمان خواتین،کوئی خاتون اپنی پڑوسن کو معمولی چیز ہدیہ کرنے کو حقیر نہ سمجھے،اگر چہ بکری کا ایک کھر ہی ہو'' اسی طرح بخاری شریف میں روایت ہے کہ صحابہ کرام کو آپ ﷺ کا حضرت عائشہؓ سے محبت فرمانا معلوم تھا اس لئے جو کوئی آپ ﷺ کو ہدیہ کرنا چاہتا تو انتظار کرتے یہاں تک کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری ہوتی تو حضرت عائشہؓ کے گھر آپ ﷺ کے لئے ہدیہ بھیجتے،حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے لوگوں کے اس عمل کے متعلق آپ ﷺ سے گفتگو کی ،تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے عائشہ کے بارے میں ایذاء مت پہنچاؤ، کیوں کہ حضرت عائشہؓ کے علاوہ کسی اور بیوی کے بستر پر مجھ پر وحی نہیں اترتی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) میں اس خیال سے توبہ کرتی ہوں۔ (اخرجہ البخاری : ۲/۸۷)

حاصل یہ ہے کہ ہدیہ کا عمل صحابہ میں جاری تھا اور آپ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور استعمال فرماتے،صدقہ اگر کوئی لاتا تو وہ استعمال نہیں فرماتے بلکہ غریب صحابہ کو کھلا دیتے تھے۔

ہبہ کے ارکان اور شرائط:

کسی کو کوئی چیز ہدیہ کرنا شرعاً ایک تبرع محض ہے،اس لئے بیع وشرا کی طرح مستقل ایجاب وقبول کی تو ضرورت نہیں،لیکن ہبہ کیلئے ایسے الفاظ کا ہونا ضروری ہے، جو بلا عوض کسی کو مالک

بنانے پر دلالت کرے، عربی میں الفاظ "وھبت" ہبہ کردیا "نحلت" عطیہ دیا "اعطیت" آپ کو مالک بنا کر دیدیا، جب کسی ایسے لفظ جو مالک بنانے پر دلالت کرے کسی کو مالک بنا دے، تو ہبہ مکمل ہو جائے گا، البتہ ہبہ تام ہونے کے لئے شرعاً ضروری ہے کہ وہ مال ہبہ کرنے والے کا مملوک ہو اور تقسیم شدہ ہو، جدگانہ طور پر ہبہ کر کے، مالک بنا دے، تو موھوب لہ کے قبضہ کرنے سے ہبہ تام ہو جائے گا، گویا کہ واھب کی طرف سے تملیک موھوب لہ کی طرف سے قبضہ ضروری ہوا، اس کے بغیر ہبہ تام نہ ہوگا، اس کو ایجاب وقبول سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اسی طرح واھب عاقل بالغ ہونا، شئی موھوب کا مالک ہونا اور شرعاً تصرفات کے بارے میں اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح موھوب کا قیمت والا مال ہونا ضروری ہے، لہٰذا شراب، مردار، خنزیر، وغیرہ ہبہ کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح شئی موھوب پر قبضہ کرنا ممکن ہونا ضروری ہے، لہٰذا جو دودھ ابھی تک تھن میں ہے یا جو اون جانور کی پشت پر ہے ان کا ہبہ کرنا جائز نہیں، ہاں البتہ ہبہ کے بعد دودھ نکال کر یا اون کاٹ کر کے دیدے تو صحیح ہو جائے گا۔

مرض الموت میں ہبہ کرنے کا حکم:

مرض الموت کی تعریف: کسی انسان کو ایسی بیماری لاحق ہو جائے کہ اس سے موت واقع ہونا یقینی ہو اور اس سے موت واقع ہو جائے تو اس کو مرض الموت کہا جاتا ہے۔

مرض الموت میں مریض اگر کوئی چیز ہبہ کرے، تو یہ ہبہ وصیت کے حکم میں ہوگا، اب اگر موھوب لہ ایسا قریبی رشتہ دار ہے کہ موت کے بعد وارث بنے گا، چوں کہ اس کے حق میں وصیت کرنا شرعاً باطل ہے اس لئے یہ ہبہ باطل ہوگا، اور مال بدستور واھب کی ملک میں برقرار رہے گا۔

لقوله عليه السلام : " ان الله قد اعطىٰ كل ذى حق حقه الا لا وصية لوارث ."

(ترمذى رقم ٢١٢٠، باب ماجاء لا وصية لوارث)

اگر موھوب لہ اجنبی شخص یا رشتہ دار غیر وارث ہو تو یہ ہبہ ترکہ کے تہائی حصہ تک نافذ ہوگا اس سے زائد نہیں الا یہ کہ تمام ورثاء بالغ ہوں اور وہ زائد کی اجازت دیدیں۔

لقوله عليه السلام: " ان الله تصدق عليكم في اخر اعمار كم بثلث اموالكم، تضعونها حيث شئتم."

(ابن ماجه في الوصايا و احمد في المسند : ٦/ ٤٤١)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر انعام فرمایا کہ تہائی مال کی حد تک تمہیں تصرف کرنے کی اجازت یدی جہاں چاہو کار خیر میں خرچ کرو۔

اگر مرض الموت میں ہبہ کرنے کے بعد مریض پھر تندرست ہو گیا، تو اگر موہوب لہ نے مال ہبہ پر قبضہ کر لیا تھا تو ہبہ تام ہو گیا، اس ہبہ کا حکم مرض الموت کے ہبہ کا نہ ہو گا۔

ہبہ مشاع کا حکم:

جو چیز قابل تقسیم ہو (یعنی تقسیم کے بعد بھی ان سے اسی طرح فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے جس طرح سے تقسیم سے پہلے) ان کو اگر غیر منقسم ہبہ کر دیا جائے تو یہ ہبہ فاسد ہے، کیوں کہ اصل مذہب یہی ہے کہ ہبۃ المشاع مفسد ہے، البتہ ایک روایت یہ ہے کہ فسادِ ہبہ اس وقت ہے جب کہ اجنبی کو ہبہ کیا جائے، اور جو شریک جائیداد کا ہو اس کو غیر منقسم ہبہ کرنا بھی صحیح ہے، اور بعض فقہاء نے اس کو مختار بھی کہا ہے۔

قال في الدر وفي الصير فيه عن العتابي، وقيل يجوز شريكه، وهو المختار اهـ. (٤/ ٧٨٠)

مگر یہ قول ظاہر مذہب کے خلاف ہے اس لئے بدون مجبوری اس پر عمل کرنا درست نہیں، اور غالباً آج کل تقسیم جائیداد میں جس قدر خرچ اور پریشانی ہوتی ہے، وہ مجبوری اور دشواری کی حد میں داخل ہے، اس لئے اس صورت میں اگر اس روایت پر عمل کر کے شریک کے لئے ہبہ بدون تقسیم کے صحیح کہا جائے تو گنجائش ہے اور قبضہ کے بعد اس کو مفید ملک کہا جائے گا، لیکن بہتر صورت یہی ہے کہ آئندہ کے لئے یا تو جائیداد تقسیم کر لی جائے یا اس کا بیع نامہ کر لیا جائے اور بیع زبانی بھی کافی ہے، تحریر کی ضرورت نہیں۔ (امداد الاحکام : ٤/ ٣٨)

مطلب یہ ہے کہ شریک کو غیر منقسم چیز ہبہ کرنے کے لئے ایک حیلہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس کو اپنا حصہ فروخت کر دے پھر قیمت اسے ہدیہ کر دے دوسری صورت یہ ہے کہ انتہائی کم قیمت پر فروخت کر دے جس کی ادائیگی موہوب لہ پر دشوار نہ ہو۔

اپنی زندگی میں ورثہ میں مال تقسیم کرنے کا حکم:

اس سلسلہ میں ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے جس کے ضمن میں یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

سوال: میں ایک بیمار عمر رسیدہ شخص ہوں میری کوئی اولاد نہیں، صرف بوڑھی بیوی ہے، جبکہ میرے دو بھتیجے ہیں، میں اپنی زندگی میں اپنا سرمایہ ان میں تقسیم کرنا چاہتا ہوں، تو شریعت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: اگر آپ اپنا سرمایہ اپنی زندگی میں ہی ان میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو شرعاً آپ کو اختیار ہے کہ جس وارث کو جتنا چاہیں دیدیں، لیکن بہتر طریقہ یہ ہے کہ، آپ اپنے کل مال کا ۱/۴ حصہ اپنی بیوی کے نام کر دیں، باقی مال کے دو برابر حصے کر کے ہر ایک بھتیجے کو ایک ایک حصہ دیدیں، اگر اس مال سے اپنے لئے بھی کچھ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس بات کا خیال رہے کہ دونوں بھتیجوں کا حصہ ان کے قبضہ میں دینا ضروری ہے ورنہ ہبہ تام نہ ہوگا۔

لما قال العلامة ابراهيم الحلبي : هی تمليك عين بلاعوض وتصح بايجاب وقبول وتتم بالقبض فان قبض فی المجلس بلا اذن صح ، وبعده لا بد من الاذن .

(ملتقى الابحر على صدر مجمع الانهر : ۴۸۹/۳ ، كتاب الهبة)

حصول منافع کا ہبہ:

السوال: ایک شخص نے ٹیکسی خرید کر اس شرط پر بیٹے کو دی کہ اس سے کما کر بیوی، بچوں کا خرچہ برداشت کرو، گاڑی کی ملکیت میری ہوگی، اس معاہدہ پر گواہ بھی موجود ہے، اب اس شخص کا انتقال ہوگیا، بیٹے نے گاڑی پر قبضہ کرلیا اور ملکیت کا دعویدار ہے، اس کو ترکہ میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟

الجواب: شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ باپ نے اس بیٹے کو صرف منافع کا مالک بنایا ہے، تو منافع کے ہبہ سے اصل چیز کا ہبہ لازم نہیں آتا اس لئے گاڑی باپ کی ملکیت میں ہونے کی وجہ سے ترکہ میں شامل ہوگی، اور دیگر ورثاء کا بھی اس میں حق ہوگا، اس بیٹے کا اکیلے اس پر قبضہ کرنا

ملکیت کا دعویٰ کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

بیوی کا حق مہر ہبہ کرنے کا حکم:

نکاح ہونے کے بعد حق مہر کا مالک بیوی خود ہے، وہ اگر کل حق مہر یا اس کا بعض حصہ بلا کسی جبر و اکراہ کے شوہر کو ہبہ کردے تو شوہر اُس کا مالک ہو جائے گا، بعد میں اگر دونوں میں کسی وجہ سے نا اتفاقی ہو جائے اس کی وجہ سے بیوی اپنے ہبہ سے رجوع کرنا چاہے اور مہر کا دوبارہ مطالبہ کرے تو شرعاً یہ درست نہیں۔

وكذا ما وهب احد الزوجين الاخر لان المقصود فيها الصلة كما في القرابة . (هداية : ٢٧٤/٣)

لیکن بعض علاقوں میں دستور ہے کہ شادی کے بعد زبردستی بیوی سے حق مہر معاف کرواتے ہیں اور اس کو بیوی کی طرف سے ہبہ سمجھتے ہیں، شرعاً یہ ہبہ معتبر نہیں، شوہر کے ذمہ بیوی کا حق مہر بدستور لازم ہے۔

قال العلامة محمد خالد اتاسی : يلزم في الهبة رضاء الواهب فلا تصح الهبة التي وقعت بالجبر والاكراه .

(مجلة الاحكام ماده : صـ ٨٦٠ ، ٤٧٢ ، الباب الثاني شرائط الهبه)

ایک سنگین غلطی:

بعض لوگ اپنی زندگی میں مکان یا دیگر کوئی جائیداد ورثاء کو ہبہ کرنا چاہتے ہیں، اس بارے میں عموماً دو طرح کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

(۱) مشترک چیز ہبہ کردیتے ہیں، مثلاً مکان میں نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو دیدیا، جبکہ شرعاً مشترک چیز کا ہبہ جائز نہیں، جب تک تقسیم کر کے دونوں کو اپنے اپنے حصے کا مالک نہ بنادے، ہبہ تام نہ ہوگا، اسی حالت میں باپ کا انتقال ہو جائے تو یہ مکان ترکہ میں داخل ہو کر تمام ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

(۲) ہبہ میں موہوب لہ کا قبضہ ضروری ہے کہ بعض کہہ دیتے ہیں بلکہ اسٹامپ میں لکھ دیتے ہیں کہ میں نے یہ مکان/دکان فلاں بیٹے کو دیدیا، اس کے بعد تاحیات اسی مکان میں رہائش پذیر رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم نے بیٹے کو دیدیا اور بیٹا مالک بن گیا، حالانکہ مکان باپ کے

سامان کے ساتھ مشغول ہونے کی وجہ سے بیٹے کا قبضہ تام نہیں ہوا ہے جس کی وجہ سے ہبہ تام نہیں ہوا، صحیح طریقہ اس کا یہ ہے کہ آپ اپنا سامان نکال کر مکان خالی کر کے بیٹے کے حوالے کریں یا یہ کہ بمع سامان کے مکان ہبہ کریں۔

مشترکہ طور پر ہبہ کرنے کا حکم:

سوال: چند شرکاء نے اپنی کوئی مشترک چیز کسی ایک شخص کو ہبہ کردی ایک عالم فرماتے ہیں کہ یہ ہبہ صحیح نہیں، رہنمائی فرمائیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

ہبۃ المشاع کی یہ صورت صحیح ہے، صحت ہبہ سے مانع وہ شیوع ہے جو موہوب لہ کے پاس ہو۔

ولا تصح الهبة للشريك لانه لم يوجد الافراز المشروط لتمام القبض . (أحسن الفتاوىٰ : ٧/٢٥٥)

قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخارى رحمه الله : وفى الاصل ومن شرائطها اى الهبة الا فراز حتى لايجوز هبة المشاع فيما يحتمل القسمة كالبيت والدار والارض ونحوها وان كان لا يحتمل القسمة يجوز كالبئر والحمام والرحى. (خلاصة الفتاوىٰ : ٤/٣٩٠)

كتاب الهبة ، الفصل الثالث فيما يكون خطباء وفيما لا يكون .

نا قابل تقسیم اشیاء کا ہبہ:

جو چیزیں نا قابل تقسیم ہوں ان کے ہبہ کا کیا طریقہ ہے، مثلاً ایک شخص نے اپنے جانور کو اس طرح ہبہ کیا کہ ایک حصہ اپنے لئے رکھا، اور تین حصے بیوی کو ہبہ کئے اور تین حصے بھائی کو، اب اس شخص کا یہ ہبہ صحیح ہوا یا نہیں؟

اس بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ جو اشیاء قابل تقسیم ہوں ان کا ہبہ تو قبل التقسیم صحیح نہیں جیسا کہ اوپر کے مسائل میں تفصیل سے معلوم ہوا، البتہ جن اشیاء کی تقسیم ممکن نہ ہو مثلاً جانور ان کا ہبہ تقسیم سے پہلے صحیح ہے، لہٰذا اس شخص کا ہبہ کرنا صحیح ہوا۔

قال العلامة الخوارزمى رحمه الله : هبة المشاع فيما لا يقسم جائزة يعنى به مالا يحتمل القسمة اى لا يبقىٰ منتفعا بعد القسمة

اصلا کعبد واحد او دابة واحدة .

(الكفاية فی فتح القدیر : ٧/٤٨٨ كتاب الهبة)

قال العلامة قاضی خانؒ : وفيما لا يقسم كالعبد والدابة والثوب والحمام يجوز هبة المشاع من الشريك وغيره فی قولهم .

(الفتاوىٰ قاضی خان علی هامش الهندية : ٣/٢٦٧ كتاب الهبة ، فصلفي هبة المشاع ومثلهٗ في الهداية : ٣/٢٨٥ كتاب الهبة)

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : وذكر قبله هبة المشاع فيما يقسم لا تفيد الملك عند ابی حنيفة وفی القهسانی لا تفيد الملك وهو المختار كما فی المضمرات .

(رد المحتار : ٥/٦٩٢ ،كتاب الهبة ومثلهٗ فی بدائع الصنائع : ٦/١٢٣ كتاب الهبة)

اولادکوھبہ کرنے میں کم یازیادہ دینا:

سوال : اولاد کو ہبہ دینے میں تفاضل کا کیا حکم ہے؟ بالتفصیل تحریر فرمائیں؟

جواب : (۱) اگر دوسروں کا اضرار مقصود ہوتو مکروہ تحریمی ہے، قضاءً نافذ ہے دیانۃً واجب الرد ہے۔

(۲) اضرار مقصود نہ ہو اور کوئی وجہ ترجیح نہ ہو تو مکروہ تنزیہی ہے، ذکور واناث میں تسویہ مستحب ہے۔

(۳) دینداری، خدمت گزاری، خدمات دینیہ کا شغل یا احتیاج وغیرہ وجوہ کی بناء پر تفاضل مستحب ہے۔

(٤) بے دین اولاد کو بقدر قوت سے زائد نہیں دینا چاہئے ،ان کو محروم کرنا اور زائد مال امور دینیہ میں صرف کرنا مستحب ہے۔

قال الامام الحصكفی رحمه الله تعالىٰ : وفی الخانية لا بأس بتفضيل بعض الاولاد فی المحبة لانها عمل القلب وكذا فی العطايا ان لم يقصد به الاضرار وان قصده يسوی بينهم ويعطی البنت كالابن عند الثانی وعليه الفتوىٰ ولو وهب فی صحته كل المال للولد جاز

واثم .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ : (قوله وعليه الفتوىٰ) ای علی قول ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ من ان التنصيف بين الذكر والانثیٰ افضل من التثليث الذی هو قول محمد رحمه الله تعالى رملی . (ردالمحتار : ٤ /٥٧٣)

وقال الامام طاهر بن عبد الرشيد رحمه الله تعالیٰ : وفی الفتاویٰ رجل له ابن وبنت اراد ان يهب لهما شيئا فالافضل ان يجعل للذكر مثل حظ الانثيين عند محمد رحمه الله تعالیٰ وعند ابی یوسف رحمه الله تعالیٰ بينهما سواء هو المختار لورود الآثار .

ولو وهب جميع ماله لابنه جاز فی القضاء وهو اثم نص عن محمد رحمه الله تعالیٰ هكذا فی العيون .

ولو اعطی بعض ولده شيئا دون البعض لزيادة رشده لابأس به وان كانا سواء لاينبغی ان يفضل .

ولو كان ولده فاسقا فاراد ان يصرف ماله الی وجود الخير ويحرمه عن الميراث هذا خير من تركه لان فيه اعانة علی المعصية ، ولو كان ولده فاسقا لا يعطی له اكثر من قوته .

(خلاصة الفتاویٰ : ٤/ ٤٠٠)

وكذا نقله عنه العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالیٰ وقرره .

ونقل ايضا عن المحيط : يكره تفضيل بعض الاولاد علی البعض فی الهبة حالة الصحة الالزيادة فضل له فی الدين وان وهب ماله كله لواحد جاز قضاءً وهو اثم . (البحر الرائق : ٧/ ٢٨٨)

وقال العلامة الطحطاوی رحمه الله تعالی : (قوله وكذا فی العطايا) ويكره ذلك عند تساويهم فی الدرجة كما فی المنح والهندية اما عند عدم التساوی كما اذا كان احدهم مشتغلا بالعلم

لا بالکسب لابأس ان یفضله علی غیره کما فی الملتقط ای ولا یکره وفی المنح روی عن الامام انه لابأس به اذا کان التفضیل لزیادة فضل له فی الدین وفی خزانة المفتین ان کان فی ولده فاسق لاینبغی ان یعطیه اکثر من قوته کیلا یصیر معینا له فی المعصیة انتهی وفی الخلاصة ولو کان ولده فاسقا فاراد ان یصرف ماله الی وجوه الخیر ویحرمه عن المیراث هذا خیر من ترکه انتهی ای للولد وعلله فی البزازیة بالعلة السابقة (قوله یسوی بینهم) قال فی البزازیة الافضل فی هبة البنت والابن التثلیث کالمیراث وعند الشافعی رحمه اللّٰه تعالیٰ التنصیف وهو المختار ولووهب جمیع ماله من ابنه جاز قضاء وهو آثم نص علیه محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ اه فانت تری نص البزازیة خالیا عن قصد الاضرار وقال فی الخانیة ولووهب رجل شیئا لاولاده فی الصحة واراد تفضیل البعض علی البعض فی ذلك لارواية لهذا فی الاصل عن اصحابنا وروی عن الامام رحمه اللّٰه تعالیٰ انه لابأس به اذا کان التفضیل لزیادة فضل له فی الدین وان کانا سواء یکره وروی المعلی عن ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ انه لابأس به اذا لم یقصد به الاضرار وان قصد به الاضرار سوی بینهم یعطی الابنة ما یعطی الابن وقال محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ یعطی للذکر ضعف ما یعطی للانثیٰ و الفتوی علی قول ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ.

(طحطاوی علی الدر : ۳۹۹/۳ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۲۵۶/۷)

ہبہ سے رجوع کرنے کا حکم:

کسی کو کوئی چیز ہبہ کرنے کے بعد واپس لینے میں کئی قباحتیں ہیں، اس سے آپس میں بغض ونفرت پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ ایک مکروہ ناپسندیدہ فعل ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی شناعت وقباحت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ

" مثل الذی یعطی العطیة ثم یرجع فیها کمثل الکلب یأکل فاذا

شبع قاء ثم عاد فی قیئه ."

(اخرجه اصحاب السنن ، وقال الترمذی ، حسن صحیح)

یعنی جو شخص کسی کو کوئی چیز عطیہ دینے کے بعد دوبارہ واپس لے لے وہ اس کتے کی طرح ہے جو پیٹ بھر کر کھائے پھر قئی کردے، اس کے بعد اپنے قئے کو دوبارہ چاٹ لے۔

اب اگر کوئی شخص ہبہ کر کے واپس لینا چاہے تو شرعاً کیا حکم ہوگا اس بارے میں تفصیل ہے۔

1- موھوب لہ کی رضاء سے بہر حال رجوع جائز ہے۔

2- قضاء قاضی سے رجوع صحیح ہے۔

3- ہبہ قبول کرنے کے بعد اسکا عوض دیدیا ہو تو بھی بذریعہ قضاء رجوع کرسکتا ہے۔

ہبہ کے بعد رجوع ممنوع ہونے کی صورتیں:

مندرجہ ذیل باتیں ہبہ کے بعد رجوع کرنے سے مانع ہیں:

(ا) قرابت داری۔

(۲) میاں بیوی کا رشتہ۔

(۳) ہبہ قبول کرنے کے بعد مالی معاوضہ لینا۔

(۴) موھوب بہ چیز کا موھوب لہ کی ملک سے نکل جانا۔

(۵) ہبہ دینے اور لینے والوں میں سے کسی ایک کا انتقال کرجانا۔

(٦) شئی موھوب کا ہلاک ہوجانا مثلاً مکان تھا گرگیا۔

(۷) موھوب بہ چیز میں کوئی زیادتی کرلی گئی، مثلاً کپڑا تھا اس کو رنگ لیا، گندم تھا اس کو پیس لیا۔

قال صاحب الاختیار : ویجوز لرجوع فیما وھبه للاجنبی ویکره، ای تحریما ، فان عوضه ، أوزادت زیادة متصلة، او مات احدھما او خرجت علی ملك الموھوب له، فلارجوع والمعانی المانعة من الرجوع فی الھبة ھی ، المحرمیة من القرابة، والزوجیة والمعاوضة وخروجھا من ملك الموھوب له ، وموت الواھب او الموھوب . (كتاب الاختیار للموصلی : ۵۱/۳)

وقد نظم بعضهم هذه الموانع السبعة بقوله، ومانع من الرجوع في الهبة: يا صاحبي حروف، دمع خذقة. (فقه المعاملات)

معتوہ (بے وقوف) کا ہبہ:

معتوہ شخص اگر کسی شخص کو کوئی چیز ہبہ کردے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا، اس بارے میں حضرت مفتی اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

معتوہ کا ہبہ صحیح نہیں، اس کے تصرفات میں یہ تفصیل ہے:

جن تصرفات میں اس کا نفع ہے وہ بلا اذن ولی بھی معتبر ہیں، جیسے ہبہ قبول کرنا، جن میں اس کا نقصان ہے، وہ اذن ولی سے بھی معتبر نہیں، جیسے ہبہ دینا۔

جن میں نفع وضرر دونوں کا احتمال ہے، ان میں اذن ولی ضروری ہے، جیسے بیع وشراء۔

ولی سے مراد باپ یا اس کا وصی یا دادا ہے، چچا کا اذن کافی نہیں، باپ دادا نہ ہوں تو حاکم مسلم یا اس کا نائب ولی ہوگا، اگر حاکم مسلم نہ ہو یا اس طرف توجہ نہ دے تو مقامی لوگوں میں سے دیندار بااثر لوگ جسے متعین کردیں اس کا اذن ضروری ہے۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وتصرف الصبي والمعتوه الذي يعقل البيع والشراء ان كان نافعا محضا كالاسلام والاتهاب صح بلا اذن وان ضارا كالطلاق والعتاق والصدقة والقرض لاوان اذن به وليهما وماتردد من العقود بين نفع وضرر كالبيع والشراء توقف على الاذن حتى لوبلغ فاجازه نفذفان اذن لهما الولي فهما في شراء وبيع كعبد مأذون في كل احكامه.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله ووليه ابوه) اي الصبي وفي الهندية المعتوه الذي يعقل البيع يأذن له الاب والوصي والجد دون الاخ والعم وحكمه حكم الصبي.

(ردالمحتار: ٥/ ١٢١)

نابالغ کو ہبہ کیا تو والد کا قبضہ کافی ہے:

اگر والد نے اپنی نابالغ اولاد کو ہبہ کیا تو نیت کرلینا کافی ہے، اسی طرح اگر کسی غیر نے ہبہ کیا

تو والد کے قبضہ سے ہبہ تام ہو جائے گا۔

قال الامام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وهبة من له الولاية على الطفل في الجملة وهو كل من يعوله فدخل الاخ والعم عند عدم الاب لوفي عيالهم تتم بالعقد .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله بالعقد) اى الايجاب فقط كما يشير اليه الشارح كذا في الهامش وهذا اذا اعمله او اشهد وللتحرز عن الجحود بعد موته والا علام لازم .

(ردالمحتار : ٢ / ٤ /) .

نابالغ پر زکوۃ اور قربانی واجب نہیں:

قال في التنوير : وشرط افتراضها عقل وبلوغ واسلام وحرية .

(ردالمحتار : ٢ / ٥٧١)

وفي الشرح : صححه في الكافي (الى قوله) وهو المعتمد .

(ردالمحتار : ٢ / ٢٢٣)

ہبہ میں شرط لگانے کا حکم:

اگر کوئی شخص مشروط طور پر ہبہ کرے تو ہبہ صحیح ہوگا یا نہیں؟ اس بارے میں ضابطہ یہ ہے کہ اگر کوئی مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ اور شرط دونوں صحیح ہیں اور اگر کوئی غیر مناسب شرط عائد کرے تو ہبہ صحیح ہوگا اور شرط باطل ہوگی۔

قال في التنوير : ومالايبطل بالشرط الفاسد القرض والهبة والصدقة الخ .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : كوهبتك هذه المائة او تصدقت عليك بها على ان تخدمني سنة نهر فتضح ويبطل الشرط لانه فاسد وفي جامع الفصولين ويصح تعليق الهبة بشرط ملائم كو هبتك على ان تعوضني كذا ولو تخالفا تصح الهبة لا الشرط .

(ردالمحتار : ٤ / ٢٥٢)

عمریٰ کے طریقہ پر ہبہ کرنے کا حکم:

ہبہ کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ "اعمرتك هذه الدار" وغیرہ الفاظ استعمال کرکے ہبہ کرے، جس کا معنی ہے کہ یہ گھر میں نے عمر بھر کے لئے تمہیں دیدیا، اب شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) دینے والا تصریح کرے کہ "اذا متّ فهي راجعة اليّ او الیٰ ورثته" اس صورت میں بالاتفاق اس کا حکم عاریت کا ہے۔

(۲) ہبہ کے وقت تصریح کردے کہ "اذا متّ فهي لورثتك بالعصبك" اس صورت میں بھی اتفاق ہے کہ یہ ہبہ کے حکم میں ہے۔

(۳) ہبہ کے وقت صرف "اعمرتك" کہے یہ تصریح نہ کرے کہ "معمرله" کے مرنے کے بعد کیا صورت ہوگی، اس صورت میں اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں اس کو عاریت سمجھا جائے گا، امام شافعی رحمہ اللہ کا قول قدیم بھی یہی ہے، امام ابوحنیفہؒ وامام احمدؒ فرماتے ہیں اس کو ہبہ قرار دیا جائے گا اور یہی امام شافعیؒ کا قول جدید ہے۔

لقوله علیه السلام: "العمریٰ جائزة". (بخاری: ۹۲/۲)

وفي ملتقى الابحر قال: والعمریٰ جائزة للمعمر حال حياته ولورثته بعده، وهي أن يجعل داره له مدة عمره فاذا مات ردت عليه فالهبة صحيحة، وشرط الرجوع الیٰ الواهب شرط باطل، لقوله صلى الله عليه وسلم: العمریٰ لمن وهبت له. (ملتقى الابحر: ۱۵۵/۲)

حکم الرقبیٰ:

الرقبی هي أن يقول شخص لآخر، جعلت داري لك رقبیٰ، ان مت قبلي فهي لي، وان مت قبلك فهي لك، وكان كل واحد منهما، يرتقب وينتظر موت الآخر ولذا سميت "رقبیٰ".

یعنی رقبیٰ کے معنی یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنا مکان تمہارے لئے رقبیٰ کے طور پر دیدیا، اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو یہ مکان واپس میرا ہوجائے گا، اور اگر میرا تجھ سے پہلے

انتقال ہو جائے تو یہ مکان ہمیشہ سے آپ کا ہوگا، اب اس کے بعد گویا کہ ہر شخص دوسرے کی موت کا منتظر ہے۔

اس کا حکم یہ ہے کہ امام شافعی، امام احمد اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا حکم بعینہ وہی ہے جو عمریٰ کا ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ اگر عمریٰ میں مطلق چھوڑ دے تو وہ ہبہ سمجھا جاتا ہے، اور رقبیٰ میں یہ تفصیل ہے کہ، اگر وہ شخص پہلے مرجائے تو گھر رقبیٰ دینے کے پاس واپس لوٹ آتا ہے، اور اگر رقبیٰ دینے والے کا انتقال پہلے ہو جائے تو وہ مکان ہمیشہ کے لئے مرقب لہ کا ہو جاتا ہے، ان کا استدلال رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

" الرقبى جائزه لاهلها . "

اور رقبیٰ کا مفہوم اس زمانہ میں یہی تھا، یہ رقب سے مشتق ہے اور ہر ایک دوسرے کی موت کا منتظر ہوتا تھا۔

لیکن امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے رقبیٰ باطل ہے کیوں کہ یہ شرط فاسد ہے اور فساد کی وجہ جہالت ہے، باقی حدیث میں جس رقبیٰ کو جائز قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ " ملكتك رقبة هذه الدار" لہٰذا وہ ہبہ کے حکم میں ہے، لہٰذا اب جو کوئی شخص رقبہ کرے گا وہ اسی معنی پر محمول ہوگا اور ہبہ سمجھا جائے گا۔

(ماخوذ از تقریر ترمذی شیخ تقی عثمانی زید مجدهم)

ہبہ اور ہدیہ کو واپس کرنے کا حکم:

ہبہ اور ہدیہ کو رد کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر یہ یقین یا ظن غالب ہو کہ حرام مال سے ہدیہ کر رہا ہے، تو اس کو قبول کرنا جائز نہیں بلکہ واپس کرنا لازم ہے، اور اگر حلال مال سے ہدیہ کر رہا ہے، لیکن رشوت کے طور پر ہو تب بھی قبول کرنا جائز نہیں، اس کے علاوہ ہو تو قبول کر لینا چاہئے، اور بدلہ میں ہدیہ کرنے والے کو بھی کوئی چیز ہبہ کرنی چاہئے۔

کما روت عائشة رضى الله عنها حيث قالت : " كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقبل الهدية، ويثيب عليها ".

(اخرجه البخارى : ۲ / ۹۰ ، باب المكافاة فى الهدية)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے اور اس پر بدلہ بھی دیتے

تھے۔

اگر ہدیہ دینے کے لئے کچھ نہ ہوتو" جزاك الله خیراً " کہدے یہ اس کے حق میں دعا اور اس کے لئے بہترین ہدیہ ہے۔

فقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " من اسدى اليكم معروفا فكافئوه فان لم تجد واما تكافئو نه به، فادعوا له ".

(الترغيب والترهيب للمنذرى)

وقوله عليه السلام : " من صنع اليه معروفا فقال لفاعله ، جزاك الله خيرًا ، فقد ابلغ فى الثناء ". (ترمذى بسند جيد)

تین چیزوں کا ہدیہ رد نہ کرنا:

تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز کسی کو ہدیہ کی جائے تو رد نہیں کرنا چاہئے۔

(۱) دودھ (۲) خوشبو (۳) تکیہ

لقولہ عليه السلام : " من عرض عليه ريحان فلايرده لانه خفيف المحمل، طيب الريح ". (مسلم : رقم ٢٢٥٣) ۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو ریحان ہدیہ میں ملے تو چاہئے کہ اس کو رد نہ کرے کیوں کہ اس کو اٹھانا آسان ہے اور اس کی خوشبو عمدہ ہے۔

وقوله عليه السلام : " ثلاثة لاترد،الوسائد، والدهن، يعنى الطيب، واللبن ". (اخرجه الترمذى وقال حديث غريب)

وقال انس : " كان النبى صلى الله عليه وسلم لايرد الطيب ."

(اخرجه البخارى : ٢/ ٩٠)

احكام الودائع

امانت کی حفاظت عاریت وغیرہ کے احکام:

هى مايوضع عند غير صاحبه ، من مال ومتاع للحفظ وللرعاية

وقال صاحب ملتقى الابحر : الايداع، تسليط المالك غيره، على

حفظ ماله، والو دیعة، مایترك عند الامین للحفظ .

(ملتقی الابحر : ۱٤٣/٢)

یعنی امانت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کے پاس بنیت حفاظت رکھوائے۔

امین اور مودِع کے لئے شرائط:

امانت رکھوانے والے اور جس کے پاس رکھوایا گیا دونوں کا عاقل، بالغ اور تصرف کا اہل ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح ایجاب وقبول بھی ضروری ہے، یعنی امانت رکھوانے والا کوئی ایسا لفظ کہے جو امانت پر دلالت کرے، مثلاً عربی میں "او دعتك هذا المال ، یا احفظ هذا الشئ لی " یعنی یہ مال میں نے آپ کے پاس بطور امانت رکھا ہے یا میری اس چیز کی حفاظت کریں دوسرا شخص زبان سے ہاں کہے، یا خاموشی سے حفاظت پر راضی ہونے کو ظاہر کرے دونوں صورتوں میں امانت کا معاملہ مکمل ہو جائے گا۔

امانت کی حفاظت کا حکم:

امانت قبول کرنے کے بعد اس کی حفاظت کرنا شرعاً واجب ہے جس طرح اپنے ذاتی مال کی حفاظت کرنا، کہ خود حفاظت کرے یا بیوی بچے یا گھر کے کسی معتبر شخص کے ذریعہ حفاظت کرے، حفاظت کرنے کی پوری کوشش کے باوجود اگر ناگہانی آفت سے ہلاک ہو جائے یا چوری ہو جائے تو امین پر تاوان لازم نہ ہوگا اور اگر ان کی تعدی یا حفاظت میں کوتاہی کی وجہ سے ایسا ہوا تو تاوان لازم ہوگا۔

قال فی الاختیار هو عقد مشروع امانة لا غرامة لحدیث لیس علی المستودع غیر المغل، ای الخائن ضمان، ولا علی المستعیر غیر المغل ضمان ، (دار قطنی) فهی امانة اذا هلکت من غیر تعد لم یضمن، لانه لو وجب الضمان ، لا متنع الناس عن قبولها، وفیه من الفساد مالا یخفی . (الاختیار لتعلیل المختار للموصلی : ٦٥/٣)

امانت میں تصرف کا حکم:

امانت میں امین کے لئے تصرف کا حکم یہ ہے کہ چونکہ امین کے ذمہ امانت کی حفاظت لازم

ہے، لہٰذا حفاظت کے لئے جو تدبیر اختیار کرنا پڑے وہ تصرف کرسکتا ہے، اس کے علاوہ کسی قسم کا تصرف جائز نہیں۔

وفی الهندیه قال: الودیعة لاتودع ولاتعار ولاتوجر ولاترهن وان فعل شیئا منهن ضمن کذا فی البحر الرائق.

(الفتاوی الهندیة: ٤/٣٣٨، کتاب الودیعة)

امانت پر اجرت لینے کا حکم:

امانت کی حفاظت کو امین پر لازم کر کے اجرت مقرر کرنا شرعاً جائز ہے، البتہ اس صورت میں امین کے ہاتھ سے امانت کسی ایسے عمل سے ضائع ہو جائے جس سے بچنا ممکن تھا تو امین ضامن ہوگا ورنہ نہیں۔

وفی مجلة الاحکام: الودیعة امانة فی ید المودَع، فاذا هلکت بلا تعد منه وبدون صنعه وتقصیره فی الحفظ لا یضمن ولکن اذا کان الایداع باجرة فهلکت او ضاعت بسبب یمکن التحرزعنه لزم المستودع ضمانها.

(شرح المجلة مادة: ٧٧٧، احکام الودیعة)

امانت رکھوا کر واپس نہ آئے:

اگر کوئی شخص امانت رکھوا کر واپس نہ آئے تو کچھ وقت انتظار کرنا ضروری ہے، اس میں اس کو تلاش کیا جائے اگر وہ مل جائے تو اس تک یا موت کی صورت میں ان کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے، لیکن اگر بالکل پتہ نہ چلے تو اس مال کو امانت رکھوانے والے کی طرف سے صدقہ کردے، امین اگر فقیر ہو تو خود بھی کھا سکتا ہے، صدقہ یا استعمال کے بعد مالک واپس آجائے تو مالک کو اختیار ہوگا کہ اس صدقہ پر راضی رہے یا یہ کہ امین سے اپنے مال کا مطالبہ کرے۔

قال العلامة الحصکفی رحمه اللّٰه: فینتفع بها لو فقیراً والا تصدق بها علی فقیر ولوعلی اصله وفرعه وحرسه، فان جاء مالکها بعد التصدق خیر بین اجازة فعله ولو بعد هلاکها وله ثوابها او تضمینه. (رد المحتار: ٤/٧٩-٨٠، کتاب اللقطة)

جوتے، کپڑے وغیرہ تبدیل ہوجانا:

اگر کسی شخص کی مسجد سے چپل، جوتے، تبدیل ہوگئے یا جہاز یا بس میں بیگ وغیرہ تبدیل ہوگیا غلطی سے کسی دوسرے کا بیگ آگیا تو کیا اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ اس کا استعمال جائز نہیں کیوں کہ اولاً اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ یقین نہیں کہ جس نے جوتا لیا ہے یہ جوتا اسی کا ہے یا جو بیگ لے گیا ہے آپ کو ملا ہوا بیگ اسی کا ہے اور اگر ایسا ہو بھی تو بھی چونکہ باہمی مبادلہ کا کوئی معاملہ نہیں ہوا، اس لئے جو جوتا یا کپڑا ملا ہے اس کا حکم لقطہ کا ہوگا، یعنی پہلے یہ کوشش کی جائے گی کہ اس کا مالک مل جائے، اور اس کو واپس کردیا جائے، اور مالک کے ملنے سے مایوسی ہوجائے تو مالک کی طرف سے صدقہ کردے، ہاں البتہ مالک ملنے سے مایوسی کی صورت میں اگر یہ شخص خود بھی مستحق زکوٰۃ ہو تو اس کو خود بھی استعمال کرسکتا ہے۔

كما في العالمگيرية قال: امرأة وضعت ملائتها فجاء ت امرأة اخرىٰ وضعت ملأتها ثم جاء ت الاولىٰ وأخذت ملاء ة الثانية وذهبت لا يسع للثانية أن ينتفع ملأتها، والحيلة أن يتصدق الثانية بهذه الملأة على بنتها، ان كانت فقيرة على نية أن يكون الثواب لصاحبها ان رضيت ثم تهب البنت الملأة منها فيسعها الانتفاع بها كاللقطة، وكذا لو سرق مكعبا وترك عوضاً.

(ماخوذ از امداد المفتين بتغير: صـ ٨٧٦)

سفر کے لئے روانگی کے وقت ہدایا کا وکیل بنانا:

جب کوئی سفر سے وطن واپس آرہا ہوتا ہے، تو دوسرے جاننے والے اپنے عزیز واقارب کے لئے مختلف قسم کی چیزیں ان کے ہاتھ بھیجتے ہیں اب اس شخص کو اختیار ہے کہ یا تو شروع سے انکار کردے کہ میں ساتھ لیکر نہیں جاسکتا اور اگر انکار نہیں کرتا بلکہ اپنے ساتھ لے جانے کی حامی بھر لیتا ہے اور چیزیں قبول کرلیتا ہے تو اس صورت میں بعینہ وہی چیزیں جن کے لئے بھیجے ان تک پہنچانا ضروری ہے اس میں کسی قسم کا ردوبدل کرنا حرام ہے، اگر ردوبدل کیا اس کے بعد وہ چیز ہلاک ہوئی تو تاوان ادا کرنا لازم ہوگا۔

عاریت کی چیزیں امانت ہیں:

اگر کسی نے کوئی چیز بطور عاریت لی، مثلاً مہمان آئے اور پڑوس سے برتن مانگ لئے یا کہیں جانا ہے کسی سے بیگ یا کوئی اور چیز بطور عاریت لی، یہ امانت ہے، جس مقصد کے لئے لی ہو وہ مقصد پورا ہوتے ہی فوراً واپس کرنا ضروری ہے۔

پڑوس کے سالن کا برتن:

اگر پڑوس نے برتن میں سالن وغیرہ کوئی چیز بطور ہدیہ پیش کی تو چیز کو استعمال کرنے کے بعد برتن کو کسی اور مقصد کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں کیوں کہ یہ برتن امانت ہے اور ان کو واپس کر دینا ضروری ہے۔

مستعار کتب کا حکم:

مدرسہ سے یا کسی سے کتاب عاریۃً حاصل کی، اب اس کتاب پر لکھنا یا حاشیہ چڑھانا یا کوئی اور تصرف کرنا جائز نہیں، بلکہ پڑھائی اور مطالعہ مکمل ہونے کے بعد واپس کرنا ضروری ہے۔

احکام الرھن

رہن کے احکام:

" الرهن فى اللغة معناه الحبس ."

رہن کے معنی لغت میں روکنا ہے۔

وشرعاً " ما يجعله الشخص وثيقة للدين الذى فى ذمته لآخر، مثاله اذا اشترى متاعاً، اوسيارة، ولم يكن لديه قيمتها؟/ فيترك عند البائع بعض الحلى رهينة، حتى يدماعليه من دين أو يرهن، داره مقابل الدين الذى استقرضه من اخر ."

یعنی شرعاً رہن اس مال کو کہا جاتا ہے، جو آدمی اپنے ذمہ واجب الاداء دین کے مقابلہ میں دائن کے پاس رکھواتا ہے تاکہ دین کی ادائیگی کا یقین حاصل ہو جائے، مثلاً کوئی سامان، یا گاڑی خریدی لیکن قیمت کے لئے رقم اپنے پاس نہیں تو رقم کا بندوبست ہونے تک اپنی کوئی قیمتی چیز مثلاً، سونا، چاندی کے زیورات وغیرہ بائع کے پاس رھن رکھواتا ہے یا قرض حاصل کیا اس کی ادائیگی

تک اپنا گھر یا کوئی دیگر جائیداد دائن کے پاس رکھواتا ہے۔

رہن کی مشروعیت:

والرھن مشروع بالكتاب، والسنة، واجماع الامة لم يخالف في جوازه احد.

قوله تعالى: ﴿وان كنتم على سفر ولم تجدوا كاتبا فرهن مقبوضة﴾ (سورة البقرة: ٢٨٣)

وروى البخاري عن عائشة رضي الله عنها انها قالت: " اشترى رسول الله صلى الله عليه وسلم من يهودي طعاماً، ورهنه درعه، ومات رسول الله صلى الله عليه وسلم ودرعه مرهونة عنده ".

(بخاري كتاب الرهن: ٧٣/٣، مسلم: ١٢٢٦/٣)

یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک یہودی سے گندم خریدی اور اپنی زرہ مبارک اس کے پاس رھن رکھی اور رسول اللہ ﷺ اس دنیا سے پردہ فرما گئے اس وقت بھی آپ کی زرہ مرھون تھی۔ (بخاری)

رہن کی اصطلاحات:

راہن: مقروض شخص جو رہن رکھواتا ہے۔

مرتھن: قرض خواہ، جو اپنے قرض کے عوض میں کسی کا مال اپنے پاس رہن رکھتا ہے۔

مرہون: وہ مال جو قرض کے عوض مرتھن کے قبضہ میں دیا جاتا ہے۔

منافع رہن کا مالک راہن ہے:

شئی مرہون اگر چہ مرتھن کے قبضہ میں ہوتا ہے، لیکن وہ راہن ہی کی ملک میں باقی رہتا ہے، اس کی حفاظت پر اگر کچھ خرچہ آئے، یا وہ کوئی جانور ہو تو چارہ وغیرہ کا خرچہ مالک (یعنی راہن) کے ذمہ ہوگا، اسی طرح اس کے منافع، پھل، دودھ، غلہ وغیرہ وہ بھی راہن کا ہوگا۔

لقوله عليه السلام: " الرهن من راهنه له غنمه وعليه غرمه. "

(اخرجه الحاكم في المستدرك: صـ ٥٧٢، دارقطني: ٣٣/٣)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ رہن پر راہن کی ملک باقی ہے، منافع کا وہ خود مالک

ہے اور خرچہ بھی اسی کے ذمہ ہے۔

اگر راہن موجود نہ ہو اور مرتھن عدالت کے حکم سے مرہون پر کچھ خرچہ کرے تو یہ راہن کے ذمہ قرض ہوگا اور اگر اپنی طرف سے خرچہ کرے تو اس کی طرف سے تبرع و احسان ہوگا۔

مرہون کے ضمان کا حکم:

احناف کے نزدیک شئی مرہون مرتھن کے قبضہ میں مضمون ہے، یعنی دین کے بقدر پر مرتھن کا قبضہ، قبضۂ ضمانت ہے اور اس سے زائد اگر ہو تو اس پر مرتھن کا قبضہ، قبضۂ امانت ہے، لہٰذا اگر مرہون مرتھن کے ہاتھ میں ہلاک ہوا تو گویا مرتھن نے اپنا دین وصول کرلیا وہ راہن سے قرض کے مطالبہ کا حقدار نہ ہوگا۔

مثلاً ہزار روپے قرض کے بدلہ میں بارہ سو کی چیز رہن رکھا بعد میں مرہون ہلاک ہوگیا تو گویا کہ ہزار روپے کا قرض وصول ہوگیا اور اگر مرہون کی قیمت آٹھ سو روپے تھی تو اب مرتھن دو سو روپے راہن سے مطالبہ کرسکتا ہے۔

لقوله عليه السلام : " فی رجل رهن فرسا ، فنفق عند المرتهن ای هـلك عنده ، فجاء الی النبی صلی الله عليه وسلم فاخبره بذلك فقال له الرسول الله صلی الله عليه وسلم ذهب حقك ".

(اخرجه البيهقی فی السنن الكبریٰ : ٦/ ٤١)

ایک شخص کے پاس گھوڑا بطور رہن رکھا گیا اور مرتھن کے پاس گھوڑا ہلاک ہوگیا پس رسول اللہ ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپ نے مرتہن سے فرمایا تمہارا حق ختم ہوگیا۔

رہن کی زمین سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنا شرعاً ناجائز ہے اگر زمین رہن رکھی جائے تو اس سے مرتھن کے لئے انتفاع ناجائز ہونے کے متعلق ایک تفصیلی سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال : زمین رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو زمین مرتھن کے قبضہ میں رہیگی کہ راہن کے قبضہ میں رہے گی؟ اگر مرتھن کے قبضہ میں رہی تو مرتھن اس زمین کو کونسی صورت میں رکھے گا، آیا کہ زمین میں مرتھن خود تصرف کریگا یا کہ بیکار چھوڑ دے گا؟ اب دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ کونسی صورت پر رکھنے سے شرعاً حلال ہوسکتا ہے، بیان فرما کر بندہ کو مطمئن فرمائیں۔

الجواب : زمین رہن رکھنا جائز ہے اور دیگر اشیاء رہینہ کی طرح زمین بھی مرتھن کے قبضہ میں رہے گی اور مرتھن کو کسی تصرف کا حق نہیں ہے فقط امانت کے طور پر قبضہ میں رکھے نہ خود زراعت کرے نہ کسی کو کرایہ وغیرہ پر دے، اگر کرایہ پر زمین وغیرہ دیدی تو دیکھا جائے کہ مالک کی اجازت سے دی گئی ہے یا بدون اجازت دی ہے اگر اجازت سے دی ہے؟ تو کرایہ مالک کا حق ہے اور رہن باطل ہوگیا اور مرتھن کو یہ حق نہیں رہا کہ اس کو بطور رہن روک رکھے اور اگر مرتھن نے بدون اذن مالک کرایہ پر دی ہے تو کرایہ [1] لینے کا حق تو مرتھن کو ہے، لیکن یہ کرایہ اس کے لئے حلال نہیں ہے، بلکہ واجب التصدق ہے [2] اور رہن باقی ہے، اور اگر مرتھن نے خود زراعت کی ہے، تو اگر اجازت راہن سے کی ہے تو اس پر ضمان کچھ نہیں لیکن یہ انتفاع ناجائز ہے، اور اگر بدون اجازت ہے تو نقصان کا ضمان لازم ہے۔

فی العالمگیریة (٦/٢٨٣) مایجوز بیعه یجوز رهنه .

وایضاً فی (صـ ٢٩٩) اعلم بان عین الرهن أمانة فی ید المرتهن بمنزلة الودیعة الخ .

وایضاً فی الصفحة المذکورة : وان اجر المرتهن من أجنبی بأمر الراهن یخرج من الرهن ، وتکون الأجرة للراهن ، وان کانت الاجارة بغیر اذن الراهن الأجر للمرتهن یتصدق به ، وللمرتهن أن یعید ها فی الرهن ، وقال ایضاً بعد السطر ولو حبسه عن الراهن بعد ما انقضت مدة الاجازة صار غاصباً ، هکذا فی شرح الطحطاوی وفی الدرالمختار مع الشامی (٥/٥١٧) ثم نقل عن التهذیب أنه یکره للمرتهن أن ینتفع بالراهن وان اذن له الرهن .

قال المصنف رحمه الله : وعلیه یحمل ما عن محمد بن أسلم من أنه لایحل للمرتهن ذلك ولو بالاذن ، لانه رباً، قلت : وتعلیله یفید أنها تحریمیة ، فتأمله .

---

(١) البتہ اگر زمین میں کچھ نقصان آ گیا ہو تو ضمان دینا پڑے گا۔

(٢) اور اگر یہ کرایہ مالک زمین کو دیدیا جائے تو مالک کے لئے حـ ـ ـ ـ منہ

وفی الصفحة المذكورة ایضا : وفیها (ای الجواهر) زرع المرتهن أرض الراهن ، ان ابیح له الانتفاع لا یجب شئی وان لم یُبح لزمه نقصان الأرض وضمان الماء لو من قناة مملوكة فلیحفظ .

وقال الشامی تحت (قوله : لو من قناة مملوكة) هذا خلاف المفتی به من أنه لا یضمن الا ماملكه بالاحراز كمامر فی كتاب الشرب وماء القناة غیر محرز .

پس مرتھن کو چاہئے کہ زمین وغیرہ کو بیکار رکھے۔

اور ایک صورت انتفاع کی یہ ہے کہ مرتھن ہی زمین کو راہن سے کرایہ پرلیکر خود زراعت کرے، اس میں یہ تفصیل ہے، کہ اگر وہی قبضہ جو رہن کے وقت ہوا تھا اجارہ کے وقت رہے، تو اجارہ صحیح نہیں ہوا اور اگر واپس کر کے دوبارہ قبضہ کیا تو اجارہ صحیح ہوگیا، مگر رہن باطل ہوجائے گا۔

كما فی العالمگیریة (٢٩٩/٦) وكذلك لو استأجره المرتهن صحت الاجارة وبطل الرهن اذا جدد القبض .

وفی الشامی (٥٠٧/٥) ویشترط فی الاجارة (ای لصحة الاجارة وبطلان الرهن جمیعاً ، وعلل فی البدائع بأن قبض الرهن وقبض الاجارة متغائر، فلا بد من قبض جدید للاجارة،تجدید القبض كما علمت انفاانتهی. (ماخوذ از امداد الاحکام : ٤٩٦/٣)

رہن سے فائدہ حاصل کرنے کا حکم:

رہن سے فائدہ حاصل کرنے کے متعلق چند سوالات وجوابات جن سے جزئیات کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں:

(١) زمین یا زیور یا مکان وغیرہ رہن یعنی گروی اپنے پاس رکھ کر اس سے فائدہ اُٹھانا اور زمین گروی وغیرہ کی پیداوار کھانا حرام ہے یا نہیں؟

(٢) گروی چیز سے نفع حاصل کرنا سود ہے یا نہیں؟ اگر سود ہے تو اس سود کو حلال جاننے والے شخص کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

(۳) اور سود کو حلال جاننے والے کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟

(٤) گروی چیز کے منافع حرام ہونے اور سود ہونے میں علماء احناف میں اختلاف بھی ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس کا؟ بینوا توجروا

الجواب: (۱) حرام ہے، اگر رہن اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ مرتھن نفع حاصل کرے گا یا مشروط نہ ہو مگر معروف ہو، جیسا کہ اس زمانہ میں ہے، یا بدون اجازت راہن کے نفع حاصل کرے۔

(۲) ہاں مرھون سے نفع اٹھانا سود ہے اور اسکو حلال سمجھنے والا فاسق ہے جبکہ انتفاع مشروط ہو یا بلا اذن ہو۔

(۳) اس کے پیچھے نماز مکروہ ہے۔

(٤) اگر انتفاع مشروط فی الرہن ہو تو اتفاقاً حرام ہے، اور معروف بھی بحکم مشروط ہے اگر معروف و مشروط نہ ہو اور بلا شرط و بلا عرف کے راہن اجازت دیدے تو جواز میں اختلاف ہے اور اگر بلا اذن انتفاع ہو تو وہ بھی اتفاقاً حرام ہے۔ (ماخوذ از امداد الاحکام)

رہن کی ایک خاص صورت کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ زید عمرو کے پاس ایک حصہ معینہ زمین کے مثلاً دوسو روپیہ کے مقابل میں رہن رکھا، اس شرط پر کہ مرتھن عمرو اس زمین مرھونہ سے نفع اٹھائے اور فی سال روپیہ مذکورہ سے پانچ روپیہ گھٹ جائے جس وقت راہن چاہے کہ زمین مذکورہ کو خلاص کرے زمین تو مابقیہ روپیہ دیکر خلاص کرسکتا ہے، مثلاً دوسال کے بعد اگر راہن زمین مذکورہ کو خلاص کرنا چاہے تو ایک سونوے 190 روپے دے کر خلاص کرے۔

خلاصہ:

راہن اور مرتھن نے زمین مرھونہ کے خلاص کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی تو یہ صورت رہن میں شرعاً جائز ہوگی یا نہیں؟ برتقدیر ثانی سود ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: یہ صورت جائز نہیں۔

ولا بتأويل انه خمس الرباء قيمةً لمنافع السنة كلهالكونه بيع مالم يوجد.

اور اگر کسی نے سود کا حیلہ بنانے کی نیت سے یہ صورت اختیار کی تو اس کی اس نیت کا بھی گناہ ہوگا۔(حوالہ بالا)

مرھون کے اجارہ کا حکم:

اگر راہن مرہونہ زمین مرتھن کو کرایہ پر دیدے تو شرعاً اس کا کیا حکم ہوگا؟ اس مسئلہ کی تفصیل اس طرح ہے کہ اجارہ ایک جائز معاملہ ہے، مالک اپنی زمین، اجارہ کی تمام شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے کرایہ پر دے سکتا ہے، چاہے مرتھن کو دے یا کسی غیر کو، لیکن جب مالک اور مستأجر کے درمیان پہلے رہن کا معاملہ ہو چکا، اب مرتھن کو کرایہ پر دینے کی وجہ سے عقد رہن کا معاملہ ختم ہو جائے گا، لہٰذا اجارہ کا معاملہ ختم ہونے پر قرض ادا کئے بغیر زمین اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے، مرتھن کے لئے انکار کی گنجائش نہیں۔

لما قال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالیٰ : اما الاجارة فالمستاجر ائن كان هو الراهن فهي باطلة ، وان هو المرتهن وجد د القبض للاجارة بطل الرهن والاجرة للراهن .

(ردالمحتار : ٦/ ٥١١ ، كتاب الرهن)

رہن کو فروخت کرنے کا حکم:

اگر قرض ادا کرنے کی مدت پوری ہو جائے تو راہن پر لازم ہے کہ قرض کا ادا کردے اور اپنا رہن چھڑالے، اگر قرض ادا نہ کرے تو حاکم اس کو قرض ادا کرنے پر مجبور کرے گا اگر قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو رہن کو فروخت کر دیا جائے گا، اگر رہن کی قیمت قرض سے زائد ملے تو زائد حصہ مالک (راہن) کو دیدیا جائے گا اور اگر قیمت کم ملے تو وہ بعد میں راہن سے وصول کیا جائے گا۔

غلق الرہن کا حکم:

عرب میں اسلام سے پہلے دستور تھا کہ قرض کی مدت پوری ہونے پر راہن اپنا رہن نہ چھڑائے تو مرتھن اس پر قبضہ کر لیتا اور اپنی مرضی سے تصرف کرنا چاہے اس کی قیمت مقدار قرض سے کتنا ہی زیادہ ہو، تو اسلام نے اس دستور کو مٹایا اور باطل طریقہ پر لوگوں کے مال کھانے سے منع فرمایا:

کما فی الحدیث : قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم : " لا یغلق الرھن لصاحبہ غنمہ و علیہ غرمہ ".

(اخرجہ ابن ماجہ : ۸۱۶/۲)

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ راہن رہن چھڑانے سے عاجز ہونے کی صورت میں مرتھن کو رہن پر قبضہ کر لینے کا حق نہ ہوگا، بلکہ راہن ہی اس کا مالک رہے گا البتہ اس کو رہن فروخت کر کے قرضہ چکانے پر مجبور کیا جائے گا۔

احکام الغصب

غصب کے احکام:

الغصب لغة : اخذ الشئی ظلما مجاھرة علی وجه القھر.

کسی کے مال کو زبردستی ظلماً چھین لینا۔

کما فی قولہ تعالیٰ : ﴿ وکان وراء ھم ملك یأخذ کل سفینة غصبا ﴾ (سورۃ الکھف : ۷۹)

اصطلاحاً : اخذ مال متقوم، محترم مملوك للغیر بطریق التعدی. (کتاب الاختیار للموصلی : ۵۸/۳)

غصب کرنا بہت بڑا گناہ ہے:

کسی کا مال ناحق کھانا بہت بڑا ظلم اور گناہ ہے۔

قولہ : ﴿ لاتأکلوا اموالکم بینکم بالباطل الاأن تکون تجارة عن تراض منکم ﴾ (سورۃ النساء : ۲۹)

اے ایمان والو: آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر مت کھاؤ لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

وقولہ علیہ السلام : "من اخذ شبرًا من الارض ظلما طوقه اللّٰہ من سبع ارضٍ". (اخرجہ البخاری : ۶۸/۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ناحق کسی کی ایک بالشت زمین غصب کر لی

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ساتوں زمینوں کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالے گا۔

وفی خطبة حجة الوداع : یاأیها الناس ان دماء کم واموالکم واعراضکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا فی شهر کم هذا فی بلد کم هذا الاهل بلغت اللهم فاشهد .

(طرف من حدیث اخرجه الشیخان ، فی خطبة حجة الوداع)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ ''اے لوگو! تمہارا آپس میں خون ریزی کرنا یا ایک دوسرے کا مال غصب کرنا، یا عزت کو نقصان پہنچانا ایسا ہی حرام ہے، جیسا کہ آج کے دن کی حرمت ہے اس مقدس دن میں اس مقدس شہر میں۔ اس کے بعد صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا، کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے؟ سب نے اقرار کیا ہاں، پھر ارشاد فرمایا کہ یا اللہ اس گواہی پر آپ کو گواہ بناتا ہوں۔

وقوله علیه السلام : " کل مسلم علی المسلم حرام ، دمه وماله وعرضه " .

(مسلم رقم : ٢٥٦٤ ، ترمذی : ١٩٢٨ وقال هذا حدیث حسن)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے دوسری روایت میں ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا، مال اور عزت کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ (ترمذی شریف)

مال مغصوب کا ضمان واجب ہے:

جو کسی کا مال غصب کرے ایسے غاصب ڈاکو پر شرعاً واجب ہے کہ جو مال غصب کیا اس کو واپس لوٹا دے اگر اس نے مال خرچ کر دیا تو اس کا ضمان واجب ہے، یعنی اگر شئی مغصوب مثلی ہے تو اس کا مثل واجب ہے اور اگر مثل بازار سے منقطع ہو گیا ہے تو یوم انقطاع کی قیمت لگائی جائے گی اور اگر مغصوب قیمی ہے تو یوم غصب کی قیمت واجب ہے۔

قال فی التنویر وشرحه : او یجب رد مثله ان هلك وهو مثلی وان انقطع المثل بأن لا یوجد فی السوق الذی یباع فیه وان کان یوجد فی البیوت ابن کمال فقیمته یوم الخصومة ای وقت القضاء وعند ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ یوم الغصب وعند محمد رحمه

اللّٰہ تعالیٰ یوم الانقطاع ورجحهما قهستانی وتجب القمیة فی القیمی یوم غصبه اجماعاً.

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ: (قوله رجحهما) ای قول ابی یوسف وقول محمد رحمهما اللّٰه تعالیٰ وکان الاولی ان یقول ایضاً ای کما رجح قول الامام محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ ضمنا لمشی المتون علیه وصریحاً قال القهستانی وهو الاصح کما فی الخزانة وهو الصحیح کمافی التحفة وعند ابی یوسف یوم الغصب وهو اعدل الاقوال کما قال المصنف وهو المختار علی ما قال صاحب النهایة وعند محمد یوم الانقطاع وعلیه الفتوی کمافی ذخیرة الفتاوی وبه افتی کثیر من المشائخ. (رد المحتار: ۵/۱۲۸)

بلا اجازت بیوی کی زمین میں تصرف کرنے کا حکم:

اس بارے میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے تاکہ مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔

سوال: زوجہ کی زمین میں اگر شوہر مکان بنا لے تو یہ کس کا ہوگا؟ آیا بیوی کا یا شوہر کا؟

بینوا توجروا

جواب: اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:

(۱) بیوی کے لئے اس کے اذن سے مکان بنایا تو مکان بیوی کا ہوگا اور جو مصارف آئے وہ بیوی پر قرض ہوں گے۔

(۲) بیوی کے لئے بلا اذن بنایا تو تبرع شمار ہوگا۔

(۳) شوہر نے اپنے لئے بیوی کی اجازت سے بنایا تو زمین بیوی کی رہے گی اور مکان شوہر کا۔

(٤) بیوی کی اجازت کے بغیر اپنے لئے بنایا تو مکان شوہر کا ہوگا مگر بیوی اس کو گرا کر اپنی زمین خالی کرانے کا مطالبہ کر سکتی ہے، اگر مکان گرانے میں زمین کا ضرر ہو تو بیوی مکان کی قیمت دیکر مکان کی مالک بن سکتی ہے، قیمت ایسے مکان کی لگائی جائے گی جس کے گرانے کا فیصلہ کیا جا چکا ہو جو ملبہ کی قیمت سے شاید کچھ زیادہ متفاوت نہ ہوگی۔

قال فی التنویر وشرحہ: عمّر دار زوجتہ بمالہ باذنہا فالعمارة لہا والنفقة دین علیہا لصحة امرہا ولو عمّر لنفسہ بلا اذنہا فالعمارة لہ ویکون غاصبا للعرصة فیؤمر بالتفریغ بطلبہا ذلک ولو لہا بلا اذنہا فالعمارة لہا وہو متطوع فی البناء فلا رجوع لہ.

وقال العلامة ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: (قولہ عمر دار زوجتہ الخ) علی ہذا التفصیل عمارة کرمہا وسائر املا کہا جامع الفصولین وفیہ عن العدة کل من بنی فی دار غیرہ بامرہ فالبناء لآمرہ ولو لنفسہ بلا امرہ فہو لہ ولہ رفعہ الا ان یضر بالبناء فیمنع ولو بنی لرب الارض بلا امرہ ینبغی ان یکون متبرعا کما مرّ اھ (قولہ بلا اذنہا) فلو باذنہا تکون عاریة.

(رد المحتار: ۵/۵۲۷ ماخوذ از أحسن الفتاوی: جـ ۷)

غیر کی زمین میں غلطی سے تصرف:

سوال: ہمارے پڑوس میں مہاجر کی زمین ہے، شروع میں تپیدار کے نشان لیکر حد قائم کی اب سرکاری طور پر پیمائش کرائی تو اس مہاجر کی زمین کم نکلی وہ ہماری زمین سے پوری کی گئی جو کہ تقریباً نصف ایکڑ سے زائد ہے، اس کی فصل ہم اپنی زمین سمجھ کر اُٹھاتے رہے کئی سال ہو گئے یہ بھی یاد نہیں کہ فصل کیا کیا کاشت ہوئی اور پیداوار کتنی ہوئی؟ کیا غلطی اور بھول چوک میں گزشتہ آمدنی کا حق مہاجر کو دینا لازم ہے یا کہ نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: تخم کی لاگت اور زراعت کی مزدوری نکال کر باقی کا اندازہ لگا کر مالک کو لوٹانا واجب ہے۔

مغصوبہ زمین میں تصرف اور اس کی آمدن کا حکم:

اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے امداد الاحکام سے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: اگر کسی کے باپ دادا نے غصبی روپیہ کی جائیداد خریدی اور اس جائیداد کی وجہ سے وہ مالدار چلا آتا ہے، آیا ایسے شخص پر زکوۃ یا حج یا قربانی وغیرہ واجب ہوں گے یا نہیں؟ اگر ایسی جائیداد سے خود آپ یا اپنے لڑکے بالغ یا اور کسی یگانے بیگانے کی دعوت کر سکتا ہے یا نہیں؟ اور

بعض لکھتے ہیں کہ ملکیت ہو جانے سے حرمت حلت میں مبدل ہو جاتی ہے، مگر میری سمجھ میں نہیں آتا، امید ہے کہ اس مسئلہ کو بہت اچھی طرح سے، بحوالہ دلائل تحریر فرمائیں گے؟

الجواب : اگر اس نے دوسرے کی زمین غصب کی ہوتب تو وہ اس زمین سے مالدار نہیں ہو سکتا، لیکن زمین مغصوبہ میں غاصب جو بیج کاشت وغیرہ کرے گا، وہ کھیتی اور اس کا منافع غاصب کی ملک ہے گو ملک خبیث ہے اگر کھیتی اور پیداوار کی آمدنی مقدار زکوۃ اور مقدار حج کو پہنچ جائے تو، اس کے ذمہ زکوۃ اور حج سب فرض ہے اور زمین مغصوب منہ کی ملک ہے اور غاصب کے ذمہ اس زمین کے استعمال کرنے کی اجرت واجب ہے، یعنی عرفاً جس قدر لگان کا شتکاروں سے زمیندار لیا کرتے ہیں، وہ اس کو دینا واجب ہے نیز اس سے معافی چاہنا بھی واجب ہے، کیوں کہ اس نے بدون اجازت کے اس کی زمین کو استعمال کیا، جب تک غاصب ایسا نہ کرے دوسروں کو اس کی آمدنی سے دعوت قبول کرنا حرام ہے، اور اگر غاصب نے زمین غصب نہیں کی بلکہ روپیہ غصب کیا اور اس روپیہ سے زمین خرید لی، تو یہ زمین غاصب ہی کی ملک ہے، روپیہ والے کی ملک نہیں، لیکن جب تک غاصب مغصوب منہ کا روپیہ ادا نہ کرے اس وقت تک زمین اس کی ملکیت خبیث ہے، لیکن جب یہ زمین کا مالک ہے تو اس پر اس کی آمدنی میں زکوۃ وحج وغیرہ کی فرضیت ضرور ہوگی، (بشرطیکہ آمدنی اس قدر ہو جائے کہ مغصوب منہ کی رقم ادا کرنے کے بعد بھی مقدار نصاب مقدار حج باقی رہے) اس صورت میں غاصب کے ذمہ مغصوب منہ کا روپیہ ادا کرنا واجب ہے اور وہ روپیہ اس کے ذمہ قرض ہے، زمین میں مغصوب منہ کا کوئی حق نہیں، زمین غاصب ہی کی ملکیت ہوگی، لیکن اگر غاصب اس کا روپیہ ادا نہ کرے تو وہ بعد حکم حاکم کے زمین بھی اپنے روپیہ کے معاوضہ میں لے سکتا ہے۔

یہ تو ملکیت کا حکم تھا، رہا دوسروں کا اس کے یہاں کھانا کھانا، دعوت قبول کرنا، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر غاصب کی آمدنی اسی زمین سے ہے جس کو اس نے غصب کے روپیہ سے خریدی تب تو لوگوں کو اس کا کھانا کھانا حرام ہے، اور اگر دوسری آمدنی بھی ہے اور حلال آمدنی حرام پر غالب ہے، تو دعوت قبول کرنا فتویٰ سے جائز ہے، مگر تقویٰ کے خلاف ہے، جب تک یہ شخص غصب کو واپس نہ کر دے۔

(ماخوذ از امداد الاحکام)

بلااجازت کسی کے جانور ذبح کرنا:

اگرضرورت کی وجہ سے کسی کے جانور خرید ے بغیر ذبح کر دے اور نیت یہ ہو کہ بعد میں قیمت ادا کردیں گے، شرعاً اس کا حکم یہ ہے کہ دوسروں کے جانور مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کرنا غصب کے حکم میں ہے، لہٰذا مالک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا، چاہے تو مذبوحہ جانور غاصب کے حوالے کر کے اس سے پورے سالم جانور کی قیمت وصول کرے اور اگر چاہے تو مذبوحہ جانور رکھ لے اور ذبح کی وجہ سے سالم بکرے کے مقابلہ میں قیمت میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ غاصب سے وصول کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : قال في العمادية في فصل ٣٢ ومن ذبح شاة غير فما لكها بالخيار ان شاء ضمنه قيمتها وسلمها اليه وان شاء اخذها و غرمها النقصان .

(تنقيح الحامديه : ٢/ ١٧٥ ، كتاب الغصب ،
هكذا فتاوىٰ خانية على هامش الهنديه : ٢٤٥/٣)

مغصوبہ زمین کے منافع کا حکم:

اگر کوئی زمین غصب کر کے منافع حاصل کرتا رہا اور منافع کا کچھ حصہ خود استعمال کرتا رہا کچھ رفاہ عامہ کے کاموں میں خرچ کرتا رہا چند سالوں کے بعد زمین اصل مالک کو واپس کردی تو اجتک کے منافع کا کیا حکم ہوگا؟ کیا اصل مالک کو حق ہوگا کہ گذشتہ سالوں کے پیداوری منافع کا مطالبہ کرے؟

تو یاد رہے کہ شرعاً کسی کا مال غصب کرنا اور اس سے انتفاع حاصل کرنا حرام ہے زمانہ غصب میں جو کچھ بھی مغصوبہ سے حاصل ہوا ہو وہ مغصوب منہ کا حق ہے، بنا برایں بکر اپنی مغصوبہ زمین کی جملہ پیداوار کا مطالبہ کرسکتا ہے، اسی طرح مغصوبہ زمین کی بازیابی کے بعد مساجد اور دیگر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی ہوئی رقم کی واپسی کا بھی مطالبہ کرسکتا ہے، مگر علاقے کے عرف کے مطابق غاصب کو اجرِ مزارعت دینا لازم ہوگا۔

وفي الهندية : وسئل شيخ الاسلام عطاء بن حمزة عمن زرع ارض انسان ببذرنفسه بغير اذن صاحب الارض هل لصاحب الارض

ان يطالبه بحصة الارض قال نعم ان جرى العرف في تلك القرية انهم يزرعون الارض بثلث الخارج او ربعه او نصفه او بشئى مقدر شائع يجب ذلك القدر الذى جرى به العرف.

(الفتاوىٰ الهندية : صـ ١٤٤ باب العاشر فى زراعة الارض المغصوبة)

قال العلامةابن عابدين رحمه اللّٰه : فالحاصل ان من زرع ارض غيره بلا اذنه ولوعلى وجه الغصب فان كانت الارض ملكا واعدها ربها الزراعة اعتبر العرف فى الحصة ان كان ثمة عرف والا فان اعدها للايجار الخارج كله للزارع وعليه اجر مثلها لربها والافان انتقصت فعليه النقصان والافلاشئى عليه .

(تنقيح الحامدية : ١٧٢/٢ ، كتاب الغصب ،
ومثله فى الفتاوىٰ الكاملية : صـ ٢٠٩ ، كتاب الغصب)

ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کا حکم:

اگر ڈاکو کسی کا مال چھیننا چاہے تو صاحب مال کو شرعاً حق حاصل ہے، مدافعت کرکے اپنے مال کو بچانے کی کوشش کرے البتہ یہ کوشش کرے کہ معمولی مدافعت سے کام چل جائے، لیکن اگر مدافعت میں قتل وقتال کی بھی نوبت آجائے تو شرعاً اس کی بھی اجازت ہے کیوں کہ انسان کی جان ومال اور عزت تینوں شریعت کی نگاہ میں محترم ہیں، ان کی حفاظت کے لئے قتال جائز ہے۔

كما فى حديث اخرجه مسلم رقم ١٤١ : " كل المسلم على المسلم حرام ، دمه،وماله وعرضه ."

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون بہانا مال لوٹنا، عزت کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

مدافعت کرتے ہوئے ڈاکو مارا جائے تو جہنمی ہوگا اور صاحب مال مارا جائے تو شہید ہوگا۔

عن ابى هريرة رضى اللّٰهعنه أنه قال" جاء رجل الىٰ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ، فقال يا رسول اللّٰه أرأيت ان جاء رجل يريد

اخـذ مـالـي قـال فلا تعطه مالك، قال ارأيت ان قاتلني ، قال قاتله قال أرأيـت ان قتـلـنـي قـال فـانـت شهيد، قال أرأيت ان قتلته قال هو في النار." (اخرجه مسلم : رقم ١٤٠)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے بتائیے کہ کوئی شخص میرا مال مجھ سے چھیننا چاہے تو میرے لئے کیا حکم ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا مال اس کو مت دو، تو دوبارہ عرض کی کہ اگر وہ مجھ سے قتال کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا تو بھی قتال کر، پھر عرض کیا اگر وہ مجھے قتل کردے تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ تو شہید ہوگا عرض کیا کہ اگر میں ڈاکو کو قتل کردوں تو کیا ہوگا، ارشاد فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

وفـي الحديث الصحيح : من قتل دون ماله فهو شهيد، ومن قتل دون دمه أي دفاعاً عن نفسه فهو شهيد، ومن قتل دون اهله اى دفاعا عن عرضه فهو شهيد .

(اخرجه ابو داؤد : ٤٧٧٢ ، والترمذی : ١٤٢١ وقال حسن صحيح ، فقه المعاملات)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ شہید ہے، اور جو شخص اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے، اور جو شخص اپنے اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا گیا وہ بھی شہید ہے۔ (ترمذی ، ابو داؤد)

غصب شدہ مال کسی کے پاس مل جائے اس کا حکم:

اگر اپنا غصب شدہ مال کسی کے پاس صحیح حالت میں مل جائے تو شرعاً اسکو حق حاصل ہے کہ اس سے واپس لے لے اگر چہ اس نے غصب کرنے والے سے خریدا ہو، کیوں کہ جس وقت غاصب ڈاکو یہ مال فروخت کر رہا تھا اس مال کا مالک نہیں تھا، لہٰذا یہ بیع منعقد ہی نہیں ہوئی، لہٰذا مالک اپنا مال اسی طرح واپس حاصل کرلے باقی یہ شخص غاصب سے ادا کردہ قیمت واپس لے لے۔

عن ابی هريرة رضي الله عنه ، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال من ادرك ماله بعينه عند رجل او انسان قد افلس ، فهو احق به من غيره .

(اخرجه البخاری : ۲/ ۵۸ ، باب اذا وجد ماله عند مفلس فهو احق به)

وجاء فی حدیث آخر : من وجد عین ماله عند رجل فهو احق به، ویتبع البیع من باعه ، ای یرجع مشتری علی من باعه المتاع فیسترد الثمن منه. (اخرجه ابوداؤد والنسائی ، فقه المعاملات)

غصب در غصب کا حکم:

ایک شخص نے دوسرے کا مال غصب کیا پھر دوسرے ڈاکو نے اس پر ڈاکہ ڈالا، مثلاً کسی کی گاڑی تھی ایک شخص اس سے چھین کر لے گیا، لیکن دوسرے ڈاکو نے اس سے چھین لیا پھر اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گئی یا کسی وجہ سے قابل استعمال نہیں رہی تو مالک کو شرعاً حق حاصل ہے کہ اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے دونوں میں سے جس سے چاہے ضمان وصول کر سکتا ہے۔

لو غصب شخص متاع انسان أو سیارته فجاء شخص آخر فغصب هذا المتاع من الغاصب أو اغتصب السیارة أو الدابة ، ثم هلك فی یده فمن یضمن هذا المغصوب اتفق فقهاء المذاهب الاربعة علی أن المالك بالخیار ان شاء ضمن الغاصب الاول لو جود فعل الغصب منه، فهو المتعدی الاول وان شاء ضمن الغاصب الثانی.

(فقه المعاملات)

احکام اللقطة

معمولی چیزوں کا حکم:

اگر کسی کو گمشدہ چیز مل جائے اور وہ ایسی حقیر چیز ہے کہ مالک خود اس کو تلاش نہیں کرے گا، مثلاً ایک کھجور یا ایک روپیہ ہے یا ایک پیاز یا کوئی انگور کا دانہ، خیال یہی ہے کہ یہ اللہ کی نعمت یوں ہی ضائع ہو جائے گی، تو اسکو اٹھا کر کسی کو دیدے یا خود استعمال کر لے۔

کما فی روایة البخاری عن انس رضی اللّٰه عنه انه قال " مر النبی صلی اللّٰه علیه وسلم بتمرة فی الطریق فقال لولا انی اخاف ان تکون من الصدقة لاکلتها " .

(اخرجه البخاری : ۲/ ٦٣ ، باب اذا وجد تمرة فی الطریق)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا کسی راستہ پر گذر ہوا ایک کھجور پڑی ہوئی ملی تو ارشاد فرمایا کہ اگر یہ خوف نہ ہوتا کہ یہ کھجور صدقہ کی ہے تو اس کو اٹھا کر کھالیتا۔

وعن جابر رضی اللّٰه عنه قال" رخص لنا رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی العطاء ، والسوط والحبل واشاهه یلتقطه الرجل ینتفع به" . (اخرجه ابوداؤد واحمد)

کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی ملنے کا حکم:

اگر کوئی قیمتی چیز پڑی ہوئی مل جائے ،اور اس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ مالک خود ہی واپس آکر اٹھا لے گا،تو چھوڑ دی جائے اور اگر یہ خیال ہو کہ اگر میں نے نہیں اٹھایا تو ضائع ہوجائے گی ،یا کوئی خائن شخص یا چور اٹھا لے گا مالک تک نہیں پہنچ پائے گی ایسی صورت میں حفاظت کی نیت سے اٹھانا واجب ہے۔

کما فی کتاب الاختیار قال : اللقطة اسم للمال الملقوطه واخذها افضل لئلا تصل الیها یدخائنة ، وان خاف ضیاعها فواجب اخذها ، صیانة لحق الناس عن الضیاع، وان یخاف علی نفسه الطمع فیها، وترك التعریف والرد، فالترك اولیٰ، وهی امانة فی ید الملتقط .

(الاختیار لتعلیل المختار : ۳/ ۳۲)

لقطہ کی تعریف اعلانا کرنا واجب ہے:

اگر کوئی پڑی ہوئی چیز حفاظت کی نیت سے اٹھالے تو اس پر واجب ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کا اعلان کرے،مساجد کے دروازے پر یا بازاروں میں اعلانات لگائے ،اخبارات میں اشتہار شائع کرے،اگر مالک مل جائے اور علامات سے یقین یا ظن غالب حاصل ہوجائے کہ یہی شخص اس چیز کا مالک ہے،تو اس کے حوالے کردینا لازم ہے،اگر حوالہ نہیں کیا تو یہ شخص غاصب شمار ہوگا انکار کے بعد اگر ہلاک ہوجائے تو ضمان لازم ہوگا۔

عن زید بن خالد الجهنی أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم سئل عن اللقطة فقال : عرفها سنة فان جاء احد یخبرك بها، ای فادفعها الیه،

والا فاستنفقها . (صحیح البخاری : ۲/ ٦٣)

لقطہ کے استعمال کا حکم:

ملی ہوئی چیز کے بارے میں ہر ممکن طریقہ سے اعلان کرنے کے باوجود مالک نہ مل سکے تو شرعاً لازم ہے کہ اس کو فقراء پر صدقہ کردے اگر عزیز واقارب میں سے کوئی فقیر ہو مثلاً والدین بھائی بہنیں وغیرہ جن پر صدقہ ہوسکتا ہے اسی طرح دیگر فقراء، ومساکین پر بھی، خود اس کا استعمال کرنا جائز نہیں۔

لو رد النهی فی الحديث : لا يحل مال امرئ مسلم الا بطيب نفس منه . (الترغيب والترهيب)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں'' ہاں البتہ اگر وہ خود فقیر ہو تو خود بھی استعمال کرسکتا ہے۔

ملی ہوئی چیز صدقہ کرنے کے بعد مالک نکل آئے:

اگر اعلان کے بعد مالک نہ مل سکا اس لئے صدقہ کردیا یا فقیر ہونے کی بناء پر خود استعمال کرلیا اس کے بعد مالک نکل آیا، تو اب مالک کو اختیار ہوگا کہ صدقہ پر راضی رہے یا اٹھانے والے سے تاوان وصول کرے۔

قال العلامة الحصكفی رحمه الله : فينتفع بها لو فقيرا والا تصدق بها على الفقير ولو على اصله وفرعه وعرسه فان جاء مالكها بعد التصدق خير بين اجازة فعله ولو بعد هلاكها فله ثوابها او تضمينه . (رد المحتار : ٤/ ٧٩ ، كتاب القطة)

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا واقعہ:

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ریل کے ذریعہ سفر فرما رہے تھے سیٹ پر چند رفقاء اور بھی تھے قریب میں ایک مسافر سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا، اس کے ہاتھ سے ایک بوٹی گرگئی اس نے جوتی سے اس کو سیٹ کے نیچے کردیا، حضرت نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہورہی ہے اور یہ نعمت ضائع ہورہی ہے تو اس کو اٹھایا اور ایک رفیق سفر سے فرمایا کہ اس کو پانی سے دھولیں چنانچہ جب اس کو دھو کر صاف کرلیا تو حضرت نے خود

کھانے کا ارادہ فرمایا لیکن ساتھی نے خود کھانے کی اجازت مانگی تو حضرت نے اجازت دیدی۔

اس سے سبق حاصل ہوا کہ اگر کوئی چیز ضائع ہو رہی ہو تو اس کو ضائع ہونے سے بچانا چاہئے، ورنہ نعمت الٰہی کی ناقدری ہوگی تو مزاج شریعت کے خلاف ہے۔

کافر کے لقطہ کا حکم:

زید مثلاً کسی کافر کا مقروض تھا اب وہ قرض خواہ ملک چھوڑ کر دوسرے ملک چلا گیا اب اس کا کوئی پتہ نہیں کہاں چلا گیا، تو اس کا قرض کیسے ادا کیا جائے؟ اس بارے میں حکم یہ ہے کہ اولاً خط وکتابت یا دیگر ممکنہ ذرائع سے قرض خواہ یا اس کے ورثہ کا پتہ لگانے کی کوشش کرے، انتہائی کوشش کے بعد جب مایوسی ہو تو اس رقم کو صدقہ کردے، اس صورت میں اصل حکم تو بیت المال میں جمع کرانے کا ہے، مگر چونکہ حکومت اسلامیہ نہ ہونے کی وجہ سے بیت المال مفقود ہے، اس لئے فقراء پر تصدق کردے۔

وفی الهندية قال: كل لقطة يعلم انها لذمي لاينبغي أن يتصدق ولكن يصرف الى بيت المال لنوائب المسلمين كذا في الراجية.

(عالمگیریة: ٦/ ٢٩٠ ومثله في الشامية: ٤/ ٢٧٩، ماخوذ از احسن الفتاوی: ٦/ ٣٨٩)

گھڑی ساز کو گھڑی دے کر واپس نہیں آیا:

اگر کوئی گھڑی ساز ہے یا کاریگر یا دھوبی یا درزی یا کوئی دیگر ایسا شخص جو لوگوں کی مختلف چیزوں کی مرمت کرتا ہے، لوگ اپنی پرانی چیزیں مرمت کے لئے چھوڑ جاتے ہیں یا دھونے کے لئے کپڑا دے جاتے ہیں، اس کے بعد واپس نہیں آتے، تو ایسی صورت میں اگر مالکان کی آمد سے مایوسی ہو جائے اور مزید پڑے رہنے سے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو ان گھڑیوں کو یا کپڑے وغیرہ کو صدقہ کردیا جائے خود استعمال کرنا جائز نہیں۔ (ماخوذ از کتب فقہ)

مسجد کی حدود میں کوئی چیز گم ہو جائے:

جو چیز مسجد سے باہر یا مسجد میں گم ہوئی ہو، یا کہیں ملی ہو، اس کا اعلان مسجد میں کرنا صحیح نہیں کیوں کہ مساجد اللہ تعالیٰ کی عبادات، نماز، تلاوت ذکر وعظ ونصیحت وغیرہ کے لئے بنائی جاتی ہیں ان مقاصد سے ہٹ کر کوئی کام انجام دینا درست نہیں، لہٰذا مساجد میں گمشدہ چیزوں کا اعلان نہ کیا جائے، البتہ مسجد سے باہر دروازے میں کھڑے ہو کر یا اشتہار وغیرہ کے ذریعہ باہر ہی اعلان کیا

جائے۔

قال الامام المرغینانی رحمه الله : وینبغی ان یعرفها فی الموضع الذی اصابها وفی المجامع ، فان ذلك اقرب الی الوصول الی صاحبها . (هداية : ١ / ٦١٤)

وقال الشیخ محمد زکریا کاندهلوی رحمه الله : واما مکانه وهو الاسواق وابواب المساجد والجوامع فی الوقت الذی یجتمعون فیه کادبار الصلوٰة فی المساجد وکذلك فی مجامع الناس لان المقصود اشاعة ذکرها، واظهارها لیظهر علیها صاحبها فیجب تحری مجامع الناس ولا ینشد ها فی المساجد لان المسجد لم یبن لهذا . (او جز المسالك : ٢٩٨/١٣)

لاوارث بچہ کا حکم:

اگر کوئی بچہ مل جائے، اس کو نہ اٹھانے کی صورت میں ضائع ہونے یا مرنے کا خوف نہ ہوتب بھی اٹھالینا مستحب ہے، اور اگر ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتو اٹھانا واجب ہے نہ اٹھایا اور بچہ مرگیا تو یہ شخص گناہ گار ہوگا۔

قال فی الاختیار : التقاط صغار بنی آدم مفروض ، ان علم انه یهلك ان لم یأخذه بان کان فی مفازة ، صحراء أو بئر أو ارض مسبعة، دفعا للهلاك عنه، فان غلب علی ظنه دفع الهلاك ، بأن کان فی مصر ، أو قریة ، فأخذه مندوب ، لمافیه من السعی فی احیاء نفس محترمة . (الاختیار لتعلیل المختار : ٤٩/٣)

لاوارث بچہ کا نان نفقہ:

لاوارث بچہ کا نان نفقہ سرکاری بیت المال کے ذمہ ہے، حکومت کی طرف سے اس کا صحیح انتظام نہ ہونے کی صورت میں عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس کی دیکھ بھال، پرورش اور تعلیم وتربیت کا انتظام کرے۔

وانما وجبت نفقته فی بیت المال لانه لاولی له ، والسلطان ولی

من لا ولی له، فینفق علیه من بیت المال ، لان ماله یکون لبیت المال عند الوفاة فیکون الغرم بالغنم ۔ (فقه المعاملات)

وقال فی کتاب اعلاء السنن : واذا فرض الامام نفقته من بیت المال ، ثم انفق الملتقط علیه شیئا من نفسه لحاجة اللقیط الیه ونوی الرجوع فله ان یرجع فی نفقته ولم یکن متبرعاً .

(اعلاء السنن : ۱۳/۳)

مسلمانوں کے لاوارث بچوں کو کافروں کی پرورش میں نہ دیا جائے:

مسلمانوں کے لاوارث بچوں کی پرورش مسلمانوں ہی کی ذمہ داری ہے اگر کوئی کافر انفرادی طور پر مسلمان لاوارث بچوں کی پرورش کرنا چاہے یا کسی ادارہ کی شکل میں مسلمان بچوں کی تعلیم وتربیت کرنا چاہے تو شرعاً یہ جائز نہیں، کیوں کہ کسی کافر کی تربیت میں پرورش پا کر اس کا مسلمان باقی رہنا بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ سرکاری سطح پر یا غیر سرکاری سطح طور پر ایسے ادارے وجود میں لائیں جن میں ایسے بچوں کی دینی نہج پر تربیت ہو سکے کافروں کے حوالہ کرنا یہ ایمانی غیرت کے خلاف ہے اور ناجائز ہے۔

لیس للکافر التقاط طفل مسلم، لانه لا ولایة لکافر علی مسلم، ولانه لا یؤمن ان یفتنه ویعلمه الکفر بل الظاهر أنه یربیه علی دینه ، وینشأ علی ذالك فیصبح کافراً،لان تاثیر الوالد علی الولد کبیر فهو سبب لانه أو کفرة ، کما قال رسول الله صلی الله علیه وسلم کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه ، أو ینصرانه ، أو یمحسانه .

(اخرجه البخاری فی کتاب القدر)

لاوارث بچہ کا مسلمان یا کافر ہونا:

جو لاوارث بچہ مسلمانوں کے علاقہ میں مل جائے وہ مسلمان سمجھا جائے گا، اور اس کی پرورش کا حقدار مسلمان ہوگا جو بچہ کافر ذمیوں کے علاقہ میں پایا جائے وہ ذمی ہوگا، کوئی ذمی اگر اس کی پرورش کرنا چاہے تو اس کو دیا جائے، ورنہ مسلمان ہی پرورش کرے، امید ہے کہ بڑا ہو کر مسلمان ہی ہوگا، یہ اس کے لئے ابدی سعادت کا ذریعہ بنے گا۔

كما فى ملتقى الابحر نقلا عن المبسوط قال : واذا وجد اللقيط فى مصر من امصار المسلمين ، أوفى قرية من قراهم فهو مسلم وان وجد فى قرية من قرى اهل الذمة او فى بيعة او كنيسة كان ذميا .

(ملتقى الابحر : ۱/ ۳۸۱)

لاوارث بچہ کے نسب کا حکم:

لاوارث بچہ مجہول النسب ہوگا، خود سے اس کو کسی کی نسبت کرنا صحیح نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے نسب کا دعویدار نکل آئے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس سے نسب ثابت ہوگا یہ اسی مدعی کا بچہ کہلائے گا، اس میں بچہ کا فائدہ ہے تعلیم وتربیت کے علاوہ اس سے بغیر باپ کے ہونے کا عار بھی دور ہو جائے گا، اگر کئی دعویدار نکل آئے تو جس کے پاس گواہ موجود ہوگا اسی کو دیدیا جائے گا۔

فاذا ادعى انسان نسبة اللقيط اليه ، تصح دعواه ويثبت النسب منه ، ولو من غير بينة ، حرمة للطفل ، لانه يتشرف بالنسب ويتعير بفقده، وبهذه الدعوىٰ يثبت انه ابوه، فيكون احق بولده ، وله أن ينتزعه من الملتقط .

(انظرالاختيار : ۳/ ۳۰ ، ملتقى الابحر : ۱/ ۳۸۰)

سیلاب میں بہتی ہوئی چیزوں کا حکم

اگر کوئی چیز سیلاب میں بہتی ہوئی آجائے، کرسی، برتن اور کوئی کھانے پینے اور پہننے کی چیز تو شرعاً اس کو استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں تفصیل ہے، جو چیز سیلاب میں بہہ کر آئے، ان کی دو قسمیں ہیں:

(۱) معمولی چیز جن کی کوئی اہمیت نہ ہو کہ مالک ان کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے، تو ان کی تشہیر واعلان کی ضرورت نہیں ویسے اٹھا کر استعمال کر سکتے ہیں، ہاں البتہ مالک آکر مطالبہ کرے تو دینا پڑے گی۔

(۲) قیمتی چیزیں جن کی مالک تلاش کرے، اگر ایسی چیزیں ملیں تو ان کا اعلان اور تشہیر ضروری ہے، مالک کا انتظار کیا جائے اگر مالک کے آنے کی توقع نہ ہو، یا ان کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو کسی غریب پر صدقہ کر دیا جائے، خود اگر حاجت مند ہو تو خود بھی استعمال کر سکتا ہے لیکن اگر مالک

آکر طلب کرے تو دینا ہوگا، اگر اس وقت غریب کے پاس صحیح سالم موجود ہوتو واپس بھی لی جاسکتی ہے۔

حطب وجد فی الماء ان له قیمة فلقطة والافحلال لاخذه کسائر المباحات الاصلیة درر، قال فی الشامیة تحت قوله ان له قیمة فلقطة وقیل انه کالتفاح یجده فی الماء وذکر فی شرح الوهبانیة ضابطا وهوأن مالا یسرع الیه الفساد ولا یعتاد رمیة لحطب وخشب ان کانت له قیمة ولو جمعه من اماکن متفرقه فی الصحیح کما لو وجد جوزة ثم اخری، وهکذا حتی بلغ له قیمة بخلاف تفاح وکمثری فی نهر جار فانه یجوز اخذه وان کثر لانه مما یفسد لو ترك الخ.

(شامیة کتاب اللقطة مطلب فیمن وجد حطبا فی نهر جار الخ: ٢٨٤/٤)

جہاز والے پانی میں سامان ڈال دیں:

اگر جہاز والے پانی میں سامان ڈال کر چلے جائیں اور مقصد یہ ہو کہ جو چاہے لے جائے، تو اس کو لینا اور استعمال کرنا جائز ہے لیکن اگر واپس آنے کا ارادہ ہو یا اعلان کردے کہ ہم واپس اٹھائیں گے تو اس کو اٹھا کر لانا اور استعمال کرنا جائز نہیں۔

الفی شیئاً وقال من اخذه فهو له فلمن سمعه أو بلغه ذلك القول له أن یأخذه، والا لم یملکه لانه اخذه اعانة لمالکه لیرده.

(ردالمحتار: ٢٨٥/٤، کتاب اللقطة)

احکام المفقود

یعنی جو شخص اپنے گھر سے اس طرح غائب ہوگیا کہ اب نہ اس کی رہائش کا علم، نہ ہی حیات وموت کا علم ہے اس کے مال کا کیا حکم ہوگا اس میں تصرف کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اس کی بیوی کا کیا حکم ہے؟ دونوں احکام کو تفصیل سے ذکر کریں اس میں۔

مفقود کی وراثت کا حکم:

جب مفقود کی عمر نوے برس ہوجائے تو اپنے مال میں مردہ سمجھا جائے گا اور اس کا مال اس

وقت موجود وارثوں پر تقسیم ہوگا، نوے برس کی عمر ہونے سے پہلے اپنے مال میں زندہ ہے لہٰذا اس زمانہ میں کوئی شخص اس کے مال میں دخیل کار نہیں ہوسکتا اور غیر کے مال میں جب سے مفقود ہوا اس وقت سے مردہ متصور ہوگا یعنی اگر کوئی شخص اس کے مفقود ہونے کے بعد مر گیا تو یہ مفقود اس کا وارث نہ ہوگا اگر چہ مفقود کی عمر ابھی تک نوے برس نہ ہوئی ہو مگر چوں کہ غیر کے مال میں بھی مردہ ہونے کا حکم نوے برس کی عمر کے بعد ہی ظاہر ہوتا ہے، اس سے پہلے اس کے واپس آکر وارث بن جانے کا احتمال ہے اس لئے اس میت کے مال سے مفقود کا حصہ امانت رکھا جائے گا، اگر واپس آگیا تو اس کو مل جائے گا ورنہ نوے برس عمر ہوجانے کے بعد جس میت کے مال سے امانت رکھا تھا اسی کے وارثوں پر لوٹا دیا جائے گا، جو میت کے انتقال کے وقت زندہ تھے موجودہ وارثوں کا اعتبار نہیں اور نہ ہی مفقود کے وارثوں کا اس میں کوئی حق ہے۔

قال العلامة التمر تاشی رحمه الله تعالیٰ : هو (ای المفقود) غائب لم یدر احی هو فیتوقع ام میت اودع اللحد البلقع وهو فی حق نفسه حی فلا ینکح عرسه غیره ولا یقسم ماله (الی قوله) ومیت فی حق غیره فلا یرث من غیره ولا یستحق ما اوصی له اذا مات الموصی بل یوقف قسطه الی موت اقرانه فی بلده علی المذهب فان ظهر قبله حیا فله ذلك وبعده یحکم بموته فی حق ماله یوم علم ذلك فتعتد عرسه للموت ویقسم ماله بین من یرثه الآن وفی مال غیره من حین فقد فیرد الموقوف له الی من یرث مورثه عند موته :

وقال العلامة ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : (قوله وهو فی حق نفسه حی) مقابله قوله الآتی ومیت فی حق غیره وحاصله انه یعتبر حیًّا فی حق الاحکام التی تضره وهی المتوقفة علی ثبوت موته ویعتبر میّتاً فیما ینفعه ویضر غیره وهو ما یتوقف علی حیاته لان الاصل انه حی وانه الی الآن کذلك استصحاباً بالحال السابق والاستصحاب حجة ضعیفة تصلح للدفع لا للاثبات ای تصلح لدفع ما لیس بثابت لا لاثباته . (رد المحتار : ۳/۳۲۸)

وقال ایضاً : (قوله علی المذهب) وقیل بقدر بتسعین سنة بتقدیم التاء من حین ولادته واختاره فی الكنز وهو الارفق هداية وعليه الفتوى .

(ردالمحتار : ۳۳۱/۳ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۳۰۸/۹)

زوجۂ مفقود کا حکم:

سوال : شریعت مطہرہ کا حکم اس بارہ میں کیا ہے؟ کہ ایک شخص مدت سے غائب اور لا پتہ ہے اس کی موت یا زندگی کی کوئی خبر نہیں، ایسی حالت میں اس کی بیوی کے لئے دوسری جگہ نکاح کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب : مفقود کی بیوی کے لئے بہتر ہے کہ شوہر کی عمر نوے برس ہونے تک صبر کرے، اگر صبر نہ کر سکے تو ایسی مجبوری میں مذہب مالکی کے مطابق یہ عورت کسی حاکم مسلم کے ہاں دعویٰ پیش کرے اور گواہوں سے مفقود کے ساتھ تا حال قیام نکاح حاکم کے پاس ثابت کرے، نکاح کے اصل شاہد ضروری نہیں بلکہ شہادت بالتسامع کافی ہے، یعنی نکاح کی عام شہرت سن کر نکاح پر شہادت دی جاسکتی ہے، اس کے بعد شوہر کے مفقود ہونے کی شہادت شرعیہ پیش کرے، پھر حاکم اس شخص کی بقدر ممکن تلاش کرے جہاں اس کے جانے کا ظنِ غالب ہو وہاں آدمی بھیجے، اور جہاں صرف احتمال ہو خط وغیرہ سے تحقیق کرے اخبار میں اشتہار دینا مفید معلوم ہو تو یہ بھی کر لے، بہر کیف ہر ممکن صورت سے اس کی تلاش میں پوری کوشش کرے، حاکم کے پاس دعویٰ پیش ہونے سے قبل عورت کی طرف سے یا کسی دوسرے شخص کی طرف سے تلاش کی کوشش کافی نہیں، بلکہ دعویٰ پیش ہونے کے بعد ضروری ہے کہ حاکم خود پوری کوشش کرے، دوسروں کے کہنے پر ہرگز اعتبار نہ کرے، جب حاکم شوہر کے ملنے سے بالکل ناامید ہو جائے تو عورت کو چار سال کی مہلت دے، اگر ان چار سالوں میں بھی اس کی کوئی خبر نہ آئی تو عورت حاکم کے پاس دوبارہ درخواست پیش کر کے نکاح فسخ کروالے، اور شوہر کو مردہ تصور کر کے عدت موت چار ماہ دس دن گذار کر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، اگر کہیں حاکم مسلم موجود نہ ہو یا وہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرتا ہو تو جماعۃ المسلمین بطریق مذکورہ فسخ نکاح کا فیصلہ کر سکتی ہے، مگر اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

(1) جماعت کے ارکان کم از کم تین ہوں۔

(2) سب ارکان عادل یعنی پکے دیندار ہوں۔

(3) سب ارکان یا کم از کم ایک رکن ایسا عالم ہو جو شہادت و قضاء کے احکام شریعت میں ماہر ہو۔

(4) فسخِ نکاح کا فیصلہ سب ارکان اتفاق رائے سے کریں۔

(5) شوہر کی تلاش کے وقت مصارف عورت خود برداشت کرے، اگر وہ عاجز ہو تو حکومت برداشت کرے۔

اگر دوسری جگہ نکاح کرنے کے بعد پہلا شوہر واپس آ گیا تو اس کے احکام یہ ہیں:

(1) یہ عورت اسی پہلے شوہر کو ملے گی، جدید نکاح کی بھی ضرورت نہیں، پہلا نکاح ہی کافی ہے۔

(2) اگر دوسرے شوہر نے خلوتِ صحیحہ کی ہو تو کل مہر دے گا، اور عورت پر عدتِ طلاق واجب ہوگی، اگر خلوۃ صحیحہ نہ ہوئی تو نہ مہر واجب ہوگا نہ عدت۔

(3) عدت پہلے شوہر کے پاس گذارے گی، مگر عدت گذارنے تک پہلے شوہر سے جماع کرنا جائز نہیں۔

(4) اگر دوسرے شوہر سے حالتِ نکاح میں یا فسخِ نکاح کے بعد عدت گذرنے سے قبل اولاد پیدا ہو گئی تو یہ دوسرے شوہر کی ہوگی۔

وھذا خلص ما ھو مشروح فی الحیلة الناجزة للحیلة العاجزة .

تنبیہ:

حیلۂ ناجزہ میں جہاں نکاح پر شہادت کا ذکر ہے اس سے صرف انعقاد نکاح مراد نہیں بلکہ قیام نکاح پر شہادت ضروری ہے۔

لمافی الروایة الاولیٰ من العلامة سعید بن صدیق الفلاتی، مانصه بعد ان یثبت الزوجیة وغیبة الزوج والبقاء فی العصمة الی الآن اھ وفی الالحاق من العلامة الفاھاشم فان الزوجة تثبت بشاھدین ان فلاناً زوجھا وغائب عنھا اھ وفی الروایة الثانیة والعشرین من العلامة الفلاتی کلفھا اثبات الزوجیة اھ . فقط واللّٰہ تعالیٰ اعلم

فائدہ:

ہم دستخط کنندگان ذیل کے نزدیک مناسب یہ ہے کہ حیلۂ ناجزہ (ص ۶۱) میں بعنوان ''فائدہ'' جو الفاظ لکھے گئے ہیں ان کو مندرجہ ذیل الفاظ میں تبدیل کر دیا جائے۔ زوجۂ مفقود کے لئے قاضی کی عدالت میں فسخ نکاح کی درخواست کے بعد جو مزید چار سال کے انتظار کا حکم دیا گیا ہے یہ اس صورت میں ہے کہ عورت کے لئے نفقہ اور گذارہ کا بھی کچھ انتظام ہو اور عصمت وعفت کے ساتھ یہ مدت گذارنے پر قدرت بھی ہو، اور اگر اس کے نفقہ اور گذارہ کا کوئی انتظام نہ ہو نہ شوہر کے مال سے کسی عزیز وقریب یا حکومت کے تکلفل سے اور خود بھی محنت ومزدوری پردہ اور عفت کے ساتھ کر کے اپنا گذارہ نہیں کر سکتی، تو جب تک صبر کر سکے شوہر کا انتظار کرے جسکی مدت ایک ماہ سے کم نہ ہو اس کے بعد [1] قاضی یا کسی مسلمان حاکم کی عدالت میں فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کرے۔

اور اگر نفقہ اور گذارہ کا تو انتظام ہے مگر بغیر شوہر کے رہنے میں اپنی عفت وعصمت کا اندیشہ قوی ہے تو سال بھر صبر کرنے کے بعد [2] قاضی کی طرف مرافعہ کرے اور دونوں صورتوں میں گواہوں کے ذریعہ یہ ثابت کرے کہ [3] اس کا شوہر فلاں اتنی مدت سے غائب ہے اور اس [4] نے اس کے لئے کوئی نان نفقہ نہیں چھوڑا، اور نہ کسی کو نفقہ کا ضامن بنایا اور اس نے اپنا نفقہ اُس کو معاف بھی نہیں کیا، اور اس پر عورت حلف بھی کرے اور دوسری صورت یعنی عفت کے خطرہ کی حالت میں قسم کھائے کہ میں بغیر شوہر کے اپنی عفت قائم نہیں رکھ سکتی، قاضی کے پاس جب یہ ثبوت مکمل ہو جائے تو قاضی اس کو کہہ دے کہ میں نے تمہارا نکاح فسخ کر دیا، یا شوہر کی طرف سے طلاق دیدی یا خود عورت کو اختیار دیدے کہ وہ اپنے نفس پر طلاق واقع کرے اور جب عورت طلاق اپنے پر واقع کرے تو قاضی اس طلاق [5] کو نافذ کر دے۔

(۲،۱) دیکھیے علامہ اتفاہاشم کی عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں ایک ماہ اور خشیت زنا کی صورت میں ایک سال کا انتظار حاکم کے فیصلہ سے پہلے کافی ہے، خواہ مرافعہ سے پہلے اتنی مدت گذری ہو یا نہیں، مگر مذہب مالکی کو اختیار کرنے کے لئے جس ضرورت کا تحقق شرط ہے اس کو متیقن کرنے کے لئے ہم پہلے بہ چکے ہیں کہ اس مدت میں کچھ اضافہ کر دیا قرین احتیاط ہے چنانچہ یہاں ایک ماہ یا ایک سال کی مدت قبل المرافعہ مقرر کی گئی ہے تا کہ مقدمہ کی کاروائی کی مدت اس کے علاوہ ہو، البتہ اگر حاکم کے فیصلہ تک بھی اتنی مدت گذر گئی تو فتوی جواز کا دیا جائیگا۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ	رشید احمد	محمد عاشق الٰہی عفا اللہ عنہ
خادم دار العلوم کراچی نمبر ۱۴	محمد رفیع عثمانی	محمد تقی عثمانی

(۳) یعنی اس کا شوہر ہونا بھی ثابت کرے اور غائب ہونا بھی۔ (۴) یعنی صورت اولیٰ میں۔

(۵) یہ طلاق رجعی ہوگی، اگر عدت کے اندر یا اس کے بعد مفقود آجائے تو اس کے احکام وہی ہوں گے جو غائب غیر مفقود کے ہیں۔ رشید احمد

(کمافی فتوی العلامۃ الفاهاسم من الالحاق حیلۂ ناجرہ: ص ۱۱۰)

شوہر بحری سفر میں گم ہوگیا:

سوال: ایک شخص بحری سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لانچ پر سوار ہو کر حج سے واپس آرہا تھا رات کو لانچ کے ایک طرف تختہ پر جو تقریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا تھا اس پر سویا ہوا تھا، ساتھیوں نے اور ناخدا نے بھی منع کیا مگر باز نہ آیا، صبح اٹھے تو یہ شخص مفقود تھا، اب اس کے مال اور بیوی کا شرعاً کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

جواب: قرائن سے اس کی موت متیقن ہے، لہٰذا اس کا ترکہ تقسیم کردیا جائے، اور اس کی بیوی عدتِ موت گذار کر دوسرا نکاح کرسکتی ہے، قرائن مفیدۂ یقین بحکم شہادت ہیں۔

کما فی کتاب الدعوی من شرح التنویر و نصه والسابع قرینة قاطعة کان ظهر من دار خالیة انسان خائف بسکین متلوث بدم فدخلوها فوراً فرأ و مذبوحاً لحینه اخذ به اذ لا یمتری احد انه قاتله (ردالمحتار: ۵۸۷/٤) وفی الشامیة فی اول کتاب القضاء فی بیان طریق القاضی الی الحکم، اوالقرائن الوضعة التی تصیر الامر فی حین المقطوع به فقد قالوا لو ظهر انسان من دار بیده سکین وهو متلوث بالدم سریع الحرکة علیه اثر الخوف فد خلوا الدار علی الفور فوجدوا فیها انساناً مذبوحاً بذلك الوقت ولم یوجدا حدغیر ذلك الخارج فانه یؤخذبه وهو ظاهر ای لا یمتری فی انه قاتله والقول بانه ذبحه اخر ثم تسور الحائط او انه ذبح نفسه احتمال بعید لا یلتفت الیه اذ لم ینشأ عن دلیل . (رد المحتار: ٤/٤٣١)

شامیہ کتاب المفقود میں جو مذکور ہے کہ "سفر بحر میں گم ہونے والے کا مدت طویلہ تک انتظار کرکے حاکم اس کی موت کا حکم کرے" اس سے وہ شخص مراد ہے جس کے ساحل پر پہنچنے کا علم نہ ہو، صورتِ سوال میں تو وسط بحر ہی میں فقدان کا علم ہوگیا ہے جو موجب یقین ہے اور احتمال بعید ناشی بلا دلیل کا اعتبار نہیں۔

کما صرح به شارح التنویر و ابن عابدین رحمهما الله تعالیٰ فیما

ذکرنا من نصهما .

ایسا بعید احتمال تو بالمشافہ میت کے دیکھنے کے بعد بھی موجود ہوتا ہے کہ شاید موت نہ ہو بلکہ سکتہ ہو، لہٰذا اس صورت میں نہ مدت طویلہ تک انتظار کی ضرورت ہے اور نہ حکمِ حاکم کی۔

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ : جـ ٥)

وقال علی رضی اللّٰہ عنه لا یحق للزوجة فسخ الزواج وتنتظر حتی تعلم احی ام میت . (اخرجه عبد الرزاق فی المصنف)

وهذا مذهب الجمهور فی المفقود الذی لا یغلب هلاکه کالذی یخرج للحج، او لطلب العلم ، او التجارة .

وقال عمر رضی اللّٰہ عنه : ایما امرأة فقدت زوجها، فلم تدر این هو؟ فانها تنتظر اربع سنین ، ثم تعتد اربعة اشهر وعشرًا ، ثم تحل، ای تتزوج . (رواه عنه البخاری والشافعی)

وهذا مذهب مالك والشافعی فی المفقود الذی یغلب هلاکه، کفقید البحر ، والمعرکة، فانه فی الغالب یکون قد استشهد ، ان لم یرجع الی اهله فی اربع سنین . (فقه المعاملات)

عہدۂ قضاء کے احکام

عہدۂ قضاء کا مقصد ہے ملکی باشندوں کو انصاف فراہم کرنا، ہر ظالم کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا، اور مظلوم کی دادرسی کرنا، یہ انسان کی اجتماعی زندگی کا حصۂ لازمی ہونے کے علاوہ عظیم عبادت بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو بعثت انبیاء کے مقاصد میں داخل فرمایا۔

کما یقول اللّٰہ جل ثناؤہ : ﴿ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط ﴾

(سورة الحدید : ٢٤٠)

ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

انصاف فراہم کرنا اور انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا اہم ترین عبادت ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ سرور کائنات ﷺ نے جن سات خوش نصیبوں کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملنے کی بشارت دی ان میں ایک امام عادل بھی ہے۔

کما قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : "سبعة یظلهم اللّٰہ تحت ظل عرشه یوم لا ظل الا ظله،امام عادل" (الحدیث اخرجه البخاری ومسلم ، وانظر نص الحدیث بکامله . (مسلم : ۱/۷۱۵)

وقال تعالیٰ لخاتم الانبیاء والمرسلین ﴿ فاحکم بینهم بما انزل اللّٰہ ولا تتبع اهواء هم عما جاء ك من الحق ﴾ (سورة المائدة : ٤٨)

ارشاد باری تعالیٰ ہے: یہ کہ تو ان کے باہمی معاملات میں اسی بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ کرا اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عمل درآمد نہ کیجئے۔

اسلام میں پہلا قاضی:

دین اسلام میں قضاء کا فریضہ سب سے پہلے سرور کائنات ﷺ نے انجام دیا، صحابہ کرامؓ اپنے معاملات کا فیصلہ کروانے کے لئے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے آپ ﷺ ان میں انصاف قائم فرماتے تھے، مظلوم کی دادرسی فرماتے، ظالم کو ظلم سے روکتے تھے، حتی کہ یہود مدینہ بھی اپنے مقدمات کا فیصلہ آپ ﷺ سے کرواتے تھے، امت کو عدالت اسلامی سے آگاہ کر کے انصاف کرنا یہ بھی آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری تھی۔

لقوله تعالیٰ : ﴿ انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللّٰہ ولا تکن للخائنین خصیما ﴾ (سورة النساء : ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ کے پاس کتاب بھیجی ہے واقع کے موافق تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فیصلہ فرمانے سے پہلے فریقین کو وعظ فرماتے غلط دعویٰ کر کے مال جیتنے اور اس کے استعمال حرام ہونے کے بارے میں ڈراتے تھے۔

کقوله علیه السلام : "انما انا بشر وانکم تختصمون الی ولعل بعضکم أن یکون الحن، ای ابلغ بحجته فاقضی له علی نحو ما اسمع

فمن قضيت له من حق أخيه شيئاً فلا يأخذه فانما هي قطعة من النار اقتطعهاله". (اخرجه البخاري: ٦٨/٢، ومسلم رقم: ١٧١٣)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک انسان ہوں تم اپنے مقدمات فیصلے کے لئے میرے پاس لاتے ہو، ہوسکتا ہے تم میں سے بعض زور بیان کا مالک ہو، اس کی بنیاد پر فریق مخالف پر غالب آئے اور میں دلائل کی بنیاد پر فیصلہ سنادوں، تو یاد رکھو اگر میں نے (غلط دلائل سن کر) دوسرے کے مال کا تمہارے حق میں فیصلہ سنا دیا، تو ہرگز ناحق مال قبول نہ کر کیوں کہ وہ مال نہیں بلکہ درحقیقت آگ کا ٹکڑا ہے، جس کا تمہارے حق میں فیصلہ ہوا۔ (بخاری)

خلاصہ یہ کہ آپ ﷺ کی موجودگی میں فیصلہ آپ ﷺ فرماتے تھے، ہاں البتہ مدینۃ الرسول ﷺ سے دور دراز علاقوں کے لئے آپ ﷺ نے دوسرے صحابہ کو بھی ذمہ دار بنا کر بھیجا ہے، مکہ مکرمہ میں ''عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر فرمایا، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں مقرر فرمایا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانگی کے وقت ان شاندار الفاظ میں وصیت فرمائی۔

"يا على اذا جلس اليك الخصمان، فلا تقض بينهما حتى تسمع الاخر، كما سمعت من الاول، فانك اذا فعلت ذلك، تبين لك القضاء اى ظهر لك وجه الحق فى الحكم فتحكم بالعدل."

(اخرجه الترمذى رقم: ١٣٣١، ابو داؤد فى الاقضية رقم: ٣٥٨٢)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کا طریقہ سکھاتے ہوئے فرمایا کہ ''اے علی جب تمہارے سامنے دو فریق مقدمہ لیکر حاضر ہوں، تو جب تک دونوں کی پوری بات سن نہ لو اس وقت تک کوئی فیصلہ مت کرو، کیوں کہ پوری بات سننے کے بعد انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا آسان ہوگا۔

(ترمذی، ابو داؤد)

عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

قاضی اور جج بننے کا مقصد رشوت لیکر ناحق فیصلہ کرنا اور دنیا جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد، ظلم کو دفع کرنا اہل حقوق کو حقوق پہنچانا ہے۔

امام مسلمین پر لازم ہے کہ ہر شہر میں ایک قاضی مقرر کرے اب پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا عہدۂ قضاء قبول کرنا چاہئے یا نہیں؟ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے اگر کوئی ذمہ دار شخص

اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف فراہم کرنے کا فریضہ انجام دے تو سب کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

اگر کوئی بھی اس عہد کو قبول نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے اگر کسی شہر میں اس منصب کے قابل ایک ہی شخص موجود ہو اور کوئی ہو ہی نہیں تو شرعاً اس کے ذمہ لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرے اور انصاف قائم کرے۔

قاضی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی نصرت:

جب قاضی حق کے مطابق فیصلہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اس کے ساتھ ہوتی ہے، جب قاضی ظلم کرنے لگتا ہے اور خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے، شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔

کما جاء فی الحدیث انه علیه السلام قال : " ان الله مع القاضی مالم یجر ای یظلم فاذا جار تخلی الله عنه ولزمه الشیطان ."

(ترمذی : ۱۳۳۰ ، کتاب الاحکام وقال حدیث حسن)

عہدۂ قضاء کا طالب ہونا خطرناک ہے:

جو شخص شرعی احکام سے ناواقف ہو اور حق وباطل کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، صرف منصب اور دنیا کمانے کی لالچ میں قضاء کے عہدہ پر فائز ہوتا ہے اور پھر خلاف شرع فیصلہ کرتا ہے رشوت لے کر ظالم کی حمایت کرتا ہے، ایسے شخص کے لئے بہت بڑی تباہی ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سرور کائنات ﷺ نے فرمایا:

" من ولی القضاء فقد ذبح بغیر سکین ."

یعنی جس نے قضاء کا منصب قبول کیا گویا کہ اس کو بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔

(ابو داؤد ، ترمذی : ۱۳۲۵)

قاضی کی تین قسمیں:

وقال رسول الله صلی الله علیه وسلم : " القضاة ثلاثة واحدة فی الجنة واثنان فی النار، فاما الذی فی الجنة فرجل عرف الحق فقضیٰ به، ورجل عرف الحق فجار فی الحکم ، فهو فی النار، ورجل قضی

للناس علی جهل فهو فی النار ."

(اخرجه ابو داؤد رقم: ۳۵۷۳، والترمذی رقم: ۱۳۲۳، والحاکم وصححه)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قاضی کی تین قسمیں ہیں ایک جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں:

(۱) جنت میں جانے والا قاضی وہ ہے جو حق کو سمجھ کر انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے۔

(۲) وہ قاضی جو حق کو جاننے کے باجود ظلم کرے وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

(۳) جو قاضی حق و باطل کے درمیان تمیز کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس لئے غلط فیصلہ کرتا ہے وہ بھی جہنمی ہے۔

عہدۂ قضاء باعث حسرت ہے:

قاضی اگر انصاف فراہم نہ کر سکے یا اپنے بارے میں خطرہ ہو کہ اس منصب کو قبول کرنے کے بعد جادۂ حق پر قائم نہیں رہ سکوں گا اس پر لازم ہے کہ اس عہدہ کو قبول کرنے سے اجتناب کرے۔

کما جاء فی الحدیث : عن ابی ذرر ضی اللّٰہعنه انه قال ، قلت یا رسول اللّٰہ الاتستعملنی ؟ فقال یا اباذر ، انك ضعیف و انها امانة، وانها یوم القیامة خزی وندامةالامن اخذ بحقها و ادی الذی علیه فیها. (اخرجه مسلم رقم: ۱۸۲۵)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) کیا آپ مجھے قضاء کا عہدہ عطاء نہیں فرماتے؟ تو ارشاد فرمایا کہ اے ابوذر! تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے متحمل نہیں ہو، کیوں کہ یہ ایک امانت ہے اور یہ قیامت کے دن ندامت اور شرمندگی کا باعث ہے، ہاں البتہ کوئی شخص اہلیت کا حامل ہو وہ اس عہدہ کو قبول کرے اور پھر اسکا حق اداء کرے تو اور بات ہے۔ (مسلم)

" وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم : من ابتغی القضاء وسأل فیه شفعاء ، ای وسط من یومله الی القضاء وکل الی نفسه ، ومن اکره علیه انزل اللّٰہ علیه ملکا یسدده . "

(أخرجه الترمذي في كتاب الاحكام رقم : ١٣٢٤، وقال هذا حديث حسن غريب)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص عہدۂ قضاء کا طلب گار ہو اور اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے سفارش کار کے ذریعہ کوشش کرے اور اس عہدہ پر فائز ہو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوتی بلکہ اسکو ویسے ہی چھوڑ دیا جاتا ہے ہاں البتہ جس کے اندر اہلیت ہو اور اس کی طلب کے بغیر اس کو یہ منصب دیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی تائید اور مدد کے لئے ایک فرشتہ مقرر فرماتے ہیں جو اس کی مدد کرتا ہے۔

عہدۂ قضاء سے انکار کا ایک واقعہ:

بڑے بڑے علماء اور فقہاء قضاء کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اس خوف سے کہ کہیں فیصلہ کرنے میں کسی فریق پر ظلم نہ ہو جائے، نیز ایسا نہ ہو کہ سلاطین وقت کے دباؤ میں آ کر کہیں خلاف شرع فیصلہ کرنا پڑ جائے، چنانچہ کتابوں میں مذکور ہے کہ حیوۃ بن شریح کو مصر کے قضاء کا عہدہ پیش کیا گیا، تو انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا، تو والی مصر نے ان کو قتل کی دھمکی دی کہ اگر یہ عہدہ قبول نہ تو قتل کر دیا جائے گا، جب شریح نے یہ صورت حال دیکھی تو اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور امیر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ یہ میرے گھر کی چابی ہے یہ لے لیں کیوں کہ اب میں اپنے رب سے ملنے کا خواہش مند ہوں، چنانچہ جب امیر نے حضرت شریح رحمہ اللہ کے اس عزم کو دیکھا تو انہیں چھوڑ دیا۔ (فقه السنة : ٣/٤٠٠)

اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ جس شخص کو فیصلہ کے وقت ظلم صادر ہونے کا خوف ہو اس کے حق میں عہدۂ قضاء قبول کرنا مکروہ ہے۔

قاضی بننے کی شرائط:

قاضی کے اندر بنیادی طور پر ان شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

١ ...... اسلام

٢ ...... عقل

٣ ...... بلوغ

٤ ...... احکام شرع سے واقف ہونا

٥ ...... اعضاء و جوارح، صحیح سالم ہوں اور متوازن مزاج کا مالک ہو۔

قاضی کو اعمال صالحہ کا پابند ہونا چاہئے نیز صلاح وتقویٰ کی صفت سے متصف ہونا بھی قاضی کی شان کے زیادہ لائق ہے، اسی وجہ سے فقہاء نے فرمایا کہ فاسق کو عہدۂ قضاء پر فائز نہیں کرنا چاہئے، تاہم اگر کسی فاسق مسلمان کو قاضی بنادیا گیا اور اس نے قرآن وسنت کے دائرہ میں رہتے ہوئے فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ نافذ ہوگا اگر شرع کے خلاف فیصلہ صادر کرے تو وہ نافذ نہ ہوگا۔

قال في ملتقى الابحر : ولاينبغي أن يكون القاضي فظا غليظا، جبارا عنيدا، وينبغي أن يكون موثوقا به، في دينه وعفافه، وعقله وصلاحه، وفهمه وعلمه بالسنة والآثار، ووجوه الفقه، كذا المغني . (ملتقى الابحر : ٢/ ٦٩)

٦ قاضی کے حکم نافذ ہونے کے لئے یہ خوبی ضروری ہے، کہ وہ حاکم وقت کا مقرر کردہ ہوتا کہ حاکم کی قوت سے قاضی کا فیصلہ نافذ ہو اور فریقین قاضی کا فیصلہ نہ مانیں تو حاکم زبردستی منوائے۔

حکم (ثالث) کے فیصلہ کی حیثیت:

جو شخص حکومت کی طرف سے قاضی مقرر نہ ہو بلکہ فریقین آپس کی رضامندی سے اس کو مقرر کریں تو شرعاً ایسے شخص کو "حَکَم" کہا جاتا ہے، اب جبکہ دونوں نے آپس کی رضامندی سے حَکَم مقرر کردیا اور فیصلہ صادر ہونے تک ان کے فیصلہ پر راضی ہو تو اس فیصلہ کو ماننا ضروری ہے، اگرچہ اس کی حیثیت صلح کی ہے۔ اسی طرح مفتی جو فتویٰ صادر کرتا ہے اس کی حیثیت بھی قاضی کے فیصلہ کی طرح نہیں، کیوں کہ وہ شریعت کا حکم بیان کرتا ہے فیصلہ نہیں کرتا۔

ظالم حاکم کی طرف سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

ظالم حاکم کی طرف سے قضاء کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے، ہاں البتہ خلاف شرع فیصلہ کرنا، کسی پر ظلم کرنا، ناحق کسی کا مال وصول کرنا، جائز نہیں بعض تابعین نے حجاج بن یوسف ثقفی کی طرف سے قضاء کا عہدہ قبول کیا تھا، حالانکہ اس کا ظالم ہونا مسلّم ہے۔

کافر حاکم کی طرف سے عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم:

جب مسلمانوں کے کسی علاقہ پر کفار کا غلبہ ہوجائے مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنا فیصلہ کسی مسلمان قاضی سے کروانے کے لئے ایک مسلمان قاضی کا مطالبہ کریں، جب مسلمانوں کے مطالبہ

پر یا حاکم کافر اپنی مرضی سے کسی مسلمان کو قاضی مقرر کردے، تو مسلمان قاضی کے لئے کافر حاکم کی طرف سے عہدہ قضاء قبول کرنا جائز ہے، عہدۂ قضاء قبول کرنے کے بعد مسلمانوں کے مقدمات کا فیصلہ قرآن وحدیث کے مطابق کرے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : ذكر في اول جامع الفصولين كل مصر فيه والى مسلم من جهة الكفار يجوز منه اقامة الجمع والاعياد واخذ الخراج وتقليد القضاء تزويج الايامى لاستيلاء المسلم عليهم واما اطاعة الكفرة فهي موادعة ومخادعة واما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والاعياد ويصير القاضي قاضيا بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب والى مسلم اهـ وقد منا نحوه في باب الجمعة عن البزازية .

(رد المحتار : ٤/١٧٥ ، قبيل باب العشر والخراج)

حاکم اور قاضی کے لئے آداب:

قاضی اور حاکم کو چاہئے کہ مندرجہ ذیل باتوں کی پابندی کرے۔

(۱) حسن خلق کو اپنائے، نیز وقار بھی ہو کہ کسی کام میں ایسی جلد بازی نہ کرے جو اس کے ہلکے پن غصہ سے مغلوب ہونے پر دلالت کرے، فریقین میں سے کسی کے ساتھ ہنسی مذاق نہ کرے، نہ کوئی ایسی بات کرے جو کم درجہ کے لوگوں کی ہوتی ہے، نیز فریقین میں سے کسی کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کرے۔

(۲) عمدہ لباس اختیار کرے جو اہل فضل علماء کا لباس ہے۔

(۳) دونوں فریق کو ایک نظر سے دیکھے، دونوں کو ایک طرح کی نشست پر بٹھائے، کسی ایک طرف زیادہ نہ جھکے۔

(۴) جب تک فریقین کی بات سن نہ لے فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے۔

(۵) کسی ایک فریق کو دلیل کی تلقین نہ کرے، نہ ہی گواہی کا طریقہ سکھائے۔

(۶) عزیز واقارب کے علاوہ کسی ایسے شخص سے ہدیہ قبول نہ کرے کہ بعد میں مقدمہ فیصلہ کرکے فقط ہدیہ کی وجہ سے ان کی رعایت کرنی پڑے، خصوصاً مقدمہ کے دونوں فریق میں سے

کسی ایک سے ہدیہ قبول کرنا یہ رشوت کے حکم میں ہے،اس سے اجتناب لازم ہے۔

(هدایه : ۳/ ۱۱٤)

(۷) عمومی دعوت کے علاوہ کسی شخص کی خاص دعوت قبول نہ کرے جو محض قاضی صاحب کی خاطر کررہا ہو۔

(۸) جنازہ میں حاضر ہوا کرے، بیماروں کی عیادت کرے، کیوں کہ یہ حقوق المسلمین میں داخل ہے۔

" قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : حق المسلم على المسلم ست، قيل ما هن يا رسول الله، قال اذا لقيته فسلم عليه و اذا دعاك فاجبه، و اذا استنصحك اى طلب النصيحة فانصح له و اذا عطس فحمد الله فشمته ، و اذا مرض فعده ، و اذا مات فاتبعه " .

(اخرجه مسلم فی كتاب السلام رقم: ۲۱٦۲)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے دوسرے مسلمان پر چھ حقوق ہیں آپ ﷺ عرض کیا گیا یارسول اللہ (ﷺ) وہ حقوق کیا ہیں ،تو فرمایا:

(۱) جب کسی مسلمان سے ملاقات ہو تو اس کو سلام کیا جائے۔

(۲) وہ دعوت کرے تو اس کو قبول کرے۔

(۳) اگر وہ نصیحت طلب کرے تو اس کو نصیحت کرے۔

(٤) چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے، تو سننے والا یرحمک اللہ کہے۔

(۵) جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔

(٦) جب انتقال کر جائے تو جنازہ میں حاضر ہو اور قبرستان تک ساتھ چلے۔

(مسلم)

(۹) قاضی کو چاہئے کہ فیصلہ کے وقت شریعت کی مکمل پابندی کرے۔

(۱۰) فیصلہ کے وقت ہر اس بات سے دور رہے، جو اس کے دل کو مشغول کرے فکر کو مشوش کرے، لہذا غصہ کے وقت یا خوف کے وقت یا بھوک کی حالت میں یا پیشاب پاخانہ کے تقاضے کے وقت فیصلہ نہ کرے۔

كما روى في الحديث : لا يقضين حاكم بين اثنين وهو غضبان. (اخرجه البخارى فى الاحكام رقم : ٢٥٧١)

قال ابن دقيق العيد : وقد قال الفقهاء على الغضب كل ما يحصل به تغير الفكر كالجوع، والعطس المفرطين وغلبة النعاس، وسائر ما يتعلق به القلب، تعلقا يشغله عن استيفاء النظر ، وهو قياس فطنة . (نقلاً عن ملتقى الابحر : ٢/ ٧١)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک اہم خط:

ولعلنا ندرك أهمية القضاء ومكانة القضاء فى الاسلام، والمنهج الذى ينبغى أن يسلكه الحاكم فى حكمه، من تلك الرسالة العظيمة، التى أرسلها الفاروق "عمر"رضى الله عنه الى "أبى موسىٰ الأشعرى" وفيها النموذج الأكمل والدستور المحكم، الذى ينبغى أن يسير عليه القضاة فى جميع العصور والأزمان، فقد جاء فى تلك الرسالة ما نصُّه:

" بسم الله الرحمن الرحيم ، من عبد الله عمر بن الخطاب أمير المؤمنين الى " عبدالله بن قيس " اسم " أبى موسى الأشعرى " سلام الله عليك .

أما بعد : فان القضاء فريضة محكمة ، وسنّةٌ متّبعة، فافهم اذا أُدلى اليك، فانه لا ينفع كلام بحق لا نفاذله، آسِ،أى وَاسِ بين الناس فى وجهك وعدلك ومجلسك، حتى لا يطمع شريف فى حَيْفِكَ، أى ميلك معه لشرفه ، ولا ييأس ضعيف من عدلك .

البينة على من ادَّعى، واليمين على من أنكر، والصلحُ جائز بين المسلمين ، الا صلحا احل حراماً، أو حرَّم حلالاً! .

لا يمنعنَّك قضاءٌ قضيتَ به اليومَ فراجعتَ فيه عقلك، وهُديت فيه لرشدك ، أن ترجع الى الحقِ، فان الحقَّ قديمٌ، ومراجعةُ الحقِ خيرٌ

من التمادی فی الباطل .

الفهمَ الفهمَ فیما تردَّد فی صدرك ، مما لیس فی کتاب ولا سُنَّة، ثـم اعـرفِ الأشباهَ والنظائر، وقسِ الأمور عند ذلك، واعمد الی أقربها الی الله وأشبهها بالحقِ، المسلمون عدولٌ بعضُهم علی بعض، الَّا محدودًا فی حدٍ أو مجرَّباً علیه شهادة زور، أو متَّهماً فی ولاءٍ أو نسب، فان الله تولَّی منکم السرائر ، ودرأ أی دفع ، بالبیّنات والأیمان الحدودَا!

وایَّاك والقَلَق والضَّجَر، والتأذِّی بالخصوم، والتنکُّر عند الخصومات، فانَّ الحقَّ فی مواطن الحقِ، یُعْظِمُ اللّٰه به الأجر، ویُحسِنُ به الذُّخر، فمن صحَّتْ نیَّتُه، وأقبل علی نفسه، کفاه اللّٰه ما بینه وبین الناس ، ومن تخلَّق، أی أظهر، للناس بما یعلم اللّٰه أنه لیس من نفسه، شانَه اللّٰه، أی أ بغضه اللّٰه وأهانه، فما ظنُّك بثوابٍ من عند اللّٰه عزَّوجل، فی عاجل رزقه، وخزائن رحمته ، والسلام ."

هذه وصیة أمیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللّٰه عنه الی أحد قُضاته، وهی تفیض صدقاً، واخلاصاً، وروعةً وبیاناً، لسلوك الطریق الأمثل ، فی فصل الخصومات بین الناس ، لیسعد النا س فی حیاتهم ، ویأمنوا علی أموالهم وأرواحهم، فی ظلِّ شریعة اللّٰه الخالدة!! . (فقه المعاملات)

قاضی سے فیصلہ میں غلطی صادر ہونے کا حکم:

قاضی کے اندر قضاء کی اہلیت موجود ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کی مکمل کوشش کی، لیکن اس کے باوجود غلطی سے کوئی خلاف شرع فیصلہ ہوگیا اور مال حقدار کے بجائے دوسرے کو مل گیا تو ایسی صورت میں قاضی عنداللہ مجرم نہیں ہوگا۔

"عن عمر بن العاص رضی اللّٰه عنه أن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال : اذا اجتهد الحاکم فأصاب فله الاجران، وان اجتهد

فاخطافله اجر" .

(اخرجه البخاري في كتاب الاعتصام رقم : ٢٥٩٣، مسلم رقم : ١٧١٦ في الاقضية)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی حاکم اپنے اجتہاد سے فیصلہ کرے اور درست فیصلہ ثابت ہوتو ان کو دو اجر ملیں گے اور اگر خطاء اجتہادی واقع ہو جائے تب بھی ایک اجر ملے گا۔

(بخاری و مسلم)

لیکن یاد رہے کہ یہ ایسے قاضی کے لئے ہے جو قضاء کے اصول وضوابط سے مکمل واقف ہو احکام شرع کا استحضار رکھتا ہو، اس کے باوجود معاملہ سمجھنے میں غلطی واقع ہوئی تو یہ حکم ہے۔

قاضی کے غلط فیصلے سے حرام حلال نہیں ہوتا:

فقہاء امت کا اس پر اجماع ہے کہ قاضی اگر جھوٹی شہادت سن کر کسی کے حق میں غلط فیصلہ کردے یہ قضاء ظاہراً تو نافذ ہے، اس لئے مدعی علیہ کے ذمہ لازم ہوگا کہ مال مدعی کا حوالہ کردے ، لیکن باطناً عند اللہ یہ فیصلہ نافذ نہیں ہوگا، لہٰذا مدعی کے لئے اس مال کو لینا حرام ہوگا، اس کا استعمال بھی حرام ہوگا، اگر لے لیا تو واپس کرنا لازم ہے، کیوں کہ قاضی کے فیصلہ کردینے سے حرام حلال نہیں ہوتا۔

لما قال صلى الله عليه وسلم : انما انا بشر ، وانكم تختصمون الى ولعل بعضكم الحن، بحجته من بعض، فاقضى بنحو ما اسمع فمن قضيت له من حق اخيه شيئاً فلا يأخذ ه، فانّما اقطع له قطعة من النار . (بخاری رقم : ٢/ ٦٨ ، مسلم ١٧١٣ ، كتاب الاقضية)

وهذا الحديث حجة قاطعة، على أن حكم القاضي لا يجعل الحرام حلالا، فالشخص المبطل مؤاخذ ومعاقب عند الله حتى ولو حكم له القاضي، ولهذا قال الفقهاء، ان قضاء القاضي بالبينة الكاذبة، لا يبيح للمدعي أن يأخذ الحق، ولا يغير الواقع ، ويبقى الامر المدعىٰ على ملك صاحبه، وقد حكى الامام الشافعي الاجماع على ذالك، لم يخالف فيه احد، وقضاء القاضي ينفذ ظاهرًا لا باطناً أى لا يحل ديانة وان ثبت قضاءً . (فقه المعاملات)

فیصلہ سے پہلے مصالحت کی کوشش کرنا:

قاضی کے لئے یہ بات بھی مناسب ہے کہ فیصلہ سے پہلے فریقین میں صلح کرانے کی کوشش کرے، کیوں کہ صلح میں بہتری ہے، کیوں کہ قاضی کی ذمہ داری منازعت کا خاتمہ کرنا ہے، یہ صلح ہی کے ذریعے ہوسکتا ہے، اس لئے فیصلہ کسی فریق کے حق میں ہوتا ہے تو دوسرے کی مخالفت میں، اس سے آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے بغض اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ فلا جناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا، والصلح خير ﴾ (سورة النساء : ١٢٨)

كما فعل رسول الله صلى الله عليه وسلم : روى البخارى عن كعب بن مالك انه تقاضى من عبد الله بن ابى حدرد الاسلمى ، دينا له عليه فى عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المسجد، فارتفعت حتى سمعهما رسول الله صلى الله عليه وسلم وهوفى بيته فخرج اليهما حتى كشف سجف اى ستر حجرته ، فنادى يا كعب، فقال لبيك يارسول الله قال ضع من دينك هذا، فأومااليه اى الشطر، قال لقد فعلت يا رسول الله ، قال صلى الله عليه وسلم (لاخر) قم فاقضه .

(اخرجه البخارى : ٢/٦١ ، ومسلم رقم : ١٥٥٨ ، فى المساقاة)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاۃ مبارکہ میں مسجد نبوی میں انہوں نے عبداللہ بن ابی حدرد اسلمی رضی اللہ عنہ سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا دونوں کی آواز کچھ بلند ہوگئی، آپ ﷺ نے گھر میں آواز سنی تو حجرۂ مبارک سے پردہ ہٹا کر باہر تشریف لائے (چونکہ پہلے دونوں کی بات سن چکے تھے) اس لئے حضرت مالک سے فرمایا کہ صلح کرلو یعنی اپنا آدھا قرض معاف کردو حضرت مالک نے آپ ﷺ سفارش قبول کرلی تو آپ ﷺ دوسرے سے فرمایا کہ تم اب قرض ادا کردو۔

یہ ایک طرح کی سفارش ہے، اس پر بڑے اجر وثواب کا وعدہ ہے۔

كقوله تعالى : ﴿ من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها،

ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها ﴾ (سورة النساء : ٨٥)

ترجمہ: جو شخص اچھی سفارش کرے اسکو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے اس کو اس کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

قضاء علی الغیب کا حکم:

احناف کا اصل مسلک یہ ہے کہ اگر مدعا علیہ غائب ہو تو اس کی عدم موجودگی میں اس کے خلاف فیصلہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ فیصلہ کے وقت اس کا خود موجود ہونا یا اس کے وکیل کا موجود ہونا ضروری ہے، کیوں کہ ممکن ہے کہ غائب کے پاس کوئی ایسی دلیل موجود ہو جو مدعی کے دعویٰ کو باطل کردے۔

قال صاحب الهداية : ولا يقضى القاضي على غائب الا أن يحضر من يقوم مقامه، كالوكيل أو الوصي لأن العمل بالشهادة لقطع الخصومة والمنازعة ولا منازعة بدون الانكار ولم يوجد ولانه يحتمل الاقرار والانكار من الخصم، فيشتبه وجه القضاء .

(الهداية : ١٦٩/٣)

البتہ ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں جب حجت وگواہی سے قاضی کے سامنے دعویٰ ثابت ہو گیا تو قاضی کے لئے جائز ہے کہ غائب کے خلاف فیصلہ کرے۔

" واستدلا لهم بقصة " هند " امرأة ابى سيفان ، انها جاءت الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وقالت له،أن ابا سفيان رجل شحيح فهل يجوز لى أن اخذ من ماله بغير اذنه ؟فقال لها صلى الله عليه وسلم خذى مايكفيك وولدك بالمعروف ".

(طرف من حديث اخرجه البخاري ومسلم)

ہند زوجہ ابی سفیان نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی ابوسفیان بخیل آدمی ہے (یعنی خرچہ پورا نہیں) کیا میرے لیے بلا اجازت شوہر کے مال میں سے لے کر خرچ کرنا جائز ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بقدرِ ضرورت لے سکتی ہیں جو تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔

" وقالوا هذا قضاء على غائب وقد حكم لها رسول الله صلى الله عليه وسلم وزوجها غائب ."

فقد روى مالك فى المؤطا أن عمر رضى الله عنه قال اللغرماء من كان له دين فليأتنا غدًا، فانا بايعوا ماله ، وقاسموا ه بين غرمائه .

(انظر الموطا للامام مالك رحمه الله)

هذا حكم على الغائب فقد كان الرجل الذى قضى عليه يبيع ماله غائباً . (فقه المعاملات)

خلاصہ یہ ہے کہ مدعیٰ ثابت ہونے کی صورت میں ائمہ ثلاثہ کے ہاں قضاء علی الغائب جائز ہے، جبکہ احناف کے ہاں جائز نہیں، البتہ شدید مجبوری کی صورت میں احناف کے ہاں بھی غائب کے خلاف فیصلہ کرنا جائز ہے۔

مدعیٰ علیہ کی گرفتاری کا حکم:

مدعیٰ علیہ کے ذمہ حق ثابت ہونے کے بعد بھی اگر وہ اداء حق سے انکار کرے، تو قاضی اس کو اداء حق پر مجبور کرے گا، اگر پھر بھی انکار کرے تو اسکو گرفتار کر کے جیل میں بھیجا جائے گا، کیوں کہ وہ انکار کی وجہ سے ظالم ٹھہرا ظلم کا دفع کرنا حاکم کے ذمہ لازم ہے۔

" كقوله عليه السلام : ليُّ الواجد ، يُحلّ عرضَه وعقوبَته " .

(اخرجه البخارى تعليقا : ٤٦/٥ ، فى الاستقراض ، ابوداؤد رقم : ٣٦٢٨)

ومعنى الحديث إن مما طلة القادر على سداد الدين ظلم يبيح التكلم عليه وعقوبته وسبحته .

سزاء کی مدت:

اتنے عرصے تک قید میں رکھا جائے گا کہ اس سے گمان غالب حاصل ہو جائے کہ اگر اس کے پاس مال ہوتا تو ضرور قرض ادا کر کے قید کی مشقت سے جان چھڑا لیتا، اگر ایک مدت تک جیل کاٹنے کے باوجود قرض ادا نہ کرے تو اس کو چھوڑ دیا جائے گا البتہ صاحب حق اس کا تعاقب جاری رکھے گا جب اس کے پاس مال نظر آئے تو اس سے اپنے حق کا مطالبہ کرے گا۔

ومدة الحبس شهر او شهران ، وتقبل بينه الاعسار بعد الحبس

بالاجماع،واما قبل الحبس فلا تقبل والفارق بينهما أنه وجد بعد الحبس قرينة ، وهي تحمل شدة الحبس ومضايقه ، وذلك دليل اعساره . (انظر الاختيار لتعليل المختار : ٢/ ٩٠)

بیمار قیدی کا حکم:

جب قیدی جیل میں بیمار ہوجائے تو جیل کے اندر ہی علاج کروایا جائے گا اگر زیادہ بیمار ہوجائے تو پولیس کی نگرانی میں ہسپتال میں لاکر علاج کروایا جائے گا اور صحت یاب ہونے پر دوبارہ جیل بھیج دیا جائیگا، بشرطیکہ مالدار ہونا ثابت ہوجائے یا مدعی ثابت کردے کہ یہ تنگ دست نہیں۔

قاضی کے فیصلہ کے بغیر اپنا حق وصول کرنے کا حکم:

اگر دوسرے کے ذمہ حق ہے، لیکن کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے، اور مقروض انکاری ہے کہ میرے ذمہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے، ایسی صورت میں بھی بہتر تو یہی ہے کہ عدالت کے ذریعہ حق وصول کرنے کی کوشش کی جائے لیکن اگر ممکن نہ ہو تو کسی بھی مناسب حیلہ کے ذریعہ اپنا حق وصول کرنا جائز ہے، البتہ اس کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کرے نیز اپنے حق سے زائد وصول نہ کرے۔

اسلامی عدالت کا ایک انوکھا واقعہ:

اسلام میں قاضی کی عدالت میں امیر وغریب کی کوئی تفریق نہیں اسی طرح حاکم ومحکوم، رشتہ دار غیر رشتہ دار، باپ بیٹا سب کا ایک ہی حکم ہے کہ مظلوم کی دادرسی کی جائے گی اور ظالم کے ظلم کو دفع کیا جائے گا اگر مدعی علیہ حاکم وقت ہے یا اور کسی بڑے عہدہ پر فائز ہے ظلم ثابت ہونے یا اس کے خلاف دعویٰ بینہ سے ثابت ہونے پر قاضی اس کے خلاف بھی فیصلہ سنائے گا، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قاضی شریح کا مشہور واقعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

أخرج الامام أبو نعيم في الحلية هذا الخبر العجيب ، قال :

" وجد علي بن أبي طالب رضي الله عنه، درعاً له عند يهودي ، كان قد التقطها من الطريق، فقال له علي درعي سقطت عن جمل لي أورق، أي أحمر، فقال له اليهودي ، درعي وهي في يدي!! .

ثم قال له اليهودي : بيني وبينك قاضي المسلمين .

فأتوا " شريحا " فلما رأىٰ علياً قد أقبل ، وسع له فى المجلس ، فقال شريح : ماتشاء يا أمير المؤمنين !؟

قال : درعى سقطت عن جمل لى أورق ، فالتقطها هذا اليهودى!

فقال شريح : ما تقول يا يهودى ؟قال : درعى وفى يدى !!

فقال شريح : صدقت يا أمير المؤمنين ، انها لدرعك ، ولكن لا بد من البينة ، فأتنى بشاهدين يشهدان لك بها !

فدعا على رضى الله عنه مولاه ، أى مملوكه، قنبر، ودعا الحسن بن على ، فشهد أنها درعه .

فقال شريح : اماشهادة مولاك فقد أجزناها، أى قبلناها،وأما شهادة ابنك فلا نجيزها! يريد أنها لا تقبل بسبب صلة القرابة ، لأن شهادة الولد لوالده ، أو الوالد لولده غير جائزة، لوجود شبهة التحيز .

فقال على : أصلح الله أمرك ، أما سمعت عمر بن الخطاب يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " الحسن والحسين سيداشباب اهل الجنة ".

(ترمذى كتاب المناقب رقم : ٣٧٦٨،من رواية ابى سعيد خدرى)

قال شريح : اللهم نعم!!قال على : أفلا تقبل شهادة سيدا شباب أهل الجنة ؟!فأصر القاضى على عدم قبول شهادته !

فقال على لليهودى : اذهب فخذ الدرع!!

فقال اليهودى : عجباً، أمير المؤمنين جاء معى الى قاضى المسلمين ، فقضىٰ لى عليه، ورضى بحكمه وقضائه !!

ثم قال اليهودى : صدقت والله يا أمير المؤمنين .

انها لدرعك سقطت عن جمل لك، والتقطتها أنا اشهد أن لا اله الا الله وأن محمدًا رسول الله ، فوهبها له على رضى الله عنه ،

واجازه على اعترافه ووصله بتسع مائة درهم اكرامالہ، وقتل معه يوم صفين.

(انظر كتاب الحلية لابی نعيم فقد ذكره فيه هذه القصة العجيبة)

ابونعیم نے ''حلیۃ الاولیاء'' میں نقل فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک زرہ گر گئی تھی جو ایک یہودی نے اٹھالی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب اپنی زرہ یہودی کے پاس دیکھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ زرہ میری ہے اونٹ سے گر گئی تھی تو نے اٹھالی، اور یہودی نے کہا یہ تو میری زرہ ہے میرے قبضہ میں ہے۔ پھر یہودی نے کہا کہ عدالت میں چلتے ہیں، چنانچہ دونوں وقت کے مشہور قاضی شریح کے پاس پہنچے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عدالت میں قاضی کے سامنے اپنا دعویٰ دائر کرایا کہ میری ایک زرہ میرے سرخ اونٹ سے گر گئی تو اس یہودی نے اٹھالی اور واپس نہیں دے رہا ہے قاضی یہودی سے پوچھا کہ کیا تو اس نے کہا یہ تو میری زرہ ہے چنانچہ میرے قبضہ میں ہے۔

قاضی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے گواہ پیش کرنے کو کہا تو انہوں نے اپنے غلام اور اپنا بیٹا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا، قاضی نے کہا غلام کی گواہی تو قبول ہے لیکن بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول نہیں اس لیے کوئی اور گواہ پیش کریں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اور تو نہیں ہے، یہ حسن ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے جنت میں جوانوں کے سردار ہونے کی بشارت دی ہے، تب بھی قاضی نے ان کی گواہی قبول نہیں کی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ یہودی کے حوالہ کردی، جب یہودی نے اس مساوات اور عدل وانصاف کو دیکھا کہ امیر المؤمنین کے مقابلہ میں ایک یہودی کی بات سنی گئی اور امیر المؤمنین کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ ہوگیا تو فوراً انہوں نے کہا امیر المؤمنین یہ زرہ آپ کی ہے۔ اور کہا ''اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمد عبده ورسوله'' جب وہ مسلمان ہوگیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زرہ بھی ان کے حوالہ کردی اور مزید انعام بھی دیا پھر وہ پکا مسلمان ہوگیا، یہاں تک کہ جنگِ صفین میں آپ رضی اللہ عنہ کی معیت میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔ (حلیۃ الاولیاء لابی نعیم)

عقل مند وہوشیار قاضی:

قاضی کے لئے عقل مند ہوشیار اور معاملہ فہم ہونا ضروری ہے تاکہ عقل وفہم کے ذریعہ اور مدعی

اور مدعا علیہ سے مختلف سوالات کے ذریعہ حق کو واضح کر سکے، خصوصاً حدود وقصاص وغیرہ معاملات میں دیکھے کہ گواہوں کا بیان دعویٰ کے موافق ہے یا دعویٰ اور بیان میں تضاد ہے کیوں کہ شہادت کی بناء پر حدود ساقط ہو جاتے ہیں۔

"لقوله عليه السلام : ادرأوا الحدود بالشبهات ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله ، فان الامام لأن يخطئ في العفو، خير من ان يخطئ في العقوبة ." (اخرجه الترمذي : ١٤٣٤)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، حدود میں شبہات پیدا ہو جائے، تو حتی المقدور حدود کو دفع کرنے کی کوشش کرو، اگر نفاذ حد سے بچنے کا کوئی راستہ نظر آئے تو مجرم کو چھوڑ دو، کیوں کہ امام کا غلطی سے معاف کر دینا، غلطی سے سزاء دینے سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

واقعات:

(۱) گواہوں کو متفرق کر کے ہر ایک سے الگ الگ گواہی حاصل کرنا تا کہ ان کے بیانات کے درمیان، اتفاق یا تضاد کو پرکھا جا سکے، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ کتابوں میں مذکور ہے کہ ایک جماعت نے ان کے پاس آ کر شہادت دی کہ فلاں شخص نے ایک عورت سے زنا کیا ہے، تو انہوں نے ہر گواہ سے الگ الگ گواہی لی تو ایک نے کہا کہ اس عورت نے ایک جوان کے ساتھ زنا کیا، سیب کے درخت کے نیچے، دوسرے نے گواہی دی کہ اس نے ایک جوان کیساتھ زنا کیا امرود کے درخت کے نیچے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے جھوٹ کو پہچان لیا۔

(التلخيص الحبير : ٢/٤٩٦)

(۲) مروی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ دو عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو لیکر جنگل میں گئیں وہاں بچوں کو ایک جگہ رکھ کر اپنا اپنا کام کر رہی تھیں اتنے میں ایک بھیڑیا نمودار ہوا اور ایک بچہ لیکر غائب ہو گیا اب جو بچہ موجود تھا اس پر دونوں عورتوں کا جھگڑا ہو گیا ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ یہ بچہ میرا ہے اور بھیڑیا تمہارا بچہ لے گیا ہے، دونوں حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو انہوں نے طرفین کی باتیں سن کر بڑی کے حق میں فیصلہ سنایا۔

پھر دونوں عورتوں کا حضرت سلیمان علیہ السلام پر گذر ہوا اور ان کو واقعات اور داؤد علیہ السلام

کے فیصلہ سے مطلع کیا، تو سلیمان علیہ السلام نے ایک چھری منگوائی اور فرمایا کہ میں بچہ کو درمیان سے دو ٹکڑے کر کے دونوں کو ایک ایک ٹکڑا دیتا ہوں، یہ بات سن کر بڑی نے رضامندی کا اظہار کیا ،لیکن چھوٹی عورت جو درحقیقت اس بچہ کی ماں تھی اس نے فوراً کہا بچہ اسی کو دیدیں لیکن اس کو ٹکڑا نہ کریں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس عورت کی کامل شفقت ومحبت کو دیکھ کر اندازہ لگالیا کہ یہ اسی خاتون کا بچہ ہے چنانچہ اسی کے حوالہ کردیا، یہ ہے قاضی کی ذکاوت اور ہوشیاری، دلائل اور شہادت کے علاوہ فہم وفراست بھی ہو جس سے حق واضح ہوجائے۔

فیصلہ کرنے کا طریقہ:

جب کوئی شخص دوسرے کے ذمہ حق کا دعویٰ کرے یا کسی مال کی ملکیت کا دعویٰ کرے، تو شرعاً اس کو مکلّف بنایا جائے گا، کہ اپنے دعویٰ کو شہادت ودلائل سے ثابت کرے، محض دعویٰ کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا کہ جس نے جو دعویٰ کرلیا وہ سن کر اس کے حق میں فیصلہ کردیا جائے۔

"لقوله عليه السلام : لو يعطى الناس بدعواهم ، لادعى رجال اموال قوم ودماء هم ، لكن البينة على المدعي واليمين على من انكر"

(اخرجه البيهقي واحمد بسند حسن واخرجه مسلم في صحيحه رقم : ١٧١١، بلفظ ولكن اليمين على المدعى عليه)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلے قاضی مدعی اور مدعا علیہ کا تعین کرے، پھر مدعی علیہ سے سوال کرے کہ اس دعویٰ کے متعلق وہ اقرار کرتا ہے یا انکار اگر اقرار کرے تو فیصلہ کردے اور اگر انکار کرے تو مدعی سے کہا جائے ثبوت پیش کرے، دستاویز اور گواہوں کو حاضر کرے، اگر ثبوت پیش کردیا تب بھی اس کے حق میں فیصلہ ہوگا اور اگر ثبوت موجود نہیں ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ مدعی علیہ قسم اٹھائے تو اس کو قسم دی جائے گی۔

مدعی علیہ کے ذمہ قسم ہے:

مدعی علیہ اگر قسم اٹھالے تو مقدمہ خارج کردیا جائے گا، مدعی اب کوئی بات نہیں کرسکتا ہے۔

"لقوله عليه السلام : للمدعى الكندى ، الك بينة ؟ قلت لا ، قال فلك يمينه ، ليس لك غير ذلك " (اخرجه البخارى : ٤/٢٤١ ، من حديث الاشعث بن قيس قال : فى نزلت : ﴿ ان الذين يشترون بعهد

اللّٰہ و ایمانھم ثمناً قلیلا ﴾ الآیة ، کان بینی و بین رجل خصومة فی بئر فقال النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم : الك بینة ؟ قلت لا، قال : فلك یمینه، لیس لك الا ذلك ، وھذه روایة الصحیحین .

اب اگر مدعیٰ علیہ قسم اٹھانے سے انکار کردے، صراحت کے ساتھ انکار کرے یا قاضی کی طرف سے مطالبہ کے باوجود خاموشی اختیار کرے، تو بہتر یہ ہے کہ تین مرتبہ قسم دی جائے، پھر بھی انکار کرے تو مدعا علیہ پر دعویٰ لازم کردیا جائے گا اور اس کے خلاف فیصلہ کردیا جائے گا۔

مدعی کی قسم پر فیصلہ کرنا جائز نہیں:

اگر مدعی علیہ خود قسم اٹھانے کے بجائے یہ کہے کہ مدعی خود قسم اٹھائے تو میں مان جاؤں گا تو مدعی کو قسم نہیں دی جائے گی، نہ ہی مدعی کی قسم پر فیصلہ کیا جائے گا، کیوں رسول اللہ ﷺ نے دعویٰ کے فیصلے کا یہ قانون مقرر فرمادیا ہے کہ گواہ مدعی کے ذمہ ہے اور قسم مدعا علیہ کے ذمہ۔

" لقوله علیه السلام : البینة علی المدعی و الیمین علی المدعی علیه ". (انظر الاختیار : ۲/ ۱۱٤ ، والحدیث اخرجه البخاری)

یعنی مدعی کے پاس گواہ نہ ہونے کی صورت میں مدعا علیہ کے ذمہ قسم ہے، باقی بعض فقہاء کا قول ہے کہ اگر مدعی کے پاس ایک گواہ موجود ہو اور قسم بھی اٹھائے، تو یہ قسم دوسرے گواہ کے قائم مقام ہوگی، لہٰذا ایک گواہ اور قسم کی بنیاد پر فیصلہ ہوگا۔ ان کا مستدل حدیث ابن عباس ہے۔

" ان النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم قضی بالیمین مع الشاهد " .

(مسلم رقم : ۱۷۱۲)

لیکن جمہور فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ایک خاص واقعہ کے متعلق تھی، اس سے عام قانون کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا جو مذکورہ بالا حدیث بخاری میں موجود ہے۔

تنبیہ:

یاد رہے کہ مدعا علیہ کی قسم پر دعویٰ کا خارج ہونا، یہ صرف تجارتی معاملات یا مال کے متعلق دعووں میں ہوگا، باقی حدود وقصاص وغیرہ میں مدعا علیہ کی قسم براءت کے لئے کافی نہیں۔

ثبوت دعویٰ کا ایک طریقہ مدعیٰ علیہ کا اقرار ہے:

اگر مدعی علیہ یا مجرم خود جرم کا اعتراف کرلے یہ معترف کے حق ثبوت جرم کی بڑی دلیل ہے،

اب مزید کسی گواہ کی ضرورت نہیں ہے، اس کے اعتراف پر فیصلہ کیا جائے گا۔

قال تعالیٰ : ﴿ بل الانسان علی نفسه بصیرة ﴾

(سورة القیامة : ١٤)

وقال تعالیٰ : ﴿ کونوا قوامین بالقسط شهداء لله ولو علی انفسکم ﴾ (سورة النساء : ١٣٥)

ترجمہ: "اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر اگرچہ اپنی ہی ذات کے خلاف ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔"

وقوله علیه : واغد یا انیس علی امرأة هذا ، فان اعترفت فارجمها. (هذا طرف من حدیث اخرجه البخاری : ١٢١/٢١)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ ، قصاص ، حدود ، اور دیگر مالی مقدمات کا فیصلہ اقرار کی بنیاد پر فرماتے تھے۔

البتہ یہ اقرار صرف اقرار کرنے والے کے حق میں ہی معتبر ہوگا، دوسرے کے حق میں نہیں، نیز اقرار کے معتبر ہونے کے لئے شرعاً یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے اندر اقرار کی اہلیت موجود ہو، کہ وہ عاقل بالغ ہو، اور اس کا ہوش وحواس درست ہو، اس اقرار کے لئے اس پر کوئی جَبر نہ ہو۔

اقرار سے رجوع کرنے کا حکم:

اگر کوئی لوگوں کے حقوق کے متعلق اقرار کرے، مثلاً قرض، وصیت، یا وراثت وغیرہ تو اقرار کے بعد ان حقوق کی ادائیگی اس کے ذمہ لازم ہو جائے گی، رجوع کرنا صحیح نہیں۔

اور اگر حقوق اللہ میں سے کسی حق کے متعلق اقرار کرے مثلاً زنا کا اقرار کرے یا شراب نوشی وغیرہ کا تو اس کے اقرار پر حد جاری کیا جائے گا، لیکن اگر وہ حد جاری ہونے سے پہلے یا دوران حد اپنے اقرار سے رجوع کر لیتا ہے تو حد ساقط ہو جائے گا، کیوں کہ رجوع کی وجہ سے اس میں شبہ پیدا ہو گیا، اور حدود اللہ شبہ سے ساقط ہو جاتے ہیں۔

"لقوله علیه السلام : ادرؤا الحدود بالشبهات ما استطعتم فان الامام لأن یخطئ فی العفو، خیر من أن یخطئ فی العقوبة".

(اخرجه الترمذی رقم : ١٤٢٤ فی کتاب الحدود)

وفی روایه فی الصحیح : " أن النبی صلی اللّٰه علیه وسلم قال لما عز حین اقر عنده بالزنا ، لعلك قبلت، أو غمزت، أو نظرت ، قال عنده لا بل زنیت ، فعند ذلك أمر برجمه " .

(اخرجه البخاری فی کتاب الحدود : ٤/١٧٧)

وروی عن عمر بن الخطاب أنه خطب فی الناس فقال : والرجم فی کتاب اللّٰه حق علی من زنا، اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینة ، أو کان الحبل ، أو الاعتراف .

(صحیح البخاری فی کتاب الحدود : ٤/١٨٠)

مرض الموت میں اقرار کا حکم:

اگر کوئی شخص حالت صحت میں کسی وارث کے حق میں قرض کا اقرار کرے کہ میرے ذمہ فلاں کے اتنا قرض ہے تو اس کا یہ اقرار معتبر ہوگا، اور اداء کرنا لازم ہوگا، لیکن اگر مرض الموت میں کسی وارث کے حق میں اس طرح اقرار کرے، چوں کہ اس میں احتمال ہے کہ اس طرح وہ بعض وارث کو زیادہ مال دینا چاہتا ہو دوسرے بعض کو نقصان پہنچا کر اس لئے اس اقرار کا اعتبار نہیں ہوگا الا یہ کہ دوسرے ورثاء اس کی تصدیق کریں۔

کما فی الهدایة : ولو اقر المریض لوارثه لا یصح، الأنْ یصدقه فیه بقیة الورثه، لانه قد تعلق بما له حق الورثة فی مرضه ، ولهذا یمنع من التبرع علی الوارث اصلا، وان اقر لاجنبي ، جاز لعدم وجود الشبهة . (الهدایة فی الفقه الحنفی : ٣/٢١٠)

مرض الموت میں طلاق پھر مطلقہ کے حق میں اقرار:

اگر کوئی شخص مرض الموت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دیدے، اس کے بعد عدت میں اس عورت کے حق میں قرضہ کا اقرار کرے، پھر قرضہ ادا کئے بغیر وفات پائے، تو حکم یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس عورت کے حق میراث اور اقرار کردہ مال میں سے کونسا کم ہے، جو کم ہے وہ دیدیا جائے، کیوں کہ اس اقرار میں یہ شبہ موجود ہے کہ شاید اس کو زیادہ مال دلانے کے لئے طلاق دیکر اس کے بعد اقرار کا قدم اٹھایا ہے۔

كما في الهداية : اذا طلق زوجته في مرضه ثلاثا، ثم اقرلها بدين ومات، فلها الاقل من الدين وميراثها منه ، لانهما متهمان فيه لقيام العدة،والاقرار بابه مسدود للوارث فلعله اقدم على الطلاق ليصح اقراره لها زيادة على ميراثها . (الهداية : ٣/ ٢١١)

مرض الموت کی تعریف:

مرض الموت ایسی حالت کو کہتے ہیں کہ جس میں ہلاکت کا اندیشہ ہواور اسی حالت میں مر بھی جائے ،خواہ اسی عارضہ سے مرا ہو یا کسی دوسری وجہ سے خواہ یہ حالت مرض کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، مثلاً کوئی شخص کشتی میں ڈوب رہا ہو یا آگ کے اندر گر گیا ہو، یا کسی ملبہ کے نیچے اس طرح دبا ہو کہ کچھ دیر زندہ رہا، اگر مرض کا مہلک ہونا معلوم نہ ہوتو اسے مرض الموت جب کہیں گے کہ اس میں اس قدر اضافہ ہو جائے کہ مریض گھر کے باہر کے ضروری مصالح سے عاجز ہو جائے مثلاً عالم مسجد میں جانے سے اور تاجر تجارت سے عاجز ہو جائے اگر مرض کسی مرحلہ پر ٹھہر جائے یعنی اس میں اضافہ نہ ہو رہا ہو اور اس ٹھہراؤ کے بعد ایک سال اسی حالت میں گزر جائے تو یہ مرض الموت میں داخل نہیں، پھر جب مرض بڑھ جائے اور اسی زیادتی کی حالت میں مر بھی جائے تو اس زیادتی کے وقت سے مرض الموت شمار ہوگا۔

(البحر الرائق : ٤/ ٤٣ ، ردالمحتار : ٢/ ٥٢ ، احسن الفتاویٰ)

كتاب الشهادة

شہادت کے احکام کے بیان میں

شہادة:

اپنے سامنے کسی معاملہ کو ہوتا ہوا دیکھ کر، یا کان سے سن کر یقین حاصل ہونے کی صورت میں بوقت ضرورت گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اس معاملہ کے وقت موجود تھا۔

شہادت کی ادائیگی کا حکم:

اگر اس معاملہ میں اور کوئی گواہ نہ ہو جو گواہ ہے وہ اگر گواہی نہ دے تو حق کے ضائع ہونے کا خوف ہو تو ایسی صورت میں اگر اس سے گواہی طلب کی جائے تو شہادت دینا فرض ہے۔

لقولہ تعالیٰ : ﴿ ولا تکتموا الشھادۃ و من یکتمھا فانہ اثم قلبہ ﴾

(سورۃ البقرۃ : ۲۸۳)

ترجمہ: مت چھپاؤ گواہی کو اور جو شخص اس کو چھپائے تو بے شک اس کا دل گناہگار ہے۔

﴿ و اقیموا الشھادۃ ﴾ (سورۃ الطلاق : ۲)

" وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم : الا أخبر کم بخیر الشھداء الذی یأتی بشھادتہ قبل أن یسألھا أو یخبر بشھادتہ قبل أن یسألھا " .

(اخرجہ مسلم فی الأقضیۃ رقم : ۱۷۱۹ ، مؤطا باب خیر الشھادۃ)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، کیا میں آپ لوگوں کو نہ بتلا دوں کہ گواہی دینے والوں میں بہترین شخص کون ہے؟ پھر خود ہی ارشاد فرمایا کہ جو طلب کرنے سے پہلے ہی گواہی دیدے، یا گواہی کے متعلق مطلع کردے سوال سے پہلے۔ (مسلم)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کسی معاملہ کے متعلق علم رکھتا ہو، مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا اس کا کچھ مال دوسرے کے ذمہ ہے وہ انکار کررہا ہے، ورثاء کے پاس کوئی گواہ موجود نہیں جبکہ بعض لوگوں کو اس حق کا علم ہے، لیکن ورثاء کو ان گواہوں کا علم نہیں، تو ان لوگوں کے لئے لازم ہے کہ خود ہی گواہی دیدے۔

گواہی کے لئے علم صحیح کا ہونا ضروری ہے:

کسی واقعہ کے متعلق گواہی دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، اسی طرح کسی معاملہ کے متعلق گواہی کے لئے ضروری ہے کہ اس معاملہ کے وقت خود موجود ہو اور آنکھوں سے دیکھا اور کان سے سنا ہو، دیکھنے اور معائنہ کئے بغیر گواہی دینا جائز نہیں۔

وہ مواقع جن میں شہرت کی بنیاد پر شہادت دینا جائز ہے:

شہادت کا عام قانون تو یہی ہے کہ مشاہدہ اور معائنہ کے بغیر شہادت جائز نہیں البتہ بعض مواقع ایسے ہیں کہ ان میں محض شہرت کی بنیاد پر گواہی دینا جائز ہے۔

(۱) نسب: مثلاً ایک بچہ کسی کے گھر میں بڑا ہوا، اس کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ میرا بچہ ہے تو اس شہرت کی بناء پر اس کے بچہ ہونے کی گواہی دی جاسکتی ہے۔

(۲) موت: ایک شخص کا انتقال ہوا اعلان ہو گیا کہ مرنے والا فلاں بن فلاں ہے، یہ خبر لوگوں میں مشہور ہو گئی، اب جن لوگوں نے اس کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا ان کے لئے بھی جائز ہے کہ شہادت دیں کہ فلاں بن فلاں کا انتقال ہو گیا ہے۔

(۳) نکاح: دو مرد وعورت ایک جگہ رہائش پذیر ہیں، دونوں میاں بیوی ہونے کے دعویدار ہیں، اب اس شہرت کی بناء پر گواہی دینا جائز ہے۔

(٤) ولایۃ القاضی: ایک شخص قاضی ہونے کا دعویدار ہے کہ اس کو حاکم وقت کی طرف سے عہدۂ قضاء پر فائز کی گیا ہے، مزاحمت کرنے والا کوئی نہیں، عدالت میں بیٹھ کر مقدمات کا فیصلہ کر رہا ہے، لوگوں نے سنا کہ یہ قاضی صاحب ہیں، بعد میں اس بنیاد پر اس کے قاضی ہونے کی گواہی دینا جائز ہے۔

(٥) اصل الوقف: ایک جائیداد، زمین، مکان، مدرسہ وغیرہ کے متعلق مشہور یہی ہے کہ یہ موقوفہ جائیداد ہے ایک زمانہ کے بعد اس پر شہادت کی ضرورت پیش آئے تو اس کے موقوفہ ونے کی شہادت دینا جائز ہے اگر چہ وقف کرتے وقت گواہی دینے والا موجود نہ تھا۔

قال فی الاختیار: ویجوز أن یشهد بکل ما سمعه، أو ابصره من الحقوق والعقود لانه علمه وتیقنه ویقول اشهد بکذا، ولا یقول اشهدنی لانه کذب، وتجوز شهادة المختبی، وهو أن یقر الرجل بحق، والشهود مختبئون فی بیت یسمعون اقراره فانه یحل لهم الشهادة اذا کانوا یعرفون وجهه ویرونه.

ولا یجوز لاحد أن یشهد بمالم یشاهده ویعاینه الاالنسب والموت، والنکاح، وولایة القاضی، وأصل الوقف لان هذه الاشیاء تکون بحضور جماعة مخصوصة، فاقیمت الشهرة والاستفاضة مقام العیان والمشاهدة ألاترى انا نشهد أن عائشة زوج النبی صلى الله علیه وسلم وأن فاطمة ابنته، ونشهد بخلافة ابی بکر وعمر والخلفاء الراشدین بالاستفاضة، والشهرة انما تکون بالتواترأو باخبار من یثق الناس به، کما اذا اخبرنا احد أن فلانامات، فتجوز الشهادة بموته،

اذا تواتر الخبر، أو نقله لنا الموثوقون .

(الاختيار لتعليل المختار للموصلي : ۲/۱۴۳)

قبول شہادت کی شرائط:

(۱) مسلمان ہونا:

مسلمان ہونا، لہذا کسی کافر کی گواہی مسلمان کے خلاف قابل قبول نہیں۔

﴿ ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا ﴾.

(سورة النساء : ۱۴۱)

ترجمہ: ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔

کیوں کہ اس میں احتمال ہے کہ عداوت اور بغض کی وجہ سے مسلمان کے حق میں جھوٹ بولے، البتہ کافر کی گواہی کافر کے حق میں مقبول ہے۔

(۲) عاقل، بالغ، آزاد ہونا:

عاقل، بالغ، آزاد ہونا، لہذا کسی نابالغ، مجنون، اور غلام کی شہادت قابل قبول نہیں۔

(۳) عادل ہونا:

یعنی گواہ صدق و دیانتداری میں مشہور ہو، لہذا فاسق بے دین شخص کی گواہی شرعاً معتبر نہیں۔

(۴) نابینا کی گواہی کا حکم:

گواہ بینا شخص ہو، لہذا نابینا کی شہادت معتبر نہیں کیوں کہ جب نابینا شخص کسی واقعہ کے متعلق شہادت دینا چاہے تو کس طرح دے سکتا ہے، جبکہ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ کس نے کس کو مارا، خنجر سے مارا، تلوار سے مارا، یا چھرا گھونپ دیا، البتہ بعض فقہاء نے کہا کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں نابینا شخص کی گواہی معتبر ہے، بشرطیکہ وہ آواز کو اچھی طرح پہچان کر یقین کے ساتھ گواہی دے۔

(۵)

زبان سے شہادت ادا کرنا، لہذا گونگے شخص کی گواہی معتبر نہیں کیونکہ وہ اداء شہادت پر قادر نہیں۔

دشمن کی گواہی معتبر نہیں:

جن لوگوں کی آپس میں کسی دنیوی معاملہ کی وجہ سے دشمنی ہو تو ان کی ایک دوسرے کے

خلاف گواہی معتبر نہیں ہے۔

وقال عمر رضی اللہ عنہ : لا تقبل شهادة خصم، ولا ظنين .

(اخرجه مالك فى المؤطاعن عمر موقوفاً : ٧١٩/٢)

قریبی رشتہ داروں کی شہادت معتبر نہیں:

اصول وفروع، یعنی ماں، باپ، دادا، دادی وغیرہ کی شہادت اپنی اولاد کے حق میں، یا اولاد کی شہادت اپنے اصول ماں باپ وغیرہ کے حق میں معتبر نہیں، نیز میاں، بیوی کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں معتبر نہیں، نیز نوکر، نوکرانی جو گھر میں رہتے ہیں ان کی شہادت اپنے مالک کے حق میں معتبر نہیں۔

فلا تقبل شهادة الوالد لولده، ولا الام لابنها، ولا الولد لابيه، ولا الزوج لزوجته، ومثله الخادم الذى ينفق عليه صاحب البيت، فان الشهادة، فى هذه الحال لا تقبل، لوجود التهمة .

وفى الحديث : ولا تجوز شهادة خائن ولا خائنة ولا ذى عمر، اى حقد، على أخيه ولا تجوز شهادة القانع لاهل البيت .

(ابو داؤد كتاب القضاء رقم : ٣٦٠٠، وابن ماجه فى الاحكام رقم : ٢٣٦٦)

القانع، الخادم الذى ينفق عليه أهل البيت . (فقه المعاملات)

وہ رشتہ جن کی شہادت معتبر ہے:

اصول وفروع اور زوجین کے علاوہ دوسرے رشتہ داروں کی شہادت قابل قبول ہے، مثلاً بھائی کی شہادت بھائی کے حق میں، یا چچا، چچازاد بھائی، یا بھتیجے وغیرہ کی شہادت ایک دوسرے کے حق میں شرعاً معتبر ہے۔

وبهذا اخذ الجمهور . (فقه المعاملات)

نصاب شہادت:

عام معاملات، بیع شراء، قرض، اجارہ، رہن اقرار، غصب وغیرہ میں مردوں کی طرح عورتوں کی گواہی بھی معتبر ہے، یعنی ایک مرد ہو اس کے ساتھ دو عورتیں ہوں اس طرح عورتوں کی گواہی شرعاً معتبر ہے، صرف تنہا عورتوں کی گواہی معتبر نہیں، مثلاً چار عورتیں مل کر شہادت دیں کہ ہم گواہی

دیتی ہیں کہ زید نے عمر کو یہ زمین فروخت کی ہے، کوئی مرد گواہ موجود نہیں تو صرف عورتوں کی گواہی سے عمر کے حق میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا، اگر قاضی فیصلہ کردے تو شرعاً وہ فیصلہ معتبر نہیں ہوگا۔

اسی طرح نکاح، طلاق، رجعت وغیرہ میں بھی عورتوں کی گواہی مردوں کی معیت میں معتبر ہے۔

حدود وقصاص میں خواتین کی شہادت غیر معتبر ہے:

البتہ حدود وقصاص میں خواتین کی شہادت شرعاً معتبر نہیں چاہے تنہا شہادت دے یا مردوں کے ساتھ مل کر شہادت دے، بلکہ حدود وقصاص کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی شہادت ضروری ہے، مثلاً زید کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے بھائی نعیم کو خالد نے قتل کیا ہے، اور اس مقدمہ کا گواہ محض سلیم ہے، اور پانچ خواتین ہیں، تو چونکہ مقدمہ قتل کے ثبوت کے لیے دو مرد گواہوں کا ہونا ضروری ہے، جبکہ یہاں صرف ایک ہے اگر چہ اس کے ساتھ پانچ خواتین گواہ بھی موجود ہیں، لیکن نصاب شہادت نامکمل ہونے کی بناء پر زید کا مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔

﴿ واستشهدوا شهيدين من رجالكم فان لم يكونا رجلين فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشهداء أن تضل احد اهما فتذكر احداهما الاخرىٰ ﴾ (سورة البقرة : ٢٨٢)

ترجمہ: اپنے مردوں میں سے دو گواہ بناؤ، اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی بھول جائے تو ایک دوسری کو یاد دلا دے۔ (بیان القرآن)

وذهب الجمهور الى أن شهادة النساء مع الرجال جائزة فى الاموال ، والنكاح ، والرجعة، والطلاق و كل شئى، الا فى "الحدود والدماء" فلا تقبل فيها شهادة النساء لغلبة العاطفة عليهن ، ولان الحدود تدرء بالشبهات .

قال الزهرى : مضت السنة من لدن رسول الله صلى الله عليه وسلم والخليفتين من بعده ، أن لا شهادة للنساء فى الحدود

والقصاص .

(الهداية : ۲/ ۱۲۹ ، والاثر ، رواه ابن ابی شیبه عن الزهری)

ثبوت زنا کے لئے شہادت کا نصاب:

حد زنا کی ثبوت کے لئے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے اس میں عورتوں کی گواہی مطلقاً معتبر نہیں، نیز نصاب شہادت چار مردوں سے کم ہونے سے بھی جرم ثابت نہ ہوگا۔

لقوله تعالیٰ : ﴿ والّتي يا تين الفحشة من نساء كم فاستشهدوا عليهن اربعة منكم ﴾ (سورة النساء : ۱۵)

وہ مسائل جن میں خبر واحد معتبر ہے:

قال العلامةالصابونی : وقد اجاز الفقهاء شهادة الرجل الواحد، فی بعض حالات استثنائية ، كشهادة الخبيرفی المتلفات، والطبيب فی المريض الذی يحل معه الافطار، والشهادة على الولادة، وشهادة الواحد فی تزكية الشهود، وفی الاخبار عن عزل المؤكل وفی الاخبار عن عيب المبيع ، فلا يشترط فی مثل هذه الامور وجود شاهدين . (فقه المعاملات)

یعنی بعض حالات میں خبر واحد معتبر ہے دینیات، پاکی ناپاکی، حلال وحرام وغیر کی خبروں میں اسی طرح بعض دیگر حالات بھی ہیں جن میں خبر واحد معتبر ہے، مثلاً:

(۱) ڈاکٹر خبر دے کہ مریض کے لیے فلاں فلاں غذا نقصان دہ ہے، اب ان سے بچنا لازم ہے۔

(۲) یا مسلمان ڈاکٹر بتائے کہ اس وقت روزہ توڑ دیں ورنہ جان کو خطرہ ہے اب روزہ توڑ دینا لازم ہوگا۔

(۳) ایک شخص خبر دے کہ فلاں فلاں صاحب کا بچہ ہے تو اس خبر پر اعتماد کرنا جائز ہے۔

(٤) گواہ کے عادل اور غیر عادل ہونے کے متعلق خبر۔

(٥) ایک معتبر شخص وکیل کو خبر دے کہ مؤکل نے تمہیں معزول کر دیا تو اس کی خبر پر

اعتماد کرتے ہوئے اپنے کو معزول سمجھے۔

(٦) ایک مبیع کے متعلق بتائیے کہ اس میں یہ عیب ہے تو اس پر اعتماد کرتے ہوئے رد بیع کا اختیار استعمال کرے وغیر ذالک۔

جن مواقع میں تنہا عورت کی شہادت معتبر ہے:

عورتوں کے جن حالات پر شرعاً مرد مطلع نہیں ہوسکتا ان میں تنہا ایک عورت کی شہادت بھی معتبر ہے، مثلاً، ولادت، یا پردۂ بکارت کا قائم ہونا یا زائل ہونا، یا عورتوں کے بعض عیوب، لہٰذا اگر صرف دائیہ اطلاع دے کہ پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز نکلی تھی پھر انتقال کرگیا تو صرف اس کی شہادت پر حیاۃ ثابت ہوگی، اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

وفی الحدیث أن النبی صلی اللہ علیه وسلم: " اجاز شهادة القابلة " دار قطنی فی سننه عن حذیفة بن الیمان.

(مجمع الزوائد: ٤/ ٢٠١)

وروی عبد الرزاق فی مصنفه عن الزهری أنه قال: مضت السنةأن تجوز شهادة النساء فیما لا یطلع علیه غیرهن، من ولادات النساء وعیوبهن. (نصب الرایة: ٤/ ٨٠)

وہ افراد جن کی شہادت مردود ہے:

چونکہ شہادت کے لئے گواہ کا عادل دیندار ہونا شرط ہے اس لئے ہر وہ شخص جو اعلانیہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو اس کی شہادت مردود ہے، مثلاً اداکار، گلوکار، ہیجڑے، شراب خور، جوئے باز، سودخور وغیرہ، کیوں کہ جب اعلانیہ طور پر گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں تو شہادت کے معاملہ میں بھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔

قال فی کتاب الاختیار: ولا یقبل شهادة مخنث ولا نائحة ولا من تغنی للناس الغناء الماجن، لان ذلك فسق لانه علیه السلام: "نهی عن صوتین احمقین، النائحة والمغنیة". (ترمذی: ١٠٠٥)

ولا تقبل شهادة المدمن علی الشرب واللهو، ولا من یفعل کبیرة

توجب الحد، ولا من يأكل الربا، ولا من يلعب القمار، ولا من يدخل الحمام بغير ازار . (انظر الاختيار : ٢/١٤٢ ، الهداية : ٣/١٣١)

جھوٹی گواہی عظیم گناہ ہے:

سچی شہادت اجر عظیم کا باعث ہے، لیکن جھوٹی شہادت بڑا ہی قبیح گناہ ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ فاجتنبوا الرجس من الاوثان واجتنبوا قول الزور ﴾ (سورة الحج : ٣٠)

رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ یہ اکبرالکبائر ہے شرک اور والدین کی نافرمانی کے بعد سب سے بڑا گناہ جھوٹی گواہی کوقرار دیا۔

" كما روى البخارى ومسلم : الا أنبئكم باكبر الكبائر!قلنا بلىٰ يا رسول الله؟قال الاشراك بالله وحقوق الوالدين ، وكان صلى الله عليه وسلم متكئا فجلس ، فقال الا وشهادة الزور، او قال قول الزور، فمازال يكررها حتى قلنا ليته سكت، خشية عليه من شدة التاثر والغضب" (اخرجه البخارى رقم : ٢٦٥٤، ومسلم رقم ٨٧)

جناب رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ کیا میں تمہیں اکبرالکبائر سے مطلع نہ کردوں؟ ہم نے کہا ضرور یارسول اللہ (ﷺ) پھر ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، یہ ارشادفرماتے وقت آپ ﷺ تکیہ لگائے بیٹھے ہوئے تھے تو سیدھے ہوکر بیٹھے اس کے بعد ارشادفرمایا، جھوٹی گواہی، یا جھوٹی بات، پھر آپ مسلسل یہ جملہ دہراتے رہے، آپ ﷺ کے اس قول کے بار بار تکرار سے سخت متأثر ہونے اور غصہ کی کیفیت کودیکھ کر ہم (دل ہی دل میں) تمنا کرنے لگے، اے کاش کہ آپ ﷺ خاموش ہوجاتے۔ (بخاری ومسلم)

دستاویز کاحکم:

کسی دعویٰ کوثابت کرنے کے لئے دستاویز بھی ایک اہم ثبوت ہے۔

كقوله تعالىٰ : ﴿ ولا تسئموا أن تكتبوه صغيرا او كبيرا الى أجله

ذلكم اقسط عند الله واقوم للشهادة وادنىٰ أن لا ترتابوا ﴾

(سورة البقرة : ۲۸۲)

اور یہ کہ تم اس (دین) کے (باربار) لکھنے سے اکتایا مت کرو، خواہ وہ (معاملہ دین کا) چھوٹا ہو یا بڑا لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے، اور زیادہ سزاوار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو، (اس لئے لکھ لینا ہی زیادہ اچھا ہے)۔

لہٰذا جب کوئی معاملہ کیا جائے تو اس کو لکھ لیا جائے اور دستاویز کو پختہ کرنے کے جو قانونی تقاضے ہیں ان کو پورے کئے جائیں اور دستاویز صحیح ہونا عدالت میں ثابت ہو جائے تو قاضی کو اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا، مدعیٰ علیہ کا دستاویز کو حق تسلیم کرنا اقرار حق کے قائم مقام ہے۔

مدعیٰ علیہ کا قسم میں توریہ کا حکم:

جب مدعیٰ علیہ کے ذمہ قسم لازم آئے اور وہ قسم اٹھائے تو اس میں مدعی یا قاضی جو قسم دلانے والا ہے اس کی نیت کا اعتبار ہوگا قسم اٹھانے والے کی نیت کا اعتبار نہ ہوگا، کیوں کہ کبھی قسم اٹھانے والا کسی اور چیز کی نیت کرتا ہے۔

مثلاً زید کا دعویٰ ہے کہ بکر نے مجھ سے مکان خریدا ہے اس کی قیمت دو لاکھ روپیہ اس کے ذمہ واجب ہے وہ دے نہیں رہا ہے، اور بکر اس کا انکار کرتا ہے، زید کے پاس کوئی گواہ نہیں اس لئے بکر کو قسم دی گئی کہ قسم اٹھائے کہ اسْ کے ذمہ زید کا دین بسلسلۂ خریداری مکان نہیں ہے، اب بکر قسم اٹھاتا ہے لیکن قسم کے وقت نیت کرتا ہے کہ میں نے زید سے کوئی قرض نہیں لیا تو اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔

"لقوله عليه السلام : يمينك على مايصدقك عليه صاحبك " .

(اخرجه مسلم باب يمين الحالف على نية المستحلف رقم : ۱٦٥۳)

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے ضمن میں فرمایا ہے کہ قسم میں قاضی یا قسم دلانے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا، یہاں قسم اٹھانے کا توریہ عند اللہ کوئی فائدہ نہ دے گا، اگر جھوٹی قسم کھاتا ہے تو وہ حدیث کی رو سے بڑا گناہ گار اور مجرم ہوگا۔

اور جھوٹ بول کر دوسرے کے مال کو ہڑپ کرنا گناہ عظیم ہونا حدیث میں صراحت کے ساتھ

مذکور ہے۔

"لقوله عليه السلام : من حلف على يمين يقتطع بها مال امرئ مسلم ، لقى الله وهو عليه غضبان ." (اخرجه مسلم رقم : ۲۲۳)

کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی مسلم بھائی کا مال کھائے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضبناک ہوگا۔ (مسلم)

توریہ کی جائز صورت:

ہاں البتہ بعض فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص مجبور ہو تو زبردستی اس پر مال کا دعویٰ ہے، اب اس کے لئے اپنا مال بچانے کی کوئی صورت نہیں تو دفع ظلم کے لئے وہ توریہ کر کے جھوٹی قسم اٹھاتا ہے اور اپنا مال بچاتا ہے تو شرعاً اس کی گنجائش ہوگی۔ (فقہ المعاملات)

احکام الصلح فی المعاملات

معاملات میں صلح کے احکام

صلح کے لغوی معنیٰ:

نزع کو ختم کرنا۔

كما في قوله تعالىٰ : ﴿وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فاصلحوا بينهما﴾ (سورة الحجرات : ۹)

شرعی معنیٰ:

کوئی ایسا درمیانہ راستہ تلاش کرنا جو دونوں فریق کے لئے قابل قبول ہو، جس سے آپس کی منازعت ختم ہو جائے اور بغض وعداوت کی بنیاد ختم ہو جائے۔

صلح کی اقسام:

(۱) دو ملکوں کا سرحدی پٹی پر صلح کرنا۔

(۲) مسلمان اور کفار کا آپس میں کسی معاملہ پر صلح کرنا۔

(۳) جنگی معاہدات۔

(٤) دو قوموں کا آپس میں مصالحت کرنا۔

(٥) میاں بیوی کے آپس کی مصالحت۔

(٦) کسی وارث کا کچھ مال لیکر دوسرے ورثاء سے صلح کر لینا۔

(٧) مدعی اور مدعا علیہ کا آپس میں صلح کرنا۔

ان سطور میں صرف آخری قسم کے متعلق تفصیلات اور فقہی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

صلح کی مشروعیت:

جب کوئی شخص دوسرے پر مال کا دعویٰ کرے اور دوسرا انکار کرے تو فیصلہ کا ایک راستہ تو قضاء کا ہے دوسرا راستہ مصالحت کا، قضاء کی صورت میں وقتی طور پر مقدمہ تو نمٹ جاتا ہے لیکن عام طور پر آپس کا نزاع ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی بھی وقت پھر لڑائی شروع ہونے کا امکان ہوتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ فیصلہ غلط ہو جاتا ہے اور ناحق مال دوسرے کو مل جاتا ہے۔

دوسرا راستہ جو صلح کا ہے، اس میں عموماً آپس کی بغض وعداوت ختم ہو جاتی ہے اور معاشرہ کے اندر امن کی فضاء قائم ہو جاتی ہے اس لئے شریعت نے قضاء کے بجائے صلح کا راستہ اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے۔

کقوله تعالیٰ: ﴿وان امرأة خافت من بعلها نشوزاأو اعراضاًفلاجناح عليهما أن يصلحا بينهما صلحا والصلح خير﴾

(سورة النساء: ١٢٨)

ترجمہ: اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی بھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ آپس میں کسی طرح صلح کر لیں اور یہ صلح ہی بہتر ہے۔ (از تفسیر عثمانی)

"وقال عليه السلام: الصلح جائز بين المسلمين، الا صلحا حرم حلالاأو احل حراماً والمسلمون على شروطهم."

(اخرجه الترمذی: ١٣٥٢، ابوداؤد: ٣٥٩٤، في الاقضية)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا آپس میں صلح کرنا جائز ہے ہاں ایسی صلح کرنا جس سے کسی حرام کو حلال کیا جائے یا حلال کو حرام کیا جائے (وہ ناجائز ہے) اور مسلمان اپنے وعدہ وعہد کے پابند ہوتا ہے۔ (یعنی اس کے خلاف نہیں کرتا) (ابوداؤد، ترمذی)

شیخ صابونی فرماتے ہیں، وہ صلح جو حلال کو حرام کرے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر پر شرط رکھتی ہے کہ شوہر اس کی دوسری سوکن سے ہم بستری نہ کرے اور حرام کو حلال کرنے کی ایک مثال یہ ہے کہ جواء کھیلنے پر صلح کرنا یا قرض کے بدلے مثلاً ایک من شراب دینے کی شرط ٹھہرانا وغیرہ، نیز ہر وہ چیز جس کا استعمال شرعاً حرام ہے اسکو بیع وشراء اور لین دین میں عوض ٹھہرانا۔ (فقه المعاملات)

صلح کی صورتیں:

(۱) صلح عن اقرار: مدعا علیہ حق کا اقرار کرتا ہے کہ ہاں، میرے ذمہ میں تمہارے دس ہزار روپے لازم ہیں لیکن میں پورا قرض دینے پر قادر نہیں ہوں تم اپنے حق کا کچھ حصہ معاف کردو تو بقیہ دینے کے لئے تیار ہوں اب مدعی اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

(۲) صلح عن انکار: یعنی مدعا علیہ اپنے ذمہ حق کے لازم ہونے کا منکر ہے اب ان کے ذمہ قسم لازم ہے تو وہ قسم اٹھانے کے بجائے مدعی سے اس کے مطلوبہ مقدار سے کچھ کم پر صلح کرتا ہے جمہور فقہاء کے نزدیک صلح کا یہ طریقہ جائز ہے، کیوں کہ اس صورت میں مدعیٰ علیہ قسم اٹھانے، اپنے نفس کو ذلیل کرنے اور عدالتوں کے چکر کاٹنے کے بجائے مال خرچ کر کے اپنے کو مشقت اور ذلت سے بچاتا ہے، یہ اس کے حق میں جائز ہے، باقی مدعی اگر باطل پر ہو یعنی غلط دعویٰ کے ذریعہ ناحق مال بٹورنا چاہتا ہے تو اس کے حق میں صلح کے ذریعہ حاصل ہونے والا مال حرام ہی رہے گا، صلح کی وجہ سے دوسرے کا مال حلال نہیں ہوسکتا۔

قال ابو حنيفة رحمه الله : اجود مايكون الصلح عن انكار، لان الحاجة الى جوازه امس، لان الصلح لقطع المنازعات، واطفاء الثائرات، وهو في الصلح مع الانكار ابلغ وللحاجة والضرورة اثر في تجويز المعاقدات، ولو ابطلناه لفتح باب المنازعات .

(انظر الاختيار لتعليل المختار : ۳/۵)

صلح کے ارکان:

صلح بھی دوسرے عقود کی طرح ایک عقد ہے لہٰذا صلح کے انعقاد کے لئے ایجاب وقبول کا ہونا ضروری ہے، ایجاب وقبول کے لئے کوئی متعین عبارت ادا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر وہ

عبارت جو صلح پر طرفین کی رضامندی پر دلالت کرے اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

مثلا قال : صالحتك بألف درهم ، على الالفين التي لك عندی وقال الاخر قبلت .

یعنی ایک کہتا ہے کہ میرے تمہارے ذمہ جو دو ہزار قرض ہے میں ایک ہزار کے عوض تم سے صلح کرتا ہوں، ایک ہی ہزار دیدوں؟ دوسرا جواب میں کہتا ہے ہاں مجھے قبول ہے یا منظور ہے تو اس سے صلح منعقد ہو جائے گی۔

صلح کی شرائط:

1- عاقدین عاقل بالغ ہوں، لہٰذا بچہ اور مجنون کی صلح جائز نہیں۔

2- مصالح علیہ مال متقوم ہو، یا ایسا حق ہو جس کا عوض لینا شرعاً جائز ہو جیسے قصاص وغیرہ، کیوں کہ قصاص کے بدلہ میں مال دے کر صلح کر لینا جائز ہے۔

لقوله تعالىٰ : ﴿ فمن عفى له من أخيه شئى فاتباع بالمعروف واداء اليه باحسان ﴾ (سورة البقره : ۱۷۸)

ترجمہ: پھر جس کو معاف کیا جائے اس کے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو (دیت کا) معقول طور پر مطالبہ کرنا چاہیے، اور (قاتل کو) خوبی کے ساتھ مال (مقتول کے ورثاء تک) پہنچانا چاہیے۔

وہ حقوق جن میں صلح جائز نہیں:

بعض حقوق چوں کہ شرعاً ان کا عوض لینا جائز نہیں، لہٰذا ان پر صلح کرنا بھی جائز نہیں۔

جیسے حق شفعہ ہے، کسی کو زمین پر حق شفعہ کے دعویٰ کا حق حاصل ہے اب وہ صلح کرتا ہے کہ اتنی رقم دیدو میں حق شفعہ کا دعویٰ چھوڑ دیتا ہوں اب اس پر صلح کر لیتا ہے، شرعاً جائز نہیں، اس صلح کا عوض بھی حلال نہیں۔

اسی طرح حد قذف اور کفالہ بالنفس وغیرہ۔

حدود اللہ میں صلح جائز نہیں:

حقوق العباد میں تو صلح کرنا جائز ہے، لیکن حدود اللہ میں صلح جائز نہیں لہٰذا اگر سزا میں کسی چور کا ہاتھ کاٹا جا رہا ہو، وہ صلح کر لے کہ اتنا مال دیتا ہوں میرا ہاتھ نہ کاٹا جائے یہ صلح شرعاً حرام ہے، اسی

طرح کوئی شرابی پکڑا گیا اور عدالت میں پیش ہوا، اس پر حد شرب جاری کرنے کا فیصلہ ہوا اب وہ مال پر صلح کرنا چاہتا ہے تا کہ اس پر حد جاری نہ ہو یہ بھی شرعاً جائز نہیں، اگر قاضی ایسا کرے تو بڑا خائن ہوگا، جو کچھ مال لے گا وہ رشوت ہوگی اس کا استعمال بھی حرام ہوگا۔

كما ورد في الحديث : " انه عليه السلام غضب على اسامة بن زيد ، لما اراد أن يشفع في المرأة المخزومية ، التي سرقت على عهد النبي صلى الله عليه وسلم وقال له : اتشفع في حد من حدود الله يا اسامة ! انما اهلك الذين من قبلكم انهم كانوا اذا سرق فيهم الشريف تركوه واذا سرق فيهم الضعيف اقاموا عليه الحد والذي نفس محمد بيده لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت يدها . "

(هذا طرف من حديث اخرجه البخاري في الحدود : ٧٦/١٢ ، مسلم : ١٦٦٨)

یعنی بنی مخزوم کی ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں چوری کی، جرم ثابت ہونے پر سزا میں اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ ہوا ادھر عزیز و اقارب کو خیال ہوا رسول اللہ ﷺ سے سفارش کی جائے تا کہ سزا معاف فرما دیں، اس کام کے لئے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو واسطہ بنایا جب حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس مسئلہ میں سفارش کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ حضرت اسامہ پر ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا، اسامہ! کیا تم حدود اللہ کو ساقط کرنے کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟ تم سے پہلے انبیاء کی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں کہ ان میں کوئی مالدار چوری کرتا تو اس پر حد جاری نہیں کرتے اور اگر کوئی کم درجہ کا آدمی چوری کرتا تو سزا میں ہاتھ کاٹ دیا جاتا، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں سزا میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ (بخاری)

قال في كتاب الاختيار : ولا يجوز الصلح عن الحدود لانها حق الله تعالىٰ ولا عن حد القذف لانه وان كان فيه حق العبد لكن المغلب في حد القذف حق الشرع عندنا .

(الاختيار لتعليل المختار للموصلي : ٧/٣)

دو شریکوں میں سے ایک کے صلح کرنے کا حکم:

دو آدمی کسی کاروبار میں شریک ہیں، اس مشترکہ کاروبار میں کسی کو ادھار یا قرض دیا، یا کسی اور وجہ سے دونوں کا مشترکہ قرضہ تیسرے شخص کے ذمہ میں واجب ہے اب ایک شریک اپنے حصۂ قرض کے بارے میں مدیون سے صلح کر لیتا ہے اور صلح کا عوض وصول کر لیتا ہے تو دوسرے شریک کو دو باتوں کا اختیار ہوگا۔

(1) چاہے تو صلح سے حاصل ہونے والے مال کا آدھا حصہ اپنے شریک سے وصول کرلے، پھر دونوں مل کر بقیہ ادھار قرضہ وصول کرنے کی کوشش کریں۔

(2) چاہے تو جب ایک شریک نے اپنا حصہ صلح کے ذریعہ وصول کرلیا تو دوسرا شریک بھی مقروض سے اپنے حصے کا مطالبہ کرے۔

قال صاحب الهداية : واصل هذه المسئلة ، أن الدين المشترك بين اثنين اذا قبض احدهما شيئا منه ، فلصاحبه أن يشاركه فى المقبوض، لانه ازداد بالقبض مالية ، وهذه الزيادة راجعة الى اصل الحق فله المشاركة ولكنه قبل المشاركة باق على ملك القابض، وقد قبضه بدلا عن حقه فيملكه حتى ينفذ تصرفه فيه ويضمن شريكه حصته . (الهدايه : ٣/٢٢٢) .

صلح کے متفرق مسائل:

1..... ایک شخص نے کسی عورت پر دعویٰ کیا کہ یہ میری بیوی ہے، عورت نے نکاح سے انکار کیا، لیکن مرد کے اصرار کو دیکھ کر عورت نے کچھ مال پر صلح کرلی تو یہ جائز ہے گویا کہ یہ مرد کے حق میں خلع شمار ہوگا کہ عورت نے مال دے کر خلع کرلی اور عورت کے حق میں صلح کہ اس نے مقدمہ ختم کرنے کے لئے مال خرچ کیا، البتہ حقیقت میں دونوں میں کوئی نکاح نہیں ہوا تھا، مرد نے جھوٹا دعویٰ کیا تو ایسی صورت مین صلح کے عوض کا استعمال مرد کے لئے حرام ہوگا، عورت کو واپس کرنا ضروری ہے۔

2..... اگر ایک عورت نے کسی مرد پر نکاح کا دعویٰ کیا کہ یہ میرا شوہر ہے، مرد نے انکار کیا اس کے بعد کچھ مال دے کر اس عورت سے صلح کرلی تا کہ عورت دعویٰ چھوڑ دے یہ جائز نہیں کیوں کہ

اگر حقیقت میں یہ اس کی بیوی ہے تو مرد بیوی کو نکاح سے فارغ کرنے کے لئے مال نہیں دیتا بلکہ عورت مال دے کر خلع کرتی ہے، اور اگر دونوں میں نکاح نہیں ہوا تھا تب بھی مال دینا جائز نہیں جو مال دیا گیا وہ رشوت کہلائے گا۔

میراث میں مصالحت جائز ہے:

حصۂ میراث میں صلح جس کو اہل میراث کی اصطلاح میں ''تخارج'' کہا جاتا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک وارث کا میراث میں جتنا حصہ بنتا ہے اس کے بدلہ میں کوئی متعین مال لیکر صلح کر لیتا ہے، کہ فلاں متعین مال (مثلاً دوکان، مکان، جائیداد) مجھے دیدیا جائے اور میراث میں جو میرا حصہ بنتا ہے وہ آپ بقیہ ورثا آپس میں تقسیم کرلیں یا اتنی رقم دیدیں بقیہ آپ تقسیم کرلیں صلح کی یہ صورت شرعاً جائز ہے۔

فقد روی عن عثمان بن عفان رضی اللّٰہ عنه أنه صالح تماضر الاشجعیة امرأة عبد الرحمن بن عوف رضی اللّٰہعنه علی ثمانین الف دینار (٨٠) عن ربع ثمنها ترکة زوجها لانها کانت احدی اربع زوجات بحضرة الصحابة، فلم ینکر علیه احد، فکان اجماعاً.

(رواه سعید بن منصور بسند صحیح ، اعلاء السنن: ٦١/٣٧)

تعجیل کے مقابلہ میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

زید عمر کے ذمہ ایک لاکھ روپے واجب الاداء ہے جو چھ ماہ بعد اداء کرنا لازم ہے، اب زید کہتا ہے کہ تم فوری اداء کر دو میں بیس ہزار معاف کرتا ہوں (٢٠٠٠٠)، یہ صلح شرعاً جائز نہیں ہے، گویا یہ بیس ہزار اس مدت کے عوض دیا اور لیا گیا ہے، جبکہ مدت کا کوئی عوض لینا اور دینا ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا یہ بھی حرام ہوا۔

(انظر کتاب الاختیار: ٣/٩، الهدایة: ٣/٢٢٠)

اس مسئلہ کی تفصیل میں شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی زید مجدہم تحریر فرماتے ہیں۔

آج کل بعض تجار ''دین مؤجلہ'' (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال اداء کر دے، مثلاً عمر پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا، اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں سو

روپے دین کے چھوڑ دیتا ہوں، بشرطیکہ تم نوسو روپے فی الحال ادا کردو، فقہ کی اصطلاح میں اس معاملے کو "ضع وتعجل" (کچھ ساقط کردو اور جلدی حاصل کرلو) کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے، صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، تابعین میں سے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، احناف میں سے امام زفر بن ہذیل اور شوافع میں سے شیخ ابوثور اس کے جواز کے قائل ہیں، اور صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما اور تابعین میں سے امام محمد بن سیرین اور حضرت حسن بصری، حضرت ابن مسیب، حضرت حکم بن عتیبہ اور امام شعبی رحمہم اللہ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(دیکھئے مؤطا امام مالك: ١/٦٠٦، مصنف عبدالرزاق: ٨/٧١ تا ٧٤)

اس سلسلے میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں اور سند کے اعتبار سے دونوں ضعیف ہیں۔

پہلی حدیث وہ ہے جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ:

"لما امر النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم باخراج بنی النضیر من المدینۃ، جاءہ ناس منھم، فقالوا: یارسول اللّٰہ! انك امرت باخراجھم، ولھم علی الناس دیون لم تحل، فقال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: ضعوا وتعجلوا."

(سنن الکبری للبیھقی: ٦/٢٨، کتاب البیوع، باب من عجل لہ ادنی من حقہ)

"جب حضور اقدس ﷺ نے بنی نضیر کو مدینہ طیبہ سے نکل جانے کا حکم فرمایا تو کچھ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے، حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں، جن کی ادائیگی کا وقت ابھی نہیں آیا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ، کچھ ساقط کردو اور جلدی ادا کردو۔"

اس حدیث سے اس معاملہ کا جواز ثابت ہوتا ہے، اور ایک دوسری حدیث جو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اگلے باب میں حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے

نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

"اسلفت رجلاً مائة دينار ثم خرج سهمي في بعث بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقلت له: عجل لي تسعين ديناراً واحط عشرة دنانير، فقال: نعم، فذكر ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: اكلت ربايا مقدا و اطعمته."

میں نے ایک شخص کو ایک سو دینار بطور قرض دیئے، اس کے بعد حضور ﷺ جو وفد بھیج رہے تھے اس میں میرا نام بھی آگیا، میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً ادے دو، میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں، اس نے منظور کرلیا (اور میں نے اس سے نوے دینار لے لئے) پھر بعد میں کسی وقت حضور ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور دوسروں کو بھی کھلایا۔ (حوالہ بالا)

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصریح کردی ہے کہ سند کے اعتبار سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں، اس لئے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت اور دلیل کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا، البتہ فقہاء نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے، اس لئے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے، اسی طرح عین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اسی میں داخل ہے۔

جہاں تک بنی نضیر کے واقعے کا تعلق ہے، تو وہ حجت نہیں بن سکتا، اولاً تو اس لئے کہ اس کی سند ضعیف ہے، ثانیاً اس لئے کہ اگر سنداً اس واقعہ کو درست بھی تسلیم کرلیا جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ بنی نضیر کی جلاوطنی کا یہ واقعہ سن ۲ھ میں پیش آیا ہو، اس طرح یہ واقعۂ سود کی حرمت کا حکم آنے سے پہلے کا ہوجائے گا۔

علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کرکے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

"ولما اجلى بني النضير قالوا: ان لنا ديوناً على الناس، فقال: ضعوا وتعجلوا، ومعلوم ان مثل هذه المعاملة لا يجوز بين المسلمين، فان من كان له على غيره دين الى اجل، فوضع عنه بعضه

بشرط ان یعجل بعضه، لم یجز، کره ذلك عمر، وزید بن ثابت وابن عمر رضی الله عنهم ."

(شرح السیر الکبیر للسرخسی : ٤/١٤١٢، فقرہ نمبر ٢٧٣٨، پھر دوبارہ یہی مسئلہ صلاح الدین المنجد کی تحقیق کے ساتھ: ج ۴/۱۹۴ فقرہ نمبر ۲۹۲۱ پر ذکر کیا گیا ہے)

جب حضور ﷺ نے بنونضیر کو جلاوطن کر دیا تو وہ لوگ حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں، تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو، اور یہ بات طے ہے کہ مسلمان کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے، اس لئے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادئیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں اور حضرت عمر، حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ کو مکروہ قرار دیا ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنی نضیر کے ساتھ حالت جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لئے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا، لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولی جائز ہوگا۔

بنی نظیر کے قصہ سے استدلال درست نہ ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر یہود دوسرے لوگوں سے سود پر لین دین کا معاملہ کرتے تھے اور حضور ﷺ نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا ہے، اس سے مراد وہ سود ہے جو رأس المال سے زائد ہو، رأس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا، اس بات کی تائید واقدی کی عبارت سے ہوتی ہے جو انہوں نے اس واقعہ کے بیان میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"فاجلاهم (ای بنی النضیر) رسول الله صلی الله علیه وسلم من المدینة، وولی اخراجهم محمد بن مسلمة، فقالوا: ان لنا دیوناً علی الناس الی آجال، فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم: تعجلوا او ضعوا، فکان لابی رافع سلام بن الحقیق علی اسید بن حضیر عشرون ومائة دینار الی سنة فصالحه علی اخذرأس ماله ثمانین دیناراً

وابطل ما فضل ."

''حضور ﷺ نے قبیلہ بنونضیر کو مدینہ سے جلاوطن کردیا، اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگران مقرر فرمایا، اس وقت وہ لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے، اور آکر کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں، جن کی ادائیگی مختلف مدتوں پر ہونی ہے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کردو، اور ابی رافع سلام بن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر کے ذمہ ایک سو بیس دینار دین تھے، جن کی واپسی سال گذرنے پر ہونی تھی، چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کرلی اور جو زائد (سود) کے چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔''

(مغازی الواقدی: ۱/۳۷۴، علامہ واقدی لکھتے ہیں کہ قبیلہ بنی قینقاع کی جلاوطنی کے وقت بھی بعینہ یہی قصہ پیش آیا تھا، دیکھئے: ۱/۱۷۹)

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا، وہ سود ہی تھا، اصل رأس المال کا حصہ نہیں تھا۔

اس لئے جمہور علماء کے نزدیک ''ضع وتعجل'' (کچھ ساقط کروا، فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے، چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"قال مالك: والامر المكروه الذى لا اختلاف فيه عندنا ان يكون للرجل على الرجل الدين الى اجل، فيضع عنه الطالب ويعجله المطلوب......قال مالك: وذلك عندنا بمنزلة الذى يؤخر دينه بعد محله عن غريمه ويزيد الغريم فى حقه قال: فهذ الربا بعينه لا شك فيه."

''امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ (طالب) دائن دین کا کچھ حصہ ساقط کرکے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے، امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو اداء دین کی تاریخ

کے بعد اور مہلت دیدے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کردے، فرماتے ہیں کہ یہ صریح ربا ہے، جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔"

(مؤطا امام محمد، کتاب البیوع، باب ماجاء فی الربا فی الدین: ۶۰۶/۱)

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ مؤطا امام محمد میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

"قال محمد: وبهذا نأخذ من وجب له دين على انسان الى اجل، فسأل ان يضع عنه ويعجل له مابقى، لم ينبغ ذلك، لانه يعجل قليلاً بكثير دينا، فكانه يبيع قليلاً نقدًا بكثير دينا، وهو قول عمر بن الخطاب وزيد بن ثابت وعبد الله بن عمر، وهو قول ابى حنيفة."

"امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس سے استدلال کرتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو، اور وہ اس سے کہے کہ وہ اس کا کچھ دین ساقط کردے گا، بشرطیکہ وہ بقیہ دین فوراً ادا کردے تو یہ صورت درست نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں وہ دین کثیر کے بدلے میں دین قلیل کو جلد طلب کر رہا ہے، گویا کہ وہ قلیل نقد کو کثیر دین کے عوض فروخت کر رہا ہے، یہی قول حضرت عمر بن خطاب، حضرت زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا ہے، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔"

(مؤطا امام محمد: ۳۳۲/۱، باب الرجل يبيع المتاع او غيره نسيئة ثم يقول: انقدنى واضع عنك)

اور علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ تعالیٰ "المغنی" میں فرماتے ہیں:

"اذا كان عليه دين مؤجل، فقال لغريمه: ضع عنى بعضه واعجل لك بقيته، لم يجز، كرهه زيد بن ثابت وابن عمر والمقداد وسعيد بن المسيب وسالم والحسن وحماد والحكم والشافعى ومالك والثورى وهشيم وابن علية واسحق وابو حنيفة، وقال المقداد لرجلين فعلا ذالك: كلا كم قد آذن بحرب من الله ورسوله، وروى عن ابن عباس انه لم يربه بأسا، وروى ذلك عن النخعى وابى ثور،

لانه آخذ بعض حقه، تارك لبعضه، فجاز، كما لو كان الدين حالا،
وقال الخرقي: لا بأس ان يعجل المكاتب لسيده، ويضع عنه بعض
كتابته ولنا انه بيع الحلول فلم يجز، كما لو زاده الذي له الدين فقال:
اعطيك عشرة دراهم وتعجل لي المائة التي عليك، فاما المكاتب فان
معاملته مع سيده، وهو يبيع بعض ماله ببعض، فدخلت المسامحة فيه،
ولانه سبب العتق، فسومح فيه، بخلاف غيره."

اگر ایک شخص کا دوسرے پر دین مؤجل ہو، اب وہ شخص اپنے غریم (قرض خواہ) سے کہے کہ مجھ سے دین کا کچھ حصہ ساقط کردو، بقیہ دین فوراً ادا کردوں گا، یہ صورت جائز نہیں، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن عمر، حضرت مقداد، حضرت سعید بن المسیب، حضرت سالم، حضرت حسن، حضرت حماد، حضرت حکم، امام شافعی، امام مالک، امام ثوری، اور حضرت ہشیم، حضرت ابن علیہ، امام اسحاق اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس صورت کو ناپسند قرار دیا ہے اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے ایسے دو شخصوں کو جنہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا، خطاب کرتے ہوئے فرمایا، تم دونوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کا اعلان کیا ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس معاملے میں کوئی حرج نہیں ہے، امام نخعیؒ امام ابوثور سے بھی یہی منقول ہے، اس لئے کہ اس صورت میں قرض خواہ اپنے حق کا کچھ حصہ وصول کررہا ہے، اور کچھ حصہ معاف کررہا ہے، لہٰذا یہ صورت جائز ہے، جیسا کہ دین حال (نقد) میں یہ صورت جائز ہوتی ہے، اور امام خرقیؒ فرماتے ہیں کہ اگر مکاتب غلام اپنے آقا کو بدل کتابت جلد ادا کردے، اور اس کے بدلہ میں آقا کچھ بدل کتابت معاف کردے تو اسمیں کوئی حرج نہیں، ہمارے نزدیک چونکہ مذکورہ صورت میں مدت کی بیع ہورہی ہے، اس لئے جائز نہیں ہے، جیسے کہ اگر قرض خواہ دین میں اضافہ کرتے ہوئے مقروض سے کہے کہ تم میرا سو درہم کا قرض فوراً ادا کردو، میں تمہیں دس درہم دوں گا، (ظاہر ہے کہ یہ صورت جائز نہیں) جہاں تک مکاتب غلام کا تعلق ہے، چوں کہ اس کا معاملہ اپنے مولیٰ کے ساتھ ہورہا ہے، اور گویا کہ مولیٰ اپنے ایک مال کو دوسرے مال کے عوض فروخت کررہا ہے، اس لئے اس کے جواز میں مسامحت سے کام لیا گیا ہے دوسرے اس لیے کہ یہ صورت اس غلام کی فوری آزادی کا سبب بھی بن رہی ہے، اس لئے بھی اس میں تسامح سے کام لیا گیا ہے، بخلاف مذکورہ

صورت کے۔ (کہ اس میں یہ بات نہیں پائی جارہی ہے)

(مغنی لابن قدامة، مع الشرح الكبير: ٤/ ١٧٤، ١٧٥)

چنانچہ مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصے کے سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

فوری ادائیگی والے دیون "ضع وتعجل" کا اصول نافذ کرنا:

مندرجہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو رہا ہے کہ "ضع وتعجل" کی ممانعت صرف دیون موجلہ میں ہے، جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا، بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی بھی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کردے، علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے، چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ:

"قلت: ارأيت لو ان لى على رجل الف درهم قد حلت، فقلت: اشهدوا ان اعطانى مائة درهم عند رأس الشهر فالتسع مائة درهم له، وان لم يعطنى فالالف كلها عليه، قال مالك: لا بأس بهذا، وان اعطاه رأس الهلال فهو كما قال، وتوضع عنه التسع مائة، فان لم يعطه رأس الهلال فالمال كله عليه."

(المدونة الكبرىٰ: ١١/ ٢٧، آخر كتاب الصلح)

"میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار روپے دین ہوں اور اس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درہم ادا کردیئے تو نو سو درہم تمہارے ہیں، اور اگر تم نے ادا نہیں کئے تو پھر پورے ایک ہزار درہم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درہم ادا کردے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا، اور نو سو درہم اس سے ساقط ہو جائیں گے، اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درہم ادا نہیں کئے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔"

پھر اس کے بعد اسی قسم کا ایک اور مسئلہ ذکر فرمایا کہ:

"قلت: ارأيت لو ان لى على رجل مائة دينار ومائة درهم حا لة، فصالحته من ذالك على مائة دينار و درهم نقدًا، قال: لا بأس بذلك."

(المدونة الكبرى: ١١/٢٧، آخر كتاب الصلح)

میں نے ان سے کہا کہ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر کسی کے ذمہ میرے ایک سو دینار اور ایک سو درہم فی الحال واجب ہوں اور میں اس سے سو دینار اور ایک درہم نقد پر صلح کرلوں تو کیا یہ جائز ہے؟ امام مالک نے فرمایا اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور علامہ حطاب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وما ذكره عن عيسىٰ هو فى نوازل لـه من كتاب المديان والتفليس ونصه: وسئل عن الرجل يقول لغريمه وقد حل حقه: ان عجلت لى كذا و كذا، من حقى فبقيته عنك موضوع، ان عجلته لى نقدًا الساعة، او الى اجل يسميه، فعجل له نقدًا، او الى الاجل، الا الدرهم او النصف او اكثر من ذلك: هل تكون الوضيعة لازمة؟ فقال: ما ارى الوضيعة تلزمه، اذا لم يعجل له جميع ذلك، وارى الذى له الحق على شرطه، قال محمد بن رشد: هذه مسالة يتحصل فيها اربعة اقوال: احدهما قوله فى هذه الرواية، وهو قول اصبغ فى الواضحة ومثله فى آخر كتاب الصلح من المدونة ان الوضيعة لا تلزمه، الاان يجعل له جميع ماشرط الى الاجل الذى سمى، وهو اصح الاقوال."

"نوازل کی کتاب المدیان والتفلیس میں عیسیٰ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ ان سے یہ مسئلہ پوچھا گیا کہ اگر ایک شخص اپنے ایسے غریم (مدیون) سے کہے جس کے دین کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہو: اگر تم نے میرا اتنا حق ادا کردیا تو بقیہ دین معاف ہے، یا تو تم ابھی نقد ادا کرو، یا فلاں وقت تک ادا کردو، لہٰذا اگر مدیون فوراً ادا کردے، یا اس کی مقرر کردہ مدت پر ادا کردے مگر صرف ایک درہم یا نصف درہم یا کچھ زیادہ باقی رہ جائے تو کیا اس صورت میں بھی دائن کے لئے اسقاط دین لازم ہوگا جس کا اس نے وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ جواب میں فرمایا کہ میری رائے میں اگر مدیون

نے پوری رقم ادا نہیں کی تو اس صورت میں اسقاط دین دائن پر لازم نہیں ہوگا، اور میری رائے میں اسقاط دین شرط ادا پر موقوف تھا، محمد بن رشد فرماتے ہیں کہ اس میں چار اقوال ہیں، اور ایک وہی ہے جو اس روایت میں ہے، اور یہی اصبغ اور واضح کا قول ہے اور مدونۃ الکبریٰ کی کتاب الصلح کے آخر میں بھی یہی قول مذکور ہے، وہ یہ کہ دائن پر دین کی کمی کرنا اس وقت تک لازم نہیں ہوگا جب تک مدیون مقررہ مدت پر پورا دین ادا نہ کر دے، اور یہی سب سے زیادہ صحیح قول ہے۔''

(تحریر الکلام فی مسائل الالتزام للحطاب: صـ ۲۳۱، دیکھئے فتح العلی المالک: ۱/۲۸۹)

یہ عبارات اس بارے میں بالکل صریح ہیں کہ علماء مالکیہ کے نزدیک دیون حالہ میں ''ضع وتعجل'' کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور ظاہر یہ ہے کہ فقہاء مالکیہ کے علاوہ دوسرے فقہاء بھی اس مسئلہ میں ان کے ساتھ متفق ہیں، اس لئے کہ دوسرے علماء نے جہاں کہیں ''ضع وتعجل'' کے حرام ہونے کا ذکر کیا ہے، وہاں ''دیون مؤجلہ'' کی قید بھی لگائی ہے، جیسا کہ مؤطا میں امام محمد بن حسن کی ذکر کردہ عبارت اور اس پر قائم کئے گئے ترجمۃ الباب سے یہی ظاہر ہو رہا ہے، اسی طرح علامہ ابن قدامہؒ نے بھی اس مسئلہ کو ''دین مؤجل'' کے ساتھ مقید کیا ہے (دونوں کی عبارات پیچھے گذر چکی ہیں) اور یہ بات بداہت کے ساتھ ثابت ہے کہ کتب فقہ میں مفہوم مخالف حجت ہوتا ہے، لہٰذا اس سے ظاہر ہوا کہ دیون حالہ میں ''ضع و تعجل'' جائز ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ نصف دین ساقط کرنے کے بارے میں حضرت کعب اور حضرت ابن ابی حدرد رضی اللہ عنہما کا واقعہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

" فقال اهل العلم فی التطبیق بینه و بین هذه الآثار، ان الآثار فی المؤجل، و هذا فی الحال، و فی کتاب الرحمة: اتفقوا علی ان من کان له دین علی انسان الی اجل، فلا یحل له ان یضع عنه بعض الدین قبل الاجل، لیعجل له الباقی ...... علی انه لا باس اذا حل الاجل ان یاخذ البعض و یسقط البعض." (المسوی علی المصفی: ۲/۳۸۲)

''اہل علم اس واقعہ کے درمیان اور ان آثار کے درمیان جو ''ضع وتعجل'' کے بارے مروی ہیں، اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ ان آثار اور روایات کا تعلق دین مؤجل سے ہے، اور یہ واقعہ دین حال سے متعلق ہے، اور کتاب الرحمۃ میں ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے پر کسی مدت کے لئے

دین واجب ہو تو دائن کو مدت کے آنے سے پہلے یہ کرنا جائز نہیں کہ دین کا کچھ حصہ معاف کردے تا کہ بقیہ دین فوراً وصول کرلے ...... ہاں! اس میں کوئی حرج نہیں کہ جب دین کی ادائیگی کا وقت آجائے اس وقت کچھ دین وصول کرلے اور باقی معاف کردے۔''

دیون مؤجلہ اور دیون حالہ میں فرق اس لحاظ سے بالکل واضح ہے کہ دین حال میں مدت کی شرط نہیں ہوتی اور ''تاخیر'' مدیون کا حق نہیں ہوتا، لہٰذا چونکہ اس میں ''مدت'' منتفی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دین کا جو حصہ معاف کردیا ہے، وہ ''مدت'' کے عوض معاف کیا ہے، لہٰذا اس میں ربا کے معنی نہیں پائے جاتے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرض حسن، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ کے نزدیک مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا (یعنی قرض میں مدت ذکر کرنے سے وہ مدت لازم نہیں ہوتی) مالکیہ کے نزدیک قرض مؤجل ہو جاتا ہے۔ علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وان اجل القرض لم يتأجل، و كان حالا، و كل دين حل أجله، لم يصر مؤجلاً بتأجيله، و بهذا قال الحارث العكلي و الاوزاعي و ابن المنذر و الشافعي، و قال مالك و الليث: يتأجل الجميع بالتأجيل ...... و قال ابو حنيفة في القرض و بدل المتلف كقولنا."

قرض مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا، بلکہ ادائیگی فوری واجب رہے گی، اور ہر وہ دین جس کی ادائیگی کا وقت آچکا ہو، اب وہ دین مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوگا، امام حارث العکلی، امام اوزاعی، ابن منذر اور امام شافعی کا بھی یہی قول ہے، اور امام مالک اور امام لیث فرماتے ہیں کہ ہر قرض مؤجل کرنے سے مؤجل ہو جاتا ہے...... قرض اور ہلاک شدہ چیز کے بدل کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا بھی وہی قول ہے جو ہمارا ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اختلف العلماء في تاخير الدين الى اجل، فقال ابو حنيفة و اصحابه: سواء كان القرض الى اجل او غير اجل، له ان ياخذه متى احب، و كذلك العارية و غيرها، لانه عند هم من باب العدة و الهبة غير مقبوضة، و هو قول الحارث العكلي و اصحابه و ابراهيم النخعي،

وقال ابن ابی شیبۃ : وبہ نأخذ وقال مالک واصحابہ : اذا اقرضہ الی اجل ثم اراد ان یأخذ قبل الأجل لم یکن لہ ذلک . "

(عمدۃ القاری للعینی : ٦/ ٦٠ ، کتاب الاستقراض باب اذا اقرضہ ، الی أجل مسمی ، مزید دیکھئے : احکام القرآن للجصاص : ٢/ ٤٨٣ ، فتح الباری : ٥/ ٦٦ ، مسوی مع المصفیٰ : ٢/ ٣٨٢ تنقیح الحامدیۃ : ١/ ٢٧٧ ، شرح المجلۃ للاتاسی : ١/ ٤٣٩)

کسی مدت تک دین کو مؤخر کرنے کے بارے علماء کا اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ قرض چاہے مؤجل ہو یا غیر مؤجل، دونوں صورتوں میں دائن اپنا قرض جب چاہے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے، اور عاریت کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ یہ مدت ان کے نزدیک وعدہ اور ہبہ غیر مقبوض کی طرح ہے، حارث عکلی اور ان کے اصحاب اور امام ابراہیم نخعی کا بھی یہی قول ہے، اور ابن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں، امام مالکؒ اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ جب کسی مدت تک کے لئے قرض دے دیا تو دائن اس مدت سے پہلے قرض واپس لینا چاہے تو واپس نہیں لے سکتا۔

لہٰذا جو فقہاء اور علماء یہ کہتے ہیں کہ ''قرض مؤجل کرنے سے مؤجل نہیں ہوتا'' ان کے نزدیک ''ضع وتعجل'' کا اصول قرض میں جائز ہے، اس لئے کہ ان کے نزدیک قرض دیون حالہ میں سے ہے، اور ''دیون حالہ'' میں ''ضع وتعجل'' کا اصول جاری کرنا جائز ہے، اور اس کے اصل حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حضرت عبداللہ بن ابی حداد اسلمی رضی اللہ عنہ پر دین تھا جب حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی حضرت عبداللہؓ سے ملاقات ہوئی تو ان کو پکڑ لیا، اور دونوں قرض پر زور زور سے گفتگو کرنے لگے، اتنے میں حضور اقدس ﷺ وہاں سے گزرے، آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ دونوں قرض پر جھگڑ رہے ہیں تو آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے اس طرح اشارہ فرمایا گویا کہ آپ ﷺ فرما رہے ہیں کہ نصف قرض لے لو، اور نصف چھوڑ دو۔ چنانچہ انہوں نے نصف لے لیا اور نصف چھوڑ دیا۔

(امام بخاری نے صحیح بخاری میں اس کو کئی جگہ روایت کیا ہے، اور یہ الفاظ ''کتاب الخصومات'' باب فی الملازمۃ، حدیث نمبر: ۲۴۲۴ میں مذکور ہیں)

تعجیل کی صورت میں بلا شرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

دین مؤجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب یہ ''چھوڑنا''، تعجیل کے لئے شرط نہ ہو، بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے، لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو، تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں، چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ ''ضع و تعجل'' کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ملی ہیں، ان کو اسی پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ومن اجاز من السلف اذا قال: عجل لی و ضع عنك، فجائز ان يكون اجازوه اذا لم يجعله شرطا فيه، وذلك بان يضع عنه بغير شرط، ويعجل الاخر الباقی بغير شرط.

(احكام القرآن للجصاص: ١/٤٦٧، آيت ربا)

جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ ''تم میرا دین جلدی ادا کر دو، میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا'' بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے، جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو، دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے، اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کر دے۔

(ماخوذ از فقہی مقالات: ١/١٠٠-١١٥)

میراث سے صلح (تخارج) کے چار اہم مسائل:

تخارج کی چند صورتوں کو وضاحت کے لئے سوال و جواب کی صورت میں نقل کئے دیتے ہیں تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

سوال: ایک آدمی کو وفات پائے عرصہ پانچ سال گزر گیا، اس نے ورثاء میں ایک بیوی پانچ لڑکے چھ لڑکیاں چھوڑی ہیں، فوت ہونے کے بعد فوراً جائیداد تقسیم کر دی گئی، جائیداد غیر منقولہ میں ۲/۱ ۳۵ ایکڑ زمین ایک گھر اور ایک پلاٹ تھا، اور منقولہ جائیداد میں چوپائے، زیورات اور گھریلو سامان تھا، گھریلو سامان، زیورات، چوپائے اور جانوروں کی قیمت لگائی گئی اور ساتھ ہی بڑے لڑکے پر جو تیرہ سو روپے قرض تھا وہ بھی اس قیمت میں جمع کیا گیا، کل رقم چودہ ہزار روپے بنی جو ورثاء کے حصص کے مطابق تقسیم کر کے ہر ایک وارث کا حصہ متعین کر دیا گیا، پھر تین بڑی

لڑکیوں سے جو عاقلہ بالغہ شادی شدہ تھیں پوچھا گیا کہ آپ اپنا حصہ جائیداد سے لینا چاہتی ہیں یا دوسرے ورثاء کے حق میں دست بردار ہوتی ہیں؟ تینوں نے منقولہ جائیداد سے چند متعین چیزیں لیکر باقی حصہ اپنے پانچ بھائیوں کو بخش دیا۔ ایک لڑکی نے ایک ہزار روپے قیمت والی بھینس لیکر باقی حصہ جائیداد بھائیوں کو بخش دیا، دوسری نے سلائی مشین چار سو روپے قیمت کی اور کانے پانچ سوئی لے کر باقی حصہ بھائیوں کو بخش دیا، تیسری نے ۱ ایکڑ زمین لے کر باقی حصہ بھائیوں کو بخشا۔

اب پانچ سال گزرنے پر بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ تخارج باطل ہے، جائیداد کی از سر نو تقسیم ہوگی، اس لئے کہ صحت تخارج کے لئے ایک تو تمام ورثاء کا عاقل ہونا شرط ہے، حالانکہ اس وقت ان میں ایک لڑکا ۱/۲ ۱۴ سال کا تھا۔

دوسری وجہ یہ کہ ایک وارث پر دین تھا اور ترکہ میں دین ہونے کی صورت میں تخارج باطل ہو جاتا ہے، حالانکہ یہ دین وارث پر تھا جو منقول جائیداد کے ساتھ شامل کر کے ورثہ پر تقسیم کیا گیا تھا بایں صورت کہ جس وارث پر دین تھا اس وارث ہی کے حصہ میں اس کو مجرا کیا گیا تھا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

یہاں چار امور قابل تحقیق ہیں:

(۱) میت کا کسی وارث پر دین ہو تو وہ تخارج سے مانع ہے یا نہیں؟

( ) مصالح اپنا حصہ صرف بعض وارثوں کو دے دوسروں کو نہ دے تو تخارج صحیح ہوگا یا نہیں؟

(۳) تخارج بغبن فاحش صحیح ہے یا نہیں؟

(٤) وارثوں میں کوئی صغیر ہو تو تخارج درست ہے یا نہیں؟

ان امور اربعہ کی تحقیق بالترتیب تحریر کی جاتی ہے:

۱۔ اگر ترکہ منقولہ میں مدیون کے حصۂ میراث سے دین زائد ہو تو تخارج سے مانع ہے ورنہ نہیں، اس لئے کہ منع دین کی علت "تمليك الدين من غير من عليه الدين" ہے جو کہ ترکہ منقولہ میں حصۂ میراث سے متجاوز دین میں موجود ہے کہ مصالح مدیون کے علاوہ دوسرے وارثوں کو بھی دین کا مالک بنا رہا ہے مگر ترکہ منقولہ سے غیر متجاوز دین میں یہ علت مفقود ہے اس لئے کہ

ترکہ منقولہ کی تقسیم میں اس کی قیمت لگا کر تقسیم کرنے کا دستور ہے، اور ظاہر ہے کہ کل ورثاء کی تراضی سے دین کو مدیون کے حصہ میں محسوب کیا جائے گا۔

فھو تملیک الدین ممن علیہ الدین وھو جائز۔

مسئلہ زیر نظر میں یہی صورت ہے، اس لئے یہ دین صحت تخارج سے مانع نہیں۔

۲. اگر بدل صلح ترکہ سے نہیں قرار پایا، بلکہ مصالح اپنے پاس سے ادا کرتا ہے تو یہ تخارج مطلقاً صحیح ہے اور اگر ترکہ سے بدل صلح قرار پایا تو اس میں چونکہ سب وارثوں کا حق ہے اس لئے اس کی صحت کے لئے سب کی رضامندی شرط ہے۔

قال العلائی رحمہ اللہ تعالیٰ: ولو اخرجوا واحدًا من الورثة فحصة تقسم بین الباقی علی السواء ان کان ما اعطوہ من مالھم غیر المیراث وان کان المعطی مما ورثوہ فعلی قدر میراثھم یقسم بینھم،

وقال ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ: افادان احد الورثة اذا صالح البعض دون الباقی یصح وتکون حصتہ لہ فقط کذا لو صالح الموصی لہ کما فی النقروی سائحانی. (ردالمحتار: ٥٣٧/٤)

قلت: فی مسألتنا وقع التخارج بتراضی الورثة فاندفع ھذا الاشکال ایضا لکن بقی رضا الصغیر وسیأتی حکمہ.

۳. بدل صلح خواہ کتنا ہی قلیل ہو تخارج جائز ہے، البتہ اگر کسی کے ساتھ یوں دھوکا ہوا کہ بوقت صلح وہ کسی چیز کی صحیح قیمت سے آگاہ نہ تھا بعد میں غبن فاحش ظاہر ہوا تو اس کو قاضی سے صلح فسخ کرانے کا اختیار ہے۔

فی شرح التنویر: ولو ظھر غبن فاحش لایدخل تحت التقویم فی القسمة فان کانت بقضاء بطلت اتفاقا لان تصرف القاضی مقید بالعدل ولم یوجد ولو وقعت بالتراضی تبطل ایضافی الاصح لان شرط جوازھا المعادلة ولم توجد فوجب نقضھا خلافاً لتصحیح الخلاصة قلت فلو قال کالکنز تفسخ لکان اولی وتسمع دعواہ ذلک ای ما ذکر من الغبن الفاحش ان لم یقر بالاستیفاء وان اقربہ لا.

وفی الحاشیة : (ولو ظهر غبن فاحش فی القسمة) ای فی التقویم للقسمة بأن قوم بالف فظهر انه یساوی خمس مائة .

وفیها تحت (قوله قلت الخ) فمقتضاه انها تحتاج الی الفسخ وان معنی تبطل و بطلت له ابطالها و به یشعر قول الکنز تفسخ حیث لم یقل تنفسخ . (ردالمحتار : ١٨٧/٥)

علائیہ کی عبارت مذکورہ سے بعض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں بوجہ غبن فاحش تخارج باطل ہے، حالانکہ علائیہ وشامیہ کی عبارت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ تخارج کے بعد غبن فاحش کے ظہور سے خیار فسخ ہے اور اس کا دعویٰ مسموع ہے، غبن کہتے ہی اس نقصان کو ہیں جو عقد کے بعد ظاہر ہو، بوقت عقد جو نقصان ظاہر اور معلوم ہو وہ خواہ کتنا ہی فاحش ہو غبن نہیں، یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تخارج میں بدل صلح کی کوئی کمیت مشروط نہیں، معہذا تسکین خاطر خام کے لئے چند امور تحریر کئے جاتے ہیں:

(١) کتب مذہب میں تصریح ہے کہ بدل صلح سونا یا چاندی، یا مکیل یا موزون ہو تو صحت تخارج کے لئے یہ شرط ہے کہ بدل صلح اس چیز میں مصالح کے حصہ سے زائد ہو، آگے یہ کوئی شرط نہیں کہ کل ترکہ سے اس حصہ کی کیا نسبت ہو، اور اگر بدل صلح اشیاء مذکورہ سے نہ ہو تو اس میں کوئی کمیت بھی مشروط نہیں۔

(٢) تخارج بحکم بیع ہے اور بیع میں بتراضی متعاقدین بدلین میں تفاوت کثیر جائز ہے۔

(٣) قال ابن عابدین رحمه الله تعالیٰ : اوصی لرجل بثلث ماله ومات الموصی فصالح الوارث الموصی له من الثلث بالسدس جاز الصلح وذکر الامام المعروف بخواهرٌ زاده ان حق الموصی له وحق الوارث قبل القسمة غیر متأکد یحتمل السقوط بالاسقاط اهـ .

(رد المحتار : ٥٣٦/٤)

اس میں اسقاط بالصلح مراد ہے، مطلق اسقاط صحیح نہیں کما حررت فی کتاب الوصیة والفرائض تحت عنوان "وارث کا حق اس کے اسقاط سے ساقط نہیں ہوتا۔" احسن الفتاویٰ جلد ۹ میں۔

اسقاط بالصلح کی مثال کی عبارت مذکورہ میں صلح من الثلث بالسدس مذکور ہے جس میں تضعیف وتنصیف کی نسبت ہے اور خود علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالی نے غبن فاحش کی مثال میں یہی نسبت بیان فرمائی ہے۔

کما مر فی نصه : بأن قوم بالف فظهر انه یساوی خمس مائة .

اس سے ثابت ہوا کہ تفاوت فاحش کے باوجود تخارج جائز ہے۔

(٤) اگر صغیر خود عاقد ہو تو بیع وشراء وغیرہ عقود دائرہ بین النفع والضرر کی طرح عقد صلح میں بھی صغیر کا عاقل ہونا شرط ہے، بلوغ شرط نہیں۔

صغیر غیر عاقل کا عقد منعقد نہیں ہوتا اور عاقل غیر ماذون کا عقد منعقد ہو جاتا ہے، مگر اذن بعد البلوغ یا اذن ولی پر موقوف ہے۔

ولی فی المال بالترتیب یہ ہیں:

باپ، اس کا وصی، دادا، اس کا وصی، قاضی۔

فی صلح شرح التنویر : وشرطه العقل لا البلوغ والحرية فصح من صبی مأذون ان عری صلحه عن ضرر بین .

(رد المحتار : ٤/٥٢٦)

وفی الهندية : واما شرائطه فانواع منها ان یکون المصالح عاقلا فلا یصح صلح المجنون والصبی الذی لا یعقل هکذا فی البدائع .

(عالمگیریة : ٤/٢٢٩)

وفی کتاب المأذون من شرح التنویر : وتصرف الصبی والمعتوه الذی یعقل البیع والشراء ان کان نافعاً محضا کالاسلام والاتهاب صح بلا اذن وان کان ضارًا کالطلاق والعتاق والصدقة والقرض لا وان اذن به ولیهما وما تردد من العقود بین نفع وضرر کالبیع والشراء توقف علی الأذن حتی لو بلغ فاجازه نفذ فان اذن لهما الولی فهما فی شراء وبیع کعبد مأذون فی کل احکامه. (رد المحتار: ٥/١٢١)

اور اگر صبی خود مباشر عقد نہ ہو بلکہ اس کی طرف سے کوئی دوسرا عقد کرے تو صبی کا عاقل ہونا

شرط نہیں، بہرصورت صلح منعقد ہو جائے گی۔ البتہ اس عقد کے نفاذ کے لئے یہ شرط ہے کہ صبی کی طرف سے اس کا ولی فی المال عقد کرے، اگر غیر ولی نے عقد کیا تو وہ منعقد تو ہو جائے گا مگر صبی کے اذن بعد البلوغ یا اذن ولی یا اذن قاضی پر موقوف رہے گا۔

البتہ تقسیم غیر ترکہ میں دو قول ہیں، ایک یہ کہ عام عقود فضولی کی طرح یہ بھی موقوف ہے، دوسرا قول یہ کہ یہ تقسیم باطل یعنی منعقد نہیں ہوتی، رحمتی رحمہ اللہ تعالیٰ نے وجہ الفرق یہ بیان فرمائی ہے کہ انعقاد عقد فضولی میں وجود متعاقدین شرط ہے جو یہاں مفقود ہے۔

وسنذكر نصه عن الرافعي رحمه الله تعالىٰ .

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : قال في المحيط فلو قسم بغير قضاء لم تجز الا ان يحضر (الغائب) او يبلغ (الصغير) فيجيز طوري وهذا ما قدمه الشارح . (رد المحتار : ١٨٢/٥)

ونص الشارح المتقدم : وصحت برضا الشركاء الا اذا كان فيهم صغير او مجنون لا نائب عنه او غائب لا وكيل عنه لعدم لزومها حينئذ الا باجازة القاضي او الغائب او الصبي اذا بلغ او وليه هذا لو ورثة ولو شركاء بطلت منية المفتي وغيرها .

وقال ابن عابدين رحمه الله تعالى : (قوله اذا كان) استثناء منقطع كما يفيده قوله بعد لعدم لزومها اواستثناء من محذوف اى ولزمت اه ط او اراد بالصحة اللزوم (قوله الا باجازة القاضي) الظاهر رجوعه للمستثنيات الثلاث (قوله او الغائب او الصبي اذا بلغ) ولو مات الغائب اوالصبي فاجازت ورثته نفذت عندهما خلافا لمحمد منية المفتي والاول استحسان والثاني قياس وكما تثبت الاجازة صريحا بالقول تثبت دلالة بالفعل كالبيع كما في التاتار خانية وفي المنح عن الجواهر : طفل وبالغ اقتسما شيئا ثم بلغ الطفل وتصرف في نصيبه وباع البعض يكون اجازة (قوله هذا) اى لزومها باجازة القاضي ونحوه لو كانوا شركاء في الميراث فلو شركاء في

غیره تبطل و مقتضاه انها لا تنفذ بالاجازة فليتأمل .

وعبارة المنية هكذا : اقتسم الورثة لا بامر القاضي وفيهم صغير او غائب لا تنفذ الا باجازة الغائب او ولى الصغير او يجيز اذا بلغ اقتسم الشركاء فيما بينهم وفيهم صغيرا و غائب لا تصح القسمة فان امرهم القاضي بذلك صح .

اقول : سيذكر المصنف تبعا لسائر المتون ان القاضي لا يقسم لو كانوا مشترين وغاب احدهم فكيف تصح قسمة الشركاء بامر القاضي ، اللهم الاان يراد به الشركاء في الميراث لكن يبقى قول الشارح ولو شركاء بطلت محتاجا الى نقل ونقل الزاهدي في قنيته : قسمت بين الشركاء وفيهم شريك غائب فلما وقف عليها قال لا ارضى لغبن فيها ثم اذن لحراثه في زراعة نصيبه لا يكون رضا بعد ما رد فليحرر وولا تنس ماقدمه من ان للشريك اخذ حصته من المثلى بغيبة صاحبه وما نقله عن الخانية فانه مخصص لما هنا .

(رد المحتار : ٥/ ١٨٠)

وقال الرافعي رحمه الله تعالىٰ : (قوله الظاهر رجوعه للمستثنيات الثلاث) يدل له ما نقله في المنح عن السراج بقوله ولهم ان يقسموا الانفسهم اذا تراضوا الا ان يكون فيهم صغيرلاولى له اوغائب لاوكيل عنه فحينئذ لا تجوز بالاصطلاح بل لا بد من القاضي لانه لا ولاية لهم على الصغير ولا على الغائب فان امر القاضي بها جاز على الصغير والغائب لان له ولاية على الصغير ونظراً على الغائب وتصرفه يصح على الميت (قوله لكن يبقى قول الشارح ولوشركاء بطلت محتاجا الى نقل) .

علل البطلان الرحمتي في هذه المسألة بأن كل واحد اجنبي في حق صاحبه فلم يوجد قابل عن الصغير ونحوه وشرط عقد الفضولي

وجود القابل عن المالك ولا يتوقف شرط العقد على غائب بخلاف مسألة الورثة لان بعضهم يصلح خصيما عن الباقين فيصح ان يكون بعضهم مقاسما وبعضهم مقاسما اهـ ومعلوم ان الشارح ثقة فى النقل يعتمد عليه فيه حتى يوجد ما يخالفه .

(التحرير المختار : ۲/۲۹٦)

تحقیق مذکور سے ثابت ہوا کہ عبارات فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ میں جہاں وجود صغیر صحت تقسیم ترکہ سے مانع بتایا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم لازم و نافذ نہیں بلکہ اذن ولی یا اذن والی یا اذن بعد البلوغ پر موقوف ہے، اس لئے ان عبارات سے بعض اصاغر کا عدم انعقاد پر استدلال غلط فہمی پر مبنی ہے۔

مسئلہ زیر بحث:

امور بالا کی تحقیق سے مسئلہ زیر بحث صاف ہوگیا اس میں صغیر کی طرف سے غیر ولی نے عقد تخارج کیا ہے اس لئے تخارج علی الارض کا عقد موقوف ہے، کوئی وارث قاضی سے اذن حاصل کرلے تو یہ عقد نافذ ہوجائے گا ورنہ صغیر کے اذن بعد البلوغ تک موقوف رہے گا، اگر صغیر قبل البلوغ فوت ہوگیا تو اس کے ورثاء کے اذن سے نافذ ہوجائے گا۔

تخارج علی العروض کا عقد ابتداء ہی سے نافذ ولازم ہے۔

لان للام والاخ بيع المنقول من مال الصغير لغيره تجارة .

وما رأيت حكم فسخ احد من الشركاء تلك القسمة قبل الاذن ،

والظاهر الجواز كما فى سائر العقود الموقوفة .

(۱) ارض صغیر کی بیع کا ولی کو اختیار نہیں الا فی صور مخصوصة ، لیکن ولی کو تقسیم عقار کا اختیار ہے اس لئے کہ تقسیم من کل الوجوہ بیع نہیں بلکہ من وجہ بیع ہے اور من وجہ افراز۔

(۲) باپ اور اس کے وصی، دادا، اور اس کے وصی، اور قاضی کے سوا کسی دوسرے کو جس طرح صغیر کے لئے تقسیم کا اختیار نہیں اسی طرح صغیر کے مال میں تصرف کا بھی اختیار نہیں اس کے مال میں تجارت اور زمین میں زراعت وغیرہ کی اجازت نہیں، البتہ صغیر کی ماں، بھائی اور چچا کو

اس کے مال کی حفاظت، بیع منقول بغرض حفاظت اور صغیر کے لئے طعام ولباس وغیرہ ضروریات خریدنے کی اجازت شرط ہے بشرطیکہ صغیر ان کی پرورش میں ہو، البتہ خود ترکہ میں طعام یا لباس ہو تو اس سے صغیر کا حصہ اس پر خرچ کرنے میں صغیر کا زیر پرورش ہونا شرط نہیں۔

قال فی التنویر : او اشتری الوارث الکبیر طعاما او کسوۃ للصغیر من مال نفسہ .

وفی الشرح : فانہ یرجع ولا یکون متطوعا .

وفی الحاشیۃ : کذا فی الخانیۃ ، ونصھا او اشتری الوارث الکبیر طعاما او کسوۃ للصغیر من مال نفسہ لا یکون متطوعا وکان لہ الرجوع فی مال المیت والترکۃ اہ، اقول : ولم یشترط الاشھاد مع ان فی انفاق الوصی خلافا کما مر وینبغی جریانہ ھنا بالاولی علی انہ قد وقع الاختلاف فی انفاقہ علی الصغیر نصیبہ من الترکۃ نفقۃ مثلہ فی انہ یصدق ام لا قولان حکاھما الزاھدی فی الحاوی ، ثم قال والمختار للفتوی مافی وصایا المحیط بروایۃ ابن سماعۃ عن محمد رحمہ اللّٰہ تعالیٰ مات عن ابنین صغیر وکبیر والف درھم فانفق علی الصغیر خمس مائۃ نفقۃ مثلہ فھو متطوع اذا لم یکن وصیا ولو کان المشترک طعاما او ثوبا واطعمہ الکبیر الصغیر او البسہ فاستحسن ان لا یکون علی الکبیر ضمان اھ .

وفی جامع الفتاویٰ ولو انفق الاخ الکبیر علی اخیہ الصغیر من نصیبہ من الترکۃ ان کان طعاما لم یضمن وان کان دراھم فکذلک ان کان فی حجرہ وفی غیر ذلک یضمن ان لم یکن وصیاہ ومثلہ فی التاتر خانیۃ وقدم المصنف فی فصل البیع من کتاب الکراھیۃ والاستحسان انہ یجوز شراء مالا بد للصغیر منہ وبیعہ لأخ وعم وام وملتقط ھو فی حجر ھم وجارتہ لامہ فقط اہ، ومثلہ فی الھدایۃ وعلیہ فیمکن حمل ما مر عن محمد رحمہ اللّٰہ تعالیٰ علی ماذا لم یکن فی

فحرره تأمل وهو حسن ... قال فما في الخانية مشكل ان لم يكن الكبير وصيا فليتأمل (رد المحتار ٥/ ٥٠٧)

غرضیکہ واقعہ معہودہ میں حقیقی ماں اور بھائیوں پر لازم ہے کہ اس کے حصہ کی زمین حکومت کی تحویل میں دیں۔

(۳) اوپر جو تحقیق لکھی گئی ہے وہ نفس مسئلہ سے متعلق ہے صورت زیر نظر میں اگر بہنوں نے بھائیوں کی ناراضی کے خوف یا رواج کے دباؤ سے ایثار کیا ہے تو بھائیوں کے ذمہ ان کا شرعی حق باقی ہے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

ایک وارث کا دوسرے ورثاء کو کچھ رقم دیکر انکے حصہ سے صلح کرنے کا حکم:

سوال: ایک شخص کے پاس زمین ہے جس میں بعض ورثاء کا حق ہے جو ان کو دیا نہیں گیا اب یہ شخص دوسرے ورثاء کے سامنے مثلاً دوسو روپے پیش کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ تمہارا جو حق اس جائیداد میں ہے اس کے عوض تم مجھ سے اتنے روپے لے لو، باقی چھوڑ دو، یا باقی سے مجھ کو بری کردو یہ صورت جائز ہے یا نہیں؟ فقط

الجواب: قال في الهداية: واذا كانت التركة بين ورثة فاخرجوا احدهم منها بمال اعطوه اياه والتركة عقار او عروض جاز قليلاً كان ما أعطوه اياه او كثيراً لأنه امكن تصحيحه بيعا وان كانت التركة فضة فاعطوه ذهبا او ذهبا فاعطوه فضة فكذالك لانه بيع الجنس بخلاف الجنس ويعتبر التقابض في المجلس لانه صرف وان كانت التركة ذهبا وفضة فصالحوه على فضة او ذهب فلا بد ان يكون ما اعطوه اكثر من نصيبه من ذلك الجنس ولو كان في التركة الدراهم والدنانير وبدل الصلح دراهم او دنانير ايضا جاز الصلح كيف ما كان صرفا للجنس الى خلاف الجنس لكن يشترط التقابض للصرف اهـ. (٢/ ٢٤٠)

صورت مسئولہ میں یہ طریقہ جائز ہے کہ ایک وارث سے دوسرا وارث یوں کہے کہ تمہارا جو حق ترکہ میں ہے اس کے عوض تم مجھ سے اتنی رقم لے لو یا یوں کہے کہ میں تم کو یہ رقم اس شرط پر

دیتا ہوں کہ تم اپنے باقی ترکہ سے خارج اور لادعویٰ ہوجاؤ یا باقی ترکہ سے صلح کے طور پر یہ رقم لے لو یا باقی مجھ کو چھوڑ دو کیوں کہ ان سب صورتوں میں کلام کو صلح پر محمول کرنا ممکن ہے، اور صلح بحکم بیع جائیداد اور سامان غیر نقد میں تو اس طرح معاملہ کرنا مطلقاً درست ہے خواہ اس وارث کا حق نقدین میں بھی ہو اور اس سے بھی صلح کرنا مقصود ہو تو اس میں بعض قیود کی رعایت ضروری ہے جو عبارت عربیہ میں مذکور ہیں۔ فقط حررہ الاحقر ظفر احمد عفا عنہ

تنبیہ ضروری:

آج کل بہنوں کو عام طور سے میراث نہیں دی جاتی اور محض رسم کی وجہ سے ہمشیرہ بھی لینے سے انکار کردیتی ہیں اور ایسے مواقع پر اس قسم کے حیلے فقط ظاہری طور پر کئے جاتے ہیں، دل سے ہمشیرہ رضامند نہیں ہوتی سو ایسے حیلہ سے مال حلال نہ ہوگا، بلکہ جہاں دلی رضامندی سے ہمشیرہ صلح کرنا چاہے اس صورت پر وہاں عمل کیا جاوے اس کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ فقط

(ماخوذ از امداد الاحکام: ۱۳۹/٤)

ترکہ میں رجوع عن الصلح کی ایک صورت:

سوال: ایک عورت کا انتقال ہوا، ورثاء میں اس کے شوہر اور ماں، باپ، دادا، اور دو بیٹے ہیں، تقسیم ترکہ کے وقت زوج نے کہا کہ میں نے سب مال سے یہ چیزیں معینہ لے لی ہیں اور باقی سب مال تم کو چھوڑ دیا ہے، تم یعنی ماں، باپ، دادا اور دو بیٹے باہم تقسیم کرلو اور اب اس پر راضی ہوگئے اور دونوں بیٹے اس شوہر کے صغیر ہیں اس کے بعد ان کو یہ فکر ہوئی کہ اب زوج تو نکل گیا اور ماں باپ اور دو لڑکوں کے درمیان تقسیم کس طرح ہوگی، مسئلہ ان کو معلوم نہ تھا، زوج نے کہا کہ میں اس صلح سے رجوع کرتا ہوں اور تقسیم میں پھر شریک ہوتا ہوں اور سہام بنا کر پورا پورا حصہ لینے میں زوج نے رجوع کرلیا اور کل مال کا ربع لے لیا اور سدس ماں اور سدس باپ نے لے لیا اور باقی مال دونوں لڑکوں کو دیدیا تو کیا زوج کا یہ رجوع صحیح ہے، اگر زوج رجوع نہ کرتا تو بقایا ورثاء کو مال زیادہ آتا اس لئے کہ زوج نے تھوڑی چیزیں لے کر صلح کی تھی۔

الجواب: قال فی الدار الصلح ان کان بمعنی المعاوضة بأن کان دیناً بعین ینتقض بنقضها ای بفسخ المتصالحین وان کان لا بمعناها ای المعاوضة بل بمعنی استیفاء البعض واسقاط البعض فلا

تصح اقالة ولا نقضه لأن الساقط لايعود . اهـ (٧٣٣/٥)

صورت مسئولہ میں نقض صلح جائز نہیں کیوں کہ ورثاء میں نابالغ بھی ہیں اور نابالغ کے حق میں صلح مفید تھی، اور نقض صلح مضر ہے، اور نقض صلح بدون تراضی ورثاء درست نہیں، اور نابالغ کی رضا معتبر نہیں، دوسری اس صلح میں استیفاء بعض واسقاط بعض ہے۔ معاوضہ کی صورت نہیں اس لئے بتراضی ورثاء بالغین کے حق میں بھی صلح منتقض نہیں ہوسکتی پس زوج نے جو اشیاء اول لے لی ہیں وہی اس کا حق ہے باقی کے چھ سہام کر کے ایک سہم ماں کا ایک سہم باپ کا حق ہے اور چار سہام لڑکوں کے ہیں دو ایک کے دو ایک کے۔ واللہ اعلم

(ماخوذ از امداد الاحکام: ١٤٢/٤)

احکام الوقف

الوقف لغۃ:

الحبس يقال: وقف داره أو ماله في سبيل الله اى حبسها وخصصها في وجوه الخير، طلبا لمرضاة الله، ولا يقال أوقف الا في لغة رديئة والافصح أن يقال: وقفها.

وقف کے لغوی معنیٰ روکنا، لہٰذا وقف مالہ فی سبیل اللہ کا معنیٰ ہے، مال کو نیک کاموں میں خرچ کرنے کے لئے خاص کر دینا۔

الوقف شرعاً:

هو اخراج شئى من ملكه وجعله ملكا لله عزوجل، موقوفا في وجوه الخير كالمسجد، والمدرسه، والمستشفیٰ، واجراء الماء، وسقى الحجاج والمعتمرين، وسائر وجوه الخير والاحسان، ابتغاء الاجر والثواب، وهذا ما يسمى الوقف الخيرى . (فقه المعاملات)

وقف کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ: اپنی مملوکہ مال کو اپنی ملک سے نکال کر اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کر دینا اور وجوہِ خیر، مساجد، مدارس، ہسپتال، پانی کا کنواں، یا حجاج کرام اور معتمرین کو پانی پلانا، اسی طرح دیگر کارِ خیر کے مال کو خاص کر دینا، وقف ہے۔

وقف کی مشروعیت:

اپنے اموال کو کارِ خیر کے لئے وقف کرنا یہ شرعاً مطلوب ومحمود ہے انسان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ دراز تک اجر وثواب حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ جوانی، صحت وعافیت، وتندرستی کے زمانہ میں اعمال صالحہ میں عام طور پر کمی کوتاہی ہوجاتی ہے، اور آخری عمر میں مؤمن میں اعمالِ صالحہ کی رغبت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن قوی کمزور ہونے کی وجہ سے جوانی وصحت کے زمانہ کی طرح اعمال انجام دینے پر قدرت برقرار نہیں رہتی، دوسری طرف موت کا وقت قریب نظر آتا ہے، اور آخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر وثواب حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، تو شریعت مطہرہ نے بعض ایسے اعمال بتلائے کہ انسان کے مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب برابر پہنچتا رہتا ہے، انہی اعمال میں سے ایک ''وقف للہ'' بھی ہے۔

كما روى عن النبي صلى الله عليه وسلم : اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلاث، صدقة جارية، او علم ينتفع به، أو ولد يدعوله . (مسلم رقم ١٦٣١ ، في الوصية ، ترمذی : ١٣٧٦، ابو داؤد ٢٨٨٠، نسائی ٦/ ٢٥١ ، في الوصايا)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ، جب انسان کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ پر اجر وثواب کا ملنا بند ہوجاتا ہے مگر تین اعمال کے ثواب جاری رہتا ہے۔

(۱) صدقہ جاریہ۔

(مثلاً کوئی مسجد بنوادی، سبیل لگوادی، پانی کا کنواں کھدوایا، قرآن کریم کا مکتب مدرسہ بنوادیا، وغیرہ)

(۲) یا علم دین چھوڑ کر گیا جس سے لوگ فائدہ حاصل کرتے رہے، (مثلاً کسی کو دین کی تعلیم دی، کسی کو قرآن وحدیث پڑھایا، یا کوئی دینی کتاب تصنیف کی، یا قرآن کریم چھپوا کر تقسیم کیا وغیر ذالک)

(۳) یا کوئی صالح اولاد چھوڑ کر مرا جو اس کے حق میں دعا کرتی رہتی ہے۔

(مسلم ، ترمذی وغیرہ)

اس روایت میں صدقۂ جاریہ سے مراد وقف ہی ہے جس شکل میں بھی ہو۔

اسلام میں سب سے پہلا وقف:

اسلام آنے کے بعد سب سے پہلا وقف جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، وہ مخیریق رضی اللہ عنہ کی زمین جو آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے لئے وصیت کی گئی تھی ان کے انتقال کے بعد جب آپ ﷺ کی ملکیت میں آئی تو آپ ﷺ نے وقف فرمادی، چنانچہ وہ زمین مدینۃ الرسول ﷺ میں ارض صدقۃ یعنی وقف زمین کے نام سے مشہور تھی اس کا تفصیلی واقعہ حدیث میں یوں مذکور ہے۔

قصة مخيريق : ومخيريق هو احد اكابر احبار اليهود ، اسلم رضى الله عنه ، وخرج يوم السبت ليعظ قومه، وسأل عن رسول الله صلى الله عليه وسلم فقيل له : لقد خرج الى " أحد " لحرب أعدائه من قريش، فطلب من قومه الخروج لمساعدة رسول الله عليه السلام، كما هو العهدبينهم وبينه، فأبوا اعانته ، فدخل بيته ، ولبس عدّة الحرب، وحمل سلاح، وقال لأهله : اذا أنامت فى خروجى هذا، فمالى كله لرسول الله صلى الله عليه وسلم : وقاتل رضى الله عنه حتى قتل ، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم "مخيريق سابق يهود" أى سابقهم الى الاسلام والى رضوان الله ، ووقف رسول الله صلى الله عليه وسلم هذه الأرض التى أوصىٰ له بها"مخيريق" فكانت أول وقفٍ فى الاسلام .

(انظر ملتقى الابحر : ١/٣٩٩ لفضيلة الشيخ وهبى سليمان الالبانى بتحقيقه)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو بھی اس کی ترغیب دی اور صحابہ کرام میں بھی وقف کا سلسلہ جاری رہا بہت سے باغات اور زمین پانی کے کنویں وغیرہ وقف کیے، جو سیرت و تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا وقف:

روى البخارى ومسلم عن عبدالله بن عمر رضى الله عنهما أنه قال : " أصاب عمر أرضاً بخيبر، فأتى النبى صلى الله عليه وسلم

يستأمره فيها، أي يستشيره ماذا يصنع بها، فقال يا رسول الله إني أصبت أرضا بخيبر، لم اصب قط مالا أنفس عندي منه، فما تأمرني فيها ؟

فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ان شئت حبست اصلها. أي وقفتها في سبيل الله، وتصدقت بها، غير أنه لا يباع أصلها ولا يبتاع، أي ولا يشترى، ولا يوهب ولا يورث!!

قال: فتصدق بها عمر في الفقراء، وذوي القربى، والرقاب، وابن السبيل، والضيف، لا جناح، أي لا اثم على من وليها أن يأكل منها، أو يطعم صديقا بالمعروف، غير متأثل فيه مالا "أي غير متكسب منها المال.

فهذا وقف للأرض، وما يكون فيها من ثمر، من أمير المؤمنين عمر، رضي الله عنه وأرضاه.

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر، اس زمین کے بارے میں مشورہ کیا، کہ یا رسول اللہ یہ زمین میرے لئے بہترین عمدہ اور پسندیدہ مال ہے، آپ مشورہ دیں کہ میں اس زمین کو کس مصرف میں لاؤں؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو اس کو اللہ کے لئے وقف کردیں اس طرح کہ پھر یہ زمین نہ فروخت ہوسکے گی، نہ کسی اور کو ہبہ ہوسکے گی، نہ ہی آپ کے انتقال کے بعد اس میں وراثت جاری ہوگی، ابن عمر فرماتے ہیں، اس مشورہ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کو وقف فرما دیا، فقراء، قرابت دار، مسافر، غلام آزاد کرنے وغیرہ مصارف پر اس کی آمدن کو خرچ کیا جائے، اسی طرح جو اس وقف کا متولی ہوگا وہ بھی ضرورت کے وقت اس کی آمدن کو استعمال کرسکے گا البتہ متولی اس وقف کو مال جمع کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔

گویا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے زمین اور اس کے پھلوں کا وقف ہوا۔

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا وقف:

وروى الشيخان عن انس رضي الله أنه قال :

" كان أبو طلحة رضي الله عنه أكثر الأنصار بالمدينة مالا من نخل ، و كان أحب أمواله اليه ، "بيْرحاء" بستان من نخيل ، و كانت مستقبلة المسجد ، و كان رسول الله صلى الله عليه و سلم يد خلها، ويشرب من ماء فيها طيب ، أى عذب ، فلما نزلت هذه الآية ﴿ لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ قام أبو طلحة الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله : ان الله أنزل عليك : ﴿ لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ وان أحب مالى الى "بير حاء" وانها صدقة لله تعالىٰ، أرجو برها و ذخرها، أى أرجو خيرها و أجرها عند الله تعالىٰ، فضعها يا رسول الله حيث أراك الله!!

فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم : بخ، أى ما أحسن هذا؟ ذلك مال رابح ، ذلك مال رابح، وقد سمعت ما قلت ، وانى أرىٰ أن تجعلها فى الأقربين !!فقال أبو طلحة : أفعل ذلك يا رسول الله فقسمها أبو طلحة فى أقاربه وبنى عمه " .

(اخرجه البخارى رقم : ١٤٦١ ، ومسلم رقم : ٩٩٨)

فدل هذا الحديث الشريف، على أن الوقف جائز فى "الوقف الأهلى "كما هو جائز فى الوقف الخيرى ، وقد أشار عليه صلى الله عليه وسلم أن يجعلها فى أقاربه لعلمه بفقرهم .

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مدینۃ الرسول ﷺ میں مالدار ترین انصاری صحابہ میں سے تھے، ان کا سب سے پسندیدہ محبوب مال ''بیرحاء'' نامی کھجور کا باغ تھا، وہ مسجد نبوی ﷺ کے سامنے کی جانب تھا، رسول اللہ ﷺ اس باغ میں تشریف لاتے اور عمدہ میٹھا پانی نوش فرماتے ، جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ''لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ''یعنی تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے، اور میرا پسندیدہ

مال ''بیر حاء'' ہی ہے اس کو اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں، میں اللہ تعالیٰ سے اس کے اجر وثواب کی امید رکھتا ہوں، اے اللہ کے رسول آپ اس کو جس کارِ خیر میں چاہیں خرچ فرمائیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ذرا توقف کرو، غور وفکر کرو، یہ ایک نفع بخش مال ہے، میں نے آپ کی پوری گفتگو سن لی ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپ اس کو اپنے خاندان کے افراد کے لئے وقف کریں، تو ابو طلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ میں اس کو اپنے خاندان کے افراد پر وقف کرتا ہوں، چنانچہ ابو طلحہؓ نے اس کو اپنے خاندان کے محتاج افراد پر تقسیم کردیا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا عام اوقاف کی طرح خاندان کے مستحق افراد کے حق میں وقف کرنا بھی جائز ہے۔

وقف کا حکم:

جب کوئی انسان اپنے کسی مال کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کردے، مثلاً یوں کہہ دے، ''وقفت هذه الدار على فقراء المسلمين، او هذا وقف الله عزوجل فى حياتى وبعد وفاتى'' یعنی میں نے اس گھر کو فقراء، مسلمین پر وقف کردیا، یا یہ گھر اللہ کے لئے وقف ہے، میری زندگی اور میرے مرنے کے بعد، اب صرف زبان سے یہ مکمل جملہ کہہ دینے سے وقف تام ہوجائے گا، اور اس کی ملک سے موقوفہ زمین جائیداد نکل جائے گی یا کچھ اور بھی تصرف کی ضرورت ہے؟

اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہ ہے کہ وقف تام ہونے اور موقوف کا واقف کی ملک سے نکلنے کے لئے دو باتوں میں سے کسی ایک بات کا ہونا ضروری ہے:

(۱) حاکم فیصلہ کردے کہ یہ وقف عام مسلمانوں کے لئے ہوگیا ہے۔

(۲) وہ واقف یوں کہے کہ میرے مرنے کے بعد میرا گھر یا زمین جائیداد فلاں پر یعنی فلاں مسجد یا فلاں مدرسہ پر وقف ہے اب واقف کا انتقال ہوتے ہی اس کی ملک ختم ہوجائے گی لیکن صاحبین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف زبانی وقف کرنے سے وقف تام ہوجاتا ہے اور واقف کی ملک ختم ہوجاتی ہے، اب وقف سے رجوع کرنا جائز نہیں۔

وقد جاء فى ملتقى الابحر قوله: الوقف عند ابى يوسف ومحمد هو حبس العين على ملك الله تعالىٰ على وجه يعود نفعه الى العباد، ويلزم بزوال ملكه بمجرد القول وهو المختار للفتوى.

(ملتقی الابحر للحلبی : ۱/ ۴۰۰)

موت کے بعد جن اعمال کا ثواب جاری رہتا ہے:

پہلے مشروعیت کے تحت حدیث گذر چکی ہے کہ بعض اعمال کا ثواب موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے، ان میں سے تین کا تذکرہ اس حدیث کے ضمن میں گذر چکا ہے، دوسری حدیث میں اس سے زیادہ تفصیل ہے۔

کما اخرجه ابن ماجه فی سننه عن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم انه قال :

"ان مما یلحق المؤمن من عمله و حسناته بعد موته ، علما نشره، أو ولدا صالحا ترکه، أو مصحفا ورثه، أو مسجدا بناه ، أو بیتا لابن السبیل ، أی الغریب المسافر بناه، أو نهر اجراه ، أو صدقة اخرجها من ماله فی صحته و حیاته تلحقه بعد موته"

(اخرجه ابن ماجه رقم : ۲۱۴ فی المقدمة)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جن اعمال کا ثواب انسان کو موت کے بعد بھی ملتا رہتا ہے ان میں سے (۱) ایک علم ہے جس کی اس نے اشاعت کی (۲) نیک اولاد جن کو پیچھے چھوڑ کر گیا ہو (۳) قرآن کریم جو وراثت میں چھوڑا ہو (۴) مسجد تعمیر کی ہو (۵) یا کوئی مسافر خانہ بنایا ہو (اس دور میں اس کی بہترین مثال مدارس ہیں جہاں مسافر طلبہ قیام کرتے ہیں) (۶) پانی کے لئے نہر جاری کی ہو (تاکہ لوگ اس سے پانی پئیں) (۷) صدقہ جو اس نے زندگی میں صحت وتندرستی کے زمانہ میں نکالا ہو، اس حدیث میں سات کا تذکرہ ہے، امام سیوطیؒ نے دس تک گنوائے ہیں، ان کو چند ابیات میں نظم کیا ہے۔

کما قال :

اذا مات ابن آدم لیس یجری
علیه من فعال غیر عشر
علوم بثها ، و دعاء نجل
وغرس النخل ، والصدقات تجری

وراثة مصحف، ورباط ثغر
وحفر البئر، أو اجراء نهر
وبيت للغريب بناه ياؤى
اليه، أو بناء محل ذكر

(فقه المعاملات)

اشیاء منقولہ وقف کرنے کا حکم:

جس طرح زمین اور جائیداد اور غیر منقولی اشیاء کا وقف جائز ہے، اسی طرح منقولی اشیاء کا وقف بھی جائز ہے، مثلاً قرآن کریم، کتب دینیہ، گھوڑے، اسلحہ وغیرہ، صحابہ کرام سے ان اشیاء کا وقف بھی ثابت ہے۔

قال الحميدى : تصدق ابو بكر بداره بمكة على ولده ، فهى الى اليوم، وتصدق عمر بربعه عند المروة على ولده ، وتصدق عثمان ببئر رومة، كانت البئر ملكاً ليهودى فاشتراها عثمان وجعلها صدقة على المسلمين، وتصدق على بأرضه بينبع ، وتصدق سعد بداره بالمدينة وتصدق عمرو بن العاص ببستان له بالطائف، وذلك كله الى اليوم،

قال جابر : لم يكن احد من اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ذو مقدرة الا وقف، واشتهر ذلك فلم ينكره أحد، فكان احماعاً .

(المغنى لابن قدامه : ٥/٥٩٨)

وروى البخارى عن "عمرو بن الحارث"قال : ما ترك رسول الله صلى الله عليه وسلم عند موته دينارًا ولا درهما ، ولا عبدًا ولا امةً،ولا شئيا الا بغلته البيضاء ، التى كان يركبها وسلاحه، وأرضاً جعلها لابن السبيل .

(اخرجه البخارى فى الجهاد : ٢/١٤٩، وفى الزكوٰة)

امام بخاری رحمہ اللہ نے عمرو بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے موت کے وقت کوئی درہم، دینار، غلام، باندی اپنی ملک میں نہیں چھوڑا، سوائے اپنا سفید خچر

جس سواری فرماتے اور اسلحہ اور زمین جن کی وقف فرمادیا تھا۔

وقال صلى الله عليه وسلم: "انكم تظلمون خالدًا، فقد حبّس ادراعه، وأعتاده، في سبيل الله" (اخرجه البخاري: ١٥٦/٢) أي وقفها في سبيل الله، نصرة لدينه، فدل هذا على جواز وقف غير.

دراہم ودینار کا وقف:

، اسی طرح دراہم ودنانیر کا وقف بھی شرعاً صحیح ہے، مگر چونکہ وقف میں انتفاع بالمنافع مع بقاء العین ہوتا ہے، اس لئے وقف دراہم میں یہ شرط ہے کہ اصل دراہم کو خرچ نہ کریں بلکہ ان کے منافع خرچ کریں یا ان سے کوئی چیز خرید کر ان کے منافع کو فقراء پر خرچ کریں۔

(تفصيله في الشامية، احسن الفتاوى: ٤١٦/٦)

مدرسہ میں دی ہوئی رقم واپس لینے کا حکم:

اگر کسی نے مدرسہ میں چندہ دیا بعد میں معلوم ہوا کہ مدرسہ صحیح اصولوں پر نہیں چل رہا ہے تو کیا یہ رقم واپس لی جاسکتی ہے یا نہیں؟ شرعاً اس کا حکم یہ ہے، چندہ کی رقم مدرسہ میں داخل ہونے سے معطین کی ملک سے خارج ہوجاتی ہے، لہٰذا دی ہوئی رقم واپس نہیں لی جاسکتی، البتہ بااثر افراد پر فرض ہے کہ مدرسہ کے منتظمین کی اصلاح کی کوشش کریں، اگر وہ اصلاح قبول نہ کریں تو انہیں معزول کرکے نظم ونسق کسی صالح شخص یا صالحین کی جماعت کے سپرد کریں۔

(ماخوذ از احسن الفتاوى: ٤١٧/٦)

وقف مشاع جائز نہیں:

صحت وقف کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اپنی ملک سے جدا کر کے متولی وقف یا کسی ذمہ دار کے حوالہ کردیا جائے لہٰذا مشترک غیر منقسم چیزوں کا وقف جائز نہیں، یہی قول مفتی بہ ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالى: ويفرز فلا يجوز وقف مشاع يقسم خلافا للثاني رحمه الله تعالى:

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالى: تحت قوله (هذا بيان) واختاره المصنفتبعالعامة المشائخ وعليه الفتوى وكثير من المشائخ اخذوا بقول ابي يوسف رحمه الله تعالى وقالوا ان عليه

الفتویٰ . (ردالمحتار : ٤/٣٧٦ ، احسن الفتاویٰ : ٦/ ٤١٧)

ایک مسجد کا سامان دوسری مسجد میں منتقل کرنے کا حکم:

مسجد کا سامان دو قسم کا ہوتا ہے:

ایک وہ جس کا تعلق مسجد کی بنا کے ساتھ ہو، جیسے اینٹیں، گارڈر، دروازے وغیرہ، اسے انقاض المسجد کہا جاتا ہے، ایسے سامان کا حکم یہ ہے کہ اگر مسجد آباد ہے اور اس میں نماز پڑھی جاتی ہے تو اس مسجد کا ایسا سامان دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز نہیں، ان کو بعینہا یا بیچ کر ان کی قیمت اسی مسجد میں صرف کی جائے۔

قال ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : الفتوى على ان المسجد لا يعود ميراثاً ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد آخر .

(رد المحتار جـ ٣ كتاب الوقف مطلب في نقل انقاض المسجد)

اور اگر مسجد غیر آباد ہو جائے کہ کوئی بھی اس میں نماز نہیں پڑھتا، مثلاً مسجد کے گرد ونواح کے لوگ وہ علاقہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جا بسے ہوں جس کی وجہ سے مسجد بالکل ویران ہوگئی ہو تو ایسی حالت میں اس مسجد کی اینٹیں، گارڈر، اور دروازے وغیرہ جماعۃ المسلمین کے متفقہ فیصلہ سے دوسری مسجد کی طرف منتقل کئے جاسکتے ہیں۔

قال في الهندية : اهل المسجد لو باعوا غلة المسجد او نقض المسجد بغير اذن القاضي الا صح انه لا يجوز كذا في السراجية .

(عالمگیریة : ٢/٣٤٩)

قلت فعلم انه يجوز باذن القاضي .

وقال في الشامية : ناقلا عن فتاوى النسفي سئل شيخ الاسلام عن اهل قرية رحلوا وتداعى مسجد ها الى الخراب وبعض المتغلبة يستولون على خشبه وينقلونه الى دورهم هل لواحد لاهل المحلة ان يبيع الخشبة بامر القاضي ويمسك الثمن ليصرفه الى بعض المساجد او الى هذا المسجد قال نعم .

وقال قبيل هذا لا سيما في زماننا فان المساجد وغيرها من رباط

او حوض یأخذ انقاضه اللصوص والمتغلبون کما ھو مشاھد .

(ردالمحتار کتاب الوقف : جـ ۳)

مسجد کا دوسری قسم کا سامان جس کا بناءِ مسجد میں کوئی دخل نہیں، جیسے چٹائی اور فانوس وغیرہ انہیں آلات المسجد کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس مسجد میں ضرورت نہیں تو اس کا دوسری مسجد کی طرف منتقل کرنا جائز ہے، بشرطیکہ واقف بھی اجازت دے، اس لئے کہ ایسا سامان بوقت استغناءِ ملک واقف میں عود کر آتا ہے، لہٰذا واقف کا اذن ضروری ہے۔

قال فی الشامیة تحت (قوله ومثله حشیش المسجد الخ) قال الزیلعی وعلی ھذا حصیر المسجد وحشیشه اذا استغنی عنھما یرجع الی مالکه عند محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ وعند ابی یوسف رحمه اللّٰه تعالیٰ ینقل الی مسجد آخر وعلیٰ ھذا الخلاف الرباط والبئر اذا لم ینتفع بھما اه وصرح فی الخانیة ان الفتوی علی قول محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ قال فی البحر وبه علم ان الفتوی علی قول محمد رحمه اللّٰه تعالیٰ فی آلات المسجد .

(ردالمحتار : جـ ۳ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۲۲۶/۶)

سرکاری زمین میں بلا اجازت مسجد کا بڑھانا:

سوال : ایک مسجد تنگ ہے، اس کے بڑھانے کی سخت ضرورت ہے، لوگ بیچارے بہت پریشان ہیں، مگر مسجد کے ساتھ متصل سرکاری زمین ہے اور گورنمنٹ مسجد کو بڑھانے کی اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں بلا اجازت مسجد کو وسیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب : اس کا حکم یہ ہے کہ حکومت پر مساجد کا انتظام اور تعمیر بقدر ضرورت فرض ہے معہذا اگر حکومت اپنا یہ فرض ادا نہیں کرتی بلا اذن حکومت زمین پر تعمیر جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

قبرستان کا درخت کاٹنا:

جن درختوں کے متعلق لوگوں کا شرکیہ عقیدہ ہو کہ یہ فلاں بزرگ یا فلاں پیر صاحب کے درخت ہیں جو انہیں ہاتھ لگائے گا اس پر آفت آجائے گی، ان کا کاٹنا عقیدۂ شرکیہ کے ابطال کے لئے ضروری ہے، مگر انہیں فروخت کر کے ان کی قیمت اسی قبرستان پر خرچ کی جائے، اگر اس

قبرستان میں کوئی مصرف نہ ہوتو دوسرے کسی قریبی قبرستان پرلگائی جائے۔
یہ حکم جب ہے کہ درخت خودرو ہوں، اگر کسی شخص نے لگائے ہیں تو وہ اس کی ملک ہوں گے۔واللہ تعالیٰ علم (ماخوذ از احسن الفتاوی : ٦/٢٢٦)

قبرستان کے درخت سے مسواک کرنا:

وقف قبرستان کے خودرو درخت بھی وقف ہیں ان سے مصارف وقف کے علاوہ نفع اٹھانا جائز نہیں۔

قبرستان کے درختوں کوفروخت کرنے کا حکم:

سوال : ایک قبرستان میں بڑے بڑے درخت ہیں جن کوفروخت کرکے ان کی قیمت اگر قبرستان میں ہی لگادی جائےتو کیا شرعاً یہ جائز ہے یانہیں؟

الجواب : جہاں کہیں درخت زمین کے قبرستان بن جانے سے قبل اُگے ہوں تو مملوکہ زمین ہونے کی صورت میں درخت مالکِ زمین کے ہوں گے،خواہ مالک کوئی ایک شخص ہو یا قوم، البتہ زمین کے قبرستان بن جانے کے بعد درخت اُگے ہوں اور یہ زمین کسی کی ملکیت نہ ہو، بلکہ عام مسلمانوں کےقبرستان کے لئے وقف ہوتو اس کے درخت فروخت کرکے ان کی قیمت قبرستان یادوسرے اجتماعی مفاد میں خرچ کی جاسکتی ہے۔

لما فی الهندية : مقبرة عليها اشجار عظيمةفهذا علىٰ وجهين اما ان كانت الاشجار قبل اتخاذالارض مقبرة او نبت بعد اتخاذ الارض مقبرة ففی الوجه الاول المسألة علی قسمين اما ان كانت الارض مملوكة لها مالك او كانت مواتاًلا مالك لها واتخذها اهل القرية مقبرة . (الفتاوىٰ الهندية : ٢/٤٧٣ ، الباب الثانی عشر الخ)

وقال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاری : مقبرة عليها اشجار ان كانت نابتة قبل اتخاذ الارض مقبرة والارض مملوكة لها مالك جعلها مقبرة فالاشجار باصلها علىٰ ملك رب الارض يصنع الورثة بالاشجار ماشاؤ الان الشجرة لا تدخل تحت الوقف......وان كانت الارض مواتا لا مالك لها باصلها علىٰ حالها القديمة هذا كله اذا كانت الاشجار نابتة قبل

اتخاذ ها مقبرة ولم ينبت بعد ذلك لا يخلوا اما ان علم غارسها او لا يعلم ان علم كانت للغارش وان لم يعلم بها غارس فالحكم للقاضي .

(خلاصة الفتاوىٰ : ٤ / ٤١٩ ، كتاب الوقف الفصل الثالث، نوع آخر ، ومثله في البحر الرائق : ٥ / ٢٠١ ، كتاب الوقف)

مرض الموت میں وقف کرنے کا حکم:

اگر کوئی انسان مرض الموت میں وقف کرے، تو یہ وقف وصیت کے حکم میں ہوگا، لہٰذا میت کے تہائی مال تک نافذ ہوگا اس سے زائد میں نافذ نہ ہوگا، الا یہ کہ ورثاء زائد کی جازت دیدیں، کیوں کہ مرض الموت میں اس کے مال کے ساتھ ورثاء کا حق متعلق ہوجاتا ہے، اس لئے تہائی مال سے زائد میں ورثاء سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، البتہ تہائی مال میں اس کو تصرف کا حق حاصل ہے۔

"لقوله عليه السلام : ان الله تصدق عليكم في اخر اعماركم ، بثلث اموالكم ، زيادة لكم في اعمالكم " .

(اخرجه ابن ماجه رقم : ٢٧١٤ ، في كتاب الصلح)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری آخری عمر میں تمہارے لیے تہائی مال کو صدقہ کیا ہے تاکہ تمہارے اعمال میں اضافہ ہو۔

اس کی وضاحت کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس صورت میں کہ ہندہ نے اپنے مرض الموت میں اپنا حصۂ مکان متروکہ پدری غیر منقسمہ حسب دستاویز وقف نامہ مصدقہ تحریر شدہ لوجہ اللہ بمسجد محلّہ وقف کیا اور اپنی حیات میں اس پر متولیانہ قابض رہی، مکان مذکور میں کرایہ دار حسب دستور رہتے ہیں لہٰذا شرعاً واقفہ کی طرف سے بعد الوقف تسلیم اور قبضہ متولیانہ صحیح ہوا یا نہیں؟ نیز وقفنامہ مذکورہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بعد میرے اس کا متولی فلاں بجائے میرے رہے گا اور متولی موصوف کو اختیار ہوگا وہ حصۂ موقوفہ کو فروخت کر کے زرِ ثمن اس کا مسجد موصوف تعمیر طلب میں لگادے چنانچہ بعد انتقال واقفہ کے متولی نے شئی موقوفہ پر بحیثیت متولیانہ تحریر کرایہ نامہ، کرایہ دار سے حصہ رسدی کرالیا، مگر چوں کہ وہ موقوفہ نہایت قلیل ہے قابل المنفعت نہیں تقریباً آٹھ، نوگز عریض اور بارہ گز

طویل تقسیم میں آتی ہے جو سوائے فروختگی اس سے کوئی حصول منفعت نہیں، بدیں لحاظ متولی کو حسب شرائط واقفہ، بمشورۂ واقفان صاحبان اہل الرای دیندار کی فروخت کر کے زرِ ثمن اس کا تعمیر مسجد موصوف میں صرف کر دینا درست ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب: اگر یہ حصۂ مکان متروکہ پدری و مملوکۂ ذاتی ہندہ کے تمام ترکہ کا ثلث ہے یا ثلث سے کم ہے تو وقف صحیح و نافذ ہو گیا، اور اگر زائد ثلث سے ہے تو ثلث میں وقف صحیح ہے اور زائد کا وقف ہندہ کے وارثوں کی رضا پر موقوف ہے، اگر وہ جائز رکھیں تو جائز ہے اور اگر راضی نہ ہوں تو زائد از ثلث میں وقف صحیح نہیں، اگر یہ زمین موقوفہ نہایت قلیل غیر قابل منفعت ہے تو متولی مسجد کو چاہئے کہ اس کو فروخت کر کے اس کے ثمن سے کوئی دکان مسجد کے لئے چھوٹی یا بڑی تعمیر کر دے یا کوئی زمین خریدے، جس کا کرایہ مسجد میں آتا رہے یا مسجد میں تعمیر کی ضرورت ہو تو تعمیر میں لگا دے۔

قال في الدر في بيان شرائط الاستبدال: مانصه و كون البدل عقارًا، وقال الشامي: وزاد العلامة قنا لي زاده في رسالته (شرطاً ثامناً وهو أن يكون البدل والمبدل من جنس واحد ثم قال: والظاهر عدم اشتراط اتحاد الجنس في الموقوفة للاستغلال لان المنظور فيه كثرة الريع وقلة المرمة والمؤنة فلو استبدل الحانوت بارض تزرع وتحصل منها غلة قدر اجرة الحانوت كان احسن لان الارض ادوم وابقىٰ واغنى عن كلفته الترميم والتعمير اهـ. (٦٠١/٣، شامی)

قلت: دل قوله: لان المنظور فيه كثرة الريع على عدم جواز الاستبدال بما لا ريع فيه اصلاً، والله اعلم.

وفي الخلاصة: ولو شرط في الوقف ان يبيعه ويجعل ثمنه في وقف افضل منه له ان يبيعه ولا يبيعه الامام الحاكم لكن اذرأه الحاكم اذن له اهـ. (٤١٤/٤)

قلت: ظهر منه جواز صرف ثمن الدار في عمارة المسجد لا جل اجازة الواقف واذنه في ذالك ولعل منعهم الحاكم عن ذلك لوقايته من التهم فقط، والله اعلم.

(ماخوذ از امداد الاحکام : ۳/ ۶۲)

کسی شخص اور اسکی اولاد پر کچھ زمین نسل در نسل امامت کیلئے وقف کرنے کا حکم:

سوال:

(۱) واقف نے زید اور ان کی اولاد نسلاً بعد نسلٍ الی یوم القیامۃ کے لئے ایک مسجد میں امامت کرنے کے لئے تھوڑی زمین وقف کی اور اس شرط کے موافق ابتک جاری رہی اور اب زید کی اولاد تین چار پشت ہو کر ان کے خاندان میں سو آدمی سے زیادہ ہو گئیں اب اس وقف کی زمین کی آمدنی ان لوگوں کو کفایت نہیں ہوتی ہے اور ان میں اکثر آدمی نماز پڑھانے کو لائق ہیں پس ان لوگوں میں کون امامت اور وظیفہ پانے کا مستحق ہے؟

(۲) واقف نے زید کو ایک مسجد میں امامت کرنے کو تھوڑی زمین وقف کی اب جماعت والے ان کو اس مسجد میں نماز پڑھانے کو حسد و غصہ کی وجہ سے منع کرتے ہیں اور جماعت والوں نے چندہ کر کے دوسرا امام مقرر کر لیا ہے، حالانکہ زید امامت کرنے کو لائق تھا اب زید نے دوسرے محلے میں ایک مسجد بنائی اس میں وقف زمین کی آمدنی سے وظیفہ پا کر زید کے لئے نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب:

(۱) اس وقف میں صرف وہ وارث مستحق ہے جو اقرب بطن میں ہو اور مسجد مذکور میں امامت کریں بقیہ اس میں مستحق نہیں ہے اگر زید کی اولاد میں بطن اقرب میں لائقِ امامت چند اشخاص ہوں تو اس میں تفصیل ہے، اگر اہل مسجد ان میں سے کسی ایک ہی کی امامت تجویز کریں بوجہ کسی ترجیح وافضلیت کے تب تو وہی شخص واحد آمدنی وقف کا مستحق ہے اور اگر سب کی امامت کو نوبت بہ نوبت منظور کر لیں تو ہر قابل امامت جو امامت کو بجالائے مستحق ہوگا اور آمدنیٔ وقف ان سب پر تقسیم کی جائے گی پس جو شخص اولادِ زید میں قابل امامت نہیں یا قابل امامت ہے مگر اہل محلہ واہل مسجد اس کی امامت منظور نہیں کرتے وہ اس وقف میں مستحق نہ ہوگا۔

هذا ما فهمته من القواعد . والله اعلم

(۲) سوال دوم کا جواب بدون عبارت وقف نامہ دیکھے ہوئے نہیں دیا جا سکتا۔ فقط

(دليل الاول) قال في الفتاوى الحامدية : ونقل في الاسعاف

فی باب الوقف علی الاولاد و اولاد الاولاد ولو ذکر البطون الثلاثۃ ثم قال : علی الاقرب فالاقرب او قال : علی ولدی ثم علی ولدی ولدی ثم وثم او قال : بطناً بعد بطن یبدأ بما بدأبہ الواقف ولا یکون للبطن الاسفل شئی ما بقی من الاعلیٰ احد اھـ . (۱۳۷/۱)

قلت : فقولہ : نسلاً بعد نسلٍ فی معنیٰ قولہ بطناً بعد بطن فلا یستحق الاسفل شیئاً ما بقی من الاعلیٰ احد ویصلح للامامۃ ولیس للاناث فی ھذا الوقف شئ لانھن بمعزل عن الامامۃ .

وفیہ ایضاً : لا یستحق الا من باشر العمل اھـ .

وفی الاشباہ : وقد اغتر کثیر من الفقھاء فی زماننا فاستب حوا معالیم الوظائف من غیر مباشرۃ اھـ . (۲۰۵/۱)

قلت : ومباشرۃ الامامۃ لیس باختیار المباشربل تتوقف علیٰ نصب اھل المحلۃ ایاہ لھا . (ماخوذ از امداد الاحکام : ۶۱/۳)

مال حرام سے مسجد تعمیر کرنے کا حکم:

حرام مال مسجد پر صرف کرنے کی مختلف صورتیں ہیں اوران کا حکم بھی مختلف ہے۔

(۱) حرام مال سے مسجد کی زمین نہ خریدی گئی ہو، بلکہ صرف دیواروں پر خرچ کیا گیا ہوتو اس صورت میں بعض اکابر نے تحریر فرمایا ہے۔

”حرام مال سے مسجد کی زمین کا استعمال نہیں پایا جاتا اس لئے اس میں نماز درست ہے، مگر حرام مال مسجد پر صرف کرنے کا گناہ ہوگا،لہٰذا مال حرام سے تعمیر کردہ دیواریں گرا کر حلال مال سے دوبارہ تعمیر کرنا ضروری ہے۔“

قال فی الشامیۃ : (قولہ لوبما لہ الحلال) قال تاج الشریعۃ امالو انفق فی ذلک مالا خبیثاً او مالا سببہ الخبیث والطیب فیکرہ لان اللّٰہ تعالیٰ لایقبل الا الطیب فیکرہ تلویث بیتہ بما لا یقبلہ اھ شر نبلالیۃ .

(رد المحتار : جـ ۱)

قول عدم استعمال خلاف ظاہر ہے ،لہٰذا اس صورت کا حکم بھی صورت ثانیہ کی طرح معلوم

ہوتا ہے۔

(۲) اگر حرام مال فرش پر لگایا گیا تو نماز پڑھنے سے حرام کا استعمال ہوگا، لہٰذا اس میں نماز مکروہ تحریمی ہے، اس کا تدارک یوں ہوسکتا ہے کہ حرام مال سے تیار کردہ فرش اکھاڑ کر طیب مال سے فرش لگائے جائے۔

(۳) اگر حرام مال سے زمین خرید کر اس پر مسجد بنائی گئی تو اس میں بھی استعمال حرام کی وجہ سے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کا تدارک بھی ممکن نہیں، مگر چونکہ اس کا وقف صحیح ہو چکا ہے اس لئے بیع اول کا استرداد کر کے دوبارہ مال طیب سے اشتراء نہیں کیا جاسکتا۔

یہ مسجد اگر چہ غیر منقول ہے، لحدیث ان اللّٰہ طیب لا یقبل الاطیباً ، مگر اس کے باوجود اس کی مسجدیت میں کوئی شبہ نہیں، لہٰذا اس کی بے حرمتی جائز نہیں۔

مسجد کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ موقوف للصلوٰۃ، اور صحت وقف کے لئے فارغ عن ملک الغیر ہونا شرط، یہ شرائط ایسی مسجد میں موجود ہیں۔ کشاف اور مدارک کے جزئیہ ''قیل کل مسجد بنی مباھاۃ او ریاءً وسمعۃ او لغرض سوی ابتغاء وجہ اللّٰہ او بمال غیر طیب فھو لاحق بمسجد الضرار'' سے شبہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ:

اولاً تو یہ قول ''قیل'' سے منقول ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

ثانیاً اسے غیر مقبول ہونے پر محمول کرنا واجب ہے، یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ یہ مسجد ہی نہیں، اس لئے کہ مسجدیت کے شرائط موجود ہیں۔

غرضیکہ اس مسجد میں نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں، اور نہ ہی اس کے تدارک کی کوئی صورت نظر آرہی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ قرآن مجید اوراق مغصوبہ پر لکھا گیا ہو تو اس کا پڑھنا جائز نہیں ''للزوم استعمال الحرام'' اور اس کی بے حرمتی بھی جائز نہیں۔

لانہ قرآن ، واللّٰہ تعالیٰ اعلم (ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۶/۴۳۱)

عیدگاہ پر پل تعمیر کرنے کا حکم:

ہمارے علاقہ میں عیدگاہ ہے جس میں عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں، بچے کھیلتے بھی ہیں، یعنی عام دنوں میں کھیل کے میدان کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس کا نام عیدگاہ گراؤنڈ ہے، اب حکومت ریلوے پل کو اس عیدگاہ سے گذارنا چاہتی ہے، جس سے عیدگاہ میدان کا آدھا حصہ

متاثر ہوگا، کیا شرعاً عیدگاہ پر پل تعمیر کرنا جائز ہوگا؟ جبکہ احسن الفتاوی میں لکھا ہے کہ عیدگاہ میں مدرسہ تعمیر کرنا بھی جائز نہیں اس بارے میں سوالات و جواب حاضر خدمت ہے۔

عیدگاہ کی فاضل زمین پر مدرسہ بنانا:

سوال : یہاں مدرسہ عربیہ میں تعمیرات کی تنگی ہے اور عیدگاہ بہت وسیع ہے، اس کا کچھ حصہ کاشت کروایا جاتا ہے اور اس کی آمدنی عیدگاہ پر خرچ کی جاتی ہے، خیال ہے کہ اگر مدرسہ کی تعمیر کے لئے عیدگاہ کی فاضل اراضی کا استعمال کرنا شرعاً جائز ہوتو مدرسہ کافی وسیع پیمانہ پر چلایا جاسکتا ہے، اس کے متعلق ایک استفتاء مرتب کر کے بعض حضرات علماء کی خدمت میں بھیجا گیا تھا، مولانا مفتی محمد شفیع رحؒ صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب رحؒ بنوری نے بلاشک جواز کا حکم دیا، لیکن خیر المدارس کے دارالافتاء سے اور سہارنپور سے جو جواب آیا، انہوں نے شرط الوقف کنص الشارع کی عبارت پیش کر کے اس کو خلاف شرط قرار دے کر عدم جواز کا حکم دیا، پھر حضرت مولانا خیر محمد صاحب یہاں تشریف لائے، ان سے گفتگو ہوئی، وہ بھی چاہتے یہ تھے کہ اگر مسئلہ کی گنجائش نکالی جاسکے تو ضرورت تو واقعی یہ ہے کہ مدرسہ منتقل کردیا جائے، اور انہوں نے فرمایا کہ آپ کی خدمت میں استفتاء بھیج دو، آپ مفصل جواب دیدیں گے، لہٰذا عرض ہے کہ آپ تفصیلی جواب عطا فرمائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

بندہ نے صورت مسئلہ میں بار بار غور کیا مگر سمجھ میں یہی آیا کہ عیدگاہ کی زمین میں مدرسہ بنانا جائز نہیں، ہر چند سوچنے کے باوجود مجوزین حضرات کے خیال کی بناء سمجھ میں نہیں آتی، اگر آپ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اور حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ کے افتاء کے دلائل تحریر فرمادیتے تو اس پر کچھ غور کرسکتا، بہرکیف مسئلہ کی نوعیت بالکل واضح ہے جس میں ذرا برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں، معہٰذا جو امور موجب خلجان ہوسکتے ہیں اثناء جواب میں ان کی تنقیح بھی کردی ہے۔

قال فی الشامیة : فان شرائط الواقف معتبرة اذا لم تخالف الشرع وهو مالك فله ان يجعل ماله حيث شاء مالم يكن معصيته وله ان يخص صنفاً من الفقراء ولو كان الوضع فی كلهم قربة .

(ردالمحتار : ٤٩٩/٣)

وقال فی التنویر اتحد الواقف والجهة وقل مرسوم بعض الموقوف علیه جاز للحاکم ان یصرف من فاضل الوقف الاخر علیه وان اختلف احدهما لا . (ردالمحتار : ٥١٥/٣)

معلوم ہوا کہ شروط واقف کے خلاف کرنا اور جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

خود واقف بھی اپنی شرط کے خلاف نہیں کرسکتا۔

قال فی شرح التنویر وقف ضیعة علی الفقراء ثم قال لولیه اعط من غلتها فلانا کذا وفلانا کذا لم یصح لخروجه عن ملکه بالتسجیل. (رد المحتار : ٥١٣/٣)

درمختار کے مندرجہ بالا جزئیہ کے بعد " ان للواقف الرجوع فی الشرط ولو مسجلاً. " (رد المحتار : ٥١٤/٣) کے جزئیہ سے شبہ نہ کیا جائے، کیوں کہ اسی موقع پر علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:" وفیه کلام سیاتی " چنانچہ آگے چل کر ایک موقع پر نہایت بسط سے اس کی تحقیق فرمائی ہے جس سے چند اقتباسات تحریر کیے جاتے ہیں:

لا یجوز ان یفعل الاما شرط وقت العقد .

وما کان من شرط معتبر فی الوقف فلیس للواقف تغییره ولا تخصیصه بعد تقرره ولا سیما بعد الحکم الخ .

(ردالمحتار : ٥٩٧/٣)

غرضیکہ خود واقف بھی جہت وقف کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

اسی طرح حاکم بھی بیت المال کے وقف میں تبدیل جہت کا اختیار نہیں رکھتا۔

قال فی شرح التنویر ان السلطان یجوز له مخالفة الشرط (الیٰ ان قال) وان غایر شرط الواقف لان اصلها لبیت المال .

وفی الشامیة قلت والمراد من عدم مراعاة شرطها ان للامام او نائبه ان یزید فیها وینقص ونحو ذلك ولیس المراد انه یصرفها عن

الجهة المعينة الخ . (رد المحتار : ٣/٥٧٩)

حاصل یہ کہ جملہ کتب معتبرہ میں وضاحت ہے کہ شرط واقف اور جہت وقف کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اگر موقوف علیہ سے استغناء ہو چکا ہوتو بھی وقف کی آمدن موقوف علیہ کے مجانس اقرب پر صرف کی جائے گی، اس حالت میں بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں۔

قال في التنوير ومثله حشيش المسجد وحصيره مع الاستغناء عنهما والرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما فيصرف وقف المسجد والرباط والبئر (والحوض شرح) الى اقرب مسجد اورباط او بئر (او حوض ، شرح) اليه .

وقال في الشامية (قوله الى اقرب مسجد اورباط الخ) لف نشر مرتب وظاهره انه لا يجوز صرف وقف مسجد خرب الى حوض وعكسه وفي شرح الملتقى يصرف وقفها لا قرب مجانس لها .

(ردالمحتار : ٣/٥١٣)

مذکورہ جزئیہ اگر چہ مصرف اول کے خراب ہوجانے سے متعلق ہیں مگر مصرف اول سے اوقاف کی آمدن اگر بہت زیادہ ہوتو اس کا بھی یہی حکم ہے، اس لئے کہ استغناء دونوں صورتوں کو جامع ہے۔

شرح التنویر مع الشامیہ صفحہ ۵۲۰ میں یہ جزئیہ ہے:

ويبدء من غلته بعمارته ثم ما هو اقرب بعمارته كامام مسجد ومدرس مدرسته يعطون بقدر كفايتهم ثم السراج والبساط الى آخر المصالح وان لم يشترطه الواقف لثبوته اقتضاءً .

اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ وقف مسجد سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس سے مقصد یہ ہے کہ وقف مسجد سے امام کو اور وقف مدرسہ سے مدرس کو دینا جائز ہے، اس لئے مندرجہ ذیل جزئیہ میں تصریح ہے کہ مسجد پر وقف کرتے وقت اگر مدرس بھی مشروط فی الوقف ہوتو وہ بھی مصارف لازمہ سے نہیں۔

قال في شرح التنوير وانما يكون المدرس من الشعائر لو مدرس

المدرسة كما مر اما مدرس الجامع فلا لانه لا يتعطل لغيبته بخلاف المدرسة حيث تقفل اصلا . (ردالمحتار : ٣/ ٥٢٥)

خلاصہ یہ کہ اصل موقوف علیہ سے استغناء کے وقت بھی جہت وقف کا بدلنا جائز نہیں، اقرب مجانس پر صرف کرنا ضروری ہے، عالمگیریہ میں بھی اس قسم کا جزئیہ موجود ہے:

سئل شمس الائمة الحلوانی عن مسجد او حوض خرب ولا يحتاج اليه لتفرق الناس هل للقاضی ان يصرف اوقافه الى مسجد اخر او حوض اخر قال نعم ولو لم يتفرق الناس ولكن استغنى الحوض عن العمارة وهناك مسجد محتاج الى العمارة او على العكس هل يجوز للقاضی صرف وقف ما استغنى عن العمارة الى عمارة ما هو محتاج الى العمارة قال لا كذا فی المحيط .

(عالمگیریه : ٢/ ٣٥٢)

اس عبارت میں اقرب مجانس کی تصریح نہیں، شرح التنویر اور شامیہ کے مذکورہ جزئیات میں وضاحت ہے کہ بحالت استغناء مسجد کا وقف قریب ترین مسجد پر اور حوض کا وقف قریب ترین حوض پر صرف کیا جائے گا۔

وهذا ماجاء فی فهم هذا الفقير والعلم عند الله اللطيف الخبير .

(احسن الفتاویٰ : ٦/ ٤٣٣)

الجواب ومنه الصدق والصواب

احسن الفتاویٰ میں مذکورہ مسئلہ اس عیدگاہ کے بارے میں ہے جو کسی کی طرف سے عید کی نماز کے لئے وقف ہو، چونکہ وقف میں واقف کی شرائط کی رعایت کرنا ضروری ہے، اس لئے اس کو عید گاہ کے علاوہ کسی اور کام میں استعمال کرنا جائز نہ ہوگا، جبکہ کالونی گیٹ کے اس عیدگاہ کے بارے میں، کے، ڈی، اے، کے محکمہ سے اسی طرح علاقے کے قدیم باشندوں سے معلوم ہوا کہ یہ میدان سرکاری کاغذات میں کھیل کا میدان ہے، بعد میں آبادی والوں نے عید کی نماز یہاں شروع کی ہے اور عیدگاہ گراؤنڈ اس کا نام پڑ گیا اس لئے شرعاً اس عیدگاہ کا حکم موقوفہ عیدگاہ کی طرح نہ ہوگا۔

لہٰذا حکومت بوقت ضرورت مفاد عامہ کے لئے اس پر پل تعمیر کر سکتی ہے اس کو شرعی مسئلہ بنا کر

ہنگامہ اور شور شرابہ کرنا درست نہیں۔ (ابن شائق عفا اللہ عنہ)

مسجد کی زمین میں امام کا مکان بنا:

مسجد کی تعمیر شروع کرنے سے پہلے مسجد کی چھت پر امام صاحب کے لئے مکان بنانے کی نیت کر لی جائے تو مکان بنانا جائز ہے لیکن اگر اس وقت ارادہ نہیں تھا مسجد بن جانے کے بعد ارادہ ہوا اب چھت پر یا بنی ہوئی مسجد کے کسی حصہ پر امام کے لئے گھر بنانا جائز نہیں، کیوں کہ جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو چکی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی کسی بھی ضرورت کے لئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

قال فی شرح التنویر ولو خرب ما حوله استغنی عنه یبقی مسجدًا عند الامام و الثانی ابداً الی قیام الساعة و به یفتی .

وفی الشامیة (قوله ولو خرب ما حوله الخ) ای ولوْ مع بقائه عامرًا و كذا لو خرب وليس له ما يعمر به وقد استغنی الناس عنه لبناء مسجد اخر . (ردالمحتار : ٣/١٣ ٥)

منہدم مسجد کے سامان کا حکم:

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے ایک مسجد خام بنوایا تھا مگر فی الحال منہدم ہونے لگی تو زید نے اس مقام پر مسجد خام توڑوا کر مسجد پختہ کی بنیاد ڈالی مسجد پختہ تعمیر کرانا چاہتا ہے، اور جو سامان پختہ مسجد میں لگانے کے قابل نہیں ہے جیسے لکڑی، کپڑا وغیرہ، اب سامان مسجد خام فروخت کر کے مسجد پختہ میں لگانا درست ہے یا نہیں؟ یا بانی مسجد غیر سے قیمت زائد دیکر لے سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نہ فروخت کیا گیا تو سامان مسجد خام بہر کیف ضائع وہلاک ہو جائے گا۔

الجواب: اگر دوسری مسجد پختہ اسی جگہ اور اسی مقام پر بنائی جا رہی ہے جہاں مسجد خام واقع تھی تو اس صورت میں مسجد خام کا فاضل اسباب بیچ کر مسجد پختہ کی مرمت میں صرف کرنا جائز ہے اور اگر پختہ مسجد اسی مقام پر نہیں بنائی گئی تو مسجد خام کا اسباب بعینہ یا بعد فروخت کر کے اس کی قیمت کا پختہ مسجد میں لگانا درست نہیں بلکہ مسجد خام کو درست کر دینا لازم ہے۔

قال العلامة عبد الحی : فی فتاواه، فی السراج المنیر : ولا یحل

ان یھدم المسجد لیبنیه احکم الاان یخاف ان ینھدم فیجوز لاھل هذه المحلة لالغیرھم اذا بذامن مال انفسھم لامن مال الوقف الابامر القاضی اھ . (۲۰۳/۱)

وفیه ایضاً : در بحر الرائق است : قال محمد : اذا اخرب المسجد ولیس له ما یعمر به وقد استغنی الناس عنه فانه یعود الی ملك الواقف وقال ابو یوسفؒ : ھو مسجد ابدًا الی قیام الساعة لایعود میراثا ولا یجوز نقله ونقل ماله الی مسجد آخر سواء کانوا یصلون فیھا اولا وعلیه الفتویٰ کذا فی الحاوی القدسی اه ونقل العلامة عبد الحیؒ عن "سعادة الساجد لعمارة المساجد" للشرنبلالی مانصه واذا علمت ھذا فما فی الدرروفتاویٰ قاضی خان من جواز نقل المسجد اذا خرب خلاف ما علیه الفتویٰ کما ھو المذکور فی الحاوی وخلاف الصحیح المذکور فی خزانة المفتین وقد مشی الشیخ الامام محمد بن سراج الدین الحانوتی علی القول المفتیٰ به من عدم نقل بناء المسجد اھ (۲۳۰/۱) وفی المجتبیٰ : واکثر المشائخ علی قول ابی یوسفؒ ورجح فی فتح القدیر قول ابی یوسفؒ اھ . فتاویٰ مذکور (٤۲۹/٤)

وفی الخلاصة : لو علق قندیلاً (وبسط حصیرًا وبواری فی المسجد ثم خرب المسجد واستغنی عنه عادت ھذه الاشیاء الی ملك صاحبه ، والصحیح من مذھب ابی یوسفؒ انه لاتعود الی ملك متخذھا بل یتحول الی مسجدآخر او یبیعھا قیم المسجد لاجل المسجد اھ . (٤۲٤/٤)

قلت : وھذا یؤذن بالفرق بین بناء المسجد حیث لایحول وبین القنادیل والحصیر حیث یجوز تحویلھا عند ابی یوسفؒ ایضاً .

(ماخوذ از امدادالاحکام : ۱۷۳/۳)

بوقت ضرورت اوقاف فروخت کرنے کا حکم:

عام حالات میں تو وقف کو فروخت کرنا، یا کسی اور کو ہبہ کرنا جائز نہیں، اسی طرح اسکو بدلنا بھی جائز نہیں، اگر موقوفہ زمین خراب ہو جائے، بنجر بن جائے اس سے استفادہ کرنا اور موقوف علیہ کو فائدہ پہنچانا ممکن نہ رہے تو اس کو بیچ کر کسی نفع بخش زمین کو خریدنا جائز ہے۔

چنانچہ امداد الاحکام ۳/۵۷۱ میں ایک سوال کے جواب میں مذکور ہے، ایسی صورت میں مسجد اول کا سامان منتقل کر کے دوسری مسجد میں لگا دینا جائز ہے، اور زمین کا مبادلہ بھی جائز ہے۔

وھذا عند ابی حنیفة و محمد رحمھما اللّٰہ و اما عند ابی یوسف رحمہ اللّٰہ فلا.

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک مکان کا چہارم حصہ متعلق مسجد وقف ہے اور بھی دیگر مکانات اس مسجد کے متعلق وقف ہیں جو مرمت طلب ہیں اگر چہارم موقوفہ فروخت کر کے متولی مسجد اس کی قیمت سے بقیہ مکانات متعلقہ مسجد کی مرمت کرا دے جس سے آئندہ مسجد کا نفع زیادہ ہونے کی امید ہے تو شرعاً اس میں کوئی ممانعت یا حرج تو نہیں ہے مفصل بروئے شرع شریف جو حکم ہو اس سے اطلاع فرمائی جائے۔ بینوا توجروا۔

الجواب: اگر اس چہارم حصہ کی آمدنی معقول نہ ہو یا یہ اندیشہ ہو کہ کسی وقت زیادہ حصہ والے مسجد کے چہارم حصہ کو شاید دبالیں گے تو اس صورت میں اس کو فروخت کر کے بقیہ مکانات سالمہ من شرکۃ الغیر کی مرمت میں اس رقم کا لگا دینا جائز ہے۔

وفی فتاویٰ النسفی: بیع عقار المسجد لمصلحة المسجد لایجوز وان کان بامر القاضی وان کان خراباً فاما بیع النقض فیصح ونقل عن شمس الائمة الحلوانیؒ انه یجوز للقاضی والمتولی ان یبیعه ویشتری مکانه آخروان لم ینقطع ولکن یؤخذ بثمنه ما هو خیر منه للمسجد لا یباع ای غلته وقد رویٰ عن محمد اذا ضعفت الارض الموقوفة عن الاستغلال والقیم یجد بثمنها ارضاً آخر هی اکثر ریعاً کان له ان یبیعها ویشتری بثمنهاما هو اکثر ریعاً وفی الفتاویٰ قیم

وقف خاف من السلطان او من وارث ان يغلب على ارض وقف يبيعها ويتصدق بثمنها .

قلت : ای اذا لم يكن للمسجد حاجة الى ثمنها .

(ماخوذ از امدادالاحکام : ۱۷۷/۳)

مسجد کو فروخت کرنا جائز نہیں:

اگر ایک مسجد غیر آباد ہو جائے اس طرح کہ آبادی والے وہاں سے چلے گئے نمازی کوئی نہیں رہا، مسجد بالکل ویران پڑی ہوئی ہے، دوبارہ آباد ہونے کا بھی امکان نہیں۔

چنانچہ مفتی اعظم مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد کو کسی حال میں بھی منتقل کرنا جائز نہیں جو جگہ ایک بار مسجد بن گئی وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی بالفرض مسجد ویران ہو جائے اور کوئی نماز پڑھنے والا بھی وہاں نہ رہے تو بھی اس مسجد کو باقی رکھنا واجب ہے۔

البتہ ویران مسجد کے سامان پر خطرہ ہو تو اس کو دوسری قریب ترین مسجد کی طرف منتقل کیا جاسکتا ہے، تو وہاں کے قریب ترین مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس جگہ کی چار دیواری کردے تا کہ اس جگہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ (احسن الفتاوی : ۴۵۱/۶)

مسجد ہونے کا حکم کب ہوگا

جو جگہ مسجد کے لئے مختص کر کے وقف کردی گئی ہے اور وہاں امام ومؤذن مقرر ہو گیا اور باضابطہ جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی ہے تو وہ مسجد شرعی بن گئی، چاہے کچا چبوترہ ہی کیوں نہ ہو اب اس کو توڑنا، اس کی بے حرمتی کرنا اور اس کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

(ملخص از فتاوی عالمگیریہ : ۱۰۳/۲)

مسجد میں خوشبو لگانا:

مسجد کی تعظیم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اسے خوشبوؤں سے معطر کیا جائے، کیوں کہ مساجد کو پاک صاف اور خوشبودار رکھنا شرعاً پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ کا حکم ہے:

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ گھروں میں مسجد بناؤ اور ان کو پاک معطر رکھا جائے۔ (مشکوٰۃ باب المساجد : صـ ۶۹)

ایک حدیث میں ہے:

" اتخذوا علی ابوابها المطاهر وجمروا ها فی الجمع ."

(ابن ماجه : صـ ٥٥)

یعنی مسجدوں کے دروازے کے پاس طہارت خانہ بناؤ اور جمعہ کے دن مسجدوں میں خوشبو کی دھونی دو۔

اور سلف صالحین کی بھی یہی سنت تھی کہ مساجد میں خوشبو لگاتے اور دھونی دیتے تھے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے بارے میں ہے: کہ انہوں نے حکم جاری فرمایا تھا کہ مدینہ کی مسجد میں ہر جمعہ کو دوپہر کے وقت دھونی دی جائے۔ (زادالمعاد : ١/ ١٠٤)

مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ خود ہر جمعہ کے دن مسجد میں دھونی دیتے تھے۔

افسوس کہ آج یہ سنت بالکل چھوٹ گئی، لوگ مساجد کے اندر طرح طرح کے مکروہ تکلفات تو کرتے ہیں، مگر اس سنت کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے آج یہ سنت بالکل مر چکی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اس سنت کو پھر سے زندہ کریں چاہے عطر استعمال کریں، چاہے عود کی دھونی دیں اگربتی بھی جلا سکتے ہیں، البتہ اس کا اہتمام رہے کہ باہر جلا کر اندر لایا جائے تا کہ ماچس کی گندھک کی بو سے مسجد محفوظ رہے۔

مسجد میں بدبودار چیز داخل کرنے کی ممانعت:

کسی قسم کی کوئی بدبودار چیز مثلاً لہسن، پیاز اور مولی وغیرہ کو مسجد میں لانا یا ان کو کھا کر فوراً مسجد میں آنا ناجائز ہے، جناب نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

" من اکل من هذه الشجر ة المنتنة فلا یقربن مسجدنا فان الملائکة تتأذی مما یتأذی منه الانس " . (بخاری ومسلم)

یعنی " جو شخص بدبودار درخت (یعنی پیاز وغیرہ) میں سے کھائے وہ ہماری مسجد کے قریب بھی نہ آئے اس لئے کہ فرشتوں کو بھی ان تمام چیزوں سے ایذا پہنچتی ہے جن سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے"۔

مراد یہ ہے کہ جب تک اس کی بو منہ سے نہ جائے اس وقت تک مسجد میں داخل نہ ہو اور یہی حکم ہے ہر بدبودار چیز کا جیسے، حقہ، سگریٹ، نسوار، بیڑی، اور لہسن وغیرہ جیسا کہ فقہ کی معتبر کتابوں میں مذکور ہے" اور طریقہ محمدیہ" میں مولی کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے۔

(آداب المساجد)

آج کل بہت سے لوگ اس میں غفلت کرتے ہیں، سگریٹ پیتے پیتے مسجد تک پہنچ جاتے ہیں پھر اسی طرح نماز میں شریک ہوجاتے ہیں جس سے برابر میں کھڑے نمازیوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور فرشتوں کو ایذاء الگ ہے، اسی طرح بہت سے مزدوری پیشہ لوگ مزدوری کے کپڑے جن میں پسینہ وغیرہ کی بدبو ہوتی ہے انہیں کپڑوں میں نماز میں شریک ہوجاتے ہیں جس سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، لہٰذا اس سے بچنا بہت ہی ضروری ہے۔

سگریٹ اور نسوار جیب میں رکھنا:

جیسا کہ بدبودار چیزوں کو مسجد میں لانے کی ممانعت کی تفصیل اوپر معلوم ہوچکی ہے سگریٹ ونسوار وغیرہ حالت نماز میں جیب میں رکھنا بھی جائز نہیں ہے، البتہ نماز صحیح ہوجائے گی، اس لئے ان چیزوں کو مسجد سے باہر ہی کہیں رکھ کر مسجد میں داخل ہونا چاہئے۔

مسجد میں چٹائی کی ٹوپی رکھنا:

آج کل بعض مساجد میں چٹائی، پلاسٹک کی ٹوپی رکھنے کا دستور ہے جب کہ ایسی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا احترام مسجد کے خلاف ہے بالخصوص جب کہ ان کے تنکے نکل کر مسجد میں بکھرتے ہیں اور ان پر میل کی تہہ نظر آتی ہے اور پسینے اور میل کی بو آتی ہے، کیا کوئی شخص ایسی ٹوپیوں کو اپنے مکان کی زینت بنانے کو تیار ہے؟ اگر نہیں تو خدا کے گھر کے لئے اس کو کیوں کر جائز قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ بات بھی تو سوچنے کی ہے کہ چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپی پہن کر آپ کسی کی شادی بیاہ کی مجلس یا کسی افسر کے سامنے نہیں جاسکتے، مسجد اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا دربار ہے یہاں کیسے پہن کر آسکتے ہیں، اس لئے چٹائی یا پلاسٹک کی ٹوپیاں مسجد میں رکھنا جائز نہیں اور ان کو سر پر رکھ کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو لباس پہن کر انسان کسی مجلس میں جانے سے شرماتا ہے ایسے لباس میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، اس پر دوام مکروہ تحریمی کے قریب ہے، اس لئے احتیاط لازم ہے۔

مسجد میں قرآن کریم رکھنا:

تلاوت کی غرض سے مسجد میں وقف کرنا کار خیر ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن قرآن کریم کے احترام کا خاص لحاظ ہونا چاہئے عام طور پر مساجد میں دیکھا جاتا ہے کہ قرآن کریم بالکل بے

ترتیب رکھے ہوئے ہوتے ہیں بعض کی جلد پھٹی ہوتی ہیں بعض کے کچھ اوراق غائب ہیں، کچھ میں جزدان ہیں کچھ میں نہیں ہے، اس طرح قرآن کریم کی بے احترامی ہوتی ہے اس لئے منتظمین مسجد پر لازم ہے کہ اتنے قرآن کریم وصول کریں جتنے کی مسجد کو ضرورت ہے اور پھر ان کی حفاظت کا اور ادب واحترام کا پورا لحاظ کیا جائے مضبوط جلد بندی کرکے جزدان میں رکھے کبھی کبھی خوشبوؤں سے معطر کرے، ورنہ بے احترامی کی وجہ سے سب گناہ گار ہوں گے اس سے اللہ تعالی کے عذاب کا بھی خطرہ ہے۔

مسجد یا مدرسہ کے قرآن پاک اور کتب دوسری جگہ منتقل کرنے کا حکم:

اگر واقف نے خاص مدرسہ یا مسجد کے لئے قرآن کریم یا کتاب وقف کیا ہے تو ان کو دوسری جگہ منتقل کرنا جائز نہیں۔

چنانچہ علامہ ظفر احمد عثانی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

مسجد کی چیزیں مسجد سے باہر لیجا کر استعمال کرنا حرام ہے۔

قال فی الخلاصة: لان البواری لیست من المسجد حقیقة لکن لها حکم المسجد ...... وقال ایضاً: ولا یحمل الرجل سراج المسجد الیٰ بیته ویحمل من بیته الی المسجد اھ. (۲۲۹/۱)

قلت: وقد مر فی قول ابی یوسفؒ انه لایجوز نقل المسجد ونقل ماله الی مسجد آخر فالیٰ غیر المسجد بطریق الاولیٰ.

(ماخوذ از امداد الاحکام: ۱۷۳/۲)

مسجد کے چراغ کیلئے دی جانے والی رقم دوسرے مصرف میں خرچ نہیں کی جاسکتی:

سوال: بنیت چراغ مسجد میں پیسہ دیتے ہیں، اس پیسہ سے دوسرا کام جیسے بچھونا، ستون خریدنا یا مؤذن وامام کا مشاہرہ دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: جب پیسہ دینے والا چراغ مسجد کا نام لیتا ہے تو دوسرے مصرف میں اس رقم کو صرف کرنا جائز نہیں اگر چراغ کے لئے ضرورت کم ہو اور دوسرے کام کے لئے رقم کی ضرورت ہو تو پیسہ دینے والے سے بصراحت اجازت لینی چاہئے کہ اگر تیل کی ضرورت نہ ہو تو ہم اس رقم کو دوسرے مصارف مسجد میں صرف کردیں یا نہیں؟ اگر وہ اجازت دے دے تو پھر اس رقم کو صرف

کرنا جائز ہو جائے گا۔

وفي الخلاصة : رجل قال : جعلت حجرتي لدهن سراج المسجد ولم يزد على هذا صارت الحجرة وقفاً على المسجد اذا سلمها الى المتولي وليس للمتولي ان يصرف غلتها الى غير الدهن اهـ. (ماخوذ از امداد الاحكام : ۳/۱۷۳، ۴/۴۴۲)

مسجد میں قرآن کریم کی تعلیم دینا:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ بچوں کو قرآن شریف وغیرہ اجرت لیکر مسجد میں پڑھانا بالاتفاق ناجائز ہے اور بلا اجرت محض ثواب کے لئے بعض فقہاء نے اجازت دی ہے۔ (کذا فی الاشباہ) لیکن بعض فقہاء اس کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں کیوں کہ بحکم حدیث بچوں کو مسجد میں داخل کرنا ہی ناجائز ہے۔

(كذا في حاشية الاشباه من التمر تاشي ، آداب المساجد : صـ ۱۴)

البتہ مدرسہ میں جگہ کی تنگی ہو اور اہل مدرسہ دوسری جگہ کے انتظام کی کوشش میں ہوں تو سر دست دوسری جگہ کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم خراب ہو رہی ہو، ایسی مجبوری کی صورت میں فقہاء نے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔

(۱) نماز، اذکار، تلاوت قرآن وغیرہ عبادات میں مخل نہ ہو۔

(۲) مسجد کی طہارت و نظافت اور آداب واحترام کا پورا خیال رکھا جائے۔

(۳) کمسن ناسمجھ اور آداب مسجد سے ناواقف بچوں کو نہ لایا جائے۔

(احسن الفتاویٰ : ۶/۴۵۸، فتاویٰ رحیمیہ : ۹/۲۰۰)

مسجد میں ذکر جہری کی مجلس:

اگر کوئی شخص مشائخ حقہ میں سے کسی سے بیعت ہو اور انہوں نے ذکر جہری کی تعلیم دی ہو تو تعلیم کے مطابق اپنا اپنا الگ ذکر جہری کر سکتے ہیں، لیکن مسجد میں ذکر جہری سے نمازیوں کو تشویش لاحق ہوتی ہو تو ایسی صورت میں مسجد میں زور زور سے ذکر کرنا جائز نہیں۔

(فتاویٰ رحیمیہ : ۱۰/ ۲۳۸)

حضرت مفتی محمد شفیعؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں اس میں اقوال بہت مختلف ہیں فیصلہ وہ ہے جو

علامہ شامی نے حاشیہ حموی سے امام سعدانی کا قول نقل کیا ہے۔

"اجمع العلماء سلفاً وخلفا علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرها الا أن یشوش جهرهم علی نائمه أو مصل او قاری الخ". (١/٦٩١)

یعنی علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ذکر جہری کی مجلس قائم کرنا مسجد وغیر مسجد دونوں جگہ جائز ہے (بشرطیکہ شریعت کے خلاف اور کوئی بات نہ ہو) ہاں ذاکرین کے ذکر جہری سے سونے والوں کو یا نمازیوں اور تلاوت کرنے والوں کو تکلیف پہنچے تو ایسے وقت میں تکلیف دہ طریقہ سے ذکر نہیں کرنا چاہئے۔ (ماخوذ آداب المساجد)

اسی طرح اگر مسجد میں ذکر جہری سے بدعتوں اور نئی نئی چیزیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسے موقع پر ذاکرین بھائی مسجد میں ذکر کرنے پر اصرار نہ کریں ان کو چاہئے کہ اپنے گھروں میں اس طرح ذکر کریں کہ سونے والوں اور نماز پڑھنے والوں وغیرہ کو تکلیف نہ پہنچے۔ (فتاوی رحیمیه)

مسجد میں تبلیغی تعلیم کہاں کی جائے:

نماز ذکر و تلاوت میں خلل آئے اس طرح تعلیم کرنا منع ہے مگر تعلیمی سلسلہ بھی بہت اہم اور مفید ہے اس لئے دونوں سلسلے جاری رہ سکیں ایسی صورت اختیار کی جائے۔ مسجد بڑی ہو تو اس کے کسی گوشہ میں یا برآمدہ یا صحن میں تعلیم ہو اگر چھوٹی ہے تو کچھ انتظار کرے تا کہ نمازی حضرات نماز سے فارغ ہو جائیں۔ (ماخوذ از فتاوی رحیمیه : ٦/١٠٠)

مسجد کی دیواروں پر آیات قرآنی لکھنا ممنوع ہے:

مسجد کے اندرونی اور بیرونی حصہ میں قرآن شریف کی آیت اور قابل تعظیم اشیاء لکھنا ممنوع ہے بے ادبی کے احتمال کی وجہ سے فقہاء اجازت نہیں دیتے۔

"لیس بمستحسن کتابة القرآن علی المحارب والجدران لما یخاف من سقوط الکتابة وأن توطا."

(طحطاوی علی الدر المختار : ١٠/٤٤٠، فتاوی رحیمیه : ١٠/٢٤٣)

مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا:

بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ مسجدوں میں آکر بھی دنیوی باتوں میں مشغول ہو جاتے

ہیں ، بلکہ بہت سوں کو دیکھا گیا ہے جن کو مسجد میں ذرا زیادہ رہنا ہوتا ہے ان کے دل میں مسجد کا ادب واحترام بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

مسجد میں کھانا ، پینا ، سونا ، آپس میں ہنسی مذاق کرنا حتیٰ کہ ایک دوسرے کی غیبت کرنا ، بعض دفعہ اس قدر شور مچاتے ہیں کہ فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا گھر مسجد ہے یا کوئی تفریح گاہ۔ (العیاذ باللہ)

حالانکہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص مسجد میں دنیا کی باتیں شروع کرتا ہے تو فرشتے پہلے کہتے ہیں "اسکت یا ولی اللہ" (اے اللہ کے ولی چپ رہ) پھر اگر وہ چپ نہیں ہوتا اور باتوں میں لگا رہتا ہے تو کہتے ہیں "اسکت یا بغیض اللہ" (اے اللہ کے دشمن چپ ہو جا) پھر اگر اس سے بھی آگے بڑھتا ہے تو کہتے ہیں "اسکت لعنۃ اللہ علیك" (تجھ پر خدا کی لعنت چپ رہ)۔ (کذا فی المدخل لابن الحاج آداب المساجد)

دوسری روایت میں ہے کہ آخری زمانہ میں ایسے لوگ ہوں گے جو مسجد میں آکر جگہ جگہ حلقہ بنا کر بیٹھ جائیں گے وہاں دنیا اور اس کی محبت کی باتیں کریں گے تم ایسے لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو مسجد میں ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ (مشکوۃ بحوالہ شعب الایمان)

ان احادیث کی روشنی میں علماء کرام نے لکھا ہے کہ جو دنیا کی باتیں مسجد سے باہر جائز اور مباح ہیں مسجد میں وہ بھی ناجائز ہیں اور جو باتیں مسجد کے باہر بھی ناجائز ہوں وہ مسجد میں سخت حرام ہیں۔

"فتح القدیر" میں علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد میں دنیا کی باتیں کرنا نیکیوں کو اس طرح کھا لیتی ہیں جس طرح آگ لکڑیوں کو کھا جاتی ہیں ، اور "خزانۃ الفقہ" میں لکھا ہے ، جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس کے چالیس دن کے عمل حبط کر دیتے ہیں۔

(الاشباہ والنظائر)

مسجد میں بلند آواز سے تلاوت کرنا:

اگر مسجد میں لوگ نمازوں میں مشغول ہوں تو ایسی بلند آواز سے تلاوت کرنا جو لوگوں کی نماز میں مخل ہو ، جائز نہیں ہے اس لئے تلاوت آہستہ کرے جس سے نمازیوں کو تشویش لاحق نہ ہو۔

مروّج صلوٰۃ وسلام:

بعض مسجدوں میں نماز جمعہ اور دیگر اوقات میں بھی کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھنے کا رواج

ہے، اور عقیدۃً اسے ضروری سمجھتے ہیں، جبکہ اس کا ثبوت نہ تو خلفاء راشدین سے ہے نہ جماعت صحابہؓ سے اور نہ تابعین و تبع تابعین اور نہ بزرگان وسلف صالحین سے اور بتلایا جاتا ہے کہ یہ اظہار محبت اور عقیدت کا ایک طریقہ ہے حالانکہ اظہار محبت وعقیدت تو اتباع اور اطاعت سے ہوتا ہے۔

کما قال اللہ تعالیٰ: ﴿ ان کنتم تحبون اللّٰه فاتبعونی یحببکم اللّٰه ﴾ (الآیۃ) (سورۃ آل عمران: ۳۱)

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کردیں گے۔ ولنعم ما قیل

تعصی الرسول وانت تظهر حبه، هذا العمری فی الفعال بدیع
لو کان حبك صادقا لاطعته، ان المحب لمن یحب مطیع

یعنی تم رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی بھی کرتے اور ان سے محبت کا اظہار بھی کرتے ہو، قسم خدا کی یہ بہت ہی عجیب بات ہے، اگر سچی محبت ہوتی تو ضرور ان کا اتباع کرتے کیوں کہ محب اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ اظہار محبت وعقیدت کا نہیں ہے بلکہ ریاونمود اور خواہش پرستی ہے کئی بدعتوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے ناجائز اور قابل ترک ہے۔

مسجد کی زمین میں میت کو دفن کرنا:

آج کل ایک رواج یہ ہوگیا ہے کہ مسجد کی موقوفہ زمین میں بانی مسجد یا امام یا کسی بزرگ کے لئے مقبرہ بنایا جاتا ہے، جبکہ متولی یا منتظمہ کمیٹی کو شرعاً یہ حق نہیں ہے کہ موقوفہ زمین میں کسی کے لئے قبر بنانے کی اجازت دے، وہ جگہ صرف مصالح مسجد کے لئے خاص ہوگی اس کے علاوہ کوئی اور کام کرنا جائز نہیں ہے۔

صرح به عامة کتب الفقه، من الشامیة والعالمگیریة.

(ماخوذ از امداد المفتیین: صـ ۷۸۸)

مسجد کی چھت پر جماعت کرانا:

مسجد کی چھت پر جماعت کرانا مکروہ ہے خواہ گرمی کی وجہ سے ہو یا کسی اور عذر سے البتہ مسجد اگر تنگ ہو تو زائد نمازی چھت پر جاسکتے ہیں۔

قال فی الهندیة: الصعود علی سطح کل مسجد مکروه ولهذا

اذا اشتد الحر یکرہ ان یصلوا بالجماعة فوقه الا اذا ضاق المسجد فحینئذ لایکرہ الصعود علی سطحه للضرورة کذا فی الغرائب .

(عالمگیریة : ۳۲۲/۵ ، احسن الفتاوی : ۳۶۲/۶)

مسجد میں چار پائی بچھانا:

بعض فقہاء غیر مسافر و معتکف کے لئے مسجد میں سونا مکروہ ہے بحالت ضرورت شدیدہ یہ تدبیر اختیار کرسکتا ہے کہ پہلے بنیت اعتکاف داخل ہوکر کچھ عبادت کرے اس کے بعد سوئے۔

دراصل ادب یا بے ادبی کا مدار عرف پر ہے ہمارے عرف میں مسجد میں چار پائی بچھانا معیوب سمجھا جاتا ہے نیز اس سے عوام کے قلوب سے مسجد کی وقعت نکل جائے گی وہ چار پائی پر قیاس کرکے دوسرے ناجائز امور بھی مسجد میں شروع کردیں گے، لہٰذا مسجد میں چار پائی بچھانا جائز نہیں، جیسے پہلے جوتے پہن کر مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر ہمارے عرف میں اسے مسجد کی بے ادبی سمجھا جاتا ہے اگر کوئی پاک جوتا بھی پہن کر مسجد میں آجائے تو عوام اس پر ہنگامہ برپا کردیں گے اس لئے جوتا پہن کر مسجد میں آنا مکروہ ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی)

مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش:

گمشدہ چیز کی تلاش مسجد میں جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ مسجد کے احترام کے خلاف ہے کیوں کہ اس میں شور اور ہنگامہ ناگزیر ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"من سمع رجلاً ینشد ضالة فی المسجد فلیقل لاردھا اللہ علیك فان المساجد لم تبن لھذا ."

جو کسی شخص کو سنے کہ وہ مسجد میں گمشدہ چیز کی تلاش کرتا ہے تو چاہئے کہ کہے اللہ تعالیٰ اس کو تجھ پر نہ لوٹائے کیوں کہ مسجد اس کام کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔

(مسلم باب النھی عن نشد الضالة : ۲۱۰/۱)

اس حدیث میں صرف گمشدہ چیز کی تلاش سے روکا ہی نہیں گیا ہے بلکہ اس میں اس پر زجر و توبیخ بھی موجود ہے اور ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان کردی گئی ہے اس زمانہ میں خصوصیت سے اس حدیث پر عمل کرنا چاہئے اور اس حدیث کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہونا چاہئے ہاں اس وقت کوئی حرج سمجھ نہیں آتا جب چیز مسجد ہی میں گم ہوجائے تو آداب مسجد کا لحاظ کرتے ہوئے

تلاش کی جائے، باقی جو چیز مسجد سے باہر کہیں اور کھوگئی ہے اس کی جستجو ان مساجد کے ذریعہ کسی طرح مناسب نہیں ہے، اور مجمع الانھر میں ہے: جس جگہ لقطہ ملا ہو اس جگہ اعلان کرے اور اسی طرح لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ جیسے مسجد کا دروازہ اور بازار مالک تک خبر اور اس کی چیز پہنچانے کا یہ قریبی ذریعہ ہے۔

(مجمع الانهر : ۱/۱۳ كتاب اللقطة، ملخص از فتاوىٰ رحيميه)

بہتر یہ ہے کہ مسجد کے باہر گمشدہ چیز پہنچانے اور لینے کے لئے کوئی جگہ متعین کردی جائے اس تدبیر سے مسجدیں ہر وقت اعلان اور شور وشغب سے محفوظ رہیں گی۔

مسجد کے لئے مسجد میں چندہ کرنا:

بہتر اور مناسب صورت یہی ہے کہ مسجد کے باہر چندہ کیا جائے یا مسجد میں کسی بورڈ پر چندہ کی اپیل لکھ دی جائے البتہ اگر اس طرح چندہ کرنے سے خاطر خواہ کامیابی نہ ہوتی ہو اور مسجد میں جمعہ کے دن چندہ کرنے سے مسجد کا زیادہ فائدہ ہو تو اس شرط کے ساتھ برائے مسجد، مسجد میں چندہ کرنے کی گنجائش ہے کہ نمازیوں کو تکلیف نہ ہو، ان کی گردن نہ پھاندے، نمازی کے سامنے سے نہ گذرے مسجد میں شور وشغب نہ ہو، مسجد کے احترام کے خلاف کوئی کام نہ ہو اور لوگوں کے سامنے کسی کو شرم اور غیرت میں ڈال کر زبردستی چندہ وصول نہ کیا جائے ان شرائط کی رعایت ضروری ہے اگر ان کی رعایت نہ ہو سکے تو مسجد میں چندہ نہ کیا جائے۔

وفي الشامية قال : والمختار ان السائل ان كان لايمر بين يدى المصلى ولا يتخطى الرقاب ولا يسأل الحافا بل لامر لابد منه فلابأس بالسوال والاعطاء اه ومثله في البزازية ولا يجوز الاعطاء اذا لم يكونوا على تلك الصفة المذكورة شامى باب الجمعة . (فتاوىٰ رحيميه : ۹/۲۳۹)

مدارس کے لئے مسجد میں چندہ کرنا:

عام حالات میں مسجد میں مدارس کے لئے چندہ نہ کرنا چاہئے مسجد میں شور وغل ہوگا نمازیوں کو خلل ہوگا، مسجد کی بے احترامی ہوگی لہٰذا مسجد میں چندہ نہ کیا جائے البتہ اگر کوئی خاص حالت ہو، تو حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں "اگر شق صفوف (یعنی گردن نہ پھاندے) نہ ہو اور نمازیوں کے سامنے سے نہ گذرے اور تشویش علی المصلین نہ ہو اور حاجت ضروریہ ہو تو درست

ہے۔(امداد الفتاوی : ۲/ ۲۴۱)

مسجد میں ہوا خارج کرنا:

مسجد میں ہوا خارج کرنا ناجائز ہے کہ فرشتوں کو ہر اس چیز سے ایذاء ہوتی ہے جس سے انسانوں کو ایذا ہوتی ہے(اشباہ) چونکہ معتکف اس حکم سے مستثنیٰ نہیں ہے اس لئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں اس کو ہوا خارج کرنے کے لئے باہر نکلنا چاہئے۔(آداب المساجد)

حضرت محمود حسن صاحبؒ فرماتے ہیں جو شخص کثرت ریاح کا مریض ہو اس کو یا تو بار بار مسجد سے نکلنا ہوگا یا کراہت کا ارتکاب کثرت سے کرنا ہوگا۔

لہٰذا احوط یہی ہے کہ ایسا شخص اعتکاف نہ کرے بلکہ اللہ پاک سے دعا کرتا رہے اس کو آرزو اور تمنا کا اجر ملے گا۔

واختلف فی الذی یفسو فی المسجد فلم یر بعضهم بأسا وبعضهم قالوا لا یفسو ویخرج اذا احتاج الیه وهو الاصح كذا فی التمر تاشی . (عالمگیریه : ۵/ ۳۲۱)

مسجد کے روپیہ کو تجارت میں لگانا:

مسجد کی آمدنی اگر ضروریات مسجد سے زائد ہو تو مسجد کے نفع کے لئے اس کو تجارت میں لگانا جائز ہے۔(امداد المفتیین : صـ ۷۸۰)

مسجد میں خرید وفروخت:

مسجد میں خرید وفروخت اور جملہ معاملات نکاح کے علاوہ ناجائز ہیں، البتہ معتکف کے لئے بقدر حاجت جائز ہے بشرطیکہ سامان فروخت مسجد میں داخل نہ کرے۔(آداب المساجد)

مسجد میں عقد نکاح مستحب ہے:

قال النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم : اعلنوا هذا النكاح واجعلوه فی المساجد . (مشکوٰۃ بحواله ترمذی)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ’’تم نکاح کا اعلان کیا کرو اور نکاح کی مجلس مسجد کے اندر منعقد کیا کرو‘‘۔(ترمذی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نکاح مسجد کے اندر کرنا مستحب ہے اسی طرح جمعہ کے دن کرنا

بھی مستحب ہے کیوں کہ مسجد میں اور جمعہ کے دن نکاح کرنے سے برکت حاصل ہوتی ہے۔

(مظاہر حق جدید)

البتہ یہ بات خوب یاد رکھنے کی ہے کہ مسجد کے ادب واحترام ملحوظ رہے شور شغب سے احتراز کیا جائے اور چھوٹے بچے جو آداب المساجد سے ناواقف ہیں ان کو مسجد میں نہ لایا جائے اسی طرح کوئی گناہ کا کام نہ کیا جائے خصوصا بعض ناداں تصویر کشی کی کوشش کرتے ہیں جو عام حالات میں بھی گناہ کبیرہ ہے پھر مسجد جیسی مقدس جگہ میں یہ اس کی قباحت وشناعت اور بھی بڑھ جاتی ہے، اسی طرح ہار وغیرہ مسجد کے اندر نہ پہنایا جائے کیوں کہ اس سے پتے وغیرہ گرنے کی وجہ سے تلویث مسجد کا خطرہ ہے۔

مسجد میں افطار کرنا:

آج کل جس طرح مساجد کے اندر افطار کرنے کا دستور ہے اس میں مسجد کی تلویث اور بے حرمتی ہوتی ہے لہذا یہ جائز نہیں۔ مسجد کی منتظمہ کمیٹی پر ضروری ہے کہ اذان کے بعد اتنا وقفہ دے کہ محلّہ کے نمازی گھروں میں اطمینان سے افطار کر کے مسجد میں پہنچ سکیں۔ (احسن الفتاویٰ) ہاں البتہ مسافر کے لئے مسجد سے باہر بقدر ضرورت انتظام کرے تاکہ سہولت رہے۔

مسجد کا مکان بینک یا کسی بھی حرام کام کرنے والے کو کرایہ پر دینا:

بینک یا کسی بھی خلاف شرع امور انجام دینے کو مسجد کا مکان کرایہ پر دینا تعاون علی الاثم کے مترادف ہے اور قرآن کریم میں تعاون علی الاثم کی ممانعت آئی ہے ارشاد خداوندی ہے:

﴿ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان ﴾

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں معاونت مت کرو، لہذا شرعاً ان کو مکان کرایہ پر دینا جائز نہیں ہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۱۰۸/۶)

مسجد کی رقم کا سود:

اول تو مسجد کا روپیہ بینک میں جمع کرنا جبکہ حفاظت کا دوسرا ذریعہ موجود ہو خلاف احتیاط ہے اور اگر غلطی سے یا غفلت سے یا قانونی مجبوری کی وجہ سے رقم بینک میں رکھی ہو اور اس پر سود ملا ہو تو وہ مسجد کے بیت الخلاء، غسل خانہ کی مرمت یا صفائی کی چیزوں میں خرچ کیا جائے اگر اس میں ضرورت نہ ہو تو غرباء کو دیدیا جائے، رفاہ عام کے کاموں میں بھی استعمال کر سکتے ہیں، مسجد پر یہ رقم

خرچ نہ کی جائے کہ یہ تقدس مسجد کے خلاف ہے۔ (فتاوی رحیمیہ بحوالہ کفایۃ المفتی)

مسجد میں غیر مسلم کا چندہ لینا:

اگر غیر مسلم اپنے اعتقاد سے اسے قربت سمجھتا ہو تو اس کا چندہ لینے کی گنجائش ہے مگر اس زمانہ میں غیر مسلم کی رقم مسجد میں استعمال کرنے سے بچنا چاہئے غیر مسلم کا مسجد پر احسان چڑھے گا اور کسی وقت ان کے مذہبی کاموں میں چندہ دینا اور شرکت کرنا پڑے گی لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

(فتاوی رحیمیہ، امداد المفتیین)

مسجد میں نماز جنازہ:

بلا عذر مسجد میں نماز جنازہ مکروہ تحریمی ہے، خواہ جنازہ مسجد کے اندر ہو یا باہر البتہ نماز جنازہ کے لئے کوئی دوسری جگہ نہ ہو تو عذر کی وجہ سے مسجد میں جنازہ پڑھنے میں کراہت نہیں۔

(شامی ، احسن الفتاوی : ۱۸۳/۴)

مسجد میں جماعت ثانیہ:

بعض لوگ جماعت سے رہ جاتے ہیں پھر ان کو مسجد میں دوسری جماعت کرانے کا شوق ہوتا ہے حالانکہ جماعت ثانیہ جائز نہیں ہے۔

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں ہے کہ: مسجد محلّہ میں امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں دوسری جماعت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ قولہ ویکرہ ای تحریماً ۔ (شامی)

پس اس میں شرکت کرنا درست نہیں اور مقتدی مستحق ثواب نہیں جماعت ثانیہ کی عادت موجب تقلیل جماعت اُولی ہے، یہ بھی ایک وجہ فقہاء نے ممانعت جماعت ثانیہ کی تحریر فرمائی ہے اور فعل مکروہ میں شرکت واعانت ظاہر ہے کہ موجب ثواب نہیں ہوسکتا۔

(عزیز الفتاوی : صـ ۱۹۰)

مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانا:

مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانے کی شرعاً اجازت نہیں ہے اس سے مسجد کا ادب واحترام باقی نہیں رہے گا اور لانے والے کو بھی اطمینان قلب نہ رہے گا، نماز میں کھڑے ہوں گے مگر خشوع وخضوع نہ ہوگا، بچوں کی طرف دل لگا رہے گا، حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

" جنبوا مساجد کم صبیا نکم و مجانینکم الخ " .

یعنی اپنی مسجدوں کو بچوں اور پاگلوں سے بچاؤ۔ (ابن ماجه: صـ ٥٥)

اسی لئے فقہاء کرام رحمہم اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ مسجد میں بچوں کو داخل کرنا اگر اس سے مسجد کے نجس ہونے کا اندیشہ ہو تو حرام ہے ورنہ مکروہ ہے۔ (الاشباه النظائر: صـ ٥٥٧)

ہاں البتہ اگر بچہ سمجھدار ہو، نماز پڑھتا ہو، مسجد کے ادب واحترام کا پاس ولحاظ رکھتا ہو تو اس کو مسجد میں لانے میں کوئی حرج نہیں، غالباً اسی بناء پر سات سال کی قید حدیث میں موجود ہے یعنی سات سال سے کم عمر کے بچوں کو نہیں لانا چاہئے اس سے بڑی عمر کے بچوں کو آداب واحترام کی تعلیم دے کر لانا چاہئے، وہ نابالغ بچوں کی صف میں کھڑا رہے اگر صرف ایک ہی بچہ ہے تو وہ بالغوں کی صف میں کھڑا ہو سکتا ہے مکروہ نہیں ہے۔ (فتاوی رحیمیه: ١٢١/٣)

مسجد کی صفائی کا اہتمام:

مسجد کی صفائی ستھرائی کا اہتمام کرنا امت محمدیہ ﷺ کے لئے کس حد تک ضروری ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ بنفس نفیس مسجد کی صفائی فرماتے تھے، حضرت یعقوب بن زیدؓ سے روایت ہے:

"ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یتبع غبار المسجد بجریدۃ." (مصنف ابن ابی شیبة: ٣٩٨/١)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ مسجد کے گرد وغبار کو کھجور کی ٹہنی سے صاف کیا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق منقول ہے کہ وہ ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار ہو کر مسجد قباء تشریف لے گئے اس میں نماز پڑھی پھر فرمایا "اے یرقا (کسی شخص کا نام ہے) مجھے کھجور کی ایک ٹہنی لا کر دو، اس نے لا کر دی آپؓ نے ایک کپڑے سے اپنی کمر باندھی اور تمام مسجد میں جھاڑو دی۔ (مصنف ابن ابی شیبه: ٣٩٨/١)

اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے اعمال کے ثواب سب میرے سامنے پیش کئے گئے یہاں تک کہ ایک ایسا تنکا کہ جس کو کسی شخص نے مسجد سے نکالدیا ہو اس کا ثواب بھی پیش کیا گیا اور میری امت کے سارے گناہ بھی پیش کئے گئے، پس میں نے کوئی گناہ اس سے بڑا نہیں دیکھا کہ آدمی قرآن مجید کی کوئی آیت یاد کر کے پھر بھول جائے۔ (مشکوۃ بحوالہ ابو داؤد، ترمذی)

احکام الاکراہ

مجبور شخص کے احکام:

الاکراہ لغۃ : الالزام والاجبار، یقال : اکرہ علی فعل کذا اذا

جبرہ علیہ دون رضاہ .

جبرواکراہ کی اصطلاحی تعریف:

کسی انسان کو قتل یا سخت اذیت یا مال تلف کرنے کی دھمکی دے، کسی خلاف شرع یا خلاف طبع

کام کرنے پر مجبور کرنا۔

الاکراہ : حمل الغیر علی مایکرہ بالوعید بالقتل او التھدید

بالضرب الشدیداو باتلاف المال او بالا ذی الجسدی قال صلی اللہ

علیہ وسلم رفع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ ای ما

اکرھوا علیہ من قول او فعل جبرًا وقھرا، دون اختیار .

اخرجہ ابن ماجہ فی سننہ رقم : ۲۰۵۳ ، بلفظ ان اللہ تجاوز لی

عن امتی : الخطأ والنسیان ، وما استکرھوا علیہ . (فقہ المعاملات)

اکراہ کی دو قسمیں:

(۱) اکراہ غیر ملجی :

یعنی کسی کو ایسے قول وفعل پر مجبور کیا جائے جس کے کہنے اور کرنے پر وہ دل سے راضی نہیں، مگر ایسا بے اختیار و بے قابو بھی نہیں کہ انکار نہ کر سکے، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ غیر ملجی کہلاتا ہے، ایسے اکراہ سے کوئی کلمۂ کفر کہنا یا کسی حرام فعل کا ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا، البتہ بعض جزئی احکام میں اس پر بھی کچھ اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مفصل مذکور ہے۔

(۲) اکراہ ملجی :

یعنی اکراہ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اسلوب اختیار کر دیا جائے کہ اگر اکراہ کرنے والوں کے کہنے پر عمل نہ کرے تو اس کو قتل کر دیا جائے گا یا اس کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے گا، یہ فقہاء کی اصطلاح میں اکراہ ملجی کہلاتا ہے۔

ایسے اکراہ کی حالت میں کلمۂ کفر زبان سے کہہ دینا، بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو جائز ہے، اسی طرح دوسرے انسانوں کو قتل کرنے کے علاوہ اور کوئی حرام فعل کرنے پر مجبور کر دیا جائے تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

مگر دونوں قسموں میں شرط یہ ہے کہ اکراہ کرنے والا جس کام کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس پر قادر بھی ہو اور جو شخص مبتلاء ہے اس کو غالب گمان یہ ہو کہ اگر میں اس کی بات نہ مانوں گا تو جس چیز کی دھمکی دے رہا ہے وہ اس کو ضرور کر ڈالے گا۔ (تفسیر مظہری، معارف القرآن: ص ۴۰۷/ ج ۵)

قال فی ملتقی الابحر : و شرط الاکراہ قدرۃ المکرہ ، اسم فاعل، علی ما ھدد بہ، سلطانا کان أ ولصا و خوف المکرہ ، اسم مفعول ، وقوع ذلك ، و کونہ ممتنعاً قبلہ عن فعل ما أکرہ علیہ، لحقہ ، أو لحق آخر ، أولحق الشرع و کون المکرہ بہ متلفا نفسہ أو عضوًا أو موجباً غماً یُعدم الرضا .

(ملتقی الابحر للامام ابراھیم الحلبی : ۱۷۸/۲)

اکراہ سے حرام کے ارتکاب پر گناہ نہ ہونے کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والاصل فی ھذا قول اللّٰہ تبارك و تعالیٰ فی أعظم الذنوب، وھو الکفر : ﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِیْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ○ ﴾

(سورۃ النحل : الآیتان ۱۰۶ـ۱۰۷)

یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے، بشرطیکہ اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا، اور ان کو بڑی سزا ہوگی اور یہ اس سبب سے ہوگا کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں عزیز رکھا اور اس سبب سے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کافر لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔
(بیان القرآن)

یہ آیت صحابۂ کرام کے بارے میں نازل ہوئی جن کو مشرکین نے گرفتار کرلیا تھا، اور کہا تھا کہ وہ کفر اختیار کریں ورنہ قتل کردیئے جائیں گے۔

یہ گرفتار ہونے والے حضرات، حضرت عمارؓ، اور ان کے والدین یاسرؓ اور سمیہؓ اور صہیب اور بلالؓ اور خباب رضی اللہ عنہم تھے، جن میں سے حضرت یاسر اور ان کی زوجہ سمیہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کیا، حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو قتل کردیا گیا، اور حضرت سمیہ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ کر ان کو مختلف سمتوں کی طرف دوڑایا گیا جس سے ان کے دو ٹکڑے الگ الگ ہوگئے اور وہ شہید ہوئیں یہی دو بزرگ ہیں جن کو اسلام کی خاطر سب سے پہلے شہادت نصیب ہوئی، اسی طرح خباب رضی اللہ عنہ نے کلمۂ کفر بولنے سے قطعی انکار کر کے بڑے اطمینان کے ساتھ قتل کیے جانے کو قبول کیا، ان میں سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جان کے خوف سے زبانی کلمۂ کفر کا اقرار کرلیا، مگر دل ان کا ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، جب دشمنوں سے رہائی پا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بڑے رنج وغم کے ساتھ اس واقعہ کا اظہار کیا، آنحضرت ﷺ نے ان سے دریافت کیا کہ جب تم یہ کلمہ بول رہے تھے تو تمہارے دل کا کیا حال تھا، انہوں نے عرض کیا کہ دل تو ایمان پر مطمئن اور جما ہوا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو مطمئن کیا کہ تم پر اس کا کوئی وبال نہیں، آپ ﷺ کے اس فیصلہ کی تصدیق میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (قرطبی، مظہری)

وقال العلامة الصابوني حفظه الله :

ومن سبب نزول الآية الكريمة ، يتّضح لنا بجلاء حكم الاكراه الملجي ، الذي تحدث عنه الفقهاء ، والذي يبيح للمسلم فعل ما أكره عليه .

أ۔ روى الحافظ ابن كثير من سبب نزول هذه الآية أن "عمار بن ياسر" رضي الله عنه ، أخذه المشركون فعذّبوه ، عذاباً شديداً ، حتى قاربهم ، اى وافقهم ، في بعض ما أرادوا ، وأظهر الكفر على لسانه فشكا ذلك الى النبي صلى الله عليه وسلم ، فقال له الرسول صلى الله عليه وسلم : كيف تجد قلبك؟ فقال يا رسول الله : أجده مطمئناً بالايمان !!فقال له عليه الصلاة والسلام : "ان عادوا

فعد"تفسیر ابن کثیر : ۲/ ۶۰۹،أی ان عادوا الی تعذیبك واکراهك ، فعُد الی ما قلت لهم .

ب۔ وروی الحاکم والبیهقی ، أن "عمار بن یاسر" لما أکرهه الکفار علی سبّ محمد صلی اللّٰه علیه وسلم ، رجع الی رسول اللّٰه علیه السلام،فقال له : ماوراءك یا عمار؟ قال : شریا رسول اللّٰه، ماترکونی حتی سببتك وذکرت آلهتهم بخیر!!

قال : کیف تجد قلبك ؟ قال : مطمئناً بالایمان ، فقال له صلی اللّٰه علیه وسلم :

"فان عادوا فعُد" وفی ذلك أنزل اللّٰه‌تعالیٰ : ﴿ اِلَّا مَنْ اُکْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ،، ﴾ الآیة .

(اخرجه الحاکم والبیهقی ، وقال الحاکم : صحیح علی شرط الشیخین ولم یخرجاه انظر نصب الرایة : ۴/ ۱۵۸)

کفر پر اکراہ کے وقت ایمان پر ثابت قدم رہنا افضل ہے:

اگر کوئی مسلمان کسی کافر کی قید میں آجائے اور وہ کلمۂ کفر پر مجبور کرے اور بصورت دیگر قتل کی دھمکی دے تو شرعاً زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی جواجازت ہے یہ گنجائش اور رخصت ہے اس وقت بھی عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ زبان سے بھی کلمۂ کفر نہ کہے اور ایمان پر ثابت قدم رہے، اور کفریہ طاقت کے سامنے ڈٹ جائے اور جان دیدے، صحابۂ کرام کے بکثرت واقعات ہیں، جن میں انہوں نے ایمان پر ثابت قدمی دکھائی اور جان قربان کردی، چنانچہ ذیل میں صحابہ کرام کے ایمان پر ثابت قدمی کے چند واقعات نقل کئے جاتے ہیں جو بعد کے مسلمانوں کیلئے یقیناً مشعل راہ ہیں۔

۱۔ ویدل علی ذلك ماروی أن "مسیلمة الکذاب "الذی ادّعی النبوة، وقع تحت یدیه رجلان من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی الأسر، فجیئ بهما الیه ، فقال لأحدهما : ما تقول فی محمد؟قال : هو رسول اللّٰه !!

قال : فما تقول فیّ ؟ قال وأنت أیضاً!! فخلی سبیله!

وجیء بالآخر، فقال: ما تقول فی محمد؟ قال: أشهد أنه رسول اللّٰه!!

قال: فما تقول فی ؟فقال: ماذا تقول؟ أنا أصم لا أسمع!،

فأعادها علیه ثلاثاً، وفی کل مرة یجیبه بالجواب نفسه: أنا أصم لاأسمع، فقتله عدو اللّٰه!!

فبلغ خبرهما رسول اللّٰه صلی علیه وسلم، فقال: "أما الأول فقد أخذ برخصة اللّٰه عز وجل، وأما الثانی فقد صدع بالحق فهنیئا له الجنة".

(انظر التلخیص الحبیر: ص ۲۷۱، تفسیر القرطبی، ۱۰/۱۸۹)

(۱)

یعنی جھوٹا مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے لوگوں نے دو صحابۂ کرام کو گرفتار کرلیا اور مسیلمہ کے پاس حاضر کر دیا، اس نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تم محمد کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو، تو انہوں نے کہا وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں، پھر دوبارہ پوچھا کہ میرے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو، تو انہوں نے (جان بچانے کے لئے زبان سے کہہ دیا) کہ تم بھی رسول ہو تو ان کو قید سے رہا کر دیا۔

دوسرے صحابی کو مسیلمہ کے سامنے لایا گیا تو اس نے سوال کیا کہ محمد ﷺ کے بارے میں کیا عقیدہ ہے تو جواب دیا، اشھد انہ رسول اللہ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں پھر مسیلمہ نے اپنے بارے میں پوچھا میرے بارے میں کیا عقیدہ ہے تو صحابی نے جواب دیا کیا پوچھتے ہو؟ میں تو بہرہ ہوں سنتا نہیں ہوں، تو مسیلمہ نے اپنے بارے میں تین مرتبہ پوچھا، صحابی رسول نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ مجھے تمہاری بات سنائی نہیں دے رہی ہے، تو اس صحابیؓ کو قتل کروا دیا، رسول اللہ ﷺ کو جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو ارشاد فرمایا کہ، پہلے شخص نے تو اللہ تعالیٰ کی رخصت پر عمل کیا، لیکن دوسرا حق پر ثابت قدم رہا، (اور جان دیدی) اس کو یہ ثابت قدمی مبارک ہو اور اس کے لئے جنت کی خوش خبری ہے، یہ واقعہ التلخیص الحبیر میں ہے اور تفسیر قرطبی میں بھی۔

۲۔ وعذب المشرکون "یاسراً" والد "عمار" حتی مات تحت

العذاب ، من أجل دينه، كما استشهدت "سمية" ام عمار بن ياسر ، قتلها أبو جهل عدو الله، بحربة قطع بها أمعاء ها، لأنها أبت الكفر ، وثبتت على الاسلام ، فكانت أول شهيدة من النساء في الاسلام ، وكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يمرُّ على هؤلاء المعذبين من آل ياسر، فيقول لهم : صبرًا آل ياسر ، فان موعدكم الجنة .

٣۔ يروى لنا الامام البخارى فى صحيحه ، ما أصاب المسلمين من شدائد ومحن ، فيقول بسنده عن خباب بن الأرت رضى الله عنه قال : شكونا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم ، وهو متوسد بردة له فى ظل الكعبة، وقد لقينا من المشركين شدة فقلنا يا رسول الله : ألا تستنصر لنا !!ألا تدعولنا!! .

فقال لهم صلى الله عليه وسلم : قد كان من قبلكم ، يؤخذ الرجل فيحفر له فى الأرض ، يعنى حفرة فيجعل فيها ، ثم يؤتى بالمنشار، فيوضع على رأسه فيجعل نصفين ، أى ينشر حتى يقع على الأرض شقين ، ويمشط بأمشاط الحديد مادون لحمه وعظمه ، ما يصده ذلك عن دينه!! .

والله ليتمن الله هذا الأمر ، أى يظهر دين الاسلام، حتى يسير الراكب من صنعاء الى حضر موت ، لا يخاف الا الله، والذئب على غنمه ، ولكنكم تستعجلون . (اخرجه البخارى رقم : ٣٦١٢)

(۳)

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کے سایہ میں چادر لپیٹے ہوئے تشریف فرما تھے ہمیں مشرکین کی طرف سے سخت اذیت پہنچ رہی تھی ،ہم نے عرض کیا یارسول اللہ (ﷺ) کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہیں فرماتے ؟ کیا آپ ہمارے حق میں دعا نہیں فرماتے ؟

آپ ﷺ نے تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ گذشتہ انبیاء کی امتوں کو طرح طرح کی تکلیفیں

دی گئیں ہیں ان پر سخت آزمائشیں آئی ہیں حتی کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ گڑھا کھود کر اس میں ڈال دیا جاتا پھر آری سے ان کے سر کو چیر کر دو ٹکڑے کر کے زمین پر پھینک دیتے اور بعض لوگوں کے زندہ جسموں پر لوہے کی کنگی کی جاتی جس سے تمام گوشت ادھڑ جاتا جسم پر صرف ہڈی رہ جاتی، لیکن یہ تمام تکالیف و مشقتیں ان کو دین حق سے نہ پھیر سکیں۔

اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ دین اسلام کو ضرور غلبہ عطاء فرمائیں گے، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا، دین کی برکت سے ایسا امن وسکون قائم ہوگا کہ ایک شخص صنعاء یمن سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ کے سواء کسی کا خوف نہ ہوگا جیسے بھیڑیا سے بکریوں پر نقصان کا خوف نہ ہو، لیکن تم مدد اور غلبۂ اسلام کی طلب میں جلدی مچاتے ہو۔ (بخاری)

٤۔ وقصة "خبيب بن عدى" رضى الله عنه، رمز للبطولة والفداء، والشهادة فى سبيل الله، فقد غدر المشركون ببعض الصحابة، الذين أرسلهم رسول الله صلى الله عليه وسلم، لتعليم القرآن والدعوة الى الله، فوقع "خبيب بن عدى" فى شباكهم، فنزلوا به الى مكة وباعوه لكفار قريش، فعذبوه عذاباً شديدًا ليجبروه على الكفر، ويردوه عن الاسلام، وطلبوا منه أن يسب محمدًا صلى الله عليه وسلم ويذكر آلهتهم بخير، فلم يسب الا آلهتهم، ولم يذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم الا بخير.

ولما يئسوا من كفره، عزموا على قتله، اجتمع حوله الأشرار الفجار، ليروا مصرعه، ولما أرادو اقتله طلب منهم أن يصلى ركعتين، فأذنوا له، فأوجزفى صلاته، وقال: والله لولا أن يظنوا بى الجزع، أى الخوف من الموت، لأطلت فى الصلاة، ثم طلب منهم أن يلقوه على وجهه ليموت وهو ساجد، فأبوا عليه ذلك، فرفع يديه نحو السماء ثم قال: اللهم انى لاأرىٰ الا وجه عدو، فأقرأ رسول الله منى السلام، ثم دعا على المشركين فقال: اللهم أحصهم عددًا، واجعلهم بددًا، ولا تبق منهم أحدًا، ثم أنشد يقول:

ولستُ أبالي حين أقتل مسلما

على أي جنب كان في الله مصرعي

ولست بمبد للعدو تخشعا

ولا جزعا اني الى الله مرجعي

فلما قتلوه وصلبوه، تحول وجهه نحو القبلة، وأخبر عنه الرسول صلى الله عليه وسلم فقال:

"هو رفيقي في الجنة"فهذا دليل على أن الثبات على الايمان أفضل من الأخذ بالرخصة. "

(روى قصته الامام احمد، وابوداؤد، والنسائي، انظر نصب الراية: ١٥٩/٤)

(۳)

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ان صحابہ کرامؓ میں سے ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن اور دینِ اسلام کی دعوت کے لئے مدینہ منورہ سے وفد کی شکل میں روانہ فرمایا تھا، لیکن اتفاق سے کفار کی غداری اور دھوکہ کی وجہ سے ان کے قید میں آگئے اور ان کو گرفتار کر کے مکہ مکرمہ لے جایا گیا، اور قریش مکہ کے ہاتھ فروخت کردیا، قریش نے انہیں سخت تکلیفیں پہنچائیں اور بہت ڈرایا دھمکایا تاکہ وہ دین اسلام سے پھیر جائیں اور کفر کی طرف لوٹ آئیں، اور ان سے مطالبہ کرتے رہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سب وشتم کریں اور کفار کے معبودان باطلہ کی تعریف کریں، لیکن ہر دفعہ ان معبودان باطلہ کی مذمت اور رسول اللہ ﷺ کی تعریف ہی فرماتے رہیں، جب کفار مکہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے کفر وارتداد سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے قتل کا ارادہ کرلیا، اور ان کے قتل گاہ کے گرد کفار کا مجمع جمع ہوگیا تاکہ قتل کا نظارہ کریں، اس وقت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے کفار سے اجازت طلب کی تاکہ وہ دو رکعت نماز پڑھ لیں چنانچہ اجازت مل گئی اور مختصرًا دو رکعت نماز پڑھی، پھر ارشاد فرمایا بخدا اگر مجھے اس طعنہ کا خوف نہ ہوتا کہ یہ مسلمان موت سے گھبرا گیا تو میں طویل نماز پڑھتا، پھر کفار سے درخواست کی کہ مجھے اوندھے منہ لٹایا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کی حالت میں موت آئے لیکن کفار نے اس بات کو قبول نہیں کیا، تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے آسمان کی طرف

ہاتھ اٹھایا اور دعا کی، اے اللہ یہاں تو دشمن کے چہروں کے علاوہ کوئی چہرہ نظر نہیں آ رہا ہے، پھر مشرکین کے خلاف بددعا کی:

اللّٰهم احصهم عددا ، و اجعلهم بددا ، و لا تبق منهم احدا .

یعنی اے اللہ ان کفار کو گن گن کر قتل کر دے، اور ان کو منتشر کر دے، اور ان میں سے کسی کو روئے زمین پر باقی نہ چھوڑیئے، پھر مذکورہ بالا اشعار کہے جن کا مطلب یہ ہے:

جب ایمان کی حالت میں موت نصیب ہو رہی ہو تو مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اللہ کی خاطر جان دینے کے بعد میری لاش کس سمت میں گر رہی ہوگی، میں کفار کے سامنے جزع وفزع کا اظہار نہیں کروں گا میرا مرجع وماویٰ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

قصة عبد اللّٰه بن حُذافة السهمي

٥ـ وذكر الحافظ ابن كثير فى تفسيره ، هذه القصة الرائعة ، قصة "عبد اللّٰه بن حُذافة "أحد صحابة النبى صلى اللّٰه عليه وسلم ، أنه كان فى أحد المعارك مع الروم، فوقع أسيرًا مع بعض المسلمين فى أيدى الروم،وأخبر ملك الروم بأن بين الأسرى رجل من الصحابة ، فأمر به فأُحضر، فعرض عليه أن يتنصر ، وقال له : أزوّجك ابنتى ، وأقاسمك نصف ملكى ، ان دخلت فى النصرانية،وتركت دين محمد!!

فقال له عبد اللّٰه : واللّٰه لو أعطيتنى كل ما تملك ، وكل ما يملكه العرب، وكل ما فى الدنيا ، على أن أترك دين محمد طرفة عين، مافعلت !!

فقال له ملك الروم : اذا أقتلك !!قال : افعل ما بدا لك وماشئت!!

فأمر به الملك أن يصلب على عمود ، وأمر الرماة أن يرموه بالسهام فى غير مقتل ، وهو يعرض عليه النصرانية فيأبى !!

ثم أمر بانزاله، وأمر الجند أن يأتوا اله بقدر كبيرة ، فأحمى عليها حتى صارت حمراء لاهبة من شدة الحرارة ، وأمر هم أن يأتوا بأسير

من المسلمين ، فأتى به فألقوه فى القدر، فاذا به عظام تلوح، وعرضوا على الصحابى النصرانية وهو يأبى ، فأمر به الملك أن يلقى فى القدر ، فوضعوه فى البكرة ليلقوه فى النار ، فبكى، فطمع به ملك الروم وأمر باعادته اليه ، وقال له : ما يبكيك !!

قال : ابكى لأنها نفس واحدة تموت فى سبيل الله، وكنت أتمنى أن يكون لى مائة نفسٍ تموت فى سبيل الله!!

فلما رأى ملك الروم صلابة دينه، أمر أن يحبس فى مكان ضيق ، وأن يمنع عنه الطعام والشراب أياماً، ثم اتي بخمر ولحم خنزير ليأكل منه، بعد ثلاثة أيام ، وقد كاد الجوع والعطش أن يهلكه ، فأبى أن يأكل ، فأخبر الملك فدعاه فقال له : لِمَ لَمْ لم تأكل من الطعام ، وقد أوشكت على الموت؟

فقال : انى أعلم أنه يحل لى، لأننى مضطر ، ولكنى ماأردت أن أشمتك فى دين محمد !!

فقال له الملك : قبل رأسى وأنا أطلق سراحك!! فقال له عبد الله: أقبل رأسك ، بشرط أن تطلق معى جميع أسرىٰ المسلمين، فقال له : أفعل ذلك، فقبل الصحابى رأسه ، فأمر باطلاق سراحه،واطلاق جميع الأسرى من المسلمين .

ولما رجع الى المدينة المنورة ، كان الخبر قد وصل الى عمر رضى الله عنه وهو خليفة المسلمين ، فلما دخل عليه قام نحوه عمر مسرعاً وقال : "حق على كل مسلم ، أن يقبل رأس " عبد الله بن حذافة " وأنا أول من يفعل ذلك، فقبل عمر رأسه ، وقبل المسلمون رأسه " .

وهكذا تكون الصلابة فى الدين ، أعز للمسلم ولدين الله، بحيث ترغم أنوف الأعداء ، والأخذ بالعزيمة أفضل من الأخذ

بالرخصة كما ذكر العلماء .

(انظر تفسير حافظ ابن كثير : ٢/ ٦١٠، وقد روى هذه القصة عن الحافظ ابن عساكر)

دوسرے مسلمان کے مال تلف کرنے پر جبر واکراہ:

جب کسی مسلمان کو قتل وغیرہ کی دھمکی کے ذریعہ مجبور کیا جائے کہ دوسرے مسلمان کا مال تلف کرے تو شرعاً حکم یہ ہے کہ مال تلف کر کے اپنی جان بچالے بعد میں ''مکرہ'' یعنی مجبور کرنے والے کے ذمہ ضمان لازم ہوگا، البتہ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکراہ کی صورت میں بھی دوسرے مسلمان کا مال تلف کرنا حرام ہے، کیوں کہ یہ حق العبد ہے۔

قال العلامة الصابوني حفظه الله :

اذا أكره انسان على اتلاف مال مسلم ، فيرخص له عند الاكراه التام الملجيء، لأن مال الغير يباح عند الضرورة ، وعند شدة المخمصة ، المجاعة ، والضرورة متحققة هنا بسبب الأكراه ، قال تعالىٰ : ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَاعَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ والرخصة هنا ترفع عنه اثم المؤاخذة الأخروية ، المراد بالاكراه التام هو احراق المال ، أو مافي معناه عند الجمهور "الشافعية، والحنفية، والحنابلة"

(انظر الفقه الاسلامي وادلته للدكتور وهبة الزحيلي : ٥/ ٢٩٤)

وقال المالكية : لا يرخص له في الاحراق ، لتعلق حق العبد به، وقد قال صلى الله عليه وسلم :

" كل المسلم على المسلم حرام : دمه، وماله، وعرضه، "

والصحيح قول الجمهور .

قال في ملتقى الأبحر : وان أكره على اتلاف مال مسلم، بالقتل، أو قطع عضو منه، رخص له أن يفعل ذلك، والضمان على المكره" .

(ملتقى الابحر : ٢/ ١٨٠)

خنزیر کا گوشت یا شراب نوشی پر مجبور کرنا:

اگر کسی مسلمان کو خنزیر کے گوشت کھانے یا شراب نوشی پر مجبور کیا جائے یا بتوں کو سجدہ کرنے پر

مجبور کیا جائے یا رمضان کے روزہ توڑنے پر مجبور کیا جائے، یا غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھنے پر مجبور کیا جائے ایسے موقع پر دیکھے کہ یہ جبر واکراہ کس نوعیت کا ہے، اگر مار پیٹ قید وغیرہ کا ہے تو ہر گز حرام کا ارتکاب نہ کرے اور اگر قتل یا کسی عضو کے تلف کرنے کا ہے جس کو پہلے اکراہ ملجی کامل لکھا گیا، تو پھر ان گناہوں کا ارتکاب کر کے اپنی جان بچانا ضروری ہے، بلکہ اس موقع پر واجب ان امور کا ارتکاب کر کے اپنی جان بچائے اگر حرام سے بچتے ہوئے صبر کرے اور قتل ہو جائے تو گناہ گار ہوگا کیوں کہ اس نے اپنے نفس کو ہلاکت کے لئے پیش کر دیا۔

قتل یا زنا پر مجبور کرنا:

اگر کسی انسان کو دوسرے انسان کے قتل پر یا زنا کرنے پر مجبور کیا جائے، تو شرعاً اس کے لئے حلال نہیں کہ دوسرے انسان کو قتل کرے اگر چہ اس مجبور کی جان چلی جائے، کیوں کہ دوسرے مسلمان کا قتل کسی حال میں بھی حلال نہیں کیوں کہ اس مجبور انسان کی جان دوسرے انسان کے مقابلہ میں کوئی زیادہ قیمتی نہیں۔

قال العلامة الصابونی رحمه الله تعالیٰ:

واذا أكره انسان على قتل غيره، أو أكره على الزنى، فلا يحل له أن يقدم على ذلك، ويجب أن يصبر، ولو أدىٰ به ذلك الى تعريض نفسه للخطر، لأن هذا مما لا تبيحه الضرورة، فليست نفس الانسان أعز ولا أغلى من نفس غيره، حتى يقدم على قتله، فكما يحرص على حياته، ينبغي أن يحرص على حياة الناس، فان قتله أثم، لأن قتل المسلم حرام، لا يباح لضرورةٍ ما، سواءً كان اكراها بالقتل أو بغير.

قال الامام القرطبی: "أجمع العلماء على أن من أكره على قتل غيره، أنه لا يجوز الاقدام على قتله، ولا انتهاك حرمته، ويصبر على البلاء الذی نزل به، ولا يحل له أن يفدی نفسه بغيره، ويسأل الله العافية فی الدنيا والآخرة" والله تعالیٰ اعلم وصلى الله على سيدنا محمد وآله وصحبه وسلم.

(تفسير القرطبی: ۱۰/۱۹۷)

معاملات میں اکراہ:

وہ معاملات جن کے انعقاد کے لئے دل سے رضامند ہونا شرعاً ضروری ہے، جیسے خرید وفروخت، ہبہ وغیرہ۔

کما قال تعالیٰ: ﴿ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ﴾

یعنی کسی دوسرے کا مال حلال نہیں ہوتا، جب تک کے تجارت وغیرہ کا معاملہ طرفین کی رضا مندی سے نہ ہو۔

وکما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منہ."

یعنی کسی مسلمان کا مال اس وقت تک حلال نہیں جب تک وہ خوش دلی سے اس کے دینے پر راضی نہ ہو، اگر ایسے معاملات جبر واکراہ کے ساتھ کرالئے جائیں تو شرعاً ان کا اعتبار نہیں، اکراہ کی حالت سے نکلنے کے بعد اس کو اختیار ہوگا کہ بحالت اکراہ جو بیع ہبہ وغیرہ کیا تھا اس کو اپنی رضاء سے باقی رکھے یا فسخ کردے۔ (معارف القرآن: ۵/۴۰۷، آیت ۱۰۶ سورۃ النحل)

نکاح وطلاق میں اکراہ:

ایسے معاملات جن کا مدار صرف زبانی الفاظ کہہ دینے پر ہے دل کا قصد وارادہ یا رضاء وخوشی انعقاد معاملہ کے لئے شرط نہیں ہے جیسے نکاح، طلاق، عتاق وغیرہ ایسے معاملات کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے:

ثلث جدھن جد وھزلھن جد، النکاح والطلاق والرجعۃ.

رواہ ابوداؤد والترمذی وحسنہ

یعنی دو شخص زبان سے نکاح کا ایجاب وقبول شرائط کے مطابق کرلیں یا کوئی شوہر اپنی بیوی کو زبان سے طلاق دیدے، یا طلاق کے بعد زبان سے رجعت کرے، خواہ وہ بطور ہنسی مذاق کے ہو دل میں ارادہ نکاح یا طلاق یا رجعت کا نہ ہو پھر بھی محض الفاظ کہنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا اور طلاق پڑ جائے گی، نیز رجعت صحیح ہو جائے گی۔ (مظہری)

امام اعظم ابوحنیفہ، شعبی، زہری، نخعی، اور قتادہ رحمہم اللہ کے نزدیک طلاق "مکرہ" کا بھی یہی حکم ہے کہ حالت اکراہ میں اگرچہ طلاق دینے پر دل سے آمادہ نہیں تھا مجبور ہو کر الفاظ طلاق کہہ

دیئے، اور وقوع طلاق کا تعلق صرف الفاظ طلاق ادا کر دینے سے ہے، دل کا قصد وارادہ شرط نہیں، جیسا کہ حدیث مذکور سے ثابت ہے اس لئے یہ طلاق واقع ہو جائے گی۔

(معارف القرآن : ٥/٤٠٨)

کسی کو خودکشی پر مجبور کیا جائے اس کا حکم:

اگر کسی انسان کو مجبور کیا جائے کہ خودکشی کر لے ورنہ ہم تجھے قتل کر دیں گے تو ایسی صورت میں بھی خودکشی کرنا حرام ہے کیوں کہ مکرَہ کے لئے فعل حرام کا ارتکاب اس وقت جائز ہے جب اس سے جان بچ جائے، خودکشی میں تو اپنے ہاتھ سے جان کو تلف کرنا ہے اسلئے یہ ناجائز اور حرام ہے، لہٰذا ایسے موقع پر صبر کرے اگر جان چلی جائے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

احكام الشفعه

حق شفعہ کے شرعی احکام

حق شفعہ کی تعریف:

قال صاحب ملتقى الابحر : هى تملك العقار على مشتريه بما قام عليه جبرا، اى تملكه بالثمن الذى باعه به جبرًا عنه .

(ملتقى الابحر : ٢/١٩٥)

حق شفعہ کی مشروعیت:

شریعت مطہرہ نے ہر انسان کو آزادی اور سکون کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق دیا ہے، اگر کسی کے پڑوس میں کوئی ایسا شخص آباد ہو جس کے عادات واخلاق پسندیدہ نہ ہوں تو ان کے ساتھ زندگی گذارنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، بسا اوقات انسان تنگ ہو کر وہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔

كما قال الشاعر :

دار جار السوء ان جار وان
لم تجد صبرا فما احلى النقل

یعنی وہ گھر جس کا پڑوسی برا ہے، اگر اس کی ایذاء پر صبر ممکن نہ ہو تو وہاں سے کوچ کر جانا ہی میٹھا ہے۔

اس لئے برے پڑوسی کے شر سے بچنے کے لئے شریعت نے شفعہ کا حق دیا ہے کہ اگر کسی کے پڑوس میں کوئی مکان دکان، جائیداد، زمین فروخت ہو تو اسکی خریداری کا اصل حقدار پڑوسی ہے، لہٰذا اس میں بائع پر بھی کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا، بلکہ جتنی قیمت پر دوسرے کو فروخت کرنا چاہتا ہے اتنے میں پڑوسی کو فروخت کرے جیسا کہ تعریف شفعہ سے ظاہر ہوا، اس کی مشروعیت پر بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

١ ـ أما السنة : فهو ما رواه البخارى عن جابر بن عبد الله رضى الله عنه قال : قضى رسول الله صلى الله عليه وسلم بالشفعة فى كل مالم يقسم ، فاذا وقعت الحدود ، وصرفت الطرق ، فلا شفعة " .

(اخرجه البخارى : ٢/ ٣٢ من كتاب الشفعة ، ومسلم رقم : ١٦٠٨)

ومعنى قوله صلى الله عليه وسلم " وصرفت الطريق " اى انتهى أمر البيع ببيان مصارف الطرق ، ولم يطلب الجار حقه فى الشفعة ، فلاشفعة له .

٢ ـ وروى الامام احمد وأصحاب السنن عن جابر رضى الله عنه قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : " الجار أحق بشفعة جاره ، ينتظر بها وان كان غائباً ، اذا كان طريقهما واحداً " .

(اخرجه أحمد فى المسند : ٣٨٨/٤ ، والترمذى رقم : ١٣٧٠ ،
وأبو داؤد رقم : ٣٥١٣ ، والنسائى : ٣٠١/٧)

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شفعہ کا فیصلہ فرمایا تھا ہر اس جائیداد میں جو تقسیم نہ ہوئی ہو جب تقسیم کے بعد حد بندی ہوگئی (اور پڑوسی نے حق شفعہ کا مطالبہ نہ کیا) اب حق شفعہ باقی نہ رہا۔

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسی شفعہ کا زیادہ حقدار ہے، اگر وہ بیع کے وقت موجود نہ ہو تو اس کے آنے کا انتظار کیا جائے گا، جب دونوں کا راستہ ایک ہو۔

(۳) وروى البخارى عن عمرو بن الشريد قال : " وقفت على

سعد بن أبي وقاص ، فجاء المسور بن مخرمة ، فوضع يده على احدىٰ منكبي ، اذ جاء "أبو رافع" مولى النبي صلى الله عليه وسلم ، أي عبده ومملوكه ، فقال ياسعد : ابتع مني بيتي في دارك، فقال سعد: والله ماأبتاعهما، أي لا أشتريهما !!

فقال المسور : والله لتبتاعنهما !!

فقال سعد : والله لا أزيدك على أربعة آلاف منجمة ، أي على أربعة آلاف درهم (منجمة) أي مفرقة على دفعات ! "

قال أبو رافع : لقد أعطيت بها خمسمائة دينار، يعني خمسة آلاف درهم ، ولولا أني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : الجار أحق بسقبه"، أي أحق بالشفعة بسبب قرب داره من دار جاره، ما أعطيتكها بأربعة آلاف، وأنا أعطى بها خمسمائة دينار، قال: فأعطاه اياه " .

(اخرجه البخاري في كتاب الشفعة : ٣٢/٢ باب عرض الشفعة على صاحبها قبل البيع)

(٤) وروى مسلم عن جابر رضي الله عنه قال : " قضى رسول الله بالشفعة في كل شرك، أي شراكة لم يقسم، ربعة، أي منزل ، أو حائط، أي بستان ، لا يحل له أن يبيع ، حتى يستأذن شريكه، فان شاء أخذ ، وان شاء ترك، فان با ع ولم يستأذنه ، فهو أحق به " أي أحق المبيع من المشتري .

فهذه نصوص نبوية صريحة واضحة ، في أن للجار والشريك ، حق الشفعة فيما يبيعه جاره، رعاية لحق الجوار، ودفعاً للضرر الذي ينشأ عن مجاورة شخص أجنبي غريب، لا سيما اذا كان عدوا أو خصماً!! . (فقه المعاملات)

حق شفعہ کا پہلا حق دار:

سب سے پہلے حق شفعہ اس شریک کو حاصل ہوگا جو مالک کے ساتھ نفس مبیع میں شریک ہو۔۔

اگر لینے سے انکار کرے تو دوسرے نمبر پر اس کا حق ہے جو مالک کے ساتھ حق مبیع یعنی جن دونوں کا نالہ اور راستہ ایک ہو ان کا حق ہوگا اگر وہ بھی لینے سے انکار کرے تو برابر میں جس کا مکان یا زمین ہے اس کا حق ہے۔

الشفعة واجبة للخليط في نفس المبيع ثم للخليط في حق المبيع كالشرب والطريق ثم للجار. (الهدايه: ٤/٣٩١)

حق شفعہ طلب کرنے کا طریقہ:

جب شفیع کو اس بات کا علم ہو جائے کہ ہمارے پڑوسی نے اپنی وہ زمین فروخت کر دی ہے جس میں مجھے شفعہ کا حق حاصل ہے تو اسی مجلس علم میں جو لوگ موجود ہوں ان کے سامنے اس کا اظہار کرے کہ مجھے یہ زمین لینے کا حق ہے اور میرا ارادہ بھی ہے آپ لوگ گواہ رہیں، اس کے بعد جا کر زمین کے پاس یا مشتری کے پاس یا بائع کے پاس اگر مبیع ابھی تک مالک کے قبضہ میں ہو یوں گواہی قائم کرے کہ فلاں نے یہ زمین خریدی میں نے اس پر حق شفعہ کا دعویٰ کیا ہے اب بھی کر رہا ہوں آپ لوگ گواہ رہیں۔

قال صاحب الملتقى الابحر: فاذا علم الشفيع بالبيع يشهد في مجلس علمه أنه بطلبها، ويسمى طلب مواثبه، ثم يشهد عند العقار، أو على المشتري، أو على البائع، ان كان المبيع في يده، فيقول اشترى فلان هذه الدار، وقد كنت طلبت الشفعة، وانا اطلبها الآن فاشهدوا على ذلك. (ملتقى الابحر: ٢/١٩٢)

اب یہاں سے شفعہ کے متعلق چند مسائل کو سوال و جواب کی صورت میں نقل کئے جاتے ہیں جن سے حق شفعہ کے جزئیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

ایک ماہ بعد شفعہ کا دعویٰ قبول نہیں ہوگا:

سوال: میں نے زمین خریدی اور اس میں کاشت کرتا رہا، شفیع میرا تصرف چھ ماہ تک دیکھتا رہا، مگر شفعہ طلب نہیں کیا، اب اس نے دعویٰ دائر کر دیا ہے تو شرعاً اب تک اسے حق طلب ہے یا کہ حق باطل ہو چکا ہے؟

اگر بالفرض شفیع طلب مواثبہ وطلب تقریر پر گواہ پیش کر دے تو تاخیر طلب خصومت عند

القاضی جو ایک ماہ سے زائد ہے، اس کی وجہ سے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول میں حق شفعہ ساقط ہوگا یا نہیں؟

(نوٹ): مقدمہ مجسٹریٹ کے ہاں چل رہا ہے، مجسٹریٹ نے شرعی فیصلہ کے متعلق کہا ہے، اس لئے پہلی فرصت میں جواب عنایت فرما کر ممنون فرمائیں۔

الجواب ومنہ الصدق والصواب

اس صورت میں طلب مواثبہ وطلب تقریر کے فقدان کی وجہ سے شفیع کا حق باطل ہو چکا ہے، اگر بالفرض شفیع طلب مواثبہ وطلب تقریر شہادت معتبرہ سے ثابت کردے تب بھی طلب خصومت عندالقاضی میں ایک ماہ سے زیادہ تاخیر اگر بلا عذر ہوئی تو حق شفعہ نہ رہا، یہ امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے، علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے پرزور الفاظ سے اسی کو ترجیح دی ہے اور مفتی بہ قرار دیا ہے۔

(قوله وقيل يفتى بقول محمد) اور (قوله يعنى دفعا للضرر) اور (قوله قلنا الخ) ان تینوں مواضع میں علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ تعالیٰ نے امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے قول کو ہی مختار اور مفتی بہ قرار دیا ہے۔

علاوہ ازیں رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا التحریر المختار میں اس پر کچھ نہ لکھنا اور سکوت کرنا بین دلیل ہے کہ یہی قول بلا شک وشبہ مفتی بہ ہے، البتہ اگر کسی معقول عذر کی وجہ سے طلب خصومت عندالحاکم میں تاخیر ہوئی ہو تو حق ساقط نہ ہوگا، بشرطیکہ مواثبہ اور طلب تقریر شہادت سے ثابت کرے۔

(قوله بلا عذر) فلو بعذر كمرض وسفر او عدم قاض يرى الشفعة بالجواز فى بلده لا تسقط اتفاقا.

(ردالمحتار: ۱۵۹/۵، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۳۵۳/۶)

سکوت شفیع سے بطلان حق کی تفصیل:

سوال: ایک زمین بیع ہونے کے بعد شفیع چند ایام تک خاموش رہا، اب حق شفع طلب کرنے کا اسے شرعاً اختیار ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب ومنہ الصدق والصواب

حق شفعہ کے لئے علم بیع کے بعد مواثبہ اور طلب تقریر بعجلت ممکنہ ضروری ہے، صورت مسئلہ

میں اس شرط کے فقدان کی وجہ سے حق شفعہ باطل ہو جائے گا، البتہ اگر مشتری یا ثمن کا علم نہ ہونے کی وجہ سے شفیع نے سکوت کیا ہو اور علم ہو جانے کے بعد فوراً طلب مواثبہ وطلب تقریر بشرائطهما المعتبرة کی ہوں تو حق ساقط نہیں ہوگا۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ معزيا الى الـ انية : اخبر بها فسكت قالوا لا تبطل مالم يعلم المشترى والثمن (الى قوله) اقول وبه افتى المصنف التمر تاشى فى فتاواه فليحفظ .

(رد المحتار : ۱۵۸/۵ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۳۵٤/۷)

بوقت بیع موت شفیع میں اختلاف:

سوال : زید نے اپنے والد کی وفات کے بعد بالغ ہوتے ہی بکر پر شفعہ کا دعویٰ کر دیا جبکہ تمام لوازماتِ شفعہ پہلے مکمل کئے جا چکے تھے، بکر نے کہا کہ چوں کہ بوقت بیع تمہارے والد زندہ تھے اور انہوں نے اس وقت کوئی دعویٰ نہیں کیا لہٰذا اب تمہارا دعویٰ لا حاصل ہے، زید نے بوقت بیع اپنے والد کی وفات پر بینہ قائم کئے اور بکر نے اس کی زندگی پر بینہ قائم کئے اب کس کے گواہوں کو ترجیح ہوگی؟ بینوا توجروا

جواب: مندرجہ ذیل جزئیات سے بظاہر اس مسئلہ پر استشہاد کیا جا سکتا ہے:

(۱) قال الامام قاضی خان رحمه الله تعالیٰ : اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد آخر ان انه حی كانت شهادة الموت والقتل اولى . (خانية بهامش العالمگيرية : ٤٨٤/٢)

(۲) وقال فى الفتاوى المهدية : ان الاصل تقديم بينة الموت على بينة الحياة لانها تثبت امرا عارضا كما هو الاصل فى البينات ففى الفصل الثالث عشر من العمادية اذا شهد رجلان ان زوج فلانة قتل او مات وشهد اخران انه حی كان شهادة الموت والقتل اولىٰ لان الموت اثبت العارض اه نعم فى تنقيح الحامدية بينة زوج فلانة قتل او مات اولىٰ من بينة انه حی الا اذا اخبر بحياته بتاريخ لاحق اه (الى ان قال) فبينة الموت اولىٰ مطلقا كما هو ظاهر اطلاقهم له

والتوجيه الجاری مطلق عن قيد التاريخ وعدمه وتأخره وتقدمه الخ .

(فتاوی مهدية : صـ ٣٦٧)

(٣) وقال العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالیٰ : يوم الموت لا يدخل تحت القضاء ويوم القتل يدخل كذا فی البزازية والوالجية والفصول وعليها فروع .

(٤) وقال العلامة الحموی رحمه الله تعالی تحت قوله وعليها فروع : لو برهن ان من شهد واعلی اقراره فی وقت كذا كان ميتا فی ذلك الوقت لا يقبل لان زمان الموت لا يدخل تحت القضاء حتی اذا برهن ان فلانا مات يوم كذا وادعت امرأة نكاحا بعد ذلك اليوم وبرهنت يقبل بخلاف زمان القتل والنكاح حيث يدخلان تحت القضاء ومنها لو ادعی ان اباه مات يوم كذا وقضی ثم ادعت امرأة النكاح بعده بيوم تقبل فهذا والذی قبله مما فرعوه علی الاول ومما فرعوه علی الثانی لو برهن الوارث علی انه قتل يوم كذا فبرهنت المرأة ان هذ المقتول نكحها بعد ذلك اليوم لاتقبل .

(شرح الاشباه والنظائر ، الفن الثانی : ٢/٣٤٦)

جزئیہ اولیٰ وثانیہ سے بینۂ شفیع کی اولویت معلوم ہورہی ہے مگر ان سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ صورت مسئلہ میں شفیع کے والد کی موت وحیات میں تنازع نہیں، اس کی موت پر جانبین متفق ہیں، تنازع امرین حادثین (الموت والشراء) کے تقدم وتأخر میں ہے۔

جزئیہ ثالثہ ورابعہ سے بظاہر بینۂ مشتری کو ترجیح معلوم ہورہی ہے مگر بنظر غائر بینۂ شفیع کی ترجیح ثابت ہوتی ہے، اس لئے جزئیات مذکورہ میں مدعیۂ نکاح کے بینہ کے قبول ہونے کی علت یہ ہے کہ یہ مدعیۂ حق اور جانب آخر اس کے حق کی منکر ہے اور اصولاً مدعی حق کا بینہ راجح ہوتا ہے، صورت متنازع فیہا چونکہ شفیع مدعی حق ہے اور مشتری منکر، لہٰذا شفیع کا بینہ راجح ہوگا۔

علاوہ ازیں اگر بالفرض مشتری کے بینہ ہی کو ترجیح ہو تو بھی یہ مشتری کے لئے مفید نہیں اس لئے کہ بوقت شراء زید کے والد کی محض حیات ثابت ہوجانے سے حق شفعہ ساقط نہ ہوگا جب تک

کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کو شراء، مشتری اور مبلغ ثمن کا بھی علم ہو چکا تھا، معہذا وہ خاموش رہا۔

اور اگر بروئے قانون " اذا تعارضا فتساقطا " دونوں کے بینہ کا تہاتر تسلیم کرکے حال کو قاضی بنایا جائے تو بھی شفیع کو حق پہنچتا ہے۔

غرض یہ کہ وجوہ ذیل کی بناء پر حق شفیع قائم ہے:

(۱) شفیع مدعی ہے اور مشتری منکر، فترجح بینۃ المدعی۔

(۲) مشتری نے شفیع کے والد کا علم بالشراء والمشتری والثمن ثابت نہیں کیا۔

(۳) قضاء بالحال۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

اقالہ سے دوبارہ حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے:

سوال: اقالہ سے شفیع کے حق شفعہ پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

الجواب باسم ملہم الصواب

اقالہ سے شفیع کے لئے حق شفعہ نئے سرے سے ثابت ہو جاتا ہے۔

قال فی الهندية: وبالرد بحكم الاقالة يتجدد للشفيع حق الشفعة. (عالمگيرية : ٥/١٩٤)

احیاء موات میں حق شفعہ نہیں:

سوال: جوارض موات آباد زمینوں کے ساتھ متصل ہو، اس کے احیاء سے حق شفعہ ثابت ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب: حق شفعہ صرف زمین کی بیع کی صورت میں ہوتا ہے، احیاء موات میں حق شفعہ نہیں۔

قال فی التنوير: هی تمليك البقعة جبرا على المشتری بما قام عليه.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ تحت (قوله جبرا على المشتری) واحترز بقوله على المشتری عما ملكه بلا عوض كما بالهبة والارث والصدقة او بعوض غير معين كالمهر والاجارة والخلع والصلح عن دم عمد ودخل فيه ما وهب بعوض فانه اشتراء انتهاء.

(ردالمحتار : ٥/١٥٢)

فیصلہ میں تاخیر سے حق شفعہ باطل نہیں ہوتا:

سوال: اگر شفیع نے شفعہ کا دعویٰ دائر کر دیا، فیصلہ میں تاخیر ہوتی رہی، کئی سال گذر گئے تو کیا اس تاخیر فیصلہ سے حق شفعہ ساقط ہو جاتا ہے؟ اگر ساقط ہو جاتا ہے تو کتنی مدت میں ساقط ہوتا ہے؟ بینوا توجروا

جواب: دعویٰ دائر کرنے کے بعد حق شفعہ کا فیصلہ قاضی کے اختیار میں ہے، اگر قاضی نے تأخیر کی تو چونکہ اس میں شفیع کی طرف سے کوئی غفلت نہیں پائی گئی، اس حق کا شفعہ باطل نہ ہوگا۔

واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

حق شفعہ میں ترتیب کی تفصیل:

سوال: ایک آدمی صرف شریک فی المبیع ہے اور دوسرا شریک فی المبیع بھی ہے اور شریک فی الحقوق بھی ہے تو حقہ شفعہ میں دونوں برابر ہیں یا دوسرے کو ترجیح ہوگی جو دو وجوہ سے حقدار ہے؟

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص صرف شریک فی المبیع ہے اور دوسرا شریک فی الحقوق بھی اور جار ملاصق بھی ہے تو حق شفعہ میں ترجیح کس کو ہوگی؟ یعنی ترتیب مراتب کا لحاظ کیا جائے گا یا کثرت مراتب کا؟ علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی عبارات سے تو ترتیب ہی کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، مگر یہاں بعض علماء کثرت مراتب کی ترجیح کے قائل ہیں، فریقین آپ کے فتویٰ کو قول فیصل قرار دینے پر متفق ہیں؟ بینوا توجروا

جواب: پہلی صورت میں دونوں برابر ہوں گے اور دوسری صورت میں شریک فی المبیع کو ترجیح ہوگی، لان الاعتبار لقوۃ الدلیل لا لکثرتہ، اسی بناء پر شرکاء فی المبیع میں حصہ کی کثرت وقلت اور جوار میں مجاورت کی مقدار کا اعتبار نہیں، بلکہ شرکاء اور ملاصق برابر ہیں۔

قال فی شرح التنویر: بقدر رؤس الشفعاء لا الملك.

(رد المحتار: ۵/۱۵۴)

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله ثم لجار ملاصق) ولو متعددا والملاصق من جانب واحد ولو بشبر كالملاصق من ثلاثة جوانب فهما سواء اتقاني.

(رد المحتار: ۵/۱۵۵، ماخوذ از احسن الفتاوی: ۷/۳۵۷)

تبادلہ جائیداد میں بھی حق شفعہ ثابت ہو جاتا ہے:

مثلاً زید و بکر نے ایک دوسرے سے اپنی جائیداد کا تبادلہ کیا بکر کے رشتہ دار عمر و خالد نے زید و بکر پر حق شفعہ کا دعویٰ کیا تو شرعاً یہ دعویٰ صحیح ہوگا، کیوں کہ تبادلہ سے بھی حق شفعہ ثابت ہوتا ہے۔

لان فیہ تملیك بعوض المال ، وفی الدرالمختار : (لا تثبت قصدًا الا فی عقار ملك بعوض)

خرج الهبة (هو مال) خروج المهر (وان لم) یکن یقسم اهـ .

(ماخوذ از امداد الاحکام : ٤ / ١٧١)

شفعہ کے متفرق مسائل:

1...... شفیع کو معلوم ہوا کہ مثلاً زید نے اس کے برابر کی زمین خریدی ہے تو شفیع اس پر راضی ہو گیا، کیوں کہ وہ زید کی شرافت سے واقف ہے بعد میں معلوم ہوا کہ خریدار تو خالد ہے جبکہ شفیع کے علم کے مطابق خالد شر پسند آدمی ہے، تو شفیع کا حق شفعہ ساقط نہ ہوگا کیوں کہ پہلے اس کو دھوکہ دیا گیا ہے۔

2...... جس طرح مسلمان کو حق شفعہ حاصل ہوتا ہے اسی طرح ذمی کو بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے، کیونکہ دفع ضرر کی ضرورت میں دونوں برابر ہیں لہٰذا حق شفعہ میں بھی دونوں برابر ہونگے۔

3...... مجلس قضاء میں دعویٰ شفعہ دائر کرنے اور مقدمہ کے فیصلہ کے وقت ثمن کا حاضر کرنا ضروری نہیں البتہ جب اس کے حق میں شفعہ کا فیصلہ ہو گیا تو اب ثمن کی ادائیگی لازم ہے۔

4...... شفیع کو بھی خیار رویت اور خیار عیب حاصل ہوگا کیوں کہ شفعہ کے ذریعہ لینا اصل خریداری کی طرح ہے، لہٰذا جو حق مشتری کو حاصل ہے وہ شفیع کو بھی حاصل ہوگا۔

احکام المساقاۃ والمزارعہ

باغات اور درختوں کو بٹائی پر دینے کے احکام

مساقاہ کا معنیٰ: اپنے درخت یا باغ کو کسی دوسرے کے حوالے کرنا تاکہ وہ اس کو سیراب کرے اور اس کی دیکھ بھال کرے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اس میں زیادہ پھل لگے، اور شرط یہ ٹھہرائے کہ پیدا ہونے والے پھل کا ایک معین حصہ اجرت میں دیا جائے گا۔

ھی دفع الشجر الی من یسقیه و یصلحه ، بجزء معین من ثمره .

(ملتقی الابحر : ۲/ ۲۱۳)

شرعاً یہ معاملہ مشروع ہے، جناب رسول اللہ ﷺ نے اہل خیبر کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا تھا، کہ جب خیبر فتح ہوا، تو وہ علاقہ مسلمانوں کے قبضہ میں آیا پھر آپ ﷺ نے ان کے ساتھ معاہدہ فرمایا کہ تم لوگ خود ان باغات کی دیکھ بھال کرو اور جو پھل لگے اس کا آدھا مدینۃ الرسول (ﷺ) بھیجا کرو۔

المساقاة مشروعة بالسنة المطهرة ، وهی صحیحة عند جمهور العلماء ، فهی کالمزارعة ، الأصل فیها أنها لا تجوز ، لأنها شرکة علی شیٔ ، مجهول ، قد یخرج النبات وقد لا یخرج الثمر ، ولهذا خالف فیها بعض الفقهاء ، ولکن حاجة الناس الیها تجعلها مشروعة ، وان کانت مخالفة للقیاس ، وقد وردت السنة بتقریرها ، فلا عبرة بخلاف من خالف فیها .

فقد روی البخاری ومسلم عن عبد اللّٰه بن عمر رضی اللّٰه عنهما أنه قال :

"عامل النبی صلی اللّٰه علیه وسلم أهل خیبر ، بشطر ، أی نصف ما یخرج من ثمر أو زرع" .

(اخرجه البخاری : ۲/ ٤٦ ، ومسلم فی صحیحه)

فالثمر هنا یراد به شجر النخیل الذی اشتهرت به خیبر وهو نص صریح فی المساقاة ، فقد عاملهم صلی اللّٰه علیه وسلم ، بأن یأخذوا النصف مقابل خدمتهم للشجر .

وقد اقتصر بعض الفقهاء علی جواز المساقاة فی شجر النخیل والکرم ، أی العنب ، لأن أهل المدینة کانوا یتعاملون بهمامساقاة ، کما هو مذهب الشافعیة .

وأجاز فقهاء الحنفیة المساقاة فی جمیع أنواع الشجر ، ما کان

منه مثمرا ، وما كان غير مثمر ، كشجر الحور الذى ينتفع به ، لسقوف البيوت وللحطب ، قياساً على شجر النخيل ، لأن الجواز للحاجة وقد عمت ، والأصل العموم لا التخصيص .

قال صاحب الهداية : وتجوز المساقاة فى النخل ، والشجر ، والكرم ، والرطاب ، وغير ذلك لأن أهل خيبر كانوا يتعاملون فى الأشجار والرطاب أيضاً ، والأصل فى النصوص أن تكون معلولة ، أى تتضح فيها الحكمة والعلة ، والجامع دفع الحاجة ، فان ذا المال قد لا يهتدى الى العمل ، والقوى عليه لا يجد المال ، فمست الحاجة الى انعقادها كالمزارعة . (الهداية : ٤ / ٣٩٠)

مساقاۃ کی شرائط:

(۱) عمل صرف عامل کے ذمہ ہو باغ کا مالک عمل میں شریک نہ ہوگا، یہی مساقاۃ کا تقاضا ہے۔

(۲) باغ مکمل طور پر عامل کے حوالہ کردیا جائے تاکہ وہ باغ کی درستگی نالہ وغیرہ بنانا، زائد کانٹے وغیرہ کاٹنے کا عمل یکسوئی کے ساتھ انجام دے سکے۔

(۳) پیداوار کے بعض حصے کو اجرت ٹھہرایا جائے مثلاً آدھا، یا تہائی، یا چوتھائی، مثلاً اگر اجرت اس طرح متعین کرے کہ پیداوار میں سے، مثلاً دس من میرا ہوگا بقیہ تمہارا، تو عقد مساقاۃ باطل ہوجائے گا، کیوں کہ بسا اوقات ہوسکتا ہے کہ کل پیداوار ہی صرف دس من ہو یا اس سے کم، اس صورت میں عامل کا نقصان ہوجائے گا۔

(٤) اسی طرح مدت متعین ہونی چاہئے، وہ مدت جس میں آسانی کے ساتھ ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار ہوجائے اور اس کو اتارا جاسکے، اگر ایسی مدت مقرر کی کہ جس میں عام طور پر ایک مرتبہ پھل لگ کر تیار نہیں ہوتا، تو اس سے عقد مساقات فاسد ہوجائے گا، کیوں کہ پیداوار میں دونوں کی شرکت کا جو مقصد ہے وہ مقصد فوت ہوجائے گا۔

قال الفقهاء فان سميا فى المعاملة ، اعنى المساقاة وقتا يعلم أنه لا يخرج منها الثمر ، فسدت المساقاة لفوات المقصود وهو الشركة

فی الخارج ، ولو سمیا مدة یبلغ الثمر فیها ، وقد یتأخر عنها قلیلا ، جازت لعدم فوات الغرض . (الهدایه : ٤ /٣٨٩ والمغنی : ٥ /٤١٤)

مساقاۃ فاسدہ کا حکم:

اگر شرط فاسد کی وجہ سے عقد مساقاۃ فاسد ہو جائے تو فیصلہ کا طریقہ یہ ہے کہ، تمام پھل مالک کا ہوگا کیوں کہ اس کے باغ کی پیداوار ہے اور عامل کو اجرت مثل ملے گی۔

احکام المزارعة

زمین دوسرے کو بٹائی پر دینے کے احکام

اسلام اپنے پیروکاروں کو عبادات کے علاوہ اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ اپنے لئے کوئی ذریعہ معاش اختیار کرو ویسے ہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھو کہ اس بات کا انتظار میں کہ دوسرا کما کر مجھے کھلائے گا۔

کمائی کے ذرائع میں سے کھیتی باڑی، باغ بانی وغیرہ بھی ہیں رسول اللہ ﷺ نے اس کی بھی ترغیب دی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

" ما من مسلم یغرس غرسا ، أو یزرع زرعا، فیاکل منه طیر أو انسان ، أو بهیمة ، الا کان له به صدقة ."

(اخرجه البخاری : ٢ /٤٥ ، باب فضل الزرع ومسلم فی المساقاة رقم : ١٥٥٣)

یعنی جو مسلمان بھی کوئی درخت لگائے ، یا کھیتی کرے پھر اس سے پرندے، انسان، یا جانور فائدہ حاصل کریں وہ اس کے لئے صدقہ جاریہ ہوگا، اس کو اجر ملے گا۔

وقال علیه الصلوٰة والسلام : " التمسوا الرزق من خبایا الارض."

(اخرجه الترمذی ، ای من باطنها بزراعتها واستخراج المعادن)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ زمین کے مخفی خزانوں سے رزق تلاش کرو، یعنی زراعت کر کے یا کان کنی وغیرہ کے ذریعہ۔

مزارعۃ کی تعریف اور حکم:

هی عقد علی زراعة الارض ، ببعض الخارج منها ، مثل اتفاق

مالك الارض مع الفلاح المزارع باعطاء ثلث او ربع ، أو نصف، مايخرج من النبات و الزرع على أن يزرعها و يعمل فيها .

عقد مزارعت وہ مالک زمین کا کسی کسان سے اس طرح معاہدہ کرنا ہے کہ کسان اس زمین میں کھیتی باڑی کرے، اور جو پیداوار حاصل ہوگی اس کا آدھا یا تہائی یا چوتھائی حصہ، کسان کو دیا جائے گا بقیہ مالک کا ہوگا۔

قال العلامة الموصلى رحمه الله : هى عقد على الزرع ببعض الخارج وهى جائزة عند ابى يوسف ومحمد لان النبى صلى الله عليه وسلم عامل من اهل خيبر على نصف ما يخرج من تمر وزرع ، ولان الحاجة ماسة اليها لان صاحب الارض قد لا يقدر على العمل بنفسه ولا يجد ما يستاجر به والقادر على العمل لا يجد ارضا ولا ما يعمل به ، فدعت الحاجة الى جوازها دفعا للحاجة كالمضاربة .

(الاختيار لتعليل المختار : ٧٥/٢)

قال العلامة الصابونى : وقد فعل ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقد روى البخارى عن ابن عمر رضى الله عنهما قال :

" عامل النبى صلى الله عليه وسلم خيبر ، بشطر، أى نصف ، مايخرج منها من ثمر أو زرع ." (اخرجه البخارى : ٤٦/٢)

وفى رواية أخرى عنده عن ابن عمر : "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم أعطى خيبر اليهود على أن يعملوها ويزرعوها، ولهم شطر، ماخرج منها . (اخرجه البخارى : ٤٧/٢)

وكذلك أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم تعاملوا بالمزارعة فقد حدث قيس بن مسلم عن أبى جعفر قال :

" ما بالمدينة أهل بيت هجرة، الا ويزرعون على الثلث، والربع."

قال البخارى : وزارع على ، وابن مسعود ، وعمر بن عبد العزيز، وآل أبى بكر ، وآل عمر ، وآل على ، وابن سيرين ، وقال عبد الرحمن

ابن الأسود: كنت أشارك عبد الرحمن بن يزيد في الزرع، وعامل عمر الناس على ان جاء عمر بالبذر من عنده فله الشطر، النصف، وان جاء وا بالبذر فلهم كذا، وقال الحسن: لا بأس أن تكون الأرض لأحدهما، فينفقان جميعاً، فما خرج فهو بينهما.

(صحيح البخاري: ٤٦/٢ باب المزارعة بالشطر ونحوه)

قال صاحب المغني: وهذا أمر مشهور، عمل به رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى توفاه الله، ثم خلفاؤه الرشدون حتى ماتوا، ثم أهلوهم من بعد هم، ولم يبق بالمدينة أهل البيت الا عمل به، وعمل به أزواج رسول الله صلى الله عليه وسلم من بعده.

"وقد كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما ظهر على خيبر، أراد إخراج اليهود منها، وصارت الأرض حين ظهر عليها لله ولرسوله، وللمسلمين، فسألت اليهود رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يقرهم بها، أي يتركهم، على أن يكفوه عملها، ولهم نصف الثمر، فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم: نقركم بها على ذلك ما شئنا !!فقروا بها حتى أجلا هم عمر رضى الله عنه الى تيماء وأريحاء."

(انظر صحيح البخاري: ٤٨/٢، المغني لابن قدامة: ٤١٨/٥، فقه المعاملات)

صحت مزارعت کی شرائط:

صحت مزارعت کی شرائط کی تفصیلات کے لئے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: مزارعت کے سلسلہ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے، لہٰذا بٹائی پر زمین دینے کا جواز مع شرائط صاف صاف عام فہم مفصل تحریر فرمائیں، نیز مزارعت کے جواز میں امام صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور صاحبین رحمہما اللہ تعالیٰ میں اختلاف ہے مفتی بہ قول کیا ہے؟ حدیث "من لم يترك المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله" کا کیا مطلب ہے؟ بینوا توجروا

جواب: قول جواز مفتی بہ ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ سے لے کر آج تک امت کا تعامل ہے۔

صحت مزارعت کے لئے آٹھ شرائط ہیں:

(۱) زمین زراعت کی صلاحیت رکھتی ہو۔

(۲) زمیندار اور مزارع اہل عقد میں سے ہوں۔

(۳) مدت کی تعیین۔

(٤) صاحب تخم کی تعیین۔

(۵) حصہ کی تعیین۔

(٦) مزارع کو زمین کا قبضہ دینا۔

(۷) پیداوار میں دونوں کی شرکت کا بیان۔

(۸) تخم کی جنس کی تعیین۔

مزارعت کی سات صورتیں ہیں:

(۱) ارض و بذر ایک کے ہوں، بقر و عمل دوسرے کے۔

(۲) ارض ایک کی، باقی سب دوسرے کا۔

(۳) عمل ایک کا باقی سب دوسرے کا۔

(٤) ارض و بقر ایک کے، بذر و عمل دوسرے کے۔

(۵) بقر و بذر ایک کے، ارض و عمل دوسرے کے۔

(٦) بقر ایک کے، باقی سب دوسرے کا۔

(۷) بذر ایک کا، باقی سب دوسرے کا۔

ان سات اقسام میں سے پہلی تین قسمیں مزارعت صحیحہ کی ہیں اور آخری چار مزارعت فاسدہ کی۔

قال فی التنویر و شرحه: و کذا صحت لو کان الارض و البذر لزید و البقر و العمل للاخر و الارض له و الباقی للاخر او العمل له و الباقی للاخر فهذه الثلاثة جائزة و بطلت فی اربعة اوجه لو کان الارض

والبقر لزید او البقر والبذر له والأخران للآخر والبقر او البذر له والباقی للآخر . (رد المحتار : ١٩٥/٥)

حدیث کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں مزارعت میں شرائط فاسدہ لگاتے تھے، مثلاً پیداوار سے وزن کی متعین مقدار کسی کے لئے رکھنا وغیرہ اس لئے ایسی مزارعت سے منع فرمایا ہے۔

قال الامام ابن الهمام رحمه اللّٰہ تعالیٰ : ویمکن ان یقال لهما ان یدفعا ذلك بحمل المروی عن النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم علی ما اذا شرط فی عقد المزارعة شرط مفسد اذ قد روی انهم کانوا یشترطون فیه شیئا معلوما من الخارج لرب الارض ونحو ذلك مما هو مفسد عند هما وقد اشار الیه صاحب الکافی الخ . (فتح القدیر : ٣٤/٨)

وقال فی التنویر وشرحه : ولا تصح عند الامام لانها کقفیز الطحان وعندهما تصح وبه یفتی للحاجة وقیاسا علی المضاربة .

(ردالمحتار : ١٩٣/٥ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ٣٨٠/٧)

قال العلامة الصابونی : وذهب بعض الفقهاء الی عدم جواز المزارعة وشبهتهم فی ذلك أنها قائمة علی شئی مجهول ، لأنه لا یعرف مقدار الخارج، فتکون الأجرة مجهولة، وبذلك یفسد العقد، کما هو معروف فی شروط الاجارة ، لما فیه من المخاطرة .

واحتجوا بما رواه البخاری عن " رافع بن خدیج " أنه قال :

" نهانا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم عن أمر کان بنا رافقاً ، أی سهلاً ونافعا، قال : ما تصنعون بمحاقلکم؟ أی مزارعکم ، قلت : نؤاجرها علی الربع، وعلی الأوسق من التمر والشعیر !!قال : لاتفعلوا، ازرعوها ، أو أزرعوها أی ادفعوها لمن یزرعها، أو أمسکوها!! قال رافع : قلت سمعاً وطاعة . " (اخرجه البخاری : ٤١٨/٢)

فالحدیث الشریف ظاهره یدل علی النهی عن اکراء المزارع

ببعض ما يخرج منها، الربع و الثلث ، وهذا الفهم رده أبن عباس رضى الله عنهما ، وبين أن النهى انما كان من أجل ارشادهم الى ما هو خير لهـم ، فقال : "ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يحرم المزارعة ، ولـكـن أمـر أن يرفق الناس بعضهم ببعض فقال : "من كانت له أرض فليزرعها ، او ليمنحها اخاه، فان ابى فليمسك ارضه .

(اخرجه البخارى من رواية جابر : ٢ / ٤٩)

وهـنـاك سبب اخر لحديث رافع بن خديج الذى يخبر بأن الرسول صلى الله عليه وسلم نهى عن المزارعة ، حدث عنه زيدبن ثابت رضى الله عـنـه أن الـنبى صـلـى الله عليه وسلم كان لقض النزاع فقال؛ يغفر اللهلـرافـع بن خديج ، انا والله اعلم بالحديث منه ، انما جاء رجلان من الانـصار قد اقتتلا فقال النبى صلى الله عليه وسلم : ان كان هذا شأنكم فـلا تـكـروا اى تـوجروا ، المزارع فسمع رافع قوله فلا تكروا المزارع، ولم يعرف سبب هذا النهى. (اخرجه ابو داؤد والنسائى)

وبهـذا اتضح الغرض من الحديث الشريف ، وبقى حل المزارعة عـلـى اصـلـه مـن الابـاحة والجواز ، كذلك التضح معنيحديث جابرؓ الـذى رواه البـخـارى مـن حيث قال : كانوا يزرعون بالثلث، والربع، والـنـصف ، فـقـال الـنبـى صـلـى الله عليه وسلم : من كانت له ارض فليزرعها ، او يمنحها فان لم يفعل فليمسك ارضه " .

هـذاالـحـديـث الشـريف ايـضـا سببـه وقـوعـه بعد المنازعات والخصومات بين بعض الانصار ، فاراد الرسول صلى الله عليه وسلم أن يـنـهـى هذا الخلافات فنها هم عن المزارعة ، وارشد هم الى ما هو الافضل والا صلح ولـم يحرم عليهم التعامل بها . (فقه المعاملات)

دخیل کار اور موروثی زمین کی پیداوار کا حکم:

اراضی پر سرکاری قبضہ زمینداروں کی ملک ، کاشتکاروں کے ساتھ معاملہ کی شرعی حیثیت کی

تفصیلات کو سمجھنے کے لئے حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی ایک تحقیق سوال وجواب کی صورت میں نقل کی جاتی ہے:

السوال : کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ آج کل جو تمام ہندوستان میں سرکار نے قانون قبضہ اراضی نافذ کر کے کاشتکاروں کو قبضہ دلایا ہے جس کی وجہ سے ہر شخص دخیل کار اور موروثی کاشتکار ہو گیا ہے پیشتر دخیل کاروں کی تعداد کم تھی مگر اب ہر کاشتکار دخیل کار ہو گیا ہے زمیندار جس طریقہ سے پیشتر کے دخیل کاروں سے ناخوش اور ناراض تھے اسی طریقے سے ان کاشتکاروں سے بھی ناخوش اور ناراض ہیں چونکہ زمینداروں کا منشاء تو یہ ہے کہ ہر سال نئے نئے کاشتکاروں کو زمین دیدی جایا کرے اور اس لگان سے کچھ زر لگان خفیہ کر لیا جایا کرے، بغیر پٹواری کے کاغذات میں بجائے للعرفی پگا کے درج کرا کر مال گذاری میں کمی رکھی جائے سرکار نے اس وجہ سے کل کو دخیل کار بنایا تا کہ زمیندار یہ غبن نہ کریں اور مال گذاری بمقابلہ وصولیت زر لگان از کاشتکار لے جایا کرے اس کے بعد سرکار نے یہ حق زمیندار کو دیا ہے کہ جو روپیہ تم اپنی جائیداد سے وصول کرو اس میں سے ۴۵ فی صدر رکھ کر باقی تحصیل میں داخل کر دو، اور احناف کا مذہب ہے کہ استیلاء کافر علی مال مسلم سبب ملک کا ہے سرکار کا جس وقت آنا ہندوستان میں معلوم ہوتا ہے اس سے پہلے یہی پتہ چلتا ہے کہ ملک پر قبضہ پورے طریقہ سے ان کو حاصل ہوا، لہٰذا یہ استیلاء کل ملک پر ظاہر ہے اس کے بعد قدر رے قدر رے قطعہ اراضی لوگوں کو دے گئے جن کو زمینداروں کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے مشہور تو ہے کہ زمیندار مالک اراضی نہیں لیکن بعض قانون دانوں سے نیز بعض زمینداروں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ زمیندار مالک اراضی نہیں بلکہ ایک مقدار معینہ کے معاہدہ سے ٹھیکہ دار ہیں، معاہدہ یہ ہے کہ فیصد آمدنی اراضی سے مثلاً مبلغ ۵۰ روپیہ ادا کریگا، چنانچہ اگر ایک سال میں اس معاہدہ کے خلاف کرلے تو اس کو اراضی سے سرکار علیحدہ کر دے گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ ٹھیکہ دار ہے اور اگر اس کو مالک ہی کہا جاوے تو اس قانون کے نفاذ کی وجہ سے سرکار کا استیلاء اراضی پر نہیں ہے جو موجب ملک ہے اور خود سرکار کا مقولہ ہے کہ زمیندار کوئی چیز نہیں کاشتکار یا ہم ثالث کون ہیں، تو ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ارشاد عالیہ سے سرفراز فرمایا جاوے کہ ان کاشتکاروں کا قبضہ اراضی پر جو باجازت سرکار ہے جائز ہے یا ناجائز اور ان کاشتکاروں کی آمدنی حلال ہے یا حرام، درصورتِ حرمت ان

لوگوں کا مساجد و مدارس وغیرہ میں چندہ دینا واعانت کرنا درست ہے یا نہیں، و نیز جو لوگ محتاج ہیں ان کو ان کاشتکاروں سے غلہ خریدنا جو ان اراضی میں پیدا ہوتا ہے درست ہے یا نہیں؟ حلت وحرمت دخیل کار امسال اور گذشتہ زمانہ کے جو دخیل کار ہیں مساوی ہیں یا کچھ فرق ہے؟ ہر دو غاصب ہیں یا نہیں اگر احدھما غاصب ہے تو ما بہ الامتیاز کیا ہے؟ جبکہ رضا مندی زمیندار ہر دو کاشتکار سے متعلق نہیں ہے۔ بینوا توجروا

الجواب: حکومت کے قبضہ سلطنت کو استیلاء علی الارض سمجھنا ہمارے فہم میں نہیں آیا کیوں کہ استیلاء قبضہ مالکانہ کا نام ہے اور گورنمنٹ نے جو ہندوستان پر تسلط کیا ہے وہ مالکانہ ہے اور قبضہ مالکانہ سے زمین ملک کے بادشاہ کی ملک نہیں ہوتی، وہ صرف منتظم ومدبر ہے۔ گذشتہ حالات کی ہم کو خبر نہیں اور نہ صحیح طور پر خبر ہو سکتی ہے، لیکن حالاتِ موجودہ اس پر شاہد ہیں کہ گورنمنٹ نے اراضی ہند پر قبضہ مالکانہ نہیں کیا، مثلاً گورنمنٹ اپنی ضرورت کے لئے بعض دفعہ اگر کسی کی زمین لیتی ہے تو اس کا معاوضہ دیتی ہے۔

عدالتوں میں شب وروز جائیداد کے بیع نامے اور ہبہ نامے اور وقف نامے اور وراثت کے دعوے دائر ہوتے ہیں اور گورنمنٹ ان سب کو معتبر سمجھتی اور اس کے موافق عمل کرتی ہے، اگر زمیندار مالک نہیں ہے بلکہ محض ٹھیکہ دار ہے تو اس کی بیع وہبہ ووراثت ووقف سب باطل ہونے چاہئیں اور اس پر جس فسادِ عظیم کا مرتکب ہوگا وہ مخفی نہیں ہے، اس لئے ان حالات کے ہوتے ہوئے یہ ہرگز تسلیم نہیں ہوسکتا کہ اراضی ہند گورنمنٹ کی ملک ہیں اور زمیندار محض ٹھیکہ دار ہے اور اگر ایسا ہوتا تو گورنمنٹ کو زمینداروں کا یک قلم الگ کر دینا کیا مشکل تھا وہ اپنے استیلاء کو دلیل بنا کر یہ سہولت کہہ سکتی تھی کہ زمیندار صرف ٹھیکہ دار ہے اب ہم اس کو ٹھیکہ دینا نہیں چاہتے، پھر ٹھیکہ اجارہ کی قبیل سے ہے جس کے لئے شرائط اجارہ کا تحقق ضروری ہے، اور یہاں ان کا بالکل وجود نہیں نہ اس ٹھیکہ کی مدت مقرر ہے نہ زمیندار کی موت سے وہ اجارہ باطل ہوتا ہے بلکہ اس میں میراث جاری ہوتی ہے پھر کیوں کر اس کو اجارہ مان لیا جاوے بلکہ یقیناً زمیندار اپنی زمین کا مالک ہے جو کاشتکار کو اجارہ پر زمین دیتا ہے، اور کاشتکار مُستاجر ہے لیکن اس قانونِ جدید کی وجہ سے اب جو کاشتکار کسی زمیندار کی زمین اجارہ پر لیتا ہے تو وہ گویا اجارہ میں یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ زندگی بھر میں اس کی زراعت کروں گا جو ایک شرط فاسد ہے، نیز اس میں مدت اجارہ ہی مجہول ہے پس اس کا حکم اجارۂ فاسد کا حکم ہوگا، جس کا

حاصل یہ ہے کہ موجر کے لئے اجر حلال ہے اور مستاجر جو کچھ زراعت کرتا ہے، پیدوار سب اس کی ملک ہے لیکن مستاجر بوجہ اس شرطِ فاسد کے گہنگار ہے اور زمیندار تو قانون کی وجہ سے اس شرط کے ماننے پر مجبور ہے لیکن مستاجر مجبور نہیں ہے اس لئے اس شرط کی وجہ سے وہی گناہ گار ہوگا رہا یہ کہ اس گناہ کا اثر صرف کاشتکار کے ذمہ تک ہے یا زراعت و پیداوار میں بھی اس کا خبث سرایت کرے گا؟ تو اس میں تفصیل ہے، جو روایاتِ ذیل سے واضح ہوگی۔

قال فی الهندية : ولو كان المشترى استاجر الارض الىٰ ان يدرك ولـم يـذكـر مـدة معلومة فالاجارة فاسدة لجهالة المدة فان تركه فی الارض حتى أدرك لزمه أجر المثل بخلاف حتى لا يجب هناك الأجر اصلاً ، قـال ويـطـيـب لــه مـن الـذرع بـقـد الثمن وما عزم من الأجر ويتصدق بالفضل هذا الذى ذكرنا قياس قول ابى حنيفة ومحمد واما عـلـى قـول ابـى يـوسف يـطـيـب له الزيادة فی الوجوه كلها كذا فی الذخيرة اهـ . (٥/٢٧٢)

قـلـت ووجـه قـول ابى يوسف كونها من الاجارات الناس كما يظهر من كلامه والله أعلم .

قـال فـى الـدر : فـى الاجارة الفاسدة وحكم الاول وهو الفاسد وجوب اجر المثل بالاستعمال لو المسمى معلوما ان كما ل اه .

وفيه ايضاً : الفاسد من العقود ما كان مشروعاً باصله دون وصفه والباطل ماليس مشروعا اصلاً لاباصله ولا بوصفه .

وقـال الشامى تحت قوله : وجوب أجر المثل والاجر طيب وان كـان الـسـبـب حراماً كما فی المنية ، ونقل فی المنع أن شمس الأئمة الـحـلـوانى قال تطيب الأجرة فی الاجارة الفاسدة اذا كان اجر المثل اهـ . (٥/٤٢)

وفـى الدر : ولاتملك المنافع بالاجارة الفاسدة بالقبض بخلاف بيع الفاسد فان المبيع يملك فيه بالقبض بخلاف فاسد الاجارة حتى

لو قبضها المستاجر ليس له أن يوجرها ولو اجرها وجب المثل ولايكون غاصباً اهـ .

فيه ايضاً : وفى الاشباه : المستاجر فاسد لو آجر صحيحا جاز ولو بعد قبضه فى الأصح منية . اهـ . (٤٣/٥)

قلت وهذا حكم المنافع واما الاعيان المتولدة من المأخوذ اجارة فاسدة فحكمهٗ فى الخامدية : وفى الخلاصة رجل دفع الى خياط ثوبا باليخيط له قبأ أو حبة ولم يشا الأجرة فلما فرغ منه اعطاه صاحب الثوب زيادة على اجر مثله فى قياس قول ابى حنيفة يطيب له وقال فقيه ابو الليث الزيادة جائز ة فى قولهم جميعا اهـ . (١٤٩/٣)

قلت واذا طاب للخياط الزيادة على اجر مثله فالظاهر جواز لبس القباء للمالك ايضاً ولعل وجه ذلك عند هما كونهن اجارات الناس ، والله اعلم .

ونصها لوزرع ارض الغيربغير اذنه يعتبر العرف فان اقتسموا الغلة انصافاً او ارباعاً اعتبر والافالخارج للزارع وعليه اجر المثل للارض اه ثم نقل عن جامع الفصولين ومن زرع ارض غيره بلا امره يجب الثلث او الربع على ماهو عرف القرية ثم رمز الفتاوى القاضى ظهيرالدين زرع الا كارسنين بعد مضى مدة الزراعة جواب الكتاب انه لا يكون مزارعة فالزرع كله للاكار وعليه تصدق بما فضل من بذره واجر المثل عمله وهكذا كانوا يفتون ببخارى وقيل تكون مزارعة وقيل لو كانت الارض معدة للزراعة بان كان ربها ممن لا يزرع بنفسه ويدفعه مزارعه فلرب الارض حصة على ماهو عرف تلك القرية لكن انما يحصل على هذا لو لم يعلم وقت الزراعة انه زرعها على وجه الغصب صريحاً اودلالة او علىٰ تاويل فان من آجر أرض غيره بلااذنه ولم يحرزبها وقد زرعها المستاجر فالزرع كله

للمستاجر لا على الزراعة (بل على وجه الاجارة لانه زرعها بتاويل الاجارة) والحاصل ان فى المسئلة قولين او ثلاثة الأول انه اذا زرع ارض غيره بلا امره لايكون غصبا بل يحمل على الزراعة وحصة رب الارض ماجرى عليه عرف القرية من ثلث او ربع والقول الثانى جواب الكتاب انه يكون غاصبا والزرع كله له لكن يتصدق ما فضل عن بذره واجر مثل عمله ويمكن حمل هذا على ما اذا لم يكن عرف فى اخذها على وجه المزارعة اذا كان صاحبها اعدها للاستغلال بان كان يدفعها مزارعة لغيره ولا يزرعها بنفسه لانه يكون قرينة على ان الزراع انما اخذها على وجه المزارعة على عرف تلك القرية اما لوكان صاحبها يزرعها بنفسه يكون الزارع غاصبا فالزرع كله له اهـ. (فتاوى حامدية : ١٥٧/٢ ـ ١٥٨)

قلت وظهر من مجموع الكلام ان الزراع انما يجب عليه التصدق بما فضل عن بذره واجر مثل عمله اذا كان غاصبا ولايكون غاصبا اذا لم تكن الارض معدة للاستغلال او كان صاحبها يزرعها بنفسه وهذا كله فيما اذا زرع ارض الغير بدون اذنه واما فى صورة المسئولة فلا يمكن القول بكون الزارع غاصبا لانه يزرعها على تاويل الاجارة ويزرعها بان المالك لا بلا اذنه فيكون مستاجرًا لا غاصباً فيكون الزرع كله له ولا يجب عليه التصدق بم فضل عن بذره واجر مثل عمله عند ابى يوسف خلافاً لهما وللمالك اجر مثل ارضه بالغامابلغ ولا ينقض عن المسمى لا يقال كيف يجب اجر المثل بالغا ما بلغ والاجرة ليست بمجهولة بل مسماة وحينئذ لا يزاد على المسمى كما فى الدر قلت علل فيه عدم الزيادة على المسمى برضا هما به . (٤٦/٥)

وفى الصورة المسئولة لايكون المالك راضيا بالاجر الذى يؤديه

الا كار المدعى لنفسه حق القرار كما هو مشاهد والله اعلم

خلاصۂ روایات یہ ہوا کہ جو شخص غاصب ہو کر دوسرے کی زمین میں زراعت کرے اس کی زراعت کی پیداوار میں زائد سب خبیث ہے جس کا تصدق واجب ہے۔

اور جو شخص اجارہ فاسد کے ساتھ دوسرے کی زمین میں زراعت کرتا ہے اس کی پیداوار بھی طرفین (امام ابوحنیفہ ومحمد رحمہما اللہ) کے نزدیک مطلقاً خبیث ہے، الا بقدر بذرہ واجر مثل عمله اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کے نزدیک بعض صورتوں میں جو من جنس اجارات الناس ہو جائز ہے۔

پس صورت مسئولہ میں جبکہ مالک ارض جانتا ہے کہ متاجر اپنی حیات تک زمین پر قابض رہے گا اور اس بات کو جانتے ہوئے زمین کو اجارہ پر دے رہا ہے تو متاجر اس صورت میں غاصب نہیں البتہ یہ اجارہ فاسدہ جس میں متاجر ایک شرط فاسد کر رہا ہے اور مدتِ اجارہ بھی مجہول ہے اس لئے اس کا حکم یہ ہے کہ خود اس متاجر کے حق میں تو اس کی پیداوار کا وہ حصہ جو قدر تخم اور اجرت مثل عمل سے زائد ہو حلال نہیں، علی قول الطرفین، اور دوسرے کے حق میں قول ابو یوسف پر اس کی کل پیداوار کو دفع حرج کے لئے جائز کہا جائے گا، کیوں کہ اب اس میں ابتلاء عام ہو گیا ہے جس سے دوسروں کو تحرز دشواری ہے ان کے لئے ایسے متاجر کے حق میں دعوت ہدیہ وچندہ کی رقم لینے کو جائز کہا جائے گا، اور خود اس متاجر کے حق میں چوں کہ حرج نہیں ہے کیوں کہ وہ اس اجارہ فاسد کا اپنے فعل سے مرتکب ہو رہا ہے تو اس کے حق پیداوار اور زائد علی القدر المذکور کو حرام کہا جائے گا، اور دوسروں کے لئے بھی یہ توسع صرف اس صورت میں ہے جبکہ مالکِ ارض ابتداء ہی سے کسی متاجر کو حیاتی کاشتکار مان کر زمین اجارہ پر دے اور اگر مالک ارض نے ابتداء میں حیاتی کاشتکار مان کر زمین نہ دی تھی بلکہ ایک مدت معینہ کے لئے اجارہ پر دی تھی پھر متاجر اس قانون جدید کی وجہ سے حیاتی کاشتکار ودخیل کار بن گیا تو یہ شخص مدتِ معینہ کے تمام ہونے کے بعد غاصب شمار ہوگا، اور اس کی پیداوار زائد علی القدر المذکور سب کے لئے حرام ہے اس کے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی، مگر یہ وہ مدتِ معینہ اجارہ اولیٰ کے ختم ہونے پر اجارہ فسخ کر دے اور دوبارہ قانونِ جدید پر اجارہ کرے یا مالک ارض کو قانوناً اس کاشتکار کو الگ کر دینے کا مدتِ معینہ تک حق حاصل تھا اور مالک ارض نے عمداً اس کو الگ نہیں کیا تو اب یہ کاشتکار بھی صورتِ اولیٰ کے کاشتکاروں جیسا ہو گیا۔ وحكمه كحكم الاول

اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ امسال کے دخیل کاروں اور گذشتہ زمانہ کے دخیل کاروں میں فرق ہے کیوں کہ گذشتہ زمانہ کے دخیل کاروں سے مالکانہ ارض مدت معینہ تک کے لئے اجارہ کرتے تھے پھر وہ بدون رضا مالک کے بارہ سال کے بعد محض قانون کی وجہ سے قابض اور دخیل کار بن جاتے ہیں پس وہ بحکم غاصب تھے اور اس وقت جو کاشتکار کسی سے زمین لیتا ہے تو مالک زمین اس کو دائمہ کاشتکار مان کر زمین دیتا ہے تو وہ اس کے قبضۂ حیاتی میں ابتداء ہی سے ہے، رہا یہ کہ وہ دل سے کہاں راضی ہے محض قانون کی وجہ سے مجبور ہے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قانوناً زمین کاشت کے لئے دینے پر مجبور نہیں اگر وہ خود کاشت کرنا چاہے تو کرسکتا ہے، اور جب وہ خود کاشت نہیں کرتا بلکہ دوسروں کو زمین دے رہا ہے اور جانتا ہے کہ یہ کاشتکار بنتے ہی دخیل کار ہو جائے گا، تو اس کا اس حالت میں زمین دینا کاشتکار کی دخیل کاری پر رضا ہے، نیز قانون نے زمین کے مالک کی زبان تو بند نہیں ہے وہ اس قانون کے بعد بھی زبان سے اتنا کہہ سکتا ہے کہ میں یہ زمین مدت معینہ کے لئے (مثلاً دو سال کے لئے) اجارہ پر دیتا ہوں اس سے زائد کے لئے میں راضی نہیں ہوں، اگر وہ زبان سے ایسا کہہ دے تو اس کاشت کار کا اب بھی مدت معینہ کے بعد وہی حکم ہوگا جو گذشتہ دخیل کاروں کا حکم تھا لیکن جب وہ زبان سے کوئی مدت متعین نہیں کرتا اور قانون حال سے واقف ہے تو دلالۃً وہ مستاجر کی شرط فاسد پر راضی ہے اس صورت میں مستاجر کو غاصب مثل گذشتہ دخیل کاروں کے نہ کہا جائے گا ہاں اس قانون سے نفع لینے میں وہ گناہ گار ضرور ہے، اس کے حق میں اس کی پیداوار حرام ہی ہے لاستفتاء ما مر، لیکن غاصب نہ ہونے کا اثر دوسروں کے حق میں بصورت توسع ظاہر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم

(ماخوذ از امداد الاحکام: ٤/١٧٥، کتاب المزارعۃ)

احکام احیاء الموات

یعنی بنجر غیر مملوکہ زمین کو آباد کرنے کا حکم

غیر آباد زمین کو آباد کرنے کا مطلب:

آبادی سے دور کوئی زمین جس کا کوئی مالک معلوم نہیں بے آباد پڑی ہوئی ہے، اب کوئی شخص اس کو درست کر کے قابل کاشت بناتا ہے تو وہ اس زمین کا مالک ہو جائے گا۔

والأصل فيها : قول النبي عليه الصلاة والسلام : "من أحيا أرضاً ميتة فهي له" .

(اخرجه الترمذي رقم ١٣٧٩ ، في الأحكام ، وقال : هذا حديث صحيح)

وفي رواية أخرى: "من أعمر أرضا ليست لأحدٍ فهو أحق بها " .

(اخرجه احمدو الترمذي وابو داؤد)

وقد اشترط الفقهاء أن تكون بعيدة عن البلدةِ ، لا ينتفع بها أهل العامر، أي أهل المدينة ، ولا يجوز احياء ماقرب من البلدة ، بل يترك مرعىً لأهل البلدة ، لأنعامهم ومواشيهم .

قال صاحب الهداية : الموات مالا ينتفع به من الأراضي، لانقطاع الماء عنه ، أو لغلبة الماء عليه، كالسبخة، أو ما أشبه ذلك، مما يمنع الزراعة ، سمى بذلك لبطلان الانتفاع به، فما كان منها قديماً لا مالك له ، أو كان مملوكاً في الاسلام ، لا يعرف له مالك بعينه ، وهو بعيد من القرية بحيث اذاوقف انسان من أقصى العامر، أي المسكونة ، فصاح لا يسمع الصوت فيه ، فهو مواتٌ .

واشترط محمد بن الحسن أن لايكون مملوكاً لمسلم، أو ذمى، مع انقطاع الارتفاق به ، ليكون ميتة مطلقاً ، أما المملوكة لمسلم أو ذمى ، فلا تكون مواتاً واذا لم يعرف مالكه يكون لجماعة المسلمين.

(الهداية : ٤/٤٣٥)

غیر آباد زمین آباد کرنے کے لئے اجازت حاکم کا حکم:

زمین آباد کرنے کے لئے ائمہ ثلاثہ کے ہاں حاکم وقت سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں لیکن امام اعظم رحمہ اللہ فرماتے ہیں چونکہ یہ زمین حکومت کی ملک میں ہے اس لئے حکومت وقت سے باقاعدہ اجازت لینے کی ضرورت ہے۔

ثم من احياها باذن الامام ملكه وان احياه بغير اذنه لم يملكه عند ابي حنيفة رحمه اللّٰه ، وقالا : يملكه لقوله عليه السلام : من احيا

ارضا میتة فھی لہ ولانہ مال مباح سبقت یدہ الیہ فیملکہ کما فی الحطب والصید،و لابی حنیفة قولہ علیہ السلام : لیس للمرء الا ماطابت بہ نفس امامہ وما رویاہ یحتمل أنہ اذن لقوم لا نصب للشرع ولانہ مغتوم لو صولہ الی ید المسلمین بایجاف الخیل والرکاب فلیس لاحد أن یختص بہ بدون اذن الامام کمافی سائر الغنائم . (الھدایہ : ٤/٤٨٣)

احیاء کے لئے صرف علامات رکھ دینا کافی نہیں:

اگر کوئی شخص بے آباد زمین کو آباد کرنے کی غرض سے چار دیواری کردے یا پتھر وغیرہ علامات سے دوسری زمینوں سے جدا کردے تو صرف اتنا کرنے سے اس زمین کا مالک بن جائے گا یا حقیقتاً قابل کاشت بنا کر کاشت کرنا ہوگا۔

اتنا کام کرنے سے وہ دوسروں کے مقابلہ میں اس زمین کا زیادہ حقدار ہوگا البتہ تین سال کی مدت میں اس کو قابل کاشت بنانا ضروری ہے اگر نہیں بنایا تو پھر حاکم اس سے واپس لے کر کسی دوسرے کے حوالے کردے گا تاکہ وہ قابل کاشت بنائے۔

لقولہ علیہ السلام : من سبق الی ماءٍ لم یسبق الیہ مسلم فھو احق بہ . (اخرجہ ابوداؤد رقم : ٣٠٧١، واسنادہ ضعیف)

وینتظرہ السلطان ثلاث سنین فان لم یعمرھا اخذھا منہ ودفعھا الی غیرہ لما روی عن عمر رضی اللّٰہ عنہ أنہ قال : "من تحجر ارضا فعطلھا ثلاث سنین فجاء قوم فعمروھا فھم احق بھا ."

قال صاحب الھدایة : ومن حجر ارضًا ولم یعمرھا ثلاث سنین، اخذھا الامام ودفعھا الی غیرہ لان الدفع الی الاول ، کان لیعمرھا فتحصل المنفعة للمسلمین ، من حیث العشر أو الخراج فاذا لم تحصل یدفع الی غیرہ تحصیلا للمقصود . (الھدایہ : ٤/٤٨٣)

زمین کی کاشتکاری میں وراثت جاری نہیں ہوتی:

اگر کوئی زمیندار اپنی کسی کھیتی کی بخوشی کاشتکاری لگوادے تو زمیندار اور کاشتکار دونوں یا کہ

ایک کے انتقال کے بعد یہ معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے گا ان کی اولاد کو کاشتکاری کا حق نہ پہنچے گا، کیوں کہ وراثت مملوک میں ہوتی ہے، حقوق مجردہ میں نہیں ہوتی، نیز اگر زمیندار کچھ عوض لیکر زمین کو موروثی کردے تو بھی زمین شرعاً موروثی نہ ہوگی اور زمیندار نے جو رقم لی ہے وہ رشوت ہے، اس کا تصرف میں لانا حرام ہے، کاشتکار اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔

قال في الدر والاشباه : لا يجوز الاعتياض عن الحقوق المجردة، كحق الشفعة ، (٤ / ٢٠ ، ملخص از امداد الاحكام : ٤/١٧٢)

حاکم رعایا کو غیر آباز مین دے سکتا ہے:

حکومت کو حق حاصل ہے کہ غیر آباد زمین کسی کو دیدے تا کہ وہ اس کو آباد کرے، البتہ ایسی زمین نہ دے جو عام لوگوں کی ضرورت کی ہے، مثلاً راستہ، نہر، وغیرہ۔

نبی کریم ﷺ نے بلال بن حارث کو ''عقیق'' نامی زمین بطور قطع کے دی تھی جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خلافت کا زمانہ آیا تو انہوں نے حضرت بلال سے فرمایا:

ما اقطعك رسول الله صلى الله عليه وسلم لتحجزه عن الناس، انما اقطعك لتعمره فخذمنها ما قدرت على عمارته ورد الباقي .

(اخرجه سعيد في سننه كذا في المغني : ٥/٥٧٠)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے تمہیں زمین محض چار دیواری کی غرض سے نہیں دی تھی بلکہ دینے کا مقصد اس کو آباد کرنا تھا، جتنی زمین آباد کر سکا، وہ تو تمہاری ہوگئی اور جو غیر آباد رہ گئی ہے اس کو واپس کردو۔

روى الترمذي عن علقمه بن وائل عن ابيه أن النبي صلى الله عليه وسلم اقطعه ارضا بحضر موت .

(اخرجه الترمذي رقم : ١٣٨٠ وقال حسن صحيح)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو ''حضر موت'' میں ایک زمین بطور قطع کے دی تھی۔

وكذا اقطع صلوات الله نا سامن جهينة مزينة فعطلوها، فجاء قوم فاحيوها، فخاصمهم الذين اقطعهم رسول الله صلى الله

علیہ وسلم، الی عمر رضی اللّٰہ عنہ فقال عمر رضی اللّٰہ عنہ ،
لو کانت قطیعۃ منی او من ابی بکر لم اردھا، ای لم ارجعھا الیھم
ولکنھا قطیعۃ من رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فانا اردھا، ثم قال
عمر : من کانت لہ ارض فعطلھا ثلاث سنین ، فجاء قوم فعمروھا ،
فھم احق بھا . (فقہ المعاملات)

غیر آباد زمین کو آباد کرنے کی شرائط:

(۱) یہ غیر آباد زمین کسی کی ملک میں نہ ہو کیوں کہ غیر آباد مملوکہ زمین مالک کی اجازت یا مالک سے خریدے بغیر کسی غیر کے لئے آباد کرنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے، اگر چہ بالکل ہی بے کار پڑی ہوئی ہو۔

(۲) یہ زمین کسی آباد زمین کی ضرورت میں سے نہ ہو، مثلاً کسی گھر کا صحن یا کسی کنویں کا من وغیرہ نہ ہو۔

کما روی : من حفر بئرًا فلہ مما حولھا اربعون ذراعا عطنا لماشیتہ . (اخرجہ ابن ماجہ باب حریم البئر رقم : ۲۵۱۱)

(۳) زمین ملنے کے بعد تین سال پورے ہونے سے قبل اس کو آباد کرنا ضروری ہے۔

تمت الجزء الثانی من

"جدید معاملات کے شرعی احکام"

بعون اللّٰہ سبحانہ تعالیٰ

فی ثمانیہ عشر من شعبان ۱۴۲۷ھ ویلیہ الجزء الثالث

ان شاء اللّٰہ تعالیٰ

فقه المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

۳ جلد یکجا مجلّد

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب

معین مفتی و استاد جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دار الاشاعت

اُردو بازار ○ ایم اے جناح روڈ ○ کراچی پاکستان فون: 2631861

فقه المعاملات

یعنی

جدید معاملات کے شرعی احکام

کامل ۳ جلد یکجا

جلد سوم

جناب مولانا مفتی احسان اللہ شائق صاحب
معین مفتی و استاذ جامعۃ الرشید احسن آباد کراچی

دارُالاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : فروری ۲۰۰۷ء علمی گرافکس
ضخامت : 267 صفحات

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تا کہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

﴿........ ملنے کے پتے ....﴾

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

﴿انگلینڈ میں ملنے کے پتے﴾

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

﴿امریکہ میں ملنے کے پتے﴾

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182 SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست مضامین ﴿جلد ثالث﴾

کتاب الخطر والاباحۃ

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے انتہائی محبت ہے اور اللہ تعالیٰ بہت ہی حکمت والے ہیں۔ اس لیے ہر وہ چیز جس کی ذات میں خبث وگندگی ہے یا جو چیزیں انسان کی صحت وعقل کے لیے مضر ہیں ان کے استعمال کو حرام قرار دیا اور جو پاکیزہ لذیذ چیزیں اور انسان کے حق میں مفید ہیں ان کے استعمال کو حلال قرار دیا ہے، تاکہ انسان اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے اسطرح کہ احکام خداوندی کی پابندی کریں اور اپنی زندگی کے زیادہ سے زیادہ اوقات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاریں۔

وقوله تعالیٰ: ﴿ وكلوا مما رزقكم الله حلالا طيبا واتقوا الله الذى انتم به مؤمنون ﴾ (مائدة : ٨٨)

اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے حلال مرغوب چیزیں کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے فرض منصبی میں یہ بات داخل فرمائی کہ لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز سکھائیں:

کقوله تعالیٰ: ﴿ يامرهم بالمعروف وينههم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ﴾ (اعراف : ١٥٧)

یعنی ارشاد باری تعالیٰ کہ وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں۔

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ حلال کو اختیار کرے اور حرام سے اجتناب کرے۔

حرام جانوروں کا بیان:

کونسا جانور حرام ہے اور کونسا حلال ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے ضابطہ بیان فرمایا:

عن أبي ثعلبة الخشني أنه قال : نهى رسول الله صلى الله عليه

وسلم عن اکل کل ذی ناب من السباع ." (اخرجه مسلم : رقم ۱۹۳۲ باب تحریم کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر)

یعنی ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وحشی جانوروں میں سے کچلی کے دانت والے جانور کے گوشت استعمال کرنے سے منع فرمایا ہے۔

دوسری روایت میں ارشاد ہے کہ پرندوں میں جو پنجوں سے شکار کرنے والے ہیں ان کا گوشت استعمال کرنا ممنوع ہے۔

کما روي عن ابن عباس رضی اللّٰہ عنه : ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم نھی عن کل ذی ناب من السباع ، و کل ذی مخلب من الطیر . (اخرجه مسلم رقم ۱۹۳۳)

خلاصہ یہ ہے کہ جو جانور یا پرندہ شکار کر کے کھاتے ہیں، یا ان کی غذا محض نجاست ہے، ان کا گوشت استعمال کرنا حرام ہے، جو ایسا نہیں ہے وہ حلال ہے۔

حرام جانوروں کی فہرست:

شیر، بھیڑیا، گیدڑ، بلی، کتا، ہاتھی، بندر، یا، خنزیر، شکرا، باز، چیل، گدھ وغیرہ

حلال جانوروں کی فہرست:

گائے، بیل، بھینس، اونٹ، بکری، د: طوطا، مینا، فاختہ، چڑیا، بٹیر، مرغابی، کبوتر، نیل گائے، ہرن، بطخ، خرگوش وغیرہ۔

بگلے اور سارس کا حکم:

بگلے اور سارس بھی حلال پرندوں میں سے ہے بعض لوگ محض غلط فہمی کی وجہ سے ان کا گوشت استعمال نہیں کرتے، حالانکہ بگلے اور سارس نہ پنجوں سے شکار کرتے ہیں نہ ہی ان کی غذا محض نجاست ہے لہٰذا ان کا گوشت استعمال کرنا حلال ہے۔

گھوڑا مکروہِ تحریمی ہے:

گھوڑے کا گوشت حلال یا حرام اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مفتی بہ قول کے مطابق مکروہِ تحریمی ہے۔ جبکہ صاحبین اور امام شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں

چونکہ گھوڑا گائے، بھینس حلال جانوروں کے مشابہ ہے لہٰذا اس کا گوشت استعمال کرنا حلال ہے۔ باقی علت حرمت یقیناً اس کے اندر کسی قسم کا خبث کا ہونا، یا اس کی غذا گندگی ہونا نہیں بلکہ چونکہ گھوڑا قیامت تک کے لیے آلہ جہاد ہے، اگر اس کے گوشت کے استعمال کو حلال قرار دیا جائے تو گھوڑے کی قلت ہوجائے گی۔

وفي التنوير وشرحه : والخيل وعندهما والشافعي رحمهم الله تعالىٰ تحل وقيل إن ابا حنيفة رحمه الله تعالىٰ رجع عن حرمته قبل موته بثلاثة امام وعليه الفتوى عماديه ولا بأس بلبنها على الاوجه.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله : (قوله وعليه الفتوى) فهو مكروه كراهة تنزيه وهو ظاهر الرواية كما في كفاية البيهقي وهو الصحيح على ما ذكره فخر الاسلام وغيره قهستاني ثم نقل تصحيح كراهة التحريم عن الخلاصة والهداية، والمحيط والمغنى، وقاضيخان، والعمادى وغيرهم وعليه المتون، وافاد ابو السعود انه على الاول لا خلاف بين الامام وصاحبيه، رحمهم الله تعالىٰ لانهما وإن قال بالحل لكن مع كراهة التنزيه كما صرح به في الشرنلالى عن البرهان قال ط. والخيل في خيل البر واما خيل البحر فلا توكل اتفاقا. (ردالمحتار : ج٥/٢١٤)

وقال العلامة محمد على الصابوني : أما لحوم الخيل فيجوز أكل لحمها، لأنها تشبه الأنعام، من الإبل والغنم والبقر، وتأكل العلف، ولا تأكل اللحم أو القذر، كما يأكله الخنزير، وقد كره بعض الفقهاء أكل لحم الخيل، لأنها آلة الجهاد في كل عصر و زمان. كما قال صلى الله عليه وسلم : "الخيل معقود في نواصيها الخير، إلى يوم القيامة" فالكراهة عندهم ليس لحرمتها، وإنما هي خشية أن يقل نسلها أو ينقرض، وهي آلة المجاهدين، التي لا يستغني عنها الغزاة، في كل عصر و زمان.

ومما يثبت حل أكل لحوم الخيل، ما ثبت في الصحيح عن جابر بن عبد الله: "أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى يوم خيبر، عن لحوم الحمر الأهلية، وأذن في لحوم الخيل."

(رواه مسلم: رقم ١٩٤١)

رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے دن گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا اور گھوڑے کے گوشت کی اجازت دی۔

وفي رواية الترمذي عن جابر رضي الله عنه أنه قال: ا" أطعمنا رسول الله صلى الله عليه وسلم لحوم الخيل، ونهانا عن لحوم الحمر" يعني الحمر الأهلية. (اخرجه الترمذي: رقم١٧٩٣ فی الاطعمه)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں گھوڑے کا گوشت کھلایا اور گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔

گھوڑے کے دودھ کا حکم:

گھوڑے کے گوشت کے استعمال کے بارے میں اگر چہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے لیکن دودھ کا استعمال حلال ہونے کے بارے میں کسی کا اختلاف نہیں، بلکہ یہ گائے کے دودھ کی طرح حلال ہے، اس سے تیار کردہ گھی اور پنیر وغیرہ بھی حلال ہے۔

گدھے کے گوشت کا حکم.

پالتو گدھے کا گوشت حرام ہے، البتہ جنگلی گدھے جن کو گورخر کہا جاتا ہے ان کا گوشت حلال ہے۔

قال العلامة الصابوني:

الحمير التي تعيش مع الناس، في المدن والقرى، ويركبونها ويحملون عليها الأثقال، فقد جاء تحريم أكلها صريحاً في الأحاديث الشريفة.

١ ـ روي مسلم والترمذي عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: " نهى عن متعة النساء ـ أي

زواج المتعة ۔ یوم خیبر ، وعن لحوم الحمر الإنسیة ۔"

(اخرجه مسلم رقم :۱٤۰۷ ، والترمذي رقم ۱۷۹٤ في الأطعمة)

رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی فتح کے موقع پر متعہ اور گدھے کے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا۔

۲۔ وروي مسلم عن عبد الله بن أبي أوفى رضي الله عنه أنه قال : " أصابتنا مجاعة يوم خيبر ، ونحن مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ، وقد أصبنا للقوم حمرا خارجة من المدينة ۔ يعني حمرا أهلية ۔ فنحرناها ، فإن قدورنا لتغلي بها ، إذ نادى منادي رسول الله صلى الله عليه وسلم أن اكفئوا القدور ۔ أي اقلبوا ما فيها وارموه ولا تطعموا من لحوم الحمر شيئا !! وتحدثنا بيننا فقلنا : حرمها البتة " أي مطلقا وأبدا . (أخرجه مسلم في كتاب الصيد والذبائح رقم ۱۹۳۷)

۳۔ وفي رواية أخرى لمسلم : " أمر رسول الله صلى الله عليه وسلم أبا طلحة فنادى إن الله ورسوله ينهيانكم عن لحوم الحمر ، فإنها رجس أو نجس ."

٤۔ وروي الترمذي عن أبي هريرة رضي الله عنه أنه قال : " حرم رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم خيبر ، كل ذي ناب من السباع ، والمجثمة ۔ أي التي تكون هدفا للنبال ۔ والحمار الإنسي " أي الأهلي . (أخرجه الترمذي رقم : ۱۷۹٥ في الاطعمه)

رسول اللہ ﷺ نے فتح خیبر کے دن ہر اس جانور کے گوشت کو حرام فرمایا جو کچلی کے دانت والا ہو، اور جس جانور کو نشانہ بنایا گیا ہو تیر اندازی کا اور پالتو گدھا کا گوشت۔

خچر کے گوشت کا حکم:

خچر گھوڑی سے پیدا ہوتا ہے اور شرعاً جانوروں کی نسل کا حکم یہ ہے کہ بچہ ماں کے تابع ہوتا ہے، لہٰذا یہ خچر بھی گھوڑی کے حکم میں داخل ہو کر اس کے گوشت کا استعمال بھی مکروہ تحریمی ہوگا۔

خنزیر کے گوشت کا حکم:

خنزیر کے گوشت از روئے قرآن وحدیث حرام ہے، جس مسلمان کا اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت

پر ایمان ہو ان کی شان سے بعید ہے کہ خنزیر جیسے نجس جانور کے کسی بھی جزء سے استفادہ کرے، اس کے باوجود بعض لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا رہتے ہیں اور اعتراضات کرتے ہیں اس لیے ذیل میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے، جس میں شکوک کے جوابات مذکور ہیں۔

خنزیر کی حرمت میں فلسفہ:

سوال: جناب مفتی صاحب! یہاں جاپان میں عموماً خنزیر کا گوشت کھایا جاتا ہے حتیٰ کہ بعض مسلمان جو کہ عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں وہ بھی استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گائے اور خنزیر کے گوشت میں کوئی فرق نہیں دونوں کا گوشت ایک ہی طرح کا ہوتا ہے بلکہ خنزیر کا گوشت گائے کے گوشت سے لذیذ ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اسلام میں خنزیر کا گوشت حرام قرار دینے کا کیا فلسفہ ہے؟

جواب: اسلامی نقطہ نظر سے کسی چیز کی حلت اور حرمت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اللہ تعالیٰ جس چیز کو حلال فرمادیں وہ حلال ہوتی ہے اور جس کو حرام فرمادیں وہ حرام ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں کسی کو قیاس آرائی کی اجازت نہیں کہ وہ ادھر ادھر صغری وکبری ملاکر کسی چیز پر حلال یا حرام ہونے کا حکم لگائے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف حیوانات کی طرح گائے کو بھی حلال قرار دیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ثمانية ازواج من الضأن اثنين ومن المعز اثنين قل أالذكرين حرم أم الأنثيين ...... ومن البقر اثنين قل أالذكرين حرم أم الأنثيين ﴾

(سورة الأنعام: پاره ۸)

ترجمہ: '' آٹھ نر و مادہ یعنی بھیڑ میں دو قسم اور بکری میں دو قسم، آپ ﷺ کہہ دیں کہ کیا اللہ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو...... اور گائے میں دو قسم، آپ ﷺ کہہ دیں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو۔''

مشہور مفسرِ قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

ثم بين اصناف الانعام الى غنم ...... الابل ذكورها واناثها وبقر كذلك وانه تعالى لم يحرم شيئا من ذلك ولا شيئا من اولادها بل كلها مخلوقة لبني ادم اكلا وركوبا وحمولة وحلبا وغير ذلك من

وجوه المنافع . (تفسیر ابن کثیر : ۲/ ۸۳)

ترجمہ: ''پھر اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی اقسام کو بیان کیا ...... حتیٰ کہ اونٹ اس کا نر و مادہ اور اسی طرح گائے بھی ، بے شک اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اور ان کی اولاد میں سے کسی کو بھی حرام نہیں کیا بلکہ یہ سارے کے سارے بنی آدم کے کھانے ، سواری ، بار برداری اور دودھ وغیرہ منافع کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔''

اس لیے گائے کے حلال ہونے میں شک کرنا صحیح نہیں اور خنزیر کو بعض حیوانات کی طرح حرام قرار دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قل لا أجد فی ما أوحی الی محرما علی طاعم یعطمه' إلا أن یکون میتة او دما مسفوحا أو لحم خنزیر فإنه رجس أو فسقا﴾

(سورة الانعام : پاره ۸)

ترجمہ: ''آپ ﷺ فرمادیں کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں جو مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون یا گوشت سؤر کا کہ وہ ناپاک اور ناجائز ہے۔''

اور اسی پر امت کا اجماع ہے، علامہ دمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''خنزیر نجس العین ہے اور اس کا کھانا حرام ہے اور اس کی خرید وفروخت بھی جائز نہیں۔''

(حیات الحیوان اردو : ۲/ ۶۱ الخنزیر)

خنزیر کی حرمت پر قرآنی آیات، احادیث نبویہ، آثار صحابہ وتابعین اس کثرت سے دال ہیں کہ کسی بھی مسلمان کے لیے ان کے ہوتے ہوئے اس کا کھانا حلال نہیں۔

شریعت جس چیز کو حرام کرتی ہے اس میں اس حکم کے علاوہ دیگر مضرات بھی ہوتے ہیں جو انسانی بدن یا اس کے اخلاق کے لیے صحیح نہیں ہوتے ، چنانچہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ خنزیر کی حرمت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

1- اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خور، بے غیرت اور دیوث ہے۔ اب اس کے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ ایسے پلید اور برے جانور کے گوشت کا اثر (انسانی) بدن اور روح پر بھی پلید ہی ہوگا کیونکہ یہ بات ثابت شدہ اور مسلم ہے کہ غذاؤں کا اثر بھی

انسان کی روح پر ضرور ہوتا ہے، پس اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد جانور کے گوشت کا اثر بھی برا ہی ہوگا، جیسا کہ یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس جانور کا گوشت بالخاصہ حیا کی قوت کو کم کر دیتا ہے اور دیوثی کو بڑھاتا ہے، پس جب کہ یہ امر مسلم ہے کہ تغیر بدن و تغیر اخلاق کے اسباب میں سے زیادہ تر قوی سبب غذا ہے، لہٰذا ایسے جانور کا گوشت کھانے سے شریعتِ اسلامیہ نے منع فرمادیا۔

2- خنزیر یعنی خوک نجاست کی طرف بہت زیادہ مائل ہے خصوصاً انسان کا فضلہ یعنی براز اس کی خوراک ہے اس کا گوشت اسی نجاست سے پیدا ہوتا ہے، پس اس کا گوشت کھانا گویا اپنی نجاست کھانا ہے۔

3- صاحبِ مخزن الادویہ فسادِ گوشت خوک (خنزیر) اور اس کی حرمت کی تیرہ وجوہِ ذیل میں تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس جانور کا گوشت فطرتِ انسانی کے برخلاف ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''گوشت خوک موار خلط غلیظ است و مورث حرص شدید وصداع مزمن، دوادالفیل، واوجاع المفاصل وفسادِ عقل و زوال، مروت و غیرت وحمیت و باعثِ فحش است و اکثرے از فرق غیر اسلامی آں رامی خورند وقبل از ظہور نورِ اسلام گوشت آں را در بازار ہامی فروختند و بعد ازاں در مذہب اسلام حرام و بیع آں ممنوع وموقوف گردید بسیار کثیف و بدہیئت است۔''

(احکام اسلام عقل کی نظر میں : ۲۰٤)

4- سؤر کا گوشت ایک بیماری کا باعث بنتا ہے جو کہ آنکھوں کی ایک بیماری ہے اور اس کا نام ٹرکن اوسس ہے جو کہ صحرائی آب وہوا میں بہت جلد اثر کرتی ہے۔

باقی رہا مسئلہ گائے وغیرہ کا تو مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

1- یہ سارے جانور دراصل مزاجِ انسانی کے موافق اور ستھرے ومعتدل المزاج ہوتے ہیں اس لیے حلال ٹھہرائے گئے ہیں اور ان جانوروں کو خدا تعالیٰ نے بہیمۃ الانعام فرمایا ہے اور اسی توافق واعتدال کے سبب دنیا میں زیادہ تر انہیں جانوروں کا گوشت بنی آدم استعمال کرتے ہیں، فطرتِ انسانی اس امر کی مقتضی ہے کہ جیسا کہ بنی آدم کی خوراک کا کچھ حصہ نباتات سے ہوتا ہے ایسا ہی کچھ حصہ اس کا حیوانات سے ہو اور اس کی خوراک کے لیے حیوانات بھی وہ مقرر ہوتے

مناسب تھے جو اس کے مزاج کے موافق ہوں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی کیا۔

2- جبکہ انسان جامع جلال و جمال ہے تو اس کی خوراک میں بھی جلال و جمال دونوں کا ہونا مناسب تھا، لہٰذا انسان کی خوراک کے لیے وہ جانور مقرر ہوئے جن میں جلال و جمال ہر دو صفات موجود ہیں۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں : ۲۱۷)

مزید تفصیل کے لیے "حیات الحیوان" از علامہ دمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرف مراجعت کریں، مسلمان کے لیے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا حکم کافی ہے۔

(ماخوذ از فتاویٰ حقانیہ : ٦/٤٥٤)

علامہ صابونی صاحب خنزیر کے گوشت حرام ہونے کی علتیں تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن جهة الاخرى : فإن من خصائص الخنزير وطباعه ، عدم الغيرة على اناثه ، فمن اكل لحمه ، اصابه من طباعه ، ففقد الغيرة التى هى من اكبر المزايا الانسانية ، والشاهد على ذلك حال الشعوب الاوروبية والاميركية ، الذين يستبيحون اكله ومن يقلدهم ويتطبع بطباعهم .

یعنی خنزیر کی خاصیت اور طبیعت یہ ہے کہ اس کو اپنی مادہ پر غیرت نہیں آتی لہٰذا جو شخص خنزیر کا گوشت استعمال کرے گا وہ بھی ضرور بے غیرت بن جائے گا، کیونکہ انسان جو غذا استعمال کرتا ہے اس کا اثر اس کی طبیعت پر پڑتا ہے، اس پر یورپ، امریکہ اور دیگر غیر مسلم خنزیر خور اقوام کے حالات شاہد ہیں، اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے خنزیر کے کسی بھی جز کو استعمال کرنے سے اجتناب کریں۔

فإنهم لا يعرفون للغيرة معنى ، ولا للشرف قيمة ، بل يعيبون الغيور ، ويعدونه غريبا ، ويقولون : إن الغيرة هي خلق الرجعيين ، ولا تليق بالإنسان المتحضر ، لذلك فإنهم يرون زوجاتهم وبناتهم في أحضان الفجار والفساق ، يراقصن من يشأن من الرجال ، وربما وصل الحال بهن إلى الممارسة الجنسية ، ولا يتحرك عندهم ساكن ، ولا غيرة على العرض والشرف ، ولعمر الحق إن هذه لهي الجاهلية

الكبرى " جاهلية القرن العشرين " التي تشمئز منها النفوس الكريمة ، وأصحاب الضمائر السليمة ، ولا كرامة للإنسان إذا فقد المروءة والشرف !!

ضب (گوہ) کے استعمال کا حکم:

ضب جس کو فارسی میں سوسمار اور اردو زبان میں گوہ کہا جاتا ہے رسول اللہ ﷺ نے اس کے استعمال سے منع فرمایا ہے اس لیے اسکا استعمال مکروہ تحریمی ہے، البتہ دوسرے ائمہ اس کی حلت کے قائل ہیں، ان کا مستدل بھی بعض احادیثِ مبارکہ ہیں جو گوہ کی حلت پر دال ہیں لیکن احناف فرماتے ہیں: جب کسی مسئلہ میں حلت وحرمت کا تعارض ہو جائے تو حرمت کو ترجیح ہوتی ہے، لہٰذا حرمت والی احادیث راجح ہوں گی۔

قال العلامة الصابوني حفظه الله : يباح أكل لحم الضب ، وهذا رأي جمهور الفقهاء ، وكرهه بعض الفقهاء ، لأن النبي صلى الله عليه وسلم عافه ولم يأكل منه ، ولو كان طيباً لأكله ، وحجتهم في كراهية أكله ما روي عن عائشة رضي الله عنها : " أن النبي صلى الله عليه وسلم أهدي له ضب فامتنع عن أكله ." (أخرجه اصحاب السنن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو 'ضب' گوہ کھانے کیلئے پیش کیا گیا آپ ﷺ نے کھانے سے انکار فرمایا،

وفي رواية عن أبي الزبير قال : سألت جابراً عن الضب ؟ فقال : " لا تطعموه ـ أي لا تأكلوه ـ وقذره ، وقال عمر بن الخطاب : إن النبي صلى الله عليه وسلم لم يحرمه " (أخرجه مسلم رقم ١٩٥٠ في كتاب الصيد) وأما حجة الجمهور الذين أباحوا أكله فهو ما رواه مسلم في صحيحه عن ابن عباس : " أن خالد بن الوليد ـ الذي يقال له : سيف الله ـ أخبره ، أنه دخل مع رسول الله صلى الله عليه وسلم على ميمونة زوج النبي صلى الله عليه وسلم وهي خالة ابن

عباس، فوجد عندها ضبا محنوذا ـ أي مشويا ـ فقدمت الضب لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فأهوى يده إلى الضب، فقالت امرأة: أخبرن رسول الله صلى الله عليه وسلم بما قدمتن له، قلن يا رسول الله صلى الله عليه وسلم: هو الضب !!

فرفع رسول الله صلى الله عليه وسلم يده، فقال: خالد بن الوليد: أحرام الضب يا رسول الله !! قال: لا، ولكنه لم يكن بأرض قومي، فأجدني أعافه !!

قال خالد: فاجتررته فأكلته، ورسول الله صلى الله عليه وسلم ينظر، فلم ينهني."

(أخرجه مسلم فی صحیحه رقم ١٩٤٣ باب اباحة الضب)

فقول الرسول صلى الله عليه وسلم: ليس بحرام نص واضح صريح، على حل أكله، ولكن الرسول صلى الله عليه وسلم لم يعتد عليه، فلم يأكله لذوقه الرفيع صلى الله عليه وسلم، وعافته نفسه، ولم يحرمه، وأقر من أكله ولم ينهه، ولو كان حراما لنهاه عن أكله.

وأخرج الترمذي: عن ابن عمر أن النبي صلى الله عليه وسلم سئل عن أكل الضب، فقال: "لا أكله، ولا أحرمه"

قال الترمذي: وقد اختلف أهل العلم في أكل الضب، فرخص فيه بعض أهل العلم من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم وغيرهم، وكرهه بعضهم، ويروي عن ابن عباس أنه قال: "أكل الضب على مائدة رسول الله صلى الله عليه وسلم تقذرا" أي تركه كراهية له، لبشاعة منظره، حيث يشبه الزواحف من الثعابين والأفاعي، ونفوره عليه السلام منه، لأنه لم يكن في أرض قومه، ولم يتعود عليه، مع أنه حلال، ولو كان حراماً لمنع أصحابه من أكله.

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالیٰ: ويكره أكل الضبع

والضب والسلحفاة والزنبور والحشرات كلها .

(الهداية : ٤/ ٤٤٠ كتاب الذبائح)

حشرات الارض (کیڑے مکوڑے) کا حکم:

کیڑے مکوڑے جتنے اقسام کے ہیں چونکہ ان کا استعمال انسانی صحت کے لیے مضر ہے، اس لیے ان کا کھانا حرام ہے جیسے، سیہ، کیچوا، چوہے، مینڈک، سانپ، بچھو، چھپکلی، ممولہ، نیولہ اور دیگر زمین پر چلنے والے دیگر چھوٹے بڑے، کیڑے مکوڑے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث ﴾

قال ابوبكر الحصاص : ذكر القنفذ عند رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال خبيثة من الخبائث : فشمله حكم التحريم بقوله تعالىٰ : ﴿ ويحرم عليهم الخبائث ﴾ والقنفذ من حشرات الأرض ، وكل ما كان من حشراتها فهو محرم قياسا عليه .

(أحكام القرآن للامام الحصاص : ٣/ ٢١)

ابوبکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے قنفد (سیہ) کا تذکرہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ خباثت میں سے ایک خبیث ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ ويحرم عليهم الخبائث ﴾ میں داخل ہے۔

موذی جانوروں کو قتل کرنے کا حکم:

بعض جانور انتہائی موذی ہوتے ہیں ان کو قتل کرنے کی ہر وقت اجازت ہے۔

كما روي عن ابن عباس وعبد الله بن عمر رضي الله تعالىٰ عنه وغيرهما " خمس من الفواسق يقتلن في الحل والحرم ، الغراب ، والحدأة ، والعقرب ، والفارة والكلب العقور .

(الحديث اخرجه البخارى رقم ٩٢٦ ، ومسلم رقم ٦٩ والترمذى رقم ٨٣٧)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ پانچ قسم کے حیوانات ایذاء پہنچانے والے ہیں ان کو حرم میں اور حرم کے باہر ہر جگہ قتل کیا جائے گا،

۱۔ کوا ۲۔ چیل ۳۔ بچھو ٤۔ چوہا ٥۔ باؤلہ کتا

کوا کھانے کا حکم:

کوے کو عربی میں ''غراب'' کہا جاتا ہے، فقہاءِ کرام کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تین قسمیں ہیں:

1- بعض کوئے ایسے ہوتے ہیں جو صرف مردار اور نجس چیزیں کھاتے ہیں، غراب (کوے) کی یہ قسم حرام ہے۔

2- دوسری قسم کے کوئے وہ ہیں جو کھانے میں صرف دانے (پاکیزہ چیزیں) استعمال کرتے ہیں، مردار نہیں کھاتے ان کا کھانا حلال ہے۔

3- کووں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جس کی خوراک حرام اور حلال سے مرکب ہوتی ہے، یعنی مردار بھی کھا لیتے ہیں اور پاکیزہ چیزیں بھی قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ اگر چہ اس کی کراہت کے قائل ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حلال ہے اور فتویٰ آپ رحمہ اللہ ہی کے قول پر ہے۔

لما قال العلامه فخر الدين عثمان بن على الزيلعى رحمه الله:

والغراب ثلاثة انواع يأكل الجيف فحسب فإنه، لا يؤكل ونوع يأكل الحب فقط فإنه، يؤكل ونوع يخلط بينهم وهو ايضاً يؤكل عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ وهو العقعق لانه، كالدجاج وعن ابى يوسف رحمه الله تعالىٰ انه يكره لان غالب ماكوله الجيف والأول اصح ـ انتهى. (تبيين الحقائق ٥/٢٩٥ كتاب الذبائح)

قال العلامة ابن همام رحمه الله تعالىٰ: وفي الذخيرة واما الغراب الابقع والاسود فهو انواع ثلاثة نوع يلتقط الحب ولا يأكل الجيف وانه لا يكره ونوع منه لا يأكل الا الجيف وإنه مكروه ونوع يختلط الحب بالجيف ياكل الحب مرة والجيف الاخرى وإنه غير مكروه عند ابيٍ حنيفة وعند ابي يوسف رحمه الله تعالىٰ يكره الغداف وهو غراب القيظ ويكون ضخما وافرابجاحين. (فتح القدير: ٨/٤١٩)

کیڑ الگا ہوا پھل یا اناج کھانا:

سوال: جس پھل میں کیڑ الگا ہوا اس کا کھانا کیسا ہے؟ نفع المفتی والسائل سے بغرضِ تصدیق ایک سوال اور جواب پیش خدمت ہے:

الاستفسار: هل يحل اكله الدود التي تكون في التفاح وغيره معه.

الاستبشار: نعم لتعسر الاحتراز منه واما إذا فردت واكلت فحكمها حكم الذباب كذا في مطالب المؤمنين. (نفع المفتي والسائل: ص ١١٠) بينوا توجروا

جواب: کیڑا نکال کر پھل کھانا حلال ہے، کیونکہ حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نفع المفتی والسائل کا جواب صحیح نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: ولا بأس بدود الزنبور قبل ان ينفخ فيه الروح لان مالا روح له لا يسمى ميتة خانية وغيرها قال ط ويؤخذ منه ان اكل الجبن او الخل او الثمار كالنبق بدوده لا يجوز ان نفخ فيه الروح. (ردالمحتار: ١٩٤/٥)

جیلی کی تحقیق:

سوال: ڈبل روٹی پر جیلی لگا کر کھاتے ہیں، بعض لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں کیونکہ یہ جانور کی کھال اور ہڈی سے بنتی ہے، آپ کی تحقیق کیا ہے؟ بینوا توجروا

جواب: اولاً جیلی کا ہڈی اور کھال سے بنایا جانا ضروری نہیں، درختوں کے پتوں وغیرہ سے بھی بنائی جاتی ہے۔

ثانیاً اگر کھال وغیرہ سے بنائی گئی ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ کھال مردار ہی کی ہو، حلال ذبیحہ کی کھالیں غالب ہیں۔

ثالثاً جیلی کی صنعت میں تبدیل ماہیت کا احتمال بھی ہے، اس صورت میں حرام جانور کی کھال سے بنی ہوئی جیلی بھی حلال ہے۔

زیادہ تجسس اور کھود کرید کرنا اور احتمالات واوہام کی بناء پر احتراز کرنا دین میں تعمق وغلو ہونے

کی وجہ سے ممنوع ہے اور بلا دلیل شرعی حرمت کا حکم لگانا دین میں زیادتی اور تحریف ہے۔

(ماخوذ از احسن الفتاوی)

چائے میں مکھی گرنا:

سوال: گرم چائے میں مکھی گر جائے تو اس کو غوطہ دے کر چائے پینا حلال ہے یا حرام؟ البحر کے مندرجہ ذیل جزئیہ سے حلت معلوم ہوتی ہے:

ومعنى امقلوه اغمسوه وجه الاستدلال به ان الطعام قد يكون حارا فيموت بالغمس فيه فلو كان يفسده لما امر النبي صلى الله عليه وسلم ليكون شفاء لنا إذا اكلناه . (البحر الرائق : ١/٨٨)

جواب: مکھی دوسرے حشرات الارض کی طرح حرام ہے، اگر کھانے پینے کی کوئی چیز اتنی گرم ہو کہ مکھی کے اجزاء اس میں حل ہو جانے یا اس کا عرق شامل ہو جانے کا ظن غالب ہو جائے تو حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ تعالی کی تصریح کے مطابق اس کا استعمال حرام ہوگا۔

جزئیہ بحر اس صورت پر محمول ہے کہ مکھی کے اجزاء یا عرق کے اختلاط کا ظن غالب نہ ہو۔ چونکہ حشرات الارض کی حرمت کی اصل علت استخباث ہے اور یہ قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے، طعام وشراب کثیر مقدار میں ہو تو یہ علت نہیں پائی جاتی، لہٰذا بڑی دیگ میں مکھی گر جائے تو اس کا استعمال جائز ہے، نیز اگر شربت، لسی وغیرہ ٹھنڈی چیز میں مکھی گر جائے تب بھی مکھی نکال کر پھینک دی جائے اس کے بعد شربت کا استعمال جائز ہے۔

قال الإمام ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ : روي عن محمد رحمه الله تعالىٰ إذا تفتت الضفدع فى الماء كرهت شربه لا للنجاسة بل لحرمة لحمه وقد صارت اجزاؤه فيه وهذا تصريح ، أن كراهة شربه تحريمية وبه صرح فى التجنيس فقال يحرم شربه .

(فتح القدير : ١/٥٨)

وكذا قال العلامة ابن نجيم رحمه الله تعالىٰ .

(البحر الرائق : ١/٨٩)

وقال أيضا : واعلم ان كل ما لا يفسد الماء لا يفسد غير الماء

وهو الاصح كذا في المحيط والتحفة والاشبهه بالفقه كذا في البدائع لكن يحرم اكل هذه الحيوانات المذكورة، ماعدا السمك الغير الطافي لفساد الغذاء وخبثه متفسخا او غيره وقد قدمناه عن التجنيس. (البحر الرائق ١/ ٩٠) - (احسن الفتاوی بتغير يسير)

جلالہ (نجاست خور جانور) کا حکم:

بعض جانوروں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نجاست کھاتے ہیں، یعنی ان کی غذا کا اکثر حصہ گندگی ہوتی ہے، جس سے ان کے گوشت میں بو پیدا ہو جاتی ہے، ایسے جانوروں کے گوشت کھانا مکروہ ہے، لہٰذا فقہاءِ کرام نے جواز کا یہ طریقہ ذکر فرمایا ہے کہ ایسے جانور کو ذبح سے پہلے مناسب مدت کے لیے بند کر کے پاکیزہ غذا چارہ کھلایا جائے وہ مدت جس گائے، بھینس، اونٹ کے لیے دس دن ہے، بکری وغیرہ کے لیے چار دن، مرغی کے لیے تین دن ہے۔ اس مدت میں صاف غذا استعمال کرنے کی وجہ سے گوشت پاکیزہ ہو جائے گا لہٰذا کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔

قال الفقهاء: تزول الكراهةُ بحبسها، وعلفها عشرة أيام، في الإبل والبقر، وأربعه أيام في الشياه والأغنام، ثلاثة أيام في الدجاج.

(الدر المختار: ٥/ ١٧٢)

وحجتهم في كراهية أكلها ما رواه الترمذي عن ابن عمر رضي الله تعالىٰ عنه قال: " نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ...... الجلاله وألبانها." (أخرجه الترمذي رقم ١٨٢٤ باب ما جاء في أكل لحوم الجلالة والبانها)

ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جلالہ کے گوشت کھانے اور دودھ پینے سے منع فرمایا ہے،

وهذا نهي كراهية لا نهي تحريم.

وروي أيضاً عن ابن عباس رضي الله عنه: "أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن المجثمة، ولبن الجلالة، وعن الشرب من في - أي فم - السقاء.

(أخرجه الترمذي رقم ١٨٢٥ وقال : هذا حديث صحيح)

المجثمة : الحيوان الذي يحبس لا صقًا بالأرض ، ويرمى عليه حتى يموت ، والجلالة التي معظم علفها من القمامات والنجاسات.

قال في الموسوعة الفقهية : الجلالة : هي التي تأكل الجلة ـ أي العذرة والنجاسة ـ ويكره أكل لحمها ، سواء كانت من الإبل ، أو البقر ، أو الغنم ، أو الدجاج ، أو غير ذلك ، لأنها نتن ، فلا بد لمن أراد ذبح الجلالة ، أن يحبسها أياما ، حتى تذهب عنها الرائحة الكريهة ، ويطيب لحمها ، وقد قدرت مدة الحبس ، بثلاثة أيام للدجاجة ، وأربعة أيام للشاة ، وعشرة أيام للإبل والبقر .

(الموسوعة الفقهية للشيخ خليل كونانج ١٣٧/١)

جانوروں میں سات چیزیں حرام ہیں:

حلال جانوروں کے اندر سات چیزیں حرام ہیں:

1- بہتا خون 2- مذکر کی پیشاب گاہ

3- خصیتین (کپورے) 4- مونث کی پیشاب گاہ

5- غدود 6- مثانہ 7- پتہ

قال فی الهندية : واما بيان ما يحرم اكله من اجزاء الحيوان سبعة الدم المسفوح والذكر والانثيان ، والقبل والغده والمثانة ، والمراره كذا فی البدائع . (عالمگيرية : ٢٩٠/٥)

سمندری جانوروں کا حکم:

سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی ہی ایسا جانور ہے کہ اس کے گوشت کو حلال و پاکیزہ قرار دیا ہے، اس کے حلال ہونے کے لیے ذبح کی ضرورت نہیں۔

لقوله عليه السلام : احلت لنا ميتتان ودمان : اما الميتتان ، فالسمك والجراد ، واما الدمان : فالكبد والطحال .

(اخرجه ابن ماجه رقم : ٢٣٥٧ ورواه احمد والشافعی)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے لیے (یعنی امت محمدیہ ﷺ کے لیے) دو مردار اور دو خون حلال کیے گئے ہیں مردار تو مچھلی اور ٹڈی ہے، اور دو خون جگر اور کلیجی ہے۔

سمندری جانوروں میں سے صرف مچھلی ہی حلال ہے یا اس کے علاوہ کوئی اور جانور بھی حلال ہے؟ اس میں فقہاءِ کرام کے آپس میں کچھ اختلاف ہیں،

تفصیل کے لیے استاذِ محترم مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہم کی ایک تحریر پیش خدمت ہے جو انہوں نے حدیث مذکورہ کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے:

"یہاں پر کئی مسائل بحث طلب ہیں، پہلا مسئلہ یہ ہے کہ سمندر کے کون کون سے جانور حلال اور کونسے حرام ہیں؟ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ خنزیر بحری کے سوا تمام مائی جانور حلال ہیں، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ سمک (مچھلی) کے علاوہ تمام جانور حرام ہیں اور سمک طافی بھی حلت سے مستثنیٰ ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ سے اس بارے میں چار اقوال منقول ہیں:

1- حنفیہ کے مطابق

2- جتنے جانور خشکی میں حلال ہیں ان کی نظیریں سمندر میں بھی حلال ہیں اور جو خشکی میں حرام ہیں وہ سمندر میں بھی حرام ہیں، مثلاً بقر بحری (دریائے گائے) حلال اور کلب بحری (کتا) حرام ہے اور جس بحری جانور کی خشکی میں نظیر نہ ہو تو وہ حلال ہے۔

3- ضفدع، تمساح، سلحفاۃ، کلب بحری اور خنزیر بحری حرام ہیں، باقی تمام جانور حلال ہیں۔

4- ضفدع (یعنی مینڈک) کے سوا تمام بحری جانور حلال ہیں۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ کے اس آخری قول کو ترجیح دے کر اسے شافعیہ کا مفتی بہ قول قرار دیا ہے۔

وقال بعض الفقهاء وابن ابى ليلىٰ انه يحل اكل ما سوى السمك، من الضفدع، والسرطان ،وحية الماء وكلبه وخنزيره ونحو ذلك لكن بالذكاة وهو قول الليث بن سعد الافى انسان الماء وخنزيره فانه لا يحل . (بذل المجهود: ١/٥٤)

مالکیہ اور شافعیہ کے دلائل یہ ہیں:

1- ﴿ احل لکم صید البحر و طعامه ﴾ اس آیت قرآنی میں لفظ ''صید'' عام ہے، اس لیے ہر جانور حلال ہوگا۔

2- ترمذی کی حدیث باب میں " الحل میته '' " کے الفاظ ہر میتۃ ماء کی حلت بیان کرر ہے ہیں۔

3- حدیث العنبر سے بھی مالکیہ اور شوافع کا استدلال ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ ہم ایک عرصہ دراز تک ایک سمندری جانور کھاتے رہے، جس کا نام عنبر تھا۔ باب غزوۃ سیف البحر میں بخاری کی اس روایت میں الفاظ یہ ہیں:

" فالقی لنا البحر دابة یقال له العنبر فاکلنا منه نصف شهر الخ ."

اس روایت میں لفظ دابہ بتلا رہا ہے کہ وہ جانور مچھلی کے علاوہ اور کوئی چیز تھی۔

پھر امام مالک رحمہ اللہ آیت قرآنی ﴿ ولحم الخنزیر ﴾ کے عموم کی وجہ سے خنزیر بحری کو حلت سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور امام شافعی رحمہ اللہ احادیث النہی عن قتل الضفدع کی بناء پر ضفدع کو حلت سے مستثنیٰ کرلیتے ہیں:

ان کے مقابلہ میں حنفیہ کے دلائل یہ ہیں:

1- " ویحرم علیهم الخبائث " علامہ عینی رحمہ اللہ نے اسی آیت قرآنی سے مسلک حنفیہ پر استدلال کیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ خبائث سے مراد وہ مخلوقات ہیں جن سے طبیعت انسانی گھن کرتی ہو اور مچھلی کے علاوہ سمندر کے دوسرے تمام جانور ایسے ہیں جن سے طبیعت گھن کرتی ہے، لہٰذا سمک کے علاوہ دوسرے دریائی جانور خبائث میں داخل ہوں گے۔

2- ﴿ حرمت علیکم المیتة ﴾ اس سے معلوم ہوگا کہ ہر میتہ حرام ہے، سوائے اس میتہ کے جس کی تخصیص دلیل شرعی سے ثابت ہوگئی ہو۔

3- ابوداؤد، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ میں مشہور مرفوع روایت ہے:

" عن عبد الله بن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال احلت لنا میتتان و دمان فاما المیتتان فالحوت و الجراد واما الدمان فالكبد و الطحال (لفظه لابن ماجة : ٢٣٨ باب الكبد و الطحال)

وقد اخرجه (الحافظ) في التلخيص الحبير مرفوعا و موقوفا وصحح الموقوف اخرجه من حديث زيد بن اسلم عن ابن عمر عند الشافعي واحمد وابن ماجة والدار قطني والبيهقي وابن عدي وابن مردويه في تفسيره ونقل تصحيح الموقوف من الدارقطني وابي زرعة وابي حاتم. (معارف السنن: ١/٢٥٧)

یہاں استدلال بعبارۃ النص ہے کیونکہ سیاقِ کلام حلت وحرمت کے بیان کے لیے ہوا اور تعارض کے وقت استدلال بعبارۃ النص راجح ہوتا ہے، کما تقرر فی اصول الفقہ، لہٰذا اس حدیث سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ میتہ یعنی وہ جانور جن میں دم سائل نہیں ہوتا، اس کی صرف دو قسمیں حلال ہیں، جراد اور حوت (یعنی مچھلی اور ٹڈی) چونکہ سمندر کے دوسرے جانور ان دو قسموں میں داخل نہیں، اس لیے وہ حرام ہیں۔

4- سب سے اہم بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ میں آپ سے اور آپ ﷺ کے بعد صحابہ کرام سے ایک مرتبہ بھی سمک کے علاوہ کسی اور دریائی جانور کا کھایا جانا ثابت نہیں، اگر یہ جانور حلال ہوتے تو آپ ﷺ کبھی نہ کبھی بیانِ جواز کے لیے ہی سہی ضرور تناول فرماتے: "وإذ ليس فليس."

رہا شافعیہ اور مالکیہ کا آیتِ قرآنی ﴿ احل لكم صيد البحر ﴾ سے استدلال سو اس کا جواب تو یہ ہے کہ اس سے خود شوافع کا استدلال اس وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ صید کو مصید کے معنی میں لیا جائے اور اضافت کو استغراق کے لیے لیا جائے، حالانکہ مصدر کو اسم مفعول کے معنی میں لینا مجاز ہے، اور بلا ضرورت مجاز کی طرف رجوع کی حاجت نہیں، اسی لیے احناف اس بات کے قائل ہیں کہ یہاں لفظ صید اپنے حقیقی یعنی مصدری معنیٰ پر ہی محمول ہے اور سیاق بھی اس پر شاہد ہے، کیونکہ ذکر ان افعال کا چل رہا ہے جو محرم کے لیے جائز یا ناجائز ہوتے ہیں، لہٰذا یہاں منشاء صرف یہ بتلانا ہے کہ سمندر میں شکار کرنا جائز ہے اس سے کھانے کی حلت ثابت نہیں ہوتی۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر بالفرض یہاں پر صید مصید ہی کے معنی میں ہو تو بحر کی طرف اس کی اضافت استغراق کے لیے نہیں ہے، بلکہ عہدِ خارجی کے لیے ہوگی، لہٰذا ایک مخصوص شکار یعنی مچھلی مراد ہے جس کا حلال ہونا دوسرے دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکا ہے اور یہ ایسا ہی ہے

جیسے ﴿ حرم علیکم الصید البر ما دمتم حرما ﴾ میں اضافت بالاتفاق عہد کے لیے ہے۔

جہاں تک حدیث باب سے شوافع اور مالکیہ کے استدلال کا تعلق ہے سو اس کا ایک جواب تو وہی ہے کہ میتہ میں اضافت استغراق کے لیے نہیں بلکہ عہد خارجی کے لیے ہے اور عہد اصل ہے لہٰذا اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہوا کہ سمندر کے وہ مخصوص میتے حلال ہیں جن کے بارے میں حلت کی نص آچکی ہے اور وہ "سمك" ہے۔

اس حدیث کا دوسرا جواب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ اگر اضافت کو استغراق کے لیے ہی مانا جائے تو الحل سے مراد یہاں حلال ہونا نہیں بلکہ ظاہر ہونا ہے اور لفظ حل کلام عرب میں بکثرت طاہر ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ بخاری کی ایک مشہور حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں:

"حتی بلغنا سد الروحاء حلت فبنی بها الخ "الحدیث اخرجه البخاری فی صحیحه : ۱/ ۲۱۸ فی اخر کتاب البیوع عن انس بن مالك تحت باب هل یسافر بالجاریة قبل أن یستبرئها ."

اس حدیث میں لفظ "حلت" باتفاق "طہرت" کے معنی میں ہے، اسی طرح حدیث باب میں لفظ "حل" طہر کے معنی میں ہے اور اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ سلسلۂ کلام طہارت ہی سے چلا آرہا ہے، صحابہ کرام کو یہ شبہ تھا کہ سمندر میں مرنے والا جانور ناپاک ہو جاتا ہے، اس شبہ کو ختم کرنے کے لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ سمندر کا میتہ طاہر رہتا ہے۔

شافعیہ و مالکیہ کا تیسرا استدلال حدیث العنبر سے تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں اس حدیث کے اندر "فالقی البحر حوتاً میتاً" کے الفاظ آئے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری روایت میں دابہ سے مراد بھی حوت ہے۔ صحیح بخاری کی روایات میں "حوت" اور "دابہ" دونوں طرح کے الفاظ آئے ہیں۔ (کتاب المغازی: ۲/ ۶۲۶)

سمک طافی:

یہاں دوسرا مسئلہ سمک طافی کی حلت و حرمت کا ہے، طافی اس مچھلی کو کہتے ہیں جو پانی میں بغیر کسی خارجی سبب کے طبعی موت مر کر الٹی ہوگئی ہو، ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ ایسی مچھلی کو حلال کہتے ہیں، جبکہ امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کی حرمت کے قائل ہیں،

یہ ہی مسلک ہے حضرت علی، ابن عباس، جابر رضی اللہ عنہم، ابراہیم نخعی، شعبی، طاؤس اور سعید بن المسیب رحمہم اللہ کا ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا ایک استدلال حدیث باب سے ہے کہ وہ ''الحل میتۃ'' سے غیر مذبوح مراد لیتے ہیں اور حدیث میں اس کی حلت کا حکم دیا گیا ہے ان کا دوسرا استدلال حدیثِ عنبر سے ہے کہ وہ صحابہ کرام کو مری ہوئی ملی تھی، اس کے باوجود وہ اسے نصف ماہ تک کھاتے رہے، تیسرا استدلال حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے ہے جو سنن بیہقی اور دار قطنی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (کمافی معارف السنن : ۱/ ۲۵۷) اس اثر میں سمک طافی کو حلال قرار دیا گیا ہے۔

حنفیہ کا استدلال ابوداؤد اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے:

"قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ما القی البحر او جزر عنه فکلوه وما مات فیه وطفا فلا تأکلوه."

(کتاب الاطعمه : ۲/ ۵۳۴ باب اکل سمك الطافی)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو سمندر نے باہر ڈال دیا یا جس سے پانی خشک ہو گیا اسکو کھاؤ، اور جو پانی میں مر کر الٹی ہو گئی ہے اسکو مت کھاؤ۔

امام ابوداؤد نے یہ روایت مرفوعاً و موقوفاً دونوں طرح روایت کی ہے، پھر طریق موقوف کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرفوع روایت بھی تمام تر ثقات سے مروی ہے اور ثقہ کی زیادتی مقبول ہوتی ہے اس لیے اس کو مرفوع ماننے میں کوئی اشکال نہیں اور اگر موقوف طریق کو ہی صحیح مانیں تب بھی چونکہ مسئلہ غیر مدرک بالقیاس ہے اس لیے یہ حدیث مرفوع ہی کے حکم میں ہوگی۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں، کیونکہ ضعف کی وجہ ابن سلیم کا ضعف بیان کی ہے، (کما فی معارف السنن : ۱/ ۲۶۰) حالانکہ ابن سلیم صحیحین کے راوی ہیں، لہٰذا ان کی یہ تضعیف درست نہیں، ابن الجوزی رحمہ اللہ نے مرفوع کو اسماعیل بن امیہ کی وجہ سے ضعیف کہا ہے حالانکہ ان کو مغالطہ لگا ہے۔ یہ اسماعیل بن امیہ ابوالصلت نہیں جو ضعیف ہیں، بلکہ اسماعیل بن امیہ قرشی اموی ہیں، جو ثقہ ہیں مسلکِ حنفیہ کی تائید آیت

قرآنی ٭ حرمت علیکم المیتة ٭ سے بھی ہوتی ہے۔

شوافع کے دلائل کا جواب یہ ہے کہ "الحل میتته" میں میتہ سے مراد غیر مذبوح نہیں، بلکہ "ما لیس له نفس سائلة" ہے جیسا کہ "احلت لنا میتتان" میں میتہ سے یہی مراد ہے اور حنفیہ کی مستدل مذکورہ بالا حدیث کی بناء پر اگر یوں کہا جائے کہ سمک طافی اس سے مستثنیٰ ہے، تب بھی کچھ بعید نہیں یا پھر بقول حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ "الحل" سے مراد حلال نہیں بلکہ طاہر ہے۔

حدیث عنبر کا جواب یہ ہے کہ اس کے طافی ہونے کی تصریح نہیں ہے، طافی صرف اس مچھلی کو کہتے ہیں جو کسی خارجی سبب کے بغیر خود بخود سمندر میں مر جائے اور الٹی ہو جائے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی مچھلی کسی خارجی سبب کی وجہ سے مثلاً شدت حرارت یا شدت برودۃ سے یا تلاطم امواج سے یا کنارے پر پہنچ کر پانی کے دور چلے جانے کی وجہ سے مر جائے تو وہ طافی نہیں ہوتی اور اس کا کھانا حلال ہوتا ہے، حدیث عنبر میں بھی ظاہر یہی ہے کہ وہ مچھلی پانی کے چھوڑ کر چلے جانے کی بناء پر مری تھی، لہٰذا اس کی حلت محل نزاع نہیں۔

اب صرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اثر رہ جاتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو اس میں شدید اضطراب ہے، دوسرے اگر بالفرض اسے سنداً صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی وہ ایک صحابی کا اجتہاد ہو سکتا ہے، جو حدیثِ مرفوع کے مقابلہ میں حجت نہیں، تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں میتہ مچھلی سے مراد وہی سمک مراد ہو جو اسبابِ خارجیہ کی بناء پر مری ہو۔

جھینگا کی حلت وحرمت:

تیسرا مسئلہ جھینگا کی حلت وحرمت کا ہے، شافعیہ اور مالکیہ کے نزدیک تو اس کی حلت میں کوئی شبہ نہیں، لیکن حنفیہ کے نزدیک مدار اس بات پر ہے کہ وہ سمک ہے یا نہیں، یہ بات خاص طور سے علماءِ ہند کے درمیان مختلف فیہ رہی ہے، علامہ دمیری رحمہ اللہ نے "حیات الحیوان" میں اس کو سمک ہی کی ایک قسم قرار دیا ہے، اسی بناء پر بعض علماءِ ہند اس کی حلت کے قائل ہیں، جن میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ بھی داخل ہیں، چنانچہ انہوں نے "امداد الفتاویٰ" میں اس کی اجازت دی ہے، لیکن صاحب فتاویٰ حمادیہ اور بعض دوسرے فقہاء نے اسے سمک ماننے سے انکار کیا ہے۔

احقر نے علم الحیوان کے ماہرین سے اس کی تحقیق کی تو یہ سب اس بات پر متفق نظر آئے کہ

جھینگا، مچھلی نہیں ہے اور دونوں کے درمیان وہ نسبت ہے جو شیر اور بلی کے درمیان پائی جاتی ہے، مچھلی کی جو تعریف علم الحیوانات کی کتابوں میں مرقوم ہے، اس کی رو سے بھی جھینگا، مچھلی کے مصداق میں داخل نہیں ہوتا، وہ تعریف یہ ہے: ''وہ ریڑھ کی ہڈی والا جانور جو پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور گلپھڑوں سے سانس لیتا ہے'' اس میں جھینگا پہلی ہی قید سے خارج ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی، بعض علماءِ حیوانات نے تو اسے کیڑے کی ایک قسم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ عرفِ عام میں بھی اسے مچھلی نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ اگر کسی شخص کو مچھلی لانے کا حکم دیا جائے اور وہ جھینگا لے آئے تو اسے صحیح تعمیل کرنے والا نہیں سمجھا جاتا، ان وجوہ کی بناء پر راجح یہی ہے کہ وہ مچھلی نہیں ہے، لہٰذا اسے کھانا درست نہیں، جہاں تک علامہ دمیری رحمہ اللہ کا تعلق ہے تو وہ کوئی علم الحیوانات کے ماہر نہیں، بلکہ محض ناقل روایات ہیں اور انہوں نے حیات الحیوان میں ہر طرح کی رطب و یابس روایات جمع کر دی ہیں، اس لیے ان کا قول اس باب میں دوسرے ماہرین کے خلاف حجت نہیں، علاوہ ازیں جس مسئلہ میں حلت وحرمت کے ادلہ متعارض ہوں، وہاں جانبِ حرمت کو ترجیح ہوتی ہے، اس لیے اس کے کھانے سے پرہیز ہی لازم ہے۔

(درس ترمذی: ۲۷۹/۱)

وضاحت:

جھینگا کے متعلق حضرت استاذ محترم صاحب کی رائے شروع میں یہی تھی کہ اس کا کھانا مکروہِ تحریمی ہے، جیسا کہ اوپر کی تقریر سے واضح ہے لیکن چونکہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک جھینگا حلال ہے، اسی طرح حنفیہ میں سے بہت سے علماء اس کی حلت کے قائل ہیں اس لیے بعد میں اس موقف میں نرمی اختیار فرمائی، چنانچہ جھینگا کھانا مکروہ تحریمی ہونے کے ایک فتویٰ پر تصدیق فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''احقر کے نزدیک جواب صحیح ہے، اگرچہ دوسرے علماء کی تحقیق اس کے برخلاف بھی ہے، اس لیے اس مسئلے میں بہت تشدد بھی مناسب نہیں، تاہم حلت وحرمت کے مسائل میں اگر ادلہ متعارض ہوں تو حرمت کی جانب کو ترجیح دینا بہرصورت اولیٰ ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم''

لہٰذا جو لوگ اس کو مچھلی سمجھ کر کھاتے ہیں ان پر لعن طعن کرنا، یا حرام خوری کا الزام دینا یہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ جب کوئی مسئلہ ائمہ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہو تو اس میں کسی ایک

جانب تشدد کرنا درست نہیں جبکہ اس مسئلہ میں ائمہ ثلاثہ حلت کے قائل ہیں نیز فقہاء احناف بلکہ علماء ہند کے درمیان بھی مختلف فیہ ہے ہر دو فریق کے پاس دلائل موجود ہیں اور جولوگ استعمال کرتے ہیں ان کے لیے بھی یہی مشورہ ہے کہ تقویٰ کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اگر اجتناب کیا جائے تو اللہ تعالیٰ رزق میں برکت نازل فرمائیں گے۔ اس لیے جھینگا کے استعمال سے اجتناب کیا جائے یہی بہتر اور اولیٰ ہے۔

درندوں کی حرمت کا فلسفہ:

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض جانوروں کو حلال قرار دیا ہے، جبکہ دیگر بہت سارے جانوروں کو حرام قرار دیا ہے، مثلاً: شیر، گیدڑ، کتا، بلی وغیرہ اس میں کیا فلسفہ ہے؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مسلمان کے لیے کسی چیز کے بارے میں حلت وحرمت کا اعتقاد کسی فلسفے کے تحت نہیں ہونا چاہیے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھتے ہوئے ماننا ضروری ہے اللہ تعالیٰ کسی چیز کے بارے میں حلت وحرمت کا حکم بغیر کسی حکمت کے نہیں فرماتا۔

چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''سارے درندے جانور جن کی سرشت وفطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور حملہ سے زخم پہنچانا اور جن میں سخت دلی ہے سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا ہے: ''اویأ کل احد'' یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے یعنی اس کو کوئی نہیں کھاتا۔ وجہ حرمت ظاہر ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا، اسی واسطے ہر شکاری پرندے کے کھانے سے بھی آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا ہے۔'' (احکامِ اسلام عقل کی نظر میں صفحہ 205 کتاب الاکل والشرب)

خرگوش حلال جانور ہے:

کسی جانور کے حرام ہونے کے لیے شریعت نے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے، وہ خرگوش میں موجود نہیں، لہٰذا خرگوش کھانا حلال ہے، اس میں کسی شک وشبہ میں مبتلا ہونا درست نہیں۔

لما قال العلامة التمرتاشي رحمه الله تعالىٰ : وحل غراب الزرع الذي يأكل الحب (واللارنب والعقعق) .

(تنویر الابصار علی صدر ردالمحتار : ٣٠٨/٦ کتاب الذبائح)

چوری شدہ جانوروں کا حکم:

اگر کوئی کسی کا جانور چوری کر کے ذبح کر دے تو اگر چہ یہ فعل حرام ہے لیکن اس سے جانور حرام نہیں ہوگا کیونکہ حلال جانور کی حلت وحرمت کے احکام پر سرقہ اور غصب مؤثر نہیں ہوتے بشرطیکہ ذابح مسلمان ہو اور ذبح کے وقت ذبیحہ پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، تاہم سارق اور غاصب پر مالک کو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔

لما قال العلامة ابن البزاز الكردري رحمه الله : غصب شاة وضحى بها ان اخذها مالكها وضمنه النقصان لا يقع عن الأضحية وإن ضمنه قيمتها حية وقعت عنها لا نها صارت ملكاً من وقت الغصب.

(الفتاوى البزازية على هامش الهندية : ٦/٢٩١ كتاب الأضحية)

غیر فطری طور پر پیدا شدہ جانور کا حکم:

بعض نسل کے جانوروں کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کی نسل کشی کے لیے خنزیر کا مادہ منویہ بذریعہ ٹیسٹ ٹیوب یا بذریعہ جفتی استعمال کیا جاتا ہے جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے ایسی گائے کو جرمنی یا غیر ملکی گائے کہا جاتا ہے اب ایسی گائے کے گوشت کا کیا حکم ہوگا؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ حیوانات کی نسل ماں سے ثابت ہوتی ہے، نر کے مادۂ منویہ کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، جیسا کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بکری کے ساتھ کوئی درندہ جفتی کرے تو بچہ ماں کے تابع ہو کر حلال ہوگا۔ لہٰذا جرمنی گائے یا کوئی اور جانور جس کی ماں حلال جانور ہو تو اس کو ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا شرعاً جائز ہے۔

لما قال العلامة الكاساني : حتى إن البقرة الاهلية إذا نزعها ثور وحشي فولدت فإنه يجوز أن يضحى به وإن كانت البقرة وحشية والثور أهليا لم يجز لإن الاصل فى الولد الام لإنه ينفصل عن الام .

(بدائع الصنائع : ٥/٦٩ ، كتاب الذبائح)

مردار اور منخنقہ وغیرہ کا حکم:

حلال جانور کو ذبح نہ کیا جائے بلکہ اپنی موت مر جائے یا گلہ گھونٹ کر مار دیا جائے یا پہاڑ وغیرہ اونچی جگہ سے گر کر مر جائے تو ایسی صورت میں اس جانور کا کھانا حرام ہو جاتا ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر اللّٰہ به والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وما أکل السبع إلا ما ذکیتم وما ذبح علی النصب وأن تستقسموا بالازلام ذلکم فسق ﴾ (سورة المائدة : ۳)

''تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور جو جانور کے غیر اللہ کا نام ذبح کر دیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مر جائے اور جو کسی ضرب سے مر جائے اور جو اونچے سے گر کر مر جائے اور جو کسی ٹکر سے مر جائے اور جس کو کوئی درندہ کھانے لگے، لیکن جس کو تم ذبح کر ڈالو اور جو جانور پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے اور یہ کہ گوشت تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں۔''

اس آیت کی تفسیر میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت ہے جس میں بہت سے اصولی اور فروعی احکام و مسائل بیان کیے گئے ہیں، پہلا مسئلہ حلال و حرام جانوروں کا ہے جن جانوروں کا گوشت انسان کے لیے مضر ہے، خواہ جسمانی طور پر کہ اس سے انسان کے بدن میں بیماری کا خطرہ ہے یا روحانی طور پر کہ اس سے انسان کے اخلاق اور قلبی کیفیات خراب ہونے کا خطرہ ہے ان کو قرآن نے خباثت قرار دیا ہے اور حرام کر دیا اور جن جانوروں میں کوئی جسمانی یا روحانی مضرت نہیں، ان کو طیب اور حلال قرار دیا۔

اس آیت میں فرمایا ہے کہ حرام کیے گئے تم پر مردار جانور مراد سے مراد وہ جانور ہیں جو بغیر ذبح کے کسی بیماری کے سبب یا طبعی موت سے مر جائیں۔ ایسے مردار جانور کا گوشت ''طبی'' طور پر بھی انسان کے لیے سخت مضر ہے اور روحانی طور پر بھی۔

البتہ حدیث شریف میں رسول اللہ ﷺ نے دو چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ایک ''مچھلی'' دوسری ٹڈی۔ یہ حدیث مسند احمد، ابن ماجہ، دار قطنی، بیہقی وغیرہ نے روایت کی ہے اور قرآن کریم کی دوسری آیت میں ﴿ أو دما مسفوحا ﴾ فرما کر یہ بتلا دیا گیا کہ خون سے مراد بہنے والا خون ہے اس لیے جگر، تلی باوجود خون ہونے کے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ حدیثِ مذکور میں جہاں ''میتة'' سے مچھلی اور ٹڈی کو مستثنیٰ فرمایا ہے۔ اسی میں جگر اور طحال (کلیجی) کو خون سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

تیسری چیز ﴿ لحم الخنزیر ﴾ ہے جس کو حرام فرمایا ہے۔ لحم سے مراد اس کا پورا بدن ہے جس میں چربی، پٹھے وغیرہ سب ہی داخل ہیں۔

چوتھے وہ جانور جو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہے۔ پھر اگر ذبح کے وقت بھی اس پر غیر اللہ کا نام لیا ہے تو وہ کھلا شرک ہے اور یہ جانور باتفاق حرام کے حکم میں ہے۔ جیسا کہ مشرکین عرب اپنے بتوں کے نام پر ذبح کیا کرتے تھے۔ یا بعض جاہل کسی پیر فقیر کے نام پر اور اگر بوقت ذبح نام تو اللہ کا لیا مگر جانور کسی غیر اللہ کے نام پر نذر کیا ہوا اور اس کی رضامندی کے لیے قربانی کیا ہے تو جمہور فقہاء نے اس کو بھی ﴿ ما اهل به لغير الله به ﴾ کے تحت حرام قرار دیا ہے۔

پانچویں منخنقہ: یعنی وہ جانور حرام ہے جو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا ہو یا خود ہی کسی جال میں پھنس کر دم گھٹ گیا ہو۔ اگرچہ منخنقہ اور موقوذۃ بھی میتہ کے اندر داخل ہیں مگر اہل جاہلیت ان کو جائز سمجھتے تھے اس لیے خصوصی طور پر ذکر کیا گیا۔

چھٹے موقوذۃ: یعنی وہ جانور جو ضربِ شدید سے ہلاک ہوا ہو۔ جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ سے مارا گیا ہو اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کر دے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذۃ میں داخل ہو کر حرام ہے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات ''معراض'' تیر سے شکار کرتا ہوں، اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور عرض تیر کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذۃ میں داخل ہے اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت جصاص نے ''احکام القرآن'' میں اپنی اسناد سے نقل کی ہے۔ اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکنے کے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا گیا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک کیا گیا ہو اس کو بھی فقہاء نے موقوذۃ میں داخل اور حرام قرار دیا ہے۔ امام جصاص رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

المقتولة بالبندوقه تلك الموقوذة .

یعنی بندوق کے ذریعے جو جانور قتل کیا گیا ہے وہ ہی موقوذہ ہے اس لیے حرام ہے، امام اعظم

رحمہ اللہ، شافعی، مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی)

ساتویں متردیہ: یعنی وہ جانور جو کسی پہاڑ یا ٹیلہ یا اونچی عمارت یا کنویں وغیرہ میں گر کر مر جائے وہ بھی حرام ہے، اسی لیے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شکار پہاڑ پر کھڑا ہے اور تم نے تیر بسم اللہ پڑھ کر اس پر پھینکا اور وہ تیر کی زد سے نیچے گر کر مر گیا تو اس کو نہ کھاؤ۔

کیونکہ اس میں بھی احتمال ہے کہ اس کی موت تیر کی زد سے نہ ہو گرنے کے صدمہ سے ہو تو وہ متردیہ میں داخل ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کسی پرندہ پر تیر پھینکا۔ وہ پانی میں گر گیا تو اس کے کھانے کو بھی اسی بناء پر منع فرمایا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ اس کی موت ڈوبنے سے واقع ہوئی ہو۔ (جصاص)

آٹھویں نطیحہ: یعنی وہ جانور جو کسی ٹکر یا تصادم سے ہلاک ہو گیا ہو۔ جیسے ریل موٹر وغیرہ کی زد میں آ کر مر جائے یا کسی دوسرے جانور کی ٹکر سے مر جائے۔

نویں وہ جانور جو کسی درندہ جانور نے پھاڑ دیا ہو اس سے مر گیا ہو۔

ان نو اقسام کی حرمت بیان فرمانے کے بعد ایک استثناء ذکر کیا گیا فرمایا ﴿ إلا ما ذكيتم ﴾ یعنی اگر ان جانوروں میں سے تم نے کسی کو زندہ پالیا اور ذبح کر لیا تو وہ حلال ہو گیا اس کا کھانا جائز ہے۔

یہ استثناء شروع کی چار قسموں میں نہیں ہو سکتا کیونکہ میتہ اور دَم میں اس کا امکان ہی نہیں اور خنزیر اور ﴿ ما اهل لغير الله به ﴾ اپنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے۔ اسی لیے حضرت علی، ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، قتادہ وغیر سلف الصالحین کا اس پر اتفاق ہے یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد، یعنی منخنقہ اور اس کے بعد سے متعلق ہے۔ اس لیے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان بقیہ تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئی اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے خواہ وہ منخنقہ ہو یا موقوذۃ یا متردیہ یا نطیحہ یا جس کو درندہ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ ان میں سے جس کو بھی آثارِ زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا۔

دسویں وہ جانور حرام ہے جو نصب پر ذبح کیا گیا ہو۔ نصب وہ پتھر ہیں جو کعبہ کے گرد کھڑے

کیے ہوئے تھے اور اہل جاہلیت ان کی پرستش کرتے تھے اور ان کے پاس لا کر جانوروں کی قربانی ان کے لیے کرتے تھے اور اس کو عبادت سمجھتے تھے۔ اہل جاہلیت ان سب قسموں کے جانوروں کو کھانے کے عادی تھے جو خبائث میں داخل ہیں قرآن کریم نے ان سب کو حرام قرار دیا۔

گیارہویں چیز جس کو اس آیت میں حرام قرار دیا ہے وہ استقسام بالازلام ہے۔ ازلام زلم کی جمع ہے۔ زلم اس تیر کو کہتے ہیں جو جاہلیت عرب میں اس کام کے لیے مقرر تھا کہ اس کے ذریعے قسمت آزمائی کی جاتی تھی اور یہ سات تیر تھے۔ جن میں سے ایک پر نعم اور ایک پر لا۔ اور اسی طرح کے دوسرے الفاظ لکھے ہوتے تھے اور یہ تیر بیت اللہ کے خادم کے پاس رہتے تھے۔

جب کسی شخص کو قسمت یا آئندہ کسی کام کا مفید ہونا یا مضر ہونا معلوم کرنا ہوتا تو خادم کعبہ کے پاس جاتے اور سو روپے اس کو نذرانہ دیتے اور ان تیروں کو ترکش سے ایک ایک کر کے نکالتا۔ اگر اس پر نعم نکل آتا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام مفید ہے اور اگر لا نکل آتا تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہ کرنا چاہیے۔ حرام جانوروں کے سلسلہ میں اس کا ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب کی یہ بھی عادت تھی کہ چند آدمی شریک ہو کر کوئی اونٹ وغیرہ ذبح کرتے مگر گوشت کی تقسیم ہر ایک کے حصہ شرکت کے مطابق کرنے کی بجائے ان جوئے کے تیروں سے کرتے تھے جس میں کوئی بالکل محروم رہتا کسی کو بہت زیادہ کسی کو حق سے کم ملتا تھا۔ اس لیے جانوروں کی حرمت کے ساتھ اس طریقہ کار کی حرمت کا بیان کر دیا گیا۔

علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔

اور استقسام بالازلام کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لیے بھی بولا جاتا ہے جس میں قرعہ اندازی اور لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جاتی ہے یہ بھی بنص قرآن حرام ہے۔

جس کو قرآن نے میسر کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی لیے حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ، مجاہد اور شعبی نے فرمایا ہے کہ جس طرح عرب ازلام کے ذریعہ حصے نکالتے تھے اسی طرح فارس و روم میں شطرنج اور چوسر وغیرہ کے مہروں سے یہ کام لیا جاتا ہے وہ ازلام کے حکم میں ہیں۔

(مظہری)

استقسام بالازلام کی حرمت کے ساتھ ارشاد فرمایا: ﴿ ذلکم فسق ﴾ یعنی یہ طریقہ قسمت معلوم کرنے یا حصے مقرر کرنے کا فسق اور گمراہی ہے۔ (معارف القرآن : ۳۱ / ۲۸ _ ۳۲)

باب اللباس

لباس کی حقیقت:

مرد کے بدن کا وہ حصہ جسے عربی زبان میں ''عورت'' اور اردو اور فارسی زبان میں ''ستر'' کہتے ہیں، چھپانا شرعی، طبعی اور عقلی طور پر فرض ہے اور ایمان کے بعد سب سے پہلا فرض جس پر عمل ضروری ہے، وہ اعضائے مستورہ کو چھپانا ہے، یہ فریضہ ابتدائے آفرینش سے ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں میں فرض رہا ہے، بلکہ شرائع کے وجود سے بھی پہلے جب جنت میں شجر ممنوعہ کھانے کے سبب حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کا جنتی لباس اتر گیا اور ان کا ستر کھل گیا تو وہاں بھی حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواء علیہا السلام نے ستر کھلا رکھنا جائز نہیں سمجھا اس لیے حضرت آدم اور حضرت حواء دونوں نے جنت کے پتے اپنے ستر پر باندھ لیے، چنانچہ ارشاد باری ہے: ﴿ فطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنة ﴾ (اعراف) دنیا میں آنے کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الرسل ﷺ تک ہر پیغمبر کی شریعت میں ستر چھپانا فرض رہا ہے، اعضاءِ مستورہ کی تعیین اور تحدید میں تو اختلاف ہوسکتا ہے مگر اصل فرضیت سترعورت کی تمام انبیاء کی شرائع میں مسلمہ ہے اور یہ فرض ہر انسان مرد وعورت پر فی نفسہ عائد ہے کوئی دوسرا دیکھنے والا موجود ہو یا نہ ہو۔

لباس کیسا ہو؟

لباس کے بارے میں شریعت کی تعلیمات بڑی معتدل ہیں، چنانچہ شریعت نے کسی مخصوص لباس کی تعیین نہیں کی ہے اور نہ اس کی مخصوص ہیئت بتلا کر یہ کہا کہ ہر شخص کے لیے ایسا لباس پہننا ضروری ہے بلکہ ہر علاقہ اور ہر جگہ کے لوگوں کو موسم اور آب وہوا کے لحاظ سے لباس کے چناؤ میں آزادی دی گئی ہے اور وہ اس لیے ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور حالات کے لحاظ سے، مختلف ممالک کے لحاظ سے، وہاں کے موسموں کے لحاظ سے، وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے، لباس مختلف ہوسکتا ہے، مثلاً: کہیں باریک، کہیں موٹا، کہیں کسی وضع، کہیں کسی ہیئت کا لباس اختیار کیا جا

سکتا ہے، البتہ اسلام نے کچھ اہم اور بنیادی اصول اور آداب لباس کے سلسلے میں بتائے ہیں ان آداب اور اصولوں کا لحاظ رکھنا ہر حال میں ضروری ہے، ذیل میں ہم آداب اور اصولوں کو پہلے اجمالی طور پر بیان کردیتے ہیں پھر ان کو قدرے وضاحت اور تشریح کے ساتھ بیان کریں گے۔ پھر اس کے بعد لباس کے متعلق مختلف اور متفرق مسائل کو الگ الگ عنوان کے ساتھ ذکر کریں گے۔

لباس کے اجمالی بنیادی اصول:

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لباس کے متعلق کسی خاص وضع اور تراش کی شریعت نے پابندی نہیں لگائی، البتہ لباس کی حدود مقرر کی ہیں ان سے تجاوز نہیں ہونا چاہے، پس جو لباس ان شرعی حدود میں ہوگا وہ شرعی لباس کہلائے گا ورنہ خلافِ شرعی ہوگا، وہ حدود یہ ہیں:

1- لباس اتنا چھوٹا، باریک یا چست نہ ہو کہ وہ اعضاء ظاہر ہو جائیں جن کا چھپانا واجب ہے، بلکہ لباس ایسا ہونا چاہیے کہ جس سے مکمل طور پر ستر پوشی ہوتی ہو۔

2- لباس میں کافروں اور فاسقوں کی نقالی اور تشبہ اختیار نہ کریں۔

3- جس لباس سے تکبر و تفاخر اور اسراف و تنعم مترشح ہوتا ہو اس سے اجتناب کریں۔

4- مال دار شخص اتنا گھٹیا لباس نہ پہنے کہ دیکھنے والے اسے مفلس سمجھیں۔

5- اپنی مالی استطاعت سے زیادہ قیمت کے لباس کا اہتمام نہ کریں۔

6- مرد شلوار، تہبند اور پائجامہ وغیرہ اتنا نیچا نہ پہنیں کہ ٹخنے یا ٹخنوں کا کچھ حصہ اس میں چھپ جائے۔

7- مردوں کے لیے اصلی ریشم کا لباس پہننا حرام ہے۔

8- مرد زنانہ لباس اور عورتیں مردانہ لباس نہ پہنیں۔

9- لباس صاف ستھرا ہونا چاہیے، مردوں کے لیے سفید لباس زیادہ پسند کیا گیا ہے۔

10- خالص سرخ لباس پہننا مردوں کے لیے مکروہ ہے، البتہ کسی اور رنگ کی آمیزش ہو یا سرخ دھاری دار ہو تو مضائقہ نہیں۔

لباس کے بنیادی اصول:

قرآن کریم اور ذخیرۂ احادیث میں تتبع و تلاش کے بعد، لباس کے متعلق جو بنیادی اصول

ملتے ہیں وہ لباس کی شرعی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہیں ہونا چاہیے اور جو لباس ان شرعی حدود میں ہوگا وہ شرعی لباس کہلائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے لباس کے بنیادی اصول بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿ يا بني آدم قد أنزلنا عليكم لباسا يواري سواتكم وريشا ولباس التقوى ذلك خير ﴾ (سورة الأعراف : ٢٦)

''اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس اتارا جو تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپاتا ہے اور جو تمہارے لیے زینت کا سبب بنتا ہے اور تقوی کا لباس تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔''

معلوم ہوا کہ لباس ایسا ہونا چاہیے جو ستر کو اچھی طرح چھپائے اور اس سے قدرے زینت حاصل ہو۔

اسراف اور تکبر سے بچنا چاہیے:

لباس اپنی مالی استطاعت کے مطابق ہونا چاہیے، مالی استطاعت سے بڑھ کر فخر و نمائش اور تکلف کا اہتمام کرنا درست نہیں اور اس میں اسراف کرنا ناجائز ہے، چنانچہ حضور ﷺ کا بڑا اصولی ارشاد ہے:

" كلوا والبسوا، وتصدقوا في غير اسراف ولا مخيلة، اي كبريا." (اخرجه البخاري في اللباس : ٤/٢٣)

جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کھاؤ، پیو، صدقہ کرو، البتہ اسراف اور تکبر سے اجتناب کرو۔

" وقال ابن عباس رضي الله عنهما : كل ما شئت والبس ما شئت، ما اخطاتك اثنتان، سرف او مخيلة."

(انظر الاثر في صحيح البخاري : ٤/٢٣)

''جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پہنو، لیکن دو چیزوں سے اجتناب کرو، ایک اسراف دوسرا تکبر۔''

حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کا کپڑا چاہو پہنو، تمہارے لیے جائز ہے، لیکن اس میں اسراف نہ ہو اور اسراف اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر نمائش کے لیے کپڑا پہنتا ہے اور جس کے پہننے سے تکبر پیدا ہوتا ہے اس لیے اس سے بچنا ضروری ہے۔

دل خوش کرنے کے لیے قیمتی لباس پہننا:

اسراف اور نمائش سے بچتے ہوئے اپنا دل خوش کرنے کے لیے قیمتی لباس پہننا جائز ہے، یعنی ایسا لباس پہننا جس سے جسم کو راحت اور آرام حاصل ہو اور ساتھ ساتھ تھوڑا سا آسائش کا مقصد بھی حاصل ہو، اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے، مثلاً پتلا لباس پہن لے اس خیال سے کہ جسم کو آرام ملے گا یا دل کو خوش کرنے کے لیے زیبائش کا لباس پہن لے یا کوئی پسندیدہ قیمتی کپڑا پہن لے، ان سب میں وسعت اور گنجائش ہے اور یہ اسراف میں داخل نہیں ہیں۔

قال العلامة الصابوني حفظه الله تعالىٰ : ومما يوكد أن التزين والتجمل مطلوب ، وإنه ليس من الكبريا الذي نهى عنه الاسلام ، ما روي في الصحيح عنه صلى الله عليه وسلم أنه قال : لا يدخل الجنة من كان في قلبه مثقال ذرة من كبر ، قالوا يا رسول الله ! إن احدنا يحب أن يكون ثوبه حسنا ، ونعله حسنة قال إن الله جميل يحب الجمال ، الكبر بطر الحق ، اي عدم قبول الحق وغمط الناس ، اي احتقارهم وازدراٴهم . (أخرجه مسلم رقم ٩ في كتاب الإيمان)

چنانچہ علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ شرعی دائرہ میں رہ کر زیب وزینت حاصل کرنا یہ تکبر میں داخل نہیں، صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کے دل میں رائے کے دانہ کے برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا، صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ) ہم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اسکا لباس عمدہ ہو جوتا عمدہ ہو کیا یہ بھی کبر میں داخل ہے تو" آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتا ہے کبر یہ ہے کہ حق بات کو قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا اور ان کے ساتھ توہین آمیز رویہ رکھنا۔

ٹخنے چھپانا مطلقاً جائز نہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ" جو شخص اپنے کپڑے کو تکبر کے ساتھ نیچے گھسیٹے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔"

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ" مرد کی زیر جامہ کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ حصہ جہنم میں

جائے گا۔'' (صحیح بخاری کتاب اللباس)

ان روایات سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے ٹخنوں سے نیچے شلوار، پائے جامہ، پتلون، تہبند اور لنگی وغیرہ پہننا جائز نہیں گناہ ہے، حدیث کے مطابق اس پر دو وعیدیں ہیں، ایک یہ کہ ٹخنوں سے نیچے جتنا حصہ ہوگا وہ جہنم میں جائے گا اور دوسرے یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالی ایسے شخص کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گا، اس لیے اس گناہ بے لذت سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

تکبر نہ ہو تو تب بھی ٹخنے چھپانا حرام ہے

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ٹخنوں سے نیچے شلوار وغیرہ لٹکانا اس وقت ناجائز ہے جب کہ یہ تکبر کی وجہ سے ہو اور اگر تکبر نہ ہو تو پھر اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ جب حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''ازار کو ٹخنے کے نیچے نہ کرو'' اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا ازار بار بار ٹخنے سے نیچے ڈھلک جاتا ہے، میرے لیے اوپر رکھنا مشکل ہوتا ہے، میں کیا کروں؟ تو اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمہارا ازار جو نیچے ڈھلک جاتا ہے، یہ تکبر کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ تمہارے عذر اور مجبوری کی وجہ سے ڈھلک جاتا ہے اس لیے تم ان میں داخل نہیں۔''

(ابو داؤد، کتاب اللباس)

اس واقعہ سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر تکبر نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں جائز ہے۔

فقہاءِ کرام رحمہ اللہ کا صحیح قول:

اس سلسلہ میں رسول اللہ سے دو قسم کی روایات آئی ہیں، ایک وہ جن میں کپڑوں کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر وغیرہ کی کسی قید کے بغیر بھی ناجائز اور موجب عذاب بتلایا گیا ہے، دوسری قسم کی وہ روایات ہیں جن میں کپڑوں کو ٹخنوں سے نیچے تکبر کے ساتھ لٹکانے کی حرمت آئی ہے، اس لیے بعض فقہاء نے اس مسئلہ میں یوں تفصیل کی ہے کہ اگر تکبر کی وجہ سے نیچے لٹکائے تو مکروہ تحریمی ہے، اور تکبر کے بغیر لٹکائے تو مکروہ تنزیہی ہے۔

لیکن علماء محققین کا صحیح قول یہ ہے کہ تکبر ہو یا نہ ہو ہر حال میں کپڑے ٹخنوں سے نیچے کرنا مکروہ تحریمی ہے، ہاں تکبر کی وجہ سے ایسا کرے گا تو گناہ زیادہ ہوگا، ورنہ گناہ کم ہوگا اور اس سے تمام روایات کے درمیان تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری / حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ: ۱۰/۲۶۴ کتاب

اللباس، وامداد الفتاوی/ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ: ۴/ ۱۱۹)

اور جہاں تک حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اجازت ملنے کا تعلق ہے تو اس پر دوسروں کو قیاس کرنا درست نہیں کیونکہ ان کو جو اجازت دی گئی تھی وہ ایک مجبوری کی وجہ سے دی گئی تھی وہ مجبوری یہ تھی کہ ان کے جسم کی بناوٹ ایسی تھی کہ ارادہ کے بغیر بھی بار بار ان کا ازار خود بخود نیچے ڈھلک جاتا تھا، اس لیے ان کو بوجہ مجبوری اجازت دی گئی تھی۔

نیز تکبر کا متحقق ہونا ایک امر خفی اور پوشیدہ معاملہ ہے اور اس کا پتہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے کہ تکبر کہاں ہے اور کہاں نہیں ہے، جب کہ بعض اوقات اس تکبر میں مبتلا شخص کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ تکبر کی حالت میں ہے، اس لیے اس سے بچنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ آدمی ٹخنے سے اوپر کپڑا پہنے اور تکبر کی جڑ ہی ختم کر دی جائے:

قال الصابونی حفظه الله تعالیٰ :وينبغي ألّا يطيل الإنسان الثوب أو العباءة، بحيث يجرهما على الارض، فما زاد على الكعبين، فإنه مكروه، بل محرم إن كان على سبيل الخيلاء، وجره على الارض كبرا، يسبب مقت الله وغضبه، فقد قال النبي صلى الله عليه وسلم: " لا ينظر الله يوم القيامة إلى من جر ثوبه خيلاء " اي زهوا وتكبرا!

(أخرجه البخاری : ٤/ ٢٠٤، والترمذي رقم ١٧٣٠ في اللباس)

وقال صلى الله عليه وسلم: " ما أسفل من الكعبين من الإزار، ففي النار ." أي صاحبه في النار.

(أخرجه البخاری فی كتاب اللباس)

وسمع أبوبكر رضي الله عنه الرسول صلى الله عليه وسلم يقول: " من جر ثوبه خيلاء، لم ينظر الله إليه يوم القيامة، فقال أبوبكر يا رسول الله: إن أحدي شقي إزاري يسترخي - أي يسقط أحيانا على الأرض - إلا أن أتعاهد ذلك منه!! فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: لست ممن يصنعه خيلاء. (صحيح البخاری : ٤/ ٢٣)

فإذا سقط الرداء على الارض دون قصد، فلا إثم فيه، ولا

مؤاخذة عليه، إنما الممنوع والمحرم، أن يجره على الأرض تكبرا واستعلاء والكبرياء لله وحده، كما جاء في الحديث القدسي: "العظمة إزاري، والكبرياء ردائي، فمن نازعني واحداً منهما قذفته في النار."

(أخرجه مسلم رقم: ٢٦٢٠ و ابو داؤد رقم ٤٠٩٠ في اللباس)

مردوں کے لیے اصلی ریشم کا حکم:

مردوں کے لیے اصلی ریشم کا لباس پہننا حرام ہے۔

فقد ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه صعد المنبر، وفي احدى يديه حرير، وفي الاخرىٰ ذهب، ثم قال: إن هذين حرام على ذكور امتي. (أخرجه ابو داؤد رقم ٤٠٥٧ باسناد حسن)

یعنی ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف لائے اس حال میں کہ ایک ایک دست مبارک میں ریشم تھا دوسرے میں سونا پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔

وفي رواية الترمذي عن ابي موسىٰ الاشعري أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: حرم لباس الحرير والذهب على ذكور امتي وأحل لاناثهم. (أخرجه الترمذي رقم ١٧٢٠ في كتاب اللباس)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ریشمی لباس اور سونا میری امت کے مردوں پر حرام ہے اور عورتوں کے لیے حلال ہے۔

لہٰذا خالص ریشم کا لباس جس طرح بھی ہے، ریشمی گدے پر بیٹھنا، یا ریشمی رومال استعمال کرنا، یا ریشمی تکیہ پر لیٹنا بھی حرام ہے، کیونکہ یہ عیش پرستی اور تکبر کی دلیل ہے۔

عورتوں کے لیے ریشمی لباس حلال ہے:

البتہ عورتوں کے لیے ریشمی لباس استعمال کرنا جائز ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں ہے، جیسا کہ اوپر کی روایات میں صراحت موجود ہے کہ عورتوں کے لیے سونا اور ریشم دونوں حلال کیے گئے ہیں صرف مردوں پر حرام ہے، لہٰذا مردوں کو سونا اور ریشم کے استعمال سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہی حکم

چھوٹے بچوں کا بھی ہے کہ ان کے لیے بھی سونے چاندی کا استعمال حلال نہیں، ماں باپ اور عزیز واقارب کو اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بچوں کو سونے، چاندی کے زیورات وغیرہ استعمال نہ کروائیں۔

افضل لباس کونسا ہے؟

لباس وہ افضل ہے جو ستر کو زیادہ چھپائے، چونکہ شلوار، کرتا، (جبہ) زیادہ ساتر ہے اس لیے اس کو زیادہ پسند کیا گیا ہے نیز "لباس صاف ستھرا ہونا چاہیے اور مردوں کے لیے سفید رنگ کا لباس زیادہ پسندیدہ ہے۔"

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سفید رنگ کے کپڑے پہنو، اس لیے کہ مردوں کے لیے سب سے اچھے کپڑے سفید رنگ کے ہیں اور اپنے مردوں کو بھی سفید کفن دو۔" اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مردوں کے لیے سفید رنگ کا لباس پسند فرمایا، تاہم دوسرے رنگ کے کپڑے پہننا بھی شرعاً جائز ہیں، چنانچہ بعض اوقات حضور اکرم ﷺ سے سفید رنگ کے علاوہ دوسرے رنگ کے لباس پہننا بھی ثابت ہے۔ تاہم زیادہ تر آنحضرت ﷺ سفید کپڑے زیب تن فرماتے تھے، لہٰذا جو شخص اتباع کی نیت سے سفید لباس پہنے گا تو اس کو اتباع سنت کا ثواب ملے گا۔

وفی فقه المعاملات قال : أفضل لباس الرجال : القمص والسراويل ، والقميص هو : الثوب الذي يلبسه أهل الحجاز ، وهو لباس رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقد روي الترمذي في سننه ، عن أم سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ، أنها قالت : " كان أحب الثياب إلى النبي صلى الله عليه وسلم القميص " أي الثوب الأبيض السابغ . والأفضل في الثياب أن تكون بيضاء ، لأنها لباس أهل الجنة ، وإشارة إلى صفاء العقيدة وبياض القلب ، فالمؤمن طيب، وكلامه طيب ، وعمله طيب ، وقد أشار صلى الله عليه وسلم إلى اختيار الأبيض من اللباس فقال صلى الله عليه وسلم : " إلبسوا من ثيابكم البياض ، فإنها من خير ثيابكم ، وكفنوا فيها موتاكم "

رواه الترمذي رقم (٩٩٤).

وفي رواية النسائي: "البسوا البياض، فإنها أطهر وأطيب، وكفنوا فيها مواتكم."

(رواه النسائي: ٨/٢٥ والحاكم في المستدرك: ٤/١٨٥)

خالص سرخ لباس پہننا مردوں کے لیے جائز نہیں:

خالص سرخ لباس پہننا مرد کے لئے جائز نہیں، اسی طرح ایسے کپڑے جو عورتوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں، ایسے کپڑے پہننا بھی مردوں کیلئے جائز نہیں، کیونکہ اس میں عورتوں کے ساتھ تشبہ ہو جائے گا اور یہ تشبہ بھی ناجائز ہے۔

فقد روي البخاري رحمه الله: عن ابن عباس قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المخنثين من الرجال، والمترجلات من النساء. (أخرجه البخاري رقم: ٥٨٨٦)

رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ایسی عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کرے اور ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرے۔

وفي رواية أخرى: "لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم المتشبهين من الرجال بالنساء، والمتشبهات من النساء بالرجال.

والمخنثون: جمع مخنث، وهو من يتشبه من الرجال بالنساء في حركاته، وكلامه، وثيابه، ذلك لأن لكل من الرجل والمرأة، خصائص ومزايا خصه الله عزوجل بها، في شكله وهيئته، وكلامه، فالمرأة مفطورة على النعومة، واللطافة، والحياء، فإذا خلعت لباس الحياء، وتشبهت بالرجل في لباسها وهيئتها وكلامها، فقد خرجت عن أصل الفطرة؟ كما أن الرجل إذا تخنث فتشبه بالمرأة، فقد تخلى عن رجولته، وخالف نظام الفطرة فاستحق الخزي والعقوبة، وقد جاء في صحيح مسلم عن رسول الله صلى الله عليه وسلم أنه قال: "صنفان من أهل النار لم أرهما: قوم معهم سياط كأذناب البقر

، یضربون بها الناس ، ونساء كاسيات عاريات ، مميلات مائلات رؤسهن كأسنمة البخت المائلة - أي يلففن شعورهن حتى تكون عالية مرتفعة كسنم الجمل ، لا يدخلن الجنة ولا يجدن ريحها ، وإن ريحها ليوجد من ميسرة كذا وكذا ." وفي رواية : " من ميسرة خمسمائة عام ." (مسلم رقم : ٢١٢٨)

وهذا الحديث من معجزاته صلى الله عليه وسلم حيث أخبر عن أمور غيبية ، حدثت كما أخبر عنها صلوات الله وسلامه عليه ، من وجود الظلمة ، وظهور التكشف والتعري بين النساء ، حيث فقد الحياء ، وأصبحت المرأة تلبس ملابس رقيقة ، لا تستر عورة ، وتتفنن في إغراء الرجال ، بأنواع الفتنة والإغراء ، من لبس الضيق ، وتقصير الثياب ، وكشف الذراعين والصدر ، وإبراز النهود ، وتصفيف شعر رأسها حتى يصبح عاليا كسنام الجمل ، وهو المرتفع فوق ظهره ، ولا حول ولا قوة إلا بالله !

مذکورہ بالا عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے مردوں پہ لعنت فرمائی جو حرکات، سکنات ،لباس، پوشاک، چال چلن وغیرہ میں عورتوں کی مشابہت اختیار کرے اسطرح ان عورتوں پہ بھی لعنت فرمایا جو کسی چیز میں مردوں کی مشابہت اختیار کرے ، نیز رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دو قسم کے انسان جہنمی ہیں ۔لیکن میں نے اپنے زمانہ میں ان کو نہیں دیکھا (یعنی آیندہ زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہونگے) کچھ لوگ ہونگے ان کے پاس گائے کی دم کی مانند کوڑے ہونگے ،اس سے لوگوں کو ماریں گے، بعض عورتیں ایسی ہونگی جو بظاہر تو لباس پہنے ہوئے ہونگی (لیکن لباس شریعت کے مطابق نہ ہونگی وجہ سے) وہ ننگی ہی شمار ہونگی ان کی صفات یہ ہونگی کہ وہ لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے والی اور لوگوں کی طرف خود مائل ہونے والی ہونگی اور ان کے سروں کے بال بختی اونٹ کے کوہان کی طرح ہونگے ،ایسی عورتیں جنت میں داخل بھی نہیں ہونگی اور ان کو جنت کی خوشبو بھی نہیں ملے گی جبکہ جنت کی خوشبو پانچ سو میل کے فاصلہ جتنی محسوس کریں گے۔(مسلم)

لہٰذا مردوں کو اپنی وضع مردانہ میں رکھنا چاہئے ،اور عورت کو اپنی وضع زنانہ رکھنا چاہئے ۔

مردوں کا لباس اور شکل وصورت میں زنانہ پن اختیار کرنا اور عورتوں کا مردانہ چال ڈھال اختیار کرنا جائز نہیں، باعث لعنت ہے، اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ نیز خالص سرخ لباس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سرخ دھاری دار لباس پہننا جائز ہے:

خالص سرخ لباس پہننا تو مردوں کیلئے جائز نہیں لیکن کسی اور رنگ کی آمیزش ہو تو وہ جائز ہے اسی طرح سرخ رنگ کے دھاری دار کپڑے پہننا بھی مردوں کیلئے جائز ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے سرخ دھاری دار جوڑے اور چادریں پہننا ثابت ہے۔ (صحیح بخاری، کتاب اللباس)

مردوں کیلئے کس رنگ کا کپڑا ممنوع ہے:

عصفر اور زعفران سے رنگا ہوا کپڑا مردوں کو استعمال کرنا مکروہ تحریمی ہے، اگر کوئی رنگ بعینہ عصفر یا زعفران کے رنگ جیسا ہو مگر خود عصفر یا زعفران کا رنگ نہ ہو تو اس کا استعمال جائز ہے، نفس عصفر وزعفران کے رنگ کے سوا باقی سب رنگ جائز ہے۔ البتہ احمر قانی میں اختلاف ہے، مختلف اقوال میں سے ایک قول استحباب کا بھی ہے، مگر ترجیح کراہت تنزیہیہ کے قول کو ہے البتہ سر پر پگڑی وغیرہ میں بالاتفاق بلا کراہت جائز ہے۔

قال في شرح التنوير: وكره لبس المعصفر والمزعفر الاحمر والاصفر للرجال مفاده انه لا يكره للنساء ولا بأس بسائر الالوان وفي المجتبى والقهستاني وشرح النقاية لابى المكارم لا بأس بلبس الثوب الاحمر اهـ . ومفاده ان الكراهة تنزيهية لكن صرح في التحفة بالحرمة فافاد انها تحريمية وهي المحمل عند الاطلاق قاله المصنف قلت وللشرنبلالي فيه رسالة نقل فيها ثمانية اقوال منها انه مستحب.

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله فافاد انها تحريمية الخ هذا مسلم لو لم يعارضه تصريح غيره بخلاف ففي جامع الفتاوى قال ابو حنيفة والشافعي ومالك رحمهم الله تعالىٰ يجوز لبس المعصفر وقال جماعة من العلماء مكروه بكراهة التنزيه وفي منتخب الفتاوىٰ قال صاحب الروضة يجوز للرجال والنساء

لبس الثوب الاحمر والاخضر بلا كراهة وفي الحاوي الزاهدي يكره للرجال لبس المعصفر والمزعفر والمورس والمحمراي الاحمر حريرا كان او غيره إذا كان في صبغه دم والا فلا ونقله عن عدة كتب وفي مجمع الفتاوىٰ لبس الاحمر مكروه وعند البعض لا يكره وقيل يكره إذا صبغ بالاحمر القاني لانه خلط بالنجس ولو صبغ بقشر الجوز عسليا لا يكره لبسه ، اجماعا اهـ فهذه النقول مع ما ذكره عن المجتبي والقهستاني وشرح ابي المكارم تعارض القول بكراهة التحريم ان لم يدع التوفيق بحمل التحريم على المصبوغ بالنجس او نحو ذلك (قوله وللشرنبلالي فيه رسالة) سماها " تحفة الاكمل والهمام المصدر لبيان جواز لبس الاحمر " وقد ذكر فيها كثيرا من النقول منها ما قدمناه وقال لم نجد نصا قطعيا لا ثبات الحرمة ووجدنا النهي عن لبسه لعلة قامت بالفاعل من التشبه بالنساء او بالاعاجم او التكبر وبانتفاء العلة تزول الكراهة باخلاص النية لا ظهار نعمة الله تعالىٰ وعروض الكراهة للصبغ بالنجس تزول بغسله ووجدنا نص الامام الاعظم رحمه الله تعالىٰ على الجواز ودليلا قطعيا على الاباحة وهو اطلاق الامر باخذ الزينة ووجدنا في الصحيحين موجبه وبه تنتفي الحرمة والكراهة بل يثبت الاستحباب اقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم اهـ ومن اراد الزيادة على ذلك فعليه بها ، اقول ولكن جل الكتاب على الكراهة كالسراج والمحيط والاختيار والملتقي والذخيرة وغيرها وبه افتي العلامة قاسم وفي الحاوي الزاهدي ولا يكره في الرأس اجماعا .

(ردالمحتار : ٥/٢٢٨) (احسن الفتاوىٰ : ٨/٦٢)

سیاہ رنگ کے کپڑے کا حکم:

مرد اور عورت کیلئے سیاہ کپڑا پہننے کا کیا حکم ہوگا جبکہ بعض لوگ اسکو ناپسند کرتے ہیں اور کہتے

ہیں چونکہ حضور ﷺ کی کالی کملی تھی اس لئے سیاہ کپڑا پہننا حضور ﷺ کی بے ادبی ہے۔ لیکن یاد رہے لوگوں کا یہ خیال صحیح نہیں، حضور ﷺ نے مختلف رنگوں کا لباس استعمال فرمایا ہے، سفید رنگ سب سے زیادہ پسند تھا، خیال مذکور کی بناء پر تو ہر رنگ کا لباس ممنوع یا خلاف ادب ہو جائے گا۔ لہٰذا ممنوع رنگوں کے سوا ہر رنگ کا لباس جائز ہے، بلکہ حضور اکرم ﷺ سے محبت اور جذبہ اتباع کا تقاضہ تو یہ ہے کہ جو چیز آپ ﷺ کو پسند تھی اسے اختیار کیا جائے، البتہ لباس میں سیاہ رنگ چونکہ شرعاً، عقلاً، طبعاً ناپسندیدہ ہے اس لئے سیاہ لباس نہیں پہننا چاہئے بالخصوص اس زمانہ میں شعار شیعہ ہونے کی وجہ سے اس سے احتراز لازم ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

(ماخوذ از احسن الفتاوی ۸ / ٦٤)

پینٹ شرٹ پہننا:

پینٹ شرٹ پہننے کا رواج اور شیوع دنیا بھر میں اتنا زیادہ عام ہو گیا ہے کہ اب اس میں تشبہ (جو کہ شرعاً ممنوع ہے) کی شان مغلوب ہو گئی ہے، اس لئے اس کا پہننا حرام تو نہیں ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ پینٹ شرٹ صالحین کا لباس نہیں ہے بلکہ کافروں کا چلایا ہوا لباس ہے اور اس کے پہننے سے انگریزوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ مشابہت ہو جاتی ہے اس لئے پینٹ شرٹ کا پہننا ناپسندیدہ ہے، حتی الامکان اس لباس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

یہ تفصیل اس لباس کے بارے میں ہے جس سے واجب الستر اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر نہ آتا ہو، اگر پتلون اتنی چست اور تنگ ہو تو اس سے اعضاء کی بناوٹ اور حجم نظر آتا ہو جیسا کہ آج کل ایسی پتلون کا کثرت سے رواج ہو گیا ہے تو اس کا پہننا اور لوگوں کو دکھانا اور دیکھنا سب حرام ہے جیسا کہ ننگے آدمی کو دیکھنا حرام ہے۔ اس لئے ایسے پتلون پہنے ہوئے شخص کے ستر کے حصہ کی طرف غور سے نہ دیکھا جائے نیز ان کو اعضاء کو چھپانے والے لباس اپنانے کی تلقین کی جائے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله ولا يضر التصاقه) اي بالالية مثلا وقوله وتشكله من عطف المسبب على السبب، عبارة شرح المنية اما لو كان غليظا لا يري منه لون البشرة الا انه التصق بالعضو وتشكل بشكله فصار شكل العضو مرئيا فينبغي ان لا يمنع جواز الصلوٰة لحصول الستر اهـ قال ط وانظر هل يحرم

النظر الى ذلك المتشكل مطلقا او حيث وجدت الشهوة اهـ قلت سنتكلم على ذلك في كتاب الحظر والذي يظهر من كلامهم هناك هو الاول . (ردالمحتار : ١ /٢٧٥)

وقال أيضاً : وعلى هذا لا يحل النظر الى عورة غيره فوق ثوب ملتزق بها يصف حجمها فيحمل ما مر على ما إذا لم يصف حجمها فليتأمل . (ردالمحتار : ٥/٢٣٤)

طلباء اور ملازمین کیلئے پینٹ شرٹ کی پابندی:

بعض تعلیمی ادارے اور سرکاری دفاتر میں، طلباء اور ملازمین کیلئے پینٹ شرٹ کو یونیفارم کے طور پر اپنانے کی پابندی ہے، اور یہ طریقہ شرعاً درست نہیں، تعلیمی ادارے اور دفاتر کے ذمہ داروں کو چاہے کہ وہ یہ ضابطہ ہرگز نہ بنائیں، طلباء اور ملازمین کو اس ناپسندیدہ لباس کے پہننے پر مجبور نہ کریں بلکہ شلوار قمیض جو قومی لباس ہے اور اسلامی اعتبار سے بھی یہ لباس صحیح ہے اس کو اپنانا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کسی کو تعلیم یا ملازمت وغیرہ کی مجبوری کی وجہ سے اس کو پہننا پڑے اور دل میں اس کو اچھا نہ جانے تو اس وقت بوجہ مجبوری اس کے پہننے کی گنجائش ہے۔ لیکن یاد رہے اس وقت پتلون ایسا ڈھیلہ بنایا جائے کہ اعضاء کو اچھی طرح چھپائے۔ نیز ٹخنے سے اوپر رہے ٹخنے سے نیچے لٹکانا اس صورت میں بھی جائز نہیں۔

چاندی کے تار والا کپڑا:

زری دار کپڑے جن کی بنائی میں چاندی کا تار استعمال ہوا اسکے استعمال کا حکم یہ ہے کہ عورتوں کے لئے مطلقاً جائز ہے۔

مردوں کیلئے ریشم یا سونے چاندی کے تار سے بنا ہوا یا کڑھائی والا کپڑا اس شرط سے جائز ہے کہ پٹی یا پھول کی چوڑائی چار انگلیوں سے زاید نہ ہو، لمبائی میں کوئی تحدید نہیں، ایسی پٹیاں یا پھول متعدد ہوں تو ان کے جواز میں یہ شرط بھی ہے کہ ان کے درمیان پٹی یا پھول کی چوڑائی سے زیادہ فاصلہ ہو، اگر فاصلہ برابر یا کم ہو کہ دیکھنے میں پورا کپڑا ہی ریشمی یا زری دار نظر آتا ہو تو جائز نہیں۔

قال العلامة التمرتاشي رحمه الله تعالىٰ : يحرم لبس الحرير ولو

بحائل على المذهب او في الحرب على الرجل لا المرأة الا قدر اربع اصابع مضمومة و كذا المنسوج بذهب يحل إذا كان هذا المقدار والا لا .

وقال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وظاهر المذهب عدم جمع المتفرق ولو في عمامة كما بسط في القنية .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : تحت (قوله الا قدر اربع اصابع الخ) وهل المراد قدر الاربع اصابع طولا و عرضا بأن لا يزيد طول العلم وعرضه على ذلك او المراد عرضها فقط وان زاد طوله على طولها المتبادر من كلامهم الثاني ويفيد ايضا ما سيأتي في كلام الشارح عن الحاوي الزاهدي .

(قوله وظاهر المذهب عدم جمع المتفرق) اي إلا إذا كان خط منه قزا وخط منه غيره بحيث يري كله قزا فلا يجوز كما سيذكره عن الحاوي ومقتضاه حل الثوب المنقوش بالحرير تطريزا و نسجاً إذا لم تبلغ كل واحدة من نقوشه اربع اصابع وإن زادت بالجمع ما لم ير كله حريرا تأمل . (ردالمحتار : ٥/٢٢٤)

مصنوعی ریشم کا حکم:

سوال: آج کل مختلف قسم کے کپڑے مروج ہیں، جن میں سے بعض کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ ریشمی ہے اسی طرح جو رومال کندھے پر رکھنے کا معمول ہے اسکی بھی ایک قسم ریشمی مشہور ہے۔ کیا عرف میں اس قسم کے کپڑے اور رومال کے ریشمی ہونے کا اعتبار کر کے مردوں کیلئے اسکو حرام کہا جائے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ آج کل عموماً مصنوعی ریشم استعمال ہوتا ہے اس لئے اسکا استعمال جائز ہے، اگر چہ عرف میں اسکو بھی ریشم کہتے ہیں ہاں اگر کسی کپڑے کا اصلی ریشمی ہونا ثابت ہو جائے تو اسکا استعمال مردوں کیلئے ناجائز ہوگا بچنا لازم ہوگا۔

محارم کے سامنے بناؤ سنگار کرنا:

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ عورت اپنے محارم مثلاً باپ اور بھائیوں

کے سامنے بناؤ سنگار کر کے بیٹھے یا ان کے ساتھ سفر کرے یہ امر فی نفسہ جائز ہے۔ مگر اس زمانے میں قلوب میں فساد غالب ہے اور ٹی وی اور وی سی آر کی لعنت نے اخلاقی اقدار کو بالکل پامال کر دیا ہے، بے حیائی اور بے باکی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ باپ کے اپنی بیٹی کے ساتھ اور بھائیوں کے اپنی بہنوں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے واقعات پیش آ رہے ہیں، اس لئے شوہر کے سوا کسی بھی محرم کے سامنے بناؤ سنگار کر کے آنا خطرے سے خالی نہیں، اس سے احتراز ضروری ہے۔

مسنون لباس:

مسنون لباس کونسا ہے؟ اور کس لباس کو مسنون لباس کہا جائے گا۔ اسکو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ سنت کسے کہتے ہیں؟

سنت کی تعریف:

فقہاء کرام نے سنت کی مشہور تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے:

الطريقة المسلوكة في الدين من غير وجوب ولا افتراض ، ومعنى الطريقة المسلوكة : ما واظب عليه النبي صلى الله عليه وسلم ولم يترك الا نادرا ، أو واظب عليه الصحابة رضي الله عنه كذلك ، كصلاة التراويح ، فإن تعلقت يتركها كراهة واساءة ، فهي سنة الهدى ، وتسمى سنة مؤكدة ايضا ، كالأذان والجماعة ، وسنن الرواتب ، كسنة الفجر والظهر والمغرب ...... وإن لم يتعلق بتركه كراهة او اساءة ، تسمى سنن الزوائد والغير المؤكدة ، فتارك المؤكدة يعاتب ، وتارك الزوائد لا يعاتب .

(ردالمحتار : ١/١٠٢ وكشاف اصطلاح الفنون ، والتعريفات للزمخشري ، والتعريفات الاصطلاحى ، والقاموس الفقهي ، مادة السنة)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ "سنت" کہا جاتا ہے کہ فرض وواجب کے سوا وہ طریقہ جو دین میں رائج ہو، اور اس پر آپ کے بعد خلفاء راشدین نے مواظبت کی ہو۔

سنت کی اقسام:

سنت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) پہلی قسم وہ ہے جسے آپ ﷺ نے عبادت کے طور پر کیا ہو، اس کو "سنت مؤکدہ" یا "سنت ہدیٰ" کہا جاتا ہے، جیسے نماز با جماعت، اذان، اقامت، فجر، ظہر، مغرب وعشاء کی سنن رواتب، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو کرنے کی تاکید آئی ہے، اور اس کا چھوڑنا گمراہی اور قابل ملامت ہے۔

(۲) دوسری قسم وہ ہے جسے آپ ﷺ نے عبادت کے طور پر نہ کیا ہو، بلکہ اپنی عادت مبارکہ کے طور پر وہ آپ سے صادر ہوئی ہو، وہ "سنت عادیہ" ہے اور اسے "سنت زائدہ" بھی کہا جاتا ہے جیسے اونٹ پر سواری کرنا، تہبند باندھنا، منقش یمنی شال استعمال کرنے کیلئے پسند کرنا، مخصوص وضع کا لباس پہننا، مخصوص انداز سے بیٹھنا، عمامہ باندھنا، وغیرہ وغیرہ یہ سب چیزیں، سنت عادیہ میں سے ہیں، جسے شرعی اصطلاح میں "سنت زائدہ" بھی کہا جاتا ہے، اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر ان چیزوں میں آپ ﷺ کی اتباع اور پیروی مقصد ہو تو اس کے کرنے میں ثواب ہے، اور اگر ان چیزوں میں اتباع کی نیت نہ ہو، تو یہ اعمال فی نفسہٖ مباح کے درجہ میں ہیں، اور بلانیت اتباع سنت (مستحب) کا ثواب نہیں ملے گا، اور نہ کرنے والے پر کوئی ملامت بھی نہیں۔

سنت کی تعریف اور اس کی اقسام واضح ہو جانے کے بعد، اب یہ بھی واضح ہونا چاہئے کہ آنحضرت ﷺ کا لباس کیسا تھا، تاکہ لباس مسنون کے تعین میں آسانی ہو سکے۔

آپ ﷺ کا لباس کیسا تھا

جبہ، کرتا، قمیص، عمامہ، ٹوپی اور لنگی پہننا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔ اور شلوار کا خریدنا بھی احادیث سے ثابت ہے، بعض روایات میں پہننا بھی مذکور ہے۔ (نشر الطیب)

تاہم قمیض آپ ﷺ کو بہت پسند تھی، اور آپ ﷺ جو قمیض مبارکہ زیب تن فرماتے تھے، اس کے چند اوصاف درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا پیراہن مبارکہ سوتی اور تنگ دامن وآستین والا ہوتا تھا، اور آپ کی قمیض مبارک میں گھنڈیاں لگی ہوتی تھیں اور قمیض مبارک میں سینہ پر گریبان تھا اور یہی قمیض کی سنت ہے۔ (مدارج النبوۃ)

(۲) ملا علی قاریؒ نے دمیاطی سے نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کا کرتہ (قمیص) سوت کا بنا

ہوتا تھا، جو زیادہ لمبا بھی نہ تھا اور اسکی آستین بھی زیادہ لمبی نہ تھی، مناوی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ آپ کا کرتہ (قمیض) ٹخنوں سے اونچا ہوتا تھا، علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ پنڈلی تک ہوتا تھا (شمائل ترمذی)

(۳) حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں کہ حضور کی قمیض کی آستین ہاتھ کے گٹے تک ہوتی تھی۔

(شمائل ترمذی)

(٤) حضور اکرم ﷺ کی قمیص کی آستین نہ اتنی تنگ تھی نہ اتنی کشادہ تھی، بلکہ درمیانی تھی اور آستین ہاتھ کے گٹے تک ہوتی تھی اور چوغہ وغیرہ پنچے تک، مگر انگلیوں سے متجاوز نہ ہوتا تھا۔

(٥) حضور ﷺ کی قمیض کا گریبان سینہ پر ہوتا تھا، کبھی آپ اپنی قمیص کا گریبان کھول لیا کرتے تھے، اور سینہ اطہر صاف نظر آتا تھا، اور اسی حالت میں نماز پڑھ لیتے تھے۔ (شمائل ترمذی)

لہٰذا حضور اکرم ﷺ کی جیسی اور جس وضع کی قمیض تھی ویسی ہی وضع اتباع کی نیت سے پہننا موجب ثواب ہے، اور چونکہ یہ سنت عادیہ میں سے ہے، اسلئے اتباع کی نیت کے بغیر پہننے سے ثواب نہیں ملے گا، اور نہ پہننے پر کوئی کراہت وملامت بھی نہیں۔ (ردالمحتار: ۱/۱۰۳)

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : اقول : فلا فرق بين النفل وسنن الزائد من حيث الحكم لانه لا يكره ترك كل منهما ، وإنما الفرق كون الاول من العبادات والثاني من العادات ، لكن اورد عليه أن الفرق بين العبادة والعادة هو النية المتضمنة الاخلاص كما في الكافي وغيره ، وجميع افعاله صلى الله عليه وسلم مشتملة عليها كما بين في محله . (ردالمحتار : ١/١٠٣ ، باب الوضوء)

شرعی لباس:

قرآن وحدیث کی رو سے شرعی لباس کے جو بنیادی اصول اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان کی رعایت کرتے ہوئے جو بھی لباس اختیار کیا جائے گا وہ شرعی لباس ہوگا اور حضور اکرم ﷺ کے طرز پر ہوگا، اس لیے اس لباس کو بھی ''لباس مسنون'' کہا جائے گا اور اس کے پہننے سے سنت کا ثواب ملے گا۔

لباس شرعی کے بیان کے سلسلے میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

''حضور ﷺ کے طرز پر ہونے کے یہ معنی نہیں کہ بالکل ویسا ہی لباس ہو جو حضور ﷺ کا تھا، بلکہ جس لباس کی حضور ﷺ سے اجازت ہو، وہ بھی حضور ہی کا طرز ہے اور جو اس پر ہو وہ بھی حضور ﷺ ہی کے طرز پر ہے۔'' (تسهيل المواعظ: وعظ نمبر ١٣ صفحه ٣٠٥)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''لباس مسنون یعنی آنحضرت ﷺ کا لباس ہمیشہ کے لیے کوئی مقرر نہ تھا، بلکہ مختلف حالات، صیف وشتا اور سفر وحضر اور دیگر طبعی اقتضاءات کی وجہ سے مختلف اقسام اور الوان منقول ہیں، لباس سادہ ہو، زیادہ تکلف نہ ہو، وضع ایسی ہو کہ جو مسلمانوں کے امتیاز کو باقی رکھے، دوسرے اہل مذاہب کی وضع نہ ہو جیسا کہ کتب حدیث وشمائل کے تتبع سے ثابت ہے ان امور مذکورہ کی رعایت رکھتے ہوئے پھر عام طرز عمل آنحضرت ﷺ کا یہ تھا کہ لباس کی فکر میں نہ رہتے تھے، وقت پر جیسا میسر ہو گیا خواہ عمدہ ہو یا معمولی اسی کو استعمال فرمالیا۔''

كما في زاد المعاد صـ ٣٦ جلد اول، والصواب أن افضل الطريق طريق رسول الله صلى الله عليه وسلم التي سنها وامربها ورغب فيها ودوام عليها وهي أن هديه في اللباس، أن يلبس ما تسير من اللباس من الصوف تارة والقطن تارة والكتان تارة.

(إمداد المفتين: صـ ٩٧٦ باب اللباس)

سونے کا بٹن استعمال کرنا:

مردوں کے لیے خالص سونے کا بٹن استعمال کرنا جائز نہیں، کیونکہ حدیث شریف میں مردوں کے لیے خالص سونے کا استعمال حرام ہونے کی صراحت موجود ہے، اسی طرح حضرات فقہاءِ کرام رحمہ اللہ نے بھی اس کے ناجائز ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

(ملاحظه هو امداد الفتاوىٰ: ٤/١٢٩)

(ولا يتحلى) الرجل (بذهب وفضة مطلقا الا بخاتم ومنطقه وحليه سيف منها) اي الفضة إذا لم يرد به التزين.

(ردالمحتار باب اللباس: ٦/٣٥٨)

بٹن کھلا رکھنا جائز ہے:

اصل طریقہ تو یہی ہے کہ کرتہ اور قمیض وغیرہ کا بٹن بند رکھا جائے تاہم گرمی یا کسی اور وجہ سے کبھی کبھار کھلا رکھے تو یہ بھی درست ہے، کیونکہ کبھی کبھار قمیص کا بٹن کھلا رکھنا آنحضرت ﷺ سے ثابت ہے۔ (شمائل ترمذی، وفتاویٰ رشیدیہ: صفحہ ۴۸۰)

گریبان ایک طرف رکھنا خلاف سنت ہے:

گریبان گلے کے نیچے سینہ کے درمیان میں رکھنا چاہیے جیسا کہ عام طور پر رکھا جاتا ہے، اس سے ہٹ کر سینہ کے ایک طرف رکھنا جیسا کہ بعض لوگ اس طرح رکھتے ہیں، یہ خلافِ سنت ہے۔

کل لباس یکون علی خلاف السنة یکون لبسه مکروها وهو مثل اثواب الکفار واثواب الفسق والفجور واهل الاشر والبطر مثل القرطق واسبال الازار وتطویل الکم وتوسیعه والجیب علی الجانب الاعلی للصدر ونحوه.

(النتف فی الفتاویٰ کتاب الالبسه: ۱/۱۶۲)

ٹوپی اسلامی لباس کا شعار ہے:

عمامہ جسے اردو میں پگڑی اور قلنسوۃ جسے اردو میں ٹوپی کہتے ہیں، یہ دونوں قسم کے لباس خود آنحضرت ﷺ سے پہننا ثابت ہیں اور صحابہ کرامؓ نے بھی دونوں کا استعمال فرمایا ہے، ان حضرات سے لیکر آج تک ہر زمانے میں علماء کرام اور صلحاء امت کا اسی پر عمل رہا ہے، جس پر بے شمار دلائل احادیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں، لہٰذا عمامہ باندھنا اور ٹوپی پہننا مسنون ہے، البتہ یہ سنت زائدہ ہے، جس کا درجہ مستحب کا ہے، اور یہ لباس کی سنت ہے۔

ننگے سر رہنا پسندیدہ نہیں:

نماز کے علاوہ عام حالات میں بھی، عمامہ یا ٹوپی پہننا آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا معمول تھا، آج تک دیندار مسلمانوں میں یہ طریقہ چلا آرہا ہے، اسی لئے سر پر ٹوپی یا عمامہ استعمال کرنا اسلامی لباس کا شعار ہے، اور یہی اسلامی تہذیب ہے، اس کے برخلاف عام حالات میں ننگے سر رہنا ناپسندیدہ اور خلاف ادب ہے، اور یہ انگریزوں کی تہذیب ہے جو اسلامی تہذیب کے بالکل خلاف ہے، لہٰذا فساق اور مغربی تہذیب کی نقالی اور انگریزی تہذیب کو چھوڑ کر اسلامی تہذیب کو

اختیار کرنا چاہئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''سر اور بدن کا وہ حصہ جو ستر میں داخل نہیں ہے، اس بارے میں باشرع اور باتہذیب نیک لوگوں کا معمول اور ان کی عادت یہ ہے کہ وہ اس کو چھپائے رکھتے ہیں، اسلئے سر کو یا بدن کے ایسے حصے کو لوگوں کے سامنے کھولنا مکروہ ہے۔'' (غنیۃ الطالبین ۱:۱۳)

اور علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ:

''عقلمند پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ لوگوں کے سامنے سر کھلا رکھنا ناپسندیدہ ہے جسے بری نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور یہ ادب، مروت اور شریفانہ تہذیب کے خلاف ہے، شریعت میں صرف احرام حج میں سر کھلا رکھنے کا حکم ہے، جس کا مقصد تعبد ہے یعنی اللہ تعالی کے سامنے اپنی نیازمندی اور اپنی بندگی کا اظہار۔'' (فتاوی رحیمیہ ۳/ ۲۲٤ ، وفتاوی رشیدیہ)

ٹوپی کے بغیر نماز پڑھنا:

ٹوپی اور پگڑی کے استعمال میں نماز اور خارج نماز کا کوئی فرق نہیں ہے، دونوں جگہ حکم برابر ہے، البتہ نماز ایک نہایت باعظمت فریضہ ہے، نماز کیلئے لباس میں زینت اور تجمل اختیار کرنے کے بارے میں کتب حدیث اور فقہ میں بہت سی ترغیب وارد ہوئی ہے، حضرات مفسرینؒ اور فقہاء کرامؒ نے نماز کیلئے تزین اور تجمل کو مستحب لکھا ہے، اور سر ڈھانپ کر نماز پڑھنے کو افضل فرمایا ہے، تاہم اگر کوئی شخص کبھی اتفاق سے بغیر ٹوپی نماز پڑھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ننگے سر نماز پڑھنے کی عادت بنانا مکروہ ہے، اور اگر (نعوذ باللہ) نماز کی توہین کرنے کے ارادہ سے ٹوپی اتار کر نماز پڑھتا ہے تو یہ کفر ہے، آج کل جو لوگ ننگے سر رہتے ہیں اور ننگے سر نماز پڑھتے ہیں ان کا یہ فعل بلاشبہ مکروہ ہے اور اسلامی شعار کے خلاف ہے، جس سے ان کو بچنا چاہئے۔ (ردالمحتار:۱/۶۴۱)

علامہ محمد زاہد کوثریؒ نے لکھا ہے کہ بغیر عذر ننگے سر نماز پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، بلکہ ننگے سر نماز پڑھنا نصاریٰ کی عادت ہے۔ (مقالات کوثری صفحہ ۱۷۲) جب کہ نصاریٰ کے تشبہ سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ احادیث میں غیر مسلموں کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے سے سخت ممانعت وارد ہوئی ہے۔ (ترمذی:۲/۹) اور اس سے واضح ہوتا ہے کہ ستر راس کا حکم اگر چہ فی نفسہٖ مستحب کا درجہ رکھتا ہے، لیکن سر کھلا رکھنے کی صورت میں نصاریٰ کے ساتھ تشبہ کا اندیشہ ہے، اس

لحاظ سے ستر راس کا معاملا نسبتاً زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

بہر حال نماز ہو یا خارج نماز ہو، ستر راس کا حکم صحیح احادیث سے ثابت ہے اور یہ اسلامی لباس کا شعار ہے، حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ، تابعین عظام اور پوری امت کے علماء و صلحاء کا عمل اس کے مطابق چلتا آرہا ہے، لہٰذا ٹوپی یا عمامہ پہننے کو اپنے لیے باعث عار سمجھنے کے بجائے اس کے پہننے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

پلاسٹک یا چٹائی کی ٹوپی کا حکم:

نماز ایک باعظمت فریضہ ہے اس کو بڑے اہتمام کے ساتھ پاک صاف لباس پہن کر اور صاف ستھری ٹوپی سے سر ڈھک کر ادا کرنا چاہیے، ایسے خراب یا گھٹیا درجہ کے یا میلے کچیلے کپڑوں میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جنہیں پہن کر آدمی بڑوں سے ملنے کے لیے جانے میں عار محسوس کرے، لہٰذا ہر نمازی کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھ صاف ستھری ٹوپی رکھے اور نماز میں اس کو استعمال کرے، پلاسٹک یا چٹائی کی ٹوپی استعمال نہ کرے، کیونکہ ایسی ٹوپی کے ساتھ نماز پڑھنا مکروہ ہے، مسجد کی انتظامیہ کو بھی چاہیے کہ وہ پلاسٹک یا چٹائی کی ٹوپیاں مسجد میں نہ رکھے اور نہ ایسی ٹوپیاں رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرے اور اگر رکھنا بھی چاہے تو کپڑوں کی صاف ستھری ٹوپیاں رکھی جائیں اور انتظام وسلیقے کے ساتھ رکھی جائیں اور جب کبھی اتفاق سے کسی نمازی کے پاس اپنی ٹوپی نہ ہو اور سر ڈھکنے کے لیے اس کے پاس کوئی بڑا رومال وغیرہ بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری کے وقت ننگے سر نماز پڑھنے سے بہتر یہ ہے کہ مسجد میں موجود ٹوپی پہن کر نماز پڑھ لے، لیکن اس کی عادت نہیں بنانی چاہیے۔ (ردالمحتار : ۱/ ۴۳)

وصلاته في ثياب بذلة يلبسها في بيته ومهنة اي خدمة إن له غيرها والا لا ، بكسر الباء الموحدة وسكون الذال المعجمة الخدمة والابتذال ، قال في البحر وفسرها في شرح الوقاية لما يلبسه في بيته ولا يذهب به إلى الاكابر والظاهر أن الكراهة تنزيهية اهـ .

(ردالمحتار : ۱/ ٦٤١ مكروهات الصلاة)

ٹوپی کی کونسی قسم سنت ہے؟

حدیث شریف کے الفاظ کے مطابق ٹوپی مدور، گول ہونی چاہیے، اور بعض روایات میں

حضور ﷺ کے پاس تین طرح کی ٹوپیاں ہونا ثابت ہیں ایک قسم وہ تھی جو سر کے ساتھ چپکی ہوئی تھی، دوسری قسم وہ تھی جو سر سے کسی قدر اونچی ہوتی تھی، جب کہ تیسری قسم کی ٹوپی مذکورہ دونوں قسم کی ٹوپیوں سے نسبتاً زیادہ بڑی اور کشادہ ہوتی تھی کہ کان بھی اس سے ڈھک جاتے تھے۔

(كتاب الوسيلة للموصلي : ٦/١١٦)

لہٰذا اس طرح کی ہر قسم کی ٹوپی پہننا بلا شبہ درست ہے اور ہمارے یہاں جو ٹوپیاں مروج ہیں، ان سب سے سنت ادا ہو جاتی ہے، البتہ لباس کے مطابق ٹوپی بھی عمدہ استعمال کرنی چاہیے۔

قراقلی کی ٹوپی پہننا جائز ہے:

قراقلی کی ٹوپی کی جتنی اقسام ہمارے یہاں رائج ہیں، ان سب کا استعمال جائز ہے اور ان سے ٹوپی پہننے کی سنت ادا ہو جاتی ہے۔

قراقلی کی ٹوپی بنانے کے سلسلے میں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ کسی حلال جانور کی کھال ہو یا حرام جانور کو حلال طریقے سے ذبح کیا جائے تو اس کا گوشت، کھال اور اس کے جسم کے دیگر سارے اجزاء پاک ہو جاتے ہیں اور اگر اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلا تو وہ بھی پاک سمجھا جائے گا اور اگر زندہ بچہ نکلا تو شرعی طریقے سے ذبح کرنے کے بعد وہ بھی پاک ہو جائے گا، ان تمام صورتوں میں اس جانور یا اس کے بچے کی کھال سے قراقلی کی ٹوپی بنانا جائز ہے اور مردہ جانور کی کھال دباغت سے پاک ہو جاتی ہے اور اس سے بھی قراقلی کی ٹوپی بنانا جائز ہے، البتہ زندہ جانور (مثلاً بھیڑ وغیرہ) کو ذبح کیے بغیر کسی ایسے طریقے سے اس کا پیٹ چاک کرنا جس سے اس کو تکلیف ہو یا وہ مر جائے یا اس کو اور کسی طرح کی اذیت پہنچانا تا کہ اس کے پیٹ کا بچہ نکال کر اس کی کھال استعمال میں لائی جائے یہ ہرگز جائز نہیں، بہت بڑا گناہ ہے، جو ایسا کرے گا وہ سخت گناہ گار ہوگا، اس لیے اس سے پرہیز کرنا لازم ہے، البتہ بھیڑ کو ذبح کرنے کے بعد پیٹ چاک کرنا یا ذبح کیے بغیر کسی ایسے طریقے سے پیٹ چاک کرنا کہ بھیڑ کو تکلیف محسوس ہی نہ ہو، اس میں گناہ نہیں اور اس کی کھال سے ٹوپی بنانا اور استعمال کرنا درست ہے۔

اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس میں بھیڑ کی نسل کشی ہے یا بھیڑ سے انتفاع کا جو ایک عام طریقہ کھانے کا ہے اس کی مخالفت ہے ان کی یہ بات درست نہیں، کیونکہ ٹوپی بنانا اور کوئی لباس بنانا یہ بھی بذاتِ خود ایک قسم کا انتفاع ہے۔

لبس الصوف والشعر سنة الانبياء عليهم السلام لانه آية التواضع

(فتاویٰ هندية : ۵/ ۳۳۳ كتاب اللباس)

وفيه ايضاً : عن ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ : لا باس بلبس القلنسوه الثعالب كذا في المبسوط وكان على ابى حنيفة رحمه الله سنجاب وعلى الضحاك قلنسوة سمور كذا في الغياثية .

(عالمگيرية : ۵/ ۳۳۳)

عمامہ لباس کی سنت ہے:

عمامہ باندھنا آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت ہے، اس لیے عمامہ باندھنا مسنون ہے، البتہ یہ سنت زائدہ ہے، جس کا درجہ مستحب کا ہے اور یہ لباس کی سنت ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اتباع سنت کی نیت سے عمامہ باندھے تو بلا شبہ موجبِ ثواب ہے اور اگر کوئی نہ باندھے تو کوئی گناہ بھی نہیں۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ سے عمامہ باندھنے پر مواظبت (دائمی طور پر) ثابت نہیں ہے، چنانچہ صاحب ''زاد المعاد'' فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کبھی عمامہ کے بغیر صرف ٹوپی استعمال فرمائی اور کبھی بغیر ٹوپی کے صرف عمامہ استعمال فرمایا اور کبھی خود یعنی جنگی ٹوپی استعمال فرمائی، الغرض جس موقع پر جو مناسب سمجھا گیا وہی استعمال فرمایا۔

(ملاحظہ ہو: زاد المعاد : ۱/ ۳٦ وتاريخ الخميس : ۲/ ۱۹۰)

قال العلامة الصابوني حفظه الله : من سنن الإسلام لبس العمامة ، وهي من شعائر الدين ، ومن هدي سيد المرسلين صلى الله عليه وسلم ، فقد كان صلى الله عليه وسلم يلبس العمامة ، ويعتم بها في السلم والحرب ، وكذلك أصحابه الكرام ، كان لهم عمائم يتوجون بها رؤسهم ، اقتداء بهدي سيد المرسلين صلى الله عليه وسلم ، ويكره للمسلم أن يبقي مكشوف الرأس .

فقد روي مسلم عن جابر رضي الله عنه : " أن رسول الله صلى الله عليه وسلم دخل يوم فتح وعليه عمامة سوداء . "

(أخرجه مسلم رقم : ۱۳۵۸ باب جواز دخول مكة بغير إحرام ،

والترمذي رقم : ١٧٣٥)

یعنی رسول اللہ ﷺ حالت جنگ اور امن دونوں حالات میں عمامہ باندھا کرتے تھے۔ حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل ہوئے آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

وروي أيضاً عن عمرو بن حريث رضي الله عنه أنه قال : " كأني أنظر إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وعليه عمامة سوداء ، قد أرخى طرفها بين كتفيه ." (أخرجه مسلم رقم : ١٣٥٩)

وروي الترمذي عن ركانة أنه سمع النبي صلى الله عليه وسلم : إن فرق ما بيننا وبين المشركين : العمائم على القلانس .

(أخرجه الترمذي : ١٧٨٤ وقال حدث حسن غريب)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپی پر عمامہ باندھنا ہے

أي العلامة الفارقة التي تميز بين المسلم والمشرك ، **هي العمامة،** فهي شعائر أهل الإسلام ، وأهل العلم والدين .

فهذا هدي النبي صلى الله عليه وسلم ، وتوجيه للأمة ، أن يتميزوا عن الكفار ، بلبس العمائم التي هي تيجان العرب ، وهي مظهر عزتهم وكرامتهم ، وهي إحدى شعائر الإسلام الجليلة .

ولقد تأسى أصحاب الرسول صلى الله عليه وسلم بهدي النبي الكريم ، فكانوا يقتدون به في أقواله ، وأفعاله ، ولباسه ، وحركاته ، وسكناته ، فيلبسون العمائم ، واشتهر ذلك عنهم ، حتى صار جزاء من حياتهم ، وشعائرهم الدينية !

فهذا سيدنا عبد الله بن عمر ، أشد الناس تمسكا بهدي الرسول صلى الله عليه وسلم الذي قال عنه نافع : لو رأيت ابن عمر يتتبع آثار رسول الله صلى الله عليه وسلم ، لقلت : إن هذا لمجنون . يروي لنا

عنه مسلم في صحيحه هذه القصة ، وهذا الحديث ، فيقول بسنده عن عبد الله بن دينار : إن رجلا من الأعراب ، لقي ابن عمر بطريق مكة ، فسلم عليه عبد الله بن عمر ، وحمله على حمار كان يركبه ، وأعطاه عمامة كانت على رأسه ، فقال له أصحابه : غفر الله لك ، أعطيت هذا الأعرابي حمارا كنت تروح عليه ـ أي تركبه لراحتك ـ وعمامة تشد بها رأسك ، وإنهم الأعراب يرضون باليسير !!

فقال ابن عمر : إن أبا هذا كان ودا ـ أي صديقا ـ لعمر بن الخطاب ، وإني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول : إن من أبر البر ـ اي أفضل فعل الخير ـ صلة الرجل أهل ود أبيه ، وإن أباه كان صديقا لعمر . (أخرجه مسلم في كتاب البر رقم : ٢٥٥٢)

هذه سيرة الصحابة ، وهذا تأسيهم برسول الله صلى الله عليه وسلم في هيئتهم ولباسهم ، ما كانوا يتركون شيئا فعله رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا فعلوه ، امتزج حب الرسول صلى الله عليه وسلم بقلوبهم ، وسرى حب التأسي به في دمائهم ، لذلك وجدنا ابن عمر ، يهدي عمامته لذلك الأعرابي ، لأن أباه كان صديقا لعمر بن الخطاب رضي الله عنه .

فأين نحن في هذا الزمان من أناس ، زهدوا في هدي سيد المرسلين ، فتركوا العمائم ، بل عدها البعض من البدع ، مع أنها شعار أهل الإسلام ؟ وقد ذكرنا فيما سبق حديث الترمذي الذي يقول فيه صلى الله عليه وسلم : إن فرق ما بيننا وبين المشركين ، العمائم على القلانس .

(أخرجه الترمذي : رقم ١٧٨٣ وقال حديث حسن)

قال في حاشية ملتقي الأبحر : العمامة سنة نبوية شريفة ، غفل عنها الكثير من الناس ، بل زهدوا حتى في تغطية الرأس ، بما ليس من

شعار الكفرة ، وقد قال الشيخ علي القاري : إن رسول الله صلى الله عليه وسلم ما صلى حاسر الرأس ، إلا في إحرامه ، ومن هنا ذهب الفقهاء إلى كراهة الصلاة حاسر الرأس ، إلا أن يكون تذللا لله تعالى ! وقد كان صلى الله عليه وسلم إذا اعتم يسدل عمامته بين كتفيه ، كما رواه الترمذي .

فكيف يصلي بعض أهل العلم حاسري الرأس ، وهم يعلمون أن الكفار يصلون حاسري الرؤس ، وقد قال صلى الله عليه وسلم : من تشبه بقوم فهو منهم . (أبو داؤد في سننه رقم : ٤٠٣١)

ولابن تيمية رحمه الله في كتابه القيم : " اقتضاء الصراط المستقيم " كلام . (فقه المعاملات)

عمامہ باندھنے کا صحیح طریقہ:

عمامہ یعنی پگڑی باندھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس کو سر پر گول پیچ دار باندھے اور پورے سر کو اس سے ڈھانپے، صرف سر کے ارد گرد عمامہ لپیٹنا اور سر کے درمیان کو ننگا چھوڑنا مکروہ ہے، البتہ ٹوپی کے اوپر پگڑی باندھنے کی صورت میں سر کے درمیان کا پگڑی سے ڈھانپنا ضروری نہیں اور نہ اس میں کوئی کراہت ہے۔

بغیر ٹوپی عمامہ باندھنا:

مگر بیان جواز کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر ٹوپی کے بھی عمامہ استعمال فرمایا ہے لیکن عام معمول عمامہ کے نیچے ٹوپی رکھنے کا تھا۔ سلف صالحین اور بزرگانِ دین کا عمل بھی اسی پر رہا ہے اس لیے بغیر ٹوپی کے عمامہ باندھنا خلافِ اولیٰ ہے، مکروہ نہیں، نماز پڑھنا بلا کراہت جائز ہے۔

محراب بنا کر عمامہ باندھنا:

عمامہ باندھنے میں سامنے پیشانی پر محراب بنانے کا ذکر کسی معتبر کتاب میں نہیں ملتا، البتہ علماء وصلحاء کو پیشانی پر محراب بناتے دیکھا ہے، لہٰذا محراب بنا کر عمامہ باندھنا سنت تو نہیں ہے لیکن اگر بنا لی جائے تو اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔

عمامہ کے کپڑے کی مقدار:

صحیح روایات سے عمامہ کی کوئی خاص مقدار متعین ہونا ثابت نہیں ہے اس لیے ہر شخص اپنی حیثیت سے جتنا مناسب سمجھے عمامہ باندھ سکتا ہے، البتہ نہ زیادہ لمبا ہونا چاہیے اور نہ ہی بہت چھوٹا بلکہ درمیانہ عمامہ ہونا چاہیے۔

وفي اللباس والزينة في الشريعة الإسلامية : المطلب الثاني : قدر العمامة لقد كانت عمامة رسول الله صلى الله عليه وسلم وسطا لا كبيرة ولا صغيرة ، وأنه لم يثبت في طولها وعرضها شيء ، فينبغي التوسط فيها اقتداء بالنبي صلى الله عليه وسلم .

وقال القسطلاني في المواهب اللدنية : لم تكن عمامته صلى الله عليه وسلم بالكبيرة التي تؤذي حاملها ، ولا بالصغيرة التي تقصر عن وقاية الرأس من الحر والبرد ، بل وسطا بين ذلك......

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا عمامہ نہ اتنا طویل تھا کہ اٹھانے والے کو اٹھانے میں تکلیف ہو نہ اتنا مختصر تھا کہ سر کو سردی وگرمی سے نہ بچا سکے، بلکہ درمیانہ درجہ کا تھا۔

وقال السيوطي في (الحاوي في الفتاوىٰ) وأما مقدار العمامة الشريفة فلم يثبت في حديث وقد روي البيهقي في شعب الإيمان ...... سألت ابن عمر كيف كان النبي صلى الله عليه وسلم يعتم ؟ قال : كان يريد العمامة على رأسه ويقورها من ورائه ، ويرسل ذوائبه بين كتفيه ، وهذا يدل على أنها عدة أذرع ، وذكر عن النووي أن النبي صلى الله عليه وسلم كان له عمامة قصيرة ستة أذرع ، وعمامة طويلة اثنا عشر ذراعاً .

وقال الحافظ في فتاويه : لا يحضرني في طول عمامة النبي صلى الله عليه وسلم قدر محدود ، وقد سئل عنه الحافظ عبد الغني النابلسي ، فلم يذكر شيئا ، قال ابن حجر المكي : لم يتحدد في

طولها وعرضها شيء .

وأما ما ذكره الطبراني من أن طولها سبعة أذرع ، وما جاء عن عائشة رضي الله عنها أنها سبعة في عرض ذراع ، وأنها كانت في السفر بيضاء ، وفي الحضر سوداء من صوف ، وأن عذبتها في السفر من غيرها ، وفي الحضر منها (لا أصل له) وفي تصحيح المصابيح لابن الجزري تتبعت الكتب لأقف على قدر عمامة النبي صلى الله عليه وسلم فلم أقف على شيء .

ومن هنا يتبين لنا أنه لم يثبت في قدر عمامته صلى الله عليه وسلم حديث يصح الاعتماد عليه . (صـ ٢٦١)

رومال سے عمامہ کی سنت ادا ہو جائے گی:

اوپر کے مسئلہ میں ذکر کردہ تفصیل کی رو سے چونکہ عمامہ کی سنت ادا ہونے کے لیے کپڑے کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے، لہٰذا ناچیز کے خیال میں رومال سے عمامہ باندھنے سے بھی عمامہ کی سنت ادا ہو جائے گی۔

عمامہ میں شملہ کی مقدار:

پگڑی کا شملہ کم سے کم چار انگلی کے برابر اور زیادہ سے زیادہ ایک ہاتھ تک ہونا چاہیے اور شملہ کا اتنا لمبا ہونا کہ بیٹھنے کی حالت میں کمر سے متجاوز ہو درست نہیں ہے۔

(فتاویٰ عالمگیریہ : ۳۳/۵)

وفي رواية عن نافع عن ابن عمر رضي الله عنهما قال عمم رسول الله صلى الله عليه وسلم ابن عوف بعمامة سوداء كرابيس وارخاها من خلفه قدر اربع اصابع وقال هكذا فاعتم .

(عمدة القاري : ۳۰۷/۲۱)

شملہ کس جانب رکھا جائے؟

آنحضرت ﷺ سے شملہ کے مختلف طریقے ثابت ہیں اور حضرات فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ پگڑی کا شملہ پیٹھ کی جانب دونوں مونڈھوں کے درمیان چھوڑنا افضل اور مستحب ہے اور

دائیں طرف رکھنا بھی جائز ہے، البتہ بائیں طرف رکھنے اور نہ رکھنے میں علماء کا اختلاف ہے، بعض نے جائز کہا ہے اور بعض نے ناجائز اور بدعت کہا ہے۔

(الوفاء لابن الجوزی : صـ ٥٦٧ ، وضیاء القلوب : صـ ١٥٣)

تاہم اگر کوئی اپنی عادت یا سہولت کی وجہ سے سنت سمجھے بغیر شملہ بائیں جانب چھوڑ دے تو یہ بہر حال ناجائز نہ ہوگا۔

عمامہ میں دو شملے رکھنا:

آنحضرت ﷺ کے عمامہ کے تذکرے میں دو شملے اور ایک شملہ دونوں کا احادیث سے ثبوت ملتا ہے، لہٰذا پگڑی میں ایک شملہ رکھنا بھی درست ہے اور دو شملے رکھنا بھی درست ہے۔

(خلاصة الفتاویٰ : ١٥٣/٣)

قال الحافظ ابن قیم رحمه الله : عن عمرو بن حریث قال رأیت رسول الله صلى الله علیه وسلم على المنبر وعلیه عمامة سوداء قد ارخىٰ طرفیها بین کتفیه . (زاد المعاد : ١٣٥/١)

عمامہ کس رنگ کا ہونا چاہیے؟

پہلے یہ بات ہو چکی ہے کہ عمامہ لباس کی سنت ہے اور عمامہ جس رنگ کا بھی ہو اس سے نفس عمامہ کی سنت ادا ہو جاتی ہے، کسی خاص رنگ کی پابندی شرعاً ضروری نہیں، بلکہ خود عمامہ بھی ضروری نہیں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، بہر حال عمامہ سیاہ رنگ کا ہو یا سفید رنگ کا ہر طرح درست ہے، کیونکہ احادیث میں جناب رسول اللہ ﷺ سے کالا عمامہ باندھنا بھی ثابت ہے چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر آپ کے سر مبارک پر کالا عمامہ تھا، نیز ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ منبر پر خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور آپ کے سر مبارک پر کالا عمامہ تھا اور رسالہ " ضیاء القلوب فی لباس المحبوب " میں لکھا ہے حضور ﷺ سے سفید عمامہ بھی ثابت ہے، نیز حضرات علمائے کرام فرماتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ کو سفید لباس محبوب تھا اور آپ نے سفید لباس پہننے کی ترغیب بھی دی ہے، لہٰذا سفید عمامہ باندھنا افضل ہے۔

نیلا اور سبز عمامہ ثابت نہیں:

ذخیرۂ احادیث میں تلاش بسیار کے باوجود، حضور ﷺ سے نیلے اور سبز عمامہ باندھنے کا کوئی

ثبوت نہیں ملا، البتہ ایک روایت میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے سبز پگڑی باندھنے کا ثبوت ملتا ہے۔

"عن سليمان ابن ابي عبد الله قال ادركت المهاجرين الأولين يعتمون بعمائم كرابيس سود و بيض و حمر و خضر و صفر ."

(مصنف ابن ابي شيبة : ٨ / ٢٤١)

اور جہاں تک سبز پگڑی باندھنے کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے تو ایسے رنگ کی پگڑی باندھنا فی نفسہ جائز ہے، شرعاً اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی سنت اہل بدعت کی علامت بن جائے تو اس کو بھی ترک کرنا اولیٰ ہے کجا یہ کہ کوئی چیز سنت بھی نہ ہو اور اہل بدعت کا شعار بن جائے اور چونکہ آج کل سبز پگڑی باندھنا بعض اہل بدعت کی علامت اور شناخت بن چکا ہے اس لیے اس کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔

"كل سنة تكون شعار أهل البدعة تركها اولى ."

(مرقاة شرح مشكوة : ٤ / ١٦٧)

في ردالمحتار : ١ / ٦٤٢ " (قوله تركها أولى) إذا تردد الحكم بين سنة و بدعة كان ترك السنة راجحاً على فعل البدعة ."

"جو سنت اہل بدعت کی پہچان اور ان کا شعار بن جائے، اسے چھوڑ دینا بہتر ہے، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی عمل سنت و بدعت کے درمیان مشتبہ ہو جائے تو فعل بدعت پر ترکِ سنت راجح ہے۔"

نماز میں عمامہ کا حکم:

نماز میں عمامہ اور بغیر عمامہ کے ثواب میں فرق ہوگا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ جن علاقوں میں عمامہ کے بغیر لباس کو نامکمل سمجھا جاتا ہے اور بغیر عمامہ گھر سے باہر نکلنا اور بڑوں کے مجمع میں جانا معیوب سمجھا جاتا ہے، وہاں بغیر عمامہ کے نماز پڑھنا مکروہ ہے اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ سنت پر عمل نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ان علاقوں کے اعتبار سے عمامہ کے بغیر لباس نامکمل ہے اور نامکمل لباس (جو صرف گھروں کے اندر استعمال کیا جاتا ہے) میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

"وتكره صلاته في ثياب البذلة يلبسها في بيته."

(ردالمحتار: ۱/ ٦٤٠ ، امداد الفتاوی: ۱/۲۵٦)

اور چونکہ عمامہ باندھنا سنتِ زائدہ ہے جس کا درجہ مستحب کا ہے، لہٰذا اگر اتباعِ سنت کی نیت سے باندھے تو موجبِ ثواب ہے، لیکن اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عمامہ کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کا ثواب بغیر عمامہ کے پڑھی جانے والی نماز سے زیادہ ہے اور ذخیرۂ احادیث میں تلاش کرنے کے باوجود ایسی کوئی حدیث نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہو کہ عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنے میں بغیر عمامہ نماز پڑھنے کی بہ نسبت ثواب زیادہ ہے، ہاں بعض ایسی موضوع یعنی بناوٹی احادیث ملتی ہیں جن میں عمامہ والی نماز کی فضیلت بیان کی گئی ہے، لیکن وہ احادیث باتفاق محدثین موضوع ہونے کی وجہ سے قابلِ رد اور غیر معتبر ہیں۔

(ملاحظه هو الموضوعات الكبرى لملا على القاري: صـ ۲۳۲ ، الفوائد المجموعة في الاحاديث الموضوعة: صـ ۱۸۷ ، وتذكرة الموضوعات: صـ ۱۵۵ ، والمصنوع في معرفة الحديث الموضوع: صـ ۸۷)

(نوٹ) عمامہ کے مسائل میں مفتی کمال الدین صاحب کا رسالہ "لباس کے احکام" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تفصیل کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

پردہ کے احکام

مرد کے ستر:

ناف سے لے کر گھٹنے تک جسم کے حصے کو چھپا کر رکھنا فرض ہے، بلا ضرورتِ شدیدہ دوسروں کے سامنے ستر کھولنا حرام ہے، اگر کسی نے بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہوئے ستر کھول لیا تو اس کے ستر کی طرف دیکھنا بھی حرام ہے، ہاں بوقتِ ضرورت بقدرِ ضرورت کھولنے کی اجازت ہے، مثلاً اندرونی حصہ میں کوئی ایسی بیماری لاحق ہوگئی کہ اس حصہ کے معاینہ کے بغیر مرض کی تشخیص مشکل ہو تو ایسی ضرورت کے وقت معاینہ کرنا جائز ہے یا ختنہ کی ضرورت ہے یا ولادت کے وقت دائیہ کا نظر پڑنا وغیرہ۔ ضرورت کے وقت بھی پوری کوشش رہے کہ کم سے کم کھولا اور دیکھا جائے۔

لقوله عليه السلام: " لا ينظر الرجل إلى عورة الرجل ، ولا تنظر

المرأة إلى عورة المرأة ، ولا يفضي الرجل إلى الرجل في ثوب واحد.

أي لا يجلس مكشوف العورة مع الرجل يسترهما ثوب واحد . ولا تفضي المرأة إلى المرأة في الثوب الواحد .

(أخرجه مسلم رقم : ٢٣٨ باب تحريم النظر الى العورة)

رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کوئی مرد کسی مرد کے ستر کی طرف نہ دیکھے اور کوئی عورت کسی عورت کے ستر کی طرف نہ دیکھے، دو مرد ننگے ہونے کی حالت میں ایک کپڑے میں نہ سوئیں اسی طرح دو عورتیں ایک کپڑے میں نہ سوئیں۔

وروي الترمذي عن بهز بن حكيم عن جده ، قال : قلت يا نبي الله : " عوراتنا ما نأتي منها وما نذر ؟ - أي ماذا نظهر منها وماذا نستر ؟

فقال صلى الله عليه وسلم : إحفظ عورتك ، إلا من زوجتك أو ما ملكت يمينك !!

قلت يا رسول الله : إذا كان القوم بعضهم في بعض ؟ - أي مختلطين في مجلس واحد - قال : إن استطعت ألا يراها أحد فلا يراها !!

قال : قلت يا نبي الله : إذا كان أحدنا خاليا ؟ قال : فالله أحق أن يستحي الناس منه .

(أخرجه الترمذي في كتاب الأدب : رقم ٢٧٩٤ وقال حديث حسن)

حضرت بہز بن حکیم اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! ہم اپنے ستر کو کس حد تک کھول سکتے ہیں؟ کتنا چھپانا فرض ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرو اس کو چھپاؤ، البتہ اپنی بیوی اور مملوکہ باندی کے سامنے، میں نے عرض کیا کہ اگر لوگ ایک مجلس میں گھل مل کر بیٹھے ہوئے ہوں؟ تو ارشاد فرمایا کہ مکمل کوشش کرے کہ کوئی اپنا ستر نہ کھولے دوسرے کا ستر نہ دیکھے۔

پھر میں نے عرض کیا، اگر کوئی تنہائی میں بیٹھا ہوا اس وقت ستر کھول سکتا ہے؟ تو آپ نے

ارشادفرمایا اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اس سے شرمایا جائے، یعنی تنہائی میں بھی ستر کھولنا جائز نہیں ہے۔

کھیل کود کے وقت ستر کھولنا:

اکثر کھلاڑی کھیل کے وقت صرف چڈی پہنتے ہیں اسی طرح پہلوان کشتی کے وقت ران پوری کھلی رکھتے ہیں تو یاد رہے کہ اس وقت بھی ران کو کھلا رکھنا حرام ہے، اوران کی طرف دیکھنا بھی حرام ہے۔

لقول النبي صلى الله عليه وسلم : لجرهد الاسلمى وقد مربه وهو كاشف عن فخذه قال : غط فخذك فانها من العورة .

(أخرجه الترمذي رقم : ٢٧٩٨ وقال هذا حديث حسن)

جناب رسول اللہ ﷺ کا جرہد اسلمی رضی اللہ عنہ پر گزر ہوا اس حال میں کہ ان کا ستر کھولا ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اپنی ران کو چھپالو کیونکہ یہ ستر میں داخل ہے۔

وقال صلى الله عليه وسلم لعلى رضي الله عنه : يا علي لا تبرز فخذك ، وفي رواية اخرى لا تبرز فخذك ولا تنظر إلى فخذ حي ولا ميت . (أخرجه ابو داود في الجنائز رقم : ٣١٤٠)

اور رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مخاطب بنا کر فرمایا اے علی! اپنی ران کسی کے سامنے ظاہر مت کرو، دوسری روایت میں ارشادفرمایا کہ کسی زندہ یا مردہ شخص کی ران کی طرف مت دیکھو۔

عورت کا ستر دوسری عورت کے حق میں:

عورت کا ستر دوسری عورت کے حق میں اتنا ہی ہے جتنا مرد کا ستر دوسرے مردوں کے سامنے، یعنی کسی عورت کے لیے دوسری عورتوں کے سامنے، ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ کھولنا یا اس کی طرف دیکھنا شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

﴿ يبني ء ادم لا يفتننكم الشيطن كما أخرج أبويكم من الجنة ينزع عنهما لباسهما ليريهما سوء تهما ﴾ أي ليريهما العورات التي أمر الله بسترها ، وحرم كشفها امام أحد من الناس .

(سورۃ الأعراف : آیت ۲۷)

اے اولادِ آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے جیسا کہ اس نے تمہارے دادا دادی کو جنت سے باہر کرا دیا ایسی حالت سے کہ ان کا لباس بھی ان (کے بدن) سے اتروا دیا تا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے۔ (معارف القرآن)

شیطان کی ابتداء آفرینش سے یہ کوشش رہی ہے کہ انسان کو ننگا کر کے بے حیائی کے کاموں میں مبتلا کر دے، مردوں کا ستر کھلا رکھنا عورتوں کا بے پردہ ہونا، یہ شیطانی وساوس کا نتیجہ ہے، جبکہ شیطان انسان کا سخت دشمن اس طرح بھلا پھسلا کر انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر کے جہنم کے گڑھے میں گرانا چاہتا ہے، اس لیے ہر مسلمان مرد وعورت کو چاہیے کہ بے پردگی اور بے حیائی کے کاموں سے اجتناب کرے اور شیطان کے ہاتھ میں کھلونا نہ بنے۔

محارم کی تعریف:

قد عرف الفقهاء المحرم ، بأنه من لا تجوز المناكحة بينه و بينها على التأبيد والاستمرار . سواء كان بسبب النسب او الرضاع ، أو المصاهرة . (فقه المعاملات)

یعنی محرم ہر وہ شخص ہے جس سے زندگی میں کسی بھی مرحلہ میں نکاح کرنا حلال نہ ہو۔ نسبی رشتہ داری کی وجہ، یا رضاعت کی وجہ سے یا حرمت مصاہرت سے

عورت کا ستر محارم کے سامنے:

عورت کے لیے جائز ہے کہ اپنے محرم مردوں کے سامنے مواضع زینت سر، سینہ، چہرہ، اسی طرح بازو پنڈلی وغیرہ کھلا رکھے تاہم جہاں فتنہ کا اندیشہ ہو وہاں احتیاط کرنا چاہیے۔

لقوله تعالىٰ : ﴿ ولا يبدين زينتهن إلا لبعولتهن أو آبائهن أو اباء بعولتهن أو ابنائهن أو ابناء بعولتهن أو اخوانهن أو بني أخوانهن أو بني أخواتهن ﴾ (سورة النور : آيت ۳۱)

"اور اپنی زینت کو کسی کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ پر یا اپنے شوہر کے باپ پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہر کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں پر یا اپنی بہنوں کے بیٹوں پر۔"

محارم وہ رشتہ دار جن سے پردہ فرض نہیں ہے:

۱۔شوہر ۲۔باپ ۳۔دادا ۴۔پردادا ۵۔بیٹا ۶۔پوتا ۷۔پڑپوتا
۸۔نواسہ، پڑنواسہ ۹۔چچا(حقیقی، علاتی، اخیافی) ۱۰۔بھائی (تینوں قسم کے)
۱۱۔بھتیجے (تینوں قسم کے بھائیوں کے بلاواسطہ یا بالواسطہ)
۱۲۔بھانجے (تینوں قسم کی بہنوں کے بلاواسطہ یا بالواسطہ)
۱۳۔ماموں (تینوں قسم کے) ۱۴۔نانا ۱۵۔پڑنانا ۱۶۔سسر
۱۷۔داماد ۱۸۔شوہر کے بیٹے ۱۹۔رضاعی باپ
۲۰۔رضاعی بیٹا ۲۱۔رضاعی بھائی ۲۲۔رضاعی چاچا
۲۳۔رضاعی ماموں وغیرہ

وہ رشتہ دار جن سے پردہ فرض ہے:

جس طرح اجنبی مردوں سے پردہ فرض ہے، اسی طرح بہت سے رشتہ داروں سے بھی پردہ کرنا فرض ہے، جن کی فہرست یہ ہے:

۱۔چچازاد ۲۔پھوپھی زاد ۳۔ماموں زاد ۴۔خالہ زاد
۵۔دیور ۶۔جیٹھ ۷۔نندوئی ۸۔بہنوئی
۹۔پھوپھا ۱۰۔خالو ۱۱۔شوہر کا بھتیجا ۱۲۔شوہر کا بھانجا
۱۳۔شوہر کا چچا ۱۴۔شوہر کا ماموں ۱۵۔شوہر کا پھوپھا ۱۶۔شوہر کا خالو

عورت کا ستر نماز میں:

نماز کی حالت میں عورت کے ذمہ لازم ہے کہ صرف چہرہ، ہتھیلیاں اور دونوں قدموں کے علاوہ پورے جسم کو چھپائے، ان تین اعضاء کے علاوہ اگر کسی عضو کا چوتھائی حصہ کھلا رہا، تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہنے کی مقدار تک تو اس کی نماز نہ ہوگی۔

وللحرة ولو خنثى جميع بدنها حتى شعرها النازل في الأصح خلا الوجه والكفين فظهر الكف عورة على المذهب والقدمين على المعتمد . (ردالمحتار ، مطلب في سترة العورة)

یعنی آزاد عورت کا ستر نماز میں پورا جسم ہے، یہاں تک سر کے لٹے ہوئے بال بھی صحیح روایت

کے مطابق البتہ چہرہ اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ ظاہر ہوا کہ ہتھیلی بھی ستر میں داخل ہے، بلکہ قدمین کو بھی بعض حضرات نے ستر میں داخل فرمایا ہے۔

عورت کا حجاب غیر محرم کے سامنے:

اگر عورت کو کسی ضرورت سے غیر محرم کے سامنے آنا پڑے تو عورت کے ذمہ لازم ہے کہ چہرہ سمیت پورے جسم کو برقع یا موٹی چادر میں چھپا کر آئے، غیر محرم کے سامنے بلاضرورتِ شدیدہ جسم کے کسی حصہ کو کھولنا جائز نہیں۔

وتمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين الرجال لا لانه عورة بل لخوف الفتنة كمسه وإن امن الشهوة لانه اغلظ .

(ردالمحتار : ۲/۹۷ دارالمعرفة ، بيروت)

چہرے کا پردہ:

﴿ يايها النبى قل لأزواجك وبنتك ونساء المؤمنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذلك أدنى أن يعرفن فلا يؤذين ﴾ (سورة الأحزاب)

”اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور دیگر مسلمان عورتوں سے فرما دیجئے (کہ جب ضرورت پر گھروں سے باہر جانا پڑے تو) اپنے (چہروں کے) اوپر (بھی) چادروں کا حصہ لٹکا کر (چہروں کے) قریب کرلیا کریں۔ اس سے جلد پہچان لی جائیں گی تو ان کو ایذا نہ دی جائے گی۔“

تشریح:

اس آیت سے چند چیزیں ثابت ہوئیں۔ اول یہ کہ آنحضرت ﷺ کی بیبیوں اور صاحبزادیوں کے ساتھ دیگر مسلمان عورتوں کو بھی پورے بدن اور چہرے کو ڈھانپ کر نکلنے کا حکم فرمایا گیا۔ اس سے باطل دعوے کرنے والوں کی خام خیالی کی واضح تردید ہوگئی کہ پردے کا حکم صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے مخصوص تھا۔

دوسری چیز جو اس آیت سے ثابت ہوئی، وہ یہ ہے کہ پردے کے لیے چہرے پر چادر لٹکانے کا حکم فرمایا گیا ہے، اس سے ان تجدد پسندوں کے دعوے کی بھی تردید ہوگئی جو کہتے ہیں کہ عورتوں کو چہرے چھپا کر نکلنے کا حکم اسلام میں نہیں ہے بلکہ مولویوں نے ایجاد کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ لوگ

اس آیت سے کس طرح انحراف کی صورت نکالتے ہیں.....؟

تیسری چیز جو اس آیت سے واضح ہوئی کہ پردے کے لیے جلباب استعمال کرنے کا حکم ہے۔ عربی زبان میں ''جلباب'' بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ جیسے عورتیں اپنے پہننے کے کپڑوں کے اوپر لپیٹ کر باہر نکلتی ہیں۔ قرآن شریف نے آیتِ بالا میں حکم فرمایا ہے کہ عورتیں جس طرح جلباب کو اعضائے جسم پر اور پہنے ہوئے کپڑے پر لپٹتی ہیں، اسی طرح چہرے پر بھی اس کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں جبکہ عورتوں میں چادر لپیٹنے کا رواج بعض علاقے میں ابھی تک قائم ہے اور برقعہ اسی جلباب کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ برقعہ کی نسبت یہ کہنا کہ شریعت میں اس کی کچھ اصل نہیں، سراسر جہالت ہے۔ برقعہ کا ثبوت تو ارشاد باری تعالیٰ ﴿یدنین علیھن من جلابیبھن﴾ آیۃ سے ثابت ہے، البتہ فیشنی برقعوں کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ بجائے پردہ کے بدنگاہی کا سبب بن گئے ہیں۔

عورت کے چہرے کو پردے کے حکم سے خارج کرنے کی غلط خیالی بعض دیندار قسم کے لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ دراصل ان لوگوں کو نماز کے مسائل سے واقفیت نہیں کیونکہ نماز کی کتابوں میں مذکور ہے کہ چہرے اور دونوں ہاتھ (گٹھوں تک) اور دونوں پاؤں (ٹخنوں تک) چھوڑ کر عورت کا باقی تمام بدن ستر میں داخل ہے۔

نماز میں اگر چہرہ اور ہاتھ پاؤں کھلے رہے تو نماز ہو جائے گی باقی تمام بدن ڈھانپنا فرض ہے۔ یہ مسئلہ شرائطِ نماز کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔ اگر پردے کے سلسلے میں بیان کیا جاتا تو ان لوگوں کا استدلال کچھ جاندار ہوتا۔ منہ کھول کر نماز ہو جانے کے جواز سے غیر محرم کے سامنے بے پردہ ہو کر منہ کھولے ہوئے آنے کا ثبوت پکڑنا بڑی بددیانتی اور خود فریبی ہے بلکہ قرآن وحدیث کے صریح حکم کے خلاف اپنی رائے زنی ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ چہرہ چھپانا ضروری ہونے کے لیے سورۂ احزاب کی مذکورہ آیت کے ہوتے ہوئے مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، تاہم ان فاسد الخیال لوگوں کی تشفی کے لیے ہم چاہتے ہیں کہ جہاں سے ان لوگوں کو فریب ملا ہے وہیں سے ان کی تردید پیش کر دیں۔

درمختار میں جہاں شرائط نماز کے بیان میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ چہرہ کفین (ہتھیلیاں) اور قدمین (پاؤں) ڈھانکنا صحتِ نماز کے لیے ضروری نہیں ہے۔ وہیں یہ بھی درج ہے کہ:

تمنع المرأة الشابة من كشف الوجه بين رجال لا لأنه عورة بل لخوف الفتنة . (درمختار على هامش ردالمحتار : ص ٢٨٤)

''اور جوان عورت کو (نامحرم) مردوں کے سامنے چہرہ کھولنے سے روکا جائے گا (اور یہ روکنا) اس وجہ سے نہیں کہ چہرہ (نماز کے) ستر میں داخل ہے بلکہ اس لیے کہ (نامحرم کے سامنے چہرہ کھولنے میں) فتنہ کا خوف ہے۔''

شیخ ابن ہمام ''زادالفقیر'' میں شرائط نماز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" وفي الفتاوىٰ الصحيح إن المعتبر في فساد الصلوٰة إنكشاف ما فوق الأذنين وتحتهما ."

''فتاویٰ کی کتابوں میں ہے کہ مذہب صحیح یہ ہے کہ کانوں کے اوپر کا حصہ یعنی بال اور سر کے کھل جانے سے نماز فاسد ہوگی اور غیر مردوں کے لیے کانوں کے اوپر کے حصے اور کانوں کے نیچے کے حصے یعنی چہرہ وغیرہ کے دیکھنے کا ایک ہی حکم ہے۔ یعنی دونوں حصوں کا دیکھنا حرام ہے۔''

اسی طرح صاحب درمختار ان چیزوں کی فہرست بتاتے ہوئے جن کی وجہ سے شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اپنے بیوی کو سزا دے۔ باب التعزیر میں لکھتے ہیں:

أو كشفت وجهها لغير محرم أو كلمته أو شتمته أو أعطت مالم تجر العادة بلا أذنه . (ردالمحتار : ١٩٠/٣)

''(شوہر اپنی بیوی کو سزا دے گا) اگر وہ اپنے چہرے کو غیر محرم کے سامنے کھولے یا غیر محرم سے بات کرے یا اس کو گالی دے یا اس کی بلا اجازت اس کے مال میں سے کسی کو کوئی ایسی چیز دے دے جو عادتاً بلا اجازت نہیں دی جاتی۔''

اس عبارت سے واضح ہوا کہ فقہاء کے نزدیک غیر محرم کے سامنے چہرہ کھولنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور مزید یہ معلوم ہوا کہ غیر محرم سے بات کرنے پر بھی سزا دی جا سکتی ہے۔

افسوس صد افسوس! کہ بے پردہ ہو کر غیر محرم کے سامنے آنے یا اس سے بات کرنے پر بیویوں کو سزا دینے کا کام جن کے سپرد کیا گیا تھا، آج وہی بے پردگی کو پسند کرتے ہیں اور برسر بازار بے پردہ ہو کر عورتوں کے نکلنے کو ہنر و کمال جانتے ہیں۔

پھر چہرہ تو مجمع المحاسن ہے اور اصل جاذبیت اور کشش چہرے ہی میں ہے۔ اگر چہرہ، پردے

سے خارج ہو جائے تو مقصد پردہ یعنی عصمت وعفت کی حفاظت خطرے میں پڑ جائے گی۔ چہرہ صرف مجمع المحاسن ہی نہیں بلکہ مجمع الفتن بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے مسلمان مردوں اور عورتوں کو نظر کی حفاظت کی الگ الگ خطاب کے ذریعے تعلیم دی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك أزكىٰ لهم ﴾ (سورة النور)

"آپ مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ ان کے لیے زیادہ صفائی کی بات ہے۔" اسی طرح عورتوں کو حکم ہے۔ فرمایا:

﴿ وقل للمؤمنات يغضضن من أبصارهن ويحفظن فروجهن ولا يبدين زينتهن إلا ما ظهر منها ﴾ (سورة النور)

"اور مسلمان عورتوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت (کے مواقع کو) ظاہر نہ کریں مگر جوان سے (غالباً) کھلا رہتا ہے (جس کو ہر وقت چھپانے میں حرج ہے)"

ان آیات میں مردوں اور عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور نامحرم عورتوں پر نظر نہ ڈالیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

اسی طرح بعض احادیث میں بدنظری کو آنکھ کا زنا بتایا گیا ہے۔ اگر کسی مرد نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت پر لذتِ نفس کے لیے نظر ڈالی تو اس نے آنکھ کا زنا کیا۔ اسی طرح اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کے علاوہ کسی مرد کو لذتِ نفس کے لیے دیکھا تو اس نے بھی زنا کیا۔ تو بدنظری کا فتنہ عام طور پر چہرے کے حسن کو دیکھ کر ہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے دل مائل ہوتا ہے جس سے دوسری خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جسم کے بقیہ اعضاء کی طرح چہرے کو چھپانا بھی ضروری ہے۔ اس کو غیر محرم کے سامنے بلا ضرورتِ شدیدہ کھولنا ہرگز جائز نہیں۔

بہر حال عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ خواتین کو غیر محرم کے سامنے چہرے کا کوئی حصہ کھولنے سے مکمل اجتناب کرنا ضروری ہے۔ پورا چہرہ کھولنا یا چہرے کا بعض حصہ کھولنا یا نقاب اس طرح باندھنا کہ آنکھوں کی پٹی کے ساتھ چہرے کا کچھ حصہ ظاہر ہو جائے جس سے چہرہ کی رنگ

ظاہر ہو، حسن کا پتہ چلے یہ مزاجِ شریعت اور انسانی غیرت کے خلاف ہے، اس لیے خواتین بھی اس کا اہتمام کریں اور مرد حضرات کو بھی چاہیے کہ اپنی خواتین سے چہرے کا پردہ کروائیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام خواتین کو دین اور پردے کے احکام سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ہر قسم کے فتنوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

نوٹ یہ مضمون رسالہ ''شرعی پردہ'' سے معمولی رد و بدل اور اضافہ ترمیم کے ساتھ ماخوذ ہے۔

غیر محرم کو ہاتھ لگانا:

عورت یا مرد کے ستر کے جس حصہ کو دیکھنا جائز نہیں اس کو ہاتھ لگانا بھی جائز نہیں۔

وما يباح النظر للرجل من الرجل يباح المس كذا في الهداية .

(هندية كتاب الكراهية : ٥/٤٠٤)

وفيه أيضا قال : وما حل النظر إليه حل مسه ونظره وغمزه من غير حائل ولكن انما يباح النظر إذا كان يامن على نفسه الشهوة فاما إذا كان يخاف على نفسه الشهوة فلا يحل له النظر ، وكذالك المس انما يباح له إذا امن على نفسه وعليها الشهوة .

(هندية : ٥/٤٠٥ كراهيه)

اجنبی عورت سے مصافحہ کی ممانعت:

بلا کسی شدید مجبوری کے غیر محرم عو ر کو ہاتھ لگانا شرعاً بڑا گناہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کو ہاتھ کا زنا قرار دیا ہے، چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ

" واليدان تزنيان وزناهما البطش "

یعنی ہاتھوں کا بھی زنا ہے، ہاتھوں کا زنا یہ ہے کہ (اجنبی مرد و عورت کا) ایک دوسرے کو پکڑنا۔

قوله عليه السلام : أن يطعن في رأس أحدكم بمخيط من حديد خير له من أن يمس امرأة لا تحل له . (رواه الطبراني والبيهقي)

''اپنے سر میں سوئی گھونپنا زیادہ بہتر ہے اس سے کہ ایسی عورت کو چھوئے جو اس کے لیے حلال نہ ہو۔''

رسول اللہ ﷺ خود بھی عورتوں سے مصافحہ نہیں فرماتے تھے بلکہ اگر کوئی عورت خود درخواست

کرتی تب بھی آپ ﷺ صاف انکار فرمادیتے تھے، چنانچہ روایت میں ہے:

اخبرنا مالك اخبرنا محمد بن المنكدر عن اميمة بنت رقيقة انها قالت اتيت رسول الله صلى الله عليه وسلم في نسوة فتبايعه قلنا يا رسول الله نبايعك على أن لا نشرك بالله شيئاً ولا نسرق ولا نقتل اولادنا ولا ناتي ببهتان نفتريه بين ايدينا وارجلنا ولا نعصيك في معروف قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فيما استطعتن واطقتن قلنا الله ورسوله ارحم منا بانفسنا هلم نبايعك يا رسول الله قال انى لا اصافح النساء وإنما قولي لمائة امرأة كقولي لامرأة واحدة أو مثل قولي لامرأة واحدة.

(مؤطا إمام محمد، باب ما يكره من مصافحة النساء)

''امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ان بہت سی عورتوں کے ساتھ حاضر ہوئی جو آپ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھیں۔ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم آپ سے بیعت کرتی ہیں کہ ہم اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، پنی طرف سے کسی پر بہتان نہ باندھیں گے، معروف (یعنی احکام شرع) میں نافرمانی نہ کریں گے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس قدر تمہارے اندر استطاعت اور قدرت ہو۔ہم نے کہا اللہ تعالی اور اس کے رسول ﷺ ہم پر خود سے زیادہ شفیق ہیں۔یارسول اللہ! اپنے دستِ مبارک ہماری طرف بڑھائیے تاکہ ہم آپ سے بیعت کریں۔تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا ہوں میرا سوعورتوں سے کچھ کہنا ایک عورت کو کہنے کی طرح یا ایک عورت کو کہنے کی مانند ہے۔(مؤطاامام محمد)

لہٰذا امت کے لیے بھی یہی حکم ہے کہ کسی اجنبی عورت سے مصافحہ کرنا جائز نہیں اگرچہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، مثلاً: چچی، ممانی، چچازاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد، خالوزاد، پھوپھاوغیرہ یعنی ایسا رشتہ جن سے پردہ کرنا فرض ہے ان سے مصافحہ کرنا ناجائز ہے۔

ساس سے مصافحہ خطرہ کی گھنٹی:

جب کسی عورت سے شادی ہوجائے تو اس کی ماں اپنی ماں کی طرح ہوتی ہے حرمت میں اس

سے مصافحہ وغیرہ کرنا شرعاً نفسہ جائز ہے تاہم اس میں ایک خطرہ ہے کہ بوقتِ مصافحہ اگر کسی ایک طرف شہوت ابھر آئے اور یہ مصافحہ بلا کسی حائل کے ہو تو ایسی صورت میں حرمتِ مصاہرت ثابت ہو جاتی ہے پھر اس سے بیوی حرام ہو جاتی ہے اور یہ حرام ہونا ایسا خطرناک ہے کہ طلاق میں تو پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں حلال ہونے کی گنجائش ہوتی ہے جبکہ حرمت مصاہرت کے ذریعہ جو حرمت ثابت ہوتی ہے وہ حرمت ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے۔ اب آگے پھر دو ہی صورتیں ہیں یا تو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہو قیامت کی رسوائی اور جہنم کے عذاب کا ڈر ہو اور بیوی سے الگ ہو جائے اگر ایسا نہیں کرتا ہے اور بیوی کو ساتھ رکھتا ہے تو زندگی بھر حرام کام میں مبتلا رہے گا اس سے بڑا گناہ اور کیا ہو سکتا ہے اس لیے ساس سے معانقہ اور مصافحہ کرنے سے احتیاط کرنا چاہیے۔

والخلوة بالمحرم مباحة الا الاخت رضاعا والصهرة الشابة .

(ردالمحتار: ۲۶۹/۶۱ فصل فی اللمس والنظر)

یعنی محرم مردوں کے ساتھ خلوت میں بیٹھنا جائز مگر رضاعی بہن اور جوان ساس کے ساتھ خلوت سے اجتناب کرنا چاہئے۔

اشکال:

بعض لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے آدمی سسرال میں جائے اور پھر ساس سے معانقہ/ مصافحہ بھی نہ کرے تب تو ساری رشتہ داری ہی ختم ہو جائے گی۔ یہ اشکال ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جو مزاجِ شریعت سے ناواقف ہو۔ احتیاط کرنے کے لیے تو اس لیے کہا جا رہا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ شہوت سے مغلوب ہو جائیں اور اس حالت میں مصافحہ کر کے ہمیشہ کے لیے بیوی سے محروم ہو جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح سلام کیا جائے کہ زبان سے ''السلام علیکم'' کہا جائے اور خیر خیریت معلوم کی جائے تو میرے خیال میں انشاء اللہ رشتہ داری اس طرح قائم رہ سکتی ہے۔

مرد کے لیے انگوٹھی کا حکم:

مرد کے لیے دو شرطوں سے انگوٹھی پہننا جائز ہے:

۱۔ چاندی کی ہو۔

۲۔ پانچ ماشے ۴۸۶ء۴ گرام سے کم ہو۔

نگینے میں کوئی قید نہیں، جس چیز کا بھی ہو اور جتنے وزن کا بھی ہو جائز ہے۔

قال العلامة التمرتاشي رحمه اللّٰه تعالىٰ : ولا يتحلي الرجل بذهب و فضة إلا بخاتم ومنطقة وحلية سيف منها ولا يتختم بغيرها كحجر وذهب وحديد وصفر والعبرة بالحلقة لا بالفص .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله ولا يتختم إلا بالفضة) هذه عبارة الإمام محمد رحمه اللّٰه تعالىٰ فى الجامع الصغير اي بخلاف المنطقة فلا يكره فيها حلقة حديد ونحاس كما قدمه وهل حلية السيف كذلك يراجع قال الزيلعي رحمه اللّٰه تعالىٰ وقد وردت اثار في جواز التختم بالفضة وكان للنبي صلى اللّٰه عليه وسلم خاتم فضة وكان فى يده الكريمة حتى توفى صلى اللّٰه عليه وسلم ثم فى يد ابى بكر رضي اللّٰه عنه الى ان توفى ثم فى يد عمر رضي اللّٰه عنه الى ان توفي ثم فى يد عثمان رضي اللّٰه عنه الى ان وقع من يده فى البئر فانفق مالا عظيما فى طلبه فلم يجده ووقع الخلاف فيما بينهم والتشويش من ذلك الوقت إلى ان استشهد رضي اللّٰه عنه (قوله فيحرم بغيرها) لما روي الطحاوي بإسناده إلى عمران بن حصين وأبي هريرة رضي اللّٰه عنهما قالا نهى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم عن خاتم الذهب وروي صاحب السنن بإسناده إلى عبد اللّٰه بن بريدة عن ابيه رضي اللّٰه عنه ان رجلا جاء إلى النبي صلى اللّٰه عليه وسلم.وعليه خاتم من شبه فقال له مالى اجد منك ريح الأصنام فطرحه ثم جاء وعليه خاتم من حديد فقال مالى اجد عليك حلية أهل النار فطرحه فقال يا رسول اللّٰه اي شيء إتخذه قال اتخذه من ورق ولا تتمه مثقالا فعلم ان التختم بالذهب والحديد والصفر حرام فالحق اليشب بذلك لانه قد يتخذ منه الأصنام فاشبه الشبه الذي هو منصوص معلوم بالنص اتقانى والشبه محركا لنحاس قاموس وفي الجوهرة والتختم بالحديد والصفر والنحاس والرصاص مكروه

للرجال والنساء . (ردالمحتار : ١/٢٢٩ ، أحسن الفتاویٰ : ٩/٦٩)

خواتین کے لیے انگوٹھی کی تفصیل:

خواتین کے لیے سونے، چاندی کے علاوہ دوسری دھات لوہا، پیتل وغیرہ کی انگوٹھی استعمال کرنے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ عورتوں کے لیے سونے چاندی کے علاوہ کسی دوسری دھات، لوہا، پیتل وغیرہ کی انگوٹھی پہننے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے بعض مکروہ تحریمی کہتے ہیں بعض تنزیہی اور بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ بلا کراہت جائز ہے اس لیے احتیاط اس میں ہے کہ سونے چاندی کے علاوہ دوسری دھات کی انگوٹھی استعمال نہ کی جائے تاہم اگر کوئی استعمال کرے تو اس کی گنجائش ہے۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالیٰ : تحت قوله (فيحرم بغيرها) وفي الجوهرة والتختم بالحديد والصفر والنحاس والرصاص مكروه للرجال والنساء . (ردالمحتار : ٦/٣٥٩)

وفي العالمكيرية قال : التختم بالحديد والصفر والنحاس والرصاص مكروه للرجال والنساء ـ إلى ...... قوله ولا بأس بأن يتخذ خاتم حديد قد لوي عليه فضة (أو ذهب) حتى لا يرى كذا في المحيط .

وفي إمداد الأحكام قال ، قلت : والكراهة إذا اطلقت يرادبها كراهة التحريم وبالجملة فلا يجوز التختم بشيء من المعادن الا للرجال بالفضة وللنساء بها وبالذهب إلى ...... قوله اما قوله صلى الله عليه وسلم التمس ولو خاتما من حديد فلا يدل على جواز اللبس وإنما يدل على جواز اعطائه للمرأة في مهرها لتنفع به بيعها ونحوه وقد حمله علماء نا الحنفية على المبالغة في الالتماس ، فإن المهر عندهم لا يكون اقل من دينار ممعناه التمس ولو شيئاً قليلا حتى تعجله في مهرها .(٤/٣٥٨)

وفي الحاوي للفتاویٰ قال : اما التختم بسائر المعادن ما عد

الذهب فغير حرام بلا خلاف لكن هل يكره وجهان : احدهما نعم لحديث بريدة أن رجلا جاء إلى النبي صلى الله عليه وسلم عليه خاتم من شبه (أي النحاس الاصفر) فقال مالي اجد منك ريح الأصنام فطرحه ثم جاء وعليه خاتم من حديد فقال مالي أري عليك حلية اهل النار . فطرحه فقال : يا رسول الله من أي شيء اتخذه ، قال اتخذه من ورق ولا تتمه مثقالاً ، أخرجه ابو داود ، والترمذي وفي سنده رجل متكلم فيه فضعفه النووي في شرح المهذب لاجله ولكن ابن حبان صححه فاخرجه في صحيحه .

والوجه الثاني أنه لا يكره ورجحه النووي في الروضة وفي شرح المهذب قال لضعف الحديث الأوّل ، ولما أخرجه ابو داود بأسناد جيد عن معيقب الصحابي قال كان خاتم النبي صلى الله عليه وسلم من حديد ملوى عليه الفضة . (الحاوي للفتاوىٰ : ۱/ ۷۵)

فتاویٰ رشیدیہ میں ہے لوہے اور پیتل کی انگوٹھی میں مرد اور عورت یکساں ہیں اور کراہت ان کے پہننے کی تنزیہی ہے نہ تحریمی کہ مسئلہ مجتہد فیہا ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں مردوں کو بھی درست ہے۔ (فتاویٰ رشیدیہ : ص ۴۹۱)

دانتوں کے گرد سونے چاندی کا خول لگانا:

بعض لوگوں کے دانت ہلتے ہیں اور بعض کے تو نکل کر گر جاتے ہیں اس کے بعد بعض لوگ سونے چاندی کے خول چڑھاتے ہیں شرعاً یہ جائز ہے یا نہیں اس کے ساتھ وضوء غسل کا کیا حکم ہو گا؟

واضح ہو کہ ایسا خول لگانا چونکہ ضرورت میں داخل ہے اور اتارنے میں حرج ہے وہ مدفوع ہے شرعاً لہٰذا ایسا خول چڑھانا جائز ہے اور بدون اتارے وضوء اور غسل صحیح ہو جائے گا۔

ونظائرها مشهورة وفي كتب القوم مسطورة ، بل نصوا على جواز اتخاذ الاسنان من الذهب وشدها به ولو كان مانعا عن صحة الغسل لما افتوا به . (أحسن الفتاوىٰ : ۲/ ۳۳)

إذا تعطل الضرس أو نخر، واحتاج الرجل إلى استعمال الذهب في تلبيسه، فإنه يجوز له للضرورة، للقاعدة الشرعية المشهورة، وهي قولهم: "الضرورات تبيح المحظورات" فإن استعمال غير الذهب، في إصلاح الأضراس أو الأسنان، قد لا يصلح، حيث يتعفن الضرس ويتسوس بواسطة الطعام، ولا ينفع في حمايته إلا الذهب، لأنه لا يتغير ولا ينتن.

ودليل الإباحة ما روي عن الصحابي "عرفجة بن أسعد" أنه قال: "أصيب أنفي ـ أن في إحدي الغزوات ـ فاتخذت أنفا من ورق ـ أي من فضة ـ فأنتن علي ـ أي صار له ريحة كريهة منتنة بالتغير ـ فأمرني رسول الله صلى الله عليه وسلم أن أتخذ أنفا من ذهب.

فدل هذا الحديث على جواز استعمال الذهب للرجال عند الضرورة.

علامہ صابونی فرماتے ہیں کہ سونے کے خول چڑھانا جائز ہونے کی دلیل حدیث عرفجہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک غزوہ میں میری ناک شہید ہوگئی میں نے چاندی کی ناک بنوالی وہ بدبودار ہوگئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سونے کی ناک بنوالو۔

قال الفقهاء: يجوز لمن سقطت أسنانه، أو تعفنت أضراسه، أن يتخذ بدلها من الذهب أو الفضة، وكذلك يجوز لمن قطعت أنفه أن يتخذ بدلها من الفضة أو الذهب.

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

اگر کسی شخص کا دانت ہلنے لگے تو اس کو سونے یا چاندی کی تار سے باندھنا جائز ہے جیسا کہ فتاوی قاضی خان میں ہے:

إذا تحركت ثنية الرجل إلى أن قال فشدها بذهب او فضة لا بأس به و ليس هذا كالحلى الخ. (إمداد المفتين: صـ ٨١٥)

قال محمد رحمه الله يشدها بالذهب ايضاً وهو رواية عن الإمام

أبي حنيفة ذكره الحاكم في المنتقى وافتى في خلاصة الفتاوى بجواز إتخاذ السن من الذهب والفضة .

(فتاوىٰ عالمگیري كتاب الكراهة باب عاشر ٤/٢١٤)

سونے چاندی کے برتن استعمال کرنا:

آج کل بعض لوگ کھانے پینے کیلئے ایسے برتن استعمال کرتے ہیں جو کہ چاندی یا سونے کے بنے ہوتے ہیں، کیا از روئے شریعت ایک مسلمان کیلئے ایسے برتنوں کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟

یاد رہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات سادگی اور بے تکلفی کا مظہر ہیں، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینا تکلف اور تکبر ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس قسم کے برتنوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے لہٰذا ایسے برتنوں کا استعمال جائز نہیں۔

عن حذيفة رضي الله عنه قال نهانا النبي صلى الله عليه وسلم أن نشرب في آنية الذهب والفضة وأن ناكل فيها وعن نلبس الحرير والديباج وأن نجلس عليه .

(الصحيح البخاري : ٢/٨٦٨ كتاب اللباس ، باب مس الحرير من غير لبس)

سونے چاندی کے کیس کی گھڑیاں اور سونے کے نب کا قلم:

سونے چاندی کے کیس کی گھڑیاں اور سونے کے نب کا قلم استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں امداد المفتین سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: آج کل ولایتی گھڑیاں سونے اور چاندی کی جو رائج ہیں ان کا استعمال شرعاً جائز ہے یا ناجائز۔ اندرونی پرزے تمام لوہے کے ہوتے ہیں اوپر کا خول جو ہوتا ہے اس میں بھی غالب حصہ دوسری دھات کا ہوتا ہے اور کمتر سونے کا۔ نیز یہ بھی مطلع فرمائیں کہ آیا ایسی چیزوں پر زکوۃ دینا چاہیے یا نہیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ فاؤنٹین پین (ولایتی قلم) جس میں سونے کا نب رہتا ہے اس کا استعمال بھی جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: یہ ولایتی گھڑیاں جن کا کیس سونے چاندی کا کیا جاتا ہے اس میں چونکہ دوسری دھاتیں غالب اور سونا، چاندی مغلوب ہوتا ہے اس لیے یہ سونے چاندی کے حکم میں نہیں بلکہ عام دھاتوں کی طرح اسباب ومتاع میں داخل ہیں۔ (صرح بہ الہدایہ وغیرہا) لہٰذا ان کا استعمال

مردوں کے لیے جائز ہے اور زکوٰۃ بھی مثل سونے اور چاندی کے ان پر نہیں آتی، البتہ اگر تجارت کے لیے گھڑیاں ہوں تو عام تجارتی مال کی طرح ان پر بھی زکوٰۃ آئے گی، فاؤنٹین پین میں بھی جو ب ہوتا ہے وہ بھی غالباً سونے کا نہیں ہوتا اس لیے جائز ہے۔

احکام الصید والذبائح

اللہ تعالیٰ نے حیوانات میں ان جانوروں کو انسان کے لیے حلال قرار دیا جن کا گوشت انسان کے لیے نافع ہے۔ جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں وغیرہ اسی طرح بعض جنگلی جانوروں کو بھی حلال قرار دیا ہے جیسے نیل گائے، خرگوش، ہرن وغیرہ۔ جس کی تفصیل حظر واباحۃ کے تحت گزر چکی ہے یہاں شکار اور ذبح کے احکام کا بیان ہے۔

قوله تعالىٰ : ﴿ أحلت لكم بهيمة الأنعام ﴾ (المائدة : ١)

''حلال ہوئے تمہارے لیے چوپائے مویشی۔''

وقوله تعالىٰ : ﴿ يسئلونك ماذا أحل لهم قل أحل لكم الطيبٰت وما علمتم من الجوارح مكلبين تعلمونهن مما علمكم الله فكلوا مما امسكن عليكم واذكروا اسم الله عليه واتقوا الله إن الله سريع الحساب ﴾ (سورة المائدة : ٤)

''یعنی لوگ پوچھتے ہیں کیا کیا جانور ان کے لیے حلال کیے گئے ہیں فرما دیجئے کہ تمہارے لیے کل حلال جانور حلال رکھے گئے ہیں جن شکاری جانوروں کو تم تعلیم دو اور تم ان کو (شکار پر) چھوڑ دو اور ان کو اس طریقہ سے تعلیم دو جو تم کو اللہ نے تعلیم دیا ہے، تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھالو اس پر اللہ کا نام بھی لیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو بے شک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔''

شکار کے حلال ہونے کی شرائط:

اوّل یہ کہ شکاری کتا یا باز سکھایا اور سدھایا ہوا ہو اور سکھانے سدھانے کا یہ اصول قرار دیا ہے کہ جب تم کتے کو شکار پر چھوڑ و تو وہ شکار پکڑ کر تمہارے پاس لے آئے۔ خود اس کو کھانے نہ لگے۔ اور باز کے لیے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ جب تم اس کو واپس بلاؤ تو وہ فوراً آ جائے اگر چہ وہ شکار

کے پیچھے ' رہا ہو۔ جب یہ شکاری جانور ایسے سدھ جائیں تو اس سے ثابت ہوگا کہ وہ جو شکار کرتے ہیں تمہارے لیے کرتے ہیں اپنے لیے نہیں، اب ان شکاری جانوروں کا شکار خود تمہارا شکار سمجھا جائے گا اور اگر کسی وقت وہ اس تعلیم کے خلاف کریں مثلاً کتا خود شکار کو کھانے لگے یا باز تمہارے بلانے پر واپس نہ آئے تو یہ شکار تمہارا نہیں رہا۔ اس لیے اس کا کھانا جائز نہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ تم فوراً اپنے ارادہ سے کتے کو یا باز کو شکار کے پیچھے چھوڑو یہ نہ ہو کہ وہ خود بخود کسی شکار کے پیچھے دوڑ کر اس کو شکار کر لیں۔ آیتِ مذکورہ میں اس شرط کا بیان لفظ ''مکلبین'' سے کیا گیا ہے۔ یہ لفظ دراصل تکلیب سے مشتق ہے، جس کے اصلی معنی کتوں کو سکھلانے کے ہیں، پھر عام شکاری جانوروں کو سکھلانے اور شکار پر چھوڑنے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔ صاحبِ جلالین اس جگہ مکلبین کی تفسیر ارسال سے کرتے ہیں جس کے معنی ہیں شکار پر چھوڑنا اور تفسیر قرطبی میں بھی یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ شکاری جانور شکار کو خود نہ کھانے لگیں بلکہ تمہارے پاس لے آئیں۔ اس شرط کا بیان ﴿ مما امسکن علیکم ﴾ سے ہوا ہے۔

چوتھی ش یہ ہے کہ جب شکاری کتے یا باز کو شکار پر چھوڑو تو بسم اللہ کہہ کر چھوڑو جب یہ چاروں شرطیں پوری ہوں تو اگر جانور تمہارے پاس آنے تک دَم توڑ چکا ہو تو بھی حلال ہے ذبح کرنے کی ضرورت نہیں۔ ورنہ بغیر ذبح کے تمہارے لیے حلال نہ ہوگا۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ یہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کردے۔ اس شرط کی طرف لفظ جوارح میں اشارہ موجود ہے۔

مسئلہ: یہ حکم ان وحشی جانوروں کا ہے جو اپنے قبضہ میں نہ ہوں اور اگر کسی وحشی جانور کو اپنے قابو میں کرلیا گیا ہے تو وہ بغیر باقاعدہ ذبح کے حلال نہیں ہوگا۔

آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کردی گئی ہے کہ شکار جانور کے ذریعہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے حلال تو کر دیا ہے، مگر شکار کے پیچھے لگ کر نماز اور ضروری احکامِ شرعیہ سے غفلت برتنا جائز نہیں۔

(معارف القرآن : ٣ / ٤٠ ، سورة المائدة)

ذبح کرنے کا شرعی طریقہ:

ذبح کرنے کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ جانور کو قبلہ رُو لٹا کر تیز چھری ہاتھ میں لے کر قبلہ رُخ ہو کر

بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر گلے پر چلائی جائے یہاں تک گلے کی چار رگیں کٹ جائیں، ایک نرخرہ، جس سے جانور سانس لیتا ہے، دوسری وہ رگ جس سے دانہ پانی جاتا ہے، اور دو شہ رگیں جو نرخرہ کے دائیں بائیں ہوتی ہیں، اگر ان چاروں میں سے تین کٹ جائیں تو بھی ذبح درست ہے اور اس کا کھانا حلال ہے، البتہ اگر دو ہی رگیں کٹیں تو جانور مردار ہوگا اس کا کھانا جائز نہ ہوگا۔

قال في التنوير : وعروقه الحلقوم والمري ، والودجان وحل بقطع اي ثلاث منها ، وقال ايضا : وندب احداد شفرته قبل الاضجاع .

(ردالمحتار : ٥/٢٠٦ كتاب الذبائح)

ذبح کے وقت بسم اللہ کا حکم:

ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا ضروری ہے، لہٰذا جس جانور کو ذبح کرتے ہوئے جان بوجھ کر اللہ کا نام نہ لیا جائے اس کا گوشت حلال نہیں، خواہ ذبح کرنے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو، البتہ اگر بسم اللہ پڑھنا یاد نہ رہے تو ذبیحہ حلال ہوگا، شافعی حضرات مسلمان کے ذبیحہ کو مطلقاً حلال قرار دیتے ہیں خواہ عمداً تسمیہ چھوڑ دے یا نسیاناً۔

لقوله تعالیٰ : ﴿ ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه وإنه لفسق وإن الشيطين ليوحون إلى أوليهم ليجادلوكم ﴾

(سورة الأنعام : ١٢١)

''اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یہ کھانا گناہ ہے، یقیناً شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے دوستوں کے تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں۔''

ذبح کے وقت بسم اللہ غیر عربی میں کہنے کا حکم:

ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے، لیکن بسم اللہ کو عربی زبان میں کہنا ضروری نہیں چنانچہ اگر کوئی ذبح کے وقت کہے کہ اللہ کے نام پر ذبح کرتا ہوں، تب بھی ذبیحہ حلال ہوگا۔ احسن الفتاویٰ ۷/۴۰۵ میں ہے:

لإن الفقهاء رحمهم الله لم يشترطوا العربية ولو كان لذكروه .

لیکن افضل اور مستحب یہی ہے کہ عربی میں یوں کہے: ''بسم اللہ اللہ اکبر''

عورت کے ذبیحہ کا حکم:

اگر کوئی مسلمان خاتون جو ذبح کے طریقے سے واقف ہو وہ اللہ کا نام لے کر جانور ذبح کرے تو یہ بھی جائز ہے، اس میں کوئی کراہت نہیں۔ ذبیحہ بلا کراہت حلال ہے۔

ذبح کے وقت پوری گردن کٹنے کا حکم:

ذبح کے وقت پوری گردن کاٹنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں جانور کو بلا ضرورت زائد تکلیف پہنچانا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص قصداً پوری گردن کاٹ دے تو یہ فعل اگر چہ مکروہ ہے تاہم گوشت کا استعمال مکروہ نہیں ہے۔

نابالغ بچہ کے ذبیحہ کا حکم:

اگر نابالغ بچہ ذبح کا طریقہ جانتا ہو اور پھر اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

گونگے کے ذبیحہ کا حکم:

گونگے مسلمان کا ذبیحہ بھی حلال ہے۔

وشرط كون الذابح مسلمان حلا لا إلى ...... قوله ولو الذابح مجنونا أو امرأة أو صبيا يعقل التسمية والذبح ويقدر أو اقلف أو اخرس ...... (ردالمحتار : ٢٩٧/٦ كتاب الذبائح)

اہل کتاب کے ذبیحہ کا حکم:

مسلمان کی طرح اہل کتاب یعنی یہودی، نصرانی جو دین سماوی پر ایمان رکھتا ہو اور ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کے نام لینے کو ضروری سمجھتا ہو ان کا ذبیحہ فی نفسہ حلال ہے۔

لقوله تعالىٰ : ﴿ وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم وطعامكم حل لهم ﴾ (سورة المائدة : ٥)

قال ابن عباس : (طعامهم) ذبائحهم . (البخاري : ٣١١/٣)

وقال جمهور الامة إن ذبيحة كل نصراني حلال سواء كان من بني تغلب وغيرهم وكذلك اليهود . (تفسير قرطبي : ٧٨/٦)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ تمام کفار میں سے اہل کتاب یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دین میں

سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود ان دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی بالکل اسلام کے مطابق ہے یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں اس کے بغیر جانور کو مردار میتہ ناپاک اور حرام قرار دیتے ہیں۔الخ (معارف القرآن : ۵۱/۳)

وطعام اهل الكتاب قال ابن عباس وابو امامه ومجاهد وسعيد بن جبير وعكرمة وعطاء والحسن ومكحول وإبراهيم النخعي والسدي ومقاتل بن حيان يعني ذبائحهم حلال للمسلمين لانهم يعتقدن تحريم الذبح لغير اللّٰه و كرون على ذبائحهم إلا اسم اللّٰه وإن اعتقدوا فيه تعالىٰ ما هو منزه عنه تعالىٰ وتقدس .

(تفسير ابن كثير مائدة : ۱۹/۳)

اب اگر کوئی نصرانی ذبح کے وقت اللہ کے نام کے بجائے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے تو ان کا ذبیحہ حرام ہوگا۔

ويشترط لحل ذبيحة الكتابي أن لا يذكر اسم غير اللّٰه ، فإن ذكر اسم المسيح عند الذبح حرمت ذبيحة ، لإنه احل لغير اللّٰه ، وقد حرم اللّٰه ما اهل به لغيره اي ذكر عليها اسم غير اللّٰه تعالىٰ عند الذبح .

(فقه المعاملات)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کوئی یہودی یا نصرانی دین سماوی پر قائم ہو اور اسلامی طریقہ پر ذبح کو ضروری سمجھتا ہو اور وہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیکر ذبح کرے تو اس کا ذبیحہ حلال ہے، لیکن موجودہ زمانہ میں ایسے اہل کتاب ناپید ہو چکے ہیں، لہٰذا یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ حرام کہا جائے گا۔

چنانچہ حضرت مفتی اعظم مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب رحمہ اللہ ذبیحہ اہل کتاب پر مفصل بحث فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ'' مگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ وہ اسلامی طریقہ کے مطابق ذبح کو ضروری نہیں سمجھتے کسی بھی طریقہ سے مار دینے کو کافی سمجھتے ہیں اور یہ ان کے ہاں عام معمول ہے، مرغی پکڑی گردن مروڑ دی اور کھینچ کر الگ کردی، لہٰذا ان کا ذبیحہ منخنقۃ یا موقوذۃ کے حکم ہونے کی بناء پر حرام ہے۔'' (احسن الفتاوی : ۴۱۶/۷)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

یادرکھنا چاہیے کہ آج کل جولوگ نصاریٰ کہلاتے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو دہریے ہیں کسی مذہب ہی کونہیں مانتے بلکہ خدا کے وجود ہی کونہیں مانتے بلکہ خدا کے وجود ہی کے قائل نہیں یہ لوگ اگر چہ مردم شماری کے اعتبار سے نصاریٰ کہلاتے ہیں، مگر حکم شرع میں ایسے لوگ اہل کتاب نہیں ہو سکتے، ان کا ذبیحہ بھی کسی حال میں درست نہیں اگر چہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کرے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ غیر مسلم یہود ونصاریٰ کے ذبیحہ سے بھی تابمقدور احتراز کرے۔

(امداد المفتین : ۹۳۱/۱٦)

مذبوح جانور کے پیٹ سے نکلنے والے بچہ کا حکم:

اگر جانور ذبح کرنے کے بعد اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکلا تو اس کا کھانا حرام ہے، اس کو استعمال میں نہ لایا جائے اور اگر زندہ بچہ نکلا تو اس کو اگر شرعی طریقہ سے ذبح کیا جائے تو اس کا گوشت حلال ہوگا، فقہاء جو لکھتے ذکاۃ الجنین ذکاۃ امہ اسکا مطلب یہی نکلتا ہے کہ بچے کے ذبح کا وہی طریقہ ہے جو ماں کے ذبح کا ہے۔

قال فی شرح التنویر : وفي منظومة النسفي قوله إن الجنين مفرد بحكمه لم يتذك بذكاة امه . فحذف المصنف إن وقالا إن تم خلقه اكل لقوله عليه الصلوٰة والسلام ذكاة الجنين ذكاة امه وحمله الإمام على التشبيه اي كذكاة امه بدليل انه روي بالنصب وليس في ذبح الأم اضاعة الولد لعدم التيقن بموته . (ردالمحتار : ٥/٢١٣)

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ٧/٤٠٩)

جانور ٹھنڈا ہونے سے پہلے سر جدا کرنا:

ٹھنڈا ہونے سے پہلے مذبوح جانور کا سر تن سے علیحدہ کر دینا مکروہ ہے کیونکہ اس میں بے فائدہ جانور کو تکلیف پہنچانا ہے، البتہ ذبیحہ حلال ہے۔

قال فی الدر المختار : وكره كل تعذيب بلا فائدة مثل قطع الرأس والسلخ قبل ان تبرد . (ردالمحتار : ٥/٢٠٥ ، كتاب الذبائح)

بندوق کا شکار بدون ذبح حلال نہیں:

بندوق کا شکار اگر ذبح کرنے سے پہلے مر جائے تو وہ حرام ہو جاتا ہے اس کا کھانا حلال نہیں

ہے، درمختار میں ہے:

او بندوقة ثقلة ذات حدة لقتلها بالثقل لا بالحد الخ ۔

اور شامیہ میں ہے:

قال قاضي خان لا يحل صيد البندوقه والحجر والمعراض والعصاء وما اشبه ذلك وإن جرح لانه لا يخرق إلى أن قال فاما لجرح الذي يدق في الباطن ولا يخرق في الظاهر لا يحل لإنه لا يحصل به انهار الدم والاصل إن الموت إذا حصل بالجرح بيقين حل وإن بالثقل او شك فيه لا يحل حتما أو احتياطاً ۔

(ماخوذ از إمداد المفتين)

بندوق اور غلیل کے شکار کا حکم:

بندوق کے چھرے اور گولی اور غلیل کے غلے ان سب کا حکم شرعی یہ ہے کہ ان کے ذریعے ذبح کا تحقق نہیں ہوتا اگرچہ بسم اللہ کہہ کر بندوق یا غلیل چھوڑی جائے وجہ یہ ہے کہ ذبح کرنے میں جن چاروں رگوں کا قطع کرنا ضروری ہے ان میں یہ شرط ہے کہ ان کو دھار دار چیز سے قطع کیا جائے کسی بوجھل چیز کے صدمے سے توڑا نہ جائے بندوق کے چھرے گولی اور غلیل کے غلے ظاہر ہے کہ دھار دار نہیں ہوتے اس لیے ان سے جو زخم لگتا ہے وہ قطع کرنے کے حکم میں نہیں ہو سکتا۔ یہی مذہب مفتی بہ ہے جس کی تصریح عالمگیری نے کتاب الذبائح میں کی ہے۔ نیز درمختار میں ہے:

وحل الذبح بكل ما افرى الاوداج فانهر الدم ۔

(الدر المختار ص ۲۹٤ كتاب الذبائح)

جس سے معلوم ہوا کہ ذبح کے لیے قطع کرنا عروق اربعہ کا ضروری ہے توڑ دینے سے یہ صورت حاصل نہیں ہو سکتی۔ (امداد المفتین: صفحہ ۹۴۳)

حرام مغز کا حکم:

فقہ حنفی کی کتابوں میں عام طور پر حلال جانور کے سات اجزاء کو حرام لکھتے ہیں، حالانکہ حرام مغز کا کھانا بھی حرام ہے۔

كما صرح به الطحاوي على الدر ٥/٣٦ حيث قال وزيد نخاع

الصلب . (ماخوذ از امداد المفتین)

مشینی ذبیحہ کا حکم:

مشینی ذبیحہ کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے ایک سوال وجواب یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

کیا فرماتے ہیں علماءِ دین ومفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں:

۱۔ بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ احادیث میں جو طریق ذبح مذکور ہے یعنی حلق اور لبہ پر چھری، چاقو وغیرہ دھاری دار آلہ سے ذبح یا نحر کرنا ''امر تعبدی'' نہیں بلکہ ''امر عادی'' ہے۔ عرب میں چونکہ اسی طرح جانور ذبح کیے جاتے تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے بھی چند ہدایات کے ساتھ اسی طریق کو قائم رکھا، لہٰذا مسلمان یا کتابی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر جس طریق پر بھی جانور ذبح کرلیں، ذبیحہ حلال ہوگا یہ قول صحیح ہے یا نہیں؟

۲۔ صنعتی ترقی کے اس مشینی دور میں انسان زیادہ سے زیادہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی بجائے مشینوں سے لے رہا ہے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں ایسی برقی مشینیں ایجاد ہوگئی ہیں کہ بہت سارے جانور اس کے نیچے کھڑے کر دیے جاتے ہیں اور ایک مرتبہ بٹن دبانے سے ان سب کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔ تو اگر بٹن دبانے والا مسلمان یا کتابی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر بٹن دبائے تو یہ ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟

الجواب از حضرت مفتی محمد شفیع صاحب

۱۔ یہ قول صحیح نہیں، جانور کے حلال ہونے کے لیے بنص قرآن ''ذکاۃ شرعی'' ضروری ہے اور ''ذکاۃ اختیاری'' کا طریقہ شرعیہ ذبح یا نحر ہے اور ان کا محل حلق اور لبہ ہے جس کا تعین حدیث صحیح میں ''امور عادیہ'' کے طور پر نہیں بلکہ ''تشریعی'' طریقہ پر کیا گیا ہے۔

۲۔ اس طرح جانور کی گردن اوپر کی طرف سے کاٹ کر علیحدہ کر دینا، خواہ دستی چھری کے ذریعہ ہو یا کسی مشین کے ذریعہ، ذبح کے شرعی طریقہ کے خلاف اور باتفاق جمہور ناجائز اور گناہ ہے۔ البتہ جو جانور اس ناجائز طریقہ سے ذبح کر دیا گیا ہے اس کا گوشت حلال ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بٹن دبانے سے بیک وقت چھری سب جانوروں کی گردنوں پر آ گئی اور بسم اللہ پڑھ کر بٹن دبا دیا گیا تو یہ ایک بسم اللہ سب کیلئے کافی ہوگئی اور اگر آگے پیچھے گردنیں کٹیں تو یہ بسم اللہ پہلے

جانور کیلئے کافی ہوگی ، باقی جانوروں کے لیے یہ بسم اللہ معتبر نہ ہوگی اور اسی لیے باتفاقِ امت یہ جانور حرام اور مردار قرار پائیں گے۔

پھر اس طرح گردن کے اوپر سے ذبح کیے ہوئے جانور، جن پر بسم اللہ پڑھنا معتبر بھی ہے، ان کے حلال ہونے میں فقہاء صحابہ وتابعین میں اختلاف ہے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کا بھی حرام ہونا منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اس طریقہ ذبح کے ناجائز اور گناہ ہونے کے باوجود اس کے گوشت کو حلال قرار دیتے ہیں۔

(صحیح بخاری کتاب الذبائح)

تفصیل وتشریح جواب:

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قرآن کریم نے کسی جانور کا گوشت حلال ہونے کے لیے ذکاۃ کو ضروری قرار دیا ہے بغیر ذکاۃ شرعی کے ذبیحہ قطعاً حرام ہے۔ یہ ذکاۃ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کی تشریح عنقریب آئے گی۔

سورۂ مائدہ میں قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے:

﴿ حرمت عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما اهل لغير اللّٰه به والمنخنقة والموقوذة والمتردية والنطيحة وما اكل السبع إلا ما ذكيتم ﴾

اس آیت کریمہ میں حرمت سے مستثنیٰ صرف وہ جانور ہیں جن کو ذکاۃ شرعی کے ذریعہ حلال کر لیا گیا ہو۔ ذکاۃ شرعی کے متعلق امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں فرمایا:

وحقيقة التذكية إخراج الحرارة الغريزية لكن خص في الشرع بابطال الحياة على وجه دون وجه .

امام راغب کی اس تصریح سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ ذکاۃ مطلقاً جانور کو قتل کردینے کا نام نہیں، بلکہ اس کے لیے ایک خاص طریقہ مقرر ہے۔ دوسرے یہ کہ خاص طریقہ محض عادات ورسوم کے تابع نہیں، بلکہ ایک شرعی اصطلاح اور ایک قانون ہے۔

پھر قرآن وسنت نے ذکاۃ کی دو صورتیں قرار دی ہیں۔ ایک اختیاری، جیسے گھریلو اور پالتو جانوروں کی ذکاۃ۔ دوسرے غیر اختیاری، جیسے شکار یا جو جانور کسی وجہ سے قابو سے نکل جائے

مقررہ طریق پر ذبح نہ کیا جا سکے۔ دوسری صورت کی ذکاۃ حسب تصریح احادیث صحیحہ بسم اللہ کے ساتھ تیر یا نیزہ وغیرہ سے زخم لگا کر زخمی کر دینا اور خون بہا دینا ہے۔ ذبح یا نحر شرط نہیں۔

اور پہلی قسم یعنی اختیاری ذکاۃ کے لیے ذبح یا نحر ضروری ہے۔ گائے، بیل اور بکری میں ذبح کرنے کا اور اونٹ میں نحر کرنے کا حکم ہے۔

ذبح کی حقیقت یہ ہے کہ چار رگیں تو حلقوم اور مری اور ان دونوں کے دو طرف گردن کی رگیں جن کو ودجین کہا جاتا ہے، ان کو قطع کر دینا اور نحر کی صورت یہ ہے کہ جانور کو کھڑا کر کے اس کے لبہ یعنی حلقوم کے گھڑے میں نیزہ یا چھری مار کر ذبح بہا دیا جائے۔

قرآن عزیز میں گائے کے متعلق ﴿ ان تذبحوا بقرة ﴾ اور ﴿ فذبحوها ﴾ کے الفاظ سے اور دنبہ کے متعلق ﴿ فدیناه بذبح عظیم ﴾ کے الفاظ سے معلوم ہوا کہ گائے، بیل، بکری، دنبہ وغیرہ میں ذبح کرنا مسنون ہے اور ﴿ فصل لربك والنحر ﴾ کے الفاظ سے اونٹ کا نحر کرنا معلوم ہوا۔ کیونکہ یہ آیت اونٹ کی قربانی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ دوسری جگہ قرآن کریم میں اونٹوں کے متعلق صواف کا لفظ بھی آیا ہے اس سے بھی اونٹ کا نحر ہی معلوم ہوتا ہے۔

رسول کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا تعامل بھی ہمیشہ یہی رہا ہے۔ اس کے خلاف یعنی اونٹ کا ذبح کرنا یا گائے، بکری وغیرہ کا نحر کرنا کہیں منقول نہیں۔ اس لیے باتفاق امت ایسا کرنا جائز نہیں، اگر کسی نے سنت کے خلاف ایسا کر دیا تو حضرت امام مالک رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا گوشت بھی حرام ہو گیا۔ دوسرے ائمہ رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگرچہ طریقہ ذکاۃ خلاف سنت ہونے کا گناہ ہوا مگر چونکہ حقیقت ذکاۃ پائی گئی، اس لیے گوشت حلال ہے۔

لما في البدائع ولو نحر ما يذبح وذبح ما ينحر يحل لوجود فرى الاوداج ولكن يكره لان السنة في الإبل النحر وفي غيرها الذبح (إلى قوله) وقال مالك إذا ذبح البدنة لا تحل لان اللّٰه تبارك وتعالىٰ امر في البدنة بالنحر بقوله عن شانه ﴿ فصل لربك وانحر ﴾ فاذاذبح ترك المأمور به فلا يحل. (بدائع ٥/ ٤١)

بدائع میں مذکور ہے کہ اگر ذبح کیے جانے والے جانور کو نحر کر دیا، یا نحر کیے جانے والے جانور کو ذبح کر دیا تو ذبیحہ حلال ہوگا اس لیے کہ گردن کی رگوں کا کٹنا پایا گیا لیکن مکروہ ہوگا اس لیے کہ سنت

اونٹ میں نحر ہے اور باقی میں ذبح ہے۔ امام مالک کا قول ہے کہ اگر اونٹنی کو ذبح کر دیا تو وہ حلال نہ ہوگی اس لیے کہ اللہ تعالی نے آیت کریمہ ﴿ فصل لربك وانحر ﴾ میں اونٹ کو نحر کرنے کا حکم دیا ہے تو جب اس شخص نے بجائے نحر کے ذبح کر دیا تو اس نے فعل مامور بہ جس کا حکم تھا اس کو ترک کر دیا۔

جانور کے حلال ہونے کے لیے ذکاۃ شرعی کی شرط اور ذکاۃ کی اقسام و احکام کے متعلق مذکورہ بالا تصریحاتِ قرآن وسنت اور اقوالِ صحابہ وتابعین اتنی بات سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ ذبح کا جو طریقہ رسول کریم ﷺ نے تعلیم فرمایا ہے وہ محض رسم عادت نہیں، بلکہ جاہلیت کی رسموں اور عادتوں کو بدل کر ایک ''تعبدی'' طریقہ جاری کیا گیا ہے جس کی خلاف ورزی گناہ ہے اور بعض صورتوں میں ذبیحہ بھی حلال نہیں ہوتا۔

موجودہ سوال میں ذکاۃ غیر اختیاری اور اونٹ کے نحر کی بحث نہیں۔ زیر بحث صرف وہ جانور ہیں جن کی ذکاۃ کا مسنون طریقہ ذبح ہے یعنی گائے، بیل، بکری، دنبہ وغیرہ۔ اس لیے ذبح کی شرعی حقیقت اور اس کی شرائط پر کسی قدر مزید تفصیل لکھی جاتی ہے۔ جس سے دوسرے سوال کا جواب واضح ہو جائے گا۔

ذبح کی تعریف صحیح بخاری میں حضرت عطاء بن رباح سے یہ نقل کی گئی ہے، الذبح قطع الاوداج، اس میں اوداج۔ ودج کی جمع ہے جو حلقوم اور مری کے دائیں بائیں دو موٹی رگوں کا نام ہے اور عادۃً ان کا قطع کرنا حلقوم اور مری کے ساتھ ہی ہوتا ہے اس لیے مراد ان چاروں چیزوں کا قطع کرنا ہے۔ یعنی حلقوم جس سے سانس اندر آتا جاتا ہے اور مری جس سے غذا اندر جاتی ہے اور دونوں طرف گردن کی موٹی رگیں جن سے خون کا سیلان ہوتا ہے اور ان کا محل متعین کرنے کے لیے ہدایہ میں رسول کریم ﷺ کی حدیث نقل کی ہے جس میں ارشاد ہے:

الذكاة بين اللبة واللحيين.

یعنی ذبح دونوں جبڑوں کے نیچے گردن اور سینہ کے درمیانی گڑھے تک ہے۔ اس درمیان میں جس جگہ سے بھی کاٹ دیا جائے، ذبح درست ہوگا، جمہور فقہاءِ امت کے نزدیک ذبح کی یہی تعریف ہے اور عام کتب فقہ میں یہی مذکور ہے البتہ اس میں ائمہ مجتہدین کے اقوال مختلف ہیں کہ ان چاروں میں سے اگر کوئی رگ رہ جائے تو ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں؟ جس کی تفصیل میں جانے کی

اس جگہ ضرورت نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذبح کا مسنون اور شرعی طریقہ وہی ہے جو عام طور پر مسلمانوں میں رائج ہے کہ جانور کولٹا کر گلے کی یہ چار موٹی رگیں قطع کر دی جائیں۔ جن سے خون بہہ جائے اور سر بالکل دھڑ سے علیحدہ بھی نہ ہوگا، گلے کو بالکل آخر تک کاٹ دینے کو نخع کہا جاتا ہے۔ حدیث صحیح بخاری میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

عن ابن جريج قال اخبرني نافع ان ابن عمر نهي عن النخع يقول يقطع ما دون العظم ثم يدع حتى يموت .

یعنی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نخع کرنے سے منع فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ گردن کی آخری ہڈی جس کو نخاع کہا جاتا ہے، اس کو قطع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ چار رگیں کاٹ کر چھوڑ دیں یہاں تک کہ جانور مر جائے۔

اور بدائع الصنائع میں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل ہے:

الا لا تنخعوا الذبيحة .

یعنی مذبوح کا سر بالکل دھڑ سے مت الگ کرو۔

اور یہ ظاہر ہے کہ یہ کوئی رائے اور قیاس کا معاملہ نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا منع فرمانا اس کی دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہی نخع کرنے سے منع فرمایا تھا۔ اس لیے گلے کی رگوں کو اتنا گہرا کاٹنا کہ آخر گردن تک پہنچ جائے۔ اس حدیث کی رو سے ناجائز ثابت ہوا اور اس سے زیادہ اشد گناہ اور ناجائز یہ ہے کہ گدی کی طرف سے کاٹا جائے اور سر کو دھڑ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ ہدایہ میں ہے:

ومن بلغ بالسكين النخاع او قطع الرأس كره له ذلك وتوكل ذبيحتهُ وإن ذبح الشاة من قفاها فبقيت حية حتى قطع العروق حل لتحقق الموت بما هو ذكاة .

اور جس شخص نے ذبح کے وقت چھری کو نخاع تک یعنی گردن کی آخری ہڈی تک پہنچا دیا تو یہ مکروہ ہے، مگر ذبیحہ حلال ہے اور اگر بکری کو گدی کی طرف سے ذبح کیا اور وہ عروقِ ذبح قطع ہونے تک زندہ رہی تو ذبیحہ حلال ہو گیا مگر ایسا کرنا مکروہ و ناجائز ہے۔

درمختار شامی میں ہے:

و كره ذبحها من قفاها ان بقيت حية حتى تقطع العروق وإلا لم تحل لموتها بلا ذكاة والنخع وقطع الرأس .

جانور کو گدی کی طرف سے ذبح کرنا مکروہ ہے اگر جانور کی رگیں قطع ہونے تک زندہ رہے ورنہ حلال نہیں، کیونکہ وہ قبل ذبح مر گیا، اور نخع کرنا بھی مکروہ ہے۔ یعنی گردن کی آخری ہڈی تک کاٹ دینا اور سر کو کاٹ دینا بھی مکروہ ہے۔

اور بدائع الصنائع میں ہے:

ولو ضرب عنق جزورا وبقرة او شاة بسيفه فابانها وسمى فإن كان ضربها من قبل الحلقوم توكل وقد اساء اما حل الا كل فلانه اتى بفعل الذكاة وهو قطع العروق وإما الاساءة فلأنه زاد في المها زيادة لا يحتاج إليها في الذكاةفيكره ذلك وإن ضربها من القفا فإن ماتت قبل القطع بأن ضرب على التأني والتوقف لا توكل لانها ماتت قبل الذكاة فكانت ميتة وإن قطع العروق قبل موتها توكل لوجود فعل الذكاة وهي حية إلا أنه يكره ذلك. (بدائع : ٤٢/٥)

اور اگر اونٹ یا گائے یا بکری کی گردن پر تلوار مار کر گردن الگ کر دی اور بسم اللہ پڑھ کر ایسا کیا تو اگر یہ کام حلق کے رخ سے کیا ہے تب تو ذبیحہ حلال ہے مگر ایسا کرنا برا ہے۔ ذبیحہ کی حلت تو اس لیے ہے کہ ذکاۃ کی شرائط پائی گئیں اور برائی اور گناہ اس لیے ہے کہ اس شخص نے بلاضرورت جانور کو غیر ضروری تکلیف دی۔ اس لیے مکروہ ہے، اور اگر گردن کے اوپر سے تلوار مار کر گردن الگ کی ہے تو اگر عروق ذبح تک تلوار پہنچنے سے پہلے جانور مر گیا، مثلاً آہستہ آہستہ کاٹا اور ذبح کی رگوں تک پہنچنے سے پہلے مر گیا تو وہ مردار ہے، کھانا اس کا حلال نہیں، اور اگر فوری طور پر کاٹا گیا اور مرنے سے پہلے ذبح کی رگیں کٹ گئیں تو گوشت حلال ہے اگرچہ طریقہ ذبح مکروہ وناجائز ہے۔

روایاتِ مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ جانور کو گردن کے اوپر سے کاٹنا ذبح کے طریق مشروع کے خلاف اور ناجائز ہے اور گردن کو دھڑ سے علیحدہ کرنا الگ ایک مکروہ فعل ہے۔ اگر گردن کے اوپر سے کاٹنے کی صورت میں آہستہ آہستہ کاٹا جائے جس سے عروق ذبح قطع ہونے سے پہلے موت واقع ہو جائے تو اس صورت میں ذبیحہ بھی مردار اور حرام ہو جاتا ہے، البتہ اگر تیز چھری

سے فوراً گردن الگ کر دی جائے تو طریق ذبح خلافِ شرع ہونے کے گناہ کے باوجود بسم اللہ پڑھ کر یہ عمل کیا گیا ہے تو ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

بجلی کی مشینوں کے ذریعہ اوپر کی طرف سے چھری گردن پر رکھ کر گردن کاٹ دینے سے بظاہر یہ صورت تو نہ ہوگی کہ عروق ذبح قطع ہونے سے پہلے موت واقع ہو جائے کیونکہ یہ قطع بڑی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہوگا۔ اس لیے اگر مشین کی چھری گردن پر رکھنے والے نے بسم اللہ کہہ کر چھری رکھی ہے تو گو غیر مشروع طریقہ سے ذبح کرنے کا گناہ ہوا مگر گوشت حلال ہو گیا۔

لیکن یہاں ایک مسئلہ دوسرا یہ سامنے آتا ہے کہ بہت سے جانوروں کو مشین کے نیچے کھڑے کر کے ایک مرتبہ بسم اللہ پڑھ بھی لی گئی ہو تو کیا وہ سب جانوروں کے حلال ہونے کے لیے کافی ہے یا صرف پہلے جانور کے لیے کافی ہوگی اور دوسرے جانور مردار پائیں گے۔

اس کے متعلق مقتضیٰ نصوص اور اصولِ شرعیہ کا یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھنا اور ذبح کرنا دونوں متصل واقع ہوں، معمولی ایک آدھ منٹ کی تقدیم کا کوئی اثر نہ ہوگا کیونکہ اتنا فرق ہو جانا عادۃً ناگزیر ہے مگر اس سے زیادہ تقدیم ہوئی تو یہ تسمیہ ذبح کے متصل نہ ہونے کے سبب کالعدم ہو جائے گا اور جانور مردار قرار پائے گا۔

بدائع الصنائع میں ہے:

فوقتها في الذكاة الاختيارية وقت الذبح لا يجوز تقديمها عليه إلا بزمان قليل لا يمكن التحرز عنه لقوله تبارك وتعالىٰ ﴿ ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله عليه ﴾ والذبح مضمر فيه معناه ولا تأكلوا مما لم يذكر اسم الله تعالىٰ عليه من الذبائح ولا يتحقق ذكرا اسم الله تعالىٰ على الذبيحة إلا وقت الذبائح. (بدائع الصنائع : ٥/٤٩)

تسمیہ (بسم اللہ) کہنے کا وقت اختیاری ذکاۃ میں بعینہ ذبح کرنے کا وقت ہے، لہٰذا پہلے سے بسم اللہ کہہ لینا ناجائز ہے، بجز اس قدر قلیل زمانہ کے جس سے بچنا ممکن نہ ہو۔ اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور مت کھاؤ اس جانور کا گوشت جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا۔'' ذبح کا لفظ یہاں مضمر (پوشیدہ) ہے اور معنی یہ ہیں کہ ذبح کے وقت جس جانور پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اس کا گوشت مت کھاؤ۔ لہٰذا ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا اسی وقت متحقق ہوگا جبکہ ذبح کے وقت نام لیا گیا ہو۔

اسی بناء پر صاحب بدائع نے امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اگر ایک شخص نے ایک بکری کو ذبح کرنے کے لیے لٹایا اور اس پر بسم اللہ پڑھی پھر اس کو چھوڑ کر دوسری بکری کو اسی سابقہ تسمیہ پر اکتفاء کر کے ذبح کر دیا تو یہ بکری مردار ہے اس کا کھانا جائز نہیں۔ کیونکہ جو بسم اللہ پڑھی گئی اس کے اور ذبح کے درمیان فصل ہو گیا۔

اور مبسوط میں امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے یہ نقل کیا ہے:

ارأیت الذابح یذبح الشاتین والثلاثة فیسمی علی الأول ویدع التسمیة علی غیر ذلك عمداً قال یأکل الشاة اللتي سمي علیها ولا یأکل ما سویٰ ذلك. (بدائع الصنائع: ٥/٤٩)

حضرت مسئلہ بتائیں۔ ایک ذبح کرنے والا دو یا تین بکریوں کو ذبح کرتا ہے اور اللہ کا نام پہلی پر لیتا ہے اور باقی پر عمداً چھوڑ دیتا ہے (اس کا کیا حکم ہے؟) فرمایا (ایسی صورت میں) صرف پہلی بکری حلال ہے باقی حلال نہیں۔

البتہ اگر دو بکریوں کو ایک ساتھ رکھ کر دونوں کے گلے پر بیک وقت چھری پھیری ہے تو یہ تسمیہ دونوں کے لیے کافی ہوگا اور دونوں حلال ہو جائیں گی۔

لو اضجع شاتین وامر السکین علیهما معا انه تجزئ في ذلك تسمیة واحدة. (بدائع: ٥/٥٠)

اگر دو بکریوں کو ایک ساتھ زمین پر لٹایا اور دونوں پر ایک ساتھ چھری پھیری تو اس صورت میں ایک مرتبہ بسم اللہ کہنا کافی ہوگا۔

روایات مذکورہ کی روشنی میں مسئلہ زیر بحث: ''بہت سے جانور مشین کی چھری کے نیچے کھڑے کر دیے جائیں اور بسم اللہ پڑھ کر ان کی گردن کاٹ دی جائے۔'' اس میں غیر مشروط طریقہ پر ذبح کرنے کے گناہ کے علاوہ صرف وہ جانور حلال سمجھے جائیں گے جن پر چھری بیک وقت پڑی ہے۔ بشرطیکہ مشین کی چھری چلانے کے وقت بسم اللہ پڑھ لی گئی ہو اور بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نزدیک یہ بھی طریق ذبح غیر مشروع ہونے کے سبب حرام ہے اور جن جانوروں کی گردن پر چھری بسم اللہ پڑھنے کے بعد تدریجاً پڑی ہے وہ ترکِ تسمیہ کی وجہ سے جمہور کے نزدیک حرام اور مردار قرار پائیں گے۔

خلاصۂ کلام:

مذکورہ بالا تفصیل میں سوال کے دونوں نمبروں کا جواب آگیا اور خلاصہ اس کا یہ ہے کہ یورپ کے شہروں کا مروجہ طریقہ ذبح خلاف شرع اور موجب گناہ ہے۔ مسلمانوں کو جہاں تک قدرت ہو اس سے بچیں اور اپنے ملکوں میں اس کے رواج کو بند کریں اور یورپ کے علاقوں میں رہنے والے مسلمان جو اس طریقہ کے بدلنے پر قادر نہیں اور گوشت کی ضرورت بہر حال ہے ان کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ اس گوشت کا استعمال کرنا جائز ہوگا ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو حرام ہوگا۔

۱۔ مشین کے ذریعہ ذبح کرنے والا آدمی مسلمان، نصرانی یا یہودی ہو۔

۲۔ مشین کی چھری جانوروں کی گردن تک پہنچاتے وقت اس نے خالص اللہ کا نام بسم اللہ اللہ اکبر پڑھا ہو۔

۳۔ یہ چھری جتنے جانوروں کی گردن پر بیک وقت پڑی ہے وہ جانور ممتاز اور الگ ہوں۔ دوسرے جانور جن پر چھری بعد میں پڑی ہے اور وہ مردار ہیں، ان کا گوشت پہلے جانوروں کے گوشت میں مخلوط نہ ہو گیا ہو۔ مگر ظاہر ہے کہ باہر سے جانے والے اور مختلف علاقوں کے رہنے والے مسلمانوں کو ان شرائط کے پورے ہونے کا علم ہونا آسان نہیں اس لیے اجتناب ہی بہتر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ دار العلوم کراچی)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا یہ فتویٰ اور اس کے خلاف ایک فتویٰ حضرت اقدس مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں برائے تصویب پیش کیے گئے تو حضرت رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں جواب ارشاد فرمایا کہ حضرت مفتی شفیع صاحب مدظلہم کا جواب صحیح ہے، یعنی مشین سے ذبح کرنا جائز نہیں مگر (مذکورہ بالا تفصیل کے ساتھ) ذبیحہ حلال ہوگا۔

مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ (احسن الفتاوی: ۷/۴۷۳)

اہل بدعت کے ذبیحہ کا حکم:

بعد از سلام مسنون ایک مسئلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ بریلویوں کے پیچھے نماز پڑھنا، ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانا اور ان کے ساتھ نکاح کرنا شرعاً ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، رسول اللہ ﷺ کے لیے علم غیب کلی ثابت کرنا، آپ

کی بشریت کا انکار کرنا، آپ کو ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا، اولیاء اللہ کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنا، مافوق الاسباب حاجت روا سمجھنا، ان کی قبروں پر سجدہ کرنا، ان کے تقرب وعبادت کی نیت سے کوئی جانور ذبح کرنا یا مزاروں پر چڑھاوے چڑھانا کفروشرک ہے۔

ایسے عقائد رکھنے والے شخص کا حکم یہ ہے کہ اس کے پیچھے نماز نہیں ہوتی، جو نمازیں پڑھی ہوں ان کا اعادہ لازم ہے، ایسے شخص کا ذبیحہ بھی حرام ہے اور اس سے نکاح نہیں ہوسکتا۔

البتہ جو شخص مندرجہ بالا عقائد نہ رکھتا ہو مگر بدعات (تیجہ، چالیسواں وغیرہ) کا ارتکاب کرتا ہو وہ بدعتی ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو امام بنانا اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، انتظامیہ مسجد پر لازم ہے کہ اسے معزول کر کے کسی متبع السنۃ صالح امام کو مقرر کرے، ورنہ سب وبال انتظامیہ پر ہوگا۔ عوام کے لیے حکم یہ ہے کہ اگر قریب میں کوئی صالح امام میسر نہ ہو جس کے پیچھے نماز پڑھ سکیں اور اس بدعتی و فاسق امام کو ہٹانے پر قادر بھی نہ ہوں تو فرض نماز اسی کے پیچھے پڑھیں، جماعت ترک نہ کریں۔ نیز ایسے شخص کے ذبیحہ کھانا حلال احتیاط اولیٰ ہے۔

اس کے علاوہ جس شخص کے عقائد مشتبہ ہوں، اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے احتیاط اور حتی الامکان اس کے ذبیحہ سے احتراز لازم ہے۔

قال الله تعالیٰ: ﴿إن الله لا يغفر أن يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء﴾ (سورة النساء: ٤٨)

وقال الخليل عليه السلام: ﴿واجنبني وبني أن نعبد الأصنام﴾ (سورة إبراهيم: ٣٥)

وعن عبد الله ابن مسعود رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من مات وهو يدعو من دون الله نداً دخل النار." (رواه البخاري)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ وہ اللہ کے سواء کسی شریک کو بھی پکارتا ہو وہ جہنم کی آگ میں داخل ہوگا۔

ولمسلم عن جابر رضي الله عنه: أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "من لقي الله لا يشرك به شيئاً دخل الجنة، ومن لقيه

يشرك به شيئاً دخل النار ."

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس حال میں ملاقات کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی غیر کو شریک نہ مانتا ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔(مسلم)

قال العلامة الحلبي رحمه الله تعالىٰ : ما حرر من ان كراهة تقديم الفاسق كراهة تحريم و يكره تقديم المبتدع ايضاً لأنه فاسق من حيث الاعتقاد وهو اشد من الفسق من حيث العمل لأن الفاسق من حيث العمل يعترف بأنه فاسق و يخاف ويستغفر بخلاف المبتدع ، والمراد بالمبتدع من يعتقد شيئاً على خلاف ما يعتقده أهل السنة والجماعة وإنما يجوز الإقتداء به مع الكراهة إذا لم يكن ما يعتقده يؤدي إلى الكفر عند أهل السنة أما لو كان مؤدياً إلى الكفر فلا يجوز أصلاً .(غنيمة المستملى شرح منية المصلى:٥١٤)

اہل تشیع کے ذبیحہ کا حکم:

علماء محققین کے نزدیک موجودہ دور کے اہل تشیع تعصب اور بغض وعناد کی وجہ سے اور کفریہ عقائد رکھنے کی وجہ سے ان کے ذبیحہ کا حکم مرتدین کے حکم میں ہوکر کھانے کے قابل نہیں۔

لما قال العلامة طاهر بن عبد الرشيد البخاري الرافضي إن كان يسب الشيخين ويلعنهما فهو كافر وإن كان يفضل عليا على ابى بكر و عمر رضي الله عنهم لا يكون كافرا لكنه مبتدع .

(خلاصة الفتاوىٰ : ٣٨١/٤ كتاب الكراهية)

علامہ عبدالرشید بخاری نے کہا کہ رافضی اگر حضرات شیخین ابوبکرؓ، عمرؓ کو گالی دیتا ہو، اور ان پر لعن وطعن کرتا ہو، وہ کافر ہے، اور اگر صرف حضرت علیؓ کو شیخین پر فضیلت دیتا ہو وہ کافر نہیں فاسق بدعتی ہے

اونٹ ذبح کرنے کا طریقہ:

اونٹ کے ذبح کا مسنون طریقہ ''نحر'' کرنا یعنی اونٹ کھڑا کر کے گردن میں چھرا گھونپ کر رگیں کاٹنا۔

والسنة في ذبح الابل أن تكون قائمة مقيدة يسهل نحرها . قال تعالىٰ : ﴿ والبدن جعلناها لكم من شعائر الله لكم فيها خير فاذكروا اسم الله عليها صواف ﴾ (حج : ٣٦) قال ابن عباس ، صواف اي قياماً .

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ کی یادگار بنایا ہے، ان جانوروں میں تمہارے فائدے ہیں، سوتم ان پر کھڑے ہوکر اللہ کا نام لیا کرو۔

روي البخاري : عن انس رضي الله عنه قال : نحر النبي صلى الله عليه وسلم سبع بدن قياما ، وضحى بالمدينة كبشين املحين اقرنين . (اخرجاه البخاري في الحج : ١/٢٩٦)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ساتھ اونٹوں کا نحر فرمایا، (یعنی کھڑا کر کے چھرا گھونپ کر رگیں کاٹ کر ذبح فرمایا) اور مدینہ منورہ میں دو چتکبرہ سینگ والے مینڈوں کی قربانی فرمائی۔

عن ابن عمر رضي الله عنه انه اتى على رجل قد اناخ بدنتة يريد ان ينحرها ، فقال له ابن عمر : ابعثها قياماً مقيدة ، سنة ابي القاسم صلى الله عليه وسلم .

(أخرجه البخاري في الحج : ١/٢٩٦ ، باب نحر الإبل مقيدة قائمة)

احکام الاضحیه و العقیقه

قربانی کا نصاب:

سونے، چاندی، مالِ تجارت اور گھر میں روزمرہ استعمال کی چیزوں سے زائد سامان کی قیمت لگا کر اس میں نقدی جمع کی جائے، ان پانچوں کا مجموعہ یا ان میں سے بعض ۷۹ء۸۷ گرام سونے یا ۳۵ء۶۱۲ گرام چاندی کے برابر ہوئے تو اس کے ذمہ قربانی واجب ہے تین جوڑے کپڑوں سے زائد لباس اور ریڈیو اور ٹی وی جیسی خرافات انسانی حاجات میں داخل نہیں اس لیے ان کی قیمت بھی حساب میں لگائی جائے گی۔

قال الإمام الحصكفي رحمه اللّٰه تعالىٰ : وشرائطها الإسلام والاقامة واليسار الذي يتعلق به وجوب صدقة الفطر .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله واليسار الخ) بأن ملك مأتى درهم او عرضا ايساويها غير مسكنه وثياب اللبس ومتاع يحتاجه إلى أن يذبح الاضحية (الى قوله) وصاحب الثياب الاربعة لوساوى الرابع نصابا غنى وثلاثة فلا لأن احدها للبذالة والاخر للمهنة والثالث للجمع والوفد والاعياد .

(ردالمحتار : ٥/٢١٩

قربانی نہ کرنے پر وعیدیں:

قوله عليه السلام : من كان له سعة ولم يضح ، فلا يقربن مصلانا . (أخرجه ابن ماجه ، وقال الحافظ فى الفتح ١٠/٣ ورواه ايضا احمد و رواه ثقات).

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مالدار (یعنی قربانی کے نصاب کا مالک ہو) اور قربانی نہ کرے وہ ہمارے عیدگاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

روي الترمذي عن ابن عمر انه قال : اقام النبي صلى اللّٰه عليه وسلم بالمدينة عشر سنين يضحى .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دس سال تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے ہر سال قربانی فرماتے تھے۔ ترمذی

مسافر پر قربانی واجب نہیں:

مسافر یعنی جو شخص عیدالاضحیٰ کے دنوں میں اپنے شہر کی حدود سے اڑتالیس میل شرعی یا اس سے زیادہ دور کے فاصلہ پر ہو اور اس نے کسی اجگہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کی نیت نہ کی ہو اس کے ذمہ قربانی واجب نہیں۔

قال على رضي اللّٰه عنه : لا جمعة ، ولا تشريق ، ولا فطر ، ولا اضحى ، الا فى مصر .

(اخرجه عبد الرزاق فی المصنف والبیهقي وابن ابی شیبة)

قال الطحاوي : ولا تجب الاضحية على المسافر .

(الفتاوىٰ الهندية : ٥/٢٩٣)

شریک ہوکر قربانی کرنا:

اونٹ، گائے، بھینس، کی قربانی میں سات آدمی شریک ہوسکتے ہیں، دو، تین آدمی شریک ہوکر بھی قربانی کرسکتے ہیں۔

لما روي عن جابر رضي الله عنه قال : اشتركنا مع النبي صلى الله عليه وسلم فى الحج و العمرة كل سبعة فى بدنة ، فقال رجل لجابر ، أيشترك فى البدنة يعنى البقرة . ما يشترك في الجزور ؟ اي الجمل ـ قال : ما هي الا من البدن . (صحيح مسلم : ١/٩٥٥)

حضرت جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حج وعمرہ میں شریک ہوئے تھے، اور قربانی کے بڑے جانور اونٹ میں سات آدمی شریک ہوئے کسی نے پوچھا گائے ،بیل میں کتنے آدمی شریک ہوسکتے ہیں؟ فرمایا کہ اس میں سات شریک ہوسکتے ہیں۔

البتہ سات سے زیادہ آدمی کا شریک ہونا جائز نہیں اگر کسی جانور میں سات سے زیادہ آدمی شریک ہوگئے تو کسی کی بھی قربانی ادا نہ ہوگی۔

يجب أن يعلم إن الشاة لا تجزي الا عن واحد وإن كانت عظيمة والبقر والبعير عن سبعة إذا كانوا يريدون به وجه الله تعالىٰ والتقدير بالسبع يمنع الزيادة ولا يمنع النقصان .

(فتاوىٰ هندية : ٦/٢٠٤)

قربانی کے جانور کی عمر:

بکری اور بھیڑ کی عمر ایک سال، گائے ،بھینس دو سال ،اونٹ پانچ سال، ہاں چھ ماہ کا دنبہ اگر موٹا تازہ صحت مند ہو اور دیکھنے میں سال کا لگتا ہو تو اس کی قربانی بھی جائز ہے۔

لقوله عليه السلام : لا تذبحوا الامسنة ، إلا أن يعسر عليكم ، فتذبحوا جذعة من الضأن . الجذعة : الفتية من الضأن ، التي زاد منها

علی ستة مشهور .

قال العيني : الثني من الغنم و المعز : ماتم له سنة ومن البقر ما تم له سنتان ، ومن الابل ماتم له خمس سنوات ، ونصح الجذعة إذا كانت سمينة عظيمة بحيث لو خلطت بالثنايا ، تشبه على الناظر من بعيد . (البناية على الهداية للعيني : ١٨٦/٤)

قربانی کا وقت:

شہر میں قربانی کا وقت عید کی نماز ختم ہونے کے بعد شہر میں کسی بھی ایک جگہ عید کی نماز کا ختم ہونا کافی ہے، اگر کسی نے عید کی نماز سے پہلے قربانی کی تو اس کی قربانی نہیں ہوگی، اس پر لازم ہوگا کہ دوبارہ قربانی کرے۔

لقوله النبي صلى الله عليه وسلم : من ذبح قبل الصلوٰة فانما هو لحم قدّمه لاهله ليس من النسك فى شيء .

(أخرجه مسلم : ١٥٥١/٢)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے عید کی نماز نے پہلے قربانی کا جانور ذبح کردیا اسکی قربانی نہیں ہوئی۔ بلکہ اس نے اپنے گھر والوں کیلئے گوشت حاصل کیا ہے۔

وعن براء بن عازب قال سمعت النبي صلى الله عليه وسلم إن اول ما نبدا او من يومنا هذا ، أن نصلى ثم نرجع فنحر ، فمن اصاب هذا فقد اصاب سنتنا ومن نحر قبل ذلك ، فإنما هو لحم يقدمه لاهله ليس من النسك فى شيء ، فقال ابو برده : يا رسول الله ، ذبحت قبل أن اصفى ، وعندي جذعة فقال : اجعلها مكانها . ولن تجزي عن احدك بعدك . (أخرجه البخاري : ٣١٨/٣ ومسلم رقم ١٩٦١)

قربانی کے ایام تین دن ہیں:

قربانی صرف تین دن جائز ہے، یعنی دس، گیارہ، بارہ ذی الحجہ اس کے بعد قربانی کے جانور ذبح کرنے سے قربانی ادا نہ ہوگی۔

قال فى الاختيار : وتختص بايام النحر ، وهي ثلاثة ايام ، وهو

المروي عن عمر وعلي وابن عباس وغيرهم وهذا لا يهتدي اليه ، فكان طريقها السمع ، فكانهم قالوه سماعاً عن النبي صلى الله عليه وسلم وافضلها اولها ، لكونه مسارعة إلى الخير والقربة .

(الاختيار لتعليل المختار : ۱۹/٥ ، وانظر الهداية : ٤٠٦/٤ وملتقى الابحر : ۲۲۳/۲)

قربانی صرف تین دن ہوتی ہے۔ یہی بات مروی ہے حضرت عمر، علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یقیناً یہ بات وہ حضرات قیاس سے نہیں کہہ سکتے بلکہ انہوں نے آپ ﷺ سے یہی سنا ہوگا، البتہ پہلے دن کرنا افضل ہے کیونکہ نیکی اور طاعت کے کام جلدی کرنا چاہئے۔

قربانی کا جانور خود ذبح کرے:

قربانی کے جانور کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا مستحب ہے، بشرطیکہ اچھی طرح ذبح کرنا جانتا ہو اگر اچھی طرح نہ جانتا ہو تو ذبح کے وقت قریب موجود رہے۔

عن انس رضي الله عنه قال : ضحى النبي صلى الله عليه وسلم بكشين املحين اقرنين ، ذبحهما بيده وسمى وكبر ووضع رجله على صفاحهما .

(أخرجه البخاري : ۳۱۹/۳ ومسلم ۱۹۲۲ ، باب استحباب التضحية وذبحها مباشرة بدوون توكيل)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو چتکبرے مینڈھوں کی قربانی فرمائی دونوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا۔ بسم اللہ اللہ اکبر کہا اور ذبح کے وقت اپنا پاؤں ان کی گردن پر رکھا۔

قربانی کی کھال اور اس کے گوشت کا حکم:

قربانی کی کھال اور اس کے گوشت کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے:

السوال: ۱۔ کیا فرماتے ہیں علماء دین وشرع متین اس مسئلہ میں کہ قربانی کی کھال کا ڈول بنوا کر مسجد میں دینا یا ۔ کھال کی قیمت کو مسجد میں یا دیگر اوقاف میں لگا دینا، تعمیر میں ان کے

ملازموں کو تنخواہ میں دے دینا جائز ہے یا نہیں؟

۲۔ غریب سید کو یا کسی غنی کو کھال قربانی یا کھال کی قیمت دینا کیسا ہے اور کھال یا قیمت کے ان ہر دو طرح سے دینے میں کچھ فرق ہے یا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

۳۔ قربانی کا گوشت پختہ یا کچا غیر مسلم ہندوں کو دینا کیسا ہے؟ بینوا توجروا

الجواب: قال في الهداية : واللحم بمنزلة الجلد في الصحيح .

(تتمه جلد ثاني فتاوىٰ امدادية : صـ ١٣٧)

وفي الدر : فإن بيع اللحم او الجلد به او بدراهم تصدق بثمنه اهـ . (تتمهٔ مذكوره : صـ ١٣٦)

وفي عالمكيرية : ويهب منها (اي من الاضحية) ما شاء للغني والفقير والمسلم والذمي اهـ . (٦/٢٠١)

وفيها ايضاً : ولا أن يعطي (أي لا يجوز) اجرا لجزار والذبح منها اهـ . (٦/٢٠٢)

قربانی کی کھال کا بعینہ مسجد میں دینا (بشرطیکہ اس کو بعینہ مسجد کے کام میں لایا جاوے یعنی فروخت نہ کی جائے) اسی طرح اس کا ڈول بنا کر مسجد میں دینا جائز ہے کیونکہ کھال کا بعینہ تصدق صدقہ نافلہ ہے اور صدقہ نافلہ کا مسجد میں دے دینا جائز ہے باقی کھال کو بیچ کر اس کی قیمت مسجد میں دینا جائز نہیں ہے کیوں کہ قیمت کا تصدق واجب ہے اور صدقہ واجبہ کے لیے تملیک شرط ہے اور مسجد محل تملیک نہیں۔ اسی طرح کھال کی قیمت کو ملازمین مسجد و دیگر اوقاف کی تنخواہ میں دینا بھی جائز نہیں ہے اسی طرح بعینہ کھال یا اس کی قیمت مسجد کے مؤذن یا امام کو اس کی خدمت کے معاوضہ میں بھی دینا جائز نہیں ہے البتہ اگر مؤذن و امام کو مقرر کرتے وقت صاف کہہ دیا گیا ہو کہ قربانی کی کھالوں میں تمہارا کچھ حق نہ ہوگا اس کے بعد اس کو بعینہ کھال یا اس کی قیمت دے دی جائے تو جائز ہے اور صورت ثانیہ میں اس کا فقیر ہونا شرط ہے، اسی طرح اس کی قیمت کو مسجد کی مرمت میں بھی صرف کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں بعینہ کھال اگر مسجد یا اوقاف کے کاموں میں لگا دی جائے تو جائز ہے مثلاً مسجد یا مدرسہ کے لیے ڈول بنا دیے جائیں۔

۲۔ بنو ہاشم کو بعینہ کھال دے دینا درست ہے پھر وہ خواہ اس کو بعینہ کام میں لائے یا

فروخت کر کے قیمت کام میں لائے کیونکہ کھال کا بعینہ تصدق صدقہ نافلہ ہے اور صدقہ نافلہ بنو ہاشم کو دینا جائز ہے مگر کھال بیچ کر اس کی قیمت بنو ہاشم کو دینا جائز نہیں کیونکہ قیمت کا تصدق واجب ہے اور وہ صدقات واجبہ کے مصرف نہیں۔

۳۔ قربانی کا گوشت کچا یا پختہ ہندو یا غیر مسلم کو دینا جائز ہے کیونکہ گوشت کا تصدق واجب نہیں پس وہ ہدیہ ہے یا صدقہ نافلہ اور یہ دونوں کافر ذمی کو دینا درست ہے۔

قلت و المستامن فی حکم الذمي في ذلك و الحربي المسالم في حکم الذمي فافهم . و اللّٰه اعلم . (امداد الأحكام : ٤/ ٢٠٥)

عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں:

کان یا دم کا نصف یا اس سے زائد حصہ کٹا ہوا ہو تو قربانی جائز نہیں۔

جس پاؤں میں عیب ہے اگر وہ زمین پر ٹیک کر کچھ سہارا لے کر چلتا ہے تو قربانی جائز ہے ورنہ نہیں۔

آنکھ کی روشنی نصف یا اس سے کم باقی رہ گئی ہو تو قربانی جائز نہیں۔

اس کے معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جانور کو دو تین دن بھوکا رکھ کر پھر عیب دار آنکھ کو باندھ کر دور سے چارا دکھاتے ہوئے قریب لائیں، جہاں سے جانور کو نظر آجائے وہاں نشان کر دیں، پھر صحیح آنکھ کو باندھ کر یہی عمل دہرائیں، پھر دونوں مسافتوں کی نسبت معلوم کر لیں، اگر فرق نصف یا اس سے زائد ہے تو قربانی جائز نہیں ورنہ جائز ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : لا بالعمياء و العوراء و العجفاء و المهزولة لامخ فی عظامها و العرجاء التي لا تمشي الى المنسك اي المذبح و المريضة البين مرضها ومقطوع أكثر الأذن أو الذنب أو العين اي التي ذهب أكثر نور عينها فاطلق القطع على الذهاب مجازا و انما يعرف بتقريب العلف .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله و العرجاء) اي التي لا يمكنها المشي برجلها العرجاء إنما تمشي بثلاث قوائم حتى لو كانت تضع الرابعة على الارض وتستعين بهاجازا عناية (قوله الى

المنسك) بكسر السين والقياس الفتح (قوله ومقطوع أكثر الاذن الخ) في البدائع لو ذهب بعض الاذن او الالية او الذنب او العين ذكر في الجامع الصغير ان كان كثيرا يمنع وان يسيرا لا يمنع واختلف اصحابنا في الفاصل بين القليل والكثير فعن ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ اربع روايات روي محمد رحمه الله تعالىٰ في الاصل والجامع الصغير ان المانع ذهاب اكثر من الثلث وعنه انه الثلث وعنه انه الربع وعنه ان يكون الذاهب اقل من الباقي او مثله اهـ بالمعنى والاولى هي ظاهر الرواية صححها في الخانية حيث قال والصحيح ان الثلث وما دونه قليل وما زاد عليه كثير وعليه الفتوى اهـ ومشي عليها في مختصر الوقاية والاصلاح والرابعة هي قولهما قال في الهداية وقالا إذا بقي الأكثر من النصف اجزأه وهو اختيار الفقيه ابی الليث وقال ابو يوسف رحمه الله تعالىٰ اخبرت بقولي ابا حنيفة رحمه الله تعالىٰ فقال قولي هو قولك وقيل هو رجوع منه الى قول ابي يوسف رحمه الله تعالىٰ وقيل معناه قولي قريب من قول وفي كون النصف مانعا روايتان عنهما اهـ وفي البزازية وظاهر مذهبما ان النصف كثير اهـ وفي غاية البيان ووجه الرواية الرابعة وهي قولهما واليها رجع الامام ان الكثير من كل شيء اكثر وفي النصف تعارض الجانبان اهـ اي فقال بعدم الجوازاحتياطا بدائع وبه ظهران ما في المتن كالهداية والكنز والملتقي هو الرابعة وعليها الفتوىٰ كما يذكره الشارح عن المجتبي وكأنهم اختاروها لان المتبادر من قول الامام السابق هو الرجوع عما هو ظاهر الرواية عنه إلى قولهما والله تعالىٰ اعلم .

(ردالمحتار : ٢٠٦/٥) (أحسن الفتاوىٰ : ٥١٧/٧)

دونوں کانوں کا مقطوعہ حصہ شمار ہوگا:

اگر بکری یا دنبے کے دونوں کا اتنا حصہ کٹا ہوا ہو کہ مجموعہ نصف یا اس سے زائد ہو جائے تو

قربانی کرنا خلاف احتیاط ہے، اگر کسی نے کردی تو ہو جائے گی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : في البزازية وهل تجمع الخروق في اذني الاضحية اختلفوا فيه قلت وقدم الشارح في باب المسح على الخفين انه ينبغي الجمع احتياطا .

(ردالمحتار : ٢٠٦/٥)

قربانی کے ایام گزر گئے تو قیمت واجب ہے:

اگر قربانی کے تینوں دن گزر گئے اور قربانی واجب ہونے کے باوجود قربانی نہیں کی تو اب جانور ذبح کرنے سے قربانی ادا نہ ہوگی بلکہ ایسے شخص پر لازم ہے کہ ایک متوسط بکرے کی قیمت صدقہ کرے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : وتصدق بقيمتها غنى شراها اولا لتعلقها بذمته شراها اولا فالمراد بالقيمة قيمة شاة تجزي فيها . (ردالمحتار : ٢٠٤/٥)

مالِ حرام پر قربانی واجب نہیں:

اگر کسی کی ملک میں صرف حرام مال ہے مثلاً سودی رقم یا رشوت کی کمائی وغیرہ تو ایسے شخص پر قربانی واجب نہیں کیونکہ حرام مال تو سارا ہی صدقہ کرنا واجب ہے لہٰذا قربانی واجب نہیں۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : في القنية لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزكوٰة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه اهـ ومثله في البزازية .

(ردالمحتار : ٢٥/٢)

زمین کی وجہ سے قربانی واجب ہونے کی تفصیل:

اگر مقدارِ معاش سے زائد زرعی وغیر زرعی زمین کی قیمت اور پیداوار کا مجموعہ کوئی ایک بقدرِ نصاب ہو تو قربانی واجب ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ معزيا إلى التتارخانية سئل محمد رحمه الله تعالىٰ عمن له ارض يزرعها او حانوت

یستغلها او دار غلتها ثلاثة ألاف ولا تکفی لنفقته ولنفقة عیاله سنة؟ یحل له اخذ الزکوٰة وإن کانت قیمتها تبلغ ألوفا وعلیه الفتویٰ عندهما لا یحل اهـ . (ردالمحتار : ۶۵/۲)

وقال ایضاً : ولو له عقار یستغله فقیل تلزم لو قیمته نصابا وقیل لو یدخل منه قوت سنة تلزم وقیل قوت شهر فمتی فضل نصاب تلزمه ولو العقار وقفا فإن وجب له فی ایامها نصاب تلزم .

(ردالمحتار : ۱۹۸/۵)(ماخوذ از أحسن الفتاویٰ : ۲۰۵/۷)

مقروض پر قربانی واجب ہونے کا حکم:

اگر کسی کے ذمہ قرض ہو اور قربانی کے ایام میں اس کی ملک میں کچھ مال بھی ہو تو نصاب سے قرض وضع کرنے کے بعد اگر نصاب میں نقص نہیں آتا، نصاب کامل باقی رہتا ہے تو قربانی واجب ہے ورنہ نہیں۔ نصاب کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

قال الإمام الکاسانی رحمه اللّٰه تعالیٰ : ولو کان علیه دین بحیث لو صرف إلیه بعض نصابه لاتنقص نصابه لا تجب لان الدین یمنع وجوب الزکاة فلأن یمنع وجوب الاضحیة اولی لان الزکاة فرض والاضحیة واجبة والفرض فوق الواجب . (بدائع : ۶۴/۵)

قربانی کے گوشت سے پہلے کھانا، پینا:

قربانی کے دن جس کو گوشت ملنے کی امید ہو اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ صبح کچھ نہ کھائے پیے بلکہ پہلا کھانا گوشت سے ہو خود اس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو یا نہ ہو بہر حال قربانی کے گوشت سے پہلے کچھ نہ کھانا مستحب ہے، چائے بھی نہ پیے، کیونکہ چائے میں دودھ اور شکر کی وجہ سے غذائیت ہے۔

یہ حکم صرف مستحب ہے، اس کے خلاف کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

قال الإمام الحصکفی رحمه اللّٰه تعالیٰ : وندب تأخیر أکله عنها وإن لم یضح فی الاصح ولو اکل لم یکره ای تحریما .

وقال العلامة ابن عابدین رحمه اللّٰه تعالیٰ : (قوله فی الاصح)

وقيل لا يستحب التأخير المستحب ثبوت الكراهة إذلا بدلها من دليل خاص . (ردالمحتار: ١/٥٦٢)

وقال في الهندية : وفي الكبرىٰ الاكل قبل الصلوٰة يوم الأضحى هل هو مكروه فيه روايتان والمختار انه لا يكره لكن يستحب له ان لا يفعل كذا فى التتارخانية ، ويستحب ان يكون اول تناولهم من لحوم الاضاحى التي هي ضيافة اللّٰه كذا فى العيني شرح الهداية .

(عالمگیریة : ١/١٥٠) (ماخوذ از أحسن الفتاوىٰ : ٧/٥٢٠ بتغير يسير)

قربانی کے جانور کو کام میں لانے کا حکم:

کسی نے قربانی کے لیے بیل خریدا، ابھی قربانی میں چند ایام باقی ہیں، اب اس سے ہل جوتنا یا اجرت پر دینے کے جواز وعدم جواز دونوں قول ہیں اور دونوں ظاہر الروایہ ہیں، الاول اوسع وایسر والثانی احوط واشہر۔

اس قول ثانی کے مطابق کسی نے ہل جوتنے میں بیل کو استعمال کیا تو اس سے قیمت میں جو کمی آئی اس کا اندازہ کر کے صدقہ کرنا واجب ہے اور اجرت پر دینے کی صورت میں اجرت کا تصدق واجب ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه اللّٰه تعالىٰ : ولا يركبها ولا يحمل عليها شيئا لا يؤجرها فإن فعل تصدق بالاجرة حاوي الفتاوىٰ لانه التزم اقامة القربة بجميع اجزائها .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه اللّٰه تعالىٰ : (قوله فإن جزه تصدق به الى قوله حاوي الفتاوىٰ) يوجد فى بعض النسخ قوله فإن فعل تصدق بالاجرة اي فيما لو أجرها واما إذا ركبها او حمل عليها تصدق بما نقصته كما في الخلاصته .

جانور کے دانت گرنے کا حکم:

اگر قربانی کے جانور کے اکثر دانتوں کا موجود ہونا ضروری ہے یا نہیں اس بارے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اکثر کا اعتبار نہیں، بلکہ معیار یہ ہے کہ جانور گھاس

کھا سکتا ہو تو قربانی جائز ہے ورنہ نہیں، کیونکہ دانتوں سے مقصود یہی ہے۔

قال الإمام الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : ولا بالهتماء التي لا اسنان لها ويكفي بقاء الاكثر وقيل ما تعتلف به .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله وقيل ما تعتلف به) وهو وما قبله روايتان حكاهما في الهداية عن الثاني وجزم في الخانية بالثانية وقال قبله والتي لا اسنان لها وهي تعتلف اولا تعتلف لا تجوز . (ردالمحتار : ٢٠٦/٥)

وقال الإمام الكاساني رحمه الله تعالىٰ : واما الهتماء وهي التي لا اسنان لها فإن كانت ترعى وتعتلف جازت والا فلا وذكر في المنتقي عن ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ انه إن كان لا يمنعها عن الاعتلاف تجزيه وإن كان يمنعها عن الاعتلاف إلا أن يصب في جوفها صبا لم تجزيه . (بدائع الصنائع : ٧٥/٥)

وقال في الهندية : واما الهتماء وهي التي لا اسنان لها فإن كانت ترعى و تعتلف جازت والا فلا كذا في البدائع .

(عالمگيرية : ٢٩٨/٥) (أحسن الفتاوىٰ : ٥١٤/٧)

مشرک کی شرکت سے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی:

کسی مشرکانہ عقیدہ رکھنے والے شخص کی شرکت سے دوسرے شرکاء کی قربانی نہ ہونے کے متعلق ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: اضحیہ کے شرکاء میں سے ایک شریک بریلوی ہے، جس کا عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ غیب جانتے ہیں اور ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں، حضور اکرم ﷺ اور اولیاء رحمہم اللہ تعالیٰ مختار کل ہیں، نفع ونقصان پہنچا سکتے ہیں، بیماری اور صحت، عزت اور اولاد ان کے اختیار میں ہے، اسی بناء پر وہ قبور اولیاء پر اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے منتیں مانتا ہے اور نذریں اور چڑھاوے پیش کرتا ہے، کیا ایسا شخص اضحیہ میں شریک ہو جائے تو دوسرے شرکاء کی قربانی ہو جائے گی؟ بینوا توجروا

الجواب: ایسا شخص مشرک ہے اس کے ساتھ اضحیہ میں شرکت جائز نہیں جو لوگ اس کے ساتھ

شریک ہوں گے ان میں سے کسی کی بھی قربانی نہیں ہوگی۔ (احسن الفتاویٰ: ۷/۵۱۰)

یہ حکم ہر بدعتی کا نہیں ہے بلکہ صرف اس بدعتی کا ہے جس کا مذکورہ بالا مشرکانہ عقائد ہوں۔ جس بدعتی کے ایسے مشرکانہ عقائد نہ ہوں، محض تیجہ، چالیسواں وغیرہ بدعات انجام دیتا ہو احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو بھی شریک نہ کیا جائے تاہم اگر کرلیا تو اس سے دوسرے شرکاء کی قربانی میں فرق نہیں پڑیگا۔

میت کی طرف سے قربانی کا حکم:

اگر میت نے قربانی کی وصیت کی تو اس کے حصہ کا گوشت فقراء کو دینا لازم ہے اس میں سے خود کھانا جائز نہیں اور اگر میت نے وصیت نہیں کی بلکہ عزیز و اقارب ایصال ثواب کے لیے میت کی طرف سے قربانی کریں تو اس کا حکم اپنی قربانی کی طرح ہے۔

كما في الشامية ٥/٣٢٨ لو ضحى عن الميت وارثه بامره الزمه بالتصدق بها وعدم الاكل وإن تبرع بها عنه له الأكل لانه يقع على ملك الذابح والثواب للميت. (امداد الأحكام: ٤/٢٣٦)

حاجی پر وجوب قربانی کی تفصیل:

جو حاجی آٹھ تاریخ کو منیٰ روانہ ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ میں پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصہ مقیم رہا ہو تو اس کے ذمہ حج کی قربانی کے علاوہ مال کی قربانی بھی واجب ہوگی اور جو ایسا نہ ہو یعنی مقیم نہ ہو تو چونکہ مسافر کے ذمہ قربانی واجب نہیں اس لیے مسافر حاجی پر مال کی قربانی واجب نہیں صرف حج تمتع یا قران کی قربانی واجب ہوگی۔

قربانی کے بجائے صدقہ کرنا جائز نہیں:

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ قربانی کے دنوں میں تو بہت جانور ذبح ہوتا ہے ہر ایک کو گوشت مل ہی جاتا ہے لہٰذا قربانی کے بجائے اگر نقد صدقہ کیا جائے تو بہتر ہوگا یہ خیال قطعاً غلط ہے۔ ایسا کرنا شرعاً جائز نہیں بلکہ قربانی کے دنوں میں قربانی کرنا ہی عبادت ہے۔

عن عائشة رضي الله تعالىٰ عنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما عمل ابن ادم من عمل يوم النحر احب إلى الله من اهراق الدم وانه ليأتي يوم القيامة بقرونها واشعارها واظلافها وإن الدم ليقع من الله بمكان قبل أن يقع بالارض فطيبوا بها نفسا رواه

الترمذي و ابن ماجه . (مشکوٰۃ : صـ ۱۲۸)

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قربانی کے دنوں میں قربانی سے زیادہ کوئی چیز اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ان دنوں میں یہ نیک کام سب نیکیوں سے بڑھ کر ہے اور قربانی کرتے وقت اور ذبح کرتے وقت خون کا جو قطرہ زمین پر گرتا ہے تو زمین تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہو جاتا ہے تو خوب خوشی اور خوب دل کھول کر قربانی کیا کرو۔ (ترمذی)

لہٰذا قربانی کے بجائے اس رقم کو صدقہ کرنا جائز نہیں اگر کسی نے صدقہ کر دیا تو اس سے قربانی ساقط نہیں ہوگی بلکہ دوبارہ قربانی کرنا لازم ہوگا اگر ایام قربانی ختم ہو گئے تو ایک متوسط بکرے کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہوگا۔

منت کی قربانی:

جس نے قربانی کرنے کی منت مانی پھر وہ کام پورا ہو گیا جس کے واسطے منت مانی تھی تو اب قربانی کرنا واجب ہے اور یہ قربانی بھی قربانی کے دنوں میں کرے، ہاں اگر قربانی سے صرف ذبح کرنا مراد ہو تو بعد میں بھی نذر پوری کی جا سکتی ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ نذر کی قربانی کا گوشت فقراء میں تقسیم کرے، خود استعمال کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح مالداروں کو کھلانا بھی جائز نہیں۔

(بهشتی زیور)

خنثیٰ جانور کی قربانی کا حکم:

خنثیٰ جانور کی قربانی جائز نہیں۔ اس کا گوشت پکتا نہیں ہے یہ گوشت کے اندر عیب ہے اور عیب دار جانور کی قربانی جائز نہیں اس لیے خنثیٰ کی قربانی جائز نہیں۔

ولا بالخنثى لان لحمها لا تنضج شرح وهبانية .

قال الشامي : وبهذا التعليل اندفع ما اورده ابن وهبان من انها لا تخلوا اما أن تكون ذكرا أو انثى وعلى كل تجوز . (٥/٣١٧)

اور اگر علامت ذکر یا انثیٰ غالب ہو تو قربانی جائز ہے۔ کیونکہ وہ خنثیٰ نہیں۔

(امداد الاحكام : ٤/ ٢٧٠)

کمزور جانور کا حکم:

اگر جانور اتنا دبلا ہو جس کی ہڈیوں میں بالکل گودا نہ رہا ہو اس کی قربانی درست نہیں ہے اور

استاد بلانہ ہو تو دبلے ہونے سے کچھ حرج نہیں اس کی قربانی درست ہے لیکن موٹے تازے جانور کی قربانی کرنا زیادہ بہتر ہے۔

ولا تجوز العجفاء التي لا تنقى فإن كانت فيها مهزولة فيها بعض الشحم جاز . (فتاوىٰ هندية : ٦/ ٣٠٠)

بے سینگ جانور کی قربانی:

جس جانور کی پیدائشی سینگ نہیں یا سینگ تو تھے لیکن ٹوٹ گئے اس کی قربانی درست ہے البتہ بالکل جڑ سے ٹوٹ گئے ہوں تو قربانی درست نہیں۔

ويضحى بالجماء هي التي لا قرن لها خلقية و كذلك العظماء، التي ذهب بعض قرنها بالكسر أو غيره فإن بلغ الكسر الى المخ لم يجز . (ردالمحتار : ٥/ ٣١٥)

قربانی کا جانور گم ہو گیا:

اگر قربانی کا جانور کہیں گم ہو گیا اس لیے دوسرا خریدا پھر وہ پہلا بھی مل گیا اگر امیر آدمی کو ایسا اتفاق ہو تو ایک ہی جانور کی قربانی اس پر واجب ہے۔ دونوں میں سے خواہ کسی کی قربانی کردے لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ اگر پہلے جانور کی قربانی کرے تب تو خیر اور اگر دوسرے جانور کی قربانی کرے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ قیمت میں پہلے جانور سے کم تو نہیں اگر کم ہو تو جتنے دام کم ہوں اتنے دام غریبوں کو صدقہ کر دینا مستحب ہے اور اگر غریب آدمی کو ایسا اتفاق ہوا تو دونوں جانور کی قربانی اس پر واجب ہوگی۔ (بہشتی زیور)

ولو ضلت او سرقت فاشترىٰ اخرىٰ ثم ظهرت الاولىٰ في ايام النحر على الموسر ذبح احدهما وعلى الفقير ذبحهما .

(شرح البداية : ٤/ ٤٤٦)

اکیلا جانور خریدنے کے بعد کسی کو شریک کرنا:

قربانی کے لیے کسی نے جانور خریدا اور خریدتے وقت یہ نیت کی کہ اگر کوئی اور مل گیا تو اس کو بھی شریک کرلیں گے اور مشترکہ قربانی کریں گے اس کے بعد کچھ اور لوگ بھی شریک ہو گئے یعنی سات آدمیوں کے سات حصے ہو گئے تو یہ قربانی درست ہے، اگر جانور خریدتے وقت کسی کو شریک

کرنے کی نیت نہیں تھی بلکہ پوری گائے اپنی طرف سے قربانی کرنے کا ارادہ تھا تو اب اس میں کسی اور کو شریک کرنا بہتر تو نہیں ہے لیکن اگر کسی کو شریک کر لیا تو دیکھنا چاہیے جس نے شریک کیا ہے وہ آدمی امیر ہے کہ اس پر قربانی واجب ہے یا غریب ہے جس پر قربانی واجب نہیں اگر امیر ہے تو شریک کرنا درست ہے اگر غریب ہے تو درست نہیں، یعنی غریب آدمی کے لیے خریدے ہوئے جانور میں کسی کو شریک کرنا درست نہیں لیکن اگر کسی کو شریک کر لیا تو شریک ہونے والے کی قربانی ہو جائے گی البتہ غریب پر اس حصہ کا ضمان لازم ہے اس طرح کہ اگر قربانی کے ایام باقی ہوں تو دوسری قربانی کر دے ورنہ وہ رقم صدقہ کر دے۔

وكذا لو اشترك فيها ستة بعد ما اوجبها لنفسه لم يسعه لانه اوجبها كلها لله وإن اشرك جاز ويضمن ستة اسباعها وقيل في الغني انه يتصدق بالثمن . (عالمگيري : ٥/٣٣٧)

قربانی کا گوشت وزن کر کے تقسیم کرنا:

اگر گائے کی قربانی میں سات آدمی شریک ہوئے تو گوشت تقسیم کرتے وقت اندازہ سے تقسیم نہ کرے بلکہ برابر وزن کر کے تقسیم کرے کیونکہ اگر کسی کے حصہ میں گوشت زیادہ چلا گیا تو یہ سود کے حکم میں ہو کر عظیم گناہ ہوگا اس زائد گوشت کا کھانا بھی جائز نہیں، ہاں البتہ اگر گوشت کے ساتھ سری پائے بھی شامل کر لیے تو اب اندازہ سے تقسیم کرنا بھی جائز ہے، بشرطیکہ سری پائے ہر حصہ میں ہوں۔

ويقسم اللحم وزنا لا جزافا الا اذا ضم معه من الاكارع او الجلد . (الدر المختار : ٥/٣١٠)

تہائی گوشت صدقہ کرنا مستحب ہے:

قربانی کے گوشت میں اختیار ہے کہ خود کھائے رشتہ داروں کو کھلائے فقراء مساکین پر صدقہ کرے البتہ تہائی گوشت تک صدقہ کر دینا یہ مستحب طریقہ ہے، لیکن اگر کوئی پورا گوشت ہی اپنے گھر میں رکھ لے اس میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

ويأكل من لحم الاضحية ويؤكل غنيا وندب الافضل تصدق من الثلث . (درمختار : ٥/٣٢٠)

فقیر پورا گوشت اپنے گھر رکھے:

اگر کسی غریب آدمی نے قربانی کی اور اس کے بچے زیادہ ہیں تو اس کے لیے مستحب یہی ہے کہ پورا گوشت اپنے گھر رکھ لے، کیونکہ قربانی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے جانور ذبح کرنا وہ مقصد تو حاصل ہو گیا۔

وقد نص على ذلك الفقهاء فقالوا: ويستحب لمن كان فقيراً أن يتركها كلها لعياله توسعة عليهم.

وقوله عليه السلام: كنت نهيتكم عن لحوم الاضاحي فوق ثلاث ليتسع ذو الطول ـ اي السعة ـ على من لا طول به. فكلوا ما بدا لكم، واطعموا وادخروا. (أخرجه الترمذي رقم: ١٥١٠)

نابالغ بچے پر قربانی واجب نہیں:

نابالغ بچہ اگر مالدار ہو اس پر قربانی واجب نہیں لہٰذا والد یا وصی نابالغ بچے کے مال سے قربانی نہ کرے۔

وليس للاب أن يفعله من مال طفله ورجحه ابن الشحنة قلت هو المعتمد لما في المتن مواهب الرحمن من انه اصح ما يفتى به.

(در مختار مع الشامية: ٥/٢٧٦)

عشرۂ ذی الحجہ ناخن وغیرہ نہ کاٹنا:

جو شخص قربانی کا ارادہ کرے اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ ذی الحجہ کے چاند نظر آنے کے بعد سے قربانی ہو جانے تک جسم کے بال صاف نہ کرے اور ناخن وغیرہ نہ کاٹے۔

قال العلامة الصابوني: كما يستحب لمن يريد أن يضحي، ألا يأخذ من شعره وأظفاره شيئا، إذا دخل العشر الأول، من شهر ذي الحجة، لما صح عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال:

"إذا دخل العشر ـ أي من أول شهر الحجة ـ وأراد أحدكم أن يضحي، فلا يأخذن شعرا، ولا يقلمن ظفرا" أي يقص أظافره.

(أخرجه مسلم من حديث ام سلمه رقم ١٩٧٧)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جس کا ارادہ قربانی کرنے کا ہو وہ ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں بال ناخن نہ کاٹے۔ باقی اس حکم کا مستحب ہونا پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

وهذا ليس على سبيل الوجوب، وإنما هو للاستحباب، والحكمة منه أن تبقى كامل الأجزاء في البدن، لتعتق من النار، حيث ورد أن الله يعتق بهذه الأضحية، جسد المؤمن من نار جهنم، وأن له بكل شعرة منها حسنة، فهذا كله على سبيل الندب والاستحباب.

روي الإمام الترمذي في سننه عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: "من رأي هلال ذي الحجة، وأراد أن يضحي، فلا يأخذن من شعره، ولا من أظفاره."

(أخرجه الترمذي في كتاب الاضاحي: رقم: ١٥٤٣

قال الترمذي: وهذا قول بعض أهل العلم. وإليه ذهب أحمد و إسحاق، ورخص بعض أهل العلم في ذلك، فقالوا: لا بأس أن يأخذ من شعره وأظفاره، وهو قول الشافعي، واحتج بحديث عائشة، أن النبي صلى الله عليه وسلم كان يبعث بالهدي من المدينة، فلا يجتنب شيئا مما يجتنب منه المحرم. تعني أنه يفعل كل شيء مباح، ومنها نظافة البدن وتقليم الأظافر. (سنن ترمذي: ١٠٢/٤)

ساتویں حصہ کی نفل قربانی میں چھ ساتھی شریک ہو سکتے ہیں؟

چھ آدمیوں نے مل کر قربانی کے بڑے جانور میں اپنا اپنا واجب حصہ رکھا ساتویں حصہ میں سب نے شریک ہو کر آنحضرت ﷺ کے لیے نفل قربانی کی نیت کر لی تو یہ قربانی درست ہوگی یا نہیں اس سلسلہ میں حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وفي الدر المختار قال: ان مات احد السبعة المشتركين في البدنة وقال الورثة اذبحوا عنه وعنكم صح عن الكل استحسانا لقصد القربة من الكل ولو ذبحوها بلا اذن الورثة لم يجزهم.

(درمختار مع الشامی: ٥/٢٨٤)

روایتِ مذکورہ فقہیہ سے استحساناً جائز معلوم ہوتا ہے کیونکہ جب ساتواں حصہ دار فوت ہوگیا تو اس کا حصہ اس کے ورثاء کو منتقل ہوگیا اور اس حصہ کے ورثاء مالک بن گئے اور انہوں نے اس ساتویں حصہ کے مالک ہونے کی حیثیت سے قربانی کی اجازت دے دی تو سب کی قربانی درست ہوگئی اسی طرح صورتِ مسئولہ میں چھ ساتھیوں نے ساتواں حصہ خرید کر حضور اکرم ﷺ کے لیے کردیا تو درست ہونا چاہیے، دوسرے علماء سے بھی دریافت کرلیا جائے۔

(فتاویٰ رحیمیہ قدیم: ١/٩٠)

بچہ کے عقیقہ کا شرعی حکم:

مذہب حنفی میں عقیقہ مسنون و مستحب ہے (رواجی نہیں) اسلامی طریقہ ہے حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ پر بدعت اور مکروہِ تحریمی کا الزام لگانا غلط اور افتراء ہے، مالابدمنہ میں ہے:

"بدانکہ عقیقہ نزد امام مالک رحمہ اللہ و شافعی رحمہ اللہ واحمد رحمہ اللہ سنتِ مؤکدہ است وبروایتے از امام احمد رحمہ اللہ واجب ونزد امام اعظم رحمہ اللہ مستحب وقول بہ بدعت بودنش افتراء است برامام ہمام۔"

ترجمہ: جان لو کہ عقیقہ امام مالک رحمہ اللہ وامام شافعی رحمہ اللہ نیز امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے اور امام احمد کی ایک روایت وجوب کی بھی ہے اور امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک مستحب ہے اور ان کی طرف بدعت کا قول منسوب کرنا حضرت امام ہمام پر افترا ہے۔

(ضمیمہ مالا بد منہ: صـ ١٧٨)

بچہ پیدا ہونے کی خوشی میں شکریہ کے طور پر نیز آفات وامراض سے حفاظت کے لیے ساتویں دن (یعنی بچہ جمعہ کو پیدا ہو تو جمعرات کو اور جمعرات کو پیدا ہو تو بدھ کو) لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے ایک بکرا ذبح کیا جائے اور بچہ کا سر منڈوا کر بال کے ہم وزن چاندی غریبوں کو صدقہ کردے اور لڑکے کے سر پر زعفران لگائے یہ تمام باتیں مستحب ہیں، حدیث سے ثابت ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

عن سمرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم الغلام مرتهن بعقيقته يذبح عنه يوم السابع ويسمى ويحلق راسه .

(ترمذي شريف : ١ / ١٨٣)

ترجمہ: بچہ اپنے عقیقہ کے بدلہ میں مرہون ہوتا ہے لہٰذا ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے اور اس کا نام طے کرلیا جائے نیز اس کا سرمنڈوایا جائے، مرہون کے بہت سے مطلب بیان کیے گئے ہیں، مثلاً حدیث میں آتا ہے کہ بچہ ماں باپ کے لیے سفارش کرے گا اور وہ ان کا شفیع ہوگا لیکن اگر حیثیت کے باوجود عقیقہ نہیں کیا اور بچپن ہی میں بچہ کا انتقال ہوگیا تو ماں باپ کے لیے شفاعت نہیں کرے گا، گویا جس طرح گروی رکھی ہوئی چیز کام میں نہیں آتی، یہ بچہ بھی ماں باپ کے کام نہیں آئے گا۔

عقیقہ کیے بغیر بچہ سلامتی نیز خیر و برکات سے محروم رہتا ہے۔ یعنی جب تک عقیقہ نہ ہو مرض کے قریب اور محافظت سے دور رہتا ہے۔

عقیقہ کیے بغیر بچہ اذی یعنی پلیدی میل کچیل وغیرہ میں مبتلا اور صفائی سے دور رہتا ہے۔ جیسے کہ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

مع الغلام عقيقة فاهر يقوا عنه دما واميطوا عنه الاذى .

(بخاري شريف : ٢/٨٢٢)

نیز حدیث شریف میں ہے:

عن علي بن ابى طالب رضي الله عنه : قال عق رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الحسن بشاةٍ وقال يا فاطمة احلقي راسه وتصدقي بزنة شعره فضةً فوزنته فكان وزنه درهماً او بعض الدرهم .

(ترمذي : ١/١٨٣)

یعنی آنحضرت ﷺ نے ایک بکرا ذبح کر کے امام حسن رضی اللہ عنہ کا عقیقہ کیا اور حضرت فاطمہ کو حکم فرمایا کہ اس کا سرمنڈواؤ اور بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کردو۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے تعمیل کی بالوں کا وزن ایک درہم یا درہم سے کچھ کم تھا۔ (حوالہ مذکورہ)

عن ابى بردة يقول كنا في الجاهلية إذا ولد لاحدنا غلام ذبح شاة ولطخ راسه بدمها فلما جاء الله بالإسلام كنا نذبح شاة ونحلق راسه ونلطخه زعفران . (ابو داود شريف : ٢/٣٧)

یعنی حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں (قبل از اسلام) بچہ پیدا ہوتا تو ہم بکرا ذبح کرتے اور اس کا خون بچہ کے سر پر لگاتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام سے نوازا تو اب ہم ساتویں دن بکرا ذبح کرتے ہیں۔ نیز بچہ کا سر مونڈھتے ہیں اور اس کے سر پر زعفران لگاتے ہیں۔ (حوالہ مذکور)

عن أم كرز رضي الله عنها قالت سمعت ۔ يقول صلى الله عليه وسلم عن الغلام شاتان وعن الجارية شاة لا يضر كم ذكراناً كن ام اناثاً . (ابو داؤد : ٢/٣٦)

یعنی آنحضرت ﷺ نے فرمایا عقیقہ میں لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بکرا ہو یا بکری۔

(ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ قدیم : ١/٩٠)

عقیقہ کی مدت:

عقیقہ کا مستحب طریقہ یہ ہے کہ ساتویں روز کیا جائے جیسا کہ گزشتہ فتویٰ میں حدیث نمبر 1 میں آیا ہے کہ اگر ساتویں روز نہ ہو تو چودھویں روز یا اکیسویں روز کرے آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ عقیقہ کے جانور کو ساتویں روز ذبح کیا جائے یا چودھویں روز یا اکیسویں روز۔ (طبرانی)

بہت سے علماء نے ساتویں دن کی تعداد کا لحاظ کر کے بالغ ہونے تک مدت لکھی ہے اور بہت سے علماء نے کسی مدت کی قید نہیں لگائی ان کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی پچاس برس کی عمر میں عقیقہ کیا ہے مگر یہ روایت صحیح نہیں ضعیف ہے، نیز یہ ایک مجبوری کی صورت ہوگی، یہاں پر تو بلا عذر مہینوں بلکہ برسوں تک ٹالتے رہتے ہیں اور گھر میں کسی کی شادی ختنہ وغیرہ رواج کی راہ دیکھتے ہیں اور ساتویں دن کا لحاظ بھی نہیں ہوتا، اس کے خلاف مستحب ہونے میں کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ عقیقہ خود مستحب ہے اور اس کو مستحب طریقہ سے ادا کرنا چاہیے لہٰذا ساتویں دن عقیقہ کرنا بہتر ہے نہ ہو سکے تو چودھویں یا اکیسویں روز کرے بغیر کسی مجبوری کے اس سے زیادہ تاخیر نہ کرے۔

(ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ قدیم : ١/٩٢)

عقیقہ کی دعا:

عقیقہ کے جانور کو ذبح کرتے وقت یہ دعاء پڑھے:

اللهم هذه عقيقة ابني ...... (اسم ولد) دمها بدمه وعظمها وجلدها بجلده وشعرها بشعره اللهم اجعلها فداء لابني (اسم ولد).

نوٹ: لڑکی کا عقیقہ ہو تو ضمیر کو بجائے مذکر کے مونث بنادے۔ جیسے: اللهم هذه عقيقة بنتي (لڑکی کا نام) دمها بدمها وعظمها بعظمها وجلدها بجلدها وشعرها بشعرها اللهم اجعلها فداء لبنتي (لڑکی کا نام) والد کے علاوہ دوسرا کوئی آدمی ذبح کرے تو ابنی یا ابنتی کی جگہ بچہ اور اس کے باپ کا نام لے۔ دعا مذکورہ کے ساتھ انی وجهت سے وانا من المسلمين تک پڑھے اور اللهم منك ولك پڑھ کر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے۔

عقیقہ کی نیت سے خریدا ہوا جانور:

جو جانور عقیقہ کی نیت سے خریدا گیا ہے اس کا عقیقہ ہی کرنا ضروری ہے یا اس کو کسی اور کام میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عقیقہ کی نیت سے جو جانور خریدا گیا ہے اس کا ذبح کرنا واجب نہیں، جس کام میں چاہیں لے آئیں۔

لأن الشراء بنية العقيقة وإن كان بمعنى النذر ولكن يشترط لانعقاد النذر أن يكون المنذور عبادة مقصودة .

قال في الدر : وكان من جنسه واجب اي فرض كما سيصرح به تبعاً للبحر والدرر . وهو عبادة مقصودة اهـ .

قال الشامي : الضمير راجع للنذر بمعنى المنذور إلى أن قال فهذا صريح في أن الشرط كون المنذور نفسه عبادة مقصودة لاما كان من جنسه اهـ .

(١٠٣/٣)

وفي تنقيح الفتاوىٰ الحامدية : ثم إذا أراد أن يعق عن الولد فإنه يذبح عن الغلام شاتين وعن الجارية شاة لانه إنما شرع للسرور بالمولود وهو بالغلام أكثر اهـ . (٢١٢/٢) وهذا يدل على كونها عبادة غير مقصود فافهم .

(ماخوذ إمداد الأحكام)

باب النذر

منت ماننے کا بیان

کسی شخص نے ایسی عبادت کی نذر مانی جس کی جنس سے فرض یا واجب عبادت ہے اور جس کام کے لیے نذر مانی تھی وہ کام پورا ہو گیا تو اب منت کا پورا کرنا واجب ہے اگر پوری نہ کرے تو سخت گناہ ہوگا۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ ثم ليقضوا تفثهم وليوفوا نذورهم ﴾

(حج : ٢٩)

اور چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں۔ (خواہ نذر سے قربانی وغیرہ واجب کر لی ہو یا بلا نذر جو افعالِ حج واجب ہیں)

وروي البخاري أن ابن عمر رضي الله عنه قال يا رسول الله ! اني نذرت في الجاهلية أن اعتكف ليلة في المسجد الحرام فقال له صلى الله عليه وسلم : اوف نذرك . (أخرجه البخاري : ١٥٩/٤)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے ایامِ جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ مسجد حرام میں ایک رات اعتکاف کروں گا تو رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا کہ اپنی نذر پوری کرو۔

وقوله عليه السلام : من نذر أن يطيع الله فليطعه ومن نذر أن يعصيه فلا يعصيه . (أخرجه البخاري : ١٥٩/٤)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی عبادت کی نذر مانی وہ نذر پوری کرے، اور جس نے گناہ کی نذر مانی وہ پوری نہ کرے۔ (یعنی اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے)

نذر کی شرائط:

نذر منعقد ہونے کے لیے چند شرائط ہیں ان کے بغیر نذر منعقد نہیں ہوگی:

١۔ جس چیز کی نذر مانی ہے وہ عبادت مقصودہ ہو، جیسے: نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ۔

٢۔ لہٰذا کسی گناہ کی نذر ماننے سے وہ نذر منعقد نہ ہوگی۔

لقوله عليه السلام من نذر أن يطيع الله فليطعه ، ومن نذر أن

معصيه فلا معصيه . (رواه البخاري)

۳۔ وہ نذر مملوکہ چیز میں ہو لہٰذا اگر کوئی نذر مانے کے ایک لاکھ درہم صدقہ کرنے کی جبکہ وہ صرف ہزار درہم کا مالک ہے تو اس پر صرف ہزار درہم صدقہ کرنا لازم ہوگا۔

لقوله عليه السلام : ولا وفاء لنذر في معصية ، ولا فيما لا يملك العبد . (اخرجه مسلم رقم ١٦٤١ في كتاب النذر)

٤۔ وہ عبادت نذر سے پہلے اس کے ذمہ شرعاً لازم نہ لہٰذا اگر کوئی یوں نذر مانے کہ میں میرا فلاں کام ہو جائے تو حج فرض ادا کروں گا تو یہ نذر منعقد نہ ہوگی اس کے ذمہ کچھ بھی لازم نہیں ہوگا۔

٥۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جس عبادت کی نذر مانی ہے اس کی جنس سے واجب ہو۔

وفي شرح تنوير الأبصار قال : ومن نذر نذر امطلقا او معلقا بشرط و كان من جنسه واجب ـ أي فرض كما سيصرح به تبعاً للبحر والدرر ، وهو عبادة مقصودة ، الى ...... قوله ان لا يكون معصية لذاته فصح نذر صوم يوم النحر لانه لغيره وأن لا يكون واجبا عليه قبل النذر فلو نذر حجة الإسلام لم يلزمه شيء غيرها وأن لا يكون ما التزمه اكثر مما يملكه ملكا لغيره ، فلو نذر التصدق بألف ولا يملك الأمائة لزمه المائة فقط خلا انتهىٰ .

(ردالمحتار : ٣/٧٣٧)

دائمی روزہ کی نذر میں بوقتِ عجز فدیہ ہے:

کسی شخص نے نذر کی کہ میں مرتے دم تک ہمیشہ روزہ رکھوں گا، اب یہ شخص بیماری یا بڑھاپے کی وجہ سے روزہ رکھنے پر قادر نہیں تو پھر یہ شخص فدیہ دیتا رہے، فدیہ کی بھی طاقت نہ ہو تو استغفار کرتا رہے۔

قال في شرح التنوير : في آخر كتاب الصوم نذر صوم رجب (الى قوله) اوصوم الابد فضعف لاشتغاله بالمعيشة افطر و كفر كما مر ، وفي الشامية (قوله و كفر) أي فدي (قوله كما مر) اي في

الشيخ الفاني من أنه يطعم كالفطرة (ردالمحتار : ٢) وفي ايمان شرح التنوير ولو نذر صوم الابد فاكل لعذر فدى ، وفي الشامية : (قوله فاكل لعذر) و كذا لدونه ح (قوله فدي) اي لكل يوم نصف صاع من بر اوصاعاً من شعيروان لم يقدر استغفر الله تعالىٰ كما مر .

(ردالمحتار : ٣) (مأخوذ از احسن الفتاویٰ : صـ ٤٧٧)

نذر میں زمان ومکان وغیرہ کی تعیین صحیح نہیں:

اگر کسی شخص نے نذر کی کہ فلاں چیز فقراءِ مکہ کو دوں گا اب وہ چیز فقراء مدینہ یا کسی اور جگہ کے فقیر کو بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ نذر میں کسی زمان یا مکان یا فقیر کی تعیین کی تو یہ تعیین ناذر پر لازم نہیں ہوتی، کسی دوسرے وقت میں یا دوسرے مکان میں یا دوسرے فقیر کو دینے سے بھی نذر اداء ہو جاتی ہے، اسی طرح اگر نذر میں کوئی چیز متعین کر دی کہ فلاں چیز دوں گا تو بعینہٖ یہی چیز دینا لازم نہیں بلکہ اس کی قیمت کے برابر نقدی یا کوئی دوسری چیز بھی دے سکتا ہے۔

قال في العلائية والنذر لا يختص بزمان ومكان ودرهم وفقير فلو نذر التصدق يوم الجمعة بمكة بهذا الدرهم على فلان فخالف جاز .

(ردالمحتار : ١٣٧/٢)

قرآن خوانی کرانے کی نذر جائز نہیں:

اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو قرآن خوانی کراؤں گا اب کام ہونے پر قران خوانی کرانا لازم نہیں کیونکہ قرآن خوانی کی مروّج رسم بدعت اور ناجائز ہے اس لیے اس کی نذر کرنا جائز نہیں۔

قال في شرح التنوير وفي البحر وشرائطه خمس فزادان لا يكون معصية لذاته فصح نذر يوم النحر لأنه لغيره ، وفي الشامية قال في الفتح واما كون المنذور معصية يمنع انعقاد النذر فيجب ان يكون معناه إذا كان حراما لعينه او ليس فيه جهة قربة فان المذهب ان نذر صوم يوم العيد ينعقد ويجب الوفاء بصوم يوم غيره ولو صامه خرج

عن العهدة اهـ . (إلى قوله) ان ما كان فيه جهة العبادة يصح النذر به لما مر من انه يلزم الوفاء بالنذر من حيث هو قربة لا بكل وصف التزمه به فصح التزام الصوم من حيث هو صوم مع الغاء كونه في يوم العيد الخ . (ردالمحتار : ٣/٦٩)

تحقیق مذکور سے ثابت ہوا کہ حرام لغیرہ کی نذر منعقد ہو جاتی ہے مگر اس کا ایفاء بطریق مباح واجب ہے۔

معہذا قرآن خوانی خواہ بطریق مباح ہی کیوں نہ ہو اس کی نذر منعقد ہی نہیں ہوتی، اس لیے کہ اس کی جنس سے کوئی فرد فرض یا واجب نہیں، البتہ خود قراۃ قرآن کی جنس سے نماز میں تلاوت فرض ہے مگر قراءۃ قرآن عبادۃ مقصودہ نہیں۔

قال في العلائية ولو نذر التسبيحات دبر الصلوٰة لم يلزمه ، وفي الشامية وكذا لو نذر قراءة القرآن وعلله القهستاني في باب الأعتكاف بانها للصلوٰة وفي الخانية ولو قال على الطواف بالبيت والسعي بين الصفا والمروة او على ان اقرأ القرآن ان فعلت كذا لا يلزمه شيء اهـ قلت وهو مشكل فإن القراءة عبادة مقصودة ومن جنسها واجب وكذا الطواف فإنه عبادة مقصودة ايضاً ثم رأيت في لباب المناسك قال في باب انواع الاطوفة الخامس طواف النذر وهو واجب ولا يختص بوقت فهذا صريح في صحة النذر به .

(ردالمحتار : ٣/٧٠)

نماز کے بعد تسبیحات کی نذر کا حکم:

اگر کوئی شخص نماز کے بعد تسبیحات کی نذر مانے تو اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے یا نہیں اس میں تفصیل ہے۔ احسن الفتاویٰ سے ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے جس سے تفصیل واضح ہو جائے گی۔

سوال: ایک مولوی صاحب نے بتایا کہ نماز کے بعد جو تسبیحات پڑھی جاتی ہیں اگر کسی نے یہ تسبیحات پڑھنے کی نذر کی تو اس کا پورا کرنا واجب نہیں اور اگر درود شریف کی نذر کی تو واجب ہو

جاتی ہے، حوالہ شامیہ کا دیتے ہیں، کیا ان کا یہ قول صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو تسبیحات اور درود شریف میں فرق کی کیا وجہ ہے؟ بینوا توجروا

جواب: تسبیحات اور درود شریف میں یہ فرق شامیہ میں نہیں درمختار میں ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے نذر تسبیحات کو بھی واجب الاداء قرار دیا ہے، صحت نذر کے لیے منذر کا عبادۃ مقصودہ ہونا اور اس کی جنس سے کسی فرد کا فرض یا واجب ہونا شرط ہے، نماز کے بعد والی تسبیحات عبادۃ مقصودہ ہیں اور یہاں لفظ تسبیحات تغلیباً تحمید وتکبیر کو بھی شامل ہے اور تحمید نماز میں سورۂ فاتحہ کی ابتداء میں فرض ہے اور تکبیر ابتداء نماز میں فرض ہے اور تکبیرات عیدین وتکبیرات تشریق واجب ہیں، اس لیے ان تسبیحات کی نذر صحیح ہے، اسی طرح درود شریف عبادۃ مقصودہ ہے اور عمر بھر میں ایک بار فرض ہے، اس لیے اس کی نذر بھی صحیح ہے، البتہ نذر تسبیحات میں اگر "نماز کے بعد" کی قید نہیں لگائی تو یہ نذر واجب نہیں، اس لیے کہ اس موقع پر لفظ تسبیحات تحمید وتکبیر کو شامل نہیں بلکہ صرف تسبیح ہی مراد ہے اور جنس تسبیح میں کوئی فرد فرض وواجب نہیں۔

نقل في شرح التنوير عن القنية لو نذر التسبيحات دبر الصلوٰة لم يلزمه ولو نذران يصلى على النبي صلى الله عليه وسلم كل يوم كذا لزمه وقيل لا ، وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله ولو نذر التسبيحات) لعل مراده التسبيح والتحميد والتكبير ثلاثا والثلاثين فى كل واطلق على الجميع تسبيحاً تغليباً لكونه سابقا وفيه اشارة الى انه ليس من جنسها واجب ولا فرض وفيه ان تكبير التشريق واجب على المفتى به وكذا تكبيرة الاحرام وتكبيرات العيدين فينبغي صحة النذر به بناء على ان المراد من الواجب هو المصطلح قلت لكن ما ذكره الشارح ليس عبارة القنية وعبارتها كما في البحر ولو نذران يقول دعاء كذا فى دبر كل صلوٰة عشر مرات لم يصح (قوله لزمه) لان من جنسه فرضا وهو الصلوٰة عليه صلى الله عليه وسلم مرة واحدة فى العمر وتجب كلما ذكر وإنما هي فرض عملى قال ح ومنه يعلم انه لا يشترط كون الفرض قطعيا (قوله وقيل

لا) لعل وجهه اشتراط كون الفرض قطعيا ح (ردالمحتار : ٣ : ٧٠)

(أحسن الفتاوی : ٥ / ٤٨١)

نذرِ ذبح میں قیمت کا تصدق جائز ہے:

ایک شخص نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو ایک بکرا ذبح کر کے گوشت فقراء میں تقسیم کروں گا اب کام ہونے پر بکرا ہی ذبح کرنا ضروری نہیں بلکہ اس بکرے کی قیمت کا تصدق بھی جائز ہے کیونکہ اضحیہ کے سوا نذرِ ذبح سے نذرِ تصدق لحم مقصود ہے، ورنہ نفس ذبح کی نذر صحیح نہیں، اس لیے کہ اضحیہ کے سوا ذبح حیوان عبادتِ مقصودہ نہیں، جب ذبح مقصود نہیں بلکہ تصدق لحم مقصود ہے تو اس سے ثابت ہوا کہ ذبح حیوان واجب نہیں، بلکہ اختیار ہے چاہے یہ بکرا ذبح کر کے گوشت صدقہ کرے یا بکرا زندہ صدقہ کر دے یا اس کی قیمت صدقہ کر دے یا قیمت کے برابر کوئی دوسری چیز۔

قال في شرح التنوير نذران يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جاز ان ساوي العشرة كتصدقه بثمنه .

(ردالمحتار : ٣ / ٧٢)

یعنی اس شخص نے نذر مانی کہ دس درہم کی روٹی صدقہ کرے گا، پھر روٹی کے بجائے دس درہم کے چاول صدقہ کر دیے یہ بھی جائز ہے، جیسے روٹی کی قیمت صدقہ کرنا جائز ہے۔

فائدہ: بعض فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نذر میں زمان، مکان اور درہم وفقیر وغیرہ کی تعیین سے نذر ان قیود سے مختص نہیں ہوتی، اس پر اشکال ہوتا ہے کہ فقیر نے قربانی کی نیت سے جانور خریدا تو بحکم نذر ہونے کی وجہ سے بعینہ اسی جانور کی قربانی اس پر واجب ہے، تبدیل کرنا جائز نہیں، اس صورت میں اختصاصِ نذر کیوں ہوا؟

وجہ الفرق یہ معلوم ہوتی ہے کہ نذر تضحیہ میں فعل منذور یعنی ذبح کا اثر حسی حیوان میں پایا جاتا ہے اور نذرِ تصدق میں مسمی میں فعل منذور یعنی تصدق کا کوئی اثر حسی نہیں پایا جاتا۔

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

شیرینی تقسیم کرنے کی نذر:

کسی نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو بچوں کو شیرینی تقسیم کروں گا تو کام پورا ہونے پر

یہ شیرینی تقسیم کرنا واجب ہے کیونکہ الفاظ نذر میں بچوں میں سے اغنیاء کی تخصیص نہیں، اس لیے یہ اغنیاء وفقراء سب کو شامل ہے اور تصدق علی الفقیر عبادت مقصودہ ہے، لہٰذا یہ نذر صحیح ہے اور واجب الاداء ہے اور الفاظِ نذر میں نہ تو شیرینی کی کوئی مقدار یا قیمت متعین کی گئی ہے اور نہ ہی بچوں کی تعداد بیان کی گئی ہے، اس صورت میں اطعام عشرۃ مساکین واجب ہے، یعنی مقدار صدقۃ الفطر سے دس گناہ زیادہ گیہوں یا اس کی قیمت کے برابر نقدی یا کوئی دوسری چیز صدقہ کرنا واجب ہے خواہ ایک مسکین کو دے یا متعدد کو بہر صورت نذر ادا ہو جائے گی۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : قال علي نذر ولم يزد عليه ولا نية له فعليه كفارة يمين ولو نوي صياماً بلا عدد لزمه ثلاثة ايام ولو صدقة فاطعام عشرة مساكين كالفطرة ، وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ (قوله لزمه ثلاثة ايام) لان ايجاب العبد معتبر بايجاب الله تعالىٰ وادنى ذلك فى الصيام ثلاثة ايام فى كفارة اليمين بحر عن الولوالجية (قوله ولو صدقة) اي بلا عدد (قوله كالفطرة) اي لكل مسكين نصف صاع برو كذا لو قال لله على اطعام مسكين لزمه نصف صاع بر استحسانا وان قال لله على ان اطعم المساكين على عشرة عند ابي حنيفة رحمه الله تعالىٰ فتح .

(ردالمحتار : ۷۳/۳)

وفي شرح التنوير نذر لفقراء مكة جاز الصرف لفقراء غيرها لما تقرر فى كتاب الصوم ان النذر غير المعلق لا يختص بشيء نذران يتصدق بعشرة دراهم من الخبز فتصدق بغيره جازان ساوي العشرة كتصدقه بثمنه ، وفي الشامية تحت (قوله لما تقرر فى كتاب الصوم) قلت وكما لا يتعين الفقير لا يتعين عدده ففي الخانية اي زوجت بنتي فالف درهم من مالى صدقة لكل مسكين درهم فزوج ودفع الالف الى مسكين جملة جاز . (ردالمحتار : ۷۲/۳)

(ماخوذ از أحسن الفتاوىٰ : ۴۸۳/۵)

نذرِ معلق میں صیغۂ التزام ضروری نہیں:

نذر معلق میں صیغۂ التزام ضروری ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں احسن الفتاوی ۵/۴۸۴ سے ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: زید کی بھینس کا پاؤں ٹرک میں پھنس گیا، نہ نکل سکا، زید نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے میری بھینس کا پاؤں صحیح سلامت نکل جائے تو دس روپے اللہ واسطے دوں گے، صرف اللہ واسطے کا لفظ کہا، منت یا نذر وغیرہ کچھ نہیں کہا تو یہ نذر کے حکم میں ہے یا نفلی صدقات کے حکم میں ہوگا؟ بینوا توجروا

جواب: ایسے الفاظ عرفاً نذر کیلئے مستعمل ہیں، اس لیے یہ نذر لازم اور واجب التصدق ہے۔

فإن الأيمان مبنية على العرف، قال فى العلائية فإن الآيمان مبنية على العرف فما تعورف الحلف به فيمين وما لا فلا.

(ردالمحتار: ٣/٥٢)

والنذر في حكم اليمين كما في الشامية تحت (قوله ومن نذر نذرا مطلقاً) و انما ذكروا النذر في الايمان لما يأتي من انه لو قال على نذر ولا نية له لزمه كفارة و مر فى آخر كتاب الصيام انه لو نذر صوماً فإن لم ينو شيئا او نوي النذر فقط او نوي النذر وان لا يكون يميناً كان نذرا فقط وان نوي اليمين وان لا يكون نذرا كان يمينا وعليه كفارة أن افطر وان نواهما او نوي اليمين كان نذرا ويمينا حتى لو افطر قضى و كفر ومر هناك الكلام فيه. (ردالمحتار: ٣/٦٨)

وايضاً فيهما (قوله لان الذبح ليس من جنسه فرض الخ) هذا التعليل لصاحب البحروينا فيه مافي الخانية قال ان برئت من مرضي هذا ذبحت شاة فبرئ لا يلزمه شئ إلا ان يقول فلله على ان اذبح شاة اهـ. وهي عبارة متن الدرر وعللها في شرحه بقوله لان اللزوم لا يكون الا بالنذر والدال عليه الثاني لا الاول اهـ فافادان عدم الصحة لكون الصيغة المذكوره لا تدل على النذر اي لان قوله ذبحت شاة

وعد لا نذر و يؤيده ما في البزازية لو قال ان سلم ولدي اصوم ما عشت فهذا وعد لكن في البزازية ايضا ان عوفيت صمت كذا لم يجب ما لم يقل لله تعالىٰ علي وفي الاستحسان يجب ولو قال ان فعلت كذا فانا أحج ففعل يجب عليه الحج اهـ فعلم أن تعليل الدرر مبني على القياس والاستحسان خلافه وينا فيه ايضاً قول المصنف على شاة اذبحها وعبارة الفتح فعلى بالفاء في جواب الشرط اذلا شك ان هذا ليس وعد اولا يقال انما لم يلزمه لعدم قوله لله على لان المصرح به صحة النذر بقوله لله على حجة او على حجة .

(ردالمحتار : ۷۲/۳)

تبلیغ میں جانے کی نذر صحیح نہیں:

کسی شخص نے نذر مانی کہ میرا فلاں کام ہوگیا تو چالیس دن تبلیغ میں جاؤں گا تو کام ہونے پر اس نذر کا پورا کرنا واجب نہیں کیونکہ صحتِ نذر کے لیے یہ شرط ہے کہ منذور عبادتِ مقصودہ ہو، تبلیغ عبادتِ مقصودہ نہیں اس لیے یہ نذر منعقد نہیں ہوئی، اس کا ایفاء واجب نہیں، جائز ہے۔

قال في التنوير ومن نذر نذراً مطلقاً او معلقاً بشرط و كان من جنسه واجب وهو عبادة مقصودة ووجدا الشرط لزم الناذر .

(ردالمحتار : ٦٨/٣) (هكذا في أحسن الفتاوىٰ)

باقی جانا واجب نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جانا کوئی گناہ کا کام ہے، بلکہ مناسب یہی ہے کہ کام پورا ہوا تو اپنا ارادہ بھی پورا کرے۔

مدرسہ میں رقم دینے کی نذر:

اگر کوئی شخص اس طرح نذر مانے کہ فلاں کام ہوگیا تو فلاں مدرسہ کو اتنی رقم دوں گا تو کام ہونے کے بعد مدرسہ کو اتنی رقم دینا لازم ہوگا کیونکہ مدرسہ کو دینے کے عرفاً دو معنیٰ ہوسکتے ہیں ایک یہ کہ مدرسہ میں وقف کردوں گا، دوسرے یہ کہ مساکین طلبہ مدرسہ کے لیے دوں گا بہرصورت نذر منعقد اور واجب الاداء ہے کیونکہ وقف بھی جنس واجبات میں سے ہے کہ کم از کم مسجد کا وقف کرنا مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے اور صدقہ مساکین بھی جنس واجبات میں سے ہے لہٰذا یہ نذر منعقد ہو

گئی اگر چہ مساکین کی نیت اور تصریح نہ کرے اسی طرح اگر یہ نذر کی کہ اگر فلاں کام ہوجائے تو یہ گائے ذبح کر کے اللہ واسطے دوں گا تو یہ نذر بھی صحیح ہے اور منعقد ہے کیونکہ یہ نذر صراحۃً گوشت کے صدقہ کی ہوئی اور صریح میں نیت شرط نہیں البتہ محض ان لفظوں سے کہ یہ کام ہوگیا تو گائے ذبح کروں گا نذر کا انعقاد اس وقت تک احقر کے خیال میں نہیں ہوگا، جب تک ان الفاظ سے اس کی نیت گوشت صدقہ کرنے کی نہ ہو۔ (ماخوذ از امداد المفتین :صفحہ ۷۲۹)

نذر ماننا ناپسندیدہ عمل ہے:

انسان جب کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے یا کسی مشکل میں پھنس جاتا ہے تو نذر مانتا ہے کہ یہ تکلیف یا بیماری دور ہوجائے یا یہ مشکل حل ہوجائے تو فلاں چیز صدقہ کروں گا اب اگر اس کو صحت حاصل ہوجائے تو اس پر نذر پوری کرنا لازم ہوجاتا ہے۔

لقوله تعالیٰ : ﴿يوفون بالنذر ويخافون يوما كان شره مستطيرا﴾ (سورة الدهر : ۷)

یعنی پورا کرتے ہیں منت کو اور ڈرتے ہیں اس دن سے کہ اس کی برائی پھیل پڑے گی، البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شرعاً پسندیدہ عمل یہ ہے کہ ایسے موقع پر صدقہ کو نذر کے ذریعہ معلق کرنے کی بجائے نقد صدقہ خیرات کیا جائے توبہ استغفار کا اہتمام کیا جائے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی جائے نذر ماننا شرعاً ناپسندیدہ عمل ہے رفع بلا میں اس نذر کا کوئی خاص دخل نہیں۔

لما ورد في الصحيحين عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال : لا تنذروا فإن النذر لا يقدم شيئا ولا يؤخره وإن النذر لا يأتي بخير وإنما يستخرج به من البخيل . (اخرجه البخاري : ۱۵۷/٤ مسلم رقم ۱٦٤۰ باب النهي عن النذر وانه لا يرد شيئا)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نذر نہ مانا کرو کیونکہ نذر کی وجہ سے جو چیز تقدیر میں مؤخر ہے مقدم نہ ہوگی اور جو مقدم ہے وہ مؤخر نہ ہوگی اور نذر سے کوئی خیر حاصل نہیں ہوگی اس کے ذریعہ تو فقط بخیل سے مال نکالا جاتا ہے۔ (بخاری)

ولی کے نام بکرا ذبح کرنے کی نذر ماننا:

غیر اللہ کے نام پر نذر ماننا حرام ہے، اس منذور کا استعمال کرنا اس سے کسی قسم کا استفادہ بھی

حرام ہے اس کے بارے میں ایک اہم سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: ایک شخص نے اس طرح نذر مانی کہ "اے بزرگ میرا فلاں کام ہو جائے گا تو میں آپ کے نام پر بکرا ذبح کروں گا، آپ کے مزار پر الٹا لٹکوں گا، پھر اس کا کام ہو گیا تو اس نے مزار پر بکرا ذبح کیا اور خود کو کئی گھنٹے الٹا لٹکایا اس کی بیوی اس کے ساتھ مزار پر نہیں جا رہی تھی لیکن اس کو بھی زبردستی لے گیا، اب سوال یہ ہے کہ ایسا آدمی مسلمان رہا یا نہیں؟ اس کی بیوی سے اس کا نکاح ٹوٹ گیا یا باقی ہے؟ اگر نکاح نہیں رہا تو کیا دوبارہ نکاح کرنا ہوگا؟ اگر نکاح نہیں ٹوٹا تو ایسے آدمی کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیا اس طرح کی نذر اور منت ماننا مزار پر بکرا ذبح کرنا، خود کو الٹا لٹکانا جائز ہے؟ بینوا توجروا

جواب: صورتِ مسئولہ میں نذر صحیح نہیں کہ یہ امورِ معصیت ہیں اور معصیت کی نذر منعقد نہیں ہوتی، اس نذر کا پورا کرنا جائز نہیں، درمختار میں ہے:

وإن لا يكون معصية لذاته . (در مختار : ٩٢/٣)

یعنی نذر منعقد ہونے کی شرط یہ ہے کہ گناہ کی نذر نہ ہو۔

شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

سوال چہل و نہم: نذر کردن بایں طور کہ اگر حاجت من برآرد بدرگاہ فلاں ولی ایں قدر از نقد وجنس طعام پختہ برسانم یا بنام اوشاں سبیل کنانم چہ حکم دارد، جائز یا گناہ کدام گناہ؟

جواب: نذر کردن بایں طور کہ اگر حاجتِ من خدا برآرد بمزار فلاں ولی ایں قدر از نقد وجنس طعام پختہ برسانم درست نیست زیرا کہ در نذر کردن خدائے تعالیٰ چند شروط است اگر ہمہ متحقق شوند نذر لازم می شود والا لازم نیست ...... الی قولہ ...... چہارم آنکہ منذور در فی نفسہ گناہ نباشد اگر گناہ خواہد شد اصلا در نذر کردن بر و لازم نخواہد شد چنانچہ در فتاویٰ عالمگیری مرقوم است الاصل ان النذر لا یصح الابشروط ...... الی قوله ...... والرابع ان لا يكون المنذور معصية باعتبار نفسه انتهى چوں ازیں عبارت معلوم شد کہ در نذر کردن چند شروط ضروراست، پس در سوال کہ مرقوم است کہ بدرگاہ فلاں ایں قدر طعام پختہ برسانم رسانیدن طعام جای عبادت نیست پس نذر صحیح نخواہد شد...... الخ۔ (مائة مسائل ص : ٨١ تا ٨٤ فارسی)

ترجمہ: سوال چہل و نہم اس طرح منت ماننا کہ اگر خدا میری حاجت برلائیں تو فلاں ولی کے

مزار پر اس قدر نقدی اور کھانا پہنچاؤں گا یا ان کے نام کی سبیل لگاؤں کیسا ہے؟ جائز ہے یا گناہ ہے؟ اگر گناہ ہے تو کس قسم کا گناہ؟

جواب: اس طرح منت ماننا کہ اگر خداوند تعالیٰ میری حاجت بر لائیں تو فلاں ولی کے مزار پر اس قدر نقد و جنس اور پکا ہوا کھانا پہنچاؤں جائز نہیں اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی منت ماننے میں چند شرطیں ہیں اگر تمام شرطیں پائی جائیں گی تو نذر لازم ہوتی ہے ورنہ نہیں...... الی قولہ...... چوتھی شرط یہ ہے کہ جو چیز منت میں مانی جائے وہ فی نفسہ گناہ نہ ہو اگر وہ فعل گناہ ہو تو منت کا پورا کرنا اس پر کبھی بھی لازم نہ ہوگا چنانچہ فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ نذر صحیح نہیں ہوتی ہے مگر چند شرطوں کے پائے جانے پر...... الی قولہ...... چوتھی شرط یہ ہے کہ منذور فی نفسہ گناہ نہ ہو۔ انتہی۔ جب اس عبارت سے معلوم ہو گیا کہ نذر ماننے میں چند شرطیں ضروری ہیں تو سوال میں جو صورت مرقوم ہے کہ فلاں ولی کے مزار پر اس قدر کھانا پہنچاؤں گا، مزار پر کھانا پہنچانا عبادت نہیں ہے اس لیے اس صورت میں نذر صحیح نہ ہوگی اگر اس طرح کہا جائے کہ اگر خداوند تعالیٰ میری حاجت بر لائیں تو فلاں مزار کے فقیروں اور مجاوروں کو کھانا کھلاؤں گا تو نذر صحیح ہو جائے گی اور اس کی وفا لازم ہوگی لیکن فقراء مزار، مجاوروں کی تخصیص نذر کے پورا کرنے میں ضروری نہیں جس فقیر کو بھی دے دے گا نذر پوری ہو جائے گی اور اگر اس طرح کہے کہ اگر میری حاجت بر آئے تو فلاں ولی کے لیے یا فلاں ولی کے نام پر اس قدر نقدی وغیرہ دوں گا تو ایسی منت ماننا بالاجماع باطل ہے اور وہ کھانا حرام ہے چنانچہ معتبر کتابوں کے حوالہ سے لکھا جائے گا اور اسی قسم سے ہے اگر یہ کہے کہ یہ چیز اس ولی اور سید کے نام کی ہے (تو یہ بھی حرام ہے) عالمگیری میں ہے وہ نذریں جو اکثر عوام مانتے ہیں کہ صلحاء کی قبر پر جاتے ہیں اور غلاف اٹھا کر مثلاً یہ کہتے ہیں کہ میں اس قدر مال اب قبر پر چڑھاؤں گا اے میرے سید اگر پوری فرمائیں میری حاجت کو تو یہ بالاجماع باطل ہے...... الی قولہ...... اور جب تم نے یہ سمجھ لیا تو یہ بھی سمجھ لو کہ وہ مال اور اس کے مثل اور چیزیں جو اولیاء کے مزار پر ثواب کے لیے لے جایا کرتے ہیں وہ بالاجماع حرام ہیں جب تک کہ زندہ محتاجوں پر خرچ کرنے کا ارادہ نہ کیا جائے اور اس پر سب متفق ہیں اور اس میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں۔ (عالمگیری) بحر الرائق میں ہے وہ نذریں جو اکثر عوام مانتے ہیں جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ کسی غائب آدمی کے لیے یا کسی بیمار کے لیے یا خود اس کو کوئی حاجت در پیش ہو تو وہ صلحاء کے مزار پر جاتا ہے اور مزار کے

غلاف کو سر پر رکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے فلاں سید! اگر آ جائے میرا غائب آدمی یا اچھا ہو جائے میرا مریض یا پوری ہو جائے میری حاجت، تو آپ پر اس قدر مال اس قدر کھانا یا اس قدر پانی یا اس قدر تیل یا اس قدر موم بتیاں یا اس قدر چراغ چڑھاؤں گا تو ایسی منت چند وجوہ سے بالاجماع باطل ہے۔ اول تو اس لیے کہ یہ منت مخلوق کے لیے ہے اور مخلوق کے لیے منت ماننا کسی صورت میں جائز نہیں۔ اور اس وجہ سے بھی کہ منذور لہ میت ہے اور میت کسی شی کا مالک نہیں ہوتا۔ اور اس وجہ سے کہ اگر گمان ہو کہ اللہ کے سوا اور دنیا میں میت بھی متصرف ہے تو یہ اعتقاد کفر ہے۔ الی آخرہ۔

(امداد المسائل ترجمہ مائتہ مسائل : صفحہ ۹۰، ۹۱، ۹۲)

مالا بدمنہ میں ہے ''سجدہ کردن بسوئے قبور انبیاء و اولیاء و طواف گرد قبور کردن و دعا از آنہا خواستن و نذر برائے آنہا قبول کردن حرام است بلکہ چیز ہا ازاں بہ کفر می رساند پیغمبر ﷺ بر آنہا لعنت گفتہ، و ازاں منع فرمودہ و گفتہ کہ قبر مرا بت نہ کنند۔''

یعنی انبیاء اور اولیاء کی قبروں کی طرف سجدہ کرنا اور ان سے دعا مانگنا اور ان کی نذر ماننا حرام ہے بلکہ بعض چیزیں کفر تک پہنچانے والی ہیں پیغمبر علیہ السلام نے ایسی چیزوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ میری قبر کو بت نہ بنانا۔ (مالا بدمنہ: صفحہ ۸۰)

لہٰذا اس طرح منت ماننا کہ ''اے بزرگ میرا فلاں کام ہو جائے گا تو آپ کے نام پر بکرا ذبح کروں گا، آپ کے مزار پر الٹا لٹکوں گا۔'' سخت گناہ اور حرام ہے اور مشرکانہ فعل ہے یہ نذر منعقد ہی نہیں ہوئی یہ چیز جہالت سے سرزد ہوئی ہے اس لیے توبہ و استغفار لازم ہے اور ایسی صورت میں احتیاطاً تجدید نکاح کا حکم کیا جائے گا۔ شامی میں ہے:

نعم سیذکرہ الشارح ان ما یکون کفرا اتفاقاً یبطل العمل والنکاح، ما فیہ خلاف یؤمر بالاستغفار والتوبۃ وتجدید النکاح وظاھرہ انہ امر احتیاطا الخ (شامی : ۳۹۹/۲ باب المرتد)

(ماخوذ از الفتاویٰ رحیمیہ : ٦٥/٦)

جس جانور کے ذبح کرنے کی نذر مانی کیا اس کو بدلا جا سکتا ہے؟

نذر کے جانور تبدیل کرنے کی ایک خاص صورت کا حکم یہاں سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سوال: بعد سلام مسنون ایک مسئلہ دریافت طلب ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص نے نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اپنے دو بکروں میں سے ایک صدقہ کروں گا اور ابھی کام ہوا نہیں ہے لیکن امید ہے کہ آئندہ وہ کام ہو جائے تو کیا ابھی اس بکرے کی قربانی کر سکتا ہے؟ اس کا خیال یہ ہے کہ بکرے کی قیمت لگا کر قیمت محفوظ رکھ لے اور جب کام پورا ہو جائے تو اس قیمت کا بکرا خرید کر صدقہ کر دے اور جو بکرا موجود ہے اس کی قربانی کر ڈالے، شرعاً اس کی اجازت ہوگی؟

بینوا توجروا

جواب: صورتِ مسئولہ میں بہتر یہ ہے کہ دو بکروں میں سے جو اچھا ہو اسے رکھ لیا جائے، دوسرے کو فروخت کر دیا جائے یا قربانی کر دی جائے اور یہ بھی درست ہے کہ دونوں کو فروخت کر دیا جائے یا قربانی کر دی جائے اور جب کام پورا ہو جائے تو ایک بکرے کی قیمت صدقہ کر دی جائے، یا اس کا بکرا خرید کر صدقہ کر دیا جائے دونوں صورتیں جائز ہیں۔ اس قسم کے سوال کے جواب میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے ارقام فرمایا ہے: یہ بھی اختیار ہے خواہ ذبح کر کے تصدق کر دے یا بکری کی قیمت کا تصدق کر دے اور فروخت کر دینے کے بعد بھی دونوں اختیار ہیں کہ خواہ دوسری بکری خرید کر ذبح وصدقہ کر دے یا وہ قیمت صدقہ کر دے۔

(امداد الفتاوی: ۲/۴۹٦)

روزہ کی نذر کی صورت میں فدیہ ادا کر سکتا ہے یا نہیں؟

سوال: زید نے نذر مانی کہ اگر میرے بھائی کی طبیعت ٹھیک ہوگئی تو میں تیس روزے رکھوں گا، زید کے بھائی کی طبیعت کچھ ٹھیک ہوگئی ہے اور اب وہ اپنی نذر پوری کرنا چاہتا ہے لیکن زید تاجر ہے اس کو روزہ رکھنا مشکل ہوگا اور پابندی نہ ہو سکے گی تو وہ ان روزوں کا فدیہ دے سکتا ہے یا نہیں؟ یا روزہ ہی رکھنا ضروری ہے؟ بینوا توجروا

جواب: صورتِ مسئولہ میں زید کے بھائی کی طبیعت ٹھیک ہو جانے پر زید پر ایک ماہ کے روزے رکھنا ضروری ہیں، مسلسل رکھنا ضروری نہیں متفرق بھی رکھ سکتا ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وقد روي عن محمد قال ان علق النذر بشرط يريد كونه كقوله ان شفى الله مريضي اورد غائبي لا يخرج عنه بالكفارة كذا فى المبسوط ويلزمه عن ما سمى كذا فى فتاوىٰ قاضي خان.

امام محمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر نذر ایسی شرط کے ساتھ معلق کی جس کے پورا ہونے کی اسے تمنا ہے جیسے یوں کہاں اگر اللہ تعالیٰ میرے بیمار کو شفا عطا کرے یا میرے گم شدہ کو واپس لوٹا دے تو میں یہ کام کروں گا تو کفارہ کافی نہ ہوگا اور جس چیز کی نذر مانی ہے وہ پورا کرنا لازم ہوگا۔

(فتاوی عالمگیری : ۴۲/۳) (هدایه اولیں : ۴۶۳)

دوسری جگہ ہے:

ولو قال لله علي ان اصوم شهر امثل شهر رمضان ان نوي المماثلة في التتابع يلزمه صوم شهر متتابعاً وإن نوي المماثلة في العدد اولم يكن له نية يلزمه ان يصوم ثلثين يوما ان شاء صام متفرقا وان شاء متتابعا كذا في المحيط .

یعنی اگر اس طرح نذر مانی میں ماہِ رمضان کی طرح ایک مہینہ کے روزے اللہ کے واسطے رکھوں گا اگر اس سے مراد یہ ہو کہ رمضان کے مانند مسلسل ایک ماہ کے روزہ رکھوں گا تو اس کو لگا تار ایک ماہ کے روزے لازم ہوں گے اور اگر یہ نیت ہو کہ رمضان کے روزوں کے عدد (گنتی) کے مطابق روزے رکھوں گا یا کچھ نیت نہ ہو تو اس کو تیس روزے لازم ہوں گے چاہے متفرق رکھے یا مسلسل۔

(کذا فی المحیط ، فتاوی عالمگیری : ۱۳۵/۱ کتاب الصوم الباب السادس فی النذر ماخوذ از فتاوی رحیمیہ)

نیاز کا حکم:

ہمارے ہاں بعض لوگ نیاز کرتے ہیں کبھی اس کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں ، نیازِ رسول، نیازِ حسین ، نیاز امیر یا نیاز اللہ وغیرہ نیاز کا حکم بیان کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس نیاز کی دوصورتیں ہیں ایک صورت میں اس کا کرنا حرام اور سخت گناہ ہے اس کے کھانے کا بھی یہی حکم ہے اور دوسری صورت میں چند شرائط کے ساتھ جائز ہے اور اس کا کھانا بھی جائز ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر نیاز انہیں بزرگوں کے نام کی ہو یعنی اس سے ان بزرگوں کا تقرب مقصود ہو تو یہ حرام ہے اور اس کا کھانا بھی حرام کیونکہ یہ نذر غیر اللہ ہے جس کی صریح ممانعت احادیثِ صحیحہ میں وارد ہے۔ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے۔

لا نذر الا فيما يبتغي به وجه الله .

نذر منعقد نہ ہوگی مگر ایسی چیز کی جس سے اللہ کی رضا مقصود ہو۔

اور بحرالرائق میں ہے:

النذر الذي يقع للأموات من اكثر العوام وما يوخذ من الشمع والزيت ونحوها الى ضرائح الاولياء الكرام تقربا اليهم فهو بالاجماع حرام الى قوله لانه حرام بل سحت ولا يجوز لخادم الشيخ اخذه الا ان يكون فقيرا الخ .

اور اگر نذر اللہ تعالیٰ کے نام کی اور اس کی رضا تقرب کے لیے ہو صرف اتنا کیا جائے کہ ایصالِ ثواب کسی بزرگ کو کردیا جائے تو یہ بشرائط ذیل جائز ہے:

۱۔ کوئی تاریخ ہمیشہ کے لیے مقرر نہ کرے۔

۲۔ جو کچھ کھلانا ہو اس میں فقراء کو کھلائے اغنیاء اور صاحبِ نصاب لوگوں کو اس میں سے کچھ نہ کھلائے۔

۳۔ اس کو لازم و واجب کی طرح جان کر نہ کرے اور ان لوگوں پر کوئی طعن نہ کرے جو ایسا نہیں کرتے۔

٤۔ قرض لے کر اپنی وسعت سے زیادہ خرچ نہ کرے۔

۵۔ اور بھی کوئی خلافِ شرع کام اس کے ساتھ نہ ملائے۔ اس صورت میں یہ نذر جائز بلکہ ثواب ہوگی اور اس کا کھانا بھی فقراء کے لیے جائز ہوگا۔ (ماخوذ از امداد المفتین: ۷۲۸)

استطاعت سے زائد نذر ماننے کی ایک صورت کا حکم:

کسی شخص نے نذر مانی کہ اس چیز کی قیمت حج پر صرف کروں گا اور اس کی استطاعت میں حج کی رقم نہیں اور قیمت بھی حج کے مصارف سے بہت کم ہے، کیا اس پر اس نذر سے حج فرض ہو جائے گا یا اگر فرض نہ ہو تو وہ منذور قیمت فی سبیل اللہ دینی پڑے گی یا نہیں؟ اس بارے میں حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قال فى البحر الرائق عن الخلاصة لو التزم بالنذر اكثر مما يملكه هو المختار كما إذا قال ان فعلت كذا فالف درهم من مالى صدقة

ففعل وهو لا يملك إلا المائة لا يلزمه الا المائة . الخ

(بحر : ٣٢١/٤)(ومثله في الدر المختار والشامي : ٧٣/٣)

عبارتِ مذکورہ سے معلوم ہوا کہ صورتِ مسئولہ میں اس شخص پر حج تو واجب نہیں لیکن اس چیز کی جو قیمت حاصل ہو اس کو حج کے مصارف میں خرچ کرنا واجب ہو گیا جس کی صورت یہ ہے کہ یا تو مکہ معظمہ میں کسی شخص کو دے دی جائے وہاں کے کوئی شخص اس رقم سے حج کر لیں اور یا کسی ایسے شخص کو دے دی جائے جو حج کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی رقم میں کمی ہے۔

عمرہ کی نذر صحیح ہے:

اگر کوئی شخص عمرہ ادا کرنے کی نذر مانے تو یہ نذر منعقد ہو گی اور اس کا ایفاء واجب ہو گا۔

نقل في الهندية عن المبسوط ، ولو جعل عليه حجة او عمرة او صوما او صلوٰة او صدقة اوما اشبه ذلك مما هو طاعة وإن فعل كذا ففعل لزمه ذلك الذي جعله على نفسه اهـ . (عالمگيرية : ٦٥/٢)

زبان سے کہے بغیر نذر نہیں ہوتی:

انعقادِ نذر کے لیے زبان سے نذر کے الفاظ کہنا شرط ہے، صرف دل میں نیت کرنے سے نذر منعقد نہیں ہوتی۔

فی اعتكاف العلائية واجب بالنذر بلسانه ، وفي الشامية فلا يكفي لا يحابه النية منح عن شمس الائمة . ردالمحتار : ١٤١/٢ وفي صوم الشامية تحت (قوله ولو نذر الخ) قال في الملتقي والنذر عمل اللسان . (ردالمحتار : ١٣٤/٢)

باب اليمين

قسم کا بیان

قسم کسی بات کو پختہ کر کے بیان کرنے کے لیے کھائی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کی تعظیم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ناموں میں کسی نام کو لے کر قسم کھانے سے بات پختہ ہوتی ہے، مدِ مقابل کو بات پر یقین آ جاتا ہے لیکن بلا ضرورت بات بات پر قسم کھانا بری بات ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے نام کی

انتہائی بے حرمتی ہے اس لیے جہاں تک ہو سکے سچی بات پر بھی قسم نہ کھانا چاہیے۔

قال في المحيط الافضل في اليمين بالله تعالیٰ تقليلها لإن في تكثير اليمين المضافة إلى المستقبل تعريض اسم الله تعالیٰ للهتك.

(طحطاوي علی الدر: ٢/٣٢٤)

غیر اللہ کی قسم کھانا جائز نہیں:

اللہ کے سوا کسی اور کے نام کی قسم مثلاً باپ کی قسم، بچے کی قسم، اپنے پیاروں کی قسم وغیرہ اس سے قسم منعقد نہیں ہوتی لہٰذا اس طرح قسم کھا کر اس کے خلاف کرنے سے کفارہ لازم نہیں ہوگا۔

سمع رسول الله صلى الله عليه وسلم عمر رضي الله عنه وهو يحلف بابيه و كان في سفر. فقال له صلى الله عليه وسلم: إن الله عزوجل ينهاكم أن تحلفوا بابائكم، فمن كان حالفا فليحلف بالله أو ليصمت - اي ليسكت، قال عمر: فو الله ما حلفت بها منذ سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى عنها ذاكرا ولا اثرا.

(أخرجه مسلم رقم ١٦٤٦ والترمذي رقم ١٥٣٣)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے سنا کہ دورانِ سفر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے باپ کی قسم کھا رہے تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے آباء کی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، لہٰذا جس کو قسم کھانی ہو وہ اللہ کی قسم کھائے، یا خاموش رہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اللہ کی قسم جب سے غیر اللہ کی قسم کا ممنوع ہونا میں نے زبانِ نبوت سے سنا اس کے بعد کبھی غیر اللہ کی قسم نہیں کھائی، نہ قصداً نہ کسی سے حکایۃً۔

کارِ خیر پر قسم کا حکم:

اگر کسی کارِ خیر کو آیندہ مستقبل میں انجام دہی کے متعلق قسم کھائے تو اب اس کو پورا کرنا ہی مناسب ہے، اسی طرح کسی مباح کام کے متعلق قسم کھائے تب بھی اس کام کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ قسم کا لحاظ رہے۔

گناہ پر قسم کھانے کا حکم:

اگر کسی نے گناہ کرنے کی قسم کھائی مثلاً سینما دیکھے گا یا ماں باپ سے بات نہیں کرے گا یا نعوذ

باللہ نماز نہیں پڑھے گا تو اس پر واجب ہے کہ قسم توڑ کر کفارہ ادا کرے۔

لقوله صلى الله عليه وسلم : من حلف على يمين ، فرأى غيرها خيرا منها ، فليأت الذي هو خير وليكفر عن يمينه .

(الاختيار للموصلي : ٤٨/٤ والحديث أخرجه مسلم رقم ١٦٥٠)

جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی بات پر قسم کھائے پھر اس کے خلاف میں بہتری نظر آئے تو قسم توڑ دے پھر کفارہ ادا کرے۔

وفي التنوير ومن حلف على معصية كعدم الكلام مع ابويه او قتل فلان اليوم وجب الحنث والتكفير . (ردالمحتار : ٦٤/٣)

حرام چیز کو حرام کرنا بھی قسم ہے:

کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنا قسم ہے اسی طرح پہلے سے حرام چیز کو حرام کرنا بھی قسم ہے، جیسے شراب اور خنزیر وغیرہ اب اگر کوئی شخص یوں قسم کھائے کہ مجھ پر سینما دیکھنا حرام ہے، سینما دیکھنا تو پہلے سے حرام تھا اگر وہ اس قسم کے بعد دوبارہ سینما دیکھے تو سخت گناہ کے علاوہ قسم کا کفارہ بھی لازم ہوگا۔

قال في التنوير : ومن حرم شيئا ثم فعله كفر . وفي الشرح ولو حراماً ، او ملك غيره ، كقوله الخمر اومال فلان ، على حرام فيمن مالم يرد الاخبار ما فيه . (ردالمحتار : ٩١٤/٣)

وفيه ايضا : لما تقرر أن تحريم الحلال يمين .

(ردالمحتار : ٦٥/٣)

جھوٹی قسم کا حکم:

جو بات ہو چکی ہے اس پر جھوٹی قسم کھانا بڑا گناہ ہے جیسے کسی نے نماز نہیں پڑھی اور جب کسی نے پوچھا تو کہہ دیا کہ خدا قسم میں نماز پڑھ چکا ہوں، یا کھانا کھا چکا تھا جب کسی نے پوچھا تو کہہ دیا خدا کی قسم میں نے ایک لقمہ بھی نہیں چکھا۔ تو یہ بہت بڑا گناہ ہے اس کا کوئی کفارہ تو نہیں لیکن اس پر لازم ہے کہ خوب توبہ واستغفار کر کے اپنا گناہ اللہ تعالیٰ سے معاف کروائے۔

فالغموس هو الحلف على امر ماض يتعمد الكذب فيه فهذه

الیمین یاثم فیها صاحبها و لا کفارة فیها الا التوبة و الاستغفار .

(هداية : ٤٥٧/٢)

قسم کا کفارہ:

اگر کسی شخص نے قسم توڑ دی تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا دس فطرانہ کی مقدار گندم، چاول وغیرہ دے دے یا نقد رقم دے دے۔ یا دس مسکینوں کو جوڑا دیدے۔ نقد دینا چاہے تو دس فطرہ کی مقدار دینا ہوگا۔

کفارے کا روزہ:

اگر کسی کو اوپر کی تینوں باتوں میں سے کسی ایک پر بھی قدرت حاصل نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ تین دن مسلسل بلا ناغہ روزہ رکھے۔

فان لم يقدر على احد الاشياء الثلثة صام ثلاثة ايام متتابعات .

(هداية : ٤٦٠/٢)

علاج و معالجه کا بیان

بیماری کا علاج کرنا سنت ہے:

اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اس بیماری سے صحت یابی کے لیے علاج کرانے کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اگر علاج نہ کروائے اور بیماری کی وجہ سے انتقال ہو جائے تو گناہ گار ہوگا یا نہیں؟ تو سمجھ لیا جائے کہ علاج ایک ظاہری سبب ہے اور سنت عمل ہے تاہم اگر کوئی بیمار اپنا علاج نہ کرنے کی وجہ سے مر جائے تو گناہگار نہیں ہوگا۔

لما قال الإمام الفقيه ابو الليث السمرقندي : ولو مرض ولم يعالج حتى مات لم يأثم بخلاف الجائع إذا لم يأكل حتى مات بالجوع يأثم به . (فتاویٰ نوازل : صـ ٢٠٠ كتاب الكراهية)

علامہ سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بیمار ہوا اور علاج نہیں کروایا یہاں تک مر گیا تو علاج نہ کروانے کی وجہ سے گناہگار نہ ہوگا۔ بخلاف بھوکا شخص اگر اس کو کھانا میسر ہونے کے باوجود نہ کھائے یہاں تک بھوک کی وجہ سے مر جائے تو گناہگار ہوگا۔

قال العلامة ابن البزاز الكردري رحمه الله : امتنع عن الأكل حتى مات جوعاً اثم وان عن التداوي حتى تلف مرضاً لا لان عدم الهلاك بالأكل مقطوع والشفاء بالمعالجة مظنون .

(الفتاوىٰ البزازية على هامش الهندية : ٣٦٧/٦ نوع في التداوي ، كتاب الكراهية ومثله في الاختيار على تعليل المختار : ١٧٤/٤ كتاب الكراهية)

وفي الهندية قال : إما الاكل فعلى مراتب فرض وهو ما يندفع به الهلاك فان ترك الاكل والشرب حتى هلك فقد عصى ...... ولا يجوز الرياضة بتقليل الاكل حتى ضعف عن أداء الفرائض ...... ولو جاع ولم يأكل مع قدرته حتى مات يأثم .

(عالمگيريه : ١٠٢/٤ كتاب الكراهية)

حمل گرانے کا حکم:

ضبطِ تولید اور اسقاطِ حمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: ضبطِ تولید اور اسقاطِ حمل دونوں کی مجموعی طور پر چار صورتیں ہیں:

(۱) قطع نسل: یعنی کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس کی وجہ سے دائمی طور پر قوتِ تولید ختم ہو جائے۔

(۲) منع حمل: یعنی ایسی صورت اختیار کرنا کہ قوتِ تولید باقی رہتے ہوئے حمل قرار نہ پائے۔

(۳) حمل ٹھہر جانے کے بعد چار ماہ پورے ہونے سے پہلے کسی ذریعہ سے اس کو ساقط کرنا۔

(٤) چار ماہ گزرنے کے بعد حمل گرانا۔

احکام: پہلی صورت بالاتفاق حرام ہے، خواہ اس میں کتنے ہی فوائد نظر آئیں اور خواہ اس کے دواعی بظاہر کتنے ہی قوی ہوں۔

دوسری صورت کے حکم میں تفصیل یہ ہے کہ بلا عذر یہ صورت اختیار کرنا مکروہِ تنزیہی ہے اور درجِ ذیل اعذار کی صورت میں بلا کراہت جائز ہے۔

(۱) عورت اتنی کمزور ہے کہ بارِ حمل کا تحمل نہیں کر سکتی۔

(۲) عورت اپنے وطن سے دور کسی ایسے مقام میں ہے جہاں اس کا مستقل قیام وقرار کا ارادہ نہیں اور سفر کسی ایسے ذریعہ سے ہے کہ اس میں مہینوں لگ جاتے ہوں۔

(۳) زوجین کے باہمی تعلقات ہموار نہ ہونے کی وجہ سے علیحدگی کا قصد ہے۔

(٤) پہلے سے موجود بچے کی صحت خراب ہونے کا شدید خطرہ ہے۔

(٥) یہ خطرہ ہو کہ فسادِ زمان کی وجہ سے بچہ بد اخلاق اور والدین کی رسوائی کا سبب ہوگا۔

اگر کوئی ایسی غرض کے تحت حمل رو کے جو اسلامی اصول کے خلاف ہے تو اس کا عمل بالکل ناجائز ہوگا، مثلاً کثرتِ اولاد سے تنگی رزق کا خیال ہو یا یہ وہم ہو کہ بچی پیدا ہوگئی تو عار ہوگی۔

تیسری صورت بلاعذر ناجائز اور حرام ہے البتہ بعض اعذار کی وجہ سے اس کی گنجائش ہے، مثلاً:

(۱) حمل کی وجہ سے عورت کا دودھ خشک ہوگیا اور دوسرے ذرائع سے پہلے بچے کی پرورش کا انتظام ناممکن یا متعذر ہو۔

(۲) کوئی دیندار، حاذق طبیب عورت کا معاینہ کر کے یہ کہہ دے کہ اگر حمل باقی رہا تو عورت کی جان یا کوئی عضو ضائع ہونے کا شدید خطرہ ہے۔

چوتھی صورت مطلقاً حرام ہے، کسی بھی عذر سے اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

(احسن الفتاویٰ: ۳٤٧/۸)

قال الشامي رحمه الله: يجوز لها سد فم الرحم كما تفعله النساء مخالفا لما بحثه في البحر من انه ينبغي ان يكون حراما بغير اذن الزوج قياسا على عزله بغير اذنها لكن في البزازيه ان له منع امراته عن العزل الخ نعم النظر إلى فساد الزمان يقيد الجواز من الجانبين فما في البحر مبني على ما هو اصل المذهب وما في النهر على ما قاله المشائخ. (شاميه مصرى، باب نكاح الرقيق: ۳۹/۲)

اولاد کی کثرت نعمتِ الٰہیہ ہے:

بعض لوگ شادی کے بعد اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ اولاد کم سے کم ہو بعض لوگ تو اس لیے

اولاد سے بیزار رہتے ہیں کہ اولاد ان کی عیاشی میں مخل نہ ہو اور بعض کا یہ خیال ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ اولاد پیدا ہونے کے بعد خرچہ کا بندوبست کیسے ہوگا؟ بعض لوگ غیر مسلموں کے اس پرفریب نعرے میں آجاتے ہیں کہ "بچے دو ہی اچھے" حالانکہ یہ سب باتیں شریعتِ مطہرہ کے خلاف ہیں، اس کے برخلاف جناب نبی کریم ﷺ نے اولاد کی کثرت کو اللہ تعالیٰ کی نعمت بتایا ہے۔

کقوله عليه السلام: تزوجوا الودود الولود، فإني مكاثر بكم الامم. (مشكوٰة: ۲/۲۷٦)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسی عورتوں سے شادی کرو جو زیادہ محبت کرنے والی ہو اور زیادہ بچے جننے والی ہو، کیونکہ میں (قیامت کے روز) اپنی امت کی کثرت کے ذریعہ اور امتوں پر فخر کروں گا۔

لہٰذا اولاد کو عذابِ الٰہی سمجھنے یا تنگی رزق کا ذریعہ سمجھنے یا کسی عار وغیرہ کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے نعمتِ الٰہیہ سمجھتے ہوئے اس کی پیدائش کے اسباب بند نہ کیا جائے بلکہ فطری طریقہ پر جتنی اولاد ہو جائے اللہ کا شکر بجالائیں۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم:

شریعتِ اسلامیہ نے انسان کی طبعی اور فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نکاح کا پاکیزہ اصول رکھا ہے، اسی طرح حصولِ اولاد کی فطری خواہش کی تکمیل کے لیے ازدواجی قانون کا نظام رکھ دیا ہے۔ انہیں اصولوں کو بروئے کار لانے کے لیے غیر منکوحہ اور غیر مملوکہ عورتوں سے زنا اور جنسی ملاپ خواہ ظاہرا یا خفیۃً رضا و رغبت سے ہو یا جبر و اکراہ سے، اجرت کے ساتھ ہو یا بغیر اجرت حرام قرار دیا ہے اور اس کے لیے سخت سے سخت ترین سزا سو سو کوڑے یا رجم کی سزا رکھی ہیں اور آخرت میں عذابِ جہنم کی وعید بھی ہے۔ اسی طرح لواطت اور اغلام بازی کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے، دنیا میں اس کے لیے زنا کی طرح کوڑے، قتل، سنگساری، پہاڑ کے اوپر سے گرا کر ہلاک کر دینے کی سزائیں رکھی ہیں، جہنم کے عذاب کی وعید الگ ہے۔

نیز یہ کہ ہر قسم کی بے حیائی اور عریانی و بے پردگی کو ممنوع اور حرام قرار دیا ہے، مقصد ان سارے احکام سے یہ ہے کہ انسان کی طبعی اور فطری ضرورت پوری کرنے کے لیے پاکیزہ معاشرہ میسر ہو اور اس کی ازلی شرافت اور پیدائشی کرامت بحال رہے۔ اصولِ شریعت کے مطابق توالد د

تناسل کا سلسلہ بھی یوں ہی چلتا رہے، لیکن انسان اگر مذکورہ اصولِ شریعت اور حدودِ الٰہیہ کی پابندی نہیں کرتا اور جانوروں کی طرح آزادانہ طور پر ہر عورت سے جب چاہے جس طرح چاہے جنسی ملاپ قائم کرتا ہے اور طبعی اور فطری خواہش کو پورا کرنا چاہتا ہے یا حصولِ اولاد کے مقررہ اصول سے ہٹ کر اپنی مرضی سے کوئی طریقہ اختیار کرتا ہے تو یہ اپنے خالق کائنات کے قانون سے کھلی بغاوت کرتا ہے اور محسن انسانیت آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کی صریح خلاف ورزی کرتا ہے۔ یہ شخص صراطِ مستقیم سے نکل کر گمراہی اور شیطان کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ جنت کے راستہ کو چھوڑ کر جہنم کا راستہ اختیار کرتا ہے جو کہ انسان کے لیے ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو دین وشریعت کا فہم عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی اصولی طور پر دو صورتیں بنتی ہیں یا تو مرد کے مادۂ منویہ لے کر اسی مرد کی بیوی کے رحم میں غیر فطری طور پر پہنچایا جائے گا یا غیر مرد کا مادۂ منویہ کسی عورت کے رحم میں پہنچایا جائے گا دونوں کا حکم الگ الگ لکھا جاتا ہے:

۱۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی پیدائش غیر فطری طریقہ ہے جس میں مرد کے مادۂ منویہ اور اس کے جرثومے حاصل کر کے دوسری غیر منکوحہ عورت کے رحم میں غیر فطری طریقے سے ڈالے جاتے ہیں اور یہ جرثومے مدتِ حمل تک اس اجنبی عورت کے رحم میں پرورش پاتے ہیں اور مدتِ حمل پوری ہو جانے کے بعد جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو عورت کو مدتِ حمل کی بار برداری اور تکلیف اٹھانے کی معقول اجرت دے کر مرد بچہ لے لیتا ہے، اس طرح کی خواہش پوری کی جاتی ہے اور یہ از روئے شرع ناجائز وحرام ہے کیونکہ قرآن وحدیث میں حصولِ اولاد کے لیے دو ہی اصول مقرر کر دیے ہیں کہ انسان اپنی منکوحہ بیوی سے فطری طریقہ سے جماع کرے اور ارادۂ اولاد کی پیدائش کا کرے۔

﴿ فالان باشروهن وابتغوا ما كتب الله لكم ﴾ (البقرة: ۱۸۷)

''اور تم اپنی منکوحہ بیویوں سے جماع کرو اور ارادۂ اولاد کا کرو جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے لکھ رکھا ہے۔''

فطری طریقے سے تحصیل اولاد، اس سے کئی فائدہ ہیں ایک تو مرد اور بیوی دونوں کی فطری

شہوت پوری ہو جائے گی ، دونوں کی شرمگاہیں کسی غلط راستے میں مستعمل ہونے سے محفوظ ہو جائیں گی اور دونوں کی نگاہیں بھی اجنبی مرد اور عورت سے پاک رہیں گی۔ اس لیے کہ فطرت کا تقاضہ ہے کہ مرد اور عورت فطرت کے طریقے سے خواہش پوری کریں، جب مرد غیر فطری طریقہ سے مادۂ منویہ نکالے گا تو عورت کی فطری خواہش باقی رہے گی تو وہ ضرور کسی غیر مرد سے اور غیر شرعی طریقے سے خواہش پوری کرنے کی کوشش کرے گی، یہ بہت بڑا دینی اور شرعی نقصان ہے اور اخلاقی ضرر ہے، دیگر یہ کہ مذکورہ بالا طریقۂ پیدائش میں یہ خرابیاں بھی ہیں:

(۱) اولاد کے خواہش مند مرد نے جس اجنبی عورت کے رحم میں اپنا مادۂ منویہ کو ڈالا ہے وہ عورت اس کا منکوحہ یا مملوکہ نہیں ہے جب کہ قرآن وحدیث کی رو سے منکوحہ یا مملوکہ عورت کے سوا کسی بھی عورت کے رحم میں انسان اپنا مادۂ منویہ داخل نہیں کر سکتا خواہ فطری طریقہ پر ہو یا غیر فطری طریقہ پر یہ ایسا ہے کہ انسان اپنی بیوی (کھیت کی زمین) چھوڑ کر دوسری عورت (غیر مملوکہ زمین) میں کھیتی کرنے کی خواہش سے ہل چلاتا ہو یا بغیر ہل چلائے بیج ڈالتا ہو جس طرح غیر مملوکہ زمین میں کھیت وزراعت کے واسطے بیج ڈالنا جائز نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے غیرتی کی بات ہے، اس طرح غیر منکوحہ یا دوسرے کی منکوحہ عورت کے رحم میں مادۂ منویہ (جو کہ نسل انسانی کا بیج ہے) کا ڈالنا جائز نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ بے غیرتی اور ذلت کی بات ہے۔

پھر یہ کہ نسل انسانی کی پیدائش کے واسطے شریعت نے عورت کے رحم کو کرائے یا آجرت پر دینے یا لینے کا کوئی طریقہ نہیں رکھا۔ نہ ہی کسی عورت کو عاریت پر لینے یا دینے کی اجازت دی ہے بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ اولاد کی خواہش پوری کرنے کے لیے شرعی اصول کے مطابق کسی بے شوہر عورت سے نکاح کرلو، بلکہ حدیث میں ہے کہ زیادہ اولاد جننے والی عورت سے نکاح کرو، پھر اس سے فطری طریقہ سے مباشرت کرو اور فطری راستے سے نسل انسانی کا مادۂ منویہ عورت کے رحم میں پہنچاؤ اور مباشرت کرتے وقت دل میں اولاد کا ارادہ بھی کرو، اس ہدایت پر عمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اگر چاہا تو اولاد کی خواہش پوری فرمادے گا اور اولادِ صالح پیدا ہوگی۔

غرض یہ کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے مذکورہ طریقہ سے اجنبی عورت کے رحم میں کسی اجنبی مرد کا مادۂ منویہ اور جرثومے داخل کرنا اولاد حاصل کرنے کی سعی کرنا قرآن وحدیث کی رو سے جائز نہیں۔ اس سے قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص کی خلاف ورزی اور شریعت کے بے شمار اصولوں

سے انحراف اور اللہ و رسول اللہ ﷺ کے قانون سے بغاوت لازم آتی ہے، اس کے علاوہ بے شمار معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

مثلاً: (الف) جس اجنبی عورت کے رحم میں مرد کا مادۂ منویہ بذریعہ انجکشن یا پچکاری داخل کیا جائے گا خود مرد داخل کرے گا یا ڈاکٹر، تو ان کے سامنے بے حیائی کا مظاہرہ ہوگا، حفاظتِ شرمگاہ اور حفاظتِ نگاہ کی پابندی ختم ہو جائے گی، غیرت اور حمیت باقی نہیں رہے گی۔

(ب) پھر پاکیزہ عورت اور اس کی شرمگاہ بکاؤ اور کرائے کا مال بن جائے گی جب اس کو ضرورت ہوگی اپنے عضوِ مخصوص کو ذریعہ معاش بنائے گی یہ سلسلہ انسانی معاشرے میں بہت بڑے فساد کا ذریعہ ہوگا۔

(ج) پھر جب اولاد پیدا ہوگی اس کی نسل اور نسب قرآن و حدیث کے لحاظ سے اس مرد سے ثابت نہ ہوگا جس کا مادۂ منویہ عورت کے رحم میں ڈالا گیا ہے کیونکہ شریعت کے اصول میں ثبوتِ نسب کے لیے عورت کا منکوحہ یا مملوکہ ہونا ضروری ہے اور یہ اجنبی عورت اولاد کے خواہشمند مرد کی منکوحہ یا مملوکہ نہیں ہے بلکہ یہ اجنبی عورت اگر کسی مرد کی منکوحہ ہے تو بچہ کا نسب اس عورت کے شوہر سے ثابت ہو جائے گا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الولد للفراش وللعاهر الحجر. (مشکوٰۃ شریف: صـ ۲۸۸)

یعنی اولاد کی نسبت عورت کے شوہر کی طرف ہوگی اور زنا کرنے والوں کے لیے سنگسار کرنے کی سزا ہوگی۔

جس کا مطلب یہ ہوا جس کا فراش (بیوی) ہے بچہ اس کا ہوگا اور جس اجنبی مرد نے اجنبی عورت کے رحم میں اپنے مادۂ منویہ کو داخل کیا ہے اگر فطری طریقہ سے وطی کر کے داخل کیا ہے تو یہ عین زنا ہے اور غیر فطری طریقہ سے داخل کیا ہے تو یہ اگرچہ عین زنا تو نہیں ہے لیکن حکم زنا میں ہے۔ اس لیے کہ کسی مرد کو اپنی منکوحہ یا مملوکہ عورت کے سوا دوسری عورت کے رحم میں مادۂ منویہ داخل کرنے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات میں حدیث کے حوالہ سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے فرمایا کسی مرد کے لیے حلال نہیں ہے کہ اپنی منکوحہ یا مملوکہ عورت کے سوا کسی عورت کے رحم میں پانی ڈالے (یعنی مادۂ منویہ داخل کرے) اس لیے کہ اس سے جو بچہ ہوگا وہ منی کے جرثومے داخل کرنے والے کا نہ ہوگا بلکہ جس کی عورت ہے اسی مرد سے نسب ثابت ہوگا۔

لیکن وہ دوسری عورت اگر بے شوہر عورت ہے پھر بھی اجنبی مرد جس کے جرثومے سے بچہ پیدا ہوا ہے اس سے نسب ثابت نہ ہوگا بلکہ عورت ہی سے بچہ کا نسب ثابت ہوگا یعنی بچہ کی نسبت عورت کی طرف کی جائے گی اور اجنبی مرد کی منی کا داخل کرنا چونکہ زنا کے حکم میں ہے، اس لیے زنا سے نسب کا ثبوت نہیں ہوگا، اس کی قانونی حیثیت ولد الزنا کی ہوگی۔

نیز چونکہ شرعاً کسی عورت کے رحم یا شرمگاہ کو عاریت یا اجارہ پر لینے کا کوئی جواز یا اس کا تصور اسلام میں نہیں ہے جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے حوالہ سے گزر چکا ہے، اس لیے کسی بھی صورت میں اولاد کے خواہش مند مرد کے جرثومے سے ہونے والے بچہ کا نسب اس مرد سے ثابت نہ ہوگا جب کہ مرد کے جرثومے اجنبی عورت کے رحم میں داخل کیے گئے ہوں۔

کتبِ فقہ میں تصریح ہے:

ویںسب ولد الزنا و اللعان بجهة الأم مما قدمنا انه لا اب له .

(ردالمحتار: ٥/ ٧٠٠)

کہ ولد الزنا اور ولد اللعان کو ماں کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ اس وجہ سے کہ ہم نے اس سے قبل لکھا ہے کہ ان کا باپ نہیں ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ زانی زنا کر کے جو جرثومے مزنیہ کے رحم میں داخل کرتا ہے گویا غیر اصولی اور غیر قانونی طور پر داخل کرنے کی وجہ سے شریعت نے زانی کے جرثومے کی کوئی حیثیت نہیں دی، اسے بے قیمت اور کالعدم قرار دیا ہے۔ اسی لیے نسب زانی سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ بچہ کی نسبت شرعاً ماں کی طرف ہوگی۔

اسی طرح لعان کے بعد کہ شوہر نے بیوی پر زنا کا دعویٰ کیا کوئی گواہ نہیں ہے اور دعویٰ پر اس نے شرعی طریقہ سے عدالت میں قسم کھا کر کہا کہ اس کی بیوی نے زنا کیا ہے، ہونے والا بچہ یا حمل اس کا نہیں ہے تو اس صورت میں لعان کے بعد ہونے والا بچہ کو ولد اللعان کہا جائے گا، اس کی نسبت ماں کی طرف ہوگی نہ کہ باپ کی طرف، اس کو وراثت ماں سے ملے گی۔ اجنبی مرد جس کے جرثومے تھے اس سے کوئی وراثت نہیں ملے گی، اس طرح صورتِ مسئولہ میں بچہ کی نسبت بے شوہر عورت کی طرف ہوگی، اس اجنبی مرد کی طرف نہ ہوگی جس کے جرثومے عورت کے رحم میں داخل کیے گئے ہیں، اس طرح یہ بچہ معاشرہ میں معیوب اور مطعون بن کر رہے گا۔ اس کو دیکھتے ہی

لوگوں کے ذہنوں میں غلط حرکتوں فحاشی پر مبنی جملہ افعال منتقل ہو جائیں گے جو کہ فسادِ معاشرہ کا ایک حصہ ہے۔

(ہ) اور اس طریقۂ ولادت سے یہ بھی نقصان ہوگا کہ مرد نے ایک صحیح النسب بچہ کی جگہ ایک ولد الزنا کو جنم دیا ہے گویا اس نے اپنی منی کے جرثوموں کو ضائع کیا ہے جن سے ولد الزنا پیدا ہوا ہے جب کہ ان جرثوموں کو اگر وہ منکوحہ عورت کے رحم میں داخل کرتا تو صحیح النسب بچہ پیدا ہوتا، اس سے صالح معاشرہ پیدا ہوتا، دنیا میں بھی عزت و شرافت والا نسب نصیب ہوتا، آخرت میں سرخروی حاصل ہوتی جب کہ ولد الزنا کی خود دنیا میں رسوائی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی جب کہ اسے باپ کی ولدیت کی جگہ ماں کے نام سے پکارا جائے گا رسوائی ہوگی، زانی کی رسوائی تو ہے ہی۔

(و) اس جرثومے سے ہونے والے بچہ کی نسبت چونکہ ماں کی طرف ہوگی اس لیے جملہ اخراجات نان ونفقہ وغیرہ بھی ماں کے ذمہ واجب ہوں گے، نہ کہ اس مرد پر جس کے جرثومے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ مرد اسے قبول کرے اور اس کی ذمہ داری اٹھائے، لیکن جب شرعاً اس پر لازم نہیں ہے تو یہ بہت ممکن ہے کہ جب مرد یہ دیکھے گا کہ بچہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں یا ناقص ہے تو اس کو لینے سے انکار کر دے گا جب کہ قانونِ شرع اسے مجبور نہیں کرتا، تو اس سے بلا وجہ عورت پر ایک بوجھ ڈالنے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کیونکہ بچہ کا رشتہ ماں سے ہوگا اور اس کے سارے اخراجات کا بوجھ بھی اس پر ہوگا۔

(ز) نیز ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اولاد پیدا کرنے کا گناہ اجنبی مرد اور عورت دونوں پر ہوگا۔ دونوں شرع اور قانونِ فطرت سے بغاوت کے مرتکب ٹھہریں گے لیکن چونکہ اس میں حقیقی زنا کی صورت (مرد کا آلہ تناسل غیر منکوحہ کی شرمگاہ میں داخل کرنے کی صورت) نہیں پائی جاتی، اس لیے زنا کی حد، تو ان پر جاری نہ ہوگی، البتہ اسلامی حکومت ان پر تعزیری سزا عائد کر سکتی ہے اور آخرت کی سزا الگ ہوگی۔

۲۔ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ اولاد پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ جس میں مرد اور عورت دونوں میاں بیوی ہوں مگر فطری طریقہ سے ہٹ کر غیر فطری طریقہ سے مرد کے جرثومے اور عورت کے جرثومے کو نکالنے کے بعد خاص ترکیب سے بیوی کے رحم میں داخل کرتے ہیں۔ اس کا حکم پہلے

سے مختلف ہوگا، پہلی بات تو یہ ہے کہ شوہر کا مادۂ منویہ عورت کے رحم میں داخل کیا گیا جو کہ نا جائز نہیں ہے، اس طرح اس سے حمل ٹھہرا تو ثابت النسب ہوگا اور اس میں کوئی تعزیری حکم نہیں ہوگا، اس وجہ سے کہ زنا کے حکم میں نہیں ہے اور اس میں گناہ بھی نہیں ہوگا، جب کہ دونوں کے جرثومے نکالنے اور داخل کرنے میں کسی اجنبی مرد اور عورت کا عمل دخل نہ ہو، بلکہ سارا کام بیوی اور شوہر خود ہی انجام دیں لیکن شوہر اور بیوی کے جرثومے کو غیر فطری طریقہ سے نکالنے اور عورت کے رحم میں داخل کرنے میں اگر تیسرے مرد یا عورت کا عمل دخل ہوتا ہے اور اجنبی مرد یا عورت کے سامنے شرمگاہ دیکھنے یا دکھانے اور مس کرنے یا کرانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس طرح بے حیائی اور بے پردگی کے ساتھ بچہ پیدا کرنے کی خواہش پوری کرنے کی اجازت شرعاً نہ ہوگی، کیونکہ بچہ پیدا کرنا کوئی فرض یا واجب امر نہیں ہے، نہ ہی بچہ پیدا نہ ہونے سے انسان کو جان یا کسی عضو کی ہلاکت کا خطرہ ہوتا ہے تو گویا کہ کوئی شرعی ضرورت و اضطراری کیفیت نہیں پائی جاتی جس سے بدن کے مستور حصے خصوصاً شرمگاہ کو اجنبی مرد یا عورت ڈاکٹر کے سامنے کھولنے کی اجازت دے۔

لہٰذا ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے دوسرے طریقہ کو اگر کسی اجنبی مرد یا اجنبی عورت ڈاکٹر کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے تو جائز نہیں ہے یعنی گناہِ کبیرہ کا ارتکاب ہوگا، تاہم بچہ کا نسب شوہر سے ثابت ہوگا، اس کو باپ سے وراثت ملے گی۔ صحیح اولاد کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔

یہاں اور چند مزید ممکنہ صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جن کی طرف توجہ نہیں دی گئی، لہٰذا فائدے کے طور پر ان صورتوں کا حکم بھی اجمالاً بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعہ اولاد حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

(الف) کہ کوئی شخص نکاح کیے بغیر اولاد حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ کسی عورت کو اولاد حاصل کرنے کے لیے کرائے پر لے اور اس سے فطری طریقہ سے زنا کرے یا غیر فطری طریقہ سے ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے نظام سے اپنے جرثومے کو اس کے رحم میں داخل کر کے اولاد حاصل کرنے کی کوشش کرے، اس کا حکم بھی زنا کا ہے اور اس سے ہونے والا بچہ بھی ولد الزنا ہے۔

(ب) چوتھا طریقہ یہ ہے کہ اولاد حاصل کرنے کی سعی کرنے والا مرد نہ ہو بلکہ وہ عورت ہو کہ وہ بلا نکاح کسی مرد کو کرائے پر لے کر اس سے فطری طریقہ سے زنا کر کے بچہ پیدا کرے یا کسی اجنبی مرد کے مادۂ منویہ کو غیر فطری طریقے سے اپنے رحم میں داخل کر کے بچہ پیدا کرے۔ یہ بھی زنا

کے حکم میں ہے، اس میں بچہ تو عورت کو مل جائے گا لیکن اس کو ولد الزنا کہا جائے گا۔ اس طرح بچہ حاصل کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا۔

(ج) پانچواں طریقہ یہ ہے کہ اولاد حاصل کرنے کے خواہش مند میاں بیوی ہوں لیکن ان کے جرثومے ناقص یا اولاد پیدا کرنے والے نہ ہونے کی بناء پر کسی ایسے اجنبی مرد کے جرثومے کو ملا کر بیوی کے رحم میں داخل کردیں جس کے جرثومے میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت ہو یا میاں بیوی دونوں کے جرثومے کسی اجنبی عورت کے رحم میں داخل کردیں۔ ان صورتوں میں خلط نسب کے شبہات پیدا ہوتے ہیں، تاہم جس عورت کے بطن اور حمل سے بچہ پیدا ہوگا۔ بچہ کی نسبت اس کی طرف ہوگی اور وہ اگر شوہر والی عورت ہے تو اس کے شوہر سے بچہ کا نسب ہوگا، خواہش مند عورت سے نہ ہوگا اور اگر عورت بے شوہر ہے تو صرف اسی عورت سے نسب ثابت ہوگا، جس کے بطن میں حمل ٹھہرا اور جس عورت کو اولاد کی خواہش تھی اور اس کے جرثومے بھی ملائے گئے ہوں اس سے نسب کا ثبوت نہ ہوگا۔

بہر حال اس میں مزید صورتیں پیدا ہوسکتی ہیں لیکن ہم نے جو اصول بیان کردیے ہیں اور جس تفصیل سے اصول اور مسائل کو دلائل سے ذکر کیا ہے اس سے مزید پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی انشاء اللہ ملے گا، ایک ادنیٰ درجہ کی عقل رکھنے والے بصیرت وعلم کے لیے اتنا کافی ہے۔

مشورہ:

واضح رہے کہ جس مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوتِ مردانیت کی صفت سے نوازا ہے، اگر اس کی بیوی کے اندر کسی کمی کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی تو وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی کر کے اولاد کی خواہش پوری کرسکتا ہے، اس طرح مرد اور عورت دونوں اولاد سے مالا مال ہوسکتے ہیں۔ کسی غیر شرعی فعل کا ارتکاب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی اور اگر مرد کے اندر مردانیت نہیں ہے یا کوئی خامی ہے اور عورت کا حال درست ہے تو ایسے موقع پر مرد کو چاہیے کہ ممکنہ علاج کر کے اپنے قوتِ مردانیت کو بحال کرنے کی کوشش کرے اور اگر علاج بالکل مفید نہیں ہے، تو ایسے حالات میں عورت کے فطری جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے اسے طلاق دیدے اور اس کے فطری جذبات کو قربان نہ کرے، ایسے موقع پر طلاق نہ دینا گناہ ہے۔ یہ چند کلمات لکھ دیے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے اور لوگوں کے لیے نافع اور سببِ موعظت بناوے۔

وأخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وآله واصحابه اجمعين .

(ماخوذ و ملخص از جواهر الفتاویٰ : ۲۱۸/۱)

بدن پر داغ دے کر مرض کا علاج کرنا:

ایک طریقہ علاج کا بالکئی بھی ہے، آنحضرت ﷺ سے اونٹوں کو داغ دینا ثابت ہے، انسانوں کے متعلق کیا حکم ہوگا اس بارے میں احادیث قولیہ مختلف ہیں۔ بعض میں داغ دینے کی ممانعت وارد ہے اور بعض میں جواز اور فعلی حدیث میں صحیح یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خود کبھی ایسا علاج نہیں کیا۔ (کما صرح بہ الحافظ فی الفتح الباری)

اور توفیق بین الروایات یہ ہے کہ نہی تنزیہ پر محمول ہے اور جواز اپنی اصل پر۔

كما ذكره الإمام القسطلاني في المواهب ولفظه حاصل الجمع ان الفعل يدل على الجواز وعدم الفعل لا يدل على المنع بل يدل على ان تركه ارجح من فعله ولذا وقع الثناء على تاركه واما النهي عنه فاما على سبيل الاختيار والتنزيه واما فيما لا يتعين طريقاً إلى الشفاء مواهب لدينه . (۱٦٦/۲)

اس لیے فقہاء حنفیہ نے اس بارے میں یہ اختیار فرمایا ہے کہ یہ علاج فی نفسہ جائز ہے مگر بلا ضرورتِ شدیدہ خلافِ اولیٰ ہے اور چہرہ پر اس کا عمل کرنا مکروہ ہے۔

قال في العالمگيرية (٢٣٦/٤) كشوري - في الباب الثامن عشر من الكراهية ما نصه ولا باس بكي الصبيان إذا كان لداء اصابهم وكذا لا باس بكي البهائم للعلامة كذا في المحيط للسرخسي ويكره الكي في الوجه كذا في الفتاوىٰ العتابية - انتهى .

(ماخوذ از إمداد المفتين)

حکیم کی اجرت کا حکم:

جو حکیم اپنے مریضوں سے فیس لے کر علاج کرتے ہیں شرعاً اس طرح فیس لے کر علاج کرنا جائز ہے کیونکہ یہ حکیم کی اجرت جانے اور تشخیص مرض اور تجویز نسخے کی ہے اس میں کسی قسم کی

کراہت نہیں ہے بلا شبہ جائز ہے بشرطیکہ حکیم حکیم ہو۔ یعنی کسی حاذق طبیب نے اس کو علاج کرنے کی اجازت دی ہو ورنہ علاج کا پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں۔

اسی طرح بہت سے لوگ با قاعدہ ڈاکٹری پڑھنے کی بجائے معمولی انگریزی پڑھ کر علاج کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں اس سے بہت سے مریضوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے بلکہ بعض لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ شرعاً یہ جائز نہیں۔ نیز اس میں حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کا بھی گناہ ہے۔ اس لیے قانون کے مطابق امتحان دے کر سند حاصل کی جائے اس کے بعد یہ پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: بل يمنع مفت ما جن يعلم الحيل الباطلة كتعليم الردة لتبين من زوجها او لتسقط عنها الزكاة وطبيب جاهل.

علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ایسے جاہل مفتی کو فتویٰ دینے سے روکا جائے گا جو لوگوں کو باطل حیلہ سکھاتا ہے جیسے عورت کو شوہر سے جدائی کے لیے مرتد ہونے کا مشورہ دینا یا زکاۃ ساقط کرنے کا حیلہ سکھانا، اسی طرح جاہل طبیب پر علاج کے سلسلہ میں پابندی عائد کی جائے گی۔

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: (قوله طبيب جاهل) بأن يسقيهم دواء مهلكا وإذا قوي عليهم لا يقدر على إزالة ضرره زيلعي. (ردالمحتار: ٥/٩٣)

تعویذ کا حکم:

بعض لوگ قرآن مجید کی آیات کریمہ کو کاغذ میں لکھ کر مریضوں کو یا ضرورت مندوں کو دیتے ہیں جیسے وہ گلے بازو پر باندھتے ہیں، اس سے انہیں کافی رقم ملتی ہے۔ الغرض یہ عمل ایک کاروباری صورت اختیار کر گیا ہے۔ اب شریعت مطہرہ کی رو سے تعویذ کا کیا حکم ہے؟ اس پر اجرت لینے کا کیا حکم ہے اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں:

احادیث صحیحہ صریحہ کثیرہ سے رقیہ (دَم) کا ثبوت بے غبار ہے، یعنی بکثرت روایات سے ثابت ہے باقی تمیمہ (تعویذ) کی مندرجہ ذیل صورتیں ناجائز ہیں:

۱۔ ٹوٹکا جو پیتل، تانبے یا لوہے وغیرہ کے ٹکڑے کو باندھ کر کیا جاتا ہے۔

۲۔ تعویذ کو مؤثر بالذات سمجھا جائے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تھا اور اب بھی بعض جہال یوں ہی سمجھتے ہیں۔

یہ صورتیں بلاشبہ ناجائز اور حرام وشرک ہیں۔

تمیمہ میں اسماء اللہ تعالیٰ، آیات قرآنیہ اور ادعیہ ماثورہ ہوں تو یہ جائز اور ثابت ہے، اس کو ناجائز کہنا جہالت ہے کیونکہ اس قسم کے تعویذ میں مؤثر بالذات صرف اللہ تعالیٰ کو سمجھا جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ جواز تمیمہ کے لیے تین شرائط ہیں:

(۱) لغت مفہومہ ہو۔

(۲) الفاظ ماثور و منقول ہوں۔

(۳) اس کے نافع بالذات ہونے کا اعتقاد نہ ہو۔

وكان عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما يعلمهن من عقل من بنيه ومن لم يعقل كتبه فاعقله عليه. (أبو داؤد: ۹۷/۲)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے سمجھدار بچوں کو معوذات سکھاتے تھے اور جو غیر سمجھدار تھے لکھ کر ان کے گلے میں لٹکاتے تھے۔

(٤) کسی غیر شرعی مقصد کے لیے نہ ہو جیسا کہ دو مسلمانوں کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا کرنے کے لیے یا کسی اجنبی مرد یا عورت کے ساتھ ناجائز تعلق کے لیے تعویذ کیا جائے۔

باقی تعویذ لٹکانے کا عمل اگرچہ خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن اس سے یہ ثابت کرنا کہ یہ عمل ناجائز ہے صحیح نہیں، روایتِ مذکورہ بالا میں ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا عمل نقل کیا گیا ہے جو اس عمل کے جواز کے لیے کافی ہے، ہر عمل شرعی کا روایتِ متواترہ سے ثابت ہونا ضروری نہیں۔

اس عمل پر اجرت لینا فی نفسہ جائز تو ہے جیسا کہ روایت میں اس کی تصریح ہے۔ تفصیل کتاب الاجارہ میں گزر چکی ہے، لیکن اسے مستقل طور پر پیشہ بنا کر اختیار کرنا دین داروں کے لیے مناسب نہیں۔

کیونکہ آج کل اکثر عوام بے شمار گناہوں میں مبتلا ہیں، پھر وہ ایسی چیزوں کو سہارا بنا کر اور زیادہ دین سے دور ہو جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑنے کی ضرورت نہیں، اس کے بغیر

بھی اللہ تعالیٰ ہمارے کام کر دیتے ہیں تو اس سے ان کے دین کا نقصان ہوگا۔

اس عمل سے فائدہ ہونا یقینی نہیں، کبھی فائدہ ہو جاتا ہے اور کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بالکل ڈاکٹر کی دوا کی طرح ہے کہ اس سے کبھی کسی مریض کو فائدہ ہو جاتا ہے اور کبھی فائدہ کی بجائے الٹا نقصان بھی ہوتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں پر اجتماعی طور پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، یہ دین پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے آیا ہے۔

لقوله تعالىٰ : وماأصابكم من مصيبة فبما كسبت ايدكم،

یعنی انسان جن آفات ومصائب کا شکار ہوتے ہیں وہ ان کے بداعمالیوں کا نتیجہ ہیں،

اگر آج بھی سارے مسلمان اللہ تعالیٰ کے دین کو مضبوطی سے تھام لیں گناہوں سے اجتناب کرنے کی مکمل کوشش کریں تو ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی وہی مدد آسکتی ہے جو کہ قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی تھی۔

﴿ وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين ﴾

یعنی تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان پر قائم رہے۔

تداوی بالمحرمات:

یعنی کسی حرام چیز کو بطورِ دوا استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر حالتِ اضطرار کی ہو، یعنی وہ محرم استعمال کیے بغیر جان کا بچنا مشکل ہو تو بقدرِ ضرورت تداوی بالمحرم بالاتفاق جائز ہے، لیکن اگر جان کا خطرہ نہ ہو بلکہ مرض کو دور کرنے کے لیے تداوی بالمحرم کی ضرورت ہو تو اس میں ائمہ کا اختلاف ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں بھی تداوی بالمحرم مطلقاً جائز ہے، جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس صورت میں تداوی بالمحرم مطلقاً ناجائز ہے، امام بیہقی رحمہ اللہ کے نزدیک تمام مسکرات سے تداوی ناجائز ہے، جبکہ باقی محرمات سے جائز ہے، حنفیہ میں سے امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ بھی امام شافعی رحمہ اللہ کی طرح مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں، جبکہ امام طحاوی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ خمر کے علاوہ باقی تمام محرمات سے تداوی جائز ہے، حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی طبیبِ حاذق یہ فیصلہ کرے کہ تداوی بالمحرم کے بغیر بیماری سے چھٹکارا ممکن نہیں ہے، تو

اس صورت میں تداوی بالمحرم جائز ہوگا۔

حضرت مولانا ظفر عثانی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تداوی بالمحرم اس وقت جائز ہے، جبکہ کوئی طبیب مسلم حاذق یا مسلمان ڈاکٹر حاذق یہ کہہ دے کہ اس مرض کے لیے صرف ایک دوا ہے اس کے قائم مقام کوئی دوا نہیں، اگر اس کے قائم مقام کوئی دوا ہو مگر اس سے شفاء دیر میں ہوگی اور حرام میں جلدی ہوگی تو اس میں دو قول ہیں:

قال في الهندية : وإن مريضاً اشار إليه الطبيب بشرب الخمر روي عن جماعة من آئمة بلخ أنه ينظران كان يعلم يقيناً أنه يصح حل له التناول اهـ يجوز لعليل شرب البول والدم واكل الميتة للتداوي إذا اخبره طبيب مسلم ان شفاءهٗ فيه ولم يجد من المباح ما يقوم مقامهٗ وإن قال الطبيب يتعجل شفاءك فيه وجهان هل يجوز شرب القليل من الخمر للتداوي إذا لم يجد شيئا يقوم مقامه فيه وجهان . اهـ .

(٢٣٦/٦)

پس جن دواؤں میں برانڈی یا شحم خنزیر کا ہونا معلوم ہو ان کا استعمال بدونِ شرط مذکور کے جائز نہیں اور ﴿والا ما اضطررتم اليه﴾ میں اس کو داخل کرنا عجیب فہم ہے۔

اضطرار اسباب یقینہ میں ہوا کرتا ہے اور تداوی وعلاج اسباب مظنونہ میں سے ہے۔

فلا اضطرار فيه اصلاً حتى لو ترك الدواء ومات لم يأثم ، ولو شرب الخمر وهو عطشان ومات اثم لتيقن زوال العطش بشربها وعدم تيقن زوال المرض به فافترقا .

قال في الهندية : وأكل الترياق يكره إذا كان فيه شيء من الحيات وإن باع ذلك جاز اهـ . (٢٣٦/٦)

اس سے ان ادویہ کا جواز بیع مفہوم ہوتا ہے جن میں شی محرم ملی ہوتی ہے بیع خالص محرم کی ناجائز ہے جیسے خالص شراب یا خالص شحم خنزیر اور مخلوط بالحرام کی بیع جائز ہے۔

كالسرقين المخلوط بالشراب يجوز بيعه .

باقی یہ علت لغو ہے کہ مسلمان تداوی بالمحرم میں کفار کے محتاج ہوں گے۔ آخر کون سی تجارت

ہے جس میں کفار سے مسلمانوں کو استغناء ہے پس احتیاج الی الکفار میں حرج کیا ہے جبکہ ہم مباحات میں بھی ان سے مستغنی نہیں ہیں۔ (ماخوذ از امداد الاحکام بتغیر یسیر)

الحدود والتعزیرات

حدود وتعزیرات کے احکام

قرآن کریم اور احادیثِ متواترہ نے چار جرائم کی سزا اور اس کا طریقہ خود متعین کر دیا ہے کسی قاضی یا امیر کی رائے پر نہیں چھوڑا انہیں متعینہ سزاؤں کو اصطلاح شرع میں ''حدود'' کہا جاتا ہے ان کے علاوہ باقی جرائم کی سزا کو اس طرح متعین نہیں کیا گیا بلکہ امیر یا قاضی مجرم کی حالت اور جرم کی حیثیت ماحول وغیرہ کے مجموعہ پر نظر کر کے جسقدر سزا دینے کو انسدادِ جرم کے لیے کافی سمجھے وہ سزا دے سکتا ہے۔ ایسی سزاؤں کو شریعت کی اصطلاح میں ''تعزیرات'' کہا جاتا ہے، حدودِ شرعیہ چار ہیں:

(۱) حدِ سرقہ: چوری کرنے پر حد۔

(۲) حدِ زنا: زنا کرنے پر

(۳) حدِ قذف: یعنی کسی پاکدامن عورت پر تہمت رکھنے کی سزا۔

(٤) حدِ شرب الخمر: یعنی شراب پینے پر سزا

حدود کی مشروعیت کی حکمت:

ان جرائم میں سے ہر جرم اپنی جگہ بڑا سخت اور دنیا کے امن کو تباہ کرنے والا اور بہت سی خرابیوں کا مجموعہ ہے۔ ان برائیوں پر قدغن لگانے کے لیے اور امتِ مسلمہ کو ان تباہ کن برائیوں سے بچانے کے لیے اور امت کی جان و مال، عزت وآبرو، ماں بہنوں کی عزت وعصمت کو بچانے کے لیے شریعت مطہرہ نے اسلامی سزائیں مقرر کیں تاکہ ان سزاؤں کو دیکھ کر لوگ ایسے جرائم کے ارتکاب سے باز آجائیں۔ معاشرہ میں امن وسکون قائم ہو، تاکہ کوئی بد بخت کسی کی ماں بہنوں کی عزت نہ لوٹے، کوئی ظالم سخت دل کسی کی جان سے نہ کھیلے، کوئی لالچی حریص کسی کے مال پر ناحق ہاتھ نہ ڈالے۔

پھر ان جرائم میں زنا خاص طور پر ایسا جرم ہے کہ اس کے انجام اور نتائج بہت ہی برے ہیں۔

کسی شخص کی بیٹی، بہن، بیوی پر ہاتھ ڈالنا اس کی ہلاکت کے مترادف ہے، شریف انسان جس میں شرم وحیا اور غیرت موجود ہے اس کو سارا مال و جائیداد اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنے حرم کی عفت پر ہاتھ ڈالنا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں روزمرہ یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ جن لوگوں کے حرم پر ہاتھ ڈالا گیا ہے وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر زانی کے قتل وفنا کے درپے ہوتے ہیں یہ جوشِ انتقام نسلوں میں چلتا ہے اور خاندانوں کو تباہ کر دیتا ہے اور جس قوم میں زنا عام ہو جائے وہاں کسی کا نسب محفوظ نہیں رہتا، ماں بہن، بیٹی وغیرہ جن سے نکاح حرام ہے جب یہ رشتہ بھی غائب ہو گئے تو اپنی بیٹی اور بہن بھی نکاح میں آسکتی ہے، جو زنا سے بھی بدتر گناہ ہے۔

غور کیا جائے تو دنیا میں جہاں کہیں بدامنی اور فتنہ وفساد ہوتا ہے اس کا بیشتر سبب عورت اس سے کم مال ہوتا ہے۔

یہ اسلامی سزائیں امن عالم کا ضامن ہیں، اگرچہ اہل مغرب و یہود ونصاریٰ اور مغرب زدہ لوگ جو مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور مادہ پرستی، نفس پرستی میں مبتلا ہیں ان کو یہ سزائیں ایک آنکھ نہیں بھاتی اس لیے وہ ان سزاؤں کو ظالمانہ قرار دیتے ہیں، آئے دن ان کے خلاف زبان درازی کرتے ہیں اپنی نجی محفلوں میں حکومتی ایوانوں میں جہاں کہیں ان کو دریدہ دہنی کا موقع ملے وہ خدائی قوانین کے خلاف بیان بازی کر کے اپنے مغربی آقاؤں کو خوش کرتے ہیں اور فحاشی وعریانی اور زنا جیسے شرمناک حیا سوز عذاب الٰہی کو دعوت دینے والے گناہ کرنے والوں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ان کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ ولا تقربوا الزنا إنه كان فاحشة وساء سبيلا ﴾

(سورة الإسراء : ٣٢)

یعنی زنا کے قریب بھی مت جاؤ کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت ہی برا راستہ ہے۔

اس لیے ایک مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ زنا کاری اور اس کے اسباب اور دیگر ذرائع سے اپنے آپ کو دور رکھے اور جہاں کہیں یہ بے حیائی کا کام ہو ان کو روکنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی کوشش کرے اب ہم زنا کی سزا کا تفصیلی ثبوت احادیثِ مبارکہ سے پیش کرتے ہیں:

حدِ زنا احادیث کی روشنی میں:

عن عبد الله بن عمر انه قال ان اليهود جاؤا الى رسول الله صلى

الله عليه وسلم فذكروا له ان رجلا منهم وامرأة زنيا فقال لهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ما تجدون في التورات في شان الرجم فقالوا نفضحهم ويجلدون قال عبد الله بن سلام كذبتم ان فيها الرجم فاتوا بالتورات فنشروها فوضع احدهم يده على آيت الرجم فقرأ ماقبلها وما بعدها فقال له عبد الله ابن سلام ارفع يدك فرفع يده فإذا فيها آيت الرجم قالوا صدق يا محمد فيها آيت الرجم فامر بهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فرجما فرأيت الرجل يحنأ على الامرأة يقيها الحجارة .

(بخاري : ۲/ ۱۰۱۱ ، ترمذي : ۱/ ۲۷۳ ، مؤطا إمام مالك : صـ ٦٨٣ ، مسلم : ۱/ ٦٩)

عبداللہ بن عمر سے راویت ہے کہ انہوں نے کہا کہ یہودیوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کے پاس حاضر ہوئی اور کہا کہ ان میں سے ایک شادی شدہ مرد نے ایک عورت شادی شدہ کے ساتھ زنا کیا ہے اس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کیا تمہاری کتاب تورات میں رجم کے بارے میں کچھ نہیں؟ انہوں نے جواب دیا اس میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہم ان کو رسوا کرتے ہیں اور ان کو کوڑے مارے جاتے ہیں۔ عبداللہ بن سلام نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا ہے تورات میں رجم کی آیت موجود ہے اس پر ان میں سے کوئی تورات لے کر آیا اس کو کھولا اور ایک شخص نے آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ دیا اور آیتِ رجم سے آگے اور پیچھے پڑھ کر سنایا۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے اس یہودی سے کہا جس نے آیتِ رجم پر ہاتھ رکھ دیا تھا تم اپنا ہاتھ اس جگہ سے اٹھاؤ اس نے ہاتھ اٹھایا۔ دیکھا کہ آیتِ رجم موجود ہے تو انہوں نے اقرار کرلیا کہ ہاں اے محمد! یہاں پر آیتِ رجم موجود ہے۔ عبداللہ بن سلام نے سچ کہا ہے پھر رسول اللہ ﷺ نے دونوں کے رجم (سنگسار) کا حکم فرمایا اور دونوں کو رجم کیا گیا۔

حدیثِ مذکور سے امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ نے استدلال کیا ہے کہ غیر مسلم ذمی اگر زنا کرے اور دونوں شادی شدہ ہوں تو رجم کیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے رجم کے بارے میں ان سے سوال کرنے اور آپ کے رجم کے حکم دینے سے معلوم ہوتا ہے۔

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خذوا عني خذوا عني ﴿ قد جعل الله لهن سبيلا ﴾ الثيب بالثيب جلد مائة ورمي بالحجارة والبكر بالبكر جلد مائة ونفي سنة .

(مسلم : ٢/ ٦٧، ابو داؤد : ٢/ ٦٠٦ اللفظ المسلم)

عبادة ابن الصامت سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے سن لو کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ او يجعل الله لهن سبيلا ﴾ کا وعدہ پورا فرمایا اور زانی مرد اور زانیہ عورت کا حکم متعین فرمایا۔ ان کے لیے شرعی راستہ بیان فرمایا وہ یہ کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کے زنا پر سو کوڑے اور سنگسار اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے اور ایک سال شہر بدر کرنا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حدیث مذکور میں غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے سو کوڑے اور شہر بدر کرنے کا شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لیے رجم کے علاوہ سو کوڑے کا ذکر بھی ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے شادی شدہ مرد اور عورت کے بارے میں صرف رجم پر اکتفا فرمایا۔

عن ابي هريرة انه اتى رجل من المسلمين الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو في المسجد فناداه فقال يا رسول الله صلى الله عليه وسلم اني زنيت فاعرض عنه فتنحى تلقاء وجهه فقال له يا رسول الله صلى الله عليه وسلم اني زنيت فاعرض عنه حتى ثنى ذلك عليه اربع مرات فلما شهد على نفسه اربع شهادات دعاه رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ابك جنون قال لا قال فهل احصنت قال نعم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذهبوا به فارجموه وفيه يقول جابر فكنت فيمن رجمه فرجمناه .

(بالمصلى ، مسلم : ٢/ ٦٦)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ مسلمانوں میں سے ایک شخص مسجد نبوی میں آیا جبکہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اس شخص نے آواز دے کر کہا یا رسول اللہ (ﷺ)! میں نے زنا کیا آپ نے اس کی طرف توجہ نہ کی پھر یہ شخص آپ کے سامنے کی طرف سے آیا

اور کہا یا رسول اللہ میں نے زنا کیا آپ نے کوئی توجہ نہ دی اس طرح وہ بار بار کہتا رہا جب اس نے اپنے اوپر چار مرتبہ شہادت دی تو آپ نے اس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تجھے جنون تو نہیں اس نے کہا نہیں پھر آپ نے پوچھا تو شادی شدہ ہے اس نے کہا ہاں پس آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا اس کو لے جاؤ اور رجم یعنی سنگسار کرو۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ رجم کرنے والوں میں میں بھی تھا ہم نے اسے عیدگاہ میں جا کر رجم کیا۔ حدیث مذکور کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں جو کہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے تھے اور وہ رجم کا یہ چشم دید واقعہ بیان فرما رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کا حکم دیا اور رجم کیا گیا جس سے معلوم ہوا کہ رجم کا واقعہ سورۂ نور کے بعد ہوا ہے کیونکہ سورۃ نور کی آیت الزانیۃ والزانی ۵ھ ہجری میں واقعہ افک کے موقعہ پر اتری، لہٰذا یہ اعتراض غلط ہوگا کہ رجم کے واقعات سورۂ نور سے قبل ہوئے ہیں۔

اور عبداللہ ابن ابی اوفی کا یہ کہنا کہ رجم کے واقعات سورۂ نور سے قبل ہیں یا بعد مجھے معلوم نہیں ہمارے استدلال کو مشتبہ نہیں بنا سکتا کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جزم و یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں رجم ہوا ہے۔

عن عبد اللّٰه ابن بريدة قال فلما رجم ما عز بن مالك فجائت الغامدية فقالت يا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم انى قد زنيت فطهرني وانه ردها فلما كان الغد قالت يا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لما تردني لعلك ان تردني كما ردت ما عزا فواللّٰه انى لحبلیٰ قال الآن فاذهبى حتى تلدى ، قال فلما هذا قد ولدته قال اذهبى فارضعيه حتى تفطميه فلما فطمته أتته بالصبي في يده كسرة خبزٍ فقالت هذا يا نبي اللّٰه قد فطمته وقد اكل الطعام فدفع الصبي الى رجل من المسلمين ثم امر بها فحفرلها الى صدره وامر الناس فرجموها فيقبل خالد ابن وليد بحجر فرمى رأسه فتنضح الدم على وجه خالد فسبها فسمع النبي صلى اللّٰه عليه وسلم سبه اياها فقال مهلا يا خالد فو الذي نفسى بيده لقد تابت توبة لو تابها صاحب مكس لغفرله ثم امربها فصلى عليها ودفنت .

(مسلم : ۲/ ۶۸ ، ابو داؤد : ۲/ ۶۰۹)

عبد اللہ ابن بریدۃ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ ماعز بن مالک اسلمی کو رجم کیا گیا تو غامدیہ کی عورت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی اور کہا کہ میں نے زنا کیا مجھے پاک کیجئے، آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس عورت کو واپس کر دیا دوسرے روز پھر آئی اور گزشتہ روز کی طرح بات کی آپ ﷺ نے کوئی توجہ نہیں دی تو عورت نے عرض کیا آپ مجھے کیوں واپس کر رہے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ آپ ماعز بن مالک کی طرح مجھے بھی واپس کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے یقیناً زنا کیا ہے چنانچہ اب میں حاملہ ہوں۔ آپ نے فرمایا ابھی حد قائم نہیں کی جائے گی چلی جاؤ وضع حمل تک انتظار کرو جب وضع حمل ہو گیا پھر عورت بچہ کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ابھی نہیں بچے کو دودھ پلاؤ۔ دودھ چھڑانے کا انتظار کرو۔ جب بچے کی مدتِ رضاعت ختم ہو گئی اور روٹی کھانے کے قابل ہو گیا وہ عورت بچے کو لے کر پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا اے اللہ کے نبی! میرے بچے کی مدتِ رضاعت ختم ہو گئی اب وہ کھانا کھانے لگا ہے پس رسول اللہ ﷺ نے بچہ کو کسی مسلمان کے ہاتھ پرورش کے لیے دے دیا اور عورت کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ صحابہ کرام نے سینہ تک گڑھا کھود کر عورت کو اس میں ڈال کر رجم کیا۔ خالد بن ولید نے ایک پتھر لے کر اس کے منہ پر مارا جس سے خون نکل کر حضرت خالد کے چہرے پر آ پڑا حضرت خالد نے اس کو گالی دی رسول کریم ﷺ نے سن لیا اور حضرت خالد سے فرمایا: چپ رہ (اے خالد) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس عورت نے ایسی توبہ کی اگر اس طرح کی توبہ ظلماً ٹیکس وصول کرنے والا کرتا تو اس کا گناہ بھی معاف ہو جاتا اور پھر آپ نے اس پر نماز جنازہ پڑھائی اور اس کو دفنا دیا گیا۔

عن عمران بن حصين ان امرأة من جهينة اتت النبي صلى الله عليه وسلم وهي حبلى من الزنا فقالت يا نبي الله صلى الله عليه وسلم اصبت حداً فاقمه على فدعا نبي الله صلى الله عليه وسلم وليها فقال احسن اليها فإذا وضعت فاتني بها ففعل فامربها نبي الله صلى الله عليه وسلم فشدت عليها ثيابها فرجمت ثم صلى عليها فقال له عمر تصلى عليها يا نبي الله صلى الله عليه وسلم وقد زنت

قال لقد تابت توبة لو قسمت بين سبعين من اهل المدينة لو سعتهم.

(اللفظ المسلم : ٦٩/٢ ، ابو داؤد : ٦٠٩/٢)

عمران ابن حصین سے روایت ہے کہ ایک عورت جہنی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی جبکہ وہ زنا سے حاملہ تھی اور اس نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میں نے زنا کیا اور مجھ پر حد لازم ہوگئی لہذا آپ مجھ پر حد قائم کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے اس کے ولی کو بلایا اور کہا کہ اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو جب وضع حمل ہو جائے تو اسے میرے پاس لے آؤ۔ اس عورت کے ولی نے ایسا ہی کیا۔ جب عورت کو لایا گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے رجم (سنگسار کرنے) کا حکم دیا اور مضبوط کر کے اس پر کپڑے باندھ دیے گئے تا کہ رجم کی حالت میں بے پردگی نہ ہو اور رجم کر کے اسے ہلاک کر دیا گیا اور آنحضرت ﷺ نے اس پر نمازِ جنازہ پڑھائی۔ حضرت عمر نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو زنا کیا ہے آپ اس کی نمازِ جنازہ ادا کر رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا اس عورت نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستر آدمیوں پر تقسیم کی جائے تو کافی ہے۔

یہاں پر ایک وضاحت ضروری ہے وہ یہ کہ غامدیہ والی عورت کے متعلق نبی کریم نے فرمایا کہ بچہ کو دودھ پلا کر جب وہ کھانا کھانے کے قابل ہو جائے پھر آنا تا کہ تمہارے اوپر حد قائم کی جائے اور جہینہ والی عورت کے متعلق فرمایا کہ وضع حمل کے بعد اس کو لاؤ تا کہ حد قائم کی جائے دونوں کے حکم میں فرق کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر زانیہ عورت کے وضع حمل کے بعد بچہ کی پرورش کرنے کا انتظام ہے پرورش کرنے والا کوئی موجود ہے پھر تو وضع حمل کے بعد ہی حد قائم کی جائے گی اور اگر بچہ کی پرورش کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے تو دودھ چھڑانے تک انتظار کیا جائے گا۔

عن جابر أن رجلاً زنا بأمرة فلم يعلم باحصانه فجلد رسول الله صلى الله عليه و سلم ثم علم باحصانه فرجم . (أبو داؤد : ٦٠٩/٢)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کسی عورت سے زنا کیا حضور اکرم ﷺ کے سامنے اس کا احصان ثابت نہ ہوا اس لیے آپ نے کوڑے کی سزا دی بعد میں معلوم ہوا کہ شادی شدہ تھا تو آپ نے رجم کیا۔

عن علي حين رجم المرأة يوم الجمعة قال رجمتها بسنة رسول الله صلى الله عليه و سلم . (بخاري : ١٠٠٦/٢)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب انہوں نے اپنے عہد خلافت میں ایک عورت کو رجم کیا تو فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ کے طریقہ کے مطابق رجم کیا ہے۔

عن عبد الله ابن مسعود رضی الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يحل دم امرء مسلم يشهدان لا إله إلا الله وانی رسول الله الا باحدیٰ ثلاث الثيب الزاني والنفس بالنفس والتارك لدينه المفارق للجماعة روته' عائشة فيه رجل زنی بعد احصان فانه يرجم.

(الخ اللفظ لابی داؤد: صـ ۵۹۸، بخاري: ۲/۱۰۱۶، مسلم: ۲/۱۹)

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر اس مسلمان کا خون جو اللہ کے ایک ہونے اور محمد (ﷺ) کے رسول ہونے کی گواہی دے کسی دوسرے مسلمان کے لیے حلال نہیں مگر تین میں سے کوئی ایک ہو تو حلال ہے:

(۱) جبکہ شادی شدہ زنا کرے۔

(۲) کسی نے دوسرے کو ناحق قتل کیا ہو۔

(۳) جس نے دین کو بدلا یعنی مرتد ہو گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ جس نے احصان کے بعد زنا کیا اسے رجم کیا جائے گا۔

عن عمر بن خطاب قال رجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورجم ابو بكر و رجمت ولو لا انی اکره ان ازید فی كتاب الله لكتبته' فی المصحف فانی قد خشيت ان يجیء اقوام فلا يجدونه فی كتاب الله فليكفرونه وفي الباب عن علی حديث عمر حديث حسن صحيح وروي من غير وجه عن عمر. (ترمذي: ۱/۱۷۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا اور ابوبکر نے رجم کیا اور میں نے رجم کیا۔ اگر میں اس بات کو برا نہ جانتا کہ کتاب اللہ میں اضافہ کیا جائے تو رجم کی آیت (الشیخ والشیخة الخ) کو مصحف قرآن میں لکھ دیتا کیونکہ مجھے تو قوی اندیشہ ہے کہ کچھ دنوں

کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو کہ کتاب اللہ میں رجم کو واضح طور پر نہ دیکھنے کی وجہ سے منکر ہو کر کافر ہو جائیں گے۔ یہ حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی روایت ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے تو بے شمار طرق سے ثابت ہے۔

عمل بالرجم الخلفاء الراشدون قال عمر رجم رسول الله صلى الله عليه وسلم ورحم ابو بكر و رجمت و كذا عن علي .

رجم پر خلفاء راشدین نے عمل کیا، حضرت عمر نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا، ابو بکر رضی اللہ عنہ نے رجم کیا اور میں نے رجم کیا۔ اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے رجم کیا۔ (مؤطا امام مالك : صـ ٦٨٦)

تاریخی اعتبار سے عہدِ رسالت میں کئی افراد پر رجم کیا گیا اور خلفائے راشدین نے اپنے زمانہ میں رجم کیا۔

امام ترمذی نے حدیثِ رجم کے بارے میں جن راویوں کے نام ذکر کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

وفي الباب عن ابى بكر ، عبادة بن الصامت ، وابى هريرة ، وابى سعيد خدرى ، وابن عباس ، جابر بن سمره ، وهزال بريدة ، سلمة ابن المحبق ، ابى بزرة ، عمران بن حصين . (ترمذي : صـ ١٧٢)

اور دیگر مختلف جگہ میں جن کا نام مذکور ہے ان میں عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عمر، حضرت عمر، حضرت ابوبکر، حضرت عثمان اور حضرت علی بھی ہیں۔ حضرت عائشہ، براء بن عازب، عمرو بن العاص وغیرہ شامل ہیں۔

ان احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت یا مرد کے بارے میں شرعی شہادت سے یا ان کے اقرار سے ثابت ہو جائے کہ انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے تو ان کو بطورِ سزا سو کوڑے مارے جائیں گے اور اگر حاکم ضرورت محسوس کرے تو ان کو جلا وطن بھی کر سکتا ہے اور اگر کوئی شادی شدہ جوڑا یا ایک سے یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کو بطورِ سزا سنگسار کیا جائے گا۔

زنا کی سزا چونکہ بہت سخت ہے اور اس کا احتمال ہے کہ سزا جاری کرنے والوں کو ان پر رحم

آجائے سزا کو چھوڑ بیٹھیں یا کم کردیں اس لیے اس کے ساتھ حکم دیا گیا کہ دین کے اس اہم فریضہ کی ادائیگی میں مجرموں پر رحم اور ترس کھانا جائز نہیں۔ رافت رحمت اور عفو وکرم ہر جگہ محمود ہے مگر مجرموں پر رحم کھانے کا نتیجہ تمام مخلوق کے ساتھ بے رحمی ہے اس لیے ممنوع اور ناجائز ہے۔

لقوله تعالی: ﴿ الزانية و الزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة و لا تأخذكم بهما رأفة في دين الله إن كنتم تؤمنون بالله و اليوم الاخر و ليشهد عذابهما طائفة من المؤمنين ﴾ (سورة النور : ۲)

یعنی ارشاد باری تعالیٰ ہے: ’’زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد ان میں سے ہر ایک کے سو سو درے مارو اور تم لوگوں کو ان دونوں پر اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ذرا رحم نہیں آنا چاہیے اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیے۔‘‘ (تاکہ ان کی رسوائی ہو اور دیکھنے، سننے والوں کو عبرت ہو)

ثبوتِ زنا کا طریقہ:

کسی پر زنا کے جرم ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں:

(۱) چار ایسے مرد گواہی دیں جن کی دیانت و ایمانداری پر اعتماد کیا جا سکتا ہو کہ ہم نے ان کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مجرم خود عدالت کے سامنے ارتکابِ زنا کا اعتراف کرے۔

کاروکاری کا حکم:

ہمارے ملک میں کاروکاری کے نام پر قتل کا ایک رواج ہے اس کے متعلق تفصیلی حکم کے لیے ہمارے دارالافتاء والارشاد میں ایک سوال آیا، اس سوال وجواب کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام ان مسائل کے بارے میں کہ سندھ، بلوچستان اور جنوبی پنجاب کے بیشتر علاقوں میں ایک رسم ’’کاروکاری‘‘ کے نام سے مروّج ہے۔ جس میں عورت کا شوہر کسی غیر مرد سے بیوی کے جنسی تعلقات (زنا) ہونے یا جنسی تعلقات کے شبہ کے بنا پر لفظ ’’کاری‘‘ کہہ کر گھر سے نکال دیتا ہے۔

لفظ ’’کاری‘‘ کے معنی اردو زبان میں سیاہ کے ہیں۔ یہ لفظ عورت کے کسی غیر مرد کے ساتھ

عین زنا یا شبہ زنا کی بنا پر بولا جاتا ہے۔ (جبکہ یہ لفظ ''کاری'' بعض علاقوں کے عرف میں گالی کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے)

جس مرد و عورت پر کارو کاری کا الزام لگایا جاتا ہے اس مرد و عورت کو حتی الامکان قتل کر دیا جاتا ہے، جن کو بغیر نمازِ جنازہ اور کفن و دفن کے کسی گڑھے یا دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر وہ قتل سے بچ جائیں تو پھر یہ معاملہ علاقائی جرگہ کے پاس چلا جاتا ہے، جس میں ایک یا ایک سے زائد سردار و رئیس شریک ہوتے ہیں۔

بسا اوقات یہ جرگہ اسی لفظ ''کاری'' کو طلاق کے قائم مقام بنا کر عورت کو شوہر سے علیحدہ کر دیتا ہے اور عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے کا اختیار ہوتا ہے اور بعض علاقوں میں اس لفظ ''کاری'' کو طلاق کے قائم مقام نہیں سمجھا جاتا بلکہ علیحدگی کی صورت میں شوہر سے مستقل طور پر صریح الفاظ میں طلاق کہلوا کر عورت کو شوہر سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔

نیز جرگہ کبھی ملزمہ کو بری کر دیتا ہے اور اس صورت میں شوہر ملزمہ کو دوبارہ بغیر نئے نکاح کے بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس رکھ لیتا ہے اور کبھی جرگہ مرد و عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ (اگرچہ ثبوتِ جرم زنا میں شرعی طریقہ کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا) جس کا حل دو طرح سے کیا جاتا ہے:

۱۔ ملزمہ عورت کے سسرال والے مرد کے خاندان سے بعوض جرم لڑکی نکاح میں لیتے ہیں، جس کا نکاح وہ اپنی مرضی سے اپنے خاندان کے کسی بھی فرد سے کر دیتے ہیں۔

۲۔ ملزم کے قبیلہ سے بھاری مالی جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ جو ملزمہ کے سسرال کو بعوضِ جرم دیا جاتا ہے اور ایک مقرر حصہ سردار کو بھی دیا جاتا ہے۔

اس مذکورہ تفصیل کے بعد مندرجہ بالا رسم کے متعلق چند پیچیدہ مسائل کا شرعی حل مطلوب ہے:

۱۔ حالتِ غضب میں شوہر کا بیوی کو لفظ ''کاری'' کہہ کر گھر سے نکال دینا طلاق ہے یا قذف؟

۲۔ اگر یہ لفظ طلاق ہے تو صریح ہوگی یا کنایہ عن الطلاق؟ اور اس سے طلاقِ رجعی واقع ہوگی یا طلاقِ بائنہ؟

۳۔ مذکورہ الزام کے عدم ثبوت پر شوہر کا اس عورت کو نئے نکاح کیے بغیر بیوی کی

حیثیت سے اپنے پاس رکھنا کیسا ہے؟

٤۔ اگر شوہر بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ عین زنا کی حالت میں دیکھے تو ایسے شوہر کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟ آیا وہ اس زانی مرد اور بیوی کو قتل کر سکتا ہے یا نہیں؟ قتل کرنے کی صورت میں شوہر پر شرعاً کوئی سزا ہوگی یا نہیں؟

٥۔ موجودہ دور میں جبکہ سرکاری عدالتیں اور قانون موجود ہے تو مذکورہ جرگہ و پنچائیت کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟ آیا ان کو اس طرح کے معاملات کے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟ اور ان کے کیے ہوئے فیصلہ پر عمل کرنا لازم ہوگا یا نہیں؟

٦۔ جرگہ کا جرم ثابت کرنے کی صورت میں مجرم مرد کے خاندان سے کسی لڑکی کو جرم کا عوض بنا کر نکاح کرانا شرعاً کیسا ہے؟

٧۔ ملزم کے خاندان سے مالی جرمانہ وصول کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس جرمانہ کا مصرف کیا ہوگا؟

٨۔ جہاں ملزم مرد و عورت کو بغیر نمازِ جنازہ اور کفن دفن کے گڑھے وغیرہ میں ڈال دیا جائے تو علاقہ والوں اور رشتہ داروں پر شرعاً کیا لازم ہوگا؟

ازراہِ کرم ان مسائل کا مدلل مفصل جواب عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

جواب:

واضح ہو کہ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا گناہِ کبیرہ ہے، قرآن وحدیث میں اس پر سخت وعیدیں آئی ہیں:

لقوله عليه السلام : اوّل ما يقضي بين الناس يوم القيامة في الدماء . (متفق عليه)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جس چیز کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا وہ خون ہے۔ (بخاری ومسلم)

وقوله عليه السلام : لن يزال المؤمن في فسحة من دينه مالم يصب دما حراما . (رواه البخاري)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تک کوئی مسلمان قتل ناحق کا مرتکب نہ ہو وہ ہمیشہ

اپنے دین کی وسعت اور کشادگی میں رہتا ہے۔ چونکہ قتل عظیم گناہ ہے اس لیے شریعتِ مطہرہ نے حدود وقصاص کے نفاذ کو شخصی ذمہ داری میں دینے کی بجائے حاکم وقت کو ذمہ دار بنایا تاکہ مزید فتنہ فساد نہ ہو، نیز زنا کاری بہت قبیح فعل ہے، زنا اور اسبابِ زنا سے بچنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ ولا تقربوا الزنى إنه كان فاحشة وساء سبيلا ﴾

(سورة الإسراء)

اسی طرح محض شبہ کی بناء پر بلا تحقیق کسی پر الزام لگانا بھی بڑا گناہ ہے، خصوصاً کسی پاکدامن خاتون پر زنا کا الزام لگانا۔

لقوله تعالیٰ: ﴿ إن الذين يرمون المحصنٰت الغٰفلٰت المؤمنٰت لعنوا في الدنيا والأخرة ولهم عذاب عظيم ﴾ (سورة النور)

(٣.١) اس وضاحت کے بعد صورتِ مسئولہ میں اگر کوئی شوہر لفظ "کاری" استعمال کر کے بیوی کو گھر سے باہر نکالے تو شرعاً اس سے طلاق واقع نہیں ہوگی، کیونکہ اس کا معنیٰ "زانیہ" کا ہے، یہ طلاق کے لیے مستعمل نہیں ہے، اس کے بعد اگر دونوں میں صلح صفائی ہو جائے تو اس عورت کو گھر میں بسانے کے لیے نئے نکاح کی ضرورت نہیں، البتہ یہ زنا کی تہمت ہے، اس کا بڑا گناہ ہونا آیتِ بالا سے ثابت ہوا۔

(٤) اگر شوہر اپنی بیوی کو عین زنا یا بوس وکنار کی حالت میں دیکھے اور اس کو یقین ہو کہ بیوی بھی راضی ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ بیوی کو اسی زنا کی حالت میں قتل کردے۔ اسی طرح زانی مرد کو بھی اسی حالت میں قتل کرنا جائز ہے۔ یہ قتل تعزیر ہے، حد نہیں، کیونکہ حد لگانا صرف حاکم کا حق ہے، نیز تعزیراً قتل کا جواز عین اسی حالت کے ساتھ خاص اور اس تک محدود ہے۔

قال في التنوير في باب التعزير: ويكون بالقتل كمن وجد رجلا مع امرأة لا تحل له إن كان يعلم أنه لا ينفر بصياح وضرب بما دون السلاح وإلا لا وإن كانت المرأة مطاوعة قتلهما، ولو كان مع امرأته وهو يزني بها أو مع محرمه وهما مطاوعان قتلهما جميعاً مطلقا.

(الدر المختار مع ردالمحتار باب التعزير: ٤/٦٢)

باقی اس قتل کی وجہ سے کوئی ضمان لازم ہوگا یا نہیں؟ یہ اس پر موقوف ہے کہ اگر وہ شخص زنا کو

گواہوں کے ذریعہ ثابت کردے کہ یہ اس وقت زنا میں مبتلا تھا، تو اس قاتل پر کوئی ضمان نہیں آئے گا، ورنہ اس سے قصاص لیا جائے گا۔

وأيضاً فيها معزيا إلى الحاوي الزاهدي: رجل رأي رجلاً مع امرأته يزني بها أو يقبلها أو يضمها إلى نفسه وهي مطاوعة فقتله أو قتلهما لا ضمان عليه ولا يحرم من ميراثها إن اثبته بالبينة أو باقرار ولو رأي رجلا مع امرأته في مفازة خالية او رآه مع محارمه هكذا ولم يرمنه الزنا ودواعيه قال بعض المشايخ: حل قتلهما وقال بعضهم لا يحل حتى يري منهما العمل أي الزنا ودواعيه ومثله في خزانة الفتاوىٰ اهـ. (ردالمحتار: ٤/٦٣ باب التعزير)

(۵) جرگہ اور پنچائیت کی حیثیت "حکم" کی ہے، ان کو تعزیر کا تو حق ہوتا ہے لیکن حدود وقصاص کے فیصلے کرنے کا حق نہیں، اگر فیصلہ کر دیا تو نافذ العمل نہیں ہوگا، البتہ پنچائیت کو فریقین کے درمیان صلح صفائی کرانے کا اختیار ہے، مگر اس میں کسی ماہر مفتی کا ہونا ضروری ہے تاکہ جہاں شرعی مسائل میں رہنمائی کی ضرورت ہو وہ رہنمائی کر سکے اور پنچائیت کا فیصلہ شریعت کے مطابق ہو سکے۔

(قوله: يسئالهما الإمام) اشار إلى ما في البحر عن القنية من أنه ليس لقاضي الرستاق أو فقيهه أو المتفقهة أو أئمة المساجد إقامة حد الشرب، إلا بتولية الإمام.

(ردالمحتار: ٤/٤٠، باب حد الشرب)

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: ولا يقيم المولي الحد على عبده إلا بإذن الإمام وقال الشافعي رحمه الله: له أن يقيمه لان له ولاية مطلقة عليه كالامام، بل اولىٰ لانه يملك من التصرف فيه مالا يملكه الإمام كالتعزير ولنا قوله عليه الصلوٰة والسلام: اربع إلى الولاة وذكر منها الحدود، ولأن الحد حق الله تعالىٰ لأن المقصد منها اخلاء العالم عن الفساد، ولهذا لا يسقط بإسقاط العبد فيستو فيه من

هو نائب عن الشرع وهو الإمام او نائبه بخلاف التعزير لانه حق العبد ، ولهذا يعزر الصبي وحق الشرع موضوع عنه .

(هدايه مع فتح القدير : ٥/ ٢٢٤)

(٦) اس جرم کے عوض میں خاندان کی کوئی لڑکی نکاح میں دینا ظلم اور سخت گناہ ہے، کیونکہ شرعاً نکاح کا مقصد یہ ہے کہ میاں بیوی کے درمیان خوشگوار ازدواجی زندگی قائم ہو اور توالد وتناسل کے ذریعے نسل انسانی کو بڑھایا جائے، اس کے لیے شریعت نے کفوء، مہر، نفقہ وغیرہ بہت سی باتوں کا خیال رکھا، لڑکی عوض کے طور پر نکاح میں دینے سے یہ حقوق تلف ہوتے ہیں اس لیے ایسا فیصلہ شریعت کے خلاف ہے۔

(٧) مالی جرمانہ، نصوصِ قرآنیہ، احادیثِ صریحہ اور اصولِ شرعیہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے حرام ہے اس لیے جرگہ والوں کا یہ فیصلہ شریعت کے خلاف ہے۔

قال العلامة العلائي رحمه الله تعالىٰ : (لا بأخذ مال في المذهب) بحر وفيه عن البزازية : وقيل يجوز ومعناه أن يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له فإن ايس من توبته صرفه إلى ما يري . وفي المجتبىٰ ؛ إنه كان في إبتداء الإسلام ثم نسخ .

(ردالمحتار : ٤/ ٦١) (والتفصيل في أحسن الفتاوىٰ : ٥/ ٥٤٩)

(٨) اگر ایسے شخص کا انتقال ہو جائے یا کوئی اس کو قتل کر دے تو اس کی لاش کی بے حرمتی جائز نہیں بلکہ لازم ہے کہ اس کو عام مسلمانوں کی طرح کفن دیا جائے اور جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے، جرم ثابت ہونے کے بعد بغیر توبہ کے مرنے کی صورت میں علاقہ کا بڑا عالم یا دینی اعتبار سے مرتبہ رکھنے والا شخص اس کے جنازہ میں شریک نہ ہو، تاکہ دوسروں کے لیے عبرت ہو۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله تعالىٰ : ويغسل ويكفن ويصلى عليه لقوله عليه الصلوٰة والسلام في ما عز : " اصنعوا به كما تصنعون بموتاكم ." (هداية مع فتح القدير : ٥/ ٢١٤ كتاب الحدود)

حیوان سے بدفعلی کی سزا:

اگر کسی نے بھینس سے بدفعلی کی تو اس کا یہ حکم ہے کہ اس شخص پر تعزیر ہے، جس کی مقدار حاکم کی

رائے پر ہے اور بھینس کو ذبح کر کے دفن کر دینا یا جلا دینا مندوب ہے، بدفعلی کرنے والا شخص بھینس کی قیمت کا مالک کے لیے ضامن ہوگا، ذبح کر کے دفن کرنا ضروری اور واجب نہیں، صرف اس لیے مندوب ہے کہ گناہ کی یادگار کو ختم کرنے سے بدفعلی کرنے والے سے عار زائل ہو جائے، اس لیے اگر ذبح نہ بھی کیا جائے تو کوئی حرج نہیں، اس کا گوشت اور دودھ وغیرہ بلاشبہ حلال ہے، اس زمانہ میں ذبح کو ضروری اور واجب سمجھتے ہیں اور ایسے جانور کے گوشت اور دودھ کو حرام تصور کرتے ہیں، لہٰذا اس زمانہ میں ذبح کرنا مناسب نہیں، اس لیے کہ مندوب کو ضروری سمجھنا یا حلال کو حرام قرار دینا سخت گناہ ہے، ایسے موقع پر مندوب پر عمل کرنا بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔

والدليل على كل ما ادعينا مافي غسل الشامية تحت (قوله ولا عند وطء بهيمة الخ) وفي القنية برمز اجناس الناطفي فرج البهيمة كفيها لا غسل فيه بغير إنزال ويعزر وتذبح البهيمة وتحرق على وجه الاستحباب ولا يحرم اكل لحمها به اهـ وسيأتي في الحدود .

(ردالمحتار : ١

وقال في الحدود (قوله وتذبح ثم تحرق) اي لقطع امتداد التحدث به كلما رؤيت وليس بواجب كما في الهداية وغيرها وهذا إذا كانت مما لا يؤكل فإن كانت تؤكل جاز اكلها عنده وقالا تحرق ايضاً ، (قوله الظاهر انه يطالب ندباً الخ) اي قولهم يطالب صاحبها ان يدفعها الى الواطىء ليس على طريق الجبر وعبارة النهر و الظاهر انه يطالب على وجه الندب ولذا قال في الخانية كان لصاحبها أن يدفعها إليه بالقيمة اهـ وعبارة البحر والظاهر انه لا يجبر على دفعها . (ردالمحتار : ٣)

وقال في شرح التنوير وكل مباح يؤدي إليه (الى الوجوب) فمكروه . (ردالمحتار : ١ ، اخر باب سجود التلاوة) وقال الطيبي في شرح المشكوٰة تحت حديث ابن مسعود رضي الله عنه فى التزام الانصراف عن اليمين بعد الصلوٰة ان من اصر على مندوب وجعله

عزما ولم يعمل بالرخصة فقد اصاب منه الشيطان اه .

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۵/۵۰۳)

کسی مسلمان کو کافر سے تشبیہ دینے کا حکم:

اس سلسلہ میں ایک سوال وجواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: ایک مولوی صاحب نے ایک صالح حافظ کو کہا کہ تجھ سے ابوجہل اچھا ہے، اس مولوی صاحب کے لیے شرعاً کیا سزا ہے؟ اس کی امامت صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس کا نکاح قائم ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان مولوی صاحب نے کسی خاص صفت میں ابوجہل کو اچھا کہا ہوگا اس میں کوئی گناہ نہیں بلکہ امر واقعی ہے کہ بعض اوصاف میں بعض کافر بعض مسلمانوں سے اچھے ہیں، اگر مولوی صاحب کا یہ مطلب نہیں بلکہ ہر حیثیت سے ابوجہل کو اچھا کہتا ہے تو اس میں دو احتمال ہیں:

۱۔ جس کو ابوجہل کہا اسے حقیقی کافر نہیں سمجھا صرف برا کہنا اور گالی دینا مقصود ہے۔

۲۔ اس کو واقعۃً کافر اور ابوجہل کی طرح مخلد فی النار سمجھے، صورتِ اولیٰ میں یہ لفظ کہنے والا فاسق ہے، اس کی امامت مکروہِ تحریمی ہے اور حاکم اسے مناسب تعزیر دے گا اور دوسری صورت میں یہ شخص کافر ہے، اس لیے اس کا نکاح باطل ہو گیا، غرضیکہ کسی خاص صفت میں تشبیہ سے نہ فاسق اور نہ کافر اور اگر گالی کی نیت سے کہا تو فاسق اور حقیقۃً کافر سمجھا تو خود کافر ہو جائے گا۔ ان احتمالاتِ ثلاثہ کے بارے میں خود متکلم سے تحقیق کی جائے کہ اس کی کیا مراد ہے، جو مراد وہ خود بیان کرے گا اسی کے مطابق اس پر حکم لگایا جائے۔

عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم سباب المسلم فسوق وقتاله كفر .

(بخاري كتاب الآداب : ۲/۸۹۳)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں آپس میں گالی دینا فسق کی علامت ہے اور لڑنا کفر ہے۔

وعن أبي ذر رضي الله عنه انه سمع النبي صلى الله عليه وسلم

يقول لا يرمي رجل رجلا بالفسوق ولا يرميه بالكفر إلا ارتدت عليه ان لم يكن صاحبه كذلك . (حوالهٔ بالا)

اوررسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ کوئی کسی کی طرف فسق یا کفر کی نسبت کرتا ہے اور وہ شخص کافر یا فاسق نہ ہوتو یہ قول کہنے والے کی طرف لوٹ کرآ جاتا ہے۔

وفي شرح التنوير وعزر الشاتم بيا كافر وهل يكفران اعتقد المسلم كافر انعم والا لابه يفتى شرح وهبانية ولو اجابه لبيك كفر خلاصة ، وفي الشامية اي يكفران اعتقاده كافر الا بسبب مكفر قال في النهر وفي الذخيرة المختار للفتوىٰ انه أن اراد الضم ولا يعتقده كفر الا يكفر وان اعتقده كفرا فخاطبه بهذا بناء على اعتقاده انه كافر يكفر لانه لما اعتقده لما اعتقد المسلم كافراً فقد اعتقد دين الإسلام كفرا اهـ . (ردالمحتار باب التعزير : ٢٥٣/٣)

تمامه (ردالمحتار : ١٨٧/٣) وفي التنوير قال الاخر يا زاني فقال الاخر بل انت حدا بخلاف لو قال له مثلاً يا خبيث فقال بل انت، وفي الشامية (قوله مثلاً) اي من كل لفظ غير موجب لحد .

(ردالمحتار : ١٧٨/٣)

شاگردکوسزادینے کاحکم:

استاذ اپنے شاگردوں کوتعزیر دے سکتا ہے، شاگرد خواہ بالغ ہو یا نابالغ، نابالغ کواس لیے کہ اس کے ولی نے استاذ کوتادیب کا مالک بنادیا ہے اور بالغ کواس لیے کہ اس نے خود استاذ کو اس کا اختیار دیا ہے۔

شیخ بھی اسی لیے مرید کوتعزیر دے سکتا ہے کہ مرید بیعت کے ضمن میں شیخ کو ہر قسم کا اختیار دیدیتا ہے۔

قال العلائي رحمه الله تعالىٰ : وفي القنية له إكراه طفله على تعلم قرآن وادب وعلم لفريضته على الوالدين وله ضرب اليتيم فيما يضرب ولده ، وفي الشامية (قوله وفي القنية الخ) وفيها عن الروضة

ولو امر غيره بضرب عبده حل للمأمور به بخلاف الحر قال فهذا تنصيص على عدم جواز ضرب ولد الأمر يامره بخلاف المعلم لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحة والمعلم يضربه بحكم الملك بتمليك ابيه لمصلحة الولد اهـ. (ردالمحتار : ۳/۱۹۵)

علامہ علائیؒ فرماتے ہیں کہ ''قنیہ'' میں ہے کہ باپ کو حق حاصل ہے کہ اپنی اولاد کو قرآن، ادب اور علم فقہ سیکھنے پر مجبور کرے۔ اور جن صورتوں میں اپنی اولاد کی پٹائی کر سکتا ہے یتیم کی بھی کر سکتا ہے، آگے علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے باپ کی طرف سے تادیب کا مالک ہونے کی بناء پر۔

طلبہ کو سزا دینے کے متعلق دارالافتاء علامہ بنوری ٹاؤن اور جامعہ دارالعلوم کراچی کا ایک مصدقہ فتویٰ بھی مع کچھ اضافہ کے ملاحظہ فرمائیے:

''اگر کوئی طالب علم سبق یاد نہیں کرتا اور وقت ضائع کرتا ہے تو اس طالب علم کی اصلاح کے ارادہ سے اس کی مصلحت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے استاذ طالب علم کو ضرب خفیفہ یعنی ہلکی پٹائی کر سکتا ہے۔

كما ذكره صاحب بحر الرائق : ولو أمر غيره بضرب عبده حل للمأمور ضربه بخلاف الحر . قال رضي الله عنه فهذا تنصيص على عدم جواز ضرب ولد الآمر بأمره بخلاف المعلم لأن المأمور يضربه نيابة عن الأب لمصلحته والمعلم يضرب بحكم الملك بتمليك أبيه لمصلحة الولد اهـ. (٥/٤٩)

لیکن استاذ کا طالب علم کو ڈنڈے سے مارنا جائز نہیں، بلکہ ہاتھ سے تین ضرباتِ خفیفہ پٹائی کر سکتا ہے زیادہ پٹائی کی ممانعت ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے مرداس معلم کو فرمایا جب تعلیم کے لیے بھیج رہے تھے کہ تین ضربات سے زیادہ نہ مارنا اگر آپ نے تین ضربات سے زیادہ کسی طالب علم کی پٹائی کی تو اس کا اللہ تعالیٰ آپ سے قصاص لے گا۔

البتہ اگر طالب علم نماز میں سستی کرتا ہے تو تادیباً اس کو ہلکے معمولی ڈنڈے سے تین ضرباتِ خفیفہ پٹائی کر سکتے ہیں کیونکہ شریعتِ محمدیہ میں جہاں بھی کسی جرم پر سزا عائد ہوتی ہے تو وہاں پر

شریعتِ محمدیہ کا مقصد انسدادِ فعل ہوتا ہے۔ اضرار انسان نہیں ہوتا، اور نماز کے علاوہ کسی اور جرم کے ارتکاب میں استاذ کے لیے ڈنڈے کا استعمال جائز نہیں ہے کیونکہ ڈنڈے سے اس مجرم کو مارا جاتا ہے جس نے کسی کی مالی یا جانی نقصان کیا ہو۔

كذا في الشامي : قوله بيد اي ولا يجاوز الثلاث وكذلك المعلم ليس له ان يجاوز لما قال عليه الصلوٰة والسلام : لمرداس معلم اياك أن تضرب فوق الثلاث فانك إذا ضربت فوق الثلاث اقتص الله منك اهـ . اسماعيل عن احكام الصغار للأستروشني وظاهره انه لا يضرب بالعصافي غير الصلاة ايضا قوله لا بخشبة اي عصا ومقتضى قوله بيد أن يراد بالخشبة ما هو الأعم منها ومن السوط افاده ط قوله لحديث استدلال على الضرب المطلق واما كونه لا بخشبة فلان الضرب بها ورد فى جناية المكلف اهـ . (ردالمحتار : ۳۵۲/۱)

نیز یہ کہ طالب علم کو اس کے چہرے پر مارنا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ حضور ﷺ نے چہرے پر مارنے سے منع فرمایا ہے۔

كذا في المشكوٰة : عن ابى هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم قال اذا ضرب احدكم فليتق الوجه .

(رواه ابو داؤد : صـ ۳۱٦)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کسی کو (تعزیراً) مارے تو چہرہ پر نہ مارے۔

پھر استاذ کو سب طلباء کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے غلطی کرنے پر بعض کی پٹائی کرنا اور بعض کو چھوڑ دینا بعض کے ساتھ سختی اور بعض کے ساتھ نرمی کرنا غرض ترجیحی سلوک کرنا جائز نہیں ہے۔

كذا فى الهندية : ان يعدل بين الصبيان إذا تنازعوا وينصف بعضهم من بعض ولا يميل الى الاولاد الاغنياء دون الفقراء .

(عالمگیری : ۳۷۹/۵)

فتاوی ھندیہ میں ہے کہ جب طلبہ کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو سزاء دیتے ہوئے انصاف سے کام لیں، ایسا نہ ہو کہ فقراء کے بچوں کو نظر انداز کر کے اغنیاء کی اولاد کی طرف جھکاؤ کا برتاؤ ہو۔ بے رحمی اور ایسی سختی سے مارنا بھی جائز نہیں ہے، جس سے جسم میں زخم آ جاتا ہو یا نشانات پڑ جاتے ہوں کیونکہ اس کا قیامت کے دن حساب ہوگا۔

كذا في العالمكيريه : إن لا يضرب الصبيان ضربا مبرحا و لا يجاوز الحد فإنه يحاسب يوم القيامة . (عالمگیری : ۳۷۹/۵)

اور اگر ایسی سختی کے ساتھ پٹائی کی جس کی کوئی نظیر شریعت میں نہیں ہے تو ایسی تادیبی پٹائی کرنے میں باجماع فقہاء استاذ پر ضمان آتا ہے۔

كذا في شرح النقاية : ولو ضربه ضربا شديداً لا يضرب مثله في التأديب يضمن بإجماع الفقهاء . (۳۹۹/۲)

نیز اگر طالب علم دردوں کی تاب نہ لا سکا شدید زخمی ہو کر بیمار پڑ گیا یا اس سے مر گیا تو ایسی صورت میں ضمان اور دیت آئے گی۔

كذا في فتح القدير : و كذا المعلم إذا أدب الصبي فمات منه يضمن عندنا و الشافعي . (۱۱۹/۵)

اس دور میں جبکہ لوگ اسلام کی بجائے اور رازموں کے درپے ہیں اور لوگوں کی ذہنیت مغرب کے سانچے میں ڈھل چکی ہے، ان حالات میں ایک مسلمان کا اپنے بچہ یا بچی کو دینی تعلیم کے لیے بھیجنا اور بچہ یا بچی کو علم دین کے لیے وقف کرنا بڑی قابل قدر بات ہے۔

بایں وجہ مدرس یا منتظم کے بے جا ظلم واستبداد کرنے سے طالب علم اگر علم دین سے محروم ہو گیا تو اس کے وبال کا سہرا اس مدرس یا منتظم کے سر پر ہوگا جو بے جا ظلم واستبداد کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ تمام مدرسین کرام اور اساتذہ علوم دینیہ کو صحیح طریقہ تعلیم کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔''

دبر میں بدفعلی کی سزا:

یہ خبیث فعل زنا سے بھی بدتر ہے، شریعت کے علاوہ عقلاً اور طبعاً بھی یہ فعل بہت ہی خبیث ہے، اس خبیث فعل کی ابتداء حضرت لوط علیہ السلام کی قوم نے کی تھی، اس لیے لوگ اس خباثت کو لواطت اور اس کے فاعل خبیث کو لوطی کہتے ہیں، ایسا نہیں کہنا چاہیے ایسے خبیث فعل اور خبیث

فاعل کو اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت لوط علیہ السلام کے نام کی طرف منسوب کرنا خلافِ ادب ہے، اس کی خباثت ایسی فاحشہ ہے کہ دنیا میں کوئی خبیث سے خبیث جاندار بھی ایسی خباثت کی رغبت نہیں رکھتا، یہ ایسا گندہ اور گھناؤنا فعل ہے کہ گندے سے گندے جانوروں کو بھی اس سے نفرت ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی خبیث قوم کو ایسا سخت عذاب دیا کہ ان کی بستی کو اوپر اٹھا کر الٹا کر کے پھینک دیا اور پھر اس پر پتھروں کی بارش برسائی اور ان کے قصہ کو قرآن کریم میں بیان فرما کر رہتی دنیا تک ان کو رسوا کیا اور بتادیا کہ ایسے خبیث لوگوں کی اصل سزا یہی ہے مگر کوئی حکومت یہ سزا دینے پر قادر نہیں، اس لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور آپ کے بعد بعض فقہاء رحمہم اللہ نے اس سے ملتی ہوئی یہ سزا تجویز فرمائی ہے کہ ایسے خبیث کو کسی بلند مقام سے سر کے بل الٹا گرا کر اس پر پتھر برسائے جائیں، اس طرح ہلاک کر دیا جائے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اقتلوا الفاعل و المفعول به .

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایسا خبیث فعل کرنے والے اور کروانے والے دونوں کو (تعزیراً) قتل کرو۔

دوسری حدیث میں ہے:

فارجموا الاعلی والاسفل احصنا اولم یحصنا .

یعنی اوپر نیچے دونوں کو سنگسار کرو، محصن ہو یا نہ ہو۔ (یعنی شادی شدہ ہو یا نہ ہو)

پہلی حدیث حضرت ابن عباس، ابو ہریرہ اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مرفوعاً اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً مروی ہے، یہ حدیث مطلق ہے، یعنی اس میں قیدِ احصان مذکور نہیں۔

دوسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، علاوہ ازیں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً ایسے مجرم کے لیے حدِ زنا مروی ہے۔

چونکہ یہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے، اس لیے حضرت عثمان وعلی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا عدم رفع بھی بحکم رفع ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ایسے خبیث شخص کا حال لکھ کر اس کی سزا دریافت کی، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مشورہ لیا، حضرت عمر، حضرت علی اور دوسرے سب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بالاتفاق آگ میں جلا دینے کا مشورہ دیا، حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہی فیصلہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو لکھا، انہوں نے اس حکم کے مطابق اس کو جلا دیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے دورِ خلافت میں ایسے شخص کو جلا دیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اور اس کی تائید میں حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث سن کر حدِ زنا کے تحت غیر محصن کو سو کوڑے لگوائے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رجم کروایا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محصن کو رجم کروایا اور غیر محصن کو سو کوڑے لگوائے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حدیثِ قتل کے راوی ہیں، مگر آپ کے ہاں طریق قتل یہ ہے کہ کسی بہت بلند مقام سے سر کے بل الٹا گرا کر اس پر پتھر برسائے جائیں، اس کی وجہ اوپر بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط علیہ السلام کو جس عذاب سے ہلاک کیا اس کے ساتھ حتی الامکان مشابہت ہو جائے۔

یہ سب تفصیل ہدایہ، درایہ، نصب الرایہ اور محلی میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر سخت عذاب، حضورِ اکرم ﷺ، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی طرف سے ہلاک کرنے کے مختلف طریقوں کے بیان اور ان کے مطابق حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے فیصلوں کی بناء پر حضرات فقہاء رحمہم اللہ نے بھی اس خبیث فعل پر اسی قسم کی بہت ہی سخت سزائیں بیان فرمائی ہیں۔ ان سزاؤں میں سے جن میں جان سے مار دینے کا حکم ہے یہ شرط ہے کہ کم از کم دو بار یہ فعل کیا ہو۔

البتہ صاحبین رحمہما اللہ اس پر حدِ زنا کے قائل ہیں، اس لیے ان کے ہاں رجم کے لیے تکرارِ فعل شرط نہیں، ایک بار ارتکاب سے بھی رجم کیا جائے گا اور حدِ زنا کے سوا موت کی دوسری سزاؤں میں شادی شدہ ہونا شرط نہیں، غیر شادی شدہ کے لیے بھی موت کی سزا ہے، اس لحاظ سے

کے علاوہ سزاؤں کی نوعیت کے لحاظ سے بھی اس فعل خبیث کی سزا زنا کی سزا سے بھی بہت سخت ہے، حضرات فقہاء رحمہم اللہ کی بیان فرمودہ سزاؤں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ رجم، اگرچہ شادی شدہ نہ ہو۔

۲۔ حدِ زنا لگائی جائے، یعنی شادی شدہ ہو تو بذریعہ رجم ہلاک کر دیا جائے ورنہ سو کوڑے لگائے جائیں۔

۳۔ آگ میں جلا دیا جائے۔

٤۔ اس پر دیوار وغیرہ گرا کر ہلاک کر دیا جائے۔

۵۔ کسی بلند مقام سے الٹا سر کے بل گرا کر اوپر سے پتھر برسائے جائیں حتی کہ مر جائیں۔

٦۔ قتل کیا جائے۔

۷۔ سخت سزا دے کر قید میں رکھا جائے حتیٰ کہ توبہ کرے یا قید ہی میں مر جائے۔

۸۔ بہت بدبودار جگہ میں قید رکھا جائے۔

قال في العلائية ولا يحد بوطء دبر وقالا ان فعل في الاجانب حد وان في عبده او امته اوزوجته فلا حد اجماعا بل يعزر قال في الدرّ بنحو الاحراق بالنار وهدم الجدار والتنكيس من محل مرتفع باتباع الاحجار وفي الحاوي والجلد اصح وفي الفتح يعزر ويسجن حتى يموتٌ او يتوب ولو اعتاد اللواطة قتله الامام سياسة (إلى قوله) وفي البحر حرمتها اشد من الزنا لحرمتها عقلا وشرعا وطبعا والزنا ليس بحرام طبعا وتزول حرمته بتزوج وشراء بخلافها وعدم الحد عنده لا لخفتها بل للتغليظ لانه مطهر على قول، وفي الشامية (قوله حد) فهو عندهما كالزنا في الحكم فيحد جلدا ان لم يكن احصن ورجما ان احصن نهر ، (قوله بنحوا الاحراق الخ) متعلق بقوله يعزر وعبارة الدرر فعند ابى حنيفة رحمه اللّٰه تعالىٰ تعزر بامثال هذا الامور واعترضه في النهر بان الذي ذكره غيره تقييد قتله بما إذا اعتاد ذلك

(الی قوله) قال البیری والظاهر انه یقتل في المرة الثانية لصدق التكرار عليه اهـ. وقال تحت (قوله وفي الحاوي وحبسه في انتن بقعة ردالمحتار: ۳/۱۶۰) (ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

پنچائیت کی طرف سے تعزیر:

اگر چہ پنچایت کسی جرم کی شرعی سزا دینے پر قادر نہیں معہذا اس پر حسبِ قدرت تغییر المنکر فرض ہے، نیز تادیبی کارروائی کے لیے جرم پر شرعی نصابِ شہادت ضروری نہیں، بلکہ قرائن قویہ کی بناء پر تادیب شرعاً جائز ہے، لہٰذا پنچائیت تادیب وتنبیہ کے لیے ناتمام شہادت اور قرائن وآثارِ قویہ کی بناء پر بھی معاشرتی مقاطعہ کا فیصلہ کر سکتی ہے اگر چہ شرعی نصابِ شہادت موجود نہ ہو۔

بالغ اولاد کو تعزیر:

باپ کی طرف سے بالغ اولاد کو بھی تعزیر دی جا سکتی ہے، بلکہ والد نہ ہو تو دوسرے اقارب بھی تعزیر دے سکتے ہیں۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالیٰ: فی الحضانة والغلام إذا عقل واستغنى برأيه ليس للاب ضمه الى نفسه إلا إذا لم يكن مأمونا على نفسه فله ضمه لدفع فتنة او عار و تأديبه إذا وقع منه شیء وفي الشامية تحت قوله والغلام إذا عقل الخ المراد الغلام البالغ لان الكلام فيما بعد البلوغ وعبارة الزيلعي ثم الغلام إذا بلغ رشيداً فله ان ينفرد إلا ان يكون مفسداً خوفا عليه الخ

علامہ حصکفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب لڑکا بالغ ہو جائے اب باپ اس کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتا بلکہ اس کو اختیار ہوگا کہ کھانا، پینا، رہائش باپ کے ساتھ رکھے یا الگ رکھے، ہاں البتہ وہ لڑکا اپنے نفس پر مامون نہ ہو فتنہ کا اندیشہ ہو تو باپ کو حق ہوگا فتنہ اور عار سے بچنے اور ادب سکھانے کے لیے اس کو اپنے گھر میں رکھے۔

(قوله فله ضمه) اي للاب ولاية ضمه اليه والظاهر انِ الجد كذلك بل غيره من العصبات كالاخ والعم ولم ارمن صرح بذلك ولعلهم اعتمدوا على أن الحاكم لا يمكنه من المعاصي وهذا في

زمانـنـا غيـر واقـع فنعين الافتاء بولاية ضمه لكل من يؤتمن عليه من اقـاربـه ويـقـدر عـلـى حفظه فان دفع المنكر واجب على كل من قدر عـلـيـه لا سيـمـا مـن يـلـحـقه عاره وذلك ايضا من اعظم صلة الرحم والشـرع امـر بصلتها وبدفع المنكر ما امكن قال تعالىٰ ﴿ إن الله يأمر بـالـعـدل والاحسـان وإيتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والـبـغـى يعظكم لعلكم تذكرون ﴾ ثم رأيت في حاشية البحر للرملي ذكر ذلك بحثا ايضا الخ .

(ردالمحتار : ٢/٦٩٧) (ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

قصاص کے احکام:

قصاص کے لفظی معنی مماثلت کے ہیں، مراد یہ ہے کہ جتنا ظلم کسی نے کسی پر کیا اتنا ہی بدلہ لینا دوسرے کے لیے جائز ہے، اس سے زیادتی کرنا جائز نہیں۔

کقوله تعالیٰ : ﴿ فاعتدوا عليه بمثل ما اعتدىٰ عليكم ﴾

(٢١ : ١٩٤)

اسی لیے اصطلاحِ شرع میں قصاص کہا جاتا ہے قتل کرنے زخم لگانے کی اس سزا کو جس میں مساوات اور مماثلت کی رعایت کی گئی ہو۔

قتل عمد کی تعریف:

قتل عمد وہ ہے کہ ارادہ کر کے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جائے، قصاص یعنی جان کے بدلے جان لینا ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے۔

قانونِ قصاص:

﴿ يـايـهـا الـذيـن آمـنـوا كتـب عليكم القصاص في القتلىٰ الحر بالحر والعبد بالعبد والأنثى بالأنثى ﴾ (سورة البقرة : ١٧٨)

''اے ایمان والو! تم پر قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جائے بہ دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں اور اسی طرح غلام غلام کے عوض میں

اور عورت عورت کے عوض میں۔''

اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے گا، عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کے بجائے بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں۔ (معارف القرآن)

قصاص کے قواعد واصول:

١۔ اگر وارث قاتل پر قادر نہیں تو حکومت پر لازم ہے کہ قاتل کو پکڑ کر ولی مقتول کے حوالہ کرے۔

٢۔ اگر کسی ایک وارث نے قاتل کو قتل کر دیا تو بھی قصاص ادا ہو گیا، باقی وارثوں کو حق اعتراض نہیں، یعنی جبکہ کسی وراث نے معاف نہ کیا ہو، معاف کرنے کی تفصیل آگے نمبر ١٣ و ١٤ میں آرہی ہے۔

٣۔ اگر وارثوں میں بعض چھوٹے ہوں اور بعض بڑے تو قتل عمد موجب قصاص میں بڑوں کو قصاص لینے کا حق ہے۔ چھوٹے وارثوں کے بلوغ کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔

٤۔ اگر سب وارث چھوٹے ہوں یا مجنون ومعتوہ ہوں تو کوئی اجنبی شخص قاتل کو قصاصاً قتل نہیں کر سکتا، بھائی اور چچا اگر ارث سے محروم ہوں تو وہ بھی اجنبی کے حکم میں ہیں اور اس صورت میں حاکم قصاص لے گا۔

٥۔ قصاص لینے کا حق ان لوگوں کو ہے جن کو میت کے ترکہ سے حصہ ملتا ہے۔

٦۔ اولیاء میں قتیل کا والد موجود ہو تو بوقت اخذ قصاص اولیاء میں سے کسی دوسرے کا موجود ہونا ضروری نہیں اور اگر والد موجود نہ ہو تو سب اولیاء کا موجود ہونا ضروری ہے۔

٧۔ توکیل کی صورت میں بوقت قصاص موکل کا موجود ہونا ضروری ہے، ولی قصاص کسی کو وکیل بنا کر مجلس قصاص سے غائب ہو گیا تو قصاص لینا جائز نہیں۔

٨۔ قتل موجب دیت میں دیت ورثہ میں بقدر حصص تقسیم ہوگی۔

٩۔ قتل موجب دیت میں اگر وارثوں میں سے بعض چھوٹے ہوں تو بڑے کو پوری دیت لینا جائز نہیں، وہ صرف اپنا حصہ لے سکتا ہے۔

١٠۔ اگر ولی مقتول نے کسی اجنبی کو حکم دیا اور اس حکم دینے پر گواہ موجود ہوں یا لوگوں میں علی الاعلان حکم دیا ہو تو وہ ولی کی موجودگی میں قاتل کو قتل کر سکتا ہے۔

۱۱۔ اگر شاہد موجود نہ ہوں اور اجنبی نے قاتل کو قتل کر دیا پھر ولی مقتول کہتا ہے کہ میں نے حکم دیا تھا تو اسکا قول معتبر نہیں ہوگا، بلکہ اجنبی سے قصاص لیا جائے گا۔

۱۲۔ اگر کسی اجنبی نے قاتل کو قتل کر دیا یا وہ مر گیا تو مقتول اول کے ورثہ کا حق ساقط ہو جاتا ہے، وہ مقتول ثانی کے ورثہ پر یا ترکہ پر کسی قسم کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

۱۳۔ اگر کوئی وارث اپنا حق قصاص معاف کر دے تو قصاص ساقط ہو جائے گا، باقی ورثہ قصاص نہیں لے سکتے بلکہ دیت لیں گے۔

۱٤۔ اگر کسی وارث کے معاف کر دینے کے باوجود دوسروں نے قصاص لے لیا تو اگر قصاص لینے والے کو یہ معلوم تھا کہ بعض وارثوں کا معاف کرنا مسقط قصاص ہے تو قصاص لینے والے سے قصاص لیا جائے گا اور اگر معلوم نہیں تھا تو قصاص نہیں بلکہ اس کے مال میں دیت آئے گی۔

حکومت کے فیصلہ کے بغیر قصاص لینے کا حکم:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قصاص لینے کا حق اگر چہ اولیاء مقتول کا ہے، مگر باجماع امت ان کو اپنا یہ حق خود وصول کرنے کا اختیار نہیں کہ خود ہی قاتل کو مار ڈالیں بلکہ اس حق کو حاصل کرنے کے لیے کسی مسلمان حاکم یا اس کے نائب کا فیصلہ ضروری ہے کیونکہ قصاص کس صورت میں واجب ہوتا ہے کس میں نہیں اس کی جزئیات بھی دقیق ہیں، جن کو ہر شخص معلوم نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ اولیاء مقتول اپنے غصہ میں مغلوب ہو کر کوئی زیادتی بھی کر سکتے ہیں اس لیے باتفاق علماءِ امت حق قصاص حاصل کرنے کے لیے اسلامی حکومت کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ قرطبی (معارف القرآن: ۱/ ۴۳۷)

ورثہ میں سے کچھ نابالغ ہوں تو قصاص کا حکم:

اگر مقتول کے ورثاء میں سے ایک دو نابالغ ہوں تو قصاص لینے کے لیے ان کے بلوغ کا انتظار کرنا ضروری نہیں فی الحال قصاص لینا جائز ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وللكبار القود قبل كبر الصغار خلافا لهما والاصل ان كل ما لا يتجزى إذا وجد سببه كاملا ثبت لكل على الكمال كولاية انكاح وامان الا اذا كان الكبير اجنبيا

عن الصغير فلا يملك القود حتى يبلغ الصغير اجماعا زيلعى فليحفظ .

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ : (قوله خلافا لهما) فعندهما ليس لهم ذلك إلا ان يكون الشريك الكبيرا بالصغير نهاية و قاساه على ما إذا كان مشتركا بين كبيرين واحدهما غائب (قوله والاصل الخ) استدلال لقول الإمام قال فى الهداية وله انه حق لا يتجزي لثبوته بسبب لا يتجزي وهو القرابة واحتمال العفو من الصغير منقطع اي فى الحال فيثبت لكل واحد كملا كما في ولاية الانكاح بخلاف الكبيرين لان احتمال العفو من الغائب ثابت اهـ .

(ردالمحتار : ٣٤٧/٥)

قاتل کے رشتہ دار کو قتل کرنا:

اگر کسی نے کسی شخص کو ناحق قتل کر دیا اب وہ قاتل ہاتھ نہیں آرہا ہے اس لیے اولیاء مقتول قاتل کے کسی رشتہ دار کو پکڑ کر قتل کر دیتے ہیں تو یہ شرعاً بہت بڑا گناہ ہے، شرعاً یہ جائز نہیں کہ قاتل کے بدلہ میں کسی اور کو قتل کر دے۔ قصداً ایسا کرنے کی صورت میں قصاصاً اس قاتل ثانی کو بھی قتل کیا جائے گا۔

کتاب الدیات والحدود

کسی کو خطا غلطی سے قتل کر دے یا ہو جائے تو قصاص کے بجائے مقتول کے اولیاء دیت وصول کرنے کے حقدار ہوتے ہیں۔ یہ دیت قاتل کے عاقلہ پر واجب ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں:

دیت و عاقلہ کی تفصیل:

دیت کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ دس ہزار درہم چاندی یا اس کی قیمت، ایک درہم: ۳٫۴۰۲ گرام، دس ہزار درہم: ۳۴٫۲۰ کلوگرام۔

۲۔ ایک ہزار دینار سونا یا اس کی قیمت، ایک دینار: ۴٫۸۶ گرام، ہزار دینار: ۴٫۸۶

کلوگرام

۳۔ سو اونٹ یا ان کی قیمت، یہ اونٹ پانچ قسم کے ہوں گے:

(۱) یک سالہ بیس اونٹنیاں۔

(۲) یک سالہ بیس اونٹ۔

(۳) دو سالہ بیس اونٹنیاں۔

(٤) تین سال کی بیس اونٹنیاں۔

(٥) چار سالہ بیس اونٹنیاں۔

تعدادِ مذکور مرد کی دیت ہے، عورت کی دیت اس سے نصف ہے، اس میں اختلاف ہے کہ دیت کی ان انواع میں سے کسی ایک کی تعیین کا اختیار قاتل کو ہے یا قاضی کو؟ قول اول راجح معلوم ہوتا ہے، معہذا قولِ ثانی کے مطابق قاضی نے تعیین کر دی تو جائز اور نافذ ہے۔

عاقلہ کی تفصیل:

اگر قاتل اہل دیوان سے ہو تو اس کے عاقلہ اہل دیوان ہیں: یعنی وہ عاقل، بالغ، مرد جن کے نام سرکاری دفتر میں اس لیے درج ہوں کہ وہ کسی خدمت کے عوض یا بوجہ ضرورت سرکاری خزانہ سے وظیفہ پا رہے ہوں، اس لیے ان کو اہل عطا بھی کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے اہل دیوان کی وہ جماعت جس سے قاتل کا تعلق ہو۔ دیت وصول کرنے کی آئندہ تفصیل کے مطابق اگر یہ جماعت کافی نہ ہو تو اس سے اوپر کی جماعت کو شامل کیا جائے گا، پھر اس سے اوپر کی جماعت کو۔

اس دور میں سرکاری دفاتر میں عورتوں کی ملازمت عام ہے، بنظر تفقہ ان دیوانی عورتوں کو عاقلہ میں شمار کرنا چاہیے۔

عاقلہ کا مدار تناصر پر ہے، اس زمانہ میں تناصر کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً سیاسی جماعتیں، اہل حرفت، صنعتکاروں، تاجروں اور مزدوروں وغیرہ کی تنظیمیں، لہٰذا اگر قاتل کسی سیاسی جماعت یا کسی تنظیم کا رکن ہوگا تو اس کی عاقلہ یہ جماعت یا تنظیم ہوگی۔

اگر قاتل اہل دیوان سے نہ ہو اور کسی تنظیم یا سیاسی جماعت کا رکن بھی نہ ہو تو اس کے عاقلہ اس کے عصبات ہیں اور ان پر وجوبِ دیت علی ترتیب الارث ہے، پہلے ابناء پھر آباء پھر بھائی، پھر بھتیجے پھر چچے، پھر چچازاد۔

قاتل سے بھی حصہ دیت وصول کیا جائے گا، خواہ وہ اہل دیوان سے ہو یا نہ ہو۔

واضطربت اقوال الفقهاء رحمهم الله تعالیٰ في ذلك والصحيح ما حررنا .

نساء وصبیان ومجانین پر دیت نہیں، اگرچہ قاتل ہوں۔

اگر قاتل کے عاقلہ نہ ہوں تو بیت المال سے تین سالوں میں دیت اداء کی جائے گی، بشرطیکہ قاتل مسلم ہو، اور اس کا کوئی وارث معروف نہ ہو، مثلاً لقیط ہو یا کوئی حربی اسلام لے آیا ہو، اگر قاتل ذمی ہو یا اس کا کوئی معروف وارث ہو، خواہ کتنا ہی بعید ہو یا بوجہ رق یا کفر محروم ہی ہو تو دیت بیت المال میں نہیں بلکہ قاتل کے اپنے مال میں ہے، اسی طرح بیت المال میں دیت ہونے کی صورت میں اگر بیت مال موجود نہ ہو یا اس میں گنجائش نہ ہو تو دیت قاتل کے مال میں ہوگی جو تین سالوں میں وصول کی جائے گی۔

دیت وصول کرنے کا طریقہ:

دیت تین سال میں وصول کی جائے گی، ایک شخص سے ایک سال میں ۵۳٦ء۴ گرام سے زیادہ نہیں لیے جائیں گے۔

بچہ ماں کے نیچے دب کر مر گیا:

ایک عورت بچے کو ساتھ لٹا کر سوگئی، سوتے میں غیر شعوری طور پر اس کے پہلو کے نیچے دب گیا اور سانس بند ہو کر مر گیا تو اس کے احکام کی تفصیل یہ ہے کہ:

۱۔ ماں بے احتیاطی کی وجہ سے بہت سخت گناہ گار ہوئی اس پر توبہ واجب ہے۔

۲۔ کفارہ یعنی ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا، اس پر قدرت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے قمری ماہ کی پہلی تاریخ کو شروع کرے تو چاند کے حساب سے دو ماہ شمار ہوں گے ورنہ ساٹھ روزے پورے کرے۔

۳۔ ماں بچہ کی میراث سے محروم ہے، دیت بھی بچہ کی میراث میں داخل ہے۔

٤۔ اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہے۔

شادی کی تقریب میں فائرنگ:

سوال: شادی کی ایک تقریب میں کچھ لوگوں نے ہوائی فائرنگ کی، اتفاق سے ایک شخص کو

گولی لگ گئی اور وہ مر گیا اس کا کیا حکم ہے؟ اس کی دیت واجب ہے یا نہیں، اگر پوری دیت کی بجائے پانچ دس ہزار روپے پر اتفاق ہو جائے تو صحیح یا نہیں؟ ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ دیت یا کچھ رقم پر صلح کا حکم اس وقت ہے جس جان بوجھ کر مارا ہو، اگر جان بوجھ کر نہیں مارا تو روپے لینا دینا جائز نہیں، شریعت کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قتل خطا ہے جس کے احکام یہ ہیں:

۱۔ عاقلہ پر دیت۔

۲۔ قاتل پر کفارہ، یعنی ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اس کی قدرت نہ ہو تو دو ماہ کے مسلسل روزے۔

۳۔ توبہ واستغفار۔

سوال میں صلح کی مذکورہ صورت جائز ہے لیکن روپے مجلس صلح ہی میں دینا ضروری ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: وموجبه اي موجب هذا النوع من الفعل وهو الخطأ وما جري مجراه الكفارة والدية على العاقلة والاثم دون اثم القتل إذا الكفارة تؤذن بالاثم لترك العزيمة.

(ردالمحتار: ٥/٣٤٢)

وقال في الصلح: لو صالح بغير مقاديرها صح كيف ما كان بشرط المجلس لئلا يكون دينا بدين. (ردالمحتار: ٤/٤٧٦)

باقی اسلحہ کے ساتھ کھیلنا اور بے احتیاطی کے ساتھ چلانا یہ بھی بڑا گناہ ہے، جبکہ حدیث کی رو سے کسی مسلمان کی طرف اسلحہ سے اشارہ کرنا بھی ممنوع ہے، چہ جائیکہ اس طرح غلط استعمال کیا جائے جو کسی کی جان تلف ہونے کا سبب بنے اس لیے خوب خوب احتیاط کی ضرورت ہے۔

بس سے کچلنے کا حکم:

بس وغیرہ گاڑیوں کے تصادم سے کوئی شخص مارا جائے تو یہ قتل خطا شمار ہوگا، ڈرائیور پر کفارہ اور اس کے عاقلہ پر دیت واجب ہوگی عاقلہ اور دیت کی تفصیل عنوان ''دیت و عاقلہ کی تفصیل'' کے تحت گزر چکی ہے۔

حدود و کفارۂ سیئات نہیں:

حدِ شرعی مثلاً حدِ قذف، حدِ شربِ خمر، حدِ زنا جاری ہونے کے بعد مرتکبِ جرم بدون توبہ

مؤاخذہ اخرویہ سے نہیں چھوٹ سکتا اس کے لیے توبہ واستغفار ضروری ہے۔

کسی کے ہاتھ سے بچہ گر کر مر گیا:

اگر کوئی شخص شفقت و پیار سے اپنے بچہ سے کھیل رہا ہو کہ اچانک بچہ اس کے ہاتھ سے گر کر ہلاک ہو جائے تو شرعاً یہ قتل جاری مجرائے خطا ہے، اس کا حکم یہ ہے:

۱۔ توبہ ۲۔ عاقلہ پر دیت

۳۔ کفارہ ٤۔ حرمان عن الارث

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ : والرابع ما جري مجراه اي مجري الخطأ (الى قوله) وموجبه اي موجب هذا النوع من الفعل وهو الخطأ وما جري مجراه الكفارة والدية على العاقلة والاثم دون اثم القتل إذا الكفارة تؤذن بالاثم لترك العزيمة .

(ردالمحتار : ٥/ ٣٤٢)

وفي الهندية : وعن ابن القاسم في الوالدين إذا لم يتعاهد الصبي حتى سقط من سطح ومات او احترق بالنار لا شيء عليهما الا التوبة والاستغفار واختيار الفقيه ابى الليث رحمه الله تعالىٰ على انه لا كفاره عليهما ولا على احدهما الا ان يسقط من يده والفتوىٰ على ما اختاره ابو الليث رحمه الله تعالىٰ كذا فى الظهيرية .

(عالمگيرية : ٦/ ٣٣)

فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ ماں باپ نے بچہ کا خیال نہیں رکھا، یہاں تک وہ چھت سے گر کر مر گیا، یا آگ میں جل گیا دونوں پر توبہ واستغفار لازم ہے اس سے زائد کچھ لازم نہیں، فقیہ ابو اللیث فرماتے ہیں، مذکورہ صورتوں میں تو کفارہ لازم نہیں البتہ بے احتیاطی کی وجہ سے بچہ ہاتھ سے گر کر مر جائے تو کفارہ لازم ہوگا اور فتویٰ فقیہ ابو اللیث کے قول پر ہے۔

جماع موجب اسقاط کا حکم:

ایک شخص اپنی حاملہ بیوی سے جماع کرتا ہے جس سے حمل ساقط ہو جاتا ہے حالانکہ اس کو معلوم بھی ہے کہ اس سے حمل ساقط ہو جائے گا تو اس شخص پر کفارہ لازم ہوگا یا نہیں؟ حاملہ پر بھی

کفارہ ہوگا یا نہیں؟ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر جماع بطریق معروف کیا تو اس پر ضمان نہیں اگر غیر معروف طریقہ سے کیا اور زوجہ نے کوئی ایسی حرکت کی جو عموماً موجب اسقاط ہوتی ہے اور بنیت اسقاط کی تو زوجہ کے عاقلہ پر ضمان غرہ واجب ہے جس کی مقدار یہ ہے:

۵۰۰ درہم: ۱۰۷ء اکلوگرام چاندی ایک سال میں۔

حاصل یہ کہ عاقلۂ زوجہ پر وجوبِ ضمان کے لیے تین شرائط ہیں:

۱۔ ایسی حرکت کی ہو جو عموماً مسقط ہو۔

۲۔ بدونِ اذن زوج ہو۔

۳۔ بنیتِ اسقاط ہو۔

اور اگر زوج نے ایسی حرکت کی ہو جو عموماً مسقط ہوتی ہے تو اس کے عاقلہ پر ضمان غرہ ہے، اس میں نیت اسقاط شرط نہیں۔

باقی بعض لوگ حالتِ حمل میں جماع کو ناجائز سمجھتے ہیں یہ خیال غلط ہے، البتہ قصداً ایسا کوئی طریقہ اختیار کرنا درست نہیں جس سے حمل کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یا کوئی ماہر ڈاکٹر عورت کے معاینہ کے بعد جماع کو نقصان قرار دے تب بھی اجتناب کیا جائے گا۔

عوام کو اجراءِ حد کا اختیار نہیں:

جتنی حدود ہیں، حدِ زنا، حدِ سرقہ، شرب خمر وغیرہ اجرائے حدود کا اختیار امام یا اس کے نائب کو ہے، عوام کو اس کا اختیار نہیں۔

قال الإمام الكاساني رحمه الله تعالىٰ: واما شرائط جواز اقامتها فمنها ما يعم الحدود كلها ومنها ما يخص البعض دون البعض اما الذي يعم الحدود كلها فهو الامامة وهوان يكون المقيم للحد هو الامام اومن ولاه الامام وهذا عندنا (وبعد سطر) وبيان ذلك ان ولاية اقامة الحد انما ثبت للامام لمصلحة العباد وهي صيانة انفسهم واموالهم واعراضهم لان القضاة يمتنعون من التعرض خوفا من اقامة الحد عليهم والمولى لا يساوي الامام في هذا المعنى لان ذلك يقف على الامامة والامام قادر على الاقامة لشوكته ومنعته وانقياد الرعية له

قهرا وجبرا ولا يخاف تبعة الجناة واتباعهم لانعدام المعارضة بينهم وبين الامام وتهمة الميل والمحاباة والتواني عن الاقامة منتفية في حقه فيقيم على وجهها فيحصل الغرض المشروع له الولاية بيقين.

(بدائع الصنائع : ۵۷/۷) (ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ۵۵/۸)

حدِ قذف معاف کرنے سے ساقط نہیں ہوتی:

اگر کسی شخص پر تہمت لگائی گئی بعد میں شہادت وغیرہ کے ذریعہ ثابت نہ ہو سکی تو تہمت لگانے والے کو حد لگائی جائے گی، یہ حد مقذوف (یعنی متہم شخص) کے معاف کرنے سے ساقط نہ ہوگی۔

اس سلسلہ میں ایک سوال و جواب احسن الفتاویٰ ۸/ ۵۵ سے کچھ تغیر کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

سوال: قرآن کریم کا حکم ہے کہ جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں ان کو اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت قبول نہ کرو، وہ خود ہی فاسق ہیں، اگر کوئی پاک مردوں پر تہمت لگائے پھر ثابت نہ کر سکے تو اس پر بھی حد جاری ہوگی کیا اس صورت میں مردوں کو عدالت میں فیصلہ لانے کا حق ہے؟ کیا یہ صحیح ہے کہ جب مقذوف عدالت میں آئے تو قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ الزام ثابت کرے اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حد جاری ہوگی اور عدالت میں آنے کے بعد نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود صاحبِ معاملہ، نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے، نہ توبہ کر کے اور نہ معافی مانگ کر سزا سے بچ سکتا ہے؟ بینوا توجروا

جواب: سوال میں مذکورہ تفصیل صحیح ہے، مردوں کو بھی حدِ قذف طلب کرنے کا حق ہے اور مقذوف یا عدالت کے معاف کرنے سے حدِ قذف ساقط نہیں ہوتی، البتہ عفو مقذوف کی صورت میں صاحبِ حق کی طرف سے عدم طلب کی وجہ سے حد نہیں لگائی جائے گی۔ عفو مقذوف صحیح نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بعد العفو بھی اس کو طلبِ حد کا اختیار ہے، یعنی ایک دفعہ معاف کرنے کے بعد دوبارہ حدِ قذف کا مطالبہ کرے تو شرعاً اس کو حق حاصل ہے۔

قال العلامة الحصكفي رحمه الله تعالىٰ: ولا ارث فيه خلافا للشافعي ولا رجوع بعد اقرار ولا اعتياض اي اخذ عوض ولا صلح ولا عفو فيه وعنه نعم لو عفا المقذوف فلا حد لا لصحة العفو بل لترك الطلب حتى لو عاد وطلب حد شمني ولذا الايتم الحد الا

بحضرته. (ردالمحتار: ۱۷۳/۳)

ڈاکہ ڈالنے کی سزا:

ہر مسلمان کی جان و مال محترم ہے، اس کو باطل طریقہ پر کھانا ناجائز اور حرام ہے، دوسرے کا مال ناحق طور پر کھانے کی ایک صورت ڈاکہ زانی لوٹ مار بھی ہے، یہ انتہائی قبیح فعل اور صریح ظلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

من انتهب نهبة مشهورة فليس منا . رواه ابو داؤد

(مشكوٰة: صـ ۳۱۳)

یعنی جس نے دوسرے کی کوئی چیز لوٹ لی وہ ہم میں سے نہیں۔ (ترمذی)

وقوله عليه السلام: إلا لا تظلموا إلا لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه. (مشكوٰة)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ: سنو ظلم مت کرو، سنو! کسی کا مال بغیر اس کی دلی رضا مندی کے حلال نہیں۔ (بیہقی)

لیکن اگر کسی شخص یا جماعت نے یہ جسارت کرلی تو یہ گناہ اور حرام ہونے اور آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی اس پر حد بھی جاری ہوگی، اس حد کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الارض فسادا ان يقتلوا أو يصلبوا او تقطع ايديهم وارجلهم من خلاف أو ينفوا من الارض ﴾

''یہی سزا ہے ان کی جو لڑتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں یا دور کردیئے جائیں اس جگہ سے۔ یہ ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ مگر جو لوگ قبل اس کے کہ تم ان کو گرفتار کرو توبہ کرلیں تو جان لو بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی شہرۂ آفاق تفسیر

معارف القرآن میں لکھتے ہیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں؟ لفظ ''محاربہ'' حرب سے ماخوذ ہے اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں اور محاورات میں یہ لفظ سلم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی امن اور سلامتی کے ہیں، تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اکا دکا چوری یا قتل وغارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل وغارت گری پر کھڑی ہو جائے، اسی لیے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے، اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جا سکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنے والے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں۔ تفسیر مظہری

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ اس آیت میں محاربہ کو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ ڈاکو یا بغاوت کرنے والے جو مقابلہ یا محاربہ کرتے ہیں وہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ کوئی طاقت ور جماعت جب طاقت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون کو توڑنا چاہے تو اگر چہ ظاہر میں اس کا مقابلہ عوام اور انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کی جنگ حکومت کے ساتھ ہے اور اسلامی حکومت میں جب قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نافذ ہو تو یہ محاربہ بھی اللہ ورسول ﷺ ہی کے مقابلہ میں کہا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس سزا کا ذکر ہے یہ ان ڈاکوؤں اور باغیوں پر عائد ہوتی ہے جو اجتماعی قوت کے ساتھ حملہ کر کے امن عامہ کو برباد کریں اور قانونِ حکومت کو علانیہ توڑنے کی کوشش کریں اور ظاہر ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہے، مال لوٹنے، آبرو پر حملہ کرنے سے لے کر قتل وخونریزی تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں، اسی سے مقاتلہ اور محاربہ میں فرق معلوم ہو گیا کہ لفظ مقاتلہ خونریزی لڑائی کے لیے بولا جاتا ہے گو کوئی قتل ہو یا نہ ہو اور گو ضمناً مال بھی لوٹا جائے اور لفظ محاربہ طاقت کے ساتھ بدامنی پھیلانے اور سلامتی کو سلب کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے یہ لفظ اجتماعی طاقت کے ساتھ عوام کی جان ومال وآبرو میں سے کسی چیز پر دست درازی کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جس کو رہزنی، ڈاکہ اور بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس جرم کی سزا قرآن کریم نے خود متعین فرمادی اور بطورِ حق اللہ یعنی سرکاری جرم کے نافذ کیا ہے جس کو اصطلاحِ شرع میں حد کہا جاتا ہے، اب سنیئے کہ ڈاکہ اور رہزنی کی شرعی سزا کیا ہے؟ آیتِ مذکورہ میں رہزنی کی چار سزائیں مذکور ہیں:

﴿ أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم وأرجلهم من خلاف أو ينفوا من الارض ﴾

یعنی ان کو قتل کیا جائے یا سولی چڑھایا جائے ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیے جائیں یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے۔

ان میں سے پہلی تین سزاؤں میں مبالغہ کا لفظ باب تفعیل سے استعمال فرمایا جو تکرارِ فعل اور شدت پر دلالت کرتا ہے اس میں صیغہ جمع استعمال فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرمادیا کہ ان کا قتل یا سولی چڑھانا یا ہاتھ پاؤں کاٹنا عام سزاؤں کی طرح نہیں کہ جس فرد پر جرم ثابت ہو صرف اسی فرد پر سزا جاری کی جائے بلکہ یہ جرم جماعت میں سے ایک فرد سے بھی صادر ہو گیا تو پوری جماعت کو قتل یا سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔

نیز اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ قتل وصلب وغیرہ قصاص کے طور پر نہیں کہ اولیاءِ مقتول کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائے بلکہ یہ حد شرعی بحیثیت حق اللہ کے نافذ کی گئی ہے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے وہ معاف بھی کر دیں تو شرعاً سزا معاف نہ ہوگی۔ یہ دونوں حکم بصیغہ تفعیل ذکر کرنے سے مستفاد ہوئے۔ تفسیر مظہری وغیرہ

رہزنی کی یہ چار سزائیں حرف أو کے ساتھ ذکر کی گئی ہیں، جو چند چیزوں میں اختیار دینے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اور تقسیم کار کے لیے بھی، اسی لیے فقہاءِ امت صحابہ و تابعین کی ایک جماعت حرف أو کو تخییر کے لیے قرار دے کر اس طرف گئی ہے کہ ان چار سزاؤں میں امام و امیر کو شرعاً اختیار دیا گیا ہے کہ ڈاکوؤں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت پر نظر کر کے ان کے حسبِ حال یہ چاروں سزائیں یا ان میں سے کوئی ایک جاری کرے۔

سعید بن میتب، عطاء رضی اللہ عنہم، داؤد، حسن بصری، ضحاک نخعی، مجاہد اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ میں سے امام مالک رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے اور امام ابوحنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور ایک جماعت صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم و تابعین رحمہم اللہ نے حرف أو کو اس جگہ تقسیم کار کے معنی میں لے کر

آیت کا مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ رہزنوں اور رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں، اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابو بردہ اسلمی سے معاہدہ صلح کا فرمایا تھا، مگر اس نے عہد شکنی کی اور کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے مدینہ طیبہ آرہے تھے ان پر ڈاکہ ڈالا، اس واقعہ میں جبرئیل امین یہ حکم سزا لے کر نازل ہوئے کہ جس شخص نے کسی کو قتل بھی کیا اور مال بھی لوٹا اس کو سولی چڑھایا جائے اور جس نے صرف قتل کیا مال نہیں لوٹا اس کو قتل کیا جائے اور جس نے کوئی قتل نہیں کیا صرف مال لوٹا ہے اس کے ہاتھ پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیے جائیں اور جو ان میں سے مسلمان ہو جائے اس کا جرم معاف کر دیا جائے اور جس نے قتل و غارت گری کچھ نہیں کیا صرف لوگوں کو ڈرایا جس سے امن عامہ مختل ہو گیا اس کو جلا وطن کیا جائے، اگر ان لوگوں نے دارالاسلام کے کسی مسلمان یا غیر مسلم شہری کو قتل کیا ہے مگر مال نہیں لوٹا تو ان کی سزا ﴿ ان یقتلوا ﴾ یعنی ان سب کو قتل کر دیا جائے اگر چہ فعل قتل بلا واسطہ صرف بعض افراد سے صادر ہوا ہو، اور اگر کسی کو قتل بھی کیا مال بھی لوٹا تو ان کی سزا ﴿ یصلبوا ﴾ ہے، یعنی ان کو سولی چڑھا دیا جائے، جس کی صورت یہ ہے کہ ان کو زندہ سولی پر لٹکایا جائے، پھر نیزہ وغیرہ سے پیٹ چاک کیا جائے اور اگر ان لوگوں نے صرف مال لوٹا ہے کسی کو قتل نہیں کیا تو ان کی سزا ﴿ او تقطع ایدیهم وارجلهم من خلاف ﴾ ہے، یعنی ان کے داہنے ہاتھ گٹوں پر سے اور بائیں پاؤں ٹخنے پر سے کاٹ دیے جائیں اور اس میں بھی یہ مال لوٹنے کا عمل بلا واسطہ اگر چہ بعض سے صادر ہوا ہو، مگر سزا سب کے لیے ہوگی، کیونکہ کرنے والوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ساتھیوں کے تعاون و امداد کے بھروسہ پر کیا ہے، اس لیے سب شریکِ جرم ہیں اور اگر ابھی تک قتل و غارت گری کا کوئی جرم ان سے صادر نہیں ہوا تھا، کہ پہلے ہی گرفتار کر لیے گئے تو ان کی سزا ﴿ أو ينفوا من الارض ﴾ ہے، یعنی ان کو زمین سے نکال دیا جائے۔

جلاوطنی کی صورتیں:

زمین سے نکالنے کا مفہوم ایک جماعتِ فقہاء کے نزدیک یہ ہے کہ ان کو دارالاسلام سے نکال دیا جائے، اور بعض کے نزدیک یہ ہے کہ جس مقام پر ڈاکہ ڈالا ہے وہاں سے نکال دیا جائے، حضرت فاروق اعظم نے اس قسم کے معاملات میں یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر مجرم کو یہاں سے نکال کر دوسرے شہروں میں آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہاں کے لوگوں کو ستائے گا اس لیے ایسے مجرم کو

قید خانہ میں بند کر دیا جائے یہی اس کا زمین سے نکالنا ہے کہ زمین میں کہیں چل پھر نہیں سکتا، امام اعظم رحمہ اللہ نے بھی یہی اختیار فرمایا ہے، یعنی جیل بھیج دیا جائے گا۔

ڈاکوؤں کی طرف سے عصمت دری کا حکم:

رہا یہ سوال کہ اس طرح کے مسلح حملوں میں آج کل عام طور پر صرف مال کی لوٹ کھسوٹ یا قتل وخوں ریزی ہی پر اکتفاء نہیں ہوتا، بلکہ اکثر عورتوں کی عصمت دری اور اغواء وغیرہ کے واقعات بھی پیش آتے ہیں اور قرآن مجید کا جملہ ﴿ ویسعون فی الارض فسادا ﴾ اس قسم کے تمام جرائم کو شامل بھی ہے تو وہ کس سزا کے مستحق ہوں گے، اس میں ظاہر یہی ہے کہ امام وامیر کو اختیار ہوگا کہ ان چاروں سزاؤں میں سے جو ان کے مناسب حال دیکھے وہ جاری کرے اور بدکاری کا شرعی ثبوت بہم پہنچے تو حد زنا جاری کرے۔

اسی طرح اگر صورت یہ ہو کہ نہ کسی کو قتل کیا نہ مال لوٹا، مگر کچھ لوگوں کو زخمی کر دیا، تو زخموں کے قصاص کا قانون نافذ کیا جائے گا۔ تفسیر مظہری

ت میں فرمایا: یعنی یہ سزائے شرعی جو دنیا میں ان پر جاری کی گئی ہے یہ تو دنیا کی رسوائی ہے اور سزا کا ایک نمونہ ہے اور آخرت کی سزا اس سے بھی سخت اور دیر پا ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی سزاؤں حدود وقصاص یا تعزیرات سے بغیر توبہ کے آخرت کی سزا معاف نہیں ہوتی، ہاں سزا یافتہ شخص دل سے توبہ کر لے تو آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی۔

دوسری آیت میں ایک استثناء ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکو اور باغی اگر حکومت کے گھیرے میں آنے اور ان پر قابو پانے سے پہلے پہلے جب کہ ان کی قوت وطاقت بحال ہے، اس حالت میں اگر توبہ کر کے رہزنی سے خود ہی باز آ جائیں تو ڈاکہ کی یہ حد شرعی ان سے ساقط ہو جائے گی، یہ استثناء عام قانون حدود سے مختلف ہے کیونکہ دوسرے جرائم چوری، زنا وغیرہ میں جرم کرنے اور قاضی کی عدالت میں جرم ثابت ہونے کے بعد اگر مجرم سچے دل سے توبہ بھی کرے تو گو اس توبہ سے آخرت کی سزا معاف ہو جائے گی مگر دنیا میں حد شرعی معاف نہ ہوگی، جیسا کہ چند آیتوں کے بعد چوری کی سزا کے تحت میں اس کا تفصیلی بیان آئے گا۔

حکمت اس استثناء کی یہ ہے کہ ایک طرف ڈاکوؤں کی سزا میں یہ شدت اختیار کی گئی ہے کہ پوری جماعت میں کسی ایک سے بھی جرم کا صدور ہو تو سزا پوری جماعت کو دی جاتی ہے، اس لیے دوسری

طرف اس استثناء کے ذریعہ معاملہ کو ہلکا کر دیا گیا کہ توبہ کر لیں تو سزائے دنیا بھی معاف ہو جائے اس کے علاوہ اس میں ایک سیاسی مصلحت بھی ہے کہ ایک طاقت ور جماعت پر ہر وقت قابو پانا آسان نہیں ہوتا، اس لیے ان کے واسطے ترغیب کا دروازہ کھلا رکھا گیا کہ وہ توبہ کی طرف مائل ہو جائیں۔

نیز اس میں یہ بھی مصلحت ہے کہ قتل نفس ایک انتہائی سزا ہے، اس میں قانون اسلام کا رخ یہ ہے کہ اس کا وقوع کم سے کم ہو اور ڈاکہ کی صورت میں ایک جماعت کا قتل لازم آتا ہے اس لیے ترغیبی پہلو سے ان کو اصلاح کی دعوت بھی ساتھ ساتھ جاری رکھی گئی۔

ڈاکہ سے توبہ کا واقعہ:

اسی کا یہ اثر تھا کہ علی اسدی جو مدینہ طیبہ کے قرب میں ایک جتھہ جمع کر کے آنے جانے والوں پر ڈاکہ ڈالتا تھا، ایک روز قافلہ میں کسی قاری کی زبان سے یہ آیت اس کے کان میں پڑ گئی

﴿ یعبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ﴾

قاری کے پاس پہنچے اور دوبارہ پڑھنے کی درخواست کی دوسری مرتبہ آیت سنتے ہی اپنی تلوار میان میں داخل کی اور رہزنی سے توبہ کر کے مدینہ طیبہ پہنچے اس وقت مدینہ پر مروان بن حکم حاکم تھے، حضرت ابو ہریرہ ان کا ہاتھ پکڑ کر امیرِ مدینہ کے پاس لے گئے اور قرآن کی آیتِ مذکور پڑھ کر فرمایا کہ آپ اس کو کوئی سزا نہیں دے سکتے۔

حکومت بھی ان کے فساد و رہزنی سے عاجز ہو رہی تھی سب کو خوشی ہوئی۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زمانہ میں حارثہ بن بدر بغاوت کر کے نکل گیا اور قتل و غارت گری کو پیشہ بنا لیا، مگر پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کر کے واپس آ گیا، تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر حد شرعی جاری نہیں فرمائی۔

حقوق العباد ادا کرنا لازم ہیں:

یہاں یہ بات قابل یادداشت ہے کہ حد شرعی کے معاف ہو جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ حقوق العباد جن کو اس نے ضائع کیا ہے وہ بھی معاف ہو جائیں گے بلکہ اگر کسی کا مال لیا ہے اور وہ موجود ہے تو اس کا واپس کرنا ضروری ہے اور کسی کو قتل کیا ہے یا زخمی کیا ہے تو اس کا قصاص اس پر لازم ہے، البتہ چونکہ قصاص حق العبد ہے تو اولیاءِ مقتول یا صاحب حق کے معاف کرنے سے معاف ہو جائے گا اور جب کوئی مالی نقصان کسی کو پہنچایا ہے اس کا ضمان ادا کرنا یا اس سے معاف

کرانا لازم ہے، امام اعظم رحمہ اللہ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے، اور اگر غور کیا جائے تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ حقوق العباد سے خلاصی حاصل کرنا خود توبہ کا ایک جزء ہے بدون اس کے توبہ ہی مکمل نہیں ہوتی، اس لیے کسی ڈاکو کو تائب اسی وقت مانا جائے گا، جب وہ حقوق العباد کو ادا یا معاف کرالے۔ (ماخوذ از معارف القرآن: ۳/۱۱۹)

وروی البخاري عن انس بن مالك، ان رهطا من عرينة قدموا المدينة فاسلموا، فاجتؤو المدينة اي استو حموها لانها لم توافق مزاجهم فامرهم صلى الله عليه وسلم ان يخرجوا إلى ابل الصدقة اي الزكاة فيشربوا من ابوالها والبانها، ففعلوا، فلما صحوا، قتلوا الرعاة واستاقوا النعم - اي الابل - فبعث رسول الله صلى الله عليه وسلم فاتى بهم، فقطع أيديهم وارجلهم، وثمل اعينهم - اي قلعها ثم ألقو في الحرة يستسقون فلا يسقون، حتى ما توا، وفيهم نزل آية الجزاء وهذا. (أخرجه البخاري في كتاب المحاربين: ٤/١٧٥)

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے واقعہ نقل فرمایا ہے کہ قبیلہ عرینہ کے ایک وفد نے مدینۃ الرسول ﷺ حاضر ہو کر اسلام قبول کیا لیکن ان کو مدینہ کی آب و ہوا موافق نہیں آئی، ان کے پیٹ پھول گئے تو آپ ﷺ نے ان کو حکم فرمایا کہ مدینہ کے باہر جہاں صدقات کے اونٹ چرتے ہیں وہاں جا کر قیام کریں اور ان اونٹوں کے دودھ اور پیشاب استعمال کریں، انہوں نے ایسا ہی کیا جب وہ تندرست ہو گئے تو انہوں نے یہ حرکت کی کہ چرواہے کو قتل کر کے اونٹ ہنکا کر لے گئے، رسول اللہ ﷺ کو خبر ہونے کے بعد گرفتاری کے لیے قافلہ روانہ فرمایا وہ جا کر ان مرتدوں کو گرفتار کر کے لے آئے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے جرم پر یہ سزا نافذ فرمائی کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے اور ان کی آنکھیں نکال لی گئیں، پھر ان کو حرہ (یعنی گرم پتھروں) پر ڈال دیا گیا، وہ پانی مانگتے رہے لیکن ان کو پانی نہیں دیا گیا، یہاں تک کہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گئے، انہی کے بارے میں یہ آیت سزا نازل ہوئی۔ (بخاری)

چوری کی سزا:

چوری کرنا یہ بھی عظیم گناہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ جب خواتین

ایمان پر بیعت کے لیے حاضر ہوا کریں جن عظیم گناہوں سے بچنے کا عہد لینا ہے ان میں سے ایک ''لا یسرقن'' کہ وہ چوری نہیں کریں گی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

حضرت میمونہ بنتِ سعد رضی اللہ عنہا نے سوال کیا'' یارسول اللہ (ﷺ) ہمیں چوری کا حکم بتائیں تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے یہ جانتے ہوئے کہ یہ چوری کا مال ہے اسے کھایا بلاشبہ وہ اس کی چوری کے گناہ میں شریک ہوگیا۔ (جمع الفوائد)

چوری کرنے سے حقوق اللہ تلف ہوتے ہیں، اس سے معاشرہ کا امن تباہ ہوتا ہے، فساد پھیلتا ہے اس لیے شریعتِ مطہرہ نے اس پر دنیوی سزا بھی مقرر فرمایا، جسے اصطلاح میں حد سرقہ کہا جاتا ہے، جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

قوله تعالیٰ: ﴿ والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما جزاء بما كسبا نكالاً من الله والله عزيز حكيم ﴾ (سورة المائدة: ٢٨)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرمایا کہ ''چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کے ہاتھ کاٹ دو ان کے کردار کے بدلہ میں اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنی احکام میں خطاب عام طور پر مردوں کو ہوتا ہے اور عورتیں بھی اس میں تبعاً شامل ہوتی ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام میں قرآن وسنت کا یہی اصول ہے، لیکن چوری کی سزا اور زنا کی سزا میں صرف مردوں کے ذکر پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ دونوں صنفوں کو الگ الگ کر کے حکم دیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ معاملہ حدود کا ہے جن میں ذرا سا بھی شبہ پڑ جائے تو ساقط ہو جاتی ہیں، اس لیے عورتوں کے لیے ضمنی خطاب پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ تصریح کے ساتھ ذکر فرمایا۔

دوسری بات اس جگہ قابل غور یہ ہے کہ لفظ سرقہ کا لغوی مفہوم اور شرعی تعریف کیا ہے؟

سرقہ کی شرعی تعریف:

قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے، اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی اس کی شرعی تعریف ہے اور اس تعریف کی رو سے

سرقہ ثابت ہونے کے لیے چند چیزیں ضروری ہوں۔

سرقہ کے احکام:

۱۔ اول یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ ایسی چیزیں ہوں جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی، جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہے یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حد سرقہ اس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کرسکتا ہے۔

۲۔ دوسری چیز تعریف سرقہ میں مالِ محفوظ ہوتا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگراں چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہونا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھا لے تو وہ بھی حد سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہو جائے تو بھی حد ساقط ہو جائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

۳۔ تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقہ عائد نہیں ہوگی اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔

سرقہ اور ڈاکہ میں فرق:

٤۔ چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے، کیونکہ دوسرے کا مال علانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہو چکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ عام عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حد سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حد شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں۔

چوری پر تعزیر:

اس کے ساتھ ہی یہ بھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ جن صورتوں میں چوری کی حد شرعی ساقط ہو جاتی ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکم وقت اپنی صوابدید کے مطابق

اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے، جو جسمانی، کوڑوں کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ جن صورتوں میں سرقہ کی کوئی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے حد شرعی جاری نہ ہو تو وہ شرعاً جائز و حلال ہے، کیونکہ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ یہاں گناہ اور عذاب آخرت کا ذکر نہیں، دنیوی سزا اور وہ بھی خاص قسم کی سزا کا ذکر ہے، ویسے کسی شخص کا مال بغیر اس کی خوش دلی کے کسی طرح بھی لے لیا جائے تو وہ حرام اور عذاب آخرت کا موجب ہے، جیسا کہ آیت قرآن کریم ﴿ لا تاكلوا اموالكم بينكم بالباطل ﴾ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ چوری میں جو الفاظ قرآن کریم کے آتے ہیں وہی زنا کی سزا میں ہیں، مگر چوری کے معاملہ میں مرد کا ذکر پہلے عورت کا بعد میں ہے اور زنا میں اس کے برعکس عورت کا ذکر پہلے کیا گیا، چوری کی سزا میں ارشاد ہے: ﴿ السارق والسارقة ﴾ اور زنا کی سزا میں فرمایا ہے: ﴿ الزانية والزاني ﴾ اس عکس کی حکمتیں حضرات مفسرین نے کئی لکھی ہیں، ان میں زیادہ دل کو لگنے والی بات یہ ہے کہ چوری کا جرم مرد کے لیے بہ نسبت عورت کے زیادہ شدید ہے، کیونکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے کسب معاش کی وہ قوت بخشی ہے جو عورت کو حاصل نہیں، اس پر کسب معاش کے اتنے دروازے کھلے ہونے کے باوجود چوری کے ذلیل جرم میں مبتلا ہو، یہ اس کے جرم کو بڑھا دیتا ہے اور زنا کے معاملہ میں عورت کو حق تعالیٰ طبعی حیا و شرم کے ساتھ ایسا ماحول بخشا ہے کہ ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے اس بے حیائی پر اترنا اس کے لیے نہایت شدید جرم ہے، اس لیے چوری میں مرد کا ذکر مقدم ہے اور زنا میں عورت کا۔

آیت مذکورہ کے الفاظ میں چوری کی شرعی سزا بیان کرنے کے بعد دو جملے ارشاد فرمائے ہیں ایک ﴿ جزاء بما كسبا ﴾ یعنی سزا بدلہ ہے ان کی بدکرداری کا، دوسرا جملہ فرمایا ﴿ نكالا من الله ﴾ اس میں دو لفظ ہیں نکال اور من اللہ، لفظ نکال کے معنی عربی لغت میں ایسی سزا کے ہیں جس کو دیکھ کر دوسروں کو بھی سبق ملے اور اقدام جرم سے باز آ جائیں، اس لیے نکال کا ترجمہ ہمارے محاورہ کے موافق عبرت خیز سزا کا ہو گیا، اس میں اشارہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا خاص حکمت پر مبنی ہے کہ ایک پر سزا جاری ہو جائے تو سب کے سب کانپ اٹھیں اور اس جرم قبیح کا انسداد ہو جائے، دوسرا لفظ من اللہ کا بڑھا کر ایک اہم مضمون کی طرف اشارہ فرمایا جو یہ ہے کہ چوری کے جرم کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کا مال بغیر حق کے لے لیا، جس سے اس پر ظلم

ہوا، دوسرا یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی پہلی حیثیت سے یہ سزا مظلوم کا حق ہے اور اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس کا حق ہے اگر وہ سزا کو معاف کردے تو معاف ہو جائے گی جیسا قصاص کے تمام مسائل میں یہی معمول ہے، دوسری حیثیت سے یہ سزا حق اللہ کی خلاف ورزی کرنے کی ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ جس شخص کی چوری کی ہے اگر وہ معاف بھی کردے تو بھی معاف نہ ہو، جب تک خود اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمادیں، جس کو اصطلاح شرع میں حد یا حدود کہا جاتا ہے، لفظ من اللہ سے اس دوسری حیثیت کو متعین کر کے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ سزا حد ہے قصاص نہیں ہے، یعنی سرکاری جرم کی حیثیت سے یہ سزا دی گئی ہے، اس لیے جس کی چوری کی ہے اس کے معاف کرنے سے بھی سزا ساقط نہیں ہوگی۔

آخر آیت میں ﴿ واللہ عزیز حکیم ﴾ فرما کر اس شبہ کا جواب دیدیا جو آج کل عام طور پر زبان زد ہے کہ یہ سزا بڑی سخت ہے اور بعض گستاخ یا ناواقف تو یوں کہنے سے بھی نہیں جھجکتے کہ یہ سزا وحشیانہ ہے، نعوذ باللہ منہ، اشارہ اس کی طرف فرمایا کہ اس سخت سزا کی تجویز محض اللہ تعالیٰ کے قوی اور زبردست ہونے کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے حکیم ہونے پر بھی مبنی ہے جن شرعی سزاؤں کو آج کل کے عقلاء یورپ سخت اور وحشیانہ کہتے ہیں ان کی حکمت اور ضرورت اور فوائد کی بحث انہی آیات کی تفسیر کے بعد مفصل آئے گی۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿ فمن تاب من بعد ظلمه واصلح فإن الله يتوب عليه إن الله غفور رحيم ﴾

یعنی جو شخص اپنی بدکرداری اور چوری سے باز آگیا اور اپنے عمل کی اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے کیونکہ اللہ بہت بخشنے والا اور مہربان ہے۔

معافی میں بنیادی فرق:

ڈاکہ زنی کی شرعی سزا جس کا بیان چند آیات پہلے آیا ہے اس میں بھی معافی کا ذکر ہے اور چوری کی سزا کے بعد بھی معافی کا ذکر ہے، لیکن دونوں جگہ کی معافی کے بیان میں ایک خاص فرق ہے اور اسی فرق کی بناء پر دونوں سزاؤں میں معافی کا مفہوم فقہاء کے نزدیک مختلف ہے ڈاکہ زنی کی سزا میں تو حق تعالیٰ نے بطورِ استثناء کے ذکر فرمایا:

﴿ إلا الذين تابو من قبل ان تقدروا عليهم ﴾

جس کا حاصل یہ ہے کہ ڈاکہ زنی کی جو شرعی سزا آیت میں مذکور ہے، اس سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ ڈاکوؤں پر حکومت کا قابو چلنے اور گرفتار ہونے سے پہلے جو توبہ کرے اس کو یہ سزائے شرعی معاف کردی جائے گی اور چوری کی سزا کے بعد جو معافی کا ذکر ہے اس میں اس سزائے دنیوی سے استثناء نہیں، بلکہ آخرت کے اعتبار سے ان کی توبہ مقبول ہونے کا بیان ہے، جس کی طرف ﴿فإن الله يتوب عليه﴾ میں اشارہ موجود ہے کہ حکامِ وقت اس توبہ کی وجہ سے شرعی سزا نہ چھوڑیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کے جرم کو معاف فرما کر آخرت کی سزا سے نجات دیں گے، اسی لیے حضرات فقہاء تقریباً اس پر متفق ہیں کہ ڈاکو اگر گرفتار ہونے سے پہلے توبہ کرلیں تو ڈاکہ کی شرعی سزا ان پر جاری نہ ہوگی، مگر چور اگر چوری کرنے کے بعد خواہ گرفتاری سے پہلے یا بعد میں چوری سے توبہ کرلے تو حدِ سرقہ جو دنیوی سزا ہے وہ معاف نہ ہوگی، گناہ کی معافی ہو کر آخرت کے عذاب سے نجات پاجانا اس کے منافی نہیں۔ (ماخوذ از معارف القرآن: ۱۲۹/۳)

نصابِ سرقہ:

فقہاءِ احناف نے کہا ہے کہ مال کی وہ مقدار جس کے چرانے سے چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا، وہ دس درہم چاندی یا ایک دینار سونا ہے۔

دس درہم: ۳۰۶۲، ایک دینار: ۴٫۸۶ گرام سونا

اگر کوئی بد بخت چور اتنا یا اس سے زائد قیمت کی کوئی چیز چرائے، گرفتار ہونے پر جرم ثابت ہونے کی صورت میں اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

ولاقامة الحد على السارق شرائط منها أن يكون المسروق ذاقدر وقيمة. وقد اعتبره الفقهاء بما قيمته دينار، اور عشرة دراهم، وما دون ذلك تافه و حقير، فقد روي عن عائشة رضي الله عنها انها قالت: لم تكن يد السارق تقطع على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم في الشي التافه.

(أخرجه ابن ابي شيبة وانظر نصب الراية: ۳۶۱/۳)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں معمولی چیز چرانے پر

ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جاتی تھی، (اگرچہ وہ بھی بڑا گناہ ہے)

وروي البخاري عن عائشة انها قالت: لم تكن تقطع يد السارق على عهد رسول الله إلا في ثمن مجن جحفة او ترس. كل واحد منهما ذو ثمن. (أخرجه البخاري: ٤/١٧٣)

وقال العلامة المرغيناني رحمه الله: وإذا سرق العاقل البالغ عشرة دراهم او ما يبلغ قيمته عشرة دراهم مضروبة من حرز لا شبهة فيه وجب عليه القطع. (هداية: ٢/٥٤٤)

صاحب ہدایہ علامہ مرغینانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب عاقل، بالغ شخص دس درہم یا اس کی قیمت کی کوئی چیز محفوظ جگہ سے چرائے اس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا نافذ ہوگی۔

شراب نوشی کی سزا:

اللہ تعالیٰ کی عظمت کا قائل ہو کر توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہوئے مکمل احکام شریعت کی پابندی کرنا یہ شرعاً مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر بندے سے اس کا مطالبہ ہے، اس کے لیے عقل ہوش و حواس کا قائم رہنا نہایت ضروری ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں کے استعمال کو حرام قرار دیا ہے جو عقل انسانی کو زائل کردے، جیسے شراب، بھنگ، چرس وغیرہ اور ارشاد فرمایا:

"كل مسكر حرام."

یعنی ہر نشہ آور چیز کا استعمال حرام ہے۔

اسی طرح شراب نوشی پر خاص وعیدیں بھی بکثرت احادیث میں وارد ہوئی ہیں۔

كقوله عليه السلام: من شرب الخمر في الدنيا فمات وهو يد منها لم يتب لم يشربها في الاخرة. رواه مسلم (مشكوٰة: ٢/٣١٧)

یعنی جو شخص دنیا میں شراب پیئے گا اس کو آخرت کی (پاکیزہ) شراب سے محروم کردیا جائے گا۔ (مسلم)

وقوله عليه السلام: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلثة قد حرم الله عليهم الجنة مد من الخمر، والعاق، والديوث الذى يقر السواء على اهله.

یعنی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی نے تین قسم کے لوگوں پر جنت کو حرام فرمایا ہے:

(۱) شراب کا عادی (۲) والدین کی نافرمانی کرنے والا

(۳) دیوث یعنی وہ شخص جو اپنے گھر والوں (ماں، بہن، بیٹی، بیوی وغیرہ) کو دوسرے غیر مرد کے ساتھ بری حالت میں دیکھے اور برداشت کر جائے۔ (مسند احمد ونسائی)

شراب نوشی پر اخروی سزا کے علاوہ دنیا میں بھی حد جاری ہوتی ہے۔

جو شخص شراب پیتا ہوا پکڑا جائے اور اس وقت بھی اس کے منہ میں شراب کی بو موجود ہے، اب وہ خود شراب نوشی کا اقرار کرے یا دو گواہ اس پر گواہی دیں اس پر حد لگائی جائیگی اسی کوڑے۔

قال العلامة المرغيناني رحمه الله : ومن شرب الخمر فاخذ وريحها موجودة أو جاؤا به سكران فشهد الشهود عليه بذلك فعليه الحد ، و كذلك إذا اقر وريحها موجودة .

(هداية شرح البداية : ٢/٥١٥)

وفي الموطا : أن الذي اشار على عمر بجلد الشارب ثمانين جلدة هو علي بن ابى طالب فقد روي مالك بسنده عن ثور الديلي ، أن عمر بن خطاب استشار في الخمر يشربها الرجل .

فقال له علي رضي الله عنه : نرى أن تجلده ثمانين ، فانه إذا شرب سكر ، واذا سكر هذى ، اي خلط في كلامه كالمجنون ، وإذا هذى افترى ـ اي كذب و قذف فجلد عمر في الخمر ثمانين .

(أخرجه مالك في المؤطا : ٢/٤٢ في كتاب الاشربة)

مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ شراب نوشی کی سزا میں اسی کوڑے مارے جائیں کیونکہ جو شخص شراب پئے گا، ضرور ہذیان بکے گا اور اس میں کسی پر جھوٹی تہمت بھی رکھے گا اور حد قذف کی مقدار اسی کوڑے ہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شراب نوشی پر اسی کوڑے مارے، یہی شرعی قانون بن گیا۔

قال فى ملتقي الابحر : ومن شرب خمراً ولو قطرة واحدة فاخذ

وريحها موجود في فمه أو جئ به سكران ، ولو من نبيذ ونحوه من المسكرات ، وشهد بذلك رجلان ، أو اقر ـ أي اعتراف ـ به السكران ، حد إذا صحا ثمانين سوطا للحر ، واربعين للعبد ، مفرقا على بدنه . (ملتقي الابحر للحلبي : ١/ ٣٣٩)

کتاب متفرقات

اپریل فول (یکم اپریل کو دھوکہ دہی کرنا) کا حکم:

یہ نصاریٰ کا طریقہ ہے، اسلامی طریقہ نہیں ہے، جھوٹ بولنا حرام ہے، حدیث شریف میں ہے:

ويل للذي يحدث فيكذب يضحك به القوم ويل له ويل له .

(ابو داؤد : ٢/ ٢٣٣)

اس آدمی کے لیے ہلاکت ہے جو لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اور حدیث میں ہے:

لا يؤمن العبد الايمان كله حتى يترك الكذب في المراحة والمراء وإن كان صادقا . (مسند احمد)

کوئی بندہ پورے پورے ایمان کا حامل نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو بالکل ترک نہ کر دے، خواہ ہنسی مذاق میں ہو خواہ لڑائی جھگڑے میں (خواہ صرف انداز جھوٹ کا ہو اگر واقع میں سچ ہو) اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ بولنا بڑی خیانت ہے کیونکہ آدمی اللہ اور لوگوں کا امین ہے اس کو سچ ہی بولنا چاہیے، جھوٹ بولنا امانت کے منافی ہے، حدیث میں ہے:

كبرت خيانتك ان تحدث اخاك حديثا هو لك مصدق وانت له كاذب . (أبو داؤد شريف)

یہ بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات اس طرح کہو کہ وہ تمہیں سچا جان رہا ہو حالانکہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ : ٢/ ٣٥١)

اس جھوٹ کی وجہ سے دوسروں کا بڑا نقصان بھی ہوتا ہے، ان کو ایذاء اور تکلیف پہنچتی ہے جبکہ

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ''کامل مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی ایذاء رسانی سے دوسرے مسلمان محفوظ رہے۔'' لہٰذا اپریل فول کے نام بھی جھوٹ بولنا حرام اس سے اجتناب کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔

جانگیہ پہننے کا مسئلہ:

مرد کا ستر (جس کا چھپانا ضروری ہے) ناف سے گھٹنے تک ہے، نماز اور خارج نماز ناف سے گھٹنے تک بدن چھپانا ضروری و فرض ہے، اس میں سے کوئی بھی حصہ عذر شرعی کے بغیر کھلا رکھنا جائز نہیں ہے، موجب گناہ ہے (البتہ گھٹنے اور شرمگاہ کے کشف کا گناہ برابر نہیں ہے) ستر کے متعلق قرآن شریف میں ہے:

﴿ یا بنی آدم قد أنزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم وریشا ﴾

(سورۃ الأعراف : ٢٦)

یعنی اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس بنایا ہے جو تمہارے ستر کو چھپاتا ہے اور باعث زینت بھی ہے۔

اس کی تفصیل حدیث شریف اور کتب فقہ کے حوالہ سے پہلے کتاب اللباس میں گزر چکی ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے، مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے۔ دوسری حدیث میں ہے:

الرکبة من العورة .

گھٹنا بھی داخل ستر ہے۔

ہدایہ میں ہے کہ مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے اور گھٹنا ستر میں داخل ہے۔ (یعنی گھٹنا چھپانا بھی ضروری ہے) (١/ ٦٧) ایسا جانگیہ (نصف پاجامہ) پہننے کی شرعاً اجازت نہیں ہے جس میں گھٹنے کھلے رہیں۔

آپ کی سہولت اور مزید اطمینان کے لیے ہند کے مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مشہور کتاب ''تعلیم الاسلام'' کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے:

سوال: ستر چھپانے سے کیا مراد ہے؟

جواب: مرد کو ناف سے گھٹنے تک اپنا بدن چھپانا فرض ہے ایسا فرض ہے کہ نماز کے اندر بھی فرض ہے اور نماز کے باہر بھی فرض ہے۔ (٣/ ٤٠)

خطرناک مرض:

جانگیہ پہننا ناجائز ہونا مردوں کے لیے بیان ہوا، بچوں کی عمر سات سال ہو جانے کے بعد ان کے لیے بھی ستر کو چھپانا ضروری ہے، بلکہ بعض فقہاء سے چار سال کا قول بھی منقول ہے۔اس دور میں اس مسئلہ پر بہت غفلت پائی جارہی ہے، مردوں اور بچوں کا رونا تو رو ہی رہے تھے، لیکن افسوس صد افسوس مسلمان بچیاں بھی اس مرض میں مبتلا ہو گئیں ہیں، نیم عریاں لباس، آدھے آستین کی قمیص، چڈی میں بازاروں اور پارکوں میں نکل جاتی ہیں، والدین اس بے غیرتی کو کیسے برداشت کرتے ہیں؟ ہائے ہائے! ایک تو مسلمانوں کا وہ دور تھا کوئی غیر مرد کسی کی ماں بہن کی طرف غلط نگاہ اٹھا کر دیکھے تو اس پر خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، اب یہی ماں باپ، بھائی، چچا، اپنے گھر کی خواتین کو لے کر حسن کی نمائش کے لیے ہوٹلوں اور پارکوں میں گھوم رہے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

وباءزدہ آبادی کو چھوڑنے کا حکم:

وبائی اور طاعونی جگہ سے اس خیال سے اور ایسے عقیدہ سے بھاگنا کہ بیماری اور موت سے ہم بچ جائیں گے ورنہ بیماری میں پھنس کر مر جائیں گے ناجائز اور سخت گناہ کا کام ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿الم تر إلى الذين خرجوا من ديارهم وهو الوف حذر الموت﴾ (سورة البقرة: پ ۲)

کیا ان لوگوں کو آپ ﷺ نے نہیں دیکھا (کیا آپ ﷺ کے ان کے حال سے واقف نہیں ہیں؟) جو موت سے بچنے کے لیے اپنے مکانوں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ (تعداد میں) ہزاروں تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مرجاؤ (تو مر گئے) پھر ان کو زندہ کیا۔(سورۂ بقرۃ)

مذکورہ آیت کی تفسیر میں ہے کہ اگلی امت کی ایک بستی میں وباء پھیلی تو ہزاروں (بروایت ستر ہزار) کی تعداد میں بھاگ گئے اور سمجھے کہ ہم موت سے نجات پا گئے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے برے عقیدہ کی سزا دی کہ ایک دم سب مر گئے۔کوئی دفن کرنے کے لیے بھی باقی نہ رہا پھر ایک مدت کے بعد ایک نبی وہاں پہنچے۔یہ خوفناک منظر دیکھ کر دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو عبرت دینے

کے لیے زندہ کیا تب ان کو یقین ہوا کہ موت سے کوئی بھاگ نہیں سکتا۔

(تفسیر مظہری : ۱ / ۳٤۳ ، تفسیر احمدی ۱/ ٤٦٩)

واقعی موت اپنے وقت اور اللہ کے حکم کے سوا نہیں آتی اور وقت آ گیا تو ٹل بھی نہیں سکتی قانون خداوندی ہے۔

﴿ این ما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم في بروج مشیدة ﴾

جہاں کہیں ہو گے وہاں تم کو موت آ پکڑے گی، چاہے مضبوط قلعہ میں کیوں نہ ہو۔

(سورۃ نساء)

﴿ قل ان الموت الذي تفرون منه فإنه ملاقیکم ﴾

(آپ ﷺ فرما دیجئے) کہ بے شک جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم کو پکڑے گی۔

(سورۃ جمعہ)

بے شک اللہ کی مقرر کی ہوئی مدت جب آ جائے گی تو تاخیر نہ ہو گی۔ (سورۂ نساء)

زمانہ جاہلیت کا عقیدہ تھا کہ جو کوئی بیمار کے پاس بیٹھے اور اس کے ساتھ کھائے تو اس کی بیماری اس کو لگ جاتی ہے، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''لا عدوی'' یعنی (بلا تقدیر بلا حکم خداوندی کے) ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے عرض کیا کہ صحت مند اونٹوں میں خارشی اونٹ مل جاتا ہے تو سب خارشی ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، پہلے اونٹ کو کس نے خارشی بنایا؟ جواب ظاہر ہے کہ اللہ نے تو پھر دوسرے اونٹوں کے لیے ایسا کیوں نہیں سمجھتے؟

ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ایک جزامی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کھانے کے برتن میں شریک کرایا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم اور تقدیر الٰہی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا مگر عقیدہ کی حفاظت کے لیے شریعت نے تعلیم دی ہے کہ وبائی جگہوں میں بلا ضرورت نہ جائے اور نہ وہاں سے بھاگے کیونکہ اگر وہاں جا کر بیماری میں مبتلا ہو جائے گا تو طبیعت کے کمزور اور ضعیف العقیدہ سمجھیں گے کہ وہاں جانے سے یہ ہوا۔ نیز بھاگنے والا سمجھے گا کہ بھاگنے سے بچ گیا ورنہ ضرور مبتلا ہو جاتا اور بھاگنے والا دوسروں کے لیے بھی زیادہ پریشانی اور کم ہمتی کا باعث بنتا ہے ایسی بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر آپ ﷺ نے امت کو ہدایت فرمائی:

إذا سمعتم بالطاعون بارض فلا تدخلوها واذا وقع بارض وانتم بها فلا تخرجوا منها .

یعنی تم سنو کہ کسی جگہ وبا پھیلی ہے تو وہاں مت جاؤ اور جہاں تم ہو وہاں وبا پھیل جائے تو بھاگنے کے ارادہ سے وہاں سے مت نکلو۔

(بخاری شریف : پارہ ۲۳ ، ۸۵۳/۲ ، مسلم شریف : ۲۲۹/۲)

اور فرمایا کہ بیمار اونٹ کو بیمار اونٹ کے ساتھ مت رکھو، اور ہدایت فرمائی مجذوم سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے کہ عقیدہ کی حفاظت ضروری ہے، ڈاکٹر حکیم وغیرہ بعض امراض (ٹی بی، خارش، جذام، طاعون، انفلوائنز وغیرہ) کو متعدی مانتے ہیں اور اس کے جراثیم ثابت کرتے ہیں، ہمیں اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر ان کو بھی ماننا چاہیے کہ بیماری از خود متعدی اور مؤثر نہیں ہے بلکہ بحکم خدا اور تقدیر سے متعدی ہوتی ہے جس کے لیے حکم خدا نہ ہو اور جس کی تقدیر میں نہ ہو تو ذرہ بھی اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیے جذامی کے مکان میں سب جذامی نہیں ہوتے، ٹی بی والے مریض کے تیمار دار سب اس میں مبتلا نہیں ہوتے۔ انفلوائنزا کے مریض کے ساتھ رہنے والے عموماً انفلوائنزا سے محفوظ اور بالکل صحیح سالم ہوتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کے لیے خدا کا حکم ہو اسی کو مرض لگتا ہے اگر ایسا نہیں تو مریض کے ساتھ طویل عرصہ تک رہنے اور کھانے پینے کے باوجود صحیح و سالم کیوں رہتے ہیں؟

شریعت نے دور رہنے کی ہدایت محض حفاظتِ عقیدہ اور سلامتی ایمان کے لیے کی ہے نہ اس لیے کہ مرض سے بچے اور وہ بھی ہر ایک کے لیے ہر حال میں حکم وجوبی نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے: فراراً منه .

(وبا سے بھاگنے کے ارادہ سے نہ نکلو) کے الفاظ ہیں اس کی شرح میں لکھا ہے اگر وبا سے بھاگنے کے علاوہ دوسری کوئی وجہ اور غرض ہو تو وہاں سے جانے میں اور بضرورت وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں عقیدہ پختہ اور مضبوط ہو ڈانواڈول نہ ہو۔ (فتح الباری وغیرہ)

اور درمختار میں ہے:

واذا خرج من بلدة بها الطاعون فان علم ان كل شيى بقدر الله تعالىٰ فلا بأس بان يخرج ويدخل . وان كان عنده انه لو خرج

تحاولو دخل ابتلا کره له ذلك فلا يدخل و لا يخرج صيانة لاعتقاده.
یعنی جو شخص وبائی شہر سے نکلے لیکن اس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز تقدیر الٰہی سے ہے خدا کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا تو اس کو نکلنے اور وہاں جانے کی اجازت ہے اور اگر اعتقاد ایسا ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں تو بچ جاؤں گا ورنہ مبتلا ہو جاؤں گا تو ایسے شخص کو وہاں سے نکلنے کی اور جانے کی اجازت نہیں۔ تا کہ اس کا عقیدہ محفوظ رہے۔ (درمختار مع الشامی: ۳۲۱/۵)

ہاں! وہاں سے آسکتے ہیں، دفع وباء تک وہاں قیام کرنا لازم نہیں، قیام کے مقصد سے وہاں نہیں گئے تو کام سے فارغ ہو کر واپس آنا فرار شمار نہ ہوگا، تاہم نیت کی درستی ضروری ہے۔

وفي هذه الاحاديث منع القدوم على بلد الطاعون و منع الخروج منه فراراً من ذالك اما الخروج فلا باس به.

(نووي شرح مسلم: ۲۲۸/۲)

ہاں! بضرورت وہاں جاسکتے ہیں اور سفر بھی کر سکتے ہیں جب وباء سے فرار کا قصد نہ ہو۔

لكن ابو موسى حمل النهى على من قصد الفرار محضاً و لا شك ان الصور ثلاث من خرج لقصد الفرار محضا فهذا يتناوله النهى لا محالة ومن خرج لحاجة متمحضة لا لقصد الفرارا اصلا ويتصور ذلك فيمن تهيأ للرحيل من بلد كان بها الى بلد اقامته مثلا ولم يكن الطاعون وقع فاتفق وقوعه فى اثناء تجهيزه فهذا لم يقصد الفرار اصلا فلا يدخل في النهي والثالث من عرضت له حاجة فاراد الخروج اليها وانضم الى ذلك انه قصد الراحة من الاقامة بالبلد التي وقع بها الطاعون فهذا محل النزاع. (فتح الباري: صـ ١٥٩)

ہاں! تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے شہر کی حد میں جنگل اور میدان میں جاسکتے ہیں نیت یہ ہونی چاہیے کہ تبدیلی آب و ہوا بھی ایک علاج ہے۔ لہٰذا بغرضِ علاج نکلتے ہیں۔

غرض یہ کہ وبائی جگہ سے بارادہ فرار نہ نکلے، اللہ پر بھروسہ کر کے صبر و ہمت سے رہے۔ تقدیر میں موت ہوگی تو آئے گی اور درجہ شہادت حاصل ہوگی۔ جب موت بھاگنے سے نہیں ٹلتی تو بھاگ کر ایمان کیوں خراب کرے۔ (ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ: ۳۹۲/۲)

ٹیبل، کرسی اور الگ الگ پلیٹوں میں کھانا:

زمین پر دستر خوان بچھا کر بیٹھ کر کھانا سنت ہے، ٹیبل، کرسی پر کھانے کا طریقہ اسلامی تہذیب کے خلاف ہے، یہ طریقہ متکبروں اور فیشن پرستوں کا ہے لہٰذا قابل ترک ہے، البتہ کبھی ضرورت کی بناء پر ٹیبل، کرسی پر بیٹھ کر کھا لیا اس کو بھی حرام اور ناجائز نہیں کہا جائے گا اس کی عادت بنا لینا بہر حال قبیح فعل ہے۔ مالا بدمنہ میں ہے: ’’مسلم را تشبہ بہ کفار و فساق حرام است۔‘‘ مسلمان کو کفار اور فساق کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے۔ (مالا بد منه : صـ ۱۳۱)

اسی طرح ایک ساتھ مل کر ایک برتن میں کھانا بھی مسنون اور باعثِ برکت ہے الگ الگ پلیٹوں میں کھانا اسلامی طریقہ نہیں ہے، یہ غیر قوم کا طریقہ ہے کہ وہ دعوتوں اور گھروں میں ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں مگر سب کی پلیٹیں الگ الگ ہوتی ہیں اگر مسلمان بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو پھر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں امتیاز کی کیا صورت ہوگی؟ نیز یہ تو ہم پرستوں کا طریقہ ہے جو امراض کے متعدی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں، حدیث میں ہے:

عن عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كلوا جميعا ولا تفرقوا فان البركة مع الجماعة .

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب ساتھ مل کر کھاؤ اور الگ الگ مت کھاؤ، ساتھ مل کر کھانے میں برکت ہے۔

(مشكوٰة شريف: صـ ۳۷۰ باب الضيافة)

نیز حدیث میں ہے، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں عرض کیا: انا ناکل ولا نشبع ’’ہم کھاتے ہیں لیکن شکم سیری نہیں ہوتی، حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: فلعلکم تفترقون شاید تم الگ الگ کھاتے ہو، صحابہ نے کہا جی ہاں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

’’ فاجتمعوا على طعامكم واذكروا اسم الله يبارك لكم فيه . ‘‘

(ابو داؤد شريف : ۱۷۲/۲ باب فى الاجتماع على الطعام ، مشكوٰة شريف : صـ ۳۶۹ باب الضيافة ، حصن حصين صـ ۱۰۹ منزل ۳)

سب ایک ساتھ مل کر اور بسم اللہ پڑھ کر کھاؤ تمہارے کھانے میں برکت ہوگی۔

نیز حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک بہت بڑا پیالہ تھا جس میں سب ایک

ساتھ مل کر کھاتے تھے۔

عن عبد الله بن بسر رضي الله عنه قال كان للنبي صلى الله عليه وسلم قصعة يحملها اربعة رجال يقال لها الغراء فلما اضحوا وسجدوا الضحى اتى بتلك وقد ثرد فيها فالتفوا عليها (اي اجتمعوا حولها) الخ .

(مشكوٰة شريف : صـ ٢٦١ باب الضيافة ، جمع الفوائد : جـ ١)

نیز حدیث میں ہے، خدا کا پسندیدہ کھانا وہ ہے جس میں بہت سے ہاتھ ہوں۔ (جمع الفوائد)

یہ ہے اسلامی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت اور مبارک طریقہ اس مبارک طریقہ کو چھوڑ کر متکبروں اور غیر قوموں کے طریقہ کو اختیار کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

رہا یہ سوال کہ ساتھ کھانے میں کھانا برباد ہوتا ہے تو یہ درحقیقت ایک شیطانی وسوسہ ہے، اگر کھانے والوں کی تعداد کے مطابق کھانا نکالا جائے اور ضرورت پڑنے پر دوسرا کھانا لیا جائے تو کھانا کس طرح ضائع نہ ہوگا اور اگر اس کے باوجود بھی کھانا بچ جائے تو اس میں کسی طرح کی کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی، مؤمن کے جھوٹے میں شفاء ہے، لہٰذا اس کھانے کو ضائع نہ کیا جائے۔

قوله تعالىٰ : ﴿ ليس عليكم جناح ان تاكلوا جميعا او اشتاتا ﴾

''پھر اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں کہ سب مل کر کھاؤ یا الگ الگ کھاؤ۔'' (سورۂ نور)

سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساتھ مل کر کھاؤ یا تنہا تنہا کھاؤ دونوں جائز ہیں کسی میں کچھ حرج اور گناہ نہیں تو پھر ساتھ مل کر کھانے پر اتنا اصرار کیوں ہے؟'' تو جواب یہ ہے کہ آیت میں نفس جواز کو بیان کیا گیا ہے کہ دونوں طرح کھانا جائز ہے، ساتھ مل کر کھانا بھی جائز ہے اور کسی وقت تنہا کھانے کا اتفاق ہو جائے تو یہ بھی جائز ہے اس میں گناہ نہیں ہے مگر ان دونوں میں افضل طریقہ یہ ہے کہ سب ساتھ مل کر کھائیں اس میں برکت ہے جیسا کہ مندرجہ بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ بعض انصار رضی اللہ عنہم کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب تک ان کے ساتھ کوئی مہمان نہ ہوتا تنہا کھانا نہیں کھاتے تھے یا مہمان کی موجودگی میں مہمان ہی کے ساتھ کھانے کو ضروری سمجھتے تھے تو اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ ساتھ مل کر کھاؤ یا تنہا تنہا سب جائز ہے، اپنی جان کو مشقت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، فوائد

عثانی میں ہے، آیت سے تنہا کھانے کا جواز بھی نکلا، بعض حضرات کے متعلق لکھا ہے کہ جب تک کوئی مہمان ساتھ نہ ہو کھانا نہیں کھاتے تھے معلوم ہوا یہ غلو ہے، البتہ اگر کئی کھانے والے ہوں اور اکٹھے بیٹھ کر کھائیں تو موجبِ برکت ہوتا ہے۔

کما ورد فی الحدیث . (سورۂ نور ، پارہ : ۱۸ رکوع : ۱۳)

معارف القرآن ادریسی میں ہے: نیز بعض انصار پر جود و کرم کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ لوگ بے مہمان کے تنہا کھانا گوارا نہیں کرتے تھے اور اپنی جان پر مشقت گوارا کرتے تھے اور مہمان کا انتظار کرتے تھے، ان کے بارے میں آئندہ آیت اتری، تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ایک جگہ جمع ہو کر اور مل کر کھانا کھاؤ یا الگ الگ اور اکیلے اکیلے کھاؤ اور دل میں یہ خیال نہ کرو کہ کس نے کم کھایا اور کس نے زیادہ، اکیلے اکیلے کھانا بھی جائز ہے، مگر مل کر کھانے میں برکت زیادہ ہے۔

(معارف القرآن ادریسی : ۲۹۲/۸ ، مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو تفسیر روح المعانی : ۲۲۱/۱۸ ، مطبوعہ مصطفائیہ دیوبند اور تفسیر مواہب الرحمن : ص ۲۴۶ ، ۲۴۷/۱۸ پارہ نمبر : ۱۸ و تفسیر روح البیان : ص ۱۸۱ ، ۱۸۲/۱۸)

تنہا کھانے کا رواج آج کل عام ہوتا جا رہا ہے، غیر اقوام اور فیشن پرستوں نے اسے اپنایا ہے لہٰذا مسلمانوں کو اس سے اجتناب کرنا چاہیے، خصوصاً اہل علم حضرات کو، امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

مهما صارت السنة شعارا لاهل البدعة قلنا بتركها خوفا من التشبه بهم .

یعنی جب کوئی سنت مبتدعین کا امتیازی شعار بن جائے تو ہم اس میں ان کے مشابہ بن جانے کے خوف سے اس کے بھی ترک کا فتویٰ دیں گے۔

(احیاء العلوم : ۲۷۰/۲ بحوالہ التشبہ فی الاسلام : ۱۶۳/۱)

اللہ تعالیٰ سنت کی عظمت اور اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائیں۔

(ماخوذ از فتاویٰ رحیمیہ : ۴۳۰/۶ مع اضافہ)

استاذ کی جگہ پر بیٹھنا:

شاگرد کے لیے یہ بات مناسب نہیں ہے کہ استاذ کی جگہ پر بیٹھے چاہے استاذ موجود نہ ہوں،

ادب واحترام کے خلاف ہے، خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے:

ولا یجلس مکانه ان غاب عنه . (٣٢٧/٤)

داڑھی پر تنقید کا حکم:

داڑھی رکھنا شرعاً واجب ہے اس کا کٹوانا یعنی ایک مٹھی سے کم کرنا یا منڈانا حرام ہے ایسا شخص فاسق ہے، اس زمانہ انحطاط میں بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مسلمان اس حکم شرعی پر عمل کرتے ہیں لیکن بعض ایسے مسلمان بھی جو خاندانی طور پر اور نام کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں اعمال ان کے شریعت کے خلاف ہیں ایسے لوگ داڑھی رکھنے والوں کا مذاق بھی اڑاتے ہیں ایسے لوگوں کا شرعاً کیا حکم ہے؟ اس بارے میں حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

افسوس! وہ زمانہ آ گیا ہے جس کی خبر مخبر صادق ﷺ نے دی ہے۔ ایک روز آنحضرت ﷺ نے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہارے نوجوان فاسق فاجر بن جائیں گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ایسا ہونے والا ہے؟ فرمایا ہاں! بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت! پھر آپ ﷺ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا جب تم نیکی کے کام میں آڑ بن جاؤ گے اور بدی کا حکم کرو گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ایسا ہونے والا ہے؟ فرمایا بے شک اس سے بھی زیادہ سخت، پھر فرمایا: تمہارا کیا حال ہوگا؟ جب تم نیکی کے کاموں کو خراب اور بدکاری کے کاموں کو اچھا سمجھنے لگو گے۔ (جمع الفوائد) کیا یہ سب آج نہیں ہو رہا ہے؟

لوگ داڑھی منڈاتے ہیں اور منڈانے کی تبلیغ کرتے ہیں، یہی نہیں بلکہ داڑھی منڈانے کو بہتر اور رکھنے کو خراب کہتے ہیں۔ جوان تو درکنار بڑی عمر کے لوگ بوڑھے بھی داڑھی منڈا کر سنتِ رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کر کے برسرِ عام فاسق بن رہے ہیں، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: ''تم سفید بالوں کو مت نوچو، جو مسلمان حالتِ اسلام میں بوڑھا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سفید بال کے بدلہ میں اس کو نیکی کا ثواب عطا فرماتے ہیں اور اس کی خطا معاف فرماتے ہیں اور قیامت کے دن یہ سفید بال اس کے لیے نور ہوں گے۔ (ابو داؤد شریف: ٢٢٥/٢)

ایک حدیث میں ہے کہ بوڑھے کو عذاب دینے سے اللہ تعالیٰ شرماتے ہیں، اللہ اکبر اللہ تعالیٰ بوڑھوں کو ان کی معاصی کی سزا دیتے شرماتا ہے مگر بوڑھا داڑھی منڈا کر بڑھاپا چھپا کر نقلی جوان

بننے سے نہیں شرماتا؟

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

خير شبابكم من تشبه بكهولكم و شر كهولكم من تشبه بشبابكم.

نوجوانوں میں سب سے اچھا نوجوان وہ ہے جو بوڑھے کی مشابہت اختیار کرے اور بوڑھوں میں سب سے بدتر بوڑھا وہ ہے جو جوانوں کی مشابہت اختیار کرے۔

(كنزالعمال: ١٢٩/٨)

داڑھی اسلامی وقومی شعار ہے اور مرد کے لیے زینت کی چیز ہے، بعض فرشتوں کی تسبیح ہے کہ

سبحان من زين الرجال باللحى و النساء بالذوائب.

یعنی پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو داڑھی سے اور عورتوں کو چوٹیوں سے زینت بخشی۔(الحدیث)

آنحضرت ﷺ نے داڑھی رکھی اور امت کو داڑھی رکھنے کی تاکید فرمائی۔

آپ ﷺ کے عمل کو اپنانا اور آپ کے حکم و فیصلہ کو دل و جان سے تسلیم کرنا شرطِ ایمان ہے کیونکہ اصطلاحِ شرع میں اسلام نام ہے نبی برحق کی ہدایت کے بموجب خداوندی احکام کی تعمیل کرنے کا، اپنی عقل اور چاہت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اتباع کرنا اسلام نہیں بلکہ کفر ہے۔

کفرست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

حق تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ فلا و ربك لا يؤمنون ﴾ إلى قوله: ﴿ ويسلموا تسليما ﴾

(سورة النساء)

یعنی قسم ہے میرے پروردگار کی، لوگ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے جب تک آپ کو اپنے جھگڑوں اور معاملات میں حکم اور منصف نہ بنالیں، پھر جو کچھ آپ فیصلہ کریں اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی (اور ناگواری) نہ محسوس کریں اور پوری طرح (دل و جان سے) اس کو مان لیں اور تسلیم کر لیں۔

آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی قوم اللہ

تعالیٰ کی عبادت کرے اور نماز، روزہ، حج، زکوۃ سب کچھ بجالائے مگر آپ ﷺ کے کسی عمل کے بارے میں بطورِ اعتراض یہ کہے کہ آپ ﷺ نے یہ کیوں کیا؟ آیا آپ ﷺ کے کسی حکم کے متعلق دل میں تنگی محسوس کرے تو صوم وصلوٰۃ وغیرہ اعمال ہونے کے باوجود وہ کافر ومشرک کے حکم میں ہے۔ (تفسیر روح المعانی: ٥/٦٥)

فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فیصلہ:

ایک مسلمان اور یہودی کا مقدمہ آپ ﷺ کے دربار میں پیش ہوا آپ ﷺ نے تحقیق فرما کر یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرمایا، مسلمان اس فیصلہ پر راضی نہیں ہوا اور یہ مقدمہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس لے گیا، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سماعتِ مقدمہ کے بجائے فیصلہ یہ کیا کہ یہ مرتد ہو گیا ہے چنانچہ اس کی گردن اڑادی اور فرمایا کہ آپ ﷺ کے فیصلہ کو منظور نہ کرنے والے کے لیے صحیح فیصلہ یہی ہے۔

یہ ایک ضابطہ اور قانون کی بات تھی کہ آپ ﷺ کے فیصلہ سے منحرف ہونے والا اور آپ ﷺ سے زیادہ کسی اور کو منصف قرار دینے والا مرتد کافر ہے اور اسلام کا نام لیتا ہے تو یہ نفاق ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو جملہ کمالات اور محاسن کا کامل نمونہ بنا کر مبعوث فرمایا اور اعلان فرمادیا کہ

﴿لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة﴾

تو کمال وہی ہے جو کمالاتِ نبوی کا پرتو ہو اور حسن وخوبی وہی ہے جو محاسن رحمۃ للعالمین ﷺ کا نمونہ ہو۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حسن وکمال کے اس فلسفہ کو پوری طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہ صرف عبادات میں سنن نبویہ کی اتباع کرتے تھے، نہ صرف اپنی عادتوں کو آپ ﷺ کی عادتوں کے سانچہ میں ڈھالتے تھے بلکہ آپ ﷺ کے معمولی اشاروں کو بھی حکم کی حیثیت دیتے تھے اور اس کی تعمیل کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔

صحابہ کرام کی اتباعِ سنت کی چند مثالیں:

مثلاً آپ ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور آپ نے حاضرین سے فرمایا:

اجلسوا، اجلسوا.

تشریف رکھیے، اب اس حکم کی تعمیل کیسے کی گئی؟ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ دروازے کے پاس تھے، جیسے ہی یہ ارشاد کانوں میں پڑا فوراً بیٹھ گئے جب آنحضرت ﷺ نے طلب فرمایا تب وہاں سے اٹھ کر آگے گئے۔

۲۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب قبائل کی سرکشی اور ارتداد کی خبریں مدینہ منورہ میں پہنچنے لگیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ ایسے وقت میں فوج کو شام بھیجنا مناسب نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے مدینہ شریف کو خالی دیکھ کر باغی اور مرتد قبیلے حملہ کر دیں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مدینہ اس طرح خالی ہو جائے کہ میں ہی اکیلا رہ جاؤں اور درندے اور کتے مجھ کو بھنبھوڑ کھائیں تب بھی میں اسامہ کو (جو اس لشکر کے سپہ سالار تھے) اس مہم پر روانہ کروں گا جس پر آپ ﷺ روانہ فرما رہے تھے۔ (ابن عساکر وغیرہ)

۳۔ یہ خلیفہ اول صدیق اکبر کی شان تھی۔ عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہ میں سے ایک صاحب کا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ میں سے سونے کی انگوٹھی نکال کر پھینک دی اور فرمایا انسان جان بوجھ کر اپنے ہاتھ میں آگ کا انگارا رکھتا ہے۔ جب آپ ﷺ تشریف لے گئے تو کسی نے ان سے کہا کہ اسے اٹھا لو کسی اور کام میں لے آنا۔ اس صحابی نے جواب دیا نہیں نہیں خدا کی قسم میں کبھی بھی اس کو نہیں اٹھا سکتا جس کو رسول اللہ ﷺ نے پھینک دیا ہے۔

(مسلم شریف بحوالہ مشکوٰۃ شریف: ص ۳۷۸)

٤۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک تالاب میں سے کھیت میں پانی دے رہے تھے کچھ آدمی اس طرف آئے ان کے پیروں سے نالی کی ڈول ٹوٹ گئی اور پانی باہر بہنے لگا۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے پانی کو خراب ہوتے ہوئے دیکھا تو فوراً بیٹھ گئے۔ پھر اسی کیچڑ میں لیٹ گئے جو وہاں موجود تھے انہیں بہت تعجب ہوا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ سیدنا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ان لوگوں کی لاپرواہی پر مجھے غصہ آیا ساتھ ہی مجھے آپ ﷺ کا ارشاد یاد آ گیا کہ غصہ آئے تو بیٹھ جاؤ پھر بھی غصہ نہ جائے تو لیٹ جاؤ۔ لہٰذا میں نے اس ارشادِ گرامی کی تعمیل کی۔ یعنی نہ بدن کی پروا نہ کپڑوں کا خیال، نہ لوگوں کے ہنسنے اور مذاق بنانے کی فکر۔ آپ ﷺ کے ایماء مبارک کی تعمیل سب سے مقدم ہے۔ اس کے مقابلہ میں سب کچھ ہیچ ہے۔

۵۔ ایک مرتبہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز جمعہ کے لیے کپڑے بدل کر جا رہے تھے، راستہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے پرنالے سے مذبوحہ مرغی کے خون میں ملا ہوا پانی آپ کے اوپر گرا۔ آپ واپس مکان آئے کپڑے بدلے اور پرنالے کے متعلق حکم فرمایا کہ راستہ سے ہٹا دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہو چکی تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بر سبیل تذکرہ فرمایا کہ یہ پرنالہ آپ ﷺ نے اس جگہ لگوایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جیسے یہ سنا فوراً اٹھے پرنالہ پر تشریف لے گئے۔ کوئی سیڑھی نہیں تھی تو خود جھک گئے اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قسم دے کر فرمایا کہ ان کی پیٹھ پر کھڑے ہوں اور پرنالہ کو اسی جگہ لگا دیں جہاں آقاءِ نامدار محبوبِ خدا ﷺ نے لگایا تھا۔

یہ تھا صحابہ کرام کا ادب (رضوان اللہ علیہم اجمعین) پرنالہ جس جگہ بھی تھا چونکہ وہ آنحضرت ﷺ کے دست مبارک کا لگایا ہوا تھا اگر چہ لاعلمی میں ہٹا دیا مگر چونکہ ہٹا دیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ اپنی پشت پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھڑا کر کے پرنالہ کو اصلی جگہ پر لگوایا۔ ایک ادب ہمارے نوجوانوں اور بہت سے بوڑھوں کا ادب ہے کہ جس داڑھی کو آپ ﷺ نے خود بھی ہمیشہ رکھا اور مسلمانوں کو تاکید فرمائی کہ داڑھی بڑھائیں اور مونچھیں کٹوائیں۔ آج اصرار ہے کہ نہ داڑھی کا نام و نشان رکھیں گے نہ مونچھ کا، اس سے بڑی بے ادبی اور گستاخی کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال داڑھی تمام انبیاءِ کرام علیہم السلام کی سنت ہے، داڑھی اسلامی شعار ہے، داڑھی شرافت و بندگی کی علامت ہے، داڑھی چھوٹے، بڑے میں فرق کرنے والی ہے۔ داڑھی سے صورتِ مردانہ مکمل ہوتی ہے۔ داڑھی منڈانا فعل شیطان خداداد شکل کو بگاڑنا ہے داڑھی منڈانے کو اچھا سمجھنا آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی سنت مبارکہ سے عناد اور مقابلہ ہے۔ (معاذ اللہ)

فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب ''ہدایہ'' میں ہے:

ولنا ان اللحية في وقتها جمال وفي خلقها تفويته على الكمال .

(٥٧١/٤)

یعنی داڑھی اپنے وقت میں (یعنی جب سے اگتی ہے) خوبصورتی اور زینت کا باعث ہے اور اس کے منڈانے سے زینت و خوبصورتی بالکل نابود ہو جاتی ہے۔ بحر الرائق میں ہے:

لان اللحية في اوانها جمال .

یعنی داڑھی اپنے وقت میں خوبصورتی کی چیز ہے، دلیل میں یہ حدیث پیش کی ہے، اللہ تعالیٰ کے ملائکہ کی ایک جماعت کا وظیفہ ہے:

سبحان من زين الرجال باللحى والنساء بالذوائب .

پاک ذات ہے وہ جس نے مردوں کو داڑھی سے اور عورتوں کو چوٹیوں اور مینڈیوں سے زینت بخشی ۔ (تکملہ بحرالرائق: ۳۳۱/۸)

ایک روایت ہے کہ فرشتے جب قسم کھاتے ہیں تو یہ کہتے ہیں:

والذي زين بني آدم باللحى .

قسم اس ذات کی جس نے انسان کو داڑھی سے زینت بخشی ۔

حضور اقدس ﷺ سے سچی محبت ہو تو آپ کی ہر ایک بات اور ہر ایک عادت محبوب ہونی چاہیے ۔ محبوب کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے ۔ اس سے (معاذ اللہ) نفرت، محبت نہ ہونے کی علامت ہے ۔ داڑھی کا منڈانے والا حضور ﷺ کی سنت کو پامال کرنے والا ہے ۔ وہ سچا محبّ کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی نے خوب کہا ہے:

تعصى الرسول وانت تظهر حبه — هذا لعمري في الفعال بديع

لو كان حبك صادقا لاطعته — إن المحب لمن يحب مطيع

یعنی تم اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور ساتھ ہی ان کے فرمان کی خلاف ورزی بھی کرتے ہو کس قدر عجیب بات ہے اگر فی الواقع تمہارے دل میں ان کی محبت ہوتی اور تم اپنے دعویٰ محبت میں سچے ہوتے تو کبھی ان کی نافرمانی نہ کرتے ان کے ہر فعل اور اداء سے محبت ہوتی ۔

مجنوں لیلیٰ کی گلی سے جب گزرتا ہے تو در و دیوار کو چومتا اور کہتا تھا ۔

امر على الديار ديار ليلى — اقبل ذا الجدار وذا الجدار

وما حب الديار شغفن قلبي — ولكن حب من سكن الديار

میں لیلیٰ کی گلیوں سے جب گزرتا ہوں تو اس دیوار کو بھی چومتا ہوں اور اس دیوار کو بھی گلی کوچوں کی محبت دل کی لگن نہیں ہے بلکہ اس کی محبت جو ان گلیوں میں رہتی ہے ۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است   افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را   کہ دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

یعنی اپنی آنکھ پر ناز کرتا ہوں کہ اس نے تیرے جمال کا دیدار کیا ہے، اپنے پاؤں پر گرتا ہوں کہ تیری گلی میں اس کی رسائی ہوئی ہے۔ اپنے ہاتھ کو ہزار بار چومتا ہوں کہ اس نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے۔

''مثنوی'' میں ہے کہ ایک معشوق نے عاشق سے کہا کہ تو نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی ہے، سب سے اچھا شہر کونسا ہے؟ عاشق نے جواب دیا جس میں میرا محبوب رہتا ہے:

گفت آں شہرے کہ دروے دلبرست

افسوس ہوتا ہے کہ دعویٰ ہے محبت مولا اور عشق رسول کا اور عمل یہ کہ داڑھی سے معاذ اللہ نفرت؟ محبوب رب العالمین آقاء دو جہاں ﷺ کا ارشاد ہے:

لا يؤمن احدكم حتى يكون هواه تبعا لما جئت به . (مشكوٰة)

دعویٰ محبت قابل اعتبار نہیں ہے جب تک ایسا نہ ہو جائے کہ صاحبِ ایمان کی چاہ (خواہش) میری تعلیم کے تابع نہ ہو جائے۔

یعنی دل کی خواہش اور دل کا جذبہ وہی ہے جو آپ ﷺ کی تعلیم اور آپ کی سنت ہے۔

بار بار ارشاد ہوا جو میری سنت پر عمل نہ کرے وہ میرا نہیں ہے، جو دوسروں کے طریقے پر چلے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو میرے طریقے سے منہ پھیر لے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے، جس نے میری سنت برباد کی اس پر میری شفاعت حرام ہے۔

سنت سے روگردانی خطرناک ہے:

ایک مرتبہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ حدیث بیان فرما رہے تھے:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحب الدباء .

''حضور ﷺ کدو کو پسند فرماتے تھے۔''

ایک شاگرد فوراً بول اٹھا مگر میں تو پسند نہیں کرتا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے تلوار نکال کر کہا توبہ کرو ورنہ قتل کر دوں گا۔

مدینہ شریف میں ایک صاحبِ نسبت بزرگ کی زبان سے اتنی بات نکل گئی کہ شام یا

ہندوستان کا دہی یہاں کے دہی سے اچھا ہے۔ آپ ﷺ نے خواب میں (یا عالم واقع میں) فرمایا کہ ہمارے یہاں سے چلے جاؤ، وہاں جا کر رہو جہاں کا دہی اچھا ہے۔

امام ربانی فرماتے ہیں کہ تمام سنن خداوند عالم کی پسند فرمودہ ہیں اور جو چیزیں خلاف سنت ہیں وہ شیطان کی پسند کردہ ہیں۔ (مکتوبات: ۱/ ۲۵۵)

آپ سوال کرتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ برادر اسلام! خواہش کے بندوں کی ملامت اور لعن طعن سے گھبرا کر حق بات کو چھوڑنا ابوطالب کا طریقہ ہے۔ آپ ﷺ نے ابوطالب کو بوقت مرگ کہا کہ چچا ایک دفعہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ دو۔ ابوطالب نے جواب میں کہا:

اظهرت دينا قد علمت بانه — من خير اديان البرية دينا

لو لا الملامة او حذار مسبة — لوحدتنی سمحا لذلك مبينا

یعنی آپ ﷺ نے میرے سامنے ایسا دین پیش کیا ہے جس کو میں دنیا کے تمام ادیان سے افضل سمجھتا ہوں اگر مجھے لوگوں کی ملامت اور لعن طعن کا ڈر نہ ہوتا تو آپ مجھے قبولیت حق میں جواں مرد پاتے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کی لعن طعن سے ڈر کر حق بات کو چھوڑ دینا ابوطالب کا طریقہ ہے اور ساری دنیا کی ملامت کی پروا کئے بغیر حق کو پکڑے رکھنا مجاہد اسلام حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی سنت ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سفر میں تھے۔ آپ کے ہاتھ مبارک سے کھاتے کھاتے لقمہ گر گیا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے اس کو اٹھا کر صاف کر کے منہ میں ڈالنے لگے۔ عجمی لوگ یہ دیکھ رہے تھے خادم نے چپکے سے کہا۔ حضرت ایسا نہ کیجئے، یہ عجمی گرے ہوئے لقمہ کو اٹھا کر کھا لینا بہت برا جانتے ہیں اور ایسے لوگوں کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا:

أأترك سنة حبيبي لهؤلاء الحمقاء.

کیا میں ان بیوقوفوں کی وجہ سے اپنے حبیب ﷺ کی سنت چھوڑ دوں؟

یہ ہے ایمان، یہ ہے آپ ﷺ کے افضل الانبیاء ہونے اور آپ کی تعلیم کے مکمل ترین تعلیم ہونے پر اعتماد! خادم عجمیوں کی تہذیب سے مرعوب ہے اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اپنے حبیب پاک ﷺ کی تہذیب پر نازاں، ہر اس شخص کو احمق کہتے ہیں جو محبوب خدا ﷺ کو کامل معلم نہ سمجھے اور آپ کی تہذیب کا شیدا نہ ہو۔ آپ داڑھی نہ منڈائیے۔ آپ ان نادانوں کی بات پر عمل کریں

گے تو گناہگار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر ﷺ کو ہدایت فرمائی ہے۔ ہم نے تم کو دین کے ایک خاص طریقہ پر لگا دیا ہے اسی طریقہ پر چلتے رہو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو علم سے ناآشنا ہیں۔ (سورۂ جاثیۃ) (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ : ۳۹۸/۲)

ظالم ظلم سے باز نہ آئے تو کیا تدبیر کی جائے:

ایسے شخص کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ دونوں میں عداوت دور کرنے اور اتفاق و باہمی محبت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اس میں اگر کامیابی نہ ہو اور ایک گروہ ظلم و زیادتی پر کمر کس لے تو دوسرے مسلمان خاموش ہو کر تماشہ نہ دیکھیں بلکہ جس کی زیادتی ہو تمام مسلمان متفق ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ یہاں تک کہ ظالم مجبور ہو کر ظلم و زیادتی سے باز آجائے جب یہ باز آجائے تو عدل و انصاف کے تقاضے کو سامنے رکھ کر ان دونوں میں صلح و صفائی اور میل ملاپ کرادو۔

(سورۂ حجرات)

اور حدیث شریف میں ہے کہ آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا تمہیں نجات نہ ملے گی تاوقتیکہ ظالموں کو اپنے ظلم سے باز نہ رکھو اور ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا تم امر بالمعروف کرتے رہو اور ظالموں کو ظلم سے روکتے رہو اور حق بات کی طرف کھینچ کر لاتے رہو ورنہ تمہارے قلوب بھی اسی طرح مسخ کر دیے جائیں گے جس طرح ان لوگوں کے کر دیے گئے اور اسی طرح تم پر بھی لعنت ہوگی جس طرح ان پر یعنی بنی اسرائیل پر ہوئی اور ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

انصر اخاك ظالماً او مظلوماً .

تم اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم سوال کیا گیا یا رسول اللہ! مظلوم کی مدد تو کریں گے مگر ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو۔ (بخاری شریف : ۳۳۱/۱ ، پارہ : ۹)

اس زمانہ میں ظالم، ڈاکو، بدمعاش، چور کو اور دیگر جرائم پیشہ افراد کو کھلے عام جرم کرنے کی جرأت اس لیے بھی ہوتی ہے کہ ظالم کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے، بھرے بازار میں کسی کو قتل کر کے مال لے کر روانہ ہو جاتا ہے، لوگ تماشہ بین بن کر دیکھتے رہتے ہیں، یہ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

بوسیدہ اوراق کا حکم:

پراگندہ اوراق یا بوسیدہ قرآن مجید کو دفن یا دریا برد کیا جائے یا کس طرح نیز دیگر اوراق انگریزی اخبارات وغیرہ کی (جن میں بعض مواقع پر آیات اور انگریزی کتب یا اخبارات وغیرہ میں تصاویر بھی ہوتی ہیں) کس طرح تلف کیا جائے؟

قال في العالمگيرية: المصحف إذا صار خلقا لا يقرأ منه ويخاف ان يضيع يجعل في خرقة طاهرة ويدفن ودفنه اولى من وضعه موضعا يخاف ان يقع عليه النجاسة اهـ. (٦/٢١٦) وفيه.

المصحف إذا صار خلقا وتعذر القرأة منه لا يحرق بالنار اشار الشيباني الى هذا وبه نأخذ اهـ.

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کو تو دفن کر دینا چاہیے جلانا نہیں چاہیے باقی اوراق جن میں قرآن کی آیت یا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا نام ہو اس میں سے آیت، اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کا نام نکال لینا چاہیے ان کو دفن کر دیا جائے اور اور باقی کو جلا دینا جائز ہے، مگر قرآن اور اللہ تعالیٰ کے نام کو اس طرح دفن کیا جائے جس طرح بغلی قبر میں مردہ کو رکھا جاتا ہے تاکہ اس پر مٹی نہ پڑے۔

ويلحد له' لانه' لو شق ودفن يحتاج إلى اهالة التراب عليه وفي ذالك نوع تحقير الا إذا جعل فوقه سقف بحيث لا يصل التراب عليه فهو حسن ايضاً كذا فى الغرائب اهـ. عالمگيرية

(ماخوذ از امداد الاحكام: ٤/٣٩٤)

کفار سے دوستی اور میل جول رکھنے کا حکم:

کفار سے معاملات بیع و شراء اجارہ وغیرہ جائز اور بضرورت ظاہری میل جول میں بھی مضائقہ نہیں، باقی بلا ضرورت میل جول کرنا جائز نہیں اور رابطہ محبت و دوستی بھی جائز نہیں باقی معاملات ہر حال میں جائز ہیں۔

ہندوؤں کے تیار کردہ کھانے کا حکم:

ہندوؤں کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی، اسی طرح مٹھائی اور گھی وغیرہ استعمال کرنا جائز ہے لیکن گوشت کھانا جائز نہیں، کیونکہ ان کا ذبیحہ حرام ہے۔

ہندوؤں کی نیز دوسرے کفار کی دعوت قبول کرنا اس شرط سے جائز ہے کہ کھانے کے اندر کوئی حرام چیز شامل نہ ہو اور نہ کھانے کی مجلس ناچ گانا وغیرہ کی ہو۔

كذا في الدر المختار والشامي من الحظر والاباحة

پھر بھی بہتر یہی ہے کہ شرکت سے احتراز کرے، کفار و مشرکین کے ساتھ کھانے کے متعلق فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ کہیں اتفاق سے گھر جائے اور ضرورت سمجھے تو مضائقہ نہیں مگر بلا ضرورت شریک ہونا یا عادت ڈال لینا جائز نہیں۔

لما في العالمگيرية: إن ابتلى المسلم مرة او مرتين فلا بأس به، واما الدوام عليه فيكره كذا في المحيط. هندية كتاب الكراهية.

(إمداد المفتين: صـ ١٠١٥)

فتاویٰ عالمگیریہ میں ہے کہ مسلمان ایک آدھ مرتبہ کفار کی دعوت میں شرکت پر مجبور ہو جائے اور مجبوراً شرکت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن ہمیشہ اس کی عادت ڈالنا مکروہ ہے۔

کافر کی عیادت وتعزیت:

کافر کی عیادت جائز ہے اور جب مر جائے تو اس کے وارثوں کی تعزیت بھی جائز ہے مگر تعزیت اس مضمون سے کی جائے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس سے بہتر بدلہ عطا فرمائے لیکن کافر کے جنازے کے ساتھ اس کے مرگھٹ تک جانا جائز نہیں کیونکہ اس میں جیفہ کافر کی تعظیم وتکریم ہے اور وہ مستحق تعظیم نہیں۔

نیز جنازہ کے ساتھ جانے کا ایک مقصد شفاعت کرنا بھی ہے اور ظاہر ہے کافر شفاعت کا اہل نہیں۔

قال في العالمگيرية: الباب الرابع عشر من الكراهية ولا باس بعيادة اليهودي والنصراني وفي المجوسي اختلاف كذا في التهذيب ويجوز عيادة الذمي كذا في التبيين الى قوله وإذا مات الكافر قال لولده او قريبة في تعزيته اخلف الله عليك خيراً منه واصلحك اي اصلحك بالاسلام الخ. (عالمگيري كشوري: ٤/ ٢٢٨)

وصرح باهانة جيفة الكافر في جنائز الشامي والدر المختار

حیث قال فیغسله غسل الثوب النجس وایضا قیده بالاحتیاج ای إذ لم یکن له قریب غیره من اهل ملته ثم قال فلو له قریب فالأولی ترکه لهم. (شامی: ۱/۵۹۷)

قادیانی کی تجہیز و تکفین اور اس کے نکاح میں شرکت:

اس سلسلہ میں ایک سوال و جواب نقل کیا جاتا ہے:

سوال: ۱۔ کسی قادیانی کی تجہیز و تکفین میں دیدہ دانستہ حصہ لینے والے مسلمان کے حق میں کیا حکم ہے؟

۲۔ قادیانی کی شادی میں شرکت کرنا اور امداد کرنا کیسا ہے؟

۳۔ دعوت قادیانی کی مسلمان کے لیے کیسی ہے؟

٤۔ علماء دین کے فتویٰ کو غلط بتانے والے اور توہین کرنے والے کے لیے کیا حکم ہے؟

۵۔ عزیز و اقارب دوست آشنا نیز برادری کے بھائی اور مسلمانانِ قصبہ قادیانیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کریں تا کہ وہ عنداللہ ماخوذ نہ ہوں؟

٦۔ قادیانی کی شادی میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

جواب: ۱۔ مرزا غلام احمد کے تمام متبعین خواہ کسی پارٹی کے ہوں جمہور علماء اسلام کے اتفاق سے کافر و مرتد ہیں ان کے جنازہ کی نماز پڑھنا یا شریک ہونا ہرگز جائز نہیں اور جو کوئی مسلمان شریک ہو وہ گناہ گار ہے توبہ کرنی چاہیے۔

۲۔ یہ بھی ناجائز ہے کیونکہ اس سے لوگ ان کو مسلمان سمجھنے لگتے ہیں اور ان کو اپنی گمراہی پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔

قال اللّٰہ تعالیٰ: ﴿ ولا تقعد بعد الذکری مع القوم الظلمین O ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار ﴾

۳۔ ہرگز نہ کھانی چاہیے بالخصوص ذبیحہ ان کا بالکل مردار ہے اس سے پرہیز ضروری ہے۔

٤۔ ایسا شخص سخت گناہگار ہے بلکہ اندیشہ کفر ہے توبہ کرنی چاہیے۔

صرح به في كلمات الكفر من جامع الفصولين والبحر.

۵۔ مسلمانوں کو قادیانیوں سے کسی قسم کا تعلق شرکت شادی و غمی وغیرہ کا ہرگز نہ رکھنا چاہیے اگر چہ رشتہ داری و قرابت بھی ہو۔ رشتہ اسلام کے قطع کرنے والے کے ساتھ رشتہ قرابت کوئی چیز نہیں۔

٦۔ قادیانی مرد یا عورت کا کسی سے نکاح نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ مرتد ہیں اور مرتد کا نکاح کسی سے منعقد نہیں ہو سکتا۔

قال في الدر المختار : ولا يصلح ان ينكح مرتدا و مرتدة احدا من الناس مطلقاً . (ماخوذ إمداد المفتين : صـ ۱۳۳)

قادیانیوں سے اختلاط:

مرزائیوں کے دونوں فریق قادیانی ولاہوری بالیقین مرتد خارج عن الاسلام ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو مرتد کا کیا حکم ہے؟ مرتدین کے ساتھ اختلاط و برتاؤ کرنا عوام کو ان کی باتیں سننا، جلسوں میں شریک ہونا، ان سے مناکحت کرنا ان کی شادی و غمی میں شریک ہونا ان کے ساتھ کھانا پینا، تجارتی تعلقات قائم رکھنا، ان کو ملازم رکھنا یہ امور جائز ہیں یا نہیں؟ تو ان کا حکم یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کا کافر مرتد ہونا اور اس کے اقوال وکلمات غیر محصورہ کا غیر محتمل التاویل ہونا اظہر من الشمس ہو چکا ہے اور اسی لیے جمہور علمائے امت ان کی تکفیر پر متفق ہیں اس کی مفصل تحقیق کرنا ہو تو مستقل رسائل مثل اشد العذاب مصنفہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب اور القول الصحيح في مكائد المسيح مصنفہ مولانا محمد سہول صاحب اور مطبوعہ فتاویٰ علمائے ہند در بارہ تکفیر قادیانی جس میں ہر ضلع وصوبہ کے علماء کے سینکڑوں دستخط و تصدیق ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں جائیں۔

پھر مرزائیوں کے دونوں فرقے قادیانی اور لاہوری اتنی بات پر متفق ہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مسلمان بلکہ مجدد و محدث اور مسیح موعود تھا اور ظاہر ہے کہ کسی کافر مرتد سے متعلق بعد اس کے عقائد معلوم ہو جانے کے ایسا عقیدہ رکھنا خود کفر ارتداد ہے۔ اسلیے بلا شبہ دونوں فرقے کافر و مرتد ہیں اور اب تو لاہوریوں نے جو تحریف قرآن اور انکار ضروریات دین کا خاص طور پر بیڑا اٹھایا ہے اس کے سبب اب وہ اپنے کفر وارتداد میں مرزا صاحب کے تابع ہونے سے مستغنی ہو کر خود بالذات ارتداد کے علمبردار ہیں اس لیے دونوں فرقوں سے عام مسلمانوں کا اختلاط اور ان کی باتیں سننا،

جلسوں میں شریک ہونا یا ان کو جلسے میں شریک کرنا، شادی وغمی اور کھانے پینے میں ان کو شریک کرنا سخت گناہ ہے اور مناکحت قطعاً حرام ہے اور جو نکاح پڑھ بھی دیا جائے تو نکاح منعقد نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر انعقادِ نکاح کے بعد مرزائی ہو جائے تو نکاح فوراً فسخ ہو جاتا ہے البتہ تجارتی تعلقات اور ملازمت میں رہنا یا ملازم رکھنا بعض صورتوں میں جائز ہے۔ بعض میں وہ بھی ناجائز ہے اس لیے بلا ضرورتِ شدیدہ اس سے بھی احتراز ضروری ہے۔ (ماخوذ از امداد المفتین : ص ١٠٢٤)

قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانا مکروہِ تحریمی ہے:

قبلہ کی طرف پیشاب، پاخانہ کرنا، پیر کرنا یا تھوکنا مکروہِ تحریمی ہے۔ درمختار میں ہے:

ویکرہ تحریما استقبال القبلة بالفرج وکذا استدبارها في الاصح الی ان قال کما کره مدر جلیه في نوم أو غيره اليها ـ اي عمدا لانه اساءة الادب الخ .

البتہ قبلہ کی طرف پشت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ (امداد المفتین : ص ١٣٥)

چھپکلی کو مارنا ثواب ہے:

چھپکلی اور گرگٹ دونوں کا مارنا باعث اجر وثواب ہے، حدیث میں ''وزغ'' کا لفظ ہے جو دونوں کو شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کے مارنے پر اجر وثواب کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ آتش نمرود میں پھونک مار کر اس کو تیز کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضرر پہنچانے میں تعاون کر رہی تھی۔

عن ام شریك رضي الله تعالیٰ عنها ان رسول الله صلی الله علیه وسلم امر بقتل الوزغ وقال وکان ینفخ علی ابراهیم علیه السلام .

(بخاري : ٤٧٤/١)

ام شریک رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے گرگٹ، چھپکلی قتل کرنے کا حکم فرمایا ہے کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی آگ تیز کرنے کے لیے پھونک مار رہا تھا۔

وعن ابي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلی الله علیه وسلم من قتل وزغا في اول ضربة کتبت له مائة حسنة وفي الثانية دون ذلك وفي الثالثة دون ذلك . (مسلم : ٢٣٦/٢)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے چھپکلی کو ایک مرتبہ میں قتل کر دیا اس کو سو نیکیاں ملیں گی اور جس نے دو مرتبہ میں مارا اس کو بھی ثواب ملے گا اور جس نے تین مرتبہ میں قتل کیا اس کو بھی ثواب ملے گا۔

عن ابي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من قتل وزغة بالضربة الاولى كان له كذا و كذا حسنة فإن قتلها في الضربة الثالثة كان له كذا كذا احسنة وفي الباب عن ابن مسعود و ام شريك و حديث ابي هريرة حديث حسن صحيح .

(ترمذي : ١/٢٧٣)

قال الإمام القرطبي رحمه الله تعالىٰ : وقال كعب وقتادة والزهري ولم تبق يومئذ دابة الا اطفأت عنه الا الوزغ فإنها كانت تنفخ عليه فلذلك امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقتلها عليه فلذلك امر رسول الله صلى الله عليه وسلم بقتلها و سماها فويسقه .

(الجامع للاحكام القرآن : ١١/٣٠٤ ، ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ٨/١٨٧ مع اضافه

غسل خانہ میں پیشاب کرنا:

غسل خانہ میں پیشاب کرنا کیسا ہے؟ جبکہ فرش پختہ ہو اور پیشاب کر کے اس پر پانی بہا دیا جائے، تو اس کا حکم یہ ہے کہ فی نفسہ اس طرح پیشاب کرنا جائز تو ہے مگر احتراز بہتر ہے کیونکہ اس سے وساوس پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يبولن احد كم في مستحمه ثم يغتسل أو يتوضاء فيه فإن العامة الوساوس منه .

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ مع اضافه)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی غسل خانے میں پیشاب نہ کرے پھر اس میں غسل یا وضوء کرے کیونکہ عام طور پر اس سے وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔

انجکشن کے ذریعہ جانوروں کو حاملہ کروانے کا حکم:

مصنوعی طریقہ سے انجکشن وغیرہ کے ذریعے گائے، بھینس وغیرہ کو حاملہ کرنے میں شرعاً کوئی

قباحت نہیں، یہ عمل شرعاً جائز ہے اور ایسے جانور کا دودھ اور گوشت بلاشبہ حلال ہے۔

رخصتی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے دعوت:

لڑکی والوں کی طرف سے جو دعوت نکاح کے موقع پر کی جاتی ہے، اگر اس کو سنت سمجھ کر کیا جائے تو ناجائز اور بدعت ہے اور واجب الترک ہے اور ایسی دعوت میں شرکت کرنا بھی درست نہیں، اگر سنت تو نہ سمجھی جائے لیکن دعوت کرنے کو ضروری اور لازمی سمجھا جائے تب بھی یہ دعوت ممنوع اور قابل ترک ہے۔

البتہ لڑکی والوں کے ہاں ان کے جو مہمان قریب ترین اعزاء اقرباء اور خصوصی احباب جمع ہوں ان کے لیے کھانا تیار کرانا اور کھلانا درست ہے کیونکہ یہ مہمان نوازی میں داخل ہے۔

(ماخذ از رجسٹر نقل فتاویٰ دارالافتاء دارالعلوم کراچی الف ۱۱۷/۳۸)

ولیمہ کا مسنون وقت:

دعوتِ ولیمہ کے مسنون وقت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں:

۱. عقد نکاح کے وقت ۲. عقد نکاح کے بعد

۳. زفاف کے بعد ٤. نکاح سے لے کر زفاف تک

البتہ جمہور کا قول زفاف کے بعد کرنے کا ہے۔

(راجع نیل الاوطار: ۲۵۰/۲، تاج ۲۷۹/۲)

رسم نیوتہ کا حکم:

کسی تقریب میں صاحب تقریب کو بطور ہبہ یا تحفہ کے کوئی رقم یا کوئی اور چیز دی جائے جس میں نہ تو دکھاوا ہو اور نہ صلہ اور بدلہ لینے کی نیت ہو تو اس قسم کی امداد کرنا جائز ہے اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن آج کل شادی بیاہ کی تقریبات میں شادی کے موقع پر جو کچھ دیا جاتا ہے اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے اور اہتمام کے ساتھ تحفہ یا رقم دینے والے کا نام وغیرہ لکھا جاتا ہے اور واپس کرتے وقت اس دی ہوئی رقم سے زیادہ دیا جاتا ہے بلکہ اس سے زیادہ دینے کو ضروری اور لازمی سمجھا جاتا ہے (اگرچہ اس تحفہ یا رقم کے واپس کرنے کا معاہدہ نہیں ہوتا) یہ شرعاً ناجائز اور حرام ہے۔

اس مروجہ لین دین کو ہبہ یا تحفہ تو نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ قرض ہے کیونکہ جب اس امداد اور تحفہ

کے نام سے دینے والے کی باری آتی ہے تو اس کی امداد بھی وہی لوگ کرتے ہیں جن کی امداد پہلے یہ کر چکا ہے بلکہ اس کو ضروری اور اس سے زیادہ دینے کو لازمی سمجھا جاتا ہے تو ثابت ہوا کہ یہ قرض ہے پھر جب یہ قرض ادا ہوگا تو اپنے ساتھ ادھر سے مزید رقم کھینچ کر لائے گا اس طرح یہ قرض ایک طرح کا نفع لانے والا بن گیا اور یہ سود کی ایک صورت ہے کیونکہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں قرآن کریم کی اس آیت ﴿ وما اتيتم من ربا ليربوا في اموال الناس ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے اس کو سود کی ایک صورت قرار دیا ہے۔

(معارف القرآن : ٦/٧٣٨) (روح المعاني : ١/٤٥)

اس مذکورہ بالا تفصیل اور مفسرین کے اقوال فقہاء کرام کی عبارات احادیث و آثار کی تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ یہ لین دین قرض ہے اس پر ملنے والی زیادتی سود کی ایک صورت ہے لہٰذا یہ رسم ناجائز اور حرام ہے۔

تمام لوگوں کو اس رسم سے بچنا واجب ہے اگر کسی کے ذمہ اس کی رقم باقی ہو تو ان پر ضروری ہے کہ وہ فوراً اس رقم کو ادا کریں اور اگر خود کسی سے لینی ہے تو اگر وصول کرنا چاہے تو وصول کر لیں ورنہ معاف کر دے آئندہ اس سے اجتناب کرے۔

التفاخر بالانساب

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ایک تحریر پیش خدمت ہے:

زخاک آفریدت خداوند پاک تو اے بندہ افتادگی کن چو خاک

تفاخر بالانساب کا سب سے زیادہ چرچا عرب جاہلیت میں رہا جس کو اسلام نے آ کر مٹایا۔ پھر قرونِ مابعد میں مسلمانوں میں دوبارہ یہ بلا پیدا ہوگئی۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کو اعتقاداً سب ہی برا جانتے ہیں، خواہ غفلت کی وجہ سے مبتلا ہو جائیں اس لیے اس بحث میں زیادہ تفصیل کی حاجت نہیں، چند احادیث اور اقوالِ سلف کو بطورِ تذکیر و نصیحت ذکر کر دینا کافی ہے۔

ارشادِ نبوی:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے روز طواف سے فارغ ہونے کے بعد ایک خطبہ دیا، جس میں ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے تم سے عیوبِ جاہلیت اور غرور وتکبر کو دور فرمایا۔

(اب) انسان کی (صرف) دو قسمیں ہیں، ایک نیک متقی اور وہ اللہ کے نزدیک عزت والا ہے اور دوسرا فاسق وفاجر اور وہ اللہ کے نزدیک ذلیل ہے۔

(الغرض مدار عزت وذلت اللہ کے نزدیک تقویٰ وعمل صالح ہے، انساب وقبائل نہیں) سب آدمی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا، اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿ یاایها الناس إنا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند اللّٰه أتقاکم ﴾

یہ حدیث ترمذی اور بیہقی وغیرہ محدثین نے روایت کی ہے۔ (از تفسیر روح المعانی: ۱۴۸/۳)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں ایام تشریق کے درمیان ایک خطبہ دیا جس کے بعض کلمات یہ تھے:

اے لوگو! تمہارا مالک پروردگار ایک ہے، کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی کالے کو گورے پر، نہ گورے کو کالے پر مگر تقویٰ کے ساتھ۔

﴿ إن أکرمکم عند اللّٰه أتقاکم ﴾

پھر حاضرین سے خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے حکم خداوندی اچھی طرح پہنچا دیا یا نہیں؟ لوگوں نے عرض کیا بیشک، آپ نے فرمایا کہ تو حاضرین یہ نصائح غائبین تک پہنچا دیں۔

(بیهقی، ابن مردویه از روح: ۱۴۸/۹)

حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''تم سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے، ہر قوم کو چاہیے کہ اپنے آباء واجداد پر فخر کرنے سے باز آجائے ورنہ اللہ کے نزدیک وہ نجاست کے کیڑوں سے بھی زیادہ ذلیل ہو جائیں گے۔ (رواہ البزار فی مسندہ روح: ۱۴۹)

فخر بالانساب پر آنحضرت ﷺ کی تنبیہ اور ابوذر غفاریؓ کا قابل تقلید عمل:

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک شخص کے ساتھ کسی معاملہ میں گفتگو تیز ہوگئی اور ان کی زبان سے نکل گیا ''یا ابن السوداء'' آنحضرت ﷺ نے سن لیا تو فرمایا:

یا ابا ذر طف الصاع طف الصاع لیس لابن البیضاء علی ابن السوداء فضل۔

اے ابوذر! تم سب ایک ہی پیمانہ کے ناپے ہوئے (برابر سرابر) ہو، یعنی ایک ہی باپ کی اولاد ہو کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کی کہاں تاب لا سکتے تھے کہ ان کی کوئی حرکت سرورِ عالم ﷺ کے خلافِ مزاج واقع ہو، الفاظ مذکورہ کا زبانِ مبارک سے سننا تھا کہ فوراً زمین پر لیٹ گئے اور اس شخص سے جس کے متعلق ناسزا الفاظ نکل گئے تھے، عرض کیا کہ کھڑے ہو کر میرے چہرے پر پیر رکھو۔ یہ واقعہ احیاء العلوم میں مذکور ہے اور تخریج عراقی میں بحوالہ مسند احمد اس کی تائید کی گئی ہے۔ (احیاء العلوم: ۳/۲۰۳)

حسب ونسب پر فخر وغرور اور دوسروں کی تحقیر کے متعلق حدیث، تفسیر اور اخلاق و سیر مختلف فنون اسلامیہ کی کتابوں میں مذمتوں اور قبائل کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے اور بلا شبہ وہ شخص جو کوئی ذاتی کمال نہیں رکھتا محض شرافت نسب پر فخر کرتا ہے اس کی مثال ٹھیک ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی مردہ کے حلق میں خمیرہ مروارید ڈال دے یا کسی سڑے ہوئے مردار کی گردن میں گراں قدر جواہرات کا ہار لٹکا دے تو اس سے نہ مردہ میں کوئی قوت پیدا ہوگی اور نہ سڑے ہوئے مردار میں کوئی زینت۔

یہ مثال اس جگہ اس لیے بھی زیادہ چسپاں اور صحیح ہوگی کہ جس طرح مردہ بے جان میں خمیرہ مروارید اور عقدِ جواہرات کے بے سود اور بے کار ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ چیزیں بالکل بیکار ہوں اسی طرح اس جگہ بد اعمالی اور بد اخلاقی کے ساتھ شرافتِ نسب کے بیکار و بے فائدہ ہونے سے بھی شرافتِ نسب کا مطلقاً غیر مفید و بیکار ہونا لازم نہیں آتا بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ شرافتِ نسب ایک نعمتِ الٰہیہ ہے مگر اس کے مفید ہونے کے لیے اپنے ذاتی اعمال واخلاق کا فی الجملہ درست ہونا شرط ہے۔

اس لیے جس شخص کو اللہ تعالیٰ شرافتِ نسب کی نعمت عطا فرمائے اس کو تو بہ نسبت دوسروں کے اور بھی زیادہ اصلاحِ اعمال واخلاق کی طرف توجہ کرنی چاہیے کیونکہ اول تو اس نعمت کا اقتضاء اور شکر یہی ہے۔ دوسرے بزرگوں کی طرف نسبت جتنی زیادہ ہے اتنی ہی اس کی ذمہ داریاں زیادہ

ہیں کم از کم نسبت کی لاج رکھنے کے لیے بدنامی کے مواقع سے بچیں۔

الانتساب الی غیر الانساب:

معاملۂ انساب میں دوسری بے اعتدالی یہ ہے کہ بعض لوگ اپنا نسب آبائی چھوڑ کر اپنے آپ کو دوسرے انساب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

ایک قوم اس میں سرگرم ہے کہ اپنے آپ کو انصاری ثابت کرے اور اپنا نسب انصار سے جا ملائے تو دوسری اس کے درپے ہے کہ اپنے آپ کو قریش میں داخل کرے، تیسری یہ چاہتی ہے کہ راعی بن کر عرب میں داخل ہو جائے کوئی اس فکر میں ہے کہ اپنے آپ کو شیخ صدیقی یا فاروقی، عثمانی، علوی ظاہر کرے تو کوئی سید بننے کے درپے ہے۔

اور منشاء اس کا تکبر و غرور ہے جو فی نفسہٖ بھی گناہِ کبیرہ ہے اور اس کی وجہ سے یہ نسب بدلنا مستقل دوسرا کبیرہ گناہ ہے، احادیث صحیحہ صریحہ میں اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کے ترجمے ذیل میں درج ہیں:

حضرت سعد بن ابی وقاص اور ابو بکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

من ادعی الی غیر ابیه وهو یعلم انه غیر ابیه فالجنة علیه حرام.

(رواه البخاری و مسلم و ابو داؤد و ابن ماجه ترغیب و ترهیب: ۵۷/۳)

جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کرے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ میرا باپ نہیں تو اس پر جنت حرام ہے۔

اور اسی مضمون کی ایک حدیث بخاری و مسلم میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ بخدا ہمارے پاس سوائے اس کتاب اللہ کے اور کوئی نیا قرآن نہیں جس کو ہم پڑھتے ہوں، البتہ رسول اللہ ﷺ کا ایک والا نامہ ہے جس میں چند احکام مذکور ہیں جس کو کھول کر سنایا اس میں منجملہ دوسرے احکام کے ایک یہ بھی تھا:

من ادعی الی غیر ابیه او انتمی الی غیر موالیه فعلیه لعنة الله والملائکة و الناس اجمعین لا یقبل الله منه یوم القیامة عدلا و لا

صرفا .

(رواہ البخاری ؛ ومسلم وابو داؤد وابن ماجه ترغیب و ترهیب : ۳/ ۸۸)

جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرے یا آزاد کردہ غلام اپنے آپ کو اپنے آقا کے قبیلہ کے سوا اور قبیلہ کی طرف نسبت کرے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ اس کا فرض قبول فرمائے گا نہ نفل۔

اور اسی مضمون کی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ابو داؤد میں اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مسند احمد وابن ماجہ وغیرہ میں بھی مروی ہے۔

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ کی اپنے دادا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''انسان کے گناہ کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ کسی نسب سے تبری کرے اگر چہ وہ نسب ادنیٰ ہی ہو اور ایسے نسب کا دعویٰ کرے جس میں اس کا ہونا معروف نہیں، اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ (از ترغیب:۳/ ۸۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے آپ کو اپنے باپ کے سوا دوسرے کی طرف منسوب کرے وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔ حالانکہ اس کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے محسوس ہوتی ہے۔ (مسند احمد، ابن ماجہ از ترغیب:۳/ ۸۸)

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

من ادعی نسبا لا یعرف کفر باللّٰه او انتفی من نسب وان دق كفر باللّٰه . (رواه الطبراني الاوسط ترغيب : ۳/ ۸۹)

جو شخص کسی ایسے نسب کا دعویٰ کرے جو اس کے لیے معروف نہیں تو اس نے اللہ تعالیٰ کا کفر کیا (یعنی نافرمانی کی) یا کسی نسب سے تبری کی اگر چہ وہ ادنیٰ نسب ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کا کفر کیا۔

احادیثِ مذکورہ کی اس قدر سخت وعیدوں کے سننے اور سمجھنے کے بعد بھی کیا کوئی مسلمان نسب بدلنے اور خلاف واقع ظاہر کرنے پر جرات کرے گا؟

ہرگز باور نمی آید ز روئے اعتقاد ایں ہمہ ہا کردن و دین پیمبر داشتن

بعض نسب بدلنے والوں کا عذر لنگ:

کہا جاتا ہے کہ کپڑا بننے والوں کا نام جو ہمارے عرف میں جولاہا ہے یہ نام مستنکر و مکروہ ہے

کیونکہ یہ لفظ دراصل سنسکرت زبان کا ہے جس کے معنی ظالم کے ہیں اور برے ناموں کے رکھنے سے آپ ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے، اس لیے ہم اپنے کو بجائے جولاہا کے انصاری کہتے ہیں اور وجہ مناسبت یہ ہے کہ پیشہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا بھی یہی تھا۔ الغرض ہم اپنے کو انصاری بہ حیثیت نسب نہیں کہتے بلکہ بہ حیثیت پیشہ کہتے ہیں۔

لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اول تو یہ غلط ہے کہ جولاہا کے معنی اردو میں مستنکر ومکروہ ہیں کیونکہ اصل لفظ چاہے سنسکرت کا ہو یا کسی اور زبان کا اور معنی ظالم کے ہوں یا کچھ اور لیکن اردو میں اس کا مفہوم اس سے زائد نہیں کہ کپڑا بننے والے کو جولاہا کہتے ہیں اور ناموں کے مکروہ و مستنکر ہونے کا اعتبار اسی زبان کے اعتبار سے ہونا چاہیے جس زبان کا لفظ سمجھ کر استعمال کیا جاتا ہو۔ اس لیے اردو زبان میں یہ لفظ کوئی مکروہ لفظ نہیں خواہ سنسکرت میں اس کے معنی کتنے ہی قبیح ہوں۔ علاوہ ازیں اگر یہی باعث تھا تو کوئی اور نام جیسے نورباف یا بافندہ وغیرہ رکھ لیتے۔ لفظ انصاری جو ایک خاص خاندان کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی معنی میں شہرت پاچکا ہے اس کو اپنا لقب قرار دینا عرف عام کے لحاظ سے اسی نسب کا مدعی بنتا ہے۔

اور احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوچکا ہے کہ غیر نسب کی طرف اپنے کو منسوب کرنا سخت حرام اور وعید شدید کا موجب ہے اور اگر بالفرض کسی کی نیت ادعائے نسب کی نہ ہو بلکہ محض پیشہ کے لحاظ سے نسبت کرنا مقصود ہو تو کم از کم التباس اور مغالطہ سے خالی نہیں۔

جیسے کوئی نبی اور رسول اپنے آپ کو کہنے لگے اور معنی یہ مراد لے کہ میں خبر دینے والا قاصد ہوں تو شرعاً اس معنی سے بھی اپنا لقب نبی اور رسول رکھنا حرام ہے، کیونکہ التباس کا سبب ہے۔

ان سب باتوں کو چھوڑ کر یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ منشاء ان نسبتوں کے تقرر اور القاب کے اور ردوبدل کا وہی ایک مرض لاعلاج محض تکبر وتعلی ہے جو خود حرام اور ناجائز ہے۔

اور جو اس کے بعد بھی عزت فانیہ موہومہ پر عزت ابدیہ یقینیہ کو قربان کرے وہ مسکین قابل رحم ہے، اس کی عقل ودانش پر تعزیت کرنی چاہیے کہ کس متاع گراں مایہ کو اس قدر سستا دے دیا۔

میں تو میخانہ میں گاہک نہ ہوا عزت کا — دین کے بدلہ میں ملتی تھی تو سستی کیا تھی

اور تجربہ تو یہ ہے کہ اس طرز سے عزت فانیہ دنیویہ بھی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ نظروں سے گر جاتے ہیں۔

عزیزے کہ از در گہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اور اگر خداوند عالم ذرا چشم بصیرت عطا فرمائیں تو انسان کی نظر ایک ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے جہاں یہ بات روزِ روشن کی طرح مشاہدہ میں آجاتی ہے کہ دنیا اور اسکی عزت وذلت سب خواب وخیال ہیں، عاقل کا کام نہیں کہ اس کے حصول پر فخر یا عدم حصول پر افسوس کرے۔

زمین شدیم چہ شد، آسماں شدیم چہ شد بچشم خلق سبک یا گراں شدیم چہ شد

ہیچ رنگ دریں گلستان قرارے نیست تو گر بہار شدی ماخزاں شدیم چہ شد

اور یہ بات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے کہ "سہاگن وہی جسے پیا چاہے" عزت وہی عزت ہے جو دربارِ الٰہی میں سرخرو کرے اور اس کے سوا ہر عزت ذلت ورسوائی کی مرادف اور متاع غرور ہے۔

ایارب ذل ساق للنفس عزة وایارب نفس بالتذلل عزة

اکبر مرحوم نے خوب کہا ہے:

گو یہ عزت ہے کہ پائی تری محفل میں جگہ لذت اس میں ہے کہ ملجائے ترے دل میں جگہ

﴿ ایبتغون عندهم العزة فإن العزة لله جميعا ﴾

کیا وہ لوگوں کے پاس عزت ڈھونڈتے ہیں بے شک عزت تو تمام اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

حقیقی عزت وذلت نسب کے تابع نہیں:

اور اگر کسی شخص کو یہی مقصود ہو کہ دوسروں پر فضیلت وفوقیت حاصل کرے تو اس کی بھی یہ صورت نہیں کہ اپنا اصلی نسب چھوڑ کر دوسرے انساب کے سلسلہ میں اپنے آپ کو داخل کرتا پھرے اور اس کی کوشش میں رہے کہ بعید قرائن کا سہارا لے کر کسی اونچے نسب نامہ میں اپنا نام درج کر دے جیسے آج کل بہت سے لوگوں کو یہ ابتلا پیش آیا ہے۔

ایسے ہی لایعنی حیلے اور قرینے جمع کر کے کوئی انصاری بنتا ہے کوئی قریشی اور کوئی راعی بلکہ عزت وتفوق کی چیز علم اور حسن اخلاق اور اعمالِ فاضلہ ہیں ہمیشہ عزت کا مدار یہی رہے ہیں۔

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ اگر آج دنیا میں تشریف لے آئیں تو اس گئی گزری حالت اور بے پروائی کے زمانہ میں بھی یقین ہے کہ بڑے بڑے عزت کی لمبی ناک رکھنے والے اونچے

اونچے نسب کے لوگ ان کے پیر دھونے کو اپنا فخر سمجھیں گے، یہی وہ عزت ہے کہ جس نے بڑے بڑے بادشاہوں کو ادنیٰ ادنیٰ نسب کے لوگوں کے آگے جھکا دیا۔ اور یہی وہ دولت ہے جس کے لیے ہارون رشید اور ان کے دونوں صاحبزادے امین اور مامون کاسہ گدائی لے کر حضرت امام مالک بن انس رحمہ اللہ کے دروازے پر آتے تھے، اور یہی وہ تاج سلطنت ہے کہ جس کے نہ ہونے نے دنیا کے بہت سے نامور بادشاہوں کے ہاتھ میں کاسہ گدائی دلوایا۔

(ماخوذ از جواہر الفقہ: ۲/ ۱۰۱)

لے پالک کا حکم:

بعض لوگ قضاء الٰہی سے اولاد کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں اب وہ اولاد کے شوق میں کسی دوسرے کے بچے گود لیتے ہیں اس میں شرعی لحاظ سے کئی خرابیاں سامنے آتی ہیں مثلاً ایک اہم مسئلہ اس کے نسب بیان کرنے کا ہے تعلیم کے سلسلہ میں مختلف سرکاری محکموں میں اصل باپ کی بجائے گود لینے والے کا نام لکھوایا جاتا ہے حالانکہ غیر باپ کی طرف نسبت کا بڑا گناہ ہونا اوپر مذکور ہو چکا ہے، نیز ممالک کے سفر کی ضرورت پیش آئے تو پاسپورٹ سمیت بہت سی جگہوں میں جھوٹی نسبت لکھوائی جاتی ہے۔

شادی کے موقع پر باپ کے بجائے گود لینے والے کا نام لکھ کر جھوٹی نسبت کی جاتی ہے۔

ثانیاً، اگر وہ لڑکی گود لینے والے کے لیے اجنبی ہو تو نو سال کے بعد اس سے اور اس کے دیگر رشتہ داروں سے پردہ کرنا فرض ہو جائے گا اور اس پر عمل بہت مشکل سے ہو پائے گا۔

اور اگر لڑکا ہو اور اس کی بیوی کا غیر محرم ہو گا تو بلوغ کے ساتھ اس کی بیوی سے پردہ فرض ہو جائے گا، اس پر عمل بھی مشکل ہو گا۔

تو گود لینے کا عمل اگرچہ فی نفسہٖ جائز ہے لیکن ان خرابیوں کے پیش نظر احتیاط بہر حال اولیٰ ہے اگر کسی نے گود لیا تو ان خرابیوں سے بچنا لازمی اور ضروری ہے۔

خضاب کا حکم:

سیاہ رنگ کے سوا دوسرے رنگوں کا خضاب علماء مجتہدین کے نزدیک جائز بلکہ مستحب ہے اور سرخ خضاب خالص حناء کا یا کچھ سیاہی مائل جس میں کتم شامل کیا جاتا ہے مسنون ہے۔ جناب نبی کریم ﷺ سے جمہور محدثین کے نزدیک ایسا خضاب استعمال کرنا ثابت ہے، صحیح بخاری میں عثمان

بن عبداللہ ابن موہب سے مروی ہے کہ ہم ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو انہوں نے ہمارے لیے نبی کریم ﷺ کا موئے مبارک نکالا۔ دیکھا تو وہ حناء کتم سے خضاب کیا ہوا تھا۔

(زاد المعاد: ۲/۱۲۶)

اسی طرح جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن أحسن ما غيرتم به الشيب الحناء والكتم.

(رواه السنن الاربعه)

بہترین رنگ جن سے سفید بالوں کی سفیدی تبدیل کی جائے مہندی اور وسمہ ہیں۔

سیاہ خضاب کا حکم:

سوال: سیاہ خضاب کا کیا حکم ہے؟

جواب: سیاہ خضاب کا استعمال خواہ داڑھی میں ہو خواہ سر میں حرام ہے چنانچہ صحیح احادیث میں سفید بالوں کے تبدیل کے لیے حناء (مہندی) اور کتم (وسمہ) استعمال کرنے کی ترغیب اور خالص سیاہ رنگ استعمال کرنے پر بہت سخت وعیدیں آئی ہیں۔ چنانچہ: جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخر زمانہ میں کچھ لوگ آئیں گے جو کبوتروں کے پوٹوں کی طرح سیاہ رنگ کا خضاب کریں گے یہ جنت سے اتنے دور رکھے جائیں گے کہ اس کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکیں گے۔

(ابو داؤد، نسائی، احمد)

وعن ابی الدرداء رضي الله عنه مرفوعاً من خضب بالسواد سود الله وجهه يوم القيامة.

جو سیاہ خضاب استعمال کرے گا اللہ تعالیٰ روز قیامت اس کا چہرہ سیاہ کردیں گے۔

عن جابر رضي الله عنه قال اتى بابى قحافة رضي الله عنه يوم فتح مكة وراسه كالثغامه، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم غيروا هذا بشيء واجتنبوا السواد. (مسلم، ابو داود، نسائی، احمد)

یعنی فتح مکہ کے روز حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں لائے گئے ان کے سر اور داڑھی کے بال ثغامہ گھاس کی طرح سفید تھے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ان کی سفیدی کسی

چیز سے تبدیل کردو لیکن سیاہ رنگ سے اجتناب برتو۔

یستحب للرجل خضاب شعره ولحيه الى ...... قوله ويكره بالسواد . (الدرالمختار على هامش ردالمحتار : ٦/٤٢٢)

(یعنی مرد کے لیے سر اور داڑھی پر خضاب کرنا مستحب ہے مگر سیاہ رنگ کا خضاب مکروہ تحریمی ہے)

حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ سر اور داڑھی میں سیاہ خضاب لگانا از روئے شرع حرام ہے۔ کیونکہ کلیاً وجزیاً اس پر وعید آئی ہے۔

حضرت مفتی عبدالرحیم لاجپوری رحمہ اللہ کا فتویٰ:

سوال: سر کے بال جوانی میں سفید ہو جائیں تو سیاہ خضاب لگانا کیسا ہے؟

جواب: سیاہ خضاب لگانا سخت گناہ ہے احادیث میں اس پر وعید آئی ہے۔

(فتاوی رحیمیہ : ٦/٢٩)

جدید ہیئر کلر کا حکم:

آج کل ہیئر کلر کے نام سے جو مہندی کا رنگ آ رہا ہے اس کا حکم یہ ہے کہ جو ہیئر کلر بالوں کو خالص سیاہ کر دیں نہ صرف مکروہ تحریمی ہے بلکہ بروئے حدیث باعث لعنت اور جنت سے محرومی کا سبب بھی ہے۔ البتہ جو ہیئر کلر بالوں کو خالص سیاہ نہیں کرتے بلکہ سیاہی مائل بسرخ کرتے ہیں ان کا استعمال بلا کراہت جائز ہے۔

واضح رہے کہ یہ اس ہیئر کلر کا حکم جن میں حرام اشیاء نہ ہوں اگر حرام اشیاء ہوں تو ان کا استعمال مطلق حرام ہے خواہ بالوں کو خالص سیاہ کریں یا نہ کریں۔

(ماخوذ از خضاب کا شرعی حکم ، فتویٰ دارالافتاء بنوری ٹاؤن)

مجاہدین کے لیے سیاہ خضاب کا حکم:

سوال: مجاہد کے بال سفید ہو گئے ہوں تو جہاد میں جاتے وقت دشمن پر رعب ڈالنے کی غرض سے سیاہ خضاب استعمال کر سکتے ہیں؟ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: دشمن پر رعب ڈالنے کی غرض سے جہاد کے موقع پر سیاہ خضاب کا استعمال بالاتفاق محمود و مستحسن ہے۔

قال في الذخيرة : اما الخضاب بالسواد للغزو ليكون اهيب في عين العدو . فهو محمود بالاتفاق . وإن يزين نفسه للنساء مكروه وعليه عامة المشايخ . (فتاوىٰ شامى : ٦/٤٢٢)

وغير واهذا الشيب واجتنبوا السواد قال الحموي هذا في حق غير الغزاة ولا يحرم في حقهم للارهاب . (فتاوىٰ شامي : ٦/٧٤٦)

مروجہ حیلہ اسقاط:

مروجہ حیلہ اسقاط کے متعلق ایک مفصل سوال وجواب لکھا ہوا نقل کیا جاتا ہے:

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیانِ دینِ مبین اس مسئلے کے بارے میں:

ہمارے علاقہ میں زمانہ قدیم سے رائج ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے اور اس کو تدفین کے لیے قبرستان لے جاتے ہیں تو نمازِ جنازہ کے بعد دو تین سو افراد کا ایک بڑا دائرہ بنایا جاتا ہے اور اس بڑے دائرے کے اندر ایک چھوٹا دائرہ بھی بنایا جاتا ہے جس میں ایک عالم ہوتا ہے۔ یہ عالم وارثِ میت سے چادر میں لپٹی ہوئی رقم جس پر ایک قرآنِ کریم بھی رکھا ہوتا ہے وصول کر کے پہلے چھوٹے دائرے میں اس کے بعد پھر بڑے دائرے میں ایک بار گھما کر حیلہ اسقاط کرتا ہے۔ ہر شخص ''قبلت ووہبت لک'' کہتا ہے جب کہ اکثر لوگ اس کے معنی ومفہوم سے واقف ہی نہیں ہوتے۔ اس کے بعد میت کے بعض ورثاء اور متعلقین اکٹھے ہو کر رقم کی مقدار متعین کرتے ہیں اور متعینہ رقم ہر شخص کو دی جاتی ہے جس کے بعد سب واپس جاتے ہیں۔

اس مروجہ حیلہ اسقاط سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں، خواہ مرنے والا شیر خوار بچہ ہو یا نہایت مفلوک الحال کوئی غریب ہو، خواہ اس کی وصیت کی ہو یا نہ کی ہو، ہر حال میں لازم تصور کیا جاتا ہے۔ اگر میت نے ترکہ میں کچھ بھی نہ چھوڑا ہو تو اس کے ورثہ قرض لے کر اس کا اسقاط کرتے ہیں اور اگر میت کے ورثہ بالغ نہ ہو تو نابالغ ورثہ سے یہ رقم وصول کی جاتی ہے۔

اشہر الحج میں بعض اوقات اتنی رقم گھماتے ہیں کہ آدمی پر حج فرض ہو جاتا ہے، کیا ہبہ کرنے سے فریضۂ حج ساقط ہو جاتا ہے؟ نیز ہبہ بھی رواجی ہے حد درجہ محتاج شخص پر بھی ہبہ کرنا لازم ہے۔

مندرجہ بالا طریقہ کار اعمالِ تدفین کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسے ترک کرنے والا پر لعن طعن کی جاتی ہے اس لیے بعض لوگ اس کو چھوڑنے میں شرم وعار محسوس کرتے ہیں۔

لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ اس کے بارے میں حکم شرعی صادر فرمائیں کہ آیا اس قسم کا عمل جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس عمل کا مرتکب گناہ گار ہوگا یا نہیں؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر میت سے فرائض فوت نہ ہوئے ہوں تو یہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے کیا واقعی یہ صحیح ہے؟ تفصیل سے جواب مطلوب ہے۔ بینوا توجروا

جواب: یہ مروجہ طریقہ ناجائز اور بدعت ہے۔ قرآن، حدیث اور فقہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی قرونِ مشہود لہا بالخیر میں اس کا کوئی وجود ہے۔

قال الله تعالیٰ: ﴿ اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا ﴾

﴿ لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة ﴾

جو فعل رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا ہم اسے ثواب سمجھ کر کرنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نعوذ باللہ حضور ﷺ نے دین کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ ہم آپ ﷺ سے دین کے مسائل کو زیادہ سمجھ رہے ہیں اور معاذ اللہ آیت ﴿ اليوم اكملت لكم دينكم ...... ﴾ بھی غلط ہے، غرضیکہ اپنی طرف سے دین میں زیادتی کرنا سخت گناہ ہے۔

قال النبي صلى الله عليه وسلم: "كل بدعة ضلالة."

علاوہ ازیں حیلہ اسقاط کا جو مروج طریقہ ہے، یہ کئی مفاسد پر مشتمل ہے، اولاً اس میں تملیک فقراء اس طرح کی جاتی ہے کہ اس سے تملیک متحقق نہیں ہوتی، ثانیاً اس سے فسادِ عقیدہ لازم آتا ہے کہ عوام گناہوں پر دلیر ہو جاتے ہیں اور نماز روزہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ ثالثاً اس کا ایسا التزام کیا جاتا ہے کہ اسے بھی کفن دفن کے اعمال میں سے ایک مستقل عمل سمجھا جاتا ہے، جبکہ التزام کرنے سے مباح بلکہ مندوب کام بھی ناجائز ہو جاتا ہے۔ کما صرح بہ فی الشامیہ وغیرہا۔ رابعاً تہائی مال سے فدیہ ادا نہیں کیا جاتا حالانکہ ترکہ کے تہائی حصہ تک فدیہ کی وصیت کرنا اور اس کا ادا کرنا لازمی ہے اور تہائی مال سے فدیہ ادا کرنے کے بعد بھی فدیہ باقی رہ جائے تو اس حالت میں بعض فقہاء نے حیلہ کی اجازت دی تھی مگر فی زمانناً فسادِ عقیدہ کی وجہ سے یہ بھی جائز نہیں۔

نیز مروجہ حیلہ میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اس میں نابالغ اور یتامیٰ کا مال بھی دیا جاتا ہے جبکہ نابالغ کا مال اس کی اجازت سے بھی کسی کو دینا جائز نہیں۔ خلاصہ یہ کہ مروجہ حیلہ اسقاط مذکورہ بالا

مفاسد کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے۔

چند رسومِ باطلہ اور بدعات مروجہ کا بیان:

۱۔ میت کے سر پر عمامہ باندھنا مکروہ اور بدعت ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ٤/٢١٦)

۲۔ میت کے منہ دکھائی کی رسم بہت سے مفاسد پر مشتمل ہونے کی وجہ سے واجب الترک ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ٤/٢٢٩)

۳۔ دفن کے بعد فی نفسہ دعا کا ثبوت ہے، البتہ التزاماً تین دفعہ دعا مانگنا اور اجتماعی دعا کرنا بدعت ہے۔ (ماخوذ از احسن الفتاویٰ : ٤/٢٣٤)

٤۔ مروجہ حیلہ اسقاط ناجائز اور بدعت ہے، قرآن و حدیث وفقہ میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور نہ ہی قرونِ مشہور لہا بالخیر میں اس کا کوئی وجود ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ١/٣٤٩)

۵۔ میت کے گھر دعوت کا التزام ناجائز اور بدعت ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ١/٣٥٥)

٦۔ تعزیت کی دعاء میں ہاتھ اٹھانا بدعت ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ٤/٢٤٥)

۷۔ اپنے طور پر صدقاتِ نافلہ یا تلاوت و تسبیح و تہلیل وغیرہ کا ثواب میت کو پہنچانا حدیث سے ثابت ہے، البتہ ایصالِ ثواب کے لیے اجتماع کا اہتمام دنوں کی تعیین کرنا بدعت اور ناجائز ہے۔ (احسن الفتاویٰ : ٤/٣٦٢)

۸۔ ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی پر اجرت لینا دینا دونوں ناجائز ہے۔

(احسن الفتاویٰ : ٧/٢٩٢)

۹۔ تعزیت کے لیے مستقل اجتماع کا اہتمام کرنا درست نہیں ہر ایک اپنے طور پر آئے اور اتفاقیہ طور پر اکٹھے ہو گئے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ (احسن الفتاویٰ)

۱۰۔ مرحوم کی بیوہ کے علاوہ دیگر عزیز و اقارب کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں۔ (ماخوذ از کتب فقہ)

۱۱۔ جمعہ اور عیدین کے موقع پر کسی مخصوص رسم کو ادا کر کے غم تازہ کرنا جائز نہیں۔

۱۲۔ قبروں پر ہری شاخ گاڑنا فی نفسہ اس کا ثبوت تو ہے لیکن لوگوں نے اس کو لازم سمجھ لیا ہے اس لیے یہ عمل بدعت ہے۔ (احسن الفتاوی : ۱/ ۳۷٤)

۱۳۔ قبر کو ایک بالشت تک اونچا بنانا مستحب ہے اور اس پر کوئی عمارت کھڑی کرنا منع ہے اس سے اجتناب لازم ہے۔ (رد المحتار : ۲/ ۲۳۷)

۱٤۔ قبر پر جھنڈیاں لگانا، قبر پر چادر ڈالنا یہ رسم بدعت ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں۔
(احسن الفتاوی : ۱/ ۳۷٤)

۱۵۔ قبروں پر چراغ جلانا جائز نہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے۔ (مشکوٰۃ : ص ۷۱ باب المساجد)

۱٦۔ قبر کو اینٹ اور چونہ لگا کر مضبوط کرنا جائز نہیں البتہ گارے سے لیپنا جائز ہے مگر احتراز بہتر ہے۔ (احسن الفتاوی : ٤/ ۱۹۷)

۱۷۔ قبر کو بوسہ دینا بنیتِ عبادت و تعظیم کفر ہے اور بلا نیتِ عبادت بوسہ دینا گناہ کبیرہ ہے۔ (احسن الفتاوی : ۱/ ۳٦)

۱۸۔ قبر پر علامت کے طور پر میت کا نام اور تاریخ وفات لکھنا جائز ہے البتہ کتبہ قبر کے سرہانے سے کچھ ہٹا کر لگایا جائے۔ (احسن الفتاوی : ٤/ ۲۰۹)

۱۹۔ قبر کے سرہانے آیتِ قرآنیہ لکھنے میں بے ادبی ہے اس لیے جائز نہیں۔
(احسن الفتاوی : ٤/ ۲٤۱)

۲۰۔ اولیاء اللہ کے مزارات یا دیگر قبروں کا طواف ناجائز اور حرام ہے مخصوص تاریخوں میں یا مطلقاً کسی بھی وقت کیا جائے ہر صورت میں ناجائز اور حرام ہے۔
(فتاوی حقانیہ : ۲/ ۷۷ بحوالہ ارشاد الساری : ۳٤۲)

۲۱۔ دوسری جگہ کی مٹی لا کر قبر میں ڈالنا چونکہ اس کا ثبوت نہیں ہے اس لیے بدعت ہے۔

۲۲۔ قبر پر حاضری دے کر ہو یا دور رہ کر غیر اللہ سے مدد مانگنا بہر حال ناجائز اور حرام ہے ایک مشرکانہ فعل ہے اہل اسلام میں سے کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔
(فتاوی رحیمیہ جدید : ۱/ ٤۵)

۲۳۔ قبر کے پتھر جسم پر ملنا فسادِ عقیدہ کی دلیل ہے اس لیے ناجائز ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

۲۴۔ بیمار کو قبر پر لے جانا یہ بھی فسادِ عقیدہ کی دلیل ہے، قبر کوئی طبیب یا ڈاکٹر تو نہیں کہ اس کے لیے دوا تجویز کرے اس لیے یہ عمل ناجائز اور اس سے اجتناب لازم ہے۔

۲۵۔ درگاہوں کا نمک کھانا عموماً لوگ اس کو شفاء سمجھ کر کھاتے ہیں اس لیے یہ جائز نہیں۔ (خیر الفتاویٰ: ۳/ ۱۸۵)

۲۶۔ **مختلف بزرگوں کے مزارات پر جو عرس کے نام پر اجتماع منعقد کیا جاتا ہے اس میں اکثر لوگ مزاروں پر سجدہ وغیرہ کرتے ہیں مختلف طریقے سے نذر و نیاز منت چڑھاوے چڑھاتے ہیں عورت و مردوں کا بے محابا اختلاط ہوتا ہے، سماع اور قوالی بھی ہوتی ہے، اس لیے یہ بدعت اور گمراہی ہے اور ایسا عرس منانا اس میں شرکت کرنا سب ناجائز ہے۔**

(ملخص از امداد المفتین)

۲۷۔ **انسان کو اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے چاہیے قبروں پر مجاور بن کر بیٹھنا جائز نہیں** ہے اس میں دین و دنیا دونوں کا نقصان ہے۔

۲۸۔ آیت الکرسی پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا فی نفسہٖ جائز ہے البتہ اس کے ساتھ اور کوئی رسم و رواج انجام نہ دیا جائے۔

۲۹۔ نماز میں زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے، اگر کوئی اپنی توجہ برقرار رکھنے کے لیے زبان سے نیت کرنا چاہے تو اتنے مختصر الفاظ کافی ہیں، مثلاً فجر کی دو رکعت فرض امام کے ساتھ پڑھتا ہوں باقی اس کو مقصود اور ضروری سمجھنا بدعت ہے۔

۳۰۔ اذان اور اقامت کے درمیان تثویب مکروہ ہے۔

(امداد الاحکام: ۱/ ۴۳۳)

۳۱۔ فرائض کے بعد اجتماعی دعا رسول اللہ ﷺ سے صراحت کے ساتھ ثابت نہیں ہے، اس لیے اس کا التزام بدعت ہے، لہٰذا ائمہ مساجد پر لازم ہے کہ فرائض کے بعد جہری دعاء کی رسم کو تو بالکلیہ ترک کر دیں اجتماعاً سری دعا کے متعلق مقتدیوں کو یہ تبلیغ کرتے رہیں کہ یہ طریقہ سنت سے ثابت نہیں اس لیے اس کا زیادہ اہتمام نہیں کرنا چاہیے، بلکہ کبھی کبھار اجتماعی دعا میں ناغہ کر دیا

کریں تا کہ عوام کے ذہن سے اس طریقہ کی سنیت کا خیال نکل جائے، مگر عملی اقدام سے قبل بطریق احسن ملاطفت اور نرمی سے لوگوں کو مسئلہ کی حقیقت سمجھائیں اور خوب ذہن نشین کرائیں تا کہ انتشار اور فتنہ کی صورت پیدا نہ ہو۔ (ماخوذ از احسن الفتاوی: ۳/۶۸)

۳۲۔ سنن و نوافل کے بعد اجتماعی دعا کا کوئی ثبوت نہیں لہٰذا سنن اور نوافل کے بعد اجتماعی دعا مانگنا بدعت ہے۔

۳۳۔ شریعت میں مصافحہ کا موقع اول ملاقات ہے نمازوں کے بعد متصلاً ملاقات و مصافحہ رسول اللہ ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین رحمہم اللہ تعالیٰ سے ثابت نہیں بلکہ یہ روافض کی ایجاد اور بدعت ہے اس لیے اس سے احتراز واجب ہے۔

(احسن الفتاوی: ۱/۳۵۵)

۳٤۔ اذان کے بعد دعاء میں ہاتھ اٹھانا رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں اس لیے ہاتھ اٹھائے بغیر ہی دعاء مانگی جائے۔ (ماخوذ از فتاوی رحیمیہ جدید: ۲/۲٤۱)

۳۵۔ علماءِ احناف کے ہاں راجح مذہب یہ ہے کہ تنہا جمعہ کا روزہ بھی مکروہ نہیں البتہ جن احادیث میں نہی وارد ہے وہ ضعف اور کمزوری وغیرہ پیدا ہو جانے پر محمول ہیں کہ جس کی وجہ سے جمعہ کی ادائیگی میں فرق آتا ہو۔

قال العلامة ابن العابدين رحمه الله تعالىٰ: ولا بأس بصوم يوم الجمعة عند ابي حنيفة رحمه الله، ومحمد رحمهم الله لما روي عن ابن عباس انه كان يصومه ولا يفطر.

(فتاوىٰ حقانية: ٤/١٤٩، ردالمحتار: ٢/٩١ كتاب الصوم)

۳٦۔ تراویح کے ہر ترویحہ یعنی ہر چار رکعت کے بعد کچھ دیر بیٹھنا مستحب ہے اس میں اختیار ہے تسبیح، درود شریف، استغفار، تلاوت، انفرادی طور پر آہستہ آواز میں جو آسان معلوم ہو اس میں مشغول رہے، بلند آواز سے اجتماعی دعا کرنا اس کا ثبوت نہیں ہے اس لیے جائز نہیں۔

۳۷۔ تراویح ختم ہونے کے فوراً بعد وتر پڑھ لی جائے، اس کے بعد امام اور مقتدیوں کا تعلق ختم ہو جاتا ہے ہر ایک انفرادی طور پر تسبیح و تلاوت وغیرہ اعمال انجام دے سکتا ہے، سورۂ ملک پڑھے یا کوئی اور سورت لیکن اس وقت انفرادی یا اجتماعی طور پر کوئی مخصوص عمل شریعت سے ثابت

نہیں اس لیے تراویح کے بعد سورۂ ملک کی تلاوت کی تخصیص اور اس کا التزام بدعت ہے۔

۳۸۔ رمضان کے آخری ایام میں الوداع یا الفراق کہہ کر پکارنا خطبہ جمعہ میں یا کسی اور وقت اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں اس لیے بدعت ہے۔

۳۹۔ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم کرنے کے لیے چندہ کرنا یا مٹھائی تقسیم کرنے کا التزام کرنا یا اس کو تراویح کا حصہ سمجھنا بدعت اور ناجائز ہے۔البتہ اگر کوئی اپنی حلال آمدن سے انفرادی طور پر تقسیم کرے تو اس کی گنجائش ہے۔

۴۰۔ عید کی مبارکباد دینا لینا جائز ہے لیکن اسے سنت سمجھنا جائز نہیں، اسی طرح انہی مخصوص الفاظ ''عید مبارک'' کو سنت اور ضروری سمجھنا بدعت ہے۔

(ماخوذ از بدعات رمضان : ص ٦٦)

۴۱۔ نفلی صدقات وخیرات کے لیے دن کی تعیین یہ شریعتِ مطہرہ پر زیادتی ہے اس لیے ناجائز اور بدعت ہے بلاتعیین وقت جس وقت دل میں آئے خیرات کرے۔

۴۲۔ بعض اوقات نماز کے بعد جو لوگ کھڑے ہو کر صلوٰۃ وسلام پڑھتے ہیں خصوصاً جمعہ کی نماز کے بعد یہ کئی قبائح ومنکرات پر مشتمل ہونے کی بناء پر بدعت اور ناجائز ہے۔

(ماخوذ از احسن الفتاویٰ)

۴۳۔ کھانے کے بعد دعاء کے موقع پر ہاتھ اٹھانا شرعاً ثابت نہیں، لہٰذا ہاتھ اٹھائے بغیر انفرادی طور پر دعاءِ ماثور پڑھی جائے۔اس موقع پر ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا کرنا بدعت ہونے کی بناء پر واجب الترک ہے۔

۴۴۔ شبِ برأت کے موقع پر حلوہ پکانا ناجائز ہے۔

۴۵۔ فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے نماز کے علاوہ جن مواقع پر اذان کو مشروع قرار دیا ہے ان میں شدید بارش کے وقت اذان کہنا مذکور نہیں اس لیے اس موقع پر اذان کہنا جائز نہیں۔

نسوار استعمال کرنا:

نسوار کے استعمال سے انسان کو غذائی لحاظ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اسی طرح اس میں ایک قسم کی بدبو بھی ہے جس سے فطرت سلیمہ کو گھن آتی ہے، لہٰذا اس کے استعمال کی عادت نہیں بنانی چاہیے، اگر کسی کو عادت پڑ گئی ہے تو اس کو ترک کرنے کی مکمل کوشش کی جائے، تاہم اس کے

استعمال کو حرام یا ناجائز نہیں کہا جائے گا۔

البتہ نسوار رکھ کر مسجد میں جانا منع ہے، کیونکہ اس کی بدبو سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے جب تک نسوار کھانے کی عادت نہ چھوڑے، اس وقت تک اس کا اہتمام کرنا لازم ہے کہ مسجد میں آنے سے پہلے منہ کو اچھی طرح صاف کرلیا جائے۔

باقی چونکہ نماز کے دوران کھانا پینا جائز نہیں اس لیے دورانِ نماز نسوار کا استعمال بھی جائز نہیں ہوگا، اسی طرح روزہ کی حالت میں بھی نسوار کا استعمال جائز نہیں اگر کسی نے استعمال کرلیا تو اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا، اس کے ذمہ اس روزہ کی قضاء لازم ہوگی۔

قال العلامة ابن عابدين رحمه الله : اختلفوا في معنى التغذي قال بعضهم أن يميل الطبع إلى أكله وتنقضي شهوة البطن به وقال بعضهم هو ما يعود نفعه إلى صلاح البدن ، وفائدته فيما إذا مضغ لقمة ثم اخرجها ثم ابتلعها فعلى الثاني يكفر لاعلى الأول ، وبالعكس في الخشبة لانه لا نفع فيها للبدن ...... وربما تنقص عقله ويميل إليها الطبع وتنقضي بها شهوة البطن اهـ .

(ردالمحتار باب ما يفسد الصوم : ٢/ ٤١٠)

گانے کی طرز پر نظمیں پڑھنا:

رسول اللہ ﷺ کی تعریف کرنا، آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ، حسن و جمال کو بیان کرنا یا آپ ﷺ سے محبت وعقیدت کا اظہار کرنا جائز بلکہ کارِثواب ہے اور سرمایہ آخرت ہے۔

لیکن اس میں غلو کرنا، اللہ تعالیٰ کی صفات کو رسول اللہ ﷺ کے لیے ثابت کرنا یا دیگر شرکیہ کلمات کو آپ کے حق میں استعمال کرنا حرام، جہالت اور گمراہی ہے، اسی طرح نعت ونظم کو گانوں کے طرز پر پڑھنا اور اس کے ساتھ ساز اور موسیقی شامل کرنا، تعلیماتِ نبوی ﷺ سے سراسر انحراف بلکہ آپ ﷺ کی شان میں گستاخی ہے۔

وعن ابي مالك الاشعرى رضي الله عنه قال : قال : رسول الله صلى الله عليه وسلم : ليشربن ناس من امتي الخمر يسمونها لغير اسمها ، يعزف على روسهم بالمعازف والمغنيات يخسف الله بهم

الارض ويجعل الله منهم القردة و الخنازير .

(رواه ابو داؤد وابن ماجه ابن حبان)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر پئیں گے اوران کے سامنے معازف اور مزامیر کے ساتھ عورتوں کا گانا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو زمین کے اندر دھنسا دے گا اور بعض کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دے گا۔

وعن علي رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن ضرب الدف ، والطبل والصوت الزمارة . (كذا في نيل الاوطار)

یعنی جناب رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ڈھول طبلہ بجانے اور بانسری کی آواز سننے سے۔ (موجودہ زمانے کی موسیقی اسی میں داخل ہے)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے راویت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آخری زمانہ میں میری امت کے کچھ لوگوں کی صورتیں مسخ کر کے بندر اور سور بنا دیا جائے گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا وہ مسلمان ہی ہوں گے؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں وہ اس بات کی گواہی دینے والے ہوں گے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں (یعنی مسلمان ہوں گے) اور روزہ بھی رکھتے ہوں گے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ پھر ان کا قصور کیا ہوگا؟ تو ارشاد فرمایا کہ وہ گانے بجانے کے آلات اور گانے بجانے والی عورتوں اور ڈھول بجانے میں مشغول ہوں گے اور شراب پیا کریں گے وہ رات اسی طرح شراب پینے اور دوسری کھیل کود میں گزار دیں گے جب صبح کو اٹھیں گے تو ان کے چہرے مسخ ہو چکے ہوں گے۔ (رواہ ابن حبان)

لہٰذا نعت رسول مقبول ﷺ کے ساتھ ساز ملا کر پڑھنا یا ساز ملائے بغیر گانے کی طرز میں جس سے گانے کی طرف دھیان جائے یا گانے کی لذت محسوس ہو شرعاً جائز نہیں، ایسی نعت و نظم پڑھنے اور سننے سے اجتناب کرنا لازم ہے۔

اسی طرح قرآن کریم کی تلاوت بھی گانے کی طرز پر کرنا جائز نہیں ہے، قرآن کو عرب کے لہجہ میں پڑھنا چاہیے۔

سی ڈیز میں محفوظ کی جانے والی چیز اکثر اہل علم وافتاء کے نزدیک تصویر ہی ہے، اس لیے ایسی

سی ڈیز کا استعمال ممنوع ہے، جن میں کسی جاندار کی تصاویر ہوں۔

روزہ میں انہیلر کا استعمال:

گیس پمپ (انہیلر) کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ دوائی کے ذرات حلق میں داخل ہوتے ہیں، اگر چہ وہ گیس یا دھویں کی شکل میں ہوتے ہوں۔

فقہاء کرام نے روزہ کی حالت میں دھواں یا غبار کو قصداً حلق میں داخل کرنے سے روزہ کے فاسد ہونے کا حکم لگایا ہے۔

وفي الدر: ومفاده أنه لو ادخل حلقه الدخان أفطر أي دخان كان، ولو عوداً أو عنبراً لو ذاكراً لإمكان التحرز عنه فليتنبه له كما بسطه شرنبلالي.

وفي ردالمحتار: ومفاده اي مفاد قوله دخل بنفسه بلا صنع منه قوله أنه لو ادخل حلقه الدخان بأي صورة كان الادخال حتى لو تبخر بخور فآواه الى نفسه واشتمه ذاكراً لصومه أفطر لامكان التحرز عنه وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس ولا يتوهم أنه كشم الورد ومائه والمسك لوضوح الفرض بين هواء تطيب بريح المسك، وشبه وبين جوهر دخان وصل الى حوفه بفعله.

(ردالمحتار: ۲/۳۹۵، مطبوعه سعيد)

باقی جس اخبار کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں مسئلہ لکھنے والا کوئی شرعی عالم یا مفتی نہیں ہے مسائل دینیہ کے لیے مستند علماء کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، ہر کس و ناکس کی بات پر اعتماد کرنا قطعاً جائز نہیں، بہر حال اب فتویٰ یہی ہے کہ ''انہیلر'' کا استعمال روزہ کی حالت میں جائز نہیں اگر کسی نے روزہ کی حالت میں استعمال کرلیا تو اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا۔

بینک کے لیے تیار ہونے والے مکان میں مزدوری کا حکم:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام ومفتیان عظام اس مسئلہ کے بارہ میں کہ اگر کسی کے رشتہ دار لکڑی کا کام کرتے ہوں (عام حالات میں ان کے یہاں زیادہ کام بھی نہیں ہوتا نہ گھر کے حالات زیادہ بہتر ہوتے ہیں) تو اگر اسے بینک کا کام کرنا پڑے جو ابھی نیا کھولا گیا ہو یعنی اس بینک کا مالک

پہلے کوئی اور کام کرتا تھا اور اب پرانا کام وغیرہ ختم کر کے بینک کھول رہا ہو اور اس بینک کی لکڑی کا تمام کام وہ اپنے رشتہ دار سے کروا رہا ہو اور اس بینک کا معاوضہ پہلے ادا کر دیا ہو اور کچھ کام کے بعد ادا کرے گا اور اب ان کے یہاں خوشحالی بھی ہے تو ان کے گھر جانا، کھانا کھانا اور اگر انہوں نے کچھ رقم ہدیۃً دی ہو تو اس کا کیا حکم ہے اور اگر کچھ کتابیں وغیرہ منگوانا ہوں تو اس رقم سے منگوانا کیسا ہے؟ مسئلہ مذکورہ کی وضاحت فرما کر بندہ کی الجھن دور فرمائیں۔ بینوا توجروا

جواب: موجودہ دور میں بینک کے کاروبار میں اکثر سودی معاملات ہوتے ہیں، اب اگر کوئی بینک کا ادارہ قائم کرے گا تو وہ بھی اسی قسم کے سودی معاملات ہی انجام دے گا، اس لیے ایسے لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا گناہ کے کام میں تعاون ہے جس سے قرآن وحدیث میں منع فرمایا گیا ہے:

﴿ ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان ﴾ الآیۃ

تاہم صورتِ مسئولہ میں چونکہ ابھی تک بینک کا ادارہ وجود میں نہیں آیا تھا اس لیے اگر یہ شخص پہلے کی حلال رقم سے اجرت ادا کرے تو وہ اجرت حلال ہوگی، اس اجرت سے بڑھئی کسی کو کھانا کھلائے یا ہدیہ کرے تو اس کو قبول کرنا بھی جائز ہوگا۔ اور اگر اجرت کا کچھ حصہ بینک کے کام شروع ہونے کے بعد بینک یا سابق حرام کی آمدن سے ادا کرے تو بینک سمیت سابقہ آمدن کے حرام ہونے کی وجہ سے اس کو لینا استعمال کرنا خود بڑھئی کے لیے بھی حلال نہیں، اگر لے لیا ہے تو بلا نیتِ ثواب فقراء پر صدقہ کر دینا واجب ہے، اگر بڑھئی اس رقم میں سے کسی کو ہدیہ کرے تو اس ہدیہ کو قبول کرنا اور اسے استعمال کرنا جائز نہیں، ہاں البتہ کسی فقیر کو مالک بنا کر دیدے تو اس کے لیے استعمال جائز ہوگا۔

وفي الدر المختار قال: وجاز تعمير كيسة وحمل خمر ذمي بنفسه أو بدا بته باجر۔ وفي الشامية قال في الخانية: ولو اجر نفسه ليعمل في الكنيسة ويعمرها لا بأس به لانه لا معصية في عين العمل.

(ردالمحتار: ٣٩١/٦ كتاب الكراهية)

بارش طلب کرنے کا مسنون طریقہ:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام درجِ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ ہمارے علاقے میں جب بارش

نہ ہوں تو کچھ لوگ جمع ہو کر پیسے جمع کرتے ہیں خود بھی حصہ ڈالتے ہیں اور لوگوں سے بھی پیسے مانگتے ہیں پھر ان پیسوں سے چاول پکاتے ہیں اور لوگوں کو کھلاتے ہیں کہ دعا کرو اللہ تعالی بارش کریں، تو کیا ایسے لوگوں کو پیسے دینا جائز ہے؟ اور کیا یہ چاول وغیرہ کھانا جائز ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ بینوا توجروا

جواب: بارش طلب کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ علاقہ کے لوگ کسی میدان میں یا جامع مسجد میں جمع ہو کر استسقاء کی نیت سے دو رکعت نماز ادا کریں، اس کے بعد اللہ تعالی سے مغفرت طلب کریں اور بارش کے لیے دعاء کریں اور اپنے طور پر صدقہ خیرات بھی کریں۔

لیکن سوال میں مذکورہ طریقہ شریعت سے ثابت نہیں ہے اس لیے اس سے اجتناب لازم ہے اور اس میں ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ لوگوں سے جو چندہ لیا جاتا ہے، اس میں اکثر لوگوں کی خوش دلی کا یقین نہیں ہوتا، اس لیے اس طرح چندہ کرنا اس کو آگے استعمال کرنا کروانا شرعاً جائز نہیں ہے، اس میں چندہ دے کر شرکت بھی نہ کی جائے۔

لقوله عليه السلام : إلا لا يحل مال امرئ مسلم إلا بطيب نفس منه . (رواه البيهقي في شعب الإيمان)

یعنی جناب نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سن لو: کسی کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

دعوت ولیمہ ورخصتی کے احکام:

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام ان رسومات کے بارے میں جو کچھ عرصے سے ہمارے علاقے میں شروع ہیں اور بہت سے دیندار گھرانے اس میں مبتلا ہیں:

۱۔ نکاح اور رخصتی سے پہلے دعوتِ طعام کرتے ہیں، جس کو دعوتِ ولیمہ کہتے ہیں کیا اس کو ولیمہ مسنون کہا جا سکتا ہے؟ ہمارا گھرانہ جو کہ علاقے میں دیندار گھرانہ کہلاتا ہے اس میں ہمارے بھائی عبد اللہ کا نکاح ہو چکا ہے رخصتی سے ایک دن پہلے وہ ولیمہ کرنا چاہتا ہے کیا اس کو ولیمہ کہا جا سکتا ہے یا نہیں اور دیندار گھرانہ جو کہ علاقہ میں مقتدا کی حیثیت رکھتا ہو اس کے لیے اس بارے میں کیا احتیاط ہے، جبکہ نکاح سے پہلے ولیمہ کا رواج پڑتا جا رہا ہے۔

۲۔ دعوتِ ولیمہ میں بعد الطعام ایک آدمی دروازے پر بٹھا دیتے ہیں جو کھانے

کھانے والوں سے پیسے وصول کرتا ہے اور ہر آدمی کا نام اور رقم لکھ لیتا ہے، پھر جب ان (رقم دینے والوں) میں سے کسی کی شادی ہوتی ہے تو یہ لوگ بھی اتنے ہی پیسے نہ کم نہ زیادہ دیتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں اور یہی طریقہ پیسہ ہمارے علاقے کے ہندوؤں کا بھی ہے۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟ جائز اور مسنون طریقہ سے ہماری راہنمائی فرمائیں۔

۳۔ برأت کو نکاح کے بعد لڑکی والے کھانا کھلاتے ہیں یا بعض لوگ ڈبے تقسیم کرتے ہیں کیا لڑکی والوں کو اس موقع پر کھانا کھلانا یا ڈبے تقسیم کرنا جائز ہے یا ناجائز اور ان صورتوں میں دیندار مقتدا گھرانہ کے لیے کیا احتیاط ہے، نیز ان لوگوں کو اس طعام میں شرکت کرنا اور اس طعام کا اہتمام کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ باحوالہ رہنمائی فرمائیں۔

٤۔ منگنی میں ایک ہزار دیتے ہیں تاکہ دو ہزار ملیں، اسی طرح رخصتی کے بعد لڑکی کے بھائی، خاوند کے گھر اپنی بہن کو ملنے جاتے ہیں اور اس کو اس نیت سے پیسے دیتے ہیں کہ بعد میں دگنے ملیں گے، کیا ایسا کرنا شریعت کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں؟ واضح رہے کہ ان تمام رسومات کو بہت ضروری سمجھا جاتا ہے اور نہ کرنے والے کو مطعون کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں دیندار مقتدا گھرانہ کے لیے کیا صورت بہتر ہے؟ بینوا توجروا

جواب: ۱۔ ولیمہ سنت ہے، البتہ اس کے لیے کوئی خاص وقت، خاص چیز، خاص مقدار شرعاً متعین نہیں ہے، حسب استطاعت جس وقت جس چیز کے ساتھ ہو ولیمہ کی سنت ادا کی جا سکتی ہے، دعوتِ ولیمہ نکاح کے وقت بھی ہو سکتی ہے نکاح کے بعد بھی، البتہ بہتر یہ ہے کہ شبِ زفاف یعنی میاں بیوی کی ملاقات کے بعد کی جائے۔

قال العيني رحمه الله : قال في المغني : ويستحب لمن تزوج أن يولم ولو بشاة ، لا خلاف بين اهل العلم في أن الوليمة في العروس سنة مشروعة وليست بواجبة في قول اكثر أهل العلم (إلى قوله) وقال عياض : لا خلاف أنه لاحد لقليل الوليمة ولا لكثيرها ؟ أو اختلف السلف في وقتها : هل هو عند العقد أو عقيبها ؟ أو عند الدخول أو عقيبه ؟ أو موسع من ابتداء العقد إلى انتهاء الدخول ؟ اقوال . إلى ...... قوله وحديث انس فاصبح رسول الله صلى الله عليه

وسلم بزينب ، فدعى القوم صريح بأنها بعد الدخول .

(عمدة القاري : ١٤/١١١ ـ ١٢)

وعن أنس رضي الله عنه : أو لم عليها (أي على صفية) بحيس

وعن صفية بنت شيبة رضي الله عنها قالت : أو لم النبي صلى الله عليه وسلم على بعض نسائه بمدين من شعير. (مشكوٰة باب الوليمة)

۲۔ شادی کے موقع پر سوال میں ذکر کردہ طریقہ پر جو رقم وصول کی جاتی ہے اس میں کئی قباحتیں ہیں:

(١) قرض کا لین دین ہے، جبکہ بلا ضرورت قرض کا لین دین شرعاً ایک ناپسندیدہ عمل ہے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض سے پناہ مانگی ہے، نیز قرض کو قرض اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ مقراض المحبة یعنی محبت کو کاٹنے والی قینچی ہے۔

(٢) بعض علاقوں میں یہ رواج ہے کہ دوسرے کی شادی کے موقع پر یہ رقم بڑھا کر لوٹائی جاتی ہے جو کہ سود کے حکم میں ہے۔

(٣) اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ قرض واپس کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا، مثلاً واپسی سے پہلی ہی دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، یا علاقہ چھوڑ کر دور کہیں چلا جائے، اس صورت میں دوسرے کی حق تلفی اور ناجائز طور پر مال استعمال کرنے کا گناہ ہوا، اس لیے یہ رقم قابل ترک ہے۔

(٤) کسی کی دعوت کر کے اس سے پیسے وصول کرنا، غیرت وحمیت کے خلاف ہونے کے علاوہ ایک احمقانہ حرکت ہے، اگر کسی کو دعوت کرنے کی استطاعت نہیں وہ دعوت کرتا ہی کیوں ہے؟ بالکل نہ کرے یا جتنے افراد کو کھانے کی استطاعت ہے صرف اتنے ہی افراد کی دعوت کرے۔

(٥) اگر ہدیہ ہی تسلیم کیا جائے، قرض قرار نہ دیا جائے تو بھی یہ رقم عموماً رسم سے مجبور ہو کر دی جاتی ہے، طیبِ خاطر اور خوشدلی سے نہیں دی جاتی، اور حدیث میں آتا ہے

لا يحل مال امرىء مسلم إلا بطيب نفس منه .

کہ مسلمان کا مال اس کی طیبِ خاطر کے بغیر حلال نہیں، ہاں البتہ واپس لینے کی نیت یا رسم کے بغیر عزیز واقارب میں سے کوئی ہدیہ دے تو اس کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں رخصتی کا کوئی خاص طریقہ نہیں تھا اور نہ ہی بارات اور لوگوں کے اجتماع کا کوئی اہتمام تھا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کی والدہ محترمہ نے رخصت کیا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر روانہ فرمایا، البتہ اگر پردے کا اہتمام ہو اور مردوں کے ساتھ اختلاط وغیرہ مفاسد نہ ہوں تو رخصتی کے وقت قریبی رشتہ دار خواتین کے گھر میں جمع ہونے کی گنجائش ہے، اور ان کے لیے بقدر استطاعت کھانے کا انتظام کرنا بھی درست ہے، لیکن اس کھانے کو صرف مہمان نوازی کی حیثیت دی جائے، اس کو دعوتِ مسنونہ نہ سمجھا جائے، کیونکہ رخصتی کے موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا انتظام شریعت میں ثابت نہیں۔

٤۔ فی نفسہ ہدایا وتحائف کا لین دین شرعاً مطلوب ہے، آپس میں محبت بڑھانے کا ذریعہ ہے، حدیث شریف میں اس کی ترغیب وارد ہوئی ہے۔

لیکن منگنی کے موقع پر ہدیہ کے نام پر جو رقم اس غرض سے دی جائے تا کہ اس کا دوگنا عوض ملے یہ ایک خلافِ شرع رسم ہے اور درحقیقت یہ ہدیہ نہیں بلکہ سودی قرض کی ایک صورت ہے، اسی لیے فقہاءِ کرام رحمہم اللہ نے اس کو ربو میں داخل فرما کر ناجائز قرار دیا ہے۔

قال ملا جیون رحمه الله تعالیٰ في تفسيرات احمدية : تحت قوله تعالیٰ : ﴿ وما اتيتم من ربا ليربوا في اموال الناس فلا يربوا عند الله ﴾ الآية قالوا ويجوز أن يكون المراد به ربوا الحلال أي وما تعطونه من الهدية لتأخذوا اكثر منها فلا يربوا عند الله لانكم لم تريدوا بذالك وجه الله وبهذا المعنى وردت هذه الاية والا فالربوا المحرم قد ذكر في سورة البقرة وال عمران ولكن الامام الزاهد لم يجعل هذا الربوا حلال لابل سماه مكروها وقال إن الربوا نوعان حرام ومكروه والاية اشارة اليهما والله اعلم . (پ ۲۱ : ۵۹۹)

شادی کے تحفے تحائف:

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس بارے میں کہ

۱۔ سکینہ (فرضی نام) کو طلاق ہو گئی ہے، منگنی کے وقت پہنائی گئی انگوٹھی اور منہ

دکھائی کے وقت شوہر کی طرف سے دی گئی انگوٹھی کیا وہ سکینہ کی ملکیت ہیں؟

۲۔ سکینہ کے سسرال والوں کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ ہم کو واپس کر دی جائیں صحیح ہے یا نہیں؟

۳۔ سلامی/ منہ دکھائی کے وقت سسرالی رشتہ داروں کی طرف سے جو پیسے سکینہ کے ہاتھ میں دیئے گئے تھے وہ کس کی ملکیت ہیں سکینہ کی یا سسرال والوں کی؟

٤۔ سکینہ نے سلامی/ منہ دکھائی کے ان پیسوں سے اپنے لیے سونے کے جھمکے بنوالیے اب سسرال والوں کا مطالبہ ہے کہ وہ ہماری ملکیت ہیں ہمیں واپس کیے جائیں کیا وہ ان کو واپس کر دیئے جائیں؟

۵۔ سکینہ کے جہیز کی چیزوں کو قسطوں میں واپس بھجوانا اور ان چیزوں میں کمی کرنا کیا یہ درست ہے؟

٦۔ سکینہ سے منسوب کوئی ملکیتی چیز مثلاً تصویریں یا کوئی ایسی چیز جس سے مستقبل میں کوئی ایذاء پہنچانا مقصود ہو واپس نہ کرنا (سابقہ) سسرال والوں کا ایسا کرنا دین کے لحاظ سے کیسا عمل ہے؟

شریعت کی رو سے مندرجہ بالا سوالات کے جوابات دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ بینوا توجروا

جواب: ۱۔ منگنی کے وقت جو انگوٹھی دی جاتی ہے وہ عورت کو ہدیۃً دی جاتی ہے، لہٰذا یہ انگوٹھی اس کی ملک ہے، واپس لینا جائز نہیں البتہ کسی جگہ کا عرف اور دستور عاریۃً دینے کا ہو، یا عاریت کے الفاظ کہہ کر دیا جاتا ہو تو اس کی ملک نہ ہوگی اور واپس لینے کا حق ہوگا۔

۲،۳،٤۔ منہ دکھائی کے وقت شوہر کی طرف سے جو انگوٹھی دی جاتی ہے اسی طرح سسرالی رشتہ داروں کی طرف سے جو تحفے دیئے جاتے ہیں وہ عورت کے لیے ہدیہ ہوتے ہیں اس کو واپس لینا جائز نہیں۔

قلت: ومن ذلك ما يبعثه إليها قبل الزفاف في الاعياد والمواسم من نحو ثياب وحلي. وكذا ما يعطيها من ذلك او من دراهم أو دنانير صبيحة ليلة العرس، ويسمى في العرف صبيحة، فإن كل ذلك تعورف في زماننا كونه هدية لا من المهر لا سيما المسمى صبيحة

فإن الزوجة تعوضه عنها ثيابا ونحوها صبيحة العرس ايضا۔

(ردالمحتار مطلب فيما يرسله الى الزوجه : ۱۵۳/۳)

۵۔ عورت کو اپنے والدین یا عزیز و اقارب کی طرف سے بطورِ جہیز جو سامان دیا گیا ہے وہ اس کی ملکیت ہے، اس کو اس میں ہر جائز تصرف کا حق حاصل ہے، طلاق ہو جانے کی صورت میں شوہر کا **بلاوجہ** کسی چیز کو روکنا یا واپس کرنے میں تاخیر کرنا جائز نہیں، البتہ جو چیزیں داماد کو شادی کے موقع پر **بطورِ تحفہ** کے دی گئیں ہیں ان چیزوں کا مالک وہ خود ہے، ان کو واپس کرنا ضروری نہیں۔

لما في **الولوالجية** : جهز بنته ثم مات فطلب بقية الورثه القسمة. فإن كان **الاب** اشترى لها في صغرها أو في كبرها وسلم لها في صحته **فهو** لها خاصة اهـ.

(**ردالمحتار** : ۱۵۷/۳ مطلب دعوى الاب ان الجهاز عارية)

۶۔ **تصویر** وغیرہ روکنا اس سے ایذاء پہنچانا کسی اور طریقہ سے **بھی** کسی **مسلمان کو** ایذاء پہنچانا حرام ہے۔

البتہ شادی کے **موقع** پر **تصویریں** بنوانا **پھر** ان کو بطورِ یادگار رکھنا شرعاً سخت گناہ ہے، ایسی **تصویروں کو** ضائع کرنا لازم ہے، **لہٰذا ان تصویروں کو** عورت یا اس کے رشتہ داروں کے سامنے ضائع کردیں۔

تنبیہ: سوال میں **مذکور** ہے، **عورت** کو منہ دکھائی کے وقت تحفے دیئے گئے، بعض علاقوں میں اس **عمل** کو **بطورِ** رسم کے **ادا کیا جاتا** ہے، یہ **شرعاً ناجائز** ہے، خصوصاً غیر محرم مردوں یعنی شوہر کے **بھائی**، **چچازاد**، ماموں زاد، بہنوئی وغیرہ اس موقع پر دلہن کو دیکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، یہ انتہائی بے غیرتی کی بات ہے، اس رسم بد سے بچنا بچانا لازم ہے۔

تمت